



تفسیر

# میزان القرآن

یعنے

اس حقیقت کے اظہار میں کہ لغت، ادب، گرامر، لسانیات اور اصناف  
عربی اور فہم کے جس زاویہ سے بھی قرآن حکم کا جائزہ لیجئے جہاں  
کیا لسانی فہم کی رسانی کا تعلق ہے تو اس میں نہ کوئی لونی غامی ہے  
نہ لسانی عقلمند غلامداری کی ضرورت اور نہ ہی عقلمند کا بھران  
الیس میں ہمارے سچ فکر مفسرین

تحریر

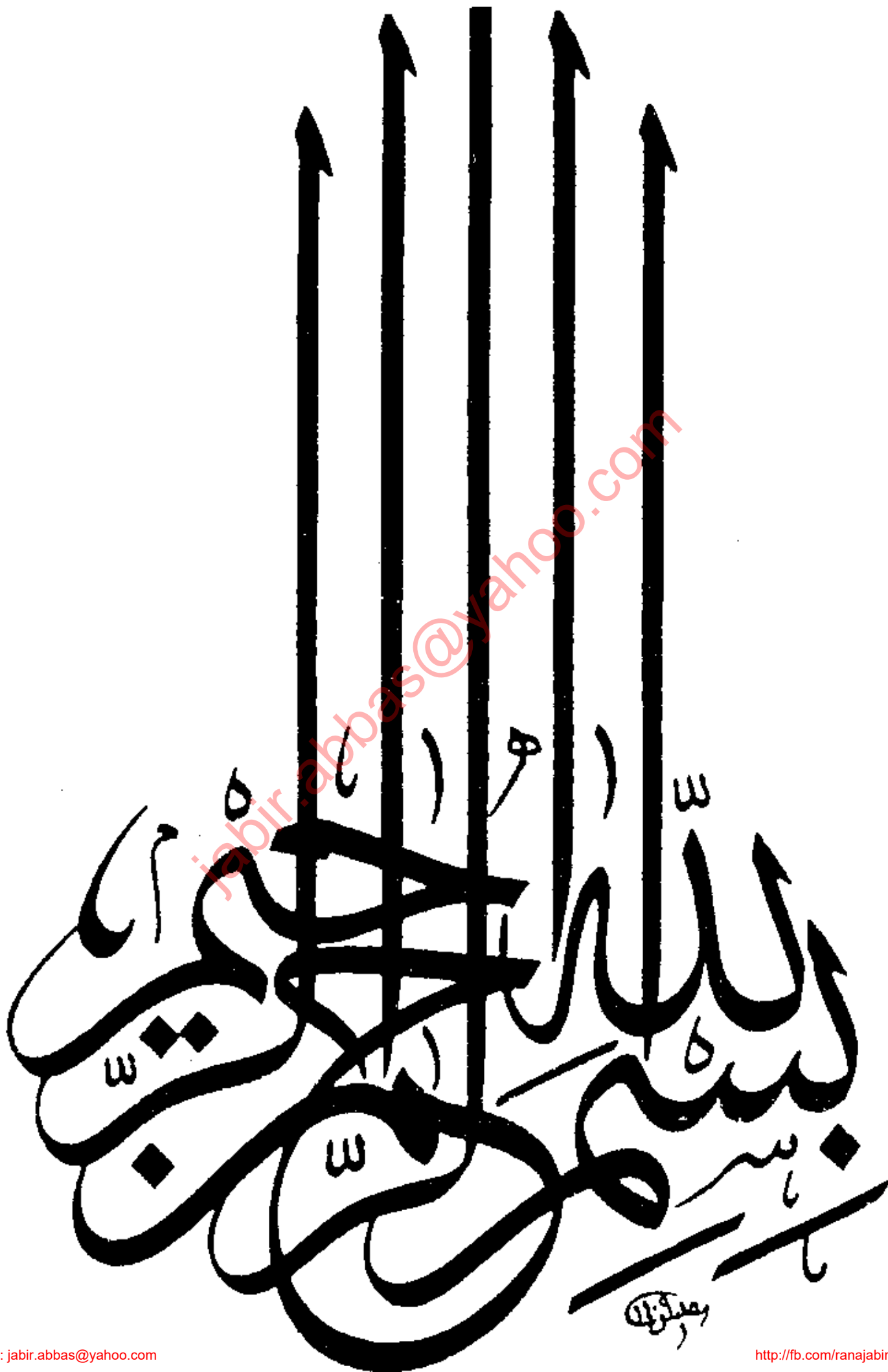
حمت اللطاف

الانبياء

1339/3 گلشن آباد بیرون پاکستان ملتان

کسانم کو گیند کی طرح؟ جہاں ایک بہت بڑا سانحہ ہے  
آئی بڑی جسارت تو ان لوگوں نے بھی نہیں کی جن کے  
شعروادب اور انکی شعری نزاکتوں کو بیچ کر کے کیلے  
قرآن متاقل میں آیا تھا اور انھوں نے اپنی زبان  
ہونے کے سوا سے قرآن کو حقیر اور ہرزادہ سے  
کہنا لادھا۔ مگر انھیں کہیں تشاد نظر آیا یا لسانی علم  
نہ فہم کی غامی نہ فصاحت و بلاغت کے معیار میں  
ہاتھی تو ہر پیرا زائل غم پر کیسے مختلف ہوئے؟  
ہم نے کتاب ہدایں غامیوں کی توجیحات کا اس زاویہ  
سے جائزہ لیا کہ ان لوگوں نے احقر اصناف کا جو علمی  
یکل نظر کیا ہے انکی علمی راوی لسانی اور مضموناتی  
کوئی بھی حیثیت نہیں ہے۔ پڑھیے اور قرآن سے  
انصاف کیجئے۔

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)



جملہ حقوق بحق ناشرین محفوظ

میزان القرآن

رحمت اللہ طارق

احمد کامران مگسی

محمد رضوان انجلیئر

نام کتاب:

مصنف:

ناشران:

پرٹرز:

۴۵۰/-

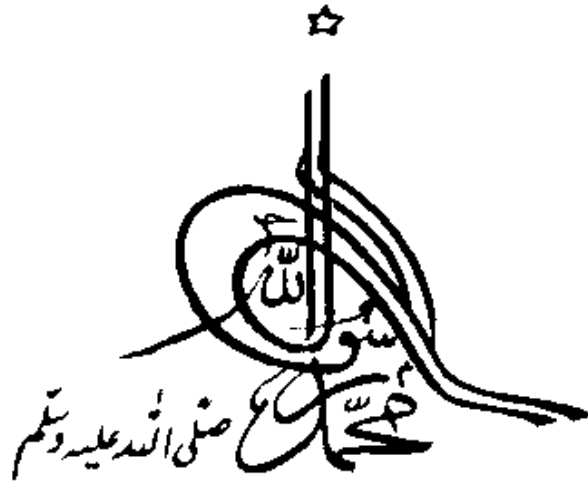
قیمت:

پتہ:

ادارہ: ادبیات اسلامیہ

گلشن آباد۔ بیرون پاک گیٹ۔ ملتان  
1339/3





## کے نام

جو ہادی برحق تھے جنہوں نے ہدایت کو نیا اسلوب دیا ایسا اسلوب جو اپنے اپنے دساتیر میں حمورابی، موسیٰ و عیسیٰ نہ دے سکے جنہوں نے ستاروں کو عریاں اور انکی تابانی کو اللہ کے عطا کردہ ”ذکرِ محدث“ (شعراء۔ 5) کی تابانی کے آگے سرنگوں کر دیا۔ جنہوں نے واشگاف الفاظ میں قرآن کے متن کو عربی مبین (شعراء۔ 195) کہہ کر تفہیم و بیان کے ذریعے ذکر للعالمین (یوسف۔ 104) ٹھیرایا۔

جنہوں نے قرآن کو مخزنِ حکمت اور آوازِ خدا کہہ کر تکوین و تقویمِ عوالم کا راز بتلایا۔

جنہوں نے کائنات کے سر نہاں کو منکشف کر کے ہدایت کے حصول کو مشاہدے کی دسترس میں دیدیا۔

جنہوں نے اعلان کر دیا کہ انسان کو مجالِ ارتقا۔ صرف قرآن ہی فراہم کرتا ہے یا یہ کہ ارتقاء قرآن کا استعارہ ہے۔

جنہوں نے پوری تہدی سے باور کرایا کہ قرآن ہی فطرت کے رجحانات کا ماہر شناسا اور نفسیات بشر کا مندرکب اعلیٰ ہے۔

جنہوں نے قرآن کو ذکر للعالمین (یوسف۔ 104) اپنے کو رحمة للعالمین (انبیاء۔ 107) کعبہ کو مثابة للناس

(بقرہ۔ 125) اور فاطر ارض و سماء کو رب العالمین کے عالمی تناظر میں مشترکہ میراث کے طور پر پیش کر کے گروہی

اجارہ داریوں کو ختم کر دیا اور جنہوں نے عقل کی بلوغت اور قابلِ رہنما حیثیت کا اعتراف کر کے واضح کر دیا کہ آئندہ نئے یا۔

پرانے ظہور کے انتظار میں نہ رہیں۔

اب آسمانی رسالت اور نبوت کی کسی انسانی پیکر میں عالمِ امکان میں نہ رسائی ممکن ہے نہ پذیرائی آسان۔

قرآن آسان ہے، سادہ ہے سلیس ہے اور فطری رہنمائی سے بھرپور ہے انہیں نہ سچی ہے نہ خالی اور نہ ہی لسانی سقم

(زمر۔ 28) یہ کسی بھی علمی، ادبی، دانش اور فطرت بشر کی ”میزان“ میں پوری اترنے والی کتاب ہے۔ اسے محمد رسول

اللہ نے پڑھا، اس پر عمل کیا اور کائنات بشری کو اس پر غور کرنے اور وقت کی مناسبتوں سے رہنمائی حاصل کرنے کی دعوت دی

ہے۔

آئیے ہم سب مل کر آپ کی پکار پر لبیک کہیں اور آپ کا ساتھ دے کر اپنی ذمہ داری پوری کریں۔

صلی اللہ علیہ وسلم

## حرف تشکر

جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا قرآنی قدروں کو اجاگر کرنا ہوان کے احساس بھی اعلیٰ وارف ہوں گے ایسے لوگ رہی وادو تحسین کے طلبکار نہیں ہوتے وہ اپنی تعریف کرانے یا سننے کو اخلاقی گراوٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ تعاون کو احسان نہیں کہتے ان کے نقطہ نظر سے ”صلے“ کا تصور ہی اخلاقی عالیہ کے منافی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ وہ مدح و ثنا کے طالب اگر نہیں تو کیا شکرینے کے مستحق بھی نہیں؟

یہ درست ہے کہ احسان کا بدلہ شکر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ احسان کو احسان ہی نہیں کہتے تعاون سے موسوم کرتے ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ ”تعاون“ ہو یا احسان اس کے لئے ہماری اخلاقیات میں شکرینے کے پاکیزہ عمل کو بیحد اہمیت دی گئی ہے لہذا میزان القرآن کے معاونین خصوصی جنہوں نے نرم سے نرم شرائط پر بھاری تعاون جاری رکھا۔ میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

جناب الشیخ الفاضل حنیف وجدانی اور  
جناب مُحَمَّدٌ صَالِحٌ عَسَا (المکرم)  
سے التماس ہے کہ شکر یہ کا یہ حقیر نذرانہ قبول فرمائیں۔

احقر طارق



مسجد نبوی کے شمال مغرب میں سیع پہاڑی ہے اسی کے دامن میں واقع ایک مکاں میں مصنف  
حقیقی کام میں مصروف ہے۔



نمبر	رہنمائے منزل	صفحہ
	انتساب	5
	فوٹو	7
	فہرست	9
	معذرتیں اور وضاحتیں	39
	تفسیر میزان القرآن کے مباحث و مقالات کا تعارف	41
	باب اول	
	فاتحہ	
1	رحمان اور رحیم میں فرق	51
	بقرہ	
2	قرآن شک سے پاک ہے	51
3	قرآن کی ہدایت عام نہیں ہے؟	52
4	قرآن کی عادات حسن و خوبی کا مرقع ہیں لیکن	52
5	بارش کہاں کہاں سے؟	52
6	حاجت روا کون کون؟	53
7	فساد کی قسمیں	53
8	اللہ سے جسمانی ملاقات	54
9	ابتلا - یا - احسان؟	54
10	خدا کا دیدار	54
11	خطاؤں کی معافی "عدل" کے منافی	55
12	پتھر کیسے پھٹ پڑتے ہیں؟	55
13	جنت کے لئے تنہا ایمان کافی ہے؟	56
14	اپنے ہاتھوں سے "لکھنے" کا مطلب	56
15	تولی - اور "اعراض" میں فرق	57

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
57	جوئے زندگی رواں رہے گی	16
58	سلیمانؑ کے دربار کا نامور افسوس گر۔ عفریت	17
59	افراد کی صلاحیت کو نظر انداز کر دینا	18
59	قرآن۔ قدیم یا حادث؟	19
60	اللہ۔ کائناتی چہرہ	20
61	اللہ کا گھر کیسا ہے؟	21
61	نبوت۔ کے بعد درجہٴ صالحیت	22
62	مسلمون۔ کس مفہوم کی غمازی کرتا ہے؟	23
62	کون سی مثل۔ طالب ایمان ہے؟	24
63	رسول اللہ۔ خاتم النبیین نہیں ہیں؟	25
63	قبلہ اول۔ کاشا خسانہ	26
64	غیر مسلم مسلمانوں کے لئے حجت؟	27
64	شکرو اور ناشکری کی بات	28
65	إله۔ کی تکرار۔ الہیہ کے تعدد کی غماز ہے	29
65	مردار کو غذا بنانا	30
66	سور کھاؤ جان بناؤ	31
67	قیامت میں اللہ ان سے باتیں ہی نہ کرے گا	32
68	قانون کو ہاتھ میں لینے کا مسئلہ	33
68	جو ”سکت“ رکھتے ہیں مگر روزہ نہیں رکھتے	34
69	ہمارے اور ان کے روزوں میں کون سا فرق ہے؟	35
70	منیٰ میں قربانی کے متبادل کب اور کتنے روزے رکھنے چاہئیں	36
70	منیٰ۔ میں ”کنکر“ کتنے دن مارنے ہیں	37
70	دنیا ہر ایک کے لئے خوبصورت ہے	38
71	عدت کے اندر رجوع ہو تو طلاق رک جائے گی	39
71	حلالہ۔ کے ذریعہ بیوی کی بازیافت	40
73	مار کر پھر زندہ کرنے کا عمل خداوندی	41
73	خدا اپنی کرسی دوسرے کو پیش کر سکتا ہے؟	42

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
74	پانی کھانا اور روٹی پینا کیا بات ہوئی؟	43
74	جنگ وجدال میں اللہ کی مشیت کا دخل	44
75	ماضی اور مضارع کی یک جائی	45
75	مردوں کو زندہ کرنے کا ”مشاہداتی“ عمل	46
76	اللہ سبحانہ ”لڑائی“ کیسے لڑتے ہیں	47
78	جرم دل کا عمل ہے یا ہاتھ پاؤں کا؟	48
78	قلب۔ کے عمل پر گرفت؟ وہ کیسے؟	49
79	کیا۔ ایمان۔ رسالت پر فائق ہے؟	50
79	”احد“ کا استعمال	51
80	خیر و شر۔ کا مآخذ	52
	<b>عمران</b>	
80	قرآن، توریت و انجیل سبھی برحق ہیں تو ”فوقیت“ کس بات میں	53
81	محکمات۔ کیا ہیں اور متشابہات کون سے ہیں؟	54
82	کفار قلت کے باوجود مسلمانوں کو ذہرے دکھتے ہیں؟	55
82	کام۔ بے نتیجہ	56
83	حکومت چھیننا۔ انصاف کے منافی ہے	57
83	قانون تخلیق کے دو بنیادی عناصر (صلب اور ترائب کی تشریح)	58
	دو نطفوں کا امتزاج ہی موجب آفرینش ہے۔۔۔ مسیح پر ”ذریۃ“ کا	
	اطلاق۔۔۔ شادی ہی سے عفت و پاکدامنی حاصل ہو سکتی ہے۔	
	نفخ سے استدلال۔۔۔ یہ شادی کس سے ہوئی؟ قید مکرر۔	
	احصنت کے معنے۔۔۔ صلب و ترائب کے بناوٹی معنے۔	
	تولید دو نطفوں کی تخلیط ہی سے ممکن ہے۔۔۔ کلوننگ۔۔۔ قانون	
	استثناء۔۔۔ الف برائے جنس۔۔۔ مسیح کا فارمولا اٹل ہے۔	
95	لا وجود سے۔ باوجود کی طرح خطاب کرنا	59
97	سیدنا اسحاق اور عیسیٰ کی غیر معمولی ولادت	60
	نظام تخلیق۔۔۔ اشارہ بلغ ترین اظہار ہے۔۔۔ ولادت اسحاق۔	
	عجز کیا ہے اور عقم کسے کہتے ہیں؟	



صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
101	صلوٰۃ میں باتیں کرنا	61
102	مسیح - پنگوڑے میں باتیں کرتے تھے؟	62
103	مسیح کے پیروکار ہی کامیاب رہیں گے	63
104	قانونِ فطرت کے آگے ہر چیز سرنگوں ہے	64
104	دین بمعنی قانون	65
105	ہدایت کی صلا - عام نہیں ہے؟	66
105	بار بار نظریہ تبدیل کرنا قابلِ معافی نہیں ہے	67
106	ایمان کے لئے "تناظر" نہیں ہوتا	68
	حسنۃ - کو صیغہ مَسَّ - اور سیئۃ - کو اصابة سے واضح کرنے میں	69
106	کیا مصلحت ہے؟	
106	پیغمبر کے اختیارات وسیع یا محدود؟	70
107	آگ صرف کافروں کے لئے ہوگی اور مسلمان؟	71
107	رحمان - تو غفار ہے - کیا انسان بھی "غفار" ہو سکتا ہے؟	72
108	قتل اور موت میں کیا فرق ہے؟	73
108	قیامت میں خیانت شدہ مال کہاں سے آئے گا؟	74
109	مصیبت کہاں سے آتی ہے؟	75
109	شہداء - کے کھانے پینے کا مسئلہ	76
110	کفر - اللہ کی منشا ہی سے سرزد ہوتا ہے؟	77
110	ان کے جرائم میں اللہ خود ہی اضافہ کرتا ہے	78
	مَنْ - کا حرف عموم کے لئے ہے جو کافر اور مسلمان کو یکساں شامل	79
111	ہے	
111	گناہوں پر پردہ ڈالنے اور محو کرنے میں فرق	80
	نساء	
112	حواء - آدم کی بیٹی - یا بیوی؟	81
112	موت اور وفات میں فرق	82
112	خالق - پر توبہ لازمی ہے؟	83
113	باپ کی بیوی سے شادی رچانا	84



صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
113	ساس اور بیوی کی سابقہ بچی سے نکاح کی بات	85
114	سالی۔ سے ہم بستری	86
114	اراد۔ فعل سے مربوط ہوتا ہے	87
115	نیکیاں بندے کی۔ اضافہ خدا کا	88
116	آگ کا عذاب جو تصور اور گماں سے بھی ماورا ہو	89
116	بغیر سورج کے سایہ	90
117	نبوت کا درجہ بلند تر۔ یا صالحیت کا؟	91
117	زیادہ مکار عورتیں یا شیطان؟	92
118	قرآن میں گڑبڑ کی تلاش	93
118	سجاء خدا۔ یا اس کا۔ قول؟	94
118	لفظی تکرار کس لئے؟	95
119	قتل خطا کی سزا نہیں ہے؟	96
119	صلاة۔ ماضی میں فرض تھی اب نہیں؟	97
120	بے گناہ کو پھانسنے کی سزا	98
120	اسم سے فعل کی استثناء	99
121	ارتداد۔ کے لئے جسمانی تعزیر نہیں ہے	100
123	غالب کون مسلمان یا کافر؟	101
123	مظلوم کو زبانی جنگ جاری رکھنے کا حق ہے	102
124	اللہ۔ کو دیکھنے کی سنگین سزا	103
124	ایمان۔ لانے پر پابندی	104
	مائدہ	
125	تکمیل دین۔ کہاں اور کیسے؟	105
	وجہ اعتراض دوم۔۔۔ وجہ اعتراض سوم	
127	حلال و حرام۔ کا معیار	106
128	جو ”متوکل“ نہیں وہ ”مؤمن“ نہیں	107
128	پابندی اور چھوٹ میں کیا فرق ہے؟	108
129	واحد کے صیغے سے جمع کا استدلال	109

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
129	کفار کی صرف بعض کوتاہیاں قابلِ سزا ہیں	110
129	دو ہاتھوں والا ”خدا“	111
130	پیغمبر کی حفاظت کیوں اور کیسے؟	112
130	جَعَلَ۔ اور خَلَقَ میں فرق	113
131	مسیح معمول کے مطابق انسانی نطفے کی پیداوار تھے	114
132	اللہ۔ پر نفس کا اطلاق	115
	<b>انعام</b>	
132	الظلمات۔ جمع اور النور مفرد یک جا کیسے؟	116
133	اجل۔ کی قسمیں	117
134	کیا اللہ تبارک اوپر کی منزل پر تشریف رکھتے ہیں؟	118
134	عدالت میں اللہ۔ کو گواہ بنانا	119
134	اللہ۔ کی مشیت یہ تھی کہ ہدایت عام نہ ہو؟	120
135	انسانوں کی طرح پرندوں کی امتیں	121
135	بات نہ چھپانے والے سے پوچھ گچھ کیسی؟	122
136	باقی رات کو ہوتی ہیں۔ دن کو نہیں	123
136	اللہ۔ صرف مسلمانوں کے مولے ہیں؟	124
137	قرآن میں غور و خوض کرنے والے کا بایکاٹ	125
137	بدی کا خالق جب اللہ ہے تو پھر سزا کیسی؟	126
138	ان آنکھوں سے اللہ نہیں دیکھتا	127
138	جنوں۔ میں رسول	128
139	اولاد کو قتل کرنے کا محرک کون ہے؟	129
139	کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟	130
	<b>اعراف</b>	
140	ظلم۔ خدا کی دی ہوئی توانائی سے وجود میں آتا ہے؟	131
140	اعمال وزن کرنے کی بات	132
140	اہرمن کو یزداں ہی نے بدراہ کیا	133
141	کپڑے اُتار کر شجرہ چکھنا	134

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
142	ابتدا کی طرف پلٹ آنا	135
142	بے جان لاشوں سے خطاب	136
143	سُقَطْ فِيْ اَيْدِيْهِمْ	137
143	اور وہ انسان تھے۔ بندر بن گئے	138
144	عہد کن سے لیا گیا تھا۔ انسانوں سے یا انسانی اعضاء سے	139
144	کیا رسول عالمی نہیں صرف مومنوں کے نذیر تھے؟	140
	<b>الانفعال</b>	
145	حق و باطل میں امتیاز کی صورت	141
145	اللہ۔ میدان و غامیں	142
146	مفرد بمعنی۔ تثنیہ اور جمع	143
146	انسان کا دل اللہ کے کنٹرول میں ہے	144
147	بارش اوپر سے ہوتی ہے السماء کے حوالے کی ضرورت کیا تھی	145
147	نبی کی موجودگی میں تباہی کا دھارا منجمد ہو جاتا ہے	146
148	تالیاں پیٹنے اور سیٹیاں بجانے پر صلاۃ۔ کا اطلاق	147
148	تھوڑی تعداد کو زیادہ کر دکھانا	148
149	پھوٹ سیاسی ہو خواہ مذہبی عنوان تباہی ہے	149
	<b>توبہ</b>	
149	مشرکین۔ حریم کعبہ میں داخل نہ ہوں	150
	نجاست کے مفاہیم۔۔۔ با ایں ہمہ یہ بات تسلیم ہے۔۔۔	
	مشرک حریم کعبہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔۔۔ روایات کیا کہتی ہیں؟	
152	دین حق کو الہدیٰ۔ پر عطف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟	151
153	اسلام۔ کو صرف کسی ایک دین پر غلبہ ہوگا	152
153	ذکر چاندی اور سونے کا۔ بات صرف چاندی کی	153
	سال کے مہینے بارہ ہی ہوتے ہیں پھر بارہ کے عدد کو دہرانے میں کیا	154
154	مصلحت تھی؟	
154	کیا اللہ کی باتیں حادث ہوتی ہیں؟	155
155	میدان جنگ میں شامل نہ ہونے کی پابندی کیوں؟	156

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
156	اب بیٹھے ہی رہو	157
156	منافقوں پر قرآن کا نزول	158
157	اللہ سے ملاقات کی حقیقت	159
157	مختلف وقتوں کی بات ایک جیسی نہیں ہوتی	160
157	برے بھلے میں تمیز نہ کرنا	161
	یونس	
158	زندگی بارش کی مانند ہے	162
158	بیانا کا استعمال	163
159	نبی کا اپنی ہی وحی میں شک کرنا	164
159	جبر سے کام لیا جاتا تو سبھی مسلمان ہو جاتے	165
159	آسمان کی ہر چیز ”دید“ سے اوجھل ہے	166
160	مس۔ اور۔ داد۔ کے استعمال میں فرق	167
	ہود	
160	قرآن حادث یا قدیم؟	168
161	توبہ پہلے۔ یا استغفار؟	169
162	”فی“ کی بجائے ”علی“ ہونا چاہئے تھا	170
162	خود ساختہ سورتوں کا اعتراف	171
163	قرآن کے آگے لا جواب ہونا	172
163	ہماری آنکھوں کے سامنے ”کشتی“ بنواؤ	173
164	ہمہ گیر طوفانِ باد و باران	174
165	آسمان و زمین کو صیغہ ”امر“ سے خطاب	175
165	قانون۔ کو خاطر میں نہ لانے کی سزا	176
166	اونٹنی باعثِ ہلاکت بن گئی	177
166	نوے سال کی عمر میں بچے کی پیدائش؟	178
	عجوز۔ کسے کہتے ہیں؟ خوشی کے موقع پر چہرہ پیٹنا	
169	ناپ تول میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے	179
170	قوم۔ لوط۔ کے عذاب کے حوالے سے بات کرنا	180

نمبر	رہنمائے منزل	صفحہ
181	ظالم بستی یا۔ لوگ؟	170
182	بد بخت اور نیک بخت کے کتبے	171
183	جنت میں لامتناہی عرصہ رہیں گے	171
184	کیا اختلاف کو فروغ دینا ہی اللہ کو پسند ہے	172
185	رسولوں کے بہت سے واقعات پر۔ پردہ پڑا ہوا ہے	172
	<b>یوسف</b>	
186	تیرہ کو گیارہ کیوں شمار کیا؟	173
187	جب یوسف اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرنے لگے	173
188	فرشتے جب نظر نہیں آتے تو ان کے حسن کا تذکرہ کیسا؟	174
189	کیا یوسف روٹل کفار پر عامل رہے تھے؟	174
190	اپنی ضد۔ سے حقائق کی پہچان	175
191	وما ابری نفسی۔ کا اظہار یوسف نے کیا۔ یا خاتونِ مصر نے	175
192	یوسف نے بے گناہ بھائیوں کو چور ٹھہرا دیا	176
193	یوسف کے لئے خدا کی حیلہ سازیاں	177
194	آنکھوں کی سفیدی بینائی کمزور ہونے کا استعارہ ہے	178
195	سب نے رسمِ شرک ادا کی پھر ”موحد“ کیسے کہلائے؟	178
	<b>رعد</b>	
196	خدا اب نہیں۔ آئندہ کسی وقت عرش پر مستوی ہوگا	179
197	مستخف۔ پر ”سارب“ کا عطف	180
198	قوموں کا عروج۔ اور۔ زوال۔ عمل سے مربوط ہے	180
	<b>ابراہیم</b>	
199	زبان اور قومیت کے حوالہ سے بات کرنا کفر ہے نہ اسلام سے	181
	بغاوتِ مادری زبان کو ذریعہ اظہار بنانا کیوں ضروری ہے؟	181
	مذہبی نیشیلیٹی اور امپورٹڈ زبان کی جارحیت	181
200	فرعون کا طریقہ ”ذبح“ کیا تھا؟	183
201	ملتِ کفر کی طرف پلٹ جانا	184
202	شمس و قمر کی تسخیر اس وقت جب دنیا اس سے آشنا ہی نہیں تھی	184

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
185	”مراد“ تو کسی کی بھی ”بَر“ نہیں آلی	203
186	نعمتوں۔ کا شمار کس زاویہ سے	204
186	یہاں موزوں ”افئدة الناس“ ہے یا۔ افئدة من الناس؟	205
187	مکرو فریب کا اللہ کے پاس پورا ریکارڈ موجود ہے	206
187	اللہ۔ کے حضور پیش ہونا	207
	<b>حجر</b>	
187	کفر پر چلانا کس کے بس میں ہے؟	208
188	خدا کے وارث ہونے کا مفہوم	209
188	ابلیس۔ کی نافرمانی اسکی رسوائی کا سبب بن گئی	210
189	دل میں کھوٹ کون پیدا کرتا ہے؟	211
190	فرشتے من مانی کریں تو اُسے کیا کہا جائے گا؟	212
	<b>النحل</b>	
190	مشقت اور تکلیف احسان کی نفی کرتے ہیں	213
191	کفر اور گمراہی۔ برحق کیسے؟	214
191	معدوم پر۔ موجود کا اطلاق	215
192	خطا انسان کی اور گرفت چوپایوں پر؟	216
192	شہد کی مکھی ہر جگہ ”چھتہ“ کیوں بناتی؟	217
192	بہنوں اور بیٹیوں کو۔ ”بیوی“ بنانے کی سوچ	218
193	حرف ”اَوْ“ بات کو مشکوک بنادیتا ہے	219
193	مشرکین کا اعتراف اور بیزاری	220
194	قرآن میں ہر چیز کی وضاحت کے معنے کیا ہیں؟	221
194	اللہ۔ کی باتیں بدلتی رہتی ہیں ان میں ثبات ہے نہ استقلال	222
197	کافروں کو ہدایت نہیں ملتی جبکہ ہزاروں صحابہ کافر تھے	223
197	ہر نفس اپنے نفس کا دفاع کرے گا۔ وہ کیسے؟	224
197	لباس پہنا جاتا ہے اس کا ”چکھنا“ کیسے؟	225
	<b>الاسراء</b>	
198	رسول۔ کو ”عبد“ کیوں کہا؟	226

صفحہ	دھنمائے منزل	نمبر
198	مکہ سے مسجد اقصیٰ کی سیر خواہاں	227
199	شادابی صرف بیت المقدس کی کیوں؟	228
199	اسرائیلی سرکشیوں اور زیادتیوں کی داستان خونچکاں	229
200	زیر دستوں پر زور آوروں کو مسلط کرنا عمل خداوندی ہے؟	230
201	لہا۔۔۔ اور۔۔۔ علیہا۔ میں فرق	231
201	بدکاروں کو بدی کا چانس خدا ہی فراہم کرتا ہے	232
202	دستر خواں کی مساوات	233
203	لعنتی۔ درخت سے کیا مراد ہے؟	234
	<b>کھف</b>	
203	مکمل مفہوم کے بعد۔ مترادف کیوں؟	235
204	دل مضبوط کرنے کا محاورہ	236
204	حرف ”دون“ کا استعمال کب اور کیسے؟	237
205	قرآن میں ہر چیز کا ہونا کس معنی میں؟	238
205	انہیں پکارو اگر دادرسی کر سکتے ہیں تو	239
206	صورت جب ناقابل برداشت ہو تو صبر کیسا؟	240
206	امراً۔ کے معنی کیا ہیں؟	241
207	دیوار۔ جاندار نہیں ہے۔ اس کا ارادہ کیسا؟	242
207	کس کی بات کو وزن میں نہ لانا	243
	<b>مریم</b>	
208	اندر کی آواز پر۔ ندا۔ کا اطلاق	244
208	عورت کی جانب وحی	245
209	بغیا۔ کی بجائے ”بغیۃ“ ہونا چاہئے	246
209	اضطراب اور بے چینی کے بول	247
210	جب وہ بچہ تھا۔ اب جوان ہے تب بات مشکل تھی اب ہوگی	248
210	مسیح نے اس وقت کلام کرنا شروع کیا جب احکام مل چکے تھے	249
211	استغفار کا ایک مفہوم	250
211	طور پر تجلیات ربانی۔ دائیں یا بائیں؟	251



صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
212	معاصر نبی۔ صرف معاون ہوتا ہے	252
212	وعدہ الہی پورا ہی ہوتا ہے	253
212	جہنم کا سا مناظرہ ہوگا	254
213	شیطانوں پر رسالت کا اطلاق	255
	طہ	
214	فعل۔ موجود ”فاعل“ غائب	256
214	چیز سامنے ہے۔ پوچھنا کہ کیا ہے؟	257
215	کلام میں صولتی ”رولیف“ کی رعایت	258
215	اسرائیلی۔ کیسے گمراہ ہو گئے؟	259
216	انقلاب۔ جو اونچ نیچ ختم کر دے	260
216	انسان اول۔ کی لغزش	261
217	کیا گناہ روزی کو گھٹاتے ہیں؟	262
217	جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ حق پر کون ہے؟	263
	انبیاء	
218	جو حساب لیا گیا اس سے مراد فتح مکہ ہے	264
218	ذکر۔ کا اطلاق حدیثوں پر؟	265
219	سرگوشی اور پوشیدہ	266
219	رویت سے کیا مراد ہے؟	267
219	انسان اول ہو۔ یا مسیح ہوں، ضابطہ تخلیق سب کے لئے یکساں ہے	268
220	جلد بازی انسانی مزاج کا خاصہ ہے	269
221	لاشوں کے کان نہیں ہوتے	270
221	بتوں کی خدائی داؤ پر لگ گئی	271
222	آگ ہوش و خرد سے عاری ہے	272
222	جہنم کا ایندھن۔ کون کون؟	273
	حج	
222	جہنم کی ہدایت کیا معنی؟	274
223	پیغمبر کے مقاصد میں رکاوٹیں ڈالنا	275



صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
224	برداشت سے باہر۔ دین نہیں ہو سکتا	276
	مؤمنون	
224	علیٰ کی جگہ ”عن“ موزوں ہے	277
225	عطف اور معطوف کا اصول	278
225	موت کے ساتھ قتل کا ذکر بھی ہونا چاہئے تھا	279
226	اللہ۔ کے لئے جمع کا صیغہ	280
	نور	
226	شہوت عورت میں زیادہ ہے یا مرد میں؟	281
228	بنت صدیق کا دامن کس نے آلودہ کیا؟	282
228	سرزنش ارادے پر یا عمل پر؟	283
228	ہاتھ پاؤں کی گواہی کا مسئلہ	284
229	نسوانی چہرہ کا پردہ	285
230	تسبیح۔ کا مفہوم کیا ہے؟	286
231	چلنا پاؤں سے خاص ہے پیٹ کے بل پر نہیں	287
232	اپنے گھر کھانا۔ ہر کوئی کھاتا ہے اس پر کسی کو اعتراض کیوں؟	288
232	گھر میں داخل ہوتے وقت اپنے پر سلام کرنا	289
	فرقان	
232	پیدا اللہ بھی کرتا ہے پیدا مسیح بھی کرتا ہے	290
233	خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنا	291
233	پیروان حق کی مخالفت	292
234	پاک کو۔ پاک کہنا۔ کیا مطلب؟	293
234	تبلیغ رسالت کا معاوضہ	294
	شعراء	
235	بات ایک کی حوالہ دو کا	295
235	کیا ”موسیٰ“ نبوت کی ”ضیاء“ سے محروم تھے؟	296
236	اللہ۔ عقل سے عاری؟	297

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
237	ایمان ہے تو خدا بھی ہے	298
237	ساحروں کی فنکاری کا اعتراف	299
238	وہ نکل رہے تھے اور یہ اُتر رہے تھے	300
	<b>نمل</b>	
238	برے عملوں کو زیادہ پرکشش کون بناتا ہے؟	301
238	قرآن نو بہ نو۔ اور تازہ بہ تازہ نازل ہوتا ہے یا.....؟	302
239	س۔ اور۔ لعل میں فرق	303
239	رسولوں سے ظلم سرزد نہیں ہوتا	304
240	منطق الطیر سے کیا مراد ہے؟	305
240	جانوروں کو سنگین سزا کس ضابطے کی رو سے؟	306
241	ساز و سامان سلیمان کے زیادہ تھے یا ملکہ سبا کے	307
241	توئی۔ کے معنی	308
242	رحمان۔ پہلے یا۔ سلیمان؟	309
242	سلیمان اور ملکہ سبا ایک ساتھ مسلمان ہوئے؟	310
243	سلیمان کا جاہ و جلال جنوں کی غیر معمولی ”توانائی“ پر قائم تھا؟	311
243	پہاڑوں کے چلنے سے کیا مراد ہے؟	312
	<b>قصص</b>	
243	خوف۔ بمعنی۔ یقین	313
244	خوف۔ اور ”حزن“ میں فرق	314
245	موسیٰ نے مکہ۔ مارا اور قطیفی نے تڑپ کر جان دیدی؟	315
	قضی علیہ۔۔۔ شیطانی فعل۔۔۔ موسیٰ کا اعتراف جرم۔۔۔	316
	معافی کی طلب۔۔۔ موسیٰ کی گمراہی	
248	گناہوں پر الزام	317
	<b>عنکبوت</b>	
248	ہزار میں سے پچاس نکال کر	318
249	روزی کے لئے فریاد کس سے کی جائے؟	319
249	گناہ جولذت فراہم کرے اور سزا نہ ہو	320

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
254	رسول اللہ پڑھنا بھی جانتے تھے اور لکھنا بھی	321
254	جہنم کن کن کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے؟	322
	روم	
255	زمین و آسمان کی تخلیق	323
255	خدا کو دیکھنے کے منکر۔ کافر ہیں؟	324
256	زبان اور رنگ قدرت کے انمول شاہکار ہیں	325
256	کائنات کو دوبارہ جہنم دینا آسان یا مشکل؟	326
257	آفرینش کے اصول فطری اور اٹل ہیں	327
	لقمان	
258	موسیقی حلال یا حرام؟	328
258	سُنی۔ اَنْ سُنّی۔ کر دینا	329
259	کلمات۔ کالفظ کیا چغلی کھاتا ہے؟	330
	السجدہ	
259	خدا کی تخلیق حسن و خوبی کا مرقع ہے	331
260	ہدایت۔ کو انسان کے خمیر میں شامل کیا گیا ہے	332
260	خَوَّ (KHARRA) کالفظ کس فعل کی غمازی کرتا ہے	333
261	مؤمن اور فاسق میں یکسانیت کیسے؟	334
261	کون سی فتح۔ مراد ہے	335
	احزاب	
262	عورتیں شوہروں کی نسبت استعجال نہ کریں	336
263	موت پر احسان کیسا؟	337
263	وہ کونسی بستی ہے جس تک مسلمان پہنچ نہ سکے	338
264	اہل بیت سے کون سی نجاست لگی ہوئی تھی؟	339
264	خدا کے نئے نئے کام ”حدوث“ کی غمازی کرتے ہیں	340
265	رسول اللہ۔ نرینہ اولاد سے کیوں محروم کر دئے گئے؟	341
265	انتظاری عقیدہ نبوت کی خاتمیت کی لٹی کرتا ہے	342

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
267	رسول اللہ - آفتاب عالمتاب - یاروشن چراغ؟	343
267	درود پڑھنے کی بات	344
268	سادات - اور - اکابر میں فرق	345
	سبائے	
269	بین ایدیہم - سے کیا مراد ہے؟	346
269	داؤد کے تابع فرمان پہاڑ اور پرندے؟	347
270	فتون لطیفہ اور مصوری کا فروغ	348
	فاطر	
270	ماضی سے مضارع کی طرف درآنا	349
271	جو مر گئے ان کے سننے کی صلاحیت مفقود ہو گئی	350
271	کیا غیر پیغمبر بھی "مصطفیٰ" بن سکتے ہیں؟	351
	یس	
272	"مُرسلون" - اور - "لُمرسلون" میں فرق	352
272	ہاتھ پاؤں بات کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے	353
272	پیغمبرِ سخن تھے سخن طراز نہیں تھے	354
273	چوپائے اللہ نے خود ہی بنائے ہیں	355
	صافات	
274	طلوع وغروب کے مقامات	356
274	کواکب صرف سماء دنیا میں کیوں؟	357
275	نجوم کی ساخت اور حرکات پر غور کرنا	358
275	بیمار نہ ہو کر - بیمار ظاہر کرنا غلط بیانی ہے	359
276	اصنام ڈر کے مارے دوڑتے رہے	360
276	ابراہیمؑ - اور - ذبیحہ کا خوابی مکالمہ	361
277	ذبحِ عظیم سے کیا مراد ہے؟	362
	ص	
277	ایک فرضی مقدمہ کا فیصلہ	363

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
278	جانوروں سے پیار شیوہ پیغمبری ہے	364
278	اچھے اور بُرے ایک سے نہیں ہو سکتے	365
	زمر	
279	شفاعت ایک ناممکن بات	366
279	اللہ۔ نہ وعدہ میں خلاف کرتا ہے نہ وعید میں	367
280	قتل۔ اور موت پر ”وفات“ کا اطلاق	368
280	شفاعت کا حق کسی کو تفویض نہیں ہوتا	369
281	جو حکم حسب حال ہو صرف اسی پر عمل کرو	370
281	کلید۔ مادی ذریعہ ہے اللہ کے استعمال میں کیسے آتا ہے؟	371
282	اللہ۔ بہت بڑا جسم ہے	372
	المؤمنون	
	قرآن میں وہی لڑتے جھگڑتے ہیں جو مسلمان ہو کر بھی کفر کی راہ	373
283	چلتے ہیں	
284	خدا کی رہائش گاہ کئی کئی منزلوں پر مشتمل ہے	374
284	اپنی بڑائی کا اظہار	375
285	تولیٰ۔ اور۔ اذہب میں فرق	376
286	اسباب۔ کا لفظ دو مرتبہ کیوں؟	377
	فصلت (حم السجدہ)	
286	حجاب کا مفہوم	378
286	وہ ایمان کے بعد کیوں بھٹکے	379
287	قرآن کی پذیرائی۔ متن سے ہے یا۔ مفہوم سے؟	380
	شورے	
288	اللہ۔ کس طرح بات کرتا ہے؟	381
288	مثل۔ کسے کہتے ہیں؟	382
288	آسمانوں میں ”زندگی“ کا وجود	383
289	مایوسی جب چھا جائے تو اُمید کی کرن پھوٹتی ہے	384

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
289	رسول اللہ۔ قرآن اور ایمان کا بخوبی ادراک رکھتے تھے	385
	زخرف	
290	جَعَلَ۔ اور خَلَق میں فرق	386
290	رسول سے مراد ”دینی“ قیادت ہے	387
290	ہر نشان پہلے سے زیادہ اہم تھا	388
	دخان	
291	موت بار بار۔ یا صرف ایک بار؟	389
	جاثیہ	
291	مردہ اجداد کو زندہ کرنے کی شرط صداقت	390
	احقاف	
292	درجات اور درجات میں فرق	391
292	وہ ”جن“ کون تھے؟	392
293	سارے یا۔ کچھ گناہ؟	393
	محمد	
293	جنگی قیدیوں کا مستقبل	394
294	مرنے کے بعد ہدایت کیسی؟	395
	فتح	
295	رسول کے اگلے پچھلے گناہ	396
295	کیا مشیت یہ تھی کہ رسول اللہ کعبہ میں داخل نہ ہوں؟	397
	حجرات	
296	محفل رسول کے آداب	398
297	رسول اللہ سے بات کرنی ہو تو ادب سے کرو	399
297	کیا صحابہؓ کے عمل ضائع ہو گئے تھے؟	400
298	فسق اور عصیان۔ میں فرق	401
298	ایمان۔ اور۔ اسلام میں فرق	402

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
	ق	
299	حَبّ - اور حصید میں فرق	403
299	تشبیہ بمعنی جمع کیوں اور کیسے؟	404
300	خدا کے لئے حلف و عید - کا عقیدہ کا فرانہ سوچ ہے	405
300	جنت کی صفت - مذکر کس لئے؟	406
301	شفاعت کا سید باب	407
301	عقل - کا محل وقوع کہاں ہے؟	408
	ذاریات	
302	فاعل بمعنی مفعول	409
302	زکوٰۃ کے بعد ٹیکسز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟	410
	حاصلاتِ مملکت کے ذرائع _____ ٹیکس کتنا عائد ہونا چاہئے؟	
	زکوٰۃ اور انفاق جرمانے نہیں ہیں _____ جبری وصولی کا قانون	
	وصولی کی میعاد _____	
307	جب تباہی کا نشان ہی نہ ہو تو عبرت کیسی؟	411
307	مریم اور مسیح نے شادی کیوں نہیں کی؟	412
308	عبادت یا قوائینِ فطرت کی پیروی	413
	طور	
309	نکاح کے بغیر زینتِ آغوش بنانا	414
	النجم	
310	قرآن - کی قسم	415
311	رسول اللہ نے اللہ کو کتنی بار دیکھا ہے؟	416
312	آتش، شعلے اور شرارے نعمت کیسے بنے؟	417
313	شعرے - کا مفہوم	418
	قمر	
313	چاند ٹکڑے ہوتے کس نے دیکھا؟	419
	رحمان	

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
315	فنا سے کیا مراد ہے؟	420
	واقعہ	
315	زمین اور پہاڑوں کا جنبش کھانا اور ریزہ ریزہ ہو جانا	421
316	تنزیل - کے معنے	422
	حدید	
317	فتح مکہ سے پہلے کے ”انفاق“ اور جہاد کا مقام	423
317	نوشہٴ تقدیر	424
318	جذبات خوشی کے ہوں خواہ غمی کے انہیں ”قابو“ میں ہونا چاہئے	425
319	لوہا اگر اوپر سے نازل ہو تو ہر چیز فنا ہو جائے	426
319	مؤمن سے ایمان کا مطالبہ؟	427
	مجادلہ	
320	ظہار کا کفارہ - نقد یا ادھار؟	428
320	اللہ - کا ہر جگہ ظہور	429
	الحشر	
321	متروکہ جائداد کا مالک کون؟	430
323	”غد“ کے معنے	431
	صف	
323	پورا نہیں ادھورا نبی ضرور ہوں	432
324	احمد کہا محمد کیوں نہیں کہا	433
324	احمد مرسل کا آنا مسیح کی موت سے مربوط ہے	434
	جمعہ	
326	رسول اللہ - ان پڑھ کیسے؟	435
327	صلاۃ - کے لئے دوڑ لگانا - سنجیدگی کے خلاف ہے	436
	منافقون	
327	سچ کو جھوٹ کہنا - انصاف نہیں ہے	437



صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
	<b>تغابن</b>	
328	کافر کے کفر اور مؤمن کے ایمان کا فیصلہ ہو چکا ہے	438
328	پہلے ہدایت - یا ایمان؟	439
	<b>طلاق</b>	
329	بے حساب رزق کا مسئلہ	440
329	جو مقدر میں لکھا	441
329	حمل والیوں کے اخراجات	442
	<b>تحریم</b>	
330	توبہ - کی صفت "نصوحہ" ہونا چاہئے	443
	<b>ملک</b>	
330	موت پہلے - یا - حیات؟	444
331	معجزات - ناممکنات	445
	<b>ن</b>	
332	اللہ کی پندلیوں کی بات	446
332	ذات بدل کر "وجاہت" حاصل کرنا	447
	<b>الحاقہ</b>	
333	صور - کی صفت عاتية	448
333	غائب کو موجود تصور کر کے بات کرنا	449
334	عرش کو اٹھائے پھرنے کے معنی - کیا ہیں؟	450
334	اللہ - کی طرف سے محاسبہ غیر یقینی ہوگا	451
335	رسول - قرآن کو منسوخ کرنے کے مجاز نہیں	452
	<b>معارض</b>	
336	کیا خدا سیڑھیوں کا محتاج ہے	453
336	یہ فاصلے اور دُوریاں ہمارے زاویہ نظر سے ہیں	454
	<b>نوح</b>	

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
337	کچھ دیر عذاب کا مل جانا	455
337	انسان پودے کی طرح اُگا ہے	456
337	کفار کے بچوں کا کیا بنے گا؟	457
	جن	
338	سائنسی پاور کے بغیر۔ فضائے بسیط کو پار کرنا ممکن نہیں	458
339	جنوں کی عبادت گاہیں	459
	مزمّل	
339	دَقل - کے معنے	460
	مدثر	
340	تطہیرِ ثیاب کس عمل کا استعارہ ہے؟	461
340	اُنیس۔ کی تلمیح کیا بتلاتی ہے؟	462
341	ملائکہ۔ جہنم کو بھر دیں گے؟	463
	قیامت	
341	چاند کے بے نور ہو جانے کا مقصد	464
342	سورج اور چاند کا ملجانا	465
343	دیکھنا آنکھ کا عمل ہے چہرے کا نہیں	466
343	نطفہ اور ”منی“ میں فرق	467
344	عورت کسی کی پسلی سے پیدا نہیں ہوئی	468
	دھر	
345	دونطفوں کا مکسچر وجہ تخلیق کائنات	469
346	ابتلا۔ کسے کہتے ہیں؟	470
346	چاندی شیشہ کیسے بن گئی؟	471
346	جستی بچوں کی موتیوں سے تشبیہ	472
	مرسلات	
347	جب بات کرنے کی اجازت ہی نہ ہو	473
347	فیصلہ پہلے۔ ڈگری بعد میں	474

نمبر	رہنمائے منزل	صفحہ
	<b>عم</b>	
475	اللہ۔ ہر چیز کا حساب رکھتا ہے	348
476	خدا کے پڑوس میں گھر بنانا	348
	<b>نازعات</b>	
477	فرشتے مذکر ہیں یا مؤنث؟	349
478	دل کی آنکھیں نہیں ہوتیں	349
	<b>عبس</b>	
479	رسول اللہ کے اخلاق و ایمان پر مفسروں کی یلغار	350
	<b>تکویر</b>	
480	آتش پرستوں کا زوال	351
481	کفار کے بچوں کو عذاب نہ ہوگا	351
482	اپنے حالات سے کوئی کوئی آگاہ ہوگا	352
483	مشینی سوار یوں کی آمد آمد	352
	<b>انفطار</b>	
484	پیار بگاڑ بھی دیتا ہے	353
485	صوت اور صورت کا امتیاز	354
486	تمام امور کا مالک اللہ ہے	354
	<b>مطففین</b>	
487	رب۔ سے اوجھل کیا معنی؟	355
	<b>انشقاق</b>	
488	آنے والے عظیم سائنسی انقلابات کا ظہور	355
	<b>بروج</b>	
489	برجوں والا آسمان	356
490	یوم موعود کیا ہے اور شاہد و مشہود کون ہیں؟	357
	<b>طارق</b>	

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
357	انسان کی آخری تخلیق کس سے ہوتی؟	491
358	جب وڈیرے دھرائے جائیں گے ان کا ساتھی ہوگا نہ مددگار	492
	<b>الاعلیٰ</b>	
359	کیا اللہ اکبر کہنے سے نظریہ توحید کی نفی ہو جاتی ہے	493
	گرامر کے زاویہ سے مشترکہ صفات میں حد امتیاز	
	اکبر دینی کلچر کا حصہ ہے حذف نہیں ہو سکتا نظر باز گشت	
363	قرآن سینہ پیغمبر سے محو نہیں ہو سکتا، مفہوم، نسیان عیب ہے، تبرکات سرسید	494
366	نصیحت اگر کارگر نہ ہو تو	495
366	ایسی ”ماز“ کہ نہ جئے نہ مرے	496
	<b>الغاشیہ</b>	
366	وجہ - سے پورا جسم مراد ہے	497
367	اونٹ اور آسمان کی تخلیق میں وجہ مناسبت	498
	<b>الفجر</b>	
367	انسان کی محیر العقول تعمیری تخلیقات	499
368	اللہ کا بہ نفس نفیس چلے آنا	500
	<b>البلد</b>	
369	عبدال مطلب اور ابوطالب کی قسم	501
371	ہر قسم کے غلاموں کو آزاد کرنے کا الہی اعلان	502
	<b>شمس</b>	
373	ارادے اور اختیار کا سلب ہونا؟	503
	<b>اللیل</b>	
374	جہنم میں جو زیادہ بد بخت ہونگے وہی داخل ہونگے	504
	<b>الضحیٰ</b>	
374	تلاش منزل تھی۔ منزل مل گئی	505
374	نبی اکرم کی پرورش کس نے کی؟	506

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
381	النشراح تیز دھار آلہ سے سینہ پیغمبر شق کیا گیا	507
382	التین انسان۔ یا۔ بوزنہ؟	508
383	انسان درجہ حیوانات میں	509
384	علق اللہ کی ربوبیت اور علم و آگہی کا اعلان	510
385	بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا	511
385	البینہ رسول اللہ دیکھ کر پڑھتے تھے	512
386	الزلزلة مصدر کو مضاف بنانا	513
386	اچھے عمل مذہبی نیشنلسٹی سے مربوط نہیں	514
387	القارعة مسلمان زیادہ تر۔ برائی پسند ہے	515
388	التکاثیر روٹی، کپڑے اور لباس کی پرش نہ ہوگی	516
388	الهمزہ انقلاب کے ڈر سے زرو جواہر کو ذخیرہ بنانا	517
389	الفیل الم تر سے خطاب کیوں ہوا؟	518
389	طیر کے کہتے ہیں؟ اور ”تر میہم“ کس چیز کا استعارہ ہے	519
391	ایلاف کیا دونوں سورتیں ہم زلف ہیں؟	520
	ماعون	

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
392	لوگوں کو ضروریات زندگی سے محروم رکھنا	521
	وانحر	
393	نماز پنج گانہ _____ صلاۃ میدانِ وغانیں _____ صلاۃ کے لئے وضو اوقات کس صلاۃ کی غمازی کرتے ہیں؟ _____ صبح، شام اور عشاء _____ تباہی کا گڑھا _____ صلاۃ میں معیشت کا اندماج _____ نماز کے استعارے _____ نماز اسلامی نظام کا لازمی عنصر ہے _____ صلاۃ ثقافتی زاویہ سے _____ صلاۃ روح اور مسجد جسم ہے _____ استدراک نماز پنج گانہ _____ اسوۂ رسول	522
	کافرون	
401	حرف "ما" کس مفہوم کا متقاضی ہے؟	523
402	دیورحرم کے آویزاں کتبے اتار پھینکو	524
	النصر	
403	تسبیح کیا ہے؟ اور استغفار کسے کہتے ہیں؟	525
	اللہب	
403	ابولہب کی وجہ تسمیہ	526
	الاخلاص	
404	اللہ احد کی بجائے اللہ واحد کہنا چاہئے تھا	527
	الفلق . الناس	
405	پیغمبرؐ جاو کے نرغے میں	528
	باب دوم	
	انتساب باب دوم	
411	وادی "نمل" کی ہشیار ملکہ	1
	ضمیمات :- آیہ نمل کا متن _____ اسماء و اعلام کا ترجمہ _____ نمل - وجہ تسمیہ _____ نمل کے انسان ہونے پر شواہد و قرائن _____ دوسرا قرینہ - حطم تیسرا قرینہ ادخلوا _____ چوتھا قرینہ - مساکنکم _____	

نمبر	رہنمائے منزل	صفحہ
	پانچواں قرینہ۔ آواز۔ چھٹا قرینہ۔ آیہ کا ماسبق۔ ساتواں قرینہ۔ ملکہ نمل کے نام۔ آٹھواں قرینہ۔ تاریخی نوشتے۔ نواں قرینہ۔ نمل کی شاخ۔ نمل کے معنی۔ وادی نمل کا محل وقوع۔ ایک اور شہادت۔ ایک تازہ شہادت۔ نمل خاندان کا شجرہ نسب۔ نملۃ مؤنث یا مذکر؟ اقوام نمل کی نقل مکانی۔ دوسرے وطن کا ایک اور ثبوت۔ شبہات اور وسوسے۔ پہلا وسوسہ۔ ربط آیات بمع قول فیصل۔ دوسرا وسوسہ غیرت خداوندی بمع قول فیصل۔ تیسرا وسوسہ۔ حقیر بننے کا قاعدہ بمع قول فیصل۔ چوتھا وسوسہ۔ انداز خطاب بمع قول فیصل۔ پانچواں وسوسہ نمل کی تاریخی شخصیت۔ منطق الطیر سلیمانی افواج کی تقسیم۔ طیر کی مزید وضاحت۔ طیر کا وسیع تر مفہوم۔ ہدھد پرندہ۔ یا۔ جاسوس؟ ایک اعتراض۔ دابة الارض۔ دابة انسان ہی ہوگا۔ نظر بازگشت۔ وہم لا یشرعون	
2	445 وادی نمل کی ہشیار ملکہ (جواب آن غزل) ضمیمات:- وجہ گناہ۔ حیوان کو انسان بنانے کا طریقہ۔ نمل۔ پاکستان میں۔	
3	450 چیونٹی	
4	460 چیونٹی اور سلیمان (جواب آن غزل) از محمد عصمت ابوسلیم	
5	469 ریاستہائے ”یمن“ پر سلیمان کی لشکر کشی (جواب آن غزل) ضمیمات:- میرے استدلال کا مآخذ۔	
6	474 فرعون ”ذی الاوتاد“ کا تعمیراتی معجزہ ضمیمات:- تصویر ہرم جیزہ۔ قومیں عظیم فن پاروں کے ناطے سے قوم شموود۔ عاد، شموود اور فراعنہ اولے کا ابتدائی وطن۔ ذی الاوتاد کی پیدائش۔ اہرام جیزہ کی تعمیر کا ارادہ۔ اصل نام۔ میری خامکاری عنوان حقیقت بن گئی۔ ذی الاوتاد۔ فرعون موسے تھے یا خوفو؟ وہ۔ گرداب معانی میں۔ تبرکات محمد عبدہ۔ لاشعوری لغزش دوسرے شاہد عادل۔ بے مقصد تعمیرات۔	

صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
492	ذی الاوتاد فرعون تھا یا بکسوس؟ فرعون کون لقب یا نام؟ قوم ”ثمود“ جس نے چٹانیں کھرچ کر رہائش کا منفرد انداز اپنایا	7
494	بابل کے معقل باغات	8
496	اخدود۔ والوں کا انسانیت سوز کارنامہ ضمیمات:- ”یہودیت“ یمن میں کب داخل ہوئی؟ حکومتوں کا ادل بدل ذو نواس پردہ سکرین پر یہودی ”دار“ خطا نہیں جاتا۔ یہ مقتل کہاں قائم تھے؟ کتنے مؤمن فدا کے گھاٹ اتارے گئے؟ ظلم کی شکست طلوع سحر	9
501	موسیٰ اور فرعون۔ آمنے سامنے ضمیمات:- ولادت موسیٰ۔ آسیہ ملکہ فرعون۔ رسم تینا اور موسیٰ کی تریت۔ شباب، نبوت اور ایمان کا امتزاج۔ مجمع البحرین۔ آسیہ پر حکومت توڑ سازش کا الزام۔ موسیٰ کی روپوشی۔ دارالامن کی تلاش۔ منقو کی تاجپوشی۔ تباہی کے اسباب اور دلائل۔ نعرہ قومیت۔ نو آیات۔ ایک مرد مومن۔ دو (۲) اہم فوٹوز موسیٰ سے بچنے آزمائی اور ذلت آمیز شک۔ رسیوں کی حقیقت جوابی کارروائی۔ مفسروں کی درماں۔ لقف کے معنی بد بیضا۔ وطن کو واپسی۔ فرعون کا ایمان۔ فرعون ڈوب رہا ہے۔ مصری تاج موسیٰ کے قدموں میں۔ فرعون غرق نہیں ہوا؟ تیرہ میں پڑاؤ۔ مصر پر موسیٰ کی حکومت۔ فرعون کا دعوے ربوبیت۔ موسیٰ دور کے نامور فضلاء۔	10
520	ذوالکفل۔ گوتم بدھ ضمیمات:- عقیدہ پہلے یا۔ دلیل؟ سیاسی مصلحتیں۔ یہ کیل کون تھے؟ ذوالکفل اور گوتم بدھ میں تاریخی فاصلے۔ ذوالکفل۔ بحث و نظر اسلم انصاری	11
528	سید البشر سے شادی کے وقت ”خدیجہؓ“ کی عمر کیا تھی؟	12



صفحہ	رہنمائے منزل	نمبر
531	سید البشر سے شادی کے وقت "عائشہ" کی عمر کیاتھی؟ ضمیمات: وفات کے تناظر میں _____ ہشام کی روایت _____ کوئی روایات مسترد؟ _____ عربی میں گنتی کا ایک طریقہ _____ ولادت عائشہ سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟ _____ ایک مغالطہ کا ازالہ _____	13
537	قرآن پر تصوف اور روایات کی ہمہ جہتی یلغار ضمیمات: قرآن کے خلاف مترادفات کی صف بندی _____ کتاب و سنت _____ ضلالت کلام الہ سنت سے؟ _____ حدیث _____ مثل قرآن؟ _____ قرآن کے مقابل شخصیات؟ _____ نبوت سے ولایت افضل ہے _____ ابو بکر کے مقام سے بھی برتر _____ کائنات کا نظام چلانے کی ممبر شپ _____ بڑے صاحب کا بڑا بول _____ کارہائے یزداں کی تکمیل میرے ہاتھوں ہوتی ہے _____ تم نام کے نبی اور کام کے صفر ہو _____ خداؤں کی یلغار _____ ان سب کا مآخذ _____ خدا کی پنڈ لیاں _____ خدا کی شکل _____ اللہ مونڈھے مارتے ہیں _____ خدا کی انگلیاں گداز اور ٹھنڈک پہنچانے والی ہیں _____ خدا کا وزن _____ اللہ میاں روئے اور خوب روئے _____ اللہ میاں "تنور" لگا کر بہشتیوں کی روٹیاں پکائیں گے _____ اللہ میاں ہنستے ہنستے بے خود ہو جاتے ہیں _____ اللہ میاں کی زلفیں _____ اللہ کا پاؤں گھڑام جہنم میں _____ تبصرہ _____ انسان خدا کا مظہر ہے _____ اللہ تعالیٰ سونے کی جوتی پہنتے اور چہرے پر برقعہ اوڑھتے ہیں _____ تبصرہ _____ اللہ سبحانہ داؤد ظاہری کی نظر میں _____ عورت کا رحم اللہ میاں سے لیٹ گیا _____	14

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)

معذرتیں اور وضاحتیں

میرا طریقہ ہے کہ دین کے بارے میں کسی مداخلت نہ کیا۔ پردہ داری سے کام نہ لینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کسی پر ضرب لگانے سے پہلے اسکے جواز کی تلاش ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر وہی گند جو غیر اچھالتے ہیں اپنے گھر کے صحن میں پھیلا ہوا ہو تو غیر کو ”مطعون“ نہ بنانا چاہیے۔ یہ اصول طے کر لینے کے بعد میرا طریقہ دفاع یہ بن جاتا ہے کہ میں تنقید سے پہلے غیر کے مفہوم یا الفاظ یا ترجمہ کو اسی کی زبان میں ”نقل“ کر لیتا ہوں تاکہ الفاظ یا ترجمہ میں جو تلخی گھلی ہوتی ہے اس کی سنگینی اور ”زخمی“ کا احساس بھی ہو سکے اور ”دفاع“ کا جواز بھی بن پائے۔ لہذا مجھے اپنوں کے پھیلانے گند و غلاظت پر پردہ ڈالنا نہیں آتا جسکی وجہ سے لاکھوں میں ایک کا مجھ پر دباؤ ہے کہ پردہ ڈالنا چاہیے۔ لیکن اگر ”غیر“ نشانہ ہوتے وقت جرأت سے کام لے کر یہ کہہ دے کہ یہی گند تو آپ کے مقدس آنگن میں بھی پھیلا ہوا ہے جسکی سزا اند اور بدبو سے آپ سب کا دماغ پھٹا بھی جا رہا ہے پہلے اُسے تو صاف کیجئے تو فرمائیے اس وقت میں کیا جواب دے سکوں گا؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت زینبؓ اور سید البشر ﷺ کے مزار عموں ”رومانوی انسانے“ ہوں یا سورہ یوسف کے الفاظ ”ولقد همت به وهم بها“۔ یا۔ ”هیت لك“ کا خود اختراعی مفہوم اُسے جب تک ”غیر“ کے لفظوں میں سامنے نہ لایا جائے دفاع کا جواز بنتا ہے نہ ہی جواب کا حق ادا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ بالائیں ہمہ میں بھی ایک انسان ہوں خامکاریاں اور قلم کی لغزشیں مجھ سے بھی سرزد ہو سکتی ہیں الفاظ نے اگر میرا ساتھ نہیں دیا اور موزوں متبادل نہ مل سکا تو اسے میری بد نیتی پر ”محمول“ نہ کیا جائے۔ مجھ سے میرا حق دفاع سلب نہ کیا جائے۔

(2)

برہان القرآن کے شائع ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ پیسٹر کی ”نظر کرم“ سے بعض صفحات آگے پیچھے اور بعض عبارتیں بے ربط ہو گئی ہیں تفصیل اس طرح ہے درست کیجئے۔۔۔۔۔ (i) صفحہ 38 ختم کر کے پھر صفحہ 41 کی ابتدائی دو سطریں پڑھ لیں سلسلہ جڑ جائے گا۔ (ii) صفحہ 59 ختم کر کے صفحہ 60 کی پانچویں تین سطر میں پہلے پڑھیں اور پھر اوپر کی 15 سطریں! عبارت مربوط ہو جائے گی۔ (iii) صفحہ 877 فالتو ہے چھوڑ دیں۔ نیز صفحہ 472 حاشیہ نمبر 1 سطر 1 میں لفظ ”شیطان“ نہیں ”انسان“ ہی ہے اور صفحہ 720 کا ایک عنوان داؤد ڈر گئے غلط ہے۔ صحیح ہے: حقیقت خرافات میں کھو گئی اسی طرح صفحہ 294 سطر 12 میں الف و لام استغراق غلط ہے صحیح الف لام ”جنس“ ہے۔

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)

## تفسیر میزان القرآن کے مباحث و مقالات کا تعارف

تفسیر ”منسوخ القرآن“ اور ”برحان القرآن“ کے بعد ایک ایسی ”تفسیر“ کی ضرورت تھی جو مختصر بھی ہو اور دفاعِ قرآن کے موضوع پر جامع بھی، چنانچہ اسی غرض کے لئے ”میزان القرآن“ کے عنوان سے ”تفسیری باب“ میں ایک نیا اضافہ کیا گیا ہے جس میں 528 آیات کو زیر بحث لایا گیا ہے اس طرح 528 عنوانات ہی مباحث کی پہچان بنائے گئے ہیں اور اس پر باب دوم کے مقالات ہستزاد مثلاً

:- اسمیں قصہ ہائے سلیمان میں جس وادی ”نمل“ اور اسکی ملکہ کا ذکر ہے اسکی تفصیل بیان کی گئی ہیں اور ان تفصیل کی عمارت عنوانات کے ”چالیس“ ستونوں پر استوار کی گئی ہے۔  
ضمناً ”ہدبد“۔ ”منطق الطیر“ اور ”دابة الارض“ کے بارے میں علمی ”تحقیقات“ کو نیز سامنے لایا گیا ہے خاص کر ”نملہ“ کی تئوین کے پیش نظر اس کے منصرف اور غیر منصرف ہونے کے رہانے جو ”شکوہ و شبہات“ پیدا کئے گئے تھے مشہور دیخی سکالر عصمت ابو سلیم کے توانا قلم سے ان کے دندان شکن جوابات فراہم کئے گئے ہیں جس سے حقیقت پردہ سکرین پر قصاں نظر آرہی ہے۔ پڑھئے اور غوامضِ قرآن پر سر دھنئے !!

:- ایک علمی بحث جس میں ”او تاد“ کے معنی اور مفہوم بلکہ ”شخصیت“ کے تعین کی وضاحت کے بعد جس فرعون کا یہ لقب تھا اسکی وادیت، ذوقِ تعمیر، مصر کے سب سے بڑے مقبرے، ”ہرم جیزہ“ کے عجائبات میں جگہ پائے اور ”تعمیراتی زاویہ“ سے ازال شاہکار ہونے کی تفصیل دی گئی ہیں !!

قوم ثمود :- اور ثمودیوں کے منفرد ذوقِ تعمیر کے نمونے مع تصاویر  
بابل کے معلق باغات :- ابرام، مٹیرا کے کندہ مکانات کے ساتھ بابل کے ”معلق“ باغات کا ذکر ضروری تھا۔ مع تصویر۔ نیز بابل کا تاریخی ”برج“ مع تصویر۔

اخدود :- والوں کا انسانیت سوز کارنامہ :- مرتدوں سے ”قتل“ کا ایک دلہوز اور جگر پاش تاریخی واقعہ جسے پڑھ کر روٹکنے کھڑے ہو جاتے اور انسانیت عرقِ افعال میں ڈوب جاتی ہے۔

عقیدے سے محبت کا ایک ازال مر قع !!

موسیٰ اور فرعون آمنے سامنے :- سامنے کے ٹپن سے تاحیات مجاہدانہ سرگزشت کی تفصیل۔ وہ حق کے ”سہیل“

تھے اور فرعون باطل کا مجموعہ۔ دونوں کی آویزش تاریخ انسانیت کا اُن مٹ شاہکار ہے۔

ذوالکفل۔ گو تم بدھ؟  
:- تاریخی زاویہ سے دونوں کے ادوار میں ”سینکڑوں“ برس کا فرق دکھلا کر واضح کیا گیا ہے کہ۔  
یہ ایک ہی ”شخصیت“ کے دوزخ نہیں ہو سکتے نیز ڈاکٹر محمد اسلم انصاری کے ”رشحات“ قلم

سے واضح کیا گیا ہے کہ حضرت بدھ کی تعلیمات میں ”توحید“ کا سراغ نہیں ملتا صرف گیان اور روان کا ہر سو جلوہ ہے جبکہ نبی اور توحید لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔

سید البشر سے شادی کے وقت ”خدیجہؓ“ کی عمر کیا تھی؟  
28 سال عمر تھی یا چالیس سال؟ تحقیق و تنقیح کا حیرت انگیز انکشاف!!

سید البشر سے شادی کے وقت ”عائشہؓ“ کی عمر کیا تھی؟  
9 سال عمر تھی یا 19 سال؟ تاریخ اور ”تحقیق“ کا فیصلہ کن تبصرہ!!

قرآن - پر تصوف اور روایات کی یلغار  
قرآن کی آفاقیت کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی سازش اور ستم یہ کہ ہر سازش پر ”نقد“ کا خول چڑھا دیا گیا تاکہ ”حقیقت“ مشتبہ ہو کر اپنی توانائی کھو بیٹھے اور سچائی کا پتہ نہ چلے۔

منسوخ القرآن اور روحان القرآن کی طرح میزان القرآن کا موضوع بھی قرآنیات ہی ہے جس کا ایک گونہ تعلق ”تضادات“ سے بھی ہے اور ”تضاد“ عموماً معانی اور مقابیم میں ڈھونڈ لیا جاتا۔ یا پیدا کر دیا جاتا ہے جسکے لئے زیادہ تر ”گردہ“ ہی ”اساس“ ہی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اس طرح ہوتا یہ ہے کہ ایک آیت کو زندہ رہنے کا حق دے کر ناحیہ کہا جاتا ہے اور دوسری کو ”عدم آباد“ پہنچا کر ”منسوخ“ کی گود میں دفن دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تضاد کی ایک اور صورت بھی ہے کہ جب دو آیتوں کا تضاد کھل کر سامنے آئے تو تطبیق پیدا کرنے کے دشوار گزار مرحلے میں داطل ہونے کی بجائے دونوں ہی کا گلا ”دبا“ دینے کا ”حکم“ ہے۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تضاد نہ صرف معانی اور ”مقاصد“ میں لازمی ہے گرامر، ادب اور ”لسانیات“ کے زاویہ سے بھی ”اسقام“ رہ گئے ہیں ان سے بھی تضاد فکری پر دان چڑھتا اور قرآن کی ہمہ جہت ”لاریت“ مشکوک ہو جاتی ہے۔

راقم الحروف نے جب سے ہوش کی آنکھ کھولی اور صنادیدِ علم و ادب کے تناظر میں منسوخات و تضادات اور قرآن میں ”فرض“ کردہ دیگر اسقام و عیوب کا جائزہ لینا شروع کیا تو مجھے قرآن ”بے عیب“۔ میں کہیں بھی علمی، ادبی، فکری اور ”نظری“ اسقام نظر نہیں آئے کیونکہ میرا ذہن صاف تھا اور میں نے پوری دیانتداری سے قرآن میں مفروضہ خامیوں اور کمیوں کا جائزہ لینا شروع کیا تھا لیکن ”بصد“ ”افسوس“ کہ مجھے فقہاء محدثین کی تلاش و ”جستجو“، ذہنی کاوشوں اور استدلالات کا صحیح مآخذ معلوم نہ ہو سکا۔ اور جہاں تک فتویٰ اور اہتمام امت کا تعلق ہے تو دنیا میں سب سے ”لوگس“ اور کمزور یہی دو مآخذ ہی تصور کئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور تعجب ہے کہ جس ”شخصیت“ کو ”اختیار تمیزی“ سے نوازا گیا ہے یعنی قافلہ ”محریت“ کے

[illegible]

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں فقہی اور تقلیدی اسالیب سے ایمان و ایقان کے تقاضے ”مختلف“ ہو جاتے اور ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ان حضرات کے ”ملفوظات“ کا فنی، علمی، نفسیاتی اور لسانی زاویوں سے جائزہ لیں اور اعتبار ”محض“ سے کام نہ لیں کیونکہ ان لوگوں نے وحی قرآن کو ”ٹارگٹ“ بنا کر اپنا اعتماد خود ہی مجروح کیا ہے چنانچہ اسی ”جذبہ محرکہ“ نے مجھ جیسے ناتواں سے ”منسوخ القرآن“ تحریر کرائی اور اسی ”اندرونی اضطراب“ نے ”بوہان القرآن“ کے پیکر میں دفاع قرآن پر آمادہ کیا اور یہی وہ اندرونی کشمکش تھی جس نے دفاع کے تقاضوں کو مزید آگے بڑھانے کیلئے ”میزان القرآن“ کے عنوان سے تازہ قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اور یہ تو جیہات القرآن میری علمی اور فکری کاوش کا آخری ثمرہ ہیں ان میں جس غازہ افتراء و اکاذیب سے چہرہ قرآن کو بے نور بنانے کی سعی نامسمود کی گئی ہے اس کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ اس ”تصنیف“ کا لب و لہجہ بھی ”دفاعی“ ہے کہ ”جارجیت“ میرا شیوہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں ایک ایسی ”مختصر“ تحریر کے ذریعے ”وحی الہی“ کے ان مقامات کی ”تشریح“ کرنا چاہتا ہوں جو فنی اور ”نظریاتی“ زاویوں سے قابل ”تأمل“ ٹھہرائے گئے تھے۔ اس میں چند ایک ”مقامات“ کے سوا حوالہ جات سے بہت ہی کم ”تعرض“ کیا گیا ہے کیونکہ اسے میں ایسے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہوں جن کا مبلغ علم ”حوالہ جات“ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا خاص طور پر میں چاہتا ہوں کہ خاندان قاسمی کے چشم و چراغ عزیزِ آصف علی انصاری بن علامہ ڈاکٹر محمد اسلم انصاری (پی. ایچ. ڈی) کے ہاتھ میں ایسا ”مختصر“ قرآنی مجموعہ ہو جسے وہ آسانی سے ”سمجھا“ سکیں چنانچہ رمضان المبارک (مطابق فروری) 1996ء کے دوسرے ہفتے اسے لکھنا شروع کیا اور پانچ ہفتے کے دورانے میں یہ فکری ہیکل تیار ہو گیا۔ اب نہ صرف عزیزِ آصف علی اس سے استفادہ







اور ”کیسے“ کی ”بات“ کی۔

(تاریخ الفلسفہ فی الاسلام مصنفہ ”دی یور“ ترجمہ عربی ڈاکٹر عبدالہادی طبع قاہرہ صفحہ 48)

جلال الدین سیوطی (1505م) جو بڑے جامع التصانیف تھے وہ بھی یہی رائے رکھتے اور خطابی (998م) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ابو العباس احمد بن سرتح (918م) نے لکن اہل ہریرۃ (956م) کو بتلایا کہ ایک سائل نے بعض علماء دریافت کیا کہ

”اللہ سبحانہ نے ایک مقام پر ”قسم“ نہ کھانے کی بات کی ہے۔ لاقسم بهذا البلد----- پھر خود ہی بلدِ امین کی قسم کھا کر اپنے ضابطے کے خلاف بھی کیا ہے۔ وهذا البلد الامین؟----- اسکے جواب میں علمائے فرمایا۔----- یہاں کوئی بات بھی قاعدے کے خلاف نہیں ہوئی۔ یہ قرآن جن حالات میں نازل ہوا تھا انہیں کسی حال میں بھی ”نار مل“ نہیں کہا جاسکتا ”لسانی شناوروں“ کا جم غفیر ”موجود“ تھا۔ ”فصاحت“ و بلاغت لوگوں کی ”گھٹی“ میں شامل تھی مخالفتوں کے جھکڑ زوروں پر تھے وہ ہر لمحہ اسی ”ٹوہ“ میں لگے رہتے تھے کہ انہیں وحی قرآن میں کوئی لسانی ”سقم“، کوئی مفہوم و معانی کا ”تضاد“ نظر آئے اور وہ اسے لے کر اچھالیں اور اپنے ”مخصوص“ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا ڈالیں۔ لیکن ”مشاہدہ“ کرتا ہے کہ مخالفین قرآن نے اپنے مجازات، استعمالات، اشارات و کنایات بلکہ ”عرب“ کے تمام ”اصناف سخن“ کے خلاف کوئی ایسی بات ”محسوس“ نہیں کی جسے لے کر یہ لوگ طنز و ”تشنیع“ کی بات کرتے۔ لہذا انہوں نے لاقسم بهذا البلد----- اور----- اور----- وهذا البلد لامین----- میں کوئی فنی ”خرابی“، لسانی ”منافات“ اور استعمال کی ”کجی“ نہ پا کر اعتراض اور طنز کے دائرے میں شامل ہی نہیں کیا۔

(مفہوم از ”الاتقان“ طبع عیسیٰ حلبی قاہرہ جلد 2/30)

یہ تینوں اقتباسات واضح کرتے ہیں کہ ”مشرکین عرب“ جو قادر الکلام بھی تھے اور اسالیب زبان سے باخبر بھی۔ انہیں اگر آیات الہی میں تضاد یا شبہ تضاد کی ”اونگٹھ سونگٹھ“ مل جاتی تو اسی پر ہی رک جاتے کہ انہیں اس سے بڑھ کر وجہ اعتراض نہ مل سکتی تھی لیکن مخالفت کے شدید اوضاع رکھنے کے باوصف انہیں الفاظ کے مزاج اور طریق اداسے کہیں بھی تضاد کی ”نو“ ”باس“ ”محسوس“ نہیں ہوئی لہذا اس زاویہ سے وہ حملہ آور ہی نہیں ہوئے انہیں اگر اعتراض تھا تو اہداف و مقاصد پر تھا اور اہداف و مقاصد ہی میں تضاد کے متلاشی تھے۔ یہ نہ صرف راقم الحروف کی ناقص رائے ہے دیگر راہروان ادب قرآن بھی یہی رائے اور عقیدہ رکھتے تھے۔

تاریخ کے طالب علم غویٰ جانتے ہیں کہ نظریہ ”تضاد“ فی القرآن، عہد رسولؐ، عہد صحابہؓ اور عہد تابعین تک متعارف نہیں ہوا تھا۔ اسکے بانی دوبر عباسیہ کے مشہور

**عقیدہ تضاد کب سے متعارف ہوا؟**

حنن طراز احمد بن عیسیٰ بن راوندی (910م) تھے اس نے ”قرآن محکم“ میں تضادات کے حوالے سے ”شکوہ“ و شبہات اور طنز و ”تشنیع“ کا باب کھولا۔ اسکے بعد مشہور طبیب ابو زکریا رازی (923م) نے ابن راوندی کے مشن کو آگے بڑھایا بلکہ اسکی حمایت میں نت نئے پیرائے اختراع کئے ادھر یہ کچھ ہو رہا تھا ادھر سر زمین اندلس کے یوسف بن اسماعیل عرف ابن الغریلہ (1066م) نے سن 459 ہجری سے پہلے اپنی شہرہ آفاق تحریر ”دامغ القرآن“ روشناس کرائی اس میں تضاد فی القرآن کا زہر ہر زاویہ سے گھول دیا گیا تھا۔ لیکن بارے غنیمت ہے کہ ان کے ہم عصر امام ابو محمد علی بن حزم ظاہری (1064م) نے ترکی بہ ترکی جواب لکھ کر ”یسودیت“ کے دانت کھٹے کئے۔ اسی طرح جاحظ (868م) نے بھی ملاحظہ اور ”منہرفین“ کے رد میں قلم کی جولانیاں دکھلائیں اور ”المختار فی الرد علی النصاری“ کی صورت میں اپنے فکری نتائج کو ہمارے سامنے رکھا ہے۔

لیکن، باوصفے کہ دانشوران ادب قرآن نے ہر دور میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو دفاع قرآن میں صرف کیا ہمارے ”حدیثی دانشوروں“ نے ایسا منفی رویہ اختیار کر لیا کہ ”لا شعوری“ طور پر حریفان قرآن ہی کی تائید ہوتی رہی۔۔۔۔۔ اور لغت، ادب، گرائمر اور استعمالات عرب کا سہارا لے کر طالبان قرآن جو کچھ کرتے رہے ان کی کارکردگی پر پانی پھر تاربا چنانچہ ان ہی دوستوں کے منفی ”ردیہ“ کو ”سنگ میل“ بنا کر جدید یورپ کے ”مستشرقین“ بھی قرآن پر قرآن ہی سے ضربیں لگانے کی راہ نکالتے رہے چنانچہ متاخرین سے دی نور۔۔۔۔۔ میکڈونالڈ۔۔۔۔۔ ٹکسن۔۔۔۔۔ شاخت۔۔۔۔۔ اور ولوزن نے اپنے اپنے انداز میں سینہ قرآن پر ضربیں لگائیں اور جو کسر رہ گئی تھی وہ ادبیات عرب کے شناور، گولڈزیئر (1921م) نے پوری کر دی اسے مزعومہ تضادات کے خوردبینی ذرات کو ”اتلارج“ کرنے میں بڑی دلسوزی سے کام لیا ہے۔ لیکن اس اہتمام دسر دردی کے باوصف ماضی کے حریفان قرآن ہوں یا زمانہ مابعد میں طنز و ”تشنیع“ کے ”خلاقین“۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ۔۔۔۔۔ ”مشرکین عرب“ کو بھی تضاد کے زاویہ سے کوئی اعتراض تھا؟ یعنی کہ عہد رسول و صحابہؓ میں جبکہ ”تزاحم“ و کشاکش کا ماحول زوروں پر تھا نظریہ تضاد ”درجہ“ نفی میں تھا اسے بعد کے ”غیر مسلموں“ یا ان کے کلمہ کار نادان ”مسلمانوں“ نے ”تخلیق“ کیا اور ”علمائے حدیث“ نے لپک کر لے لیا کیونکہ ان کے زاویہ فکر سے اختلاف اور تضاد کو تسلیم کئے بغیر ”اختلاف قرأت“۔۔۔۔۔ نسخ و منسوخ اور دیگر تضادات لفظی و معنوی کا ”طلسمی“ ”ہیکل“ تعمیر نہ ہو سکتا تھا چنانچہ ان کی کاوشیں رنگ لائیں اور انہوں نے تضادات قرآنی کا عہد نبویؐ سے رشتہ جوڑ کر دنیا کو بار کر لیا کہ تضاد اور قرآن ایک ہی ”حقیقت“ کے ”دورخ“ ہیں ”مستشرقین“ اور حریفان قرآن جو کچھ کہتے ہیں اسکی جزیں گہری ہیں چنانچہ احمد بن حنبل (855) نسائی (915) اور بخاری (870م) وغیرہ حماد بن زید اور عمرو بن شعیب کے ذریعہ ایسی بھی روایات سامنے لائے ہیں جو تضادات پر بحث و ”تحقیص“ کو دوبار نبوی ﷺ سے ”مربوط“ کرتی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پوری طرح ذہنی آزمائش کے باوصف گروہ محدثین کوئی ایسی روایت پیش نہ کر سکے جو تضاد کی واضح نشاندہی کر سکتی ہو۔ اسکے برعکس عمرو بن شعیب کی ایک دوسری روایت ہے جسے امام احمد بن حنبل نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے مہلا یا قوم بهذا اهلکت الامم مثلکم باختلافہم علی انبیائہم و ضربہم الکتاب ببعض وان القرآن لم یزل یکذب بعضہ ببعض بل

بعضه ببعضه بل يصدق بعضه بعضا

رک جاؤ اے قوم۔۔۔۔۔ کہ پہلے انبیاء کی باتوں میں اختلافی پہلو نکالنے اور کتاب الہی پر کتاب الہی کے ذریعہ ”ضربیں“ لگانے کی وجہ سے امتیں روبہ زوال ہوئیں پھر کبھی نہ ابھر سکیں۔۔۔۔۔ یاد رکھو۔۔۔۔۔ قرآن اسلئے نازل نہیں ہوا کہ اسکا ایک حصہ دوسرے حصے کی تکذیب کرے یا ایک مفہوم دوسرے مفہوم کی نفی کر ڈالے۔ اسکا تو ہر حصہ دوسرے کی تصدیق و توثیق کو نمایاں کرتا ہے۔ (خوالہ ”البيان والتعريف“ مصنفہ شیخ ابوالہیثم بن حمزہ الحنفی طبع مصر جلد 1/272)

اس روایت کی بابت شیخ حنفی وضاحت فرماتے ہیں کہ بخاری و مسلم کے متفقہ موقف کے مطابق ہے۔

**تضاد کی فنی تعریف** امام اہل دانش قاضی عبدالجبار البہدانی (1025 م) لکھتے ہیں۔ ان المتناقض من الکلام وهو ان يكون احد الکلامین يتضمن نفی ما یثبتہ الآخر. او اثبات ما ینفیه او. عندما تناولہ

الآخر او۔۔۔۔۔ ما یجری مجری الضد

کلام میں تضاد اور تناقض کی صورت یہ ہے کہ ان میں سے ایک کلام دوسرے کلام کی ”نفی“ یا اثبات پر مشتمل ہو یا۔۔۔۔۔ یہ کہ نفی کے برعکس اثبات کا غماز ہو یا۔۔۔۔۔ یہ کہ ہر کلام اپنی ضد کا محتمل ہو یا۔۔۔۔۔ ضد کی اساس پر مستعمل ہو۔ (المغنی فی ابواب التوحید والعدل طبع

وزارة الثقافة والعدل مصر 1958 و 1964 جلد 16/387)

اس سے واضح الفاظ میں مشہور ریسرچ سکاالر ڈاکٹر ممدی فضل اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ تناقض (و تضاد) کی فنی تعریف یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ کسی چیز کے بارے میں ایک ہی وقت میں دو ایسے وصف بیان کئے جائیں جو مفہوم و معانی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی نفی کرنے والے ہوں مثلاً کسی چیز کے بارے میں کہنا کہ وہ موجود ہے، وہ معدوم ہے یا یہ۔۔۔۔۔ کہ نفی اور اثبات کو ایک ہی مقام پر جمع کر دیا جائے (جو کہ ناممکن ہے)۔۔۔۔۔ (المدخل الی علوم المنطق 89 و 90)

جبکہ کسی چیز کا ایک وقت کا لایا چٹا ہونا۔۔۔۔۔ یا ایک ہی وقت میں موجود و معدوم یا۔۔۔۔۔ انہیں ایک ساتھ نفی اور اثبات کا جمع ہونا ”ممکنات“ میں سے نہیں ہے کہ اس طرح دنیا کے ہر قانون میں تصادم کے امکان کو تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ دور جدید کے ماہرین قانون اس اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں کہ ”قانون“ میں ”عدم التناقض“ اور ہم آہنگی بیاد کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کے بغیر ”انصاف“ کو ”کشید“ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں (مارچ 96 کے آخر میں) پاکستان کی سپریم کورٹ نے عدالتی انصاف کے ”حصول“ میں ”اصل“ خرابی کی نشاندہی کرتے ہوئے حکومت پاکستان کو حکم دیا تھا کہ ایڈہاک رسٹم کو ختم اور بہت سے دیگر امور میں واقع تضادات کا ازالہ کیا جائے۔ جس سے رائج عدالتی ماحول میں ایک طرح کا بھونچال آیا اور بہت سی باتوں میں تشریحات کا ”لاوا“ اہل پڑا اس سے عدالتوں کی آزادی کا احساس تو ضرور

آئینہ ایک فریق جو ماضی میں عدالتوں کی زبان گدی سے کھینچتا رہا اسی نے اس اصولی فیصلے کو ”عملی سیاست“ کا حصہ بنا کر حکومت وقت کی تبدیلی کا ایشو بنا ڈالا حالانکہ مسئلہ ناخن تدبیر سے حل کرنے کا تھا غلط منہج پر ڈال کر حکومت کو بے بس و درماندہ کر کے میدان سے بھگانے کا نہیں تھا خاص کر یہ کہ غیر ہم آہنگیاں جب خود ان ہی کی پیدا کردہ ہوں اور پچاس سالوں سے ”لا قانونیت“ کو قانون کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہو وہاں فریق مقتدر کو دیوچ لینے کا جواز پیدا کرنا بڑی ستم ظریفی ہے کم از کم ایسے نازک اور حساس مسائل میں ”قومی“ ایک جہتی کو نظر انداز کرنا ”بے حمیت“ کی انتہا ہے۔ کئے کا مقصد یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ قانون میں ہم آہنگی ”سیاست جدیدہ“ کا تسلیم شدہ اصول ہے اسکے بغیر خود عدالت بھی ”زراکشش“ کی طرح کئی مومنہ اور کئی ہاتھوں کا پیکر بن کر اپنے ہی وجود پر ”مار“ کرتی رہے گی۔ اب اگر حکومت وقت ہوشمندی سے کام لے کر سپریم کورٹ کے فیصلہ پر ”عمل“ نہ کرتی تو کورٹ نے جس غلطی میں فیصلہ کیا تھا تمام ادارے ”ٹوٹ پھوٹ“ کر رہ جاتے پس جب ایک عدالتی امور میں تصادم اور ”ناہم آہنگی“ برداشت نہیں ہو سکتی تو کیا وجہ ہے کہ اسی تصادم و ناہم آہنگی کو وحی کے نازک اور حساس تقاضوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے قرآن محکم میں رد اور لازمی ٹھہر لیا جائے؟

ناظرین محترم :- ذیل میں دو چار اُن کتابوں کی نشاندہی کر رہا ہوں جو ”میزان القرآن“ کے لکھتے وقت زیر مطالعہ رہیں مثلاً

(i)۔ القرآن الکریم

(ii)۔ مجازات القرآن۔ امام شریف الرضی (1015 م)

(iii)۔ مسائل الرازی۔ واجوبتھا عن غرائب آی القرآن۔ علامہ ابو بکر رازی (1268 م)

(iv)۔ تاویل مشکل القرآن امام ابن قتیبہ (884 م) اور ”مشابہ القرآن“۔ قاضی عبدالجبار (1025 م) ابن احمد

المعزلی طبع القاہرہ۔

سب سے پہلے اساسی عنوان ہوگا اسکے بعد متعلقہ آیت مع ترجمہ سامنے لائی جائے گی۔ ترجمہ رواجی بھی طریق تفہیم ہو سکتا ہے اور صرف مفہوم بردار بھی۔ اصل حقیقت وہی ہوگی جو ”قول فیصل“ میں بیان ہوگی۔ دوسرا ذیلی عنوان ہوگا ”وجہ اعتراض“ اس میں آیہ زیر بحث پر اعتراض کی نوعیت یا عدم اطمینان کی وجہ بیان ہوگی۔ اور چوتھا غلطی عنوان ہوگا ”قول فیصل“ جس میں متعلقہ آیت کی وضاحت اور اسکی ضوع میں تشریح ہوگی۔۔۔۔۔ اسکے علاوہ اگر کہیں کوئی اہم علمی نکتہ سامنے آئے گا تو ماخذ کی وضاحت ساتھ ہی ہوگی۔

4-4-1996 ملتان

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)

کتاب اول

50

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)

## رحمن۔ اور۔ رحيم۔ میں فرق

1

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ۔ رحمن اور رحيم کے مبارک نام سے

میں کہا جاتا ہے کہ عرب جب کسی کی مدح و ثنا کرتے تو وصف کا آغاز ادنیٰ سے کر کے اعلیٰ تک پہنچتے یعنی ”خوب“ ہے پہلے کہتے اور ”خوب تر“ بعد میں اس کے برعکس یہاں الرحمن جو کہ صرف اللہ کی صفت ہے اور اعلیٰ صفت ہے اسے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور الرحيم جو کہ اللہ اور انسان کی مشترکہ صفت ہے اسے بعد میں لایا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

الرحمن۔ اگرچہ جدید تحقیقات کی رو سے عبرانی لفظ ہے تاہم بحث کی خاطر عرب و انشوروں جوہری (1003 م) وغیرہ کے مطابق۔ الرحمن۔ اور۔ الرحيم کا مادہ ”رحمة“ ہے اور ایک ہی مفہوم و معنی رکھتے ہیں لہذا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک دوسرے کے ”متبادل“ کے طور پر استعمال ہوں تاہم الرحمن چونکہ اللہ کی خاص صفت ہے ادھر اللہ بھی ذاتی نام ہے لہذا ذاتی صفات کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ذکر کر دینا واضح کر دیتا ہے کہ یہاں صفت کے ”مدارج“ سے ”تعرض“ نہیں کیا گیا۔

☆

بقرہ

## قرآن شک سے پاک ہے

2

ذالك الكتاب لا ريب فيه

یہ وہ کتاب ہے جس میں کہ ریب ہے نہ تشکیک راہ پا سکتی ہے (بقرہ، 2)

یہ ہے کہ یہ بات مشاہدے کے خلاف ہے یہاں لاکھوں لوگ ہیں جو شک سے کام لے رہے ہیں بلکہ وسیع تناظر میں گروہی اور فقہی ”اساس“ پر شک کا سراغ لگا لیا گیا ہے لیکن اسکا تذکرہ دلخراش

وجہ اعتراض

بھی ہے اور ”شر مناک“ بھی تاہم جو اہل قرآن نہیں ان کے شک کی گواہی خود قرآن بھی دیتا ہے۔۔۔۔۔ (بقرہ، 23)

یہاں ”لا“ کا حرف اگرچہ ”نفی“ کے لئے ہے لیکن ”نہی“ کا استعارہ بن کر آیا ہے۔ اس طرح ”لا ریب“ کے معنی ہوں گے۔ لا تو تابوا۔ اسمیں شک نہ کرو۔

قول فیصل

☆



### قرآن کی ہدایت عام، نہیں؟

3

#### ہدی للمتقین

(بقرہ، 2)

متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ۔ ”متقی“ تو پہلے ہی سے ہدایت یافتہ ہیں ان کے لئے ہدایت کو خاص کرنا تحصیل حاصل ہے۔

#### قول فیصل

للمتقین،۔ میں لام استغراق کا ہے جو گرامر کی ”ضوء“ میں سب لوگوں کو حاوی ہے اسمیں ہدایت یافتہ اور غیر ”ہدایت یافتہ“ سب ”برابر“ ہیں ”متقین“ کو صرف بطور استعارہ ذکر فرمایا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ہدایت پذیری کی صلاحیت رکھتے ہیں قرآن ان ہی کے لئے جذب و کشش کا زیادہ موجب ہے۔



### اللہ کی عادات حسن و خوبی کا مرقع ہیں لیکن

4

#### اللہ يستهزئ بهم

(بقرہ، 15)

اللہ بھی ان سے مذاق کرتا ہے۔

یہ ہے کہ استہزاء ”تہج عادت“ ہے جو اللہ کی شانِ کبریائی کے منافی ہے۔

#### وجہ اعتراض

یہاں استہزاء ”جوہلی“ عمل سے تعبیر ہے اسے فنِ معانی اور بدیع کی رو سے ”صنعتِ مشاکلت“

#### قول فیصل

کہا جاتا ہے یعنی الفاظ تو ہم شکل ہوں مگر نسبتوں کے اختلاف سے معانی مختلف ہو جائیں۔ یعنی

”برائی“ کا ذکر اسی مادے اور لفظ میں کرنا جو استعمال ہوا ہے اس طرح پہلی آیت (14) میں واقع استہزاء کے معنی ٹھٹھا کرنے اور مذاق اڑانے کے ہوں گے اور دوسری آیت (15) میں مذاق اڑانے کی پاداش میں سرزنش یا گوشائی کرنے کے ہوں گے یعنی اللہ انہیں ”گستاخی“ کی سزا دے گا۔



### بارش کہاں کہاں سے؟

5



(بقرہ، 19)

یا اس بارش کی مانند ہے جو آسمان سے برس رہی ہے۔

### وجه اعتراض

## قول فیصل

☆

## 6

(بقرة 22)

اللہ کے ساتھ کسی کو ہم سر نہ بناؤ۔

### وجه اعتراض

## قول فیصل

☆

## 7

$$\left( \frac{1}{\sqrt{2}} \begin{pmatrix} 1 & i \\ 1 & -i \end{pmatrix} \right)$$

زمین کو معمور و فساد نہ ہناؤ۔

### وجه اعتراض

## قول فیصل

☆

## اللہ سے جسمانی ملاقات؟

8

### الذین یظنون انہم ملقوا ربہم

(بقرہ، 46) جن کا گمان ہے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں صبر و صلوة ان پر بھاری نہیں۔

یہ ہے کہ۔ یہاں مومنوں کی خوشدلانہ خواہش کو ”گمان“ سے تعبیر کیا ہے۔ نیز ملاقات کی

**وجہ اعتراض**

اضافت رب کریم کی طرف کی گئی ہے جب کہ ”ملاقات“ کیلئے دیکھے اور مس کئے جانے والے وجود کی ضرورت ہے۔ اور ”وجودی“ ملاقات کا عقیدہ رکھنا ”تشبیہ“ کا متقاضی اور ”تنزیہ“ کے سراسر ”منافی“ ہے۔

**قول فیصل**

ظن۔ کالفظ حروف ”اضداد“ میں سے ہے جسکے معنی گمان کے بھی ہیں اور یقین و علم کے بھی اس

بناء پر معنی ہوں گے ان کو یقین اور علم ہے کہ اپنے رب سے ملیں گے۔ اور ملاقات کے ایک معنی ”سامنا“ کرنے کیلئے بھی ہیں جس سے حسی ملاقات یا ”لمس“ کی متقاضی ملاقات مقصود نہیں ہے، مثلاً ایک نابینا، دوسرے کی آواز سن کر جان لیتا ہے کہ یہ فلاں کی آواز ہے۔ اب ایک گونہ بہ بھی ”ملاقات“ ہے مگر مشاہدے میں نہ آنے والی۔



## ابتلا۔ یا۔ احسان؟

9

### وفی ذالکم بلاء من ربکم عظیم

(بقرہ، 49) اور ان امور میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا امتلا تھا۔

میں کہا جاتا ہے کہ عربی میں ”بلاء“ کا لفظ مصیبت یا، کسی ناگوار صورتِ حال کے پیش آنے کو کہا

**وجہ اعتراض**

جاتا ہے جبکہ یہاں مقصود فرعون کے مظالم سے نجات دلانے پر احسان جتانے کا ہے۔

**قول فیصل**

بلاء۔ لغت میں ”احسان“ کو بھی کہتے ہیں۔ سید رضی نے اسی ہی مفہوم کو ترجیح دی ہے۔



## خدا کا دیدار

10

### واذقلتم یٰموسیٰ لن نؤمن لک حتیٰ نرے اللہ جہرۃ

(بقرہ، 55) جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم جب تک خدا کو دیکھ نہ پاؤں ایمان لانے کے نہیں۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ اللہ کا ان آنکھوں سے دیکھنا محال ہے جبکہ وہ نہ تصور میں آسکتا ہے نہ کوئی نگاہ اسکا احاطہ کر سکتی ہے کہ اسکا جسی وجود ہی نہیں ہے۔ بالیں ہمہ مومن ان کے اعتراض میں کچھ بھی نہ کہہ پائے۔

**قول فیصل** دیدارِ خدا یہودیوں کا مطالبہ تھا اور کسی کے مطالبے پر پابندی نہیں ہے۔ مسلمان، نہ تو اللہ کی جسمیت کے قائل ہیں۔ نہ حال اور ”مستقبل“ میں اس کے دیدار کے ”منتظر“۔ یہ اشعریوں کا عقیدہ ہے۔ تاہم وہ بھی دیدارِ باری کی ”کیفیت“ کی وضاحت سے قاصر ہیں البتہ فرقہ ”مشبہ“ اور ”کرامیہ“ ان آنکھوں سے دیکھنے کے قائل ہیں کہ وہ خدا کیلئے دیکھے جانے والے جسم کے بھی قائل ہیں اور اسکے لئے جنت اور مکانیت کے بھی۔



## 11 خطاؤں کی معافی ”عدل“ کے منافی ہے

وقولوا حطة نغفر لكم خطاياكم وسنزيد المحسنين

اور کہو ہماری خطاؤں کو معاف ہوں تو ہم تمہاری خطاؤں بھی معاف کر دیں گے اور احسان کیشوں کے صلے میں اضافہ بھی۔ (بقرہ، 58)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ صرف ”حطہ“ کا لفظ کہنے سے خطاؤں کا معاف ہو جانا صریح جانبداری ہے۔

**قول فیصل** گناہ کی سزا سے مقصود گناہ گار کی اصلاح ہوتی ہے لیکن اگر یہ مقصد سزا دینے بغیر ہی حاصل ہو جائے تو سزا کا اجراء غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک سائیکولوجیکل مسئلہ ہے کہ کبھی کبھار گناہ معاف کر دینا گناہ چھڑانے کا ذریعہ بن جاتا ہے آخر انسان اپنے موی پتھوں کو بھی اکثر معاف کر دیا کرتا ہے تاہم یہ گناہ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ ہر گناہ قابلِ عفو نہیں ہو سکتا۔ ☆

## 12 پتھر کیسے پھٹ پڑتے ہیں؟

وان من الحجارة لما ينفجر منه الانهار وان منها لما يشقق فيخرج

منه الماء

پتھروں میں وہ بھی ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں اور ان سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور وہ بھی ہیں جن سے

پانی بچنے لگتا ہے۔

(بقرہ، 74)

میں کہا جاتا ہے کہ آیت کے دونوں حصوں میں ایک ہی بات کو دہرایا گیا ہے جس کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ ”تغیر“ ہو خواہ ”تشقیق“ معنی ایک ہے اور ایک ہی فقرے سے کام چل سکتا تھا۔

**وجہ اعتراض**

کلام میں تنوع اور عبارت میں ”حسن و آرائش“ پیدا کرنے کیلئے ادبیات اقوام کے مشاوری اس طرح کے اصناف ”نخن“ سے کام لیتے رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں اگر اس وجہ کو ناکافی سمجھا جائے تب بھی ”تغیر“

**قول فیصل**

پانی کے اس بہہ چلنے کو کہا جاتا ہے جو زور سے پھوٹ پڑے اور ”تشقیق“ صرف بہہ چلنے کو کہا جاتا ہے۔



## جنت کے لئے تمہارا ایمان کافی ہے؟

13

والذین آمنوا و عملوا الصالحات اولئک اصحاب الجنة هم فیہا خالدون

جو ایمان لائے اور عمل صالح بھی کئے وہی جنت والے ہیں جو ہمیشہ کے لئے اسیں رہنے والے ہوں گے۔ (بقرہ، 82)

یہ ہے کہ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جنت اس ایمان کے ناطے سے ملے گی جسکے ساتھ عمل صالح ردیف ہو۔ صرف ”قولی“ اعتراف دخول جنت کا موجب نہیں بن سکتا جس سے اہل سنت کا

**وجہ اعتراض**

عقیدہ مجروح ہو جاتا ہے۔

اہل سنت کے ”نہکتہ“ احساس کا احترام ہے لیکن ان کی خاطر قرآن حکیم کی وضاحت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ کا وعدہ جنت برحق ہے۔ رہی یہ بات کہ اہل سنت اشعریوں کے نزدیک اللہ

**قول فیصل**

اپنی وعید کے خلاف کر سکتا ہے اسی طرح وعدہ خلائی پر بھی وہ قادر ہے یعنی ”پاسا بن عمل“ کو تنہا چھوڑ کر صرف ایمان کی اساس پر بھی جنت کا حصول آسان بنا سکتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ بات انتہائی ”عکین“ اور قرآنی تصریحات کے صریحاً خلاف ہے یہاں صلہ کا معیار ”عمل“ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنی دانشور اور عقلیت پسند اشعریوں کے ایمان بلا عمل کے فلسفہ کو تسلیم نہیں کرتے وہ اللہ کے وعدے اور وعید کو توڑنا اللہ کی عادت کے خلاف سمجھتے ہیں۔



## اپنے ہاتھوں سے ”لکھنے“ کا مطلب

14

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیہم

(بقرہ، 79)

اپنے ہاتھوں سے (خلاف حقیقت) لکھنے والوں پر افسوس ہے۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں ایدیہم۔ کا لفظ غیر ضروری ہے، کہ کتابت ہوتی ہی باتھوں سے ہے۔

**قول فیصل** قرآن محکم میں غیر ضروری کوئی چیز نہیں ہوتی و ما ہو بالہزل (طارق، 14) یہاں، ”کتابت“ کے ساتھ ”یدیہم“ کا لفظ انسان کے ذاتی لکھ لینے کی وضاحت لے کر نازل ہوا ہے، اگر کوئی شخص کسی منشی، عرضی نویس یا کسی سے کچھ ڈکٹیٹ کرانے والا ہو تو وہاں ”یدیہم“ کی اضافت نہیں ہوتی۔



## تولے۔ اور ”اعراض“ میں فرق

15

ثم توليتم الاقليلا منكم وانتم معرضون

اوپر جو عہد تم سے لئے گئے ان سے تم منہ پھیر بیٹھ گئے ہاں تھوڑے سے نہیں (تاہم یہ کام بھی نے کر ڈالا) (قرہ، 83)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ تولے۔ اور اعراض۔ ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں دونوں کا ایک ساتھ استعمال، کیا مصلحت رکھتا ہے؟

**قول فیصل** تولے۔۔۔۔۔ عہد و پیمان سے پھر جانے اور ”اعراض“ فکر و نظر سے منہ موڑنے کو کہا جاتا ہے۔



## جوئے زندگی رواں رہے گی

16

ولتجدنهم احرص الناس على حياة ومن الذين اشركوا

انہیں تم زندگی کا سب سے زیادہ پیار کرنے والا پاؤ گے (جبکہ یہ) مشرکین ہزار برس زندہ رہنے کی خواہش (تک) رکھتے ہیں۔ (قرہ، 96)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ زندگی ہر ایک کو پیاری ہے کوئی نہیں چاہتا کہ اسکی عمر کم ہو ایسے میں صرف مشرکین کی تخصیص کیوں؟

**قول فیصل** وہ اسلئے کہ ہمارے نزدیک ”حیاتِ محض“ کا ”دورانیہ“ مختصر نہیں ہوتا ”جوئے زندگی“ موجودہ زندگی کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح رواں رہے گی جبکہ ”مشرک“ لوگ ”موت“ سے مراد ”زندگی“



## سلیمان کے دربار کا نامور افسون گر۔ عفریت

17

وما كفر سليمان ولكن الشياطين كفروا يعلمون الناس السحر

(جادو کفر ہے) اور سلیمان نے یہ کفر نہیں کیا لیکن شیطان صفت انسانوں نے اس کا ارتکاب کیا  
(بقرہ، 102)

یہ ہے کہ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نہ ساحر تھے نہ سحر کے زور پر اثران  
**وجہ اعتراض** کھٹولے اڑاتے اور فضائی فاصلے ”طے“ کرتے تھے لیکن دوسرے مقام پر یہ وضاحت بھی موجود  
ہے کہ آپ ساحروں اور شیطان قسم کے انسانوں کی غیر معمولی ”قوت نفسی“ سے استفادہ بھی کرتے تھے۔ یہ کہ تنخواہ دار  
جادو گروں کے توسط سے ”مملکت“ اور نبوت کا کاروبار بھی چلا لیتے تھے۔ سورہ ”نمل“ میں ہے قال عفریت من الجن انا  
اتيك به قبل ان تقوم من مقامك

سلیمان نے جب کہا کون ہے جو ملکہ سباء کا تخت لا کر مجھے پیش کر دے؟ اسپر جنوں میں سے  
عفریت نے کہا یہ کام میرا ہے اور جتنی دیر میں آپ اپنی جگہ پر کھڑے ہیں میں لا کر پیش کر سکتا  
(نمل، 39)

ہوں۔

ہمارے روشن فکر لام۔ ابو حنیفہ (767م) جادو، شعبہ اور ”افسون گری“ کو نہیں مانتے اور فرماتے

**قول فیصل** تھے کہ انه خدع لا اصل له ولا حقیقة سحر ”فریب“ ہی کا ایک گر ہے جسکی حقیقت ہے نہ  
اصلیت (تفسیر فتح البیان طبع مصر 132/1)

اب بات آجاتی ہے کہ پھر یہ عفریت کی ”جادو گری“ کا اعتراف کیوں کیا گیا؟ تو جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ  
عفریت کسی ”مسئ“ سے تعبیر نہیں ہے ہر ”خبیث“ اور شریر کو عفریت کہا جاتا ہے راغب لکھتے ہیں۔ هو العارم الخبیث  
و يستعار ذالك للانسان استعارة الشيطان له

ہر بد اخلاق، تند خو، طرار اور بد فطرت انسان کو عفریت کہا جاتا ہے بلکہ جب کسی انسان کی خباثت  
اور شیطنت کا تذکرہ ہوتا ہے ”عفریت“ کے استعارے میں بیان کرتے ہیں۔

(مفردات راغب طبع دار الفکر بیروت صفحہ 5/351)

راغب ہی نے اس کے معانی میں تیز و طرار، شریر اور چالاک بھی لکھے ہیں۔ مخالف کو مٹی اور کیچڑ میں روندنے  
والے بد اخلاق کو بھی عفریت ہی سے موسوم کیا جاتا ہے جھوٹ و فریب کو پیشہ بنانے والا بھی عفریت ہے اور کون جانتا ہے  
کہ اس خبیث نے سلیمان کے سامنے اپنی جس ”غیر معمولی“ صلاحیت، یا ذہانت کا اظہار کیا وہ کہاں تک سچ تھا؟ اور کون

جانتا ہے کہ سلیمانؑ نے اسکے کئے پر اعتماد بھی کیا تھا؟ تاہم اگر اسکے کئے کو وزن دیا جائے تب بھی اسے مبالغہ آرائی کا نام ہی دیا جاسکتا ہے۔

مفسر قرطبی (1273م) سے نواب صدیق حسن (1889م) نقل کرتے ہیں۔

**هذا ادنى ما قيل فيها ولا يلتفت الى ما سواه**

عفریت کے دعویٰ کو زیادہ سے زیادہ مبالغہ پر ”محمول“ کیا جاسکتا ہے اسکے علاوہ جو بھی توجیہ ہوگی ناقابل التفات ہوگی۔  
(فتح البیان طبع مصر 133/1)

قرطبی کی طرح امام رازی (1210م) نے بھی عفریت کے کئے کو مبالغہ آرائی میں شمار کیا اور کہا ہے کہ

اختلفوا في قوله ”قبل ان يرتد اليك طرفك“ على وجهين. الاول انه اراد المبالغة في السرعة كما تقول لصاحبك اعمل ذالك في لحظة وهذا قول مجاهد

آیہ نمل کی دو توجیہیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ ان الفاظ سے جلد سے جلد کے مبالغہ کا احساس اُبھرتا ہے جیسے کہ تم کسی سے کہو کہ یہ کام ایک منٹ میں کر ڈالو تو ظاہر ہے ایک منٹ یہاں جلدی کے مبالغہ کا غماز ہے ”حقیقت امری“ سے اس کا ”تعلق“ نہیں ہے۔ مجاہد بن جبر (722م) نے اسے سرعت کا مبالغہ ہی کہا ہے۔ ☆ (تفسیر رازی طبع خیر یہ ۱۳۰۸ ہجری جلد 6/566)

## 18 افراد کی صلاحیت کو نظر انداز کر دینا

**والله يختص برحمته من يشاء**

(بقرہ، 105)

اللہ اپنی رحمت کا جسے مستحق سمجھتا ہے خاص کر لیتا ہے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اس طرح افراد کی ”صلاحیت“ کو مد نظر نہیں رکھا گیا اپنی پسند کو سامنے لایا گیا ہے۔

اللہ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے وہ اپنے علم کی بنا پر جانتا ہے کہ کون اسکے پیغام اور مشن کو آگے بڑھانے کی ”صلاحیت“ رکھتا ہے تو اپنی ذمہ داری کا اسے ہی ”اہل“ گردان لیتا ہے۔ یہ نہ عیب ہے

**قول فیصل**

اور نہ ہی قابل شکوہ کردار۔

☆

## 19 قرآن ”قدیم“ یا ”حادث“؟

19

## مانسوخ من آية او ننسها نات بخير منها

جب ہم کسی آیت کو منسوخ یا فراموش کر دیتے ہیں تو اسکی مثل یا اس سے بہتر دوسری آیت لے آتے ہیں۔

(بقرہ 106)

یہ ہے کہ یہاں قرآن پر ”نسخ“ کا اطلاق ہوا ہے۔ اس طرح نسخ، تبدیلی، ازالہ اور نسیان کو قرآن کے اوصاف میں شامل کر کے اسکی قدامت کی نفی کر دی گئی ہے۔

**وجہ اعتراض**

یہاں ”آیۃ“ کا لفظ ”نکمرے“ کے مقام پر آیا ہے جس سے قرآن محکم کی آیات مراد نہیں ہیں کہ وہ سراپا ”خیر“ ہیں ان میں سے کوئی آیت ”لاجبر“ نہیں ہے۔۔۔۔۔ رہا یہ کہ اسمیں قرآن کے

**قول فیصل**

”ابدال“ اور ازالہ کی بات کی گئی ہے جس سے اسکے ”حادث“ ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے تو اسکا ہم کیا کریں کہ ”نسخ“ لانے والا خود ہی فرما رہا ہے کہ وہ اس سے بہتر لانے پر قادر ہے۔۔۔۔۔ یہاں ”بہتر لانا“ متبادل کی چغلی کھاتا ہے جبکہ متبادل پر کہیں بھی قدیم کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اس طرح ”مثل“ کا لفظ بھی۔ ”حدوث“ ہی کا غماز ہے ایسے میں اس بحث کو صرف ”احکام الہی“ کے منسوخ کرنے پر اٹھا رکھنا ستم ظریفی ہے یہاں نسخ کا چنڈورا جس کھولا گیا تو اسکی زد سے ”سنی مسلمات“ کا محفوظ رہنا ممکن نہ ہوگا۔ اس طرح یہ ”حقیقت“ نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یہاں ”آیۃ“ سے مراد ”سابقہ“ شریعتوں کے قابل تبدیلی احکام میں اصلاح و ترمیم یا ”ازالہ“ کرنا ہے اور چونکہ یہ تمام ”اوصاف“ حادث ہیں لہذا اس زاویہ سے پرانے احکامات کی طرح ”نئے احکام“ بھی ”حادث“ ہی ہونگے۔ بات واضح ہو گئی کہ یہاں نسخ سے ”قرآنی آیات“ کا نسخ مراد نہیں ہے کہ یہ علی الاطلاق حرام ہے اسی طرح قرآن کی ”مثلیت“ بھی حرام اور اسکا متبادل بھی کفر ہے۔

☆

## اللہ۔ کا نورانی چہرہ

20

## ولله المشرق والمغرب فاينما تولوا فثم وجه الله

مشرق و مغرب اللہ کے ہیں جدھر رخ کروادھر اللہ کا رخ ہے۔

(بقرہ 115)

میں کہا جاتا ہے کہ ”مضاف“ کی خاصیت یہ ہے کہ ”مضاف الیہ“ سے مختلف ہو۔ جیسے عبد اللہ کا لفظ ہے اسمیں ”عبد“ مضاف اور ”اللہ“ مضاف الیہ ہے جو دونوں مختلف ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے

**وجہ اعتراض**

کہ آیۃ زیر بحث میں ”وجه“ کا لفظ اللہ کا مضاف بن کر آیا ہے جو اسمیں نہیں ”غیر“ ہے لیکن اضافت کی وجہ سے اللہ کے لئے چہرے کا غماز ہے جس سے نظریہ ”تجسیم“ کو تقویت ملتی ہے۔

”وجه“ کا مذکورہ مفہوم بہت سے مقامات پر خود سنیوں کو بھی تسلیم نہیں ہے وہ بھی استعمالات عرب سے رجوع کر کے ”معتزلہ“ کی طرح کہتے ہیں کہ ”وجه“ کے معنی ذات کے ہیں۔ تفصیل

**قول فیصل**



ملاحظہ ہو (تلخیص البیان صفحہ 118)۔ تاویل مشکل القرآن صفحہ 198۔۔۔۔۔ اور امام ہدائی کی ”متشابه القرآن“ صفحہ 105 وغیرہ) ☆

## اللہ کا گھر کیسا ہے؟

21

### اذ جعلنا البيت مثابة للناس

(بقرہ، 125)

اور جب ہم نے قابلِ احترام گھر کو امن کا گوارہ بنایا۔

یہ ہے کہ یہاں ”بیت“ سے مراد ”بیت اللہ“ ہے جو عرفِ عام میں مکہ میں واقع ہے اور اللہ کے

وجہ اعتراض

لئے مکانیت کو واضح کرتا ہے۔

مثابۃ کے معنی ہیں ایک جگہ جمع ہونے کے، جو امن کا غماز ہے یعنی انتشار اور تفریق کا سد باب

قول فیصل

کرنے کیلئے کسی جگہ اکٹھے ہونا ”مثابۃ“ ہے اس طرح جس عمارت کے تعمیری مقاصد میں ”انسانی

وحدت“ کو اصلی ہدف بنایا گیا وہ بلاشبہ ”عظیم“ عمارت ہے اور اس قابل ہے کہ اسے ”عظمت“ و جلال کے طور پر اللہ کا گھر

کہا جائے لیکن اس سے ”مکانیت“ کا استدلال ”خام خیالی“ ہے بلکہ میرے حدِ علم تک قرآن پاک نے اسے ”بیت اللہ“ کی

ترکیب سے ذکر ہی نہیں کیا اور اگر ذکر کر بھی دیا جاتا تب بھی ایسا نہیں ہوا کہ ”مکان“ کبھی صاحبِ مکان کا ”جز“ ٹھہرایا گیا

ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ یہ احمد کامران کا مکان ہے تو کہنے کی حد تک جائے لیکن وہ احمد کامران کا ”جز“ نہیں ہے اسکی پیدا کردہ

”ملکیت“ ہے اسی طرح بیت اللہ کہنے سے بیت۔۔۔۔۔ اللہ کا جز نہیں بن جاتا لہذا ہم جو ”مسجد الحرام“ کی طرف رخ کر کے

سجدہ جلاتے ہیں تو وہ اللہ کے واقعی وجود کی جانب نہیں ہے وہ تو جہت اور مکانیت سے پاک و منزہ ہے۔ ہر جگہ ہے اور

ہر ایک کے ساتھ ہے اس کا علم کائنات کے ”ذرے ذرے“ کو محیط ہے کعبہ تو صرف ”وحدت“ کا مرکز اور ”رمزی“

نشان ہے اسکی طرف رخ کرنے سے ہماری عبادات کو صحیح جہت دینا مقصود تھا کہ ہم ڈھیر سارے خداؤں اور ڈھیر ساری

جنتوں کو کعبہ مقصود بنا کر تفرق اور انتشار سے بچ رہیں پھر کعبہ سے ”خاص“ جتنی بھی عبادات ہیں، تہلیل ہے، تکبیر ہے،

دعوات ہیں پکار ہے ان میں ہم غیر اللہ کو شامل ہی نہیں کرتے یہاں صرف ”وحدتِ الہ“ کی صدا ایں گو خجی اور حرم

اقدس کے در و بام صرف اللہ کی عبادت کی گواہی فراہم کرتے ہیں۔

☆

## نبوت۔ کے بعد درجہِ صالحیت؟

22

وانه في الآخرة لمن الصالحين

(بقرہ، 130)

وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوگا۔

یہ ہے کہ۔ صالحین تو انبیاء کے ماسوا بھی ہو سکتے ہیں۔ انبیاء خاص کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر وجہ اعتراض ”صالحین“ کا اطلاق گویا نہیں رتبہ ”رسالت“ سے گھٹانے کے ”مترادف“ ہے یا یوں کہ صالح رسول سے افضل ہوتے ہیں کہ افضل صفت ہی بعد میں آتی ہے۔

نعت عرب کے ایک دانشور زجاج (924م) نے اسکے معنی فائز، کامیاب اور کامران کے لکھے قول فیصل ہیں۔



مسلمون۔ کس مفہوم کی غمازی کرتا ہے

23

ولا تموتن الا وانتم مسلمون

(بقرہ، 132)

تم مرو تو مسلمان ہو کر ہی مرو۔

میں کہا جاتا ہے کہ موت کسی کے اختیار میں نہیں ہے لہذا کسی کو غیر اختیاری کام کا مکلف گردانا ضابطہ ”عمل“ کے خلاف ہے۔

یہاں ”مسلمون“ کا لفظ اسلام پر ثابت قدمی کا استعارہ ہے۔



کون سی مثل۔ طالب ایمان ہے؟

24

فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا

(بقرہ، 137)

تمہاری طرح وہ بھی ایمان لائیں تب ہی ہدایت یافتہ ہوں گے۔

یہ ہے کہ آیہ زیر بحث میں ”مثل“ کا لفظ آیا ہے جس سے اگر دین اسلام ہی مراد لیا جائے تو ظاہر ہے وجہ اعتراض وہ ”لامثل“ ہے۔ اسی طرح اللہ کی ذات بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ بھی ”لامثل“ ہے ایسے میں یہاں ”بمثل“ کا مفہوم واضح نہیں ہو پاتا۔

یہاں ”مثل“ کا لفظ کلام میں حسن پیدا کرنے کیلئے استعمال ہوا ہے جیسے کمن مثله فی الظلمات قول فیصل (انعام، 122) اب معنی ہوں گے۔۔۔۔۔ جس طرح تم ایمان لائے ہو وہ بھی اتنی ہی ”پختگی“ سے



ایمان لائیں۔۔۔۔۔ مثل۔ معنی طریقہ۔

## رسول اللہ۔ خاتم النبیین نہیں ہیں؟

25

### وجعلنا کم امة وسطا

(بقرہ، 143)

ہم نے تمہیں ”امتِ وسط“ بنایا ہے۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ اگر مسلمان ”امتِ وسط“ ہیں تو اس سے اجرِ انبوت کے فارمولے کو تقویت ملتی ہے کیونکہ ”وسط“ کے معنی درمیان کے ہیں مثلاً تین کے درمیان دو، پانچ کے درمیان تین، سات کے درمیان چار، اور نو کے درمیان پانچ کا عدد ہے۔ یعنی وسط نہ ابتداء میں ہوتا ہے اور نہ آخر میں درمیان ہی کو ”وسط“ سے موسوم کیا جاتا ہے اس بنا پر یہ امت ”آخری امت“ نہ رہے گی اور جو معیار امت کے لئے ہوگا پیغمبر سے گہری مناسبت کے باعث وہی معیار پیغمبر کا پیغمبر کا گہری مناسبت کی گاہت کیا ہوئی کہ اگر امت آخری نہیں تو پیغمبر بھی آخری نہیں ہو سکتے اس طرح ہمارے آقا و مولا۔ رسول ”انسانیت“ بھی نہیں رہیں گے۔ بلکہ وہ کوئی اور نبی ہوگا جسکی امت بھی آخری کہلائے گی اور مشاہدہ کی حیثیت سے ”آخری“ ہی نبوت کی پیروی کا بھی ہوگی اور وہی پیغمبر ہوگا جو فناء عالم سے پہلے آکر ”آخر“ کے لقب سے امتیاز پائے گا۔

**قولِ فیصل** یہاں وسط ہند سے اور عدد والا وسط مراد نہیں ہے اسکے معنی چیدہ، پسندیدہ اور ”رفیع المنزلات“ کے ہیں اور ایسی رفیع المنزلات امت ہی کا یہ امتیاز ہوگا کہ سب سے آخر میں آئے اور اپنے سے پہلوں پر گواہی دینے کی ذمہ داری پوری کرے۔

☆ (تفصیل بمع عربی محاورات ملاحظہ ہو برہان القرآن تضاد نمبر 59)

## قبلہ اول۔ کا۔ شاخسانہ

25

### فلنولينك قبله ترضها

(بقرہ، 144)

اور ہم قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیں گے جس سے تم راضی ہو جاؤ گے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ جب بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو کیا وجہ بنی کہ پھر سے قبلہ اول کی طرف رخ کرنے کو کہا گیا؟

**قولِ فیصل** ”بیت المقدس“ کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رخ کیا اور نہ ہی اللہ سبحانہ نے ایسا کرنے کا آپ کو حکم دے رکھا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ ”فتح مکہ“ سے پہلے جتنے سال کعبہ اقدس مشرکین مکہ کے قبضہ میں رہا آپ متفکر اور پریشان رہے کہ ”مشرکین“ نے دار التوحید کعبہ کی کیا حالت بنا رکھی

ہوگی؟ اس پر آپ کی دلجمعی اور تسلی کا سامان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ۔۔۔۔۔ اے حبیب علیک السلام فکر نہ کرو ہم قریب ہی پھر تم ہی کو ”متولی“ بنائیں گے۔ اس طرح دوبارہ ”تولیت“ کعبہ کی نوید سنا کر آپ کے اضطرابِ دروں کو زائل کر دیا گیا۔ نولینک کے معنی متولی بنادینے کے ہیں یہ نہیں کہ فی الحال تو تم بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر دو پھر کسی مناسب وقت پر تمہارا بیت المقدس سے رخ پھیر کر کعبہ اقدس کی طرف کر دیں گے؟ یہ مفہوم نہ آیات قرآن سے مترشح ہوتا ہے اور نہ کبھی آپ کے حافیہ خیال میں یہ بات آئی تھی۔ ”تحریف“ در تحریف اور شانمائے نزول کی بے رحم بھول بھلیوں نے ایک سیدھی سی بات میں اشکال اور الجھاؤ پیدا کر دیا۔

(تفصیل بمع دلائل ملاحظہ ہو۔۔۔۔۔ برہان القرآن باب اول عنوان ”خوشبو کا سفر“)



## 27 غیر مسلم۔ مسلمانوں کے لئے حجت؟

لئلا يكون للناس عليكم حجة الا الذين ظلموا منهم

اس لئے کہ لوگ تم پر الزام نہ دے سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں وہ الزام دیں تو دیں۔ (بقرہ، 150)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ ظالم ہوں خواہ یہودی۔ ان کا عمل یا ان کی ذات مسلمانوں کے لئے حجت اور سند کیسے بن گئے؟

قول فیصل اسکا مفہوم صرف یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ یہ مسلمانوں کیلئے حجت اور سند تو نہیں بن سکتے یہ اور بات ہے کہ وہ باطل کو منوانے کے ظلم کا بدلہ بے دریغ استعمال کریں اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی سے کہہ دے کہ۔۔۔۔۔ تمہارا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے ہاں تم جھوٹ بولو اور ستم ڈھاؤ۔۔۔۔۔ تو اس طرح کہنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مخالف کو ”تسلیم“ کر لیا گیا ہے؟ خاص کر الا۔ کا حرف اس مقام پر ”لکن“ کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس طرح۔ معنی ہوں گے۔۔۔۔۔ ”لیکن وہ جو ان میں سے ظالم ہیں وہ الزام دیں تو دیں“۔۔۔۔۔ (نیز ملاحظہ ہو نمل، 10)



## 28 شکر اور۔ ناشکری کی بات

واشکروا لی ولا تکفروا

(بقرہ، 152)

میرا شکر کرتے رہو ناشکری نہ کرو۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ ”شکر“ کے بعد ”ناشکری“ کا ذکر ”بے محل“ ہے کیونکہ شکر۔ ناشکری کے خلاف ہے

جہاں شکر ہو گا وہاں ناشکری کی نفی ہوگی۔

یہاں لفظی ”صنعت گری“ کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے لہذا اَشْكُرُ والی کے معنے ہوں گے۔ میری نعمتوں کو میری فرماں برداری کا ذریعہ بناؤ اور ”وَلَا تَكْفُرُون“ کا مفہوم ہوگا۔ میری نعمتوں کو

**قولِ فیصل**

میری نافرمانی کے لئے استعمال نہ کرو۔



**اللہ کی تکرار۔ اَللّٰہ کے تعدد کی غماز ہے**

29

**والہکم الہ واحد**

تمہارا اللہ۔ ایک ہی اللہ ہے۔

(بقرہ، 163)

میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں ایک مختصر سے فقرے میں کلمہ ”اللہ“ کا اظہار دوم مرتبہ کیا گیا ہے۔

**وجہ اعتراض**

صرف ”الہکم واحد“ کہنے سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس طرح اللہ کی الوہیت کی خبر دی گئی ہے جبکہ مطلوب اسکی ذات کی ”یکائی“ کو واضح کرنا تھا۔ جو ”اللہ“ کے تکرار کے بغیر واضح نہیں ہو سکتی

**قولِ فیصل**

تھی۔



**مردار کو غذا بنانا**

30

**انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر**

یہ قطعی بات ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے مردار۔ جہاں ہوا خون اور خنزیر کو حرام ٹھیر لیا ہے۔ (بقرہ، 173)

میں کہا جاتا ہے کہ جانور طبعی موت مرے یا چھری سے ذبح کیا جائے وہ بہر حال ”مر“ کر ہی قابل خوردنی بن جاتا ہے زندہ تو ہم مچھلی کو بھی نہیں کھا سکتے۔ لہذا ایک حالت کے مردے کو کھانا، اور

**وجہ اعتراض**

دوسری حالت کے مردے کو منہ نہ لگانا عجیب حکمتِ عملی ہے۔

زندہ جانوروں میں چونکہ خون کا دورہ ہر وقت جاری رہتا ہے اور وہ تمام جسم میں سے ہڈیوں ان زہروں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے جو پھپھڑوں کے ذریعہ صاف ہو تا رہتا ہے اب جس وقت زندہ

**قولِ فیصل**

جانور ذبح کر دیا جاتا ہے تو وہ خون زہروں سمیت جسم سے خارج ہو جاتا ہے اسکے برعکس جو جانور دم گھٹنے سے، دومرے جانور کے سینگ مارنے سے یا پہاڑ سے پھسل کر نیچے گرنے سے مر جاتا ہے تو زہریلا مواد خون کے اندر ہی رہ جاتا ہے لہذا



مردہ جانور کے گوشت کے اندر سمیت پیدا کر کے ”مضر“ صحت بنادیتا ہے لہذا مصلحت الٰہی متقاضی ہوئی کہ مرے جانوروں کو غذا بنانے سے روک دے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جہاں تک غیر اللہ کے نام کے فحش کے حرام ہونے کا تعلق ہے تو اسکا تعلق ہمارے عقائد کی تطہیر سے ہے یعنی ہم اہل اسلام کو احساس دلایا ہے کہ اسلام میں شرک کا ہر ”عمل“ حرام ہے۔۔۔۔۔ یہی بات کہ ذبح کرنے سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے اور پالیسی یہ ہے کہ دکھ کسی جانور کو بھی نہ پہنچانا چاہئے تو اس کے بارے میں ماہرین علم النفس کا خیال ہے کہ دکھ اور سکھ۔ احساس اور علم سے مربوط ہیں جوں جوں ہمارے احساسات نازک ہوتے جاتے ہیں دکھ زیادہ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے لیکن یہ ہماری بات ہے اسکے برعکس ایک جانور دومرے جانور کو اپنے سامنے ذبح ہوتے دیکھتا ہے مگر اسکے جذبات میں نہ ارتعاش پیدا ہوتا ہے نہ احساسات میں ”جنبش“، مگر ایک انسان دومرے انسان کے خالی عملِ جراحی سے ”غش“ کھا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کا احساس علم سے مربوط نہیں ہے لہذا وہ دکھ اور سکھ کا وہ احساس نہیں رکھتے جو انسان کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے بلکہ دیکھا جائے تو انسان میں بھی خوشی اور رنج دراصل اسکے اندر کے موسم کے عکاس ہیں۔۔۔۔۔ اب چونکہ خون کے ”عدم دوران“ کو حرکت کی ”علت“ ٹھہرایا لہذا فرمایا کہ رسی غلط گانٹھ سے مرتی مرتی جانور کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے اور وہ دم گھسنے سے مر جاتا ہے۔ پہاڑیا کسی اونچائی سے پھسل کر گہرائی میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے کسی طاقتور جانور کی ٹکر یا سینگ مارنے سے صید مرغ بن جاتا ہے تو ان سب حالتوں میں خون کا اخراج نہیں ہو پاتا تو ایسے جانور بھی شریعت قرآن میں ناقابلِ خوردنی ہیں۔

سور کھاؤ جان بناؤ

31

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ..... وَلَحْمُ الْخَنزِيرِ

(173۰۰۰)

حقیقت یہ ہے کہ تم پر سور کا گوشت بھی حرام ہے۔

یہ ہے کہ آیہ زہرِ بحث میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ خنزیر کا گوشت حرام ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

یہاں خنزیر کسی خاص جانور کا نام نہیں ہے اس کے معنی ”عدود“ کے ہیں یعنی ہر جانور کے گوشت کے

ساتھ پٹھے، جھچھڑے، آلاکش اور غدد لگے رہتے ہیں جنہیں قصاب صاف کر کے گوشت کو قابلِ خوردنی بنالیتا ہے وہ کسنا چاہتے ہیں کہ جانوروں کے ”غدد“ ہی حرام ہیں۔

مانا کہ طبی اصطلاح میں خنزیر کے معنی غرور کے بھی ہیں لیکن یہ کس نے کہا کہ ہر مقام پر اسکے یہی

معنی ہی کارگر ہیں! جبکہ ”غدد“ خود بھی عربی کا لفظ ہے جسے انگریزی میں GLAND کہتے ہیں اور

قرآن آسانی سے ”ولحم الغدود“ کہہ سکتا تھا جسکے بعد کوئی ایہام راہ نہ پاسکتا تھا۔ پھر اگر خنزیر کے معنی غدود ہی کے ہیں تو

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس جانور کو سندھی میں ”مردوں“ مراٹھکی میں ”سوپر“ اردو میں ”سور“ فارسی میں ”خوک“ اور

انگریزی میں "PIG" کہا جاتا ہے اسے عربی میں گیا کہا جائیگا؟ جبکہ قرآن نے اسے جانور کی حیثیت سے خنزیر کہا ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ غیر معروف مفاہیم کا کھوج لگا کر حقائق کو مسح کر کے قرآن کا مذاق نہ اڑایا جائے اس سے سنسنی تو پھیل سکتی ہے کسی حقیقت کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خنزیر جانور ہی سہی مگر یہ گھاس کھانے والا جانور ہے حیواناتی سائنس نے اُسے بھیڑ، بکری، اور ہرن کی صفت کا جانور ثابت کیا ہے جو قطعی حلال ہے اسی طرح ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ عام جانور کی طرح "جگالی" کرتے وقت نچلے "جڑے" کو حرکت دیتا ہے لہذا وہ گائے بھینس دو دیگر حلال بہائم (ANIMALS) کی طرح ہے اسے قرآن کی اصطلاح میں "بہیمۃ الانعام" کہا جاتا ہے۔ ان تمام توجیہات کی غایت یہ ہے کہ خنزیر حلال ہے انسانی غذا کے بطور استعمال ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے ہیں جو لوگ اسے وٹامن سے بھرپور غذا کہتے اور مزے لے لے کر کھانا چاہتے ہیں وہ ہمارے مشورے پر لذت کام و دہن سے باز آجائیں گے۔ نہیں وہ اسے ضرور کھائیں اور جان بٹائیں۔ ہمارا تو صرف یہ کہنا ہے کہ "قرآن محکم" نے اسے کلمہ حصر (انما) کے ساتھ ذکر فرمایا ہے لہذا اسکی حرمت میں شک نہ کرنا چاہئے۔ خاص کر اللہ کے اختیارات وسیع ہیں وہ چاہے تو ضابطہ "وما اھل بہ لغیر اللہ۔ (بقرہ، 173)" کے زور پر حلال جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے جاتے یا حلال کھانے جو کسی متبرک ہستی پر چڑھاوے کے بطور چڑھائے جاتے ہیں اللہ انہیں حرام کر سکتا ہے۔ پس جب اپنے اجزا کے لحاظ سے "طیبات" قسم کی اشیاء بھی قانون خدا سے "محرمات" یا "حیثیات" بن سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ خنزیر کے بارے میں اللہ کے یہ اختیارات بے اثر ہو کر رہ جائیں؟ آپ سور کھائیں اور پیٹ بھر کر کھائیں مگر یہ نہ کہیں کہ یہ مسلمانوں کے لئے بھی حلال ہے یا اللہ نے چند منچلے قرآنی بد احتیاطوں کیلئے اپنے اختیارات سے دست برداری اختیار کر لی ہے۔ ☆

## قیامت میں اللہ۔ اُن سے باتیں ہی نہ کرے گا

32

### ولا یکلّمہم اللہ یوم القیامۃ

(اور نہ ہی قیامت کے دن اللہ ان سے باتیں کرے گا۔ (بقرہ، 174))

یہ ہے کہ اسکے برعکس سورہ حجر میں فرمایا۔۔۔۔۔ خدا ان سے ضرور بات ہوگی اور سبھی سے ان کے

عمل دریافت کئے جائیں گے۔ (حجر، 92)

ابو جبر رازی کہتے ہیں کہ یہاں جس بات کی نفی کی گئی ہے وہ نکریم و نوازش کی بات ہے اور جس بات

کو جاری رکھا جائیگا وہ اہانت اور وارنک کی بات ہوگی (صفحہ 12)۔۔۔۔۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

قیامت کے طویل عرصے میں ایسے بھی مواقع آئیں گے کہ مجرم بات کرنے کے قابل ہی نہ ہوں گے اور ایسے بھی چانس ملیں گے کہ نعمتوں کی کھل کرباز پرس ہوگی۔ ☆

## قانون۔ کوہاتھ میں لینے کا مسئلہ۔۔۔۔

33

### کتب علیکم القصاص فی القتل

قتل میں تم پر قصاص فرض کر لیا گیا ہے۔ (قرہ، 178)

میں کہا جاتا ہے کہ۔ قصاص۔ کا مقتول کے وارث کو اختیار دیا گیا ہے اس طرح قصاص بہر حال ایک مستحسن امر ہے اور ورثا اپنے اختیار کو کام میں لا کر خود بھی قاتل سے نمٹ سکتے ہیں۔

**وجہ اعتراض**

قاتل کا پیچھا کر کے قتل کا بدلہ چکانا حکومت کا فرض ہے وارث کو خون بہا۔ یا قتل۔ کا اختیار ضرور دیا گیا ہے لیکن قاتل سے خود نمٹنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ علیکم۔ کا مخاطب معاشرہ یا بہت

**قول فیصل**

حاکم ہے ورثا نہیں ہیں ہو سکتا ہے کہ ورثا اتنے کمزور ہوں کہ بدلہ لیتے لیتے خود ہی ختم ہوتے چلے جائیں۔

☆

## جو ”سکت“ رکھتے ہیں مگر روزہ نہیں رکھتے

34

### و علی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین

جو لوگ طاقت رکھتے ہیں کہ روزہ رکھیں اور نہیں رکھتے تو ایک مسکین کو کھانا کھلادیا کریں۔ (قرہ، 183)

یہ ہے کہ اس آیت میں روزہ رکھنے کی ”سکت“ کے باوصف روزہ نہ رکھنے کی سولت کا ذکر ہے جبکہ

**وجہ اعتراض**

اگلی ہی آیت میں ”حکم“ ہے کہ روزے پورے مہینے کے فرض ہیں۔ صرف مریض اور مسافر بعد

میں رکھ سکتے ہیں۔

**قول فیصل**

اگر ”سکت“ رکھنے کے باوصف روزہ نہ رکھنے کی سولت ہوتی تو اس پر ”کسب“ کا اطلاق مذاق بن

جاتا حقیقت یہ ہے کہ سکت نہ رکھنے کی صورت ہی میں سولت کی بات ہوئی ہے۔ یہاں

”یطیقونہ“ افعال کے باب سے ہے جس میں الف ”سلب“ کا ہے یعنی جو لوگ اپنے میں طاقت سلب پاتے ہیں یا طبی اور

”طبعی“ عوامل کے باعث روزے کی برداشت سلب پاتے ہیں تو صرف وہی فدیہ کی سولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب

اگر یہ مفہوم تسلیم نہ کر لیا جائے تو ”من شہدہ الشهر فلیصمه“ میں جو امر موکد ہے وہ واضح نہ ہو سکے گا۔ خاص کر

”یومہ“ پر ام تاکید کا ہے (لیصمه) جو روزوں کو فرض ٹھیراتا ہے ایسا فرض جس سے ایک گونہ مریض اور مسافر بھی

مستثنیٰ نہیں ہو سکتے یعنی بعد میں دوسرے دنوں میں پوری تعداد (ولتکملوا العدة) کے ساتھ روزے رکھنا ان پر بھی فرض

ہوں گے اور اگر فدیہ سے کام چل جاتا تو یہ لوگ زیادہ ”مستثنیٰ“ تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سولت اپنے وسیع تر



تاظر میں صرف ہر وقت نہ رکھ سکنے والوں کے لئے ہے کیونکہ اسلام پوری کائنات بھری کے طبعی اور موسمی حالات کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا وہ کائناتی نظام حیات ہونے کے ناطے سے ان لوگوں کو بھی خطاب کرتا ہے جہاں کئی کئی ماہ تک سورج طلوع نہیں ہوتا۔ ایسے میں عین ممکن ہے کہ فدیہ کی سہولت ارزاں کرتے وقت انہیں بھی ملحوظ رکھا گیا ہو۔ سر سید (1898م) علیہ الرحمۃ نے موسموں سے بے نیاز ایسے ملکوں کی نشاندہی کرتے ہوئے روزے نہ رکھنے کی سہولت صرف ان ہی سے خاص کی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ”بطوقونہ“ کی دوسری قرأت ”بطوقونہ“ ہے جس سے روزے کی طاقت رکھ نہ سکتے والوں کے لئے بھی فدیہ کی سہولت ہے۔ لیکن حیرے نزویک جس طرح قرآن میں ”نسخ“ باطل ہے اسی طرح ”قبول قرأت“ بھی باطل ہے۔ ”بطوقون“ کا فقرہ اگر قرآن ہوتا تو قرآن ہی میں درج ہو جاتا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے قرآن میں جگہ نہ دے کر اس کے ”جعلی قرآن“ ہونے پر مہر تصدیق ثبت فرمادی ہے۔ تو کیا خود اختراعی قرآن کے ذریعہ اصلی قرآن پر ”ہٹ“ کرنا مسلمان ہے؟۔۔۔۔۔ کچھ لوگ زیادہ عمر کے بوڑھوں کو بھی فدیہ ادا کرنے کا حق دیتے ہیں۔ تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے یہاں بات صرف ہر لحاظ سے طاقت سلب پانے کی ہو رہی ہے جبکہ بعض بوڑھے طویل عمر پا کر بھی شو مند اور توانا ہوتے ہیں کہ ان کی صحت پر شک آتا ہے اور بعض جوان اتنے بد صحت اور ناتواں ہوتے ہیں کہ ان پر ترس آتا ہے۔ ایسے میں بوڑھاپا کچھ لازمی شرط نہیں ہے جو کوئی بھی مریض من (لا علاج مرض) میں مبتلا ہو وہ ”فدیہ“ کی سہولت سے استفادہ کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رمضان کے علاوہ بھی روزے اختیاری تھے جو بعد میں فرض کئے گئے۔ آیہ میں بطیخونہ کا اشارہ ایسے ہی غیر رمضان روزے نہ رکھنے والوں کیلئے فدیہ کی بات ہوئی ہے؟ تو اچھر کسی کو گیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان غیر رمضان روزوں کا حکم کس نے دیا تھا؟ قرآن میں نہ ان کا اشارہ ہے اور نہ ایمائیت۔ ایسے میں از خود ”سنخ کا جھوٹ تراشنا“ پارمضان کے روزوں کو فدیہ سے متاثر کرنا کہاں کا انصاف ہے؟

8-2-96 ملتان

مطابق 18-9-1416 هجری

☆

ہمارے اور اُن کے روزوں میں کونسا فرق ہے؟

35

کما کتب علی الذین من قبلکم

(بقرہ، 184)

روزہ تم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح تم سے پہلوں پر فرض تھا۔

میں کہا جاتا ہے کہ ہمارے صیام یودیوں اور عیسائیوں کے روزوں کی طرح نہیں ہیں ”کما“ سے تشبیہ دینے میں کیا ”مصلحت“ ہے؟

## قول فیصل

یہاں ”کما“ کی تشبیہ سے صرف روزے رکھنے اور افطار کرنے کی کیفیت مراد نہیں ہے روزے

وجه اعتراض

کی فرضیت مراد ہے۔



مئے۔ میں قربانی کے متبادل کب اور کتنے روزے رکھنے چاہئیں؟

36

فمن لم يجد فصيام ثلاثة ايام في الحج وسبعة اذا رجعتم تلك عشرة كاملة  
حج میں قربانی کا انتظام نہ کر سکے تو حج ہی کے دنوں میں تین روزے مئے میں اور جب گھر لوٹے تو سات  
روزے رکھے۔ (بقرہ، 196)

یہ ہے کہ۔ آیہ زیر بحث میں تین اور سات کا عدد دہرایا گیا ہے جو دس ہی کا غماز ہے ایسے میں دس کا  
لفظوں میں اظہار کرنا کیا مصلحت رکھتا ہے؟

وجہ اعتراض

آیہ کریمہ میں ”عشرة“ کا لفظ ہے جس سے شبہ گزرتا تھا صرف تین روزے بھی ہو سکتے ہیں  
صرف سات بھی للذبات کو زیادہ واضح کرتے ہوئے فرمایا۔ عشرہ۔۔۔۔۔ یعنی دس روزے ہی  
مطلوب شرع ہیں۔ اس طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں ”و“ عطف کے لئے ہے ”او“ کے مفہوم میں نہیں ہے۔

قول فیصل



مئے۔ میں ”کنکر“ کتنے دن مارنے ہیں؟

37

فمن تعجل في يومين فلا اثم عليه ومن تأخر فلا اثم عليه

جس نے جلدی کی اور صرف دو دن ”رمی“ کیا اور جس نے جلدی سے کام نہ لیا اور تیسرے دن  
بھی ”کنکر“ مارے تو دونوں پر دوش نہیں۔ (بقرہ، 203)

میں کہا جاتا ہے کہ ”رمی“ کرنے کیلئے اگر تین دن خاص ہیں یعنی مئے کے ”مناسک“ تین دن میں

وجہ اعتراض

مکمل پذیر ہوں گے تو دو دن ”رمی“ کرنے سے ایک دن کٹ جائے گا جس سے ”نسک“ میں

واضح طور پر نقص آئے گا لیکن کہا یہ گیا ہے کہ۔ کوئی بات نہیں ہے حالانکہ بات اہم ہے کہ حج کی ایک اہم رسم پوری نہ ہونے  
سے احکام میں نقص آئے گا۔

اختیاری امور میں نہ جرم نہ (دم) ہوتا ہے اور نہ عدم ادائیگی کی وجہ سے ”نقص“ واقع ہوتا ہے۔

قول فیصل

یہاں دوسرے حکم کو ”و“ کے حرف سے شروع کیا ہے جو صرف اور صرف ”أو“ کے اختیاری



مفہوم کیلئے ہے۔

دنیا ہر ایک کیلئے خوبصورت ہے

38

## زین للذین کفروا الحیاة الدنیا

(بقرہ، 212)

کافروں کیلئے دنیا کی زندگی خوشنمائی گئی ہے۔

یہ ہے کہ یہاں کفار ہی کی زندگی کو خوشنمائی دینے کے ”عمل“ کو عملِ خداوندی کہا گیا ہے جو شانِ کبریائی کے خلاف ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ”زین“ فعل ”مجمول“ ہے جسکا قائل ”معلوم“ نہیں ہے۔ تاہم یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ فعل کا ذکر کرتے وقت قائل کا حذف کرنا فنی طور پر جائز ہے لیکن مفہوم یہ ہوگا کہ تزمین کے

قول فیصل

قائل کفار خود ہیں اللہ سبحانہ تزمین کے صرف اسباب فراہم کرنے والے ہیں۔



## عدت کے اندر رجوع ہو تو طلاق رک جائے گی

39

### وبعوا لتهن احق بردهن ان ارادوا اصلاحا

ان کے شوہر اگر آئندہ کے لئے حسن کارانہ نبھانے کا ارادہ ظاہر کر دیں تو وہی ہمانے کا حق رکھتے ہیں۔

(بقرہ، 228)

میں کہا جاتا ہے کہ ”حسن کارانہ“ نبھانے یا نہ نبھانے کا اسے پورا حق ہے وہ چاہے تو عدت کو طول دے کر نقصان پہنچا سکتا ہے۔

وجہ اعتراض

آیہ زیرِ بحث میں ”ان“ شرطیہ ہے جسکے معنی لازمی حد تک یہ ملتے ہیں کہ شوہر اپنا حق صرف حسن کارانہ نبھاؤ تک محدود رکھے اسے نقصان پہنچانے کا نہ اخلاقی حق ہے اور نہ قانونی۔ فقہا ہمارے لئے

قول فیصل

پیغمبر نہیں کہ ان کی خاطر قرآن محکم کو مسترد کر دیں۔ اور مرد کے حق کو ناجائز باتوں میں بھی قائل اور ”برتر“ تسلیم کر لیں۔



## حلالہ۔ کے ذریعہ بیوی کی بازیافت

40

### حتی تنکح زوجا غیرہ

(بقرہ، 230)

حتی کہ وہ عورت کسی دوسرے سے شادی کر لے۔

یہ ہے کہ طلاق کے بعد جب عدت ختم ہو تو عورت کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ اس سے حلالہ۔

وجہ اعتراض

کیا جائے اور جب اسے تازہ شوہر طلاق دے یا حادثاتی موت مر جائے تب سابقہ شوہر سے دوبارہ

نکاح کر سکتی ہے جس سے احناف کے نظریہ ”حلالہ“ کو تقویت ملتی ہے۔

## قول فیصل

لیکن اسکیمیں یہ تو نہیں ہے کہ ”حلالہ سنٹر“ سے فراہم کردہ نیا شوہر لازمی طور پر طلاق بھی دیگایا یہ کہ ساہو میاں کے لئے جلدی سے مر بھی جائے گا؟۔ پھر ایک سیدھی سی بات کو ”حلالہ“ جیسے دیوٹی کے ”عمل“ سے مربوط کرنے کا کیا جواز ہے؟ حلالہ تو بے غیرتی، دیوٹی، حرام کاری، فحاشی اور قابلِ تعزیر ”قباحت“ کا نام ہے۔ کون بے غیرت ہے جو اپنی قابلِ رجوع منکوحہ کو کرائے کے کسی بھیڑیے کی آغوش میں دے کر پھر واپس بھی لینا چاہے گا۔ فقہائے احناف نے ایک ناآسودہ خواہش کی ”تحکیل“ کے لئے ایک ترکیب نکال تولی ہے مگر وہ اس جرم سیاہ کاری میں تھاملوٹ ہیں دیگر مدارس فکران کی بیہودگی میں شریک و سیم نہیں ہیں، شافعی، مالکی، حنبلی، اہلحدیث، امام اوزاعی، ابن ابی لیلہ اور ظاہریوں کے ہم نوا اور پیروکار اسے ”زنا“ ہی سے موسوم کرتے ہیں وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے حوالہ سے ”لعن اللہ المحلل والمحلل لہ“ کی روایت بیان کر کے۔ حلالہ کو جائز بتلانے، کرنے اور کرانے والوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔۔۔۔۔ اس فرمانِ رسول ﷺ میں عورت کو لعنت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حلالہ کرانے والے شوہر اور ملاں کو سزاوارِ لعنت فرمایا ہے اب اس حیا سوز عمل کے لئے سو کوڑے بمع لعنت حلالہ کرنے والے اور کرانے والے شوہر اور ملاں کی پیٹھ پر مار کریں گے۔

حلالہ۔ کی ایک صورت جو آسمان اور جلد ”روبوہ“ عمل آنے والی ہے یہ ہے کہ حلالہ سنٹر کے کسی مولوی کو کمیشن یا مٹھائی دی جاتی ہے تاکہ وہ خود یا اپنے توسط سے کسی آدمی کو پیسے دیکر ”حلالہ“ کیلئے آگاہہ کرے اور وہ شب بھری کے بعد فی الفور خاتون کو واپس بھیج دے میرے سامنے اور میرے مشاہدے میں یہ صورت آچکل ہے ہٹاریں میں نے کئی حنفیوں کو اہلحدیث مولویوں کے پاس بھیج کر انہیں ”گھر بربادی“ اور ”عمل دیوٹی“ سے چالیا ہے تاہم کرائے کے شوہر کی بات جسے زبانِ رسالت ﷺ پر ”التیس المستعار“ کہا گیا ہے پہلے میری سمجھ میں نہ آتی تھی مگر 1940ء کے ایک واقعہ سے سمجھ آگئی کہ۔ حضور نے کرائے کے سائڈ کوالتیس المستعار فرمایا ہے۔

بات سیدھی سی ہے کہ طلاق۔ ”مرحلہ وار“ عمل کا نام ہے اور ہر مرحلہ ایک ماہ کے وقفے کا خواہاں۔ اسکیمیں طرفین کے اہل خاندان، بزرگوں اور حکومتی کاوشوں سے مدد لیجائے گی۔ اگر کامیابی نہیں ہوتی تو عورت اب بھی حالتِ عدت میں رہے گی اور دوسرے ماہ کے وقفے میں پھر سے ”مصالحات“ کے ثالثی کے سلبہ عمل کو دہرایا جائے گا۔ اسی طرح الطلاق مرتان پر عمل درآمد کے ”مراحل“ مکمل ہو گئے اسکے بعد بھی اگر معاملہ سلجھنے میں نہیں آتا تو پھر یقین جاننے کہ یہ ”بندھن“ ٹوٹنے کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اگرچہ ٹوٹا نہیں کیونکہ دو ماہ کے وقفے کے دو مراحل کے بعد تیسرا مرحلہ خوش اسلوبی سے۔۔۔۔۔ بسانے یا۔ ”حسن کارانہ“ عمل سے فارغ کر دینے کا ہے کہ اب رسمی طلاق کی ضرورت بھی نہیں اور دورانِ عدت رجوع کی سہولت بھی باقی نہیں رہی اب عورت آزاد اور خود ہی اپنے نئے سفر کا آغاز کرنے کی مجاز ہے حتیٰ تنکح زوجا غیرہ لیکن آزاد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ لازمی حد تک نئے سفر کا آغاز کرے۔ وہ اگر نکاح اول سے زخم کھا

کر شادی ہی سے الرجک ہو چلی ہے تو اسے نکاحِ ثانی کیلئے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اسے شوہر کا سدا اچاہنے یا کسی بھی سدا سے بے نیاز ہے یہ اسکا ذاتی مسئلہ ہے اب اس پر نہ حلالہ کا جادو اثر انداز ہو گا نہ دیوثی کی راہ چل کر زندگی کو خوش گوار بنانے کا لالچ کارگر۔ حلالہ جبری زنا ہے ایک بار جاہلیت کی اس مکروہ و ناپسندیدہ رسم کا نام لیتے ہوئے فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا۔

”جس نے حلالہ کیا اسے سنگسار کروں گا یعنی سزائے موت دوں گا۔“ (تسب احادیث)

اور سزائیں یہ مبالغہ، عورت کو حلالہ سنٹروں سے آزاد کرانے کا اقدام ہے۔

(نوٹ) حتیٰ قنکح کے لفظ میں عورت کا بغیر ”ولی“ کے اپنا معاملہ طے کرنے کا اختیار مترشح ہوتا ہے لہذا الانکاح الابولی کی روایت قابلِ تامل بن جاتی ہے خاص کر اسکا عمومی لہجہ واضح کرتا ہے کہ ولی کے بغیر جس طرح عورت نکاح نہیں کر سکتی اسی طرح ولی کے بغیر مرد بھی نہیں کر سکتا۔ جو قرآن کی واضح پالیسی کے خلاف ہے۔



## مار کر۔ پھر زندہ کرنے کا عملِ خداوندی

41

فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مَوْتُوا اَمْ اَحْيَا هُمْ

(نقرہ، 243)

اللہ نے ان سے کہا ”مر جاؤ“ پھر انہیں زندہ کر دیا۔

وَجْهَ اعْتِرَاضٍ میں کہا جاتا ہے کہ یہاں موت اور زندگی کو جمع کر دیا گیا ہے جو بظاہر ناممکن ہے۔

وَجْهَ اعْتِرَاضٍ

یہاں موت استعارہ ہے ذلت و رسوائی سے جیسے ہم کہتے ہیں ”دوب مرد“ تو اس کہنے سے صرف

قولِ فیصل

پھٹکار اور تذلیل کا اشارہ ہے حقیقت میں کسی کی موت کی بات نہیں ہوئی اسی طرح ”زندگی“

استعارہ ہے، حالتِ سنور نے کے بعد ذلت کی کیفیت زائل ہونے سے۔ جیسے ہم کہتے ہیں ”ٹسے نئی زندگی ملی ہے“۔ اس

مفہوم کو دُخان (55) کے تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے جس میں ہے لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَى۔ جسکی بابت

خود مفسرین کو بھی اعتراف ہے کہ یہاں پہلے ”الموت“ سے ایسی ذلت اور تادیبی کی موت مراد ہے جس سے انسان میں

روح ہو اور رسوائی کی موت بھی اور دوسرے ”الموتة“ سے حقیقی موت مراد ہے جس میں تکرار اور اعادہ نہیں۔



## خدا اپنی کرسی دوسرے کو پیش کر سکتا ہے؟

42



والله يُوتِي ملكه من يشاء

(بقرہ، 247)

اللہ جسے چاہے اپنی حاکمیت منتقل کر سکتا ہے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اللہ۔ اپنی حاکمیت اور اختیارات کسی کو منتقل نہیں کرتا۔

**قول فیصل**

یہاں ”ملك“ سلطنت اور مشیت سے مراد وہ حاکمیت نہیں جو اللہ سبحانہ کو حاصل ہے اس حاکمیت کا اشارہ ہے جو حضرت طالوت کو عطا کرنا مقصود ہے ”على الاطلاق“ حاکمیت کی بات نہیں ہوئی یہی وجہ ہے کہ آیہ ہذا کے پہلے حصے میں انہی یکتوں له الملك کہہ کر امر ایلیوں کے الفاظ میں حاکمیت مطلوبہ کی نفی کر دی گئی ہے۔ ان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ نحن احق بالملك۔ طالوت سے زیادہ ہم خود ہی حکمرانی کے مزدار ہیں۔ فرمایا۔ یہ اللہ کا اختیار ہے جسے چاہے حکمرانی کا حق دیدے۔ ☆

**پانی کھانا اور روٹی پینا۔ کیا بات ہوئی؟**

43

ومن يطعمه فانه مني،

(بقرہ، 249)

جس نے اس سر سے پانی پیادہ ہم میں سے ہے۔

**وجہ اعتراض**

میں کہا گیا ہے عربی ایک مکمل زبان ہے اسکے محاورات قرآن فہمی کیلئے سند کی حیثیت رکھتے ہیں اسکیں مفہیم کی خامی ذہن میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے مثلاً عربی میں ”پانی پینا“ کہتے ہیں پانی کھانا نہیں کہتے لیکن آیہ زیر بحث میں ”لم يطعمه“ کہہ کر ”پینا“ ہی مراد لیا گیا ہے جبکہ پانی ”مشروب“ ہے مآکول نہیں ہے۔

**قول فیصل**

یہاں عربی محاورے کے بموجب ”طعم“ کے معنی ”ذائق“ (چکھنے) کے ہیں اور ”چکھنا“ مآکول و مشروب کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔۔۔۔۔ (ابو بکر رازی صفحہ 17) ہم اپنے محاورات میں کہتے ہیں۔ پانی کا ذائقہ میٹھا ہے۔ یا۔ کھارا ہے۔ سالن کا ذائقہ مرچ و مسالے کی مناسبت سے ”پیکا“ یا تیز ہے اسی طرح موت کا بھی ذائقہ ہوتا ہے غرض کہ ذائقہ۔ عام ہے اور یہاں طعم۔ اسی ذائقہ کا استعارہ ہے۔

☆

**جنگ وجدال میں اللہ کی مشیت کا دخل**

44

ولو شاء الله ما اقتتلوا ولكن الله يفعل ما يريد

(بقرہ، 253)

اور اگر اللہ چاہتا تو آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو ارادہ کرتا ہے کر لیتا ہے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اس آیت سے سترح ہوتا ہے کہ دنیا میں جنگ و جدل اللہ کی مشیت سے ہوتے ہیں۔

**قول فیصل** خدا کا منشا اور قانون دو الگ چیزیں ہیں۔ ”منشا“ یہ ہے کہ لوگوں میں جنگ و جدل نہ ہو لیکن اللہ نے انسان کو چونکہ ارادے اور اختیار کا مالک بنا دیا ہے لہذا اسے اپنے معاملات نمٹانے میں مجبور نہیں کیا۔ شریعتوں، حدود و تعزیرات کا سلسلہ ضرور ہے مگر قانون شکنی سے روکنے پر جبر نہیں ہے کہ اس طرح لوگوں کی آزادی سلب ہوگی اور ارادے و اختیار کا عنوان مٹ کر رہ جائے گا۔ ☆

## ماضی اور مضارع کی یک جائی

45

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور

اللہ مومنوں کو ضلالت اور کفر کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لے آتا ہے۔

(بقرہ، 257)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ ”آمنوا“ فعل ماضی ہے اور اسکی مناسبت سے ”یخرجہم“ بھی ماضی ہی کا فعل ہونا چاہئے تھا۔

**قول فیصل** فعل مضارع کی خاصیت ہے کہ اسکی دوام اور استمرار کا مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے اس طرح یہ احساس دلایا کہ ماضی میں تو مومنوں کو ہدایت میسر آگئی تھی لیکن آنے والوں کو بھی اس سے مستفید کیا جائے گا۔ اس طرح یہ اشتباہ کہ ”آمن“ کے ساتھ ”اخرج“ ماضی کے صیغے استعمال ہونے سے ”مستقبل“ والوں کی نفی ہو جاتی، زائل ہو گیا ہے۔ ☆

## مردوں کو زندہ کرنے کا مشاہداتی عمل

46

اَنّٰی یُحٰی ہٰذَہُ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِہَا

(بقرہ، 259)

اللہ موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ عزیر اللہ کے نبی تھے جن پر اللہ کی ”قادریت“ مشکوک نہ ہو سکتی تھی اسکے باوصف انہوں نے ایسی بات کہہ دی جو یقین کے منافی ہے۔



## قول فیصل

عزیز کا جب بیت المقدس کے دیرانے پر گذر ہوا تو متعجب ہو کر سوچنے لگے کہ اس دیران بستی کو اللہ کیسے زندہ کرے گا؟ اس طرح ”موت“ کے معنے دیران اور ”یحییٰ“ کے معنے کباد کرنے کے ہیں چنانچہ ”نخت نصر“ کے بعد جب ”دارا“ آئے تو اس نے پھر سے شہر کباد کیا۔ ہیکل سلیمان و دیگر آثار بحال ہو گئے۔ اللہ اس کے زندہ کرنے کے ڈھنگ نرالی ہی ہیں۔ ☆

## اللہ سبحانہ ”لڑائی“ کیسے لڑتے ہیں؟

47

### وان لم تفعلوا فاذا نوا بحرب من الله

اگر تم اللہ کے قانون ”دبوا“ پر عمل پیرا نہیں ہوتے تو پھر اللہ سے لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ (بقرہ، 279)

یہاں جنگ کو اللہ کے افعال میں شمار کیا گیا ہے جبکہ اسکے لئے مادی ذرائع و آلات اور ”متحرک“ ہاتھ پاؤں کا استعمال ضروری ہے جو اللہ کی تقدیس اور شان کے شایاں نہیں ہیں۔

## قول فیصل

خدا کی جنگ اسلحہ سے نہیں ہوتی نہ ہی اسکے لئے ”متحرک“ ہاتھ پاؤں اور ہوا میں تلوار گھمانے سے ہوتی ہے یہ جنگ قانون ”مکافاتِ عمل“ سے لڑی جاتی ہے اس کا نتیجہ حتمی ہوتا ہے برے عمل کا نتیجہ بر اور اچھے عمل کا نتیجہ اچھا برآمد ہوتا ہے یہ اللہ کا اٹل قانون ہے اسمیں ”عمل“ کے ذریعے ہی تبدیلی آسکتی ہے اس طرح یہ قانونی اور آئینی جنگ ہوگی میدانی اور اسلحہ کی نہیں یہی وجہ ہے کہ ”بالغِ نظر“ مسلمانوں نے یہاں جنگ کا لفظ مبالغہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے جس سے ”دارنگ“ اور شدید گرفت مراد ہے امام رازی لکھتے ہیں الاول المراد المبالغة في التهديد دون نفس الحرب۔ یہاں جنگ سے مراد ”حقیقی“ جنگ نہیں استعاراتی اور دارنگ کی جنگ مراد ہے۔

(تفسیر رازی طبع قاہرہ 1938ء جلد 7/11/12 تا)

لغات القرآن میں۔۔۔۔۔ صدیق حسن خان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں ح (H) اور ر (R) اور با (B) اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ابھرتا ہے (لغات القرآن طبع لاہور جلد 2/481) اس زاویہ سے ”الحرب“ کے معنے ہوں گے ”مشکل“ اور ”مصیبت“ میں دھکیلنے کے۔ جس کے لئے نہ آلاتِ حرب کی ضرورت ہوتی ہے نہ ہی ”نفسِ نفیس“ معرکہ حرب و ضرب میں شمولیت ناگزیر۔ یعنی کہ ”خفیہ تدبیر“ کی ماردینا بھی حرب ہے۔

اب یہ بات صاف ہو گئی کہ محاورات و محاکات کا اپنا مزاج ہوتا ہے ان سے حقیقت مراد نہیں ہوتی تاہم بعض دیگر آیات سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ فتح و نصرت میں ”عملی“ حصہ بھی لیتے رہے ہیں (عمران، 123) اور توبہ (26) میں واضح فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ کیلئے بذاتِ خود میدانِ معرکہ میں اتر آتے ہیں جو کیہ ذریعہ بحث کے عین مطابق ہے وغیرہ۔ جی نہیں یہاں بھی کسی مافوق الفطرت جنگ کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔ کہ اللہ نے ہر مقام پر ضابطہ ”تنبیہ“ ہی کو فتح و نصرت کا اصلی سبب ٹھہرایا ہے۔ مزل میں اگرچہ فرمادیا ذرنی والمکذبین اولی النعمة ومهلهم قليلا

(مزل، 11) ان سرمایہ داروں کو تم ڈھیل دو اور ان سے ”نمنے“ کے لئے معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔  
تو یہاں اللہ کے نمنے کی مختلف صورتیں ہیں کسی انقلاب کے ذریعہ سرمایہ داروں کو خانہ ”صفر“ میں رکھنا بھی ہوتا ہے۔ کسی ناگہانی آفت سے ان پر زوال مسلط کرنا ہے یا کسی اور ذریعہ سے یہ لوگ آفات کا شکار ہو کر معدوم ہو جاتے ہیں تو ان تمام صورتوں کی ”علۃ العلل“ چونکہ ذاتِ خداوندی ہے لہذا ان کی نسبت۔ اللہ کی طرف کسی لسانی اور ”عقائدی“ سقم کو مستوجب نہیں ہو سکتی اس طرح اللہ ذاتِ خود حصہ لیتے ہی نہیں بلکہ ایک مرحلہ پر مسلمانوں نے جب کہا تھا:  
ولو شاء الله لاتنصر منهم۔

(محمد، 4) اگر خدا چاہتا خود ہی ان پر غالب کر دیتا۔  
مخالفین کے اٹھتے ہاتھوں کو پتھر بنا دیتا۔ دماغ میں اٹھتی شرارت کی لہروں میں انہیں ڈبو دیتا۔ جو پاؤں مسلمانوں کی طرف بڑھتے ان میں جمود کی بیڑیاں پسند دیتا اور ان کی صلاحیتوں کا دھارہ منجمد کر دیتا۔ اسکے جواب میں اللہ سبحانہ نے فرمایا  
ليبلو بعضكم ببعض۔ لیکن اللہ ایسا نہیں کرتا کہ اسکے سامنے یہ بھی ہے کہ مخالفوں کی سرکوبی کیلئے تمہیں ہی سامنے لاتا ہے کہ تم میں سے بعض کا بعض دوسروں کے ذریعہ ٹٹ لے۔

(محمد، 4) یعنی کہ اللہ یہ کام تمہارے ہاتھوں اسلئے سرانجام دے گا یا دیتا رہے گا کہ اسکے بغیر نہ تمہارے کردار کا امتحان ہوتا نہ ”شخصیت“ کا ٹٹ۔۔۔۔۔ اس طرح تمہیں احساس ہی نہ ہوتا کہ تمہارا ”جوہر دروں“ کتنا ”ابدار“ ہے جبکہ خدا چاہتا ہے کہ تمہاری شخصیت میں نکھار آجائے اور کردار میں اجلاہن۔ اس طرح محمد (4) سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں کہیں اللہ کی ذاتی امداد اور فتح و نصرت کا ذکر ہے اس سے مراد مسلمانوں کے ہاتھوں ”سرکشوں“ کی ”سرکوبی“ ہوگی۔ اس طرح یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جو مسلمان ہر لمحہ اور ہر آن اپنی دینی و دنیاوی سر بلندی کیلئے مدد و مسیح کی کوشاں ہستیوں کے منتظر رہتے ہیں۔ انکی انتظار قانونِ خداوندی کی نفی کرتی ہے زندوں کی مدد خدا اگر دوسرے زندوں کے ذریعہ کرتا ہے تو یہاں کیا افتاد پڑگئی کہ زندوں کی مدد وہ کریں جن کا نہ وجود ہے نہ امکان۔

ایک سوال  
ایہ زیر بحث کی مدد سے ٹیکس و زکوٰۃ نادہندہ اور سود وصول کرنے والے یکساں مجرم ہیں اسکیں ”مسلم“ اور ”غیر مسلم“ کا کوئی فرق نہیں ہے خدا کے قانون کے مطابق ہر دو سے جنگ لڑی جاسکتی ہے یہ جنگ معروضی حالات میں قانونی جنگ بھی ہو سکتی ہے مثلاً وصولی جمع جہانہ، جائداد کی مکمل یا جزوی ”ضبطی“۔ قیدیہ پختہ ضمانت کی صورت میں اور یہ حکومت کی صوابدید پر ”منحصر“ ہے دوسرے الفاظ میں کسی بھی ”بے عمل“ و نافرمان کو جسمانی یا موت کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً کوئی بے عمل ہے نماز، روزہ، جہاد وغیرہ کی ادائیگی سے قاصر تو اسے ہر طیکہ ملکی قوانین میں درج ہو خفیف سزا دی جاسکتی ہے۔ سیدنا صدیق اکبرؓ نے ٹیکس نادہندگان کے خلاف جو ”تادیبی“ اقدام کیا تھا اسکے زیادتی اسباب میں یہ بھی تھا کہ سرمایہ داروں نے رحلت نبویؐ کے ساتھ ہی ٹیکس روک کر نہ صرف غلط فہمی پھیلا رکھی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری حکم میں ٹیکس بالکل ہی معاف کر دیا تھا منسوخ!! بلکہ بغاوت بھی کر

ڈالی۔ اور باغی قبائل نے ہر چار طرف سے مدینہ کو ”گھیر“ بھی رکھا تھا بلکہ جنگ یمامہ میں ”بے انت“ مسلمانوں کو شہید بھی کر ڈالا تھا اس طرح نادہندگی اور بغاوت نے مل کر صدیق اکبر کے دفاع اسلام، ”دفاع مسلمین“ اور دفاع مدینہ کے اسباب فراہم کر دیئے تھے ”نادہندگی“ جنگ کا موجب نہیں بنی لہذا کیے زیر بحث کسی بھی جان لیوا جنگ سے حث نہیں کرتی۔

**قارئین محترم:** جنگ یمامہ کا ایک خاص پس منظر بھی ہے جسکی تفصیل دے کر میں کوئی بد مزگی پھیلا نا نہیں چاہتا دراصل ہوا یہ کہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے مخالفین جو مدینہ کے نواح میں کاشکاری کرتے اور نغاولہ کہلاتے تھے۔ سیدنا علیؓ کے ”ہوا“ خواہ تھے زکوٰۃ نہ دینے کے سلسلے میں وہ کہتے تھے کہ قرآن پاک میں خذ من اموالہم صدقۃ (توبہ، 104) کے مخاطب نبی اکرم ﷺ تھے جو کہ اب ہم میں موجود نہیں اور آپ ہی وصولیات کے مجاز تھے اخلاق کی طہارت اور اندر کی پاکیزگی بھی آپ ہی کے توسط سے ہو سکتی تھی۔ نبی کے بعد یہ اتھارٹی ان کے اہلیت کو حاصل ہے کسی خلیفہ کو نہیں وغیرہ۔ لیکن یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ ”خذ من اموالہم“ کے اندر ”وصولی“ کا جو ”امر“ مضر ہے وہ نبی کو ہیڈ آف دی سٹیٹ کی حیثیت دیتا ہے جو آپ کے بعد ہی حیثیت آپ کے جانشین کی طرف ”منقل“ ہو جاتی ہے۔ جانشین ”نبی“ نہیں بن سکتا عکرائی میں جانشین بالکل غیر متاثر ہے۔



## جرم۔ دل۔ کا عمل ہے یا ہاتھ پاؤں کا؟

48

### فانہ آثم قلبہ

(بقرہ، 283)

کیوں کہ اسکا دل مجرم تھا۔

یہ ہے کہ یہاں جرم کو قلب کا فعل قرار دیا ہے جبکہ ضابطہ تعزیرات کے تناظر میں جرم کو ہاتھ پاؤں کا عمل قرار دے کر سزا کا نفاذ کیا جاتا ہے۔

### وجہ اعتراض

گو اہی اور شہادت کو چھپانا جرم ہے لیکن اس فعل کو دل سے مربوط کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دل کے فیصلے اپنے ہوتے ہیں اس طرح کسی فعل کو کسی بھی ”عضو“ سے مربوط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ۔

### قول فیصل

فنی طور پر اسے زیادہ اثر آفریں کہا گیا ہے جیسے کہنا۔ میری آنکھوں نے دیکھا، کانوں نے سنا اور دل نے محفوظ کر لیا۔ (رازی صفحہ 23۔ مزید ذیل میں ملاحظہ ہو)



## قلب کے عمل پر گرفت؟ وہ کیسے؟

49

وان تبدوا مافی انفسکم او تخفوه يحاسبکم اللہ

تم اندر کی بات چھپا دیا ظاہر کرو۔ اللہ نے ہر حال میں محاسبہ کرنا ہے۔ (بقرہ، 284)

میں کہا جاتا ہے کہ دل کے ارادے پر اس وقت تک گرفت نہیں ہوتی جب تک ”عمل“ کے سانچے میں نہ ڈھلے۔ لیکن یہاں فرمایا گیا ہے ”محاسبکم“ عملِ قلب پر بھی محاسبہ ہوگا۔

**وجہ اعتراض**

مجرد۔ دل کے ارادے اور دوسو سے پر گرفت نہیں ہوتی خاص کر یہاں ”محاسبہ“ کا ذکر ہے

**قول فیصل**

”معاقبہ“ یعنی سزا اور عقوبت کا نہیں۔ بات صاف ہو گئی کہ دل کے عمل پر محاسبہ تو ممکن ہے معاقبہ ناممکن مثلاً شرک اور قرآنی حقائق سے انکار دل کا ”عمل“ ہے اسی طرح اسلام سے ”منحرف“ ہونا بھی دل کا عمل ہے لیکن کسی کے انکار یا ستر کرنے کی جسمانی سزا نہیں ہے یعنی شرک اور مرتد کو جسمانی آذیت سے دوچار نہیں کیا جائے گا۔



## کیا ”ایمان“ رسالت پر فائق ہے؟

50

آمن الرسول

رسول پر جو کچھ نازل ہوا اس پر ایمان لے آئے۔ (بقرہ، 285)

یہ ہے کہ یہاں ”ایمان“ کو درجہ رسالت کے ہم وزن ٹھیرایا گیا ہے جبکہ افضلیت، شرف اور کرامت میں جو مقام رسالت کا ہے وہ ایمان کا نہیں ہے۔

**وجہ اعتراض**

یہاں ایمان کو درجہ رسالت کی شے نہیں بنایا گیا صرف اسکی اہمیت واضح کرنے کیلئے ذکر فرمایا ہے۔

**قول فیصل**

اس سے رسالت کے درجے کی نفی ”مقصود“ نہیں ہے کیونکہ نبوت و رسالت کو ذکر کر کے

مقابلے میں ایمان کی بات نہیں کی گئی۔ صرف ایمان کا بایں معنی تذکرہ ہوا ہے کہ منزل من اللہ۔۔۔۔۔ اہم چیز ہے کہ اس پر عوام تو عوام رسول اور نبی بھی ایمان لانے کے پابند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ صافات میں ہر نبی کے ذکر کے بعد فرمایا۔

انہ من عبادنا المؤمنین۔۔۔۔۔ ”وہ ہماری ذات اور ہمارے احکامات پر یقین رکھنے والوں میں سے تھا۔“



## احد۔ کا استعمال

51

لا نفرق بین احد من رسلہ

اللہ کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ (بقرہ، 285)

میں کہا جاتا ہے کہ آیہ زیر بحث میں ”بین“ کا لفظ ہے جو لغت کی رو سے دو یا اس سے زیادہ پر بولا

**وجہ اعتراض**

جاتا ہے۔ جبکہ اس آیت میں اس کا مفرد (احد) پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

یہاں ”احد“ کا لفظ اگرچہ حروف آحاد میں سے ہے تاہم جمع (دسلہ) کی مناسبت سے جمع کے مقام پر بھی استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا: فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ (الحاقہ، 47) یہاں ”منکم“ کی مناسبت سے احد کو جمع کا لباس پہنایا گیا ہے۔ قطع نظر قرآنی استدلال کے خود لغت میں بھی ایسی شہادت موجود ہیں جن کے تناظر میں یہ لفظ مفرد اور جمع کے لئے یکساں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا۔ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ (احزاب، 32) امید ہے احد کے استعمالات نے ”بین“ کی پوزیشن واضح کر دی ہوگی۔ ☆

## خیر۔ وشر۔ کا ماخذ

52

### لها ما کسبت وعليها ما اكتسبت

اس نے جو کچھ کیا وہی اسے ملے گا اور اس نے جو کیا اس کا وبال اس پر ہوگا۔ (بقرہ، 286)

یہ ہے کہ یہاں ”لها“ اور ”عليها“ نے خیر و شر کا مفہوم اجاگر کر دیا ہے جبکہ ان کا تعلق قرآن سے کم ”علم الکلام“ سے زیادہ ہے۔

وجه اعتراض

خیر و شر کا بظاہر تو ماخذ قرآن نہیں ہے لیکن عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ ”لها“ صلہ و ستائش اور ”عليها“ سرزنش اور وبال کے مفہوم میں استعمال کئے گئے ہیں اور پھر کثرت استعمال کے نتیجہ میں خیر و شر کے مترادف بن گئے بلکہ جہاں اکٹھے آئے ہیں تو وہاں بھی ”تقابل“ تاظر میں صلہ و وبال کے مفہیم ہی اخذ کئے گئے ہیں۔ اب کیے زیر بحث میں بظاہر اگرچہ خیر و شر کا ذکر نہیں ہوا تاہم کثرت استعمال نے انہیں اسی ہی مفہوم کا لباس پہنایا ہے۔

☆ 19-2-96 ملتان

## قرآن، توریت اور انجیل سبھی پر حق ہیں تو فوقیت کس بات میں؟

53

### نزل عليك الكتاب بالحق

جس نے تم پر کتاب حق نازل کی۔ (عمران، 3)

اور پھر فرمایا،

### وانزل التوراة والانجيل

اور اس سے پہلے تورات و انجیل (بھی) نازل کئے۔ (عمران، 4)



میں گما جاتا ہے کہ یہاں قرآن کو فعل ”نزل“ اور تورات و انجیل کو صیغہ ”انزل“ سے تعبیر کیا ہے جبکہ مادہ۔ (Root) ہر دو کا ایک ہی ہے۔ پھر کیا وجہ بنی کہ۔ نزل۔ اور ”انزل“ میں فرق

وجہ اعتراض

رکھا گیا؟

دونوں افعال ”متعدیہ“ سے ہیں مفہوم و معنی میں بھی کوئی فرق نہیں ہے عرب جب کلام میں تنوع پیدا کرتے تو کہیں ”الفاظ“ کا سہارا لیتے اور کبھی ”افعال“ کا۔۔۔۔۔ چنانچہ یہاں افعال کا سہارا لے کر

قول فیصل

ایک کیلئے ”تفعیل“ کا اور دوسرے کیلئے ”افعال“ کا وزن استعمال کیا گیا ہے اس کے علاوہ کوئی فرق بظاہر نظر نہیں آتا خود اسی آیت میں و انزل الفرقان کہہ کر اشارہ دیا ہے کہ تفعیل کے علاوہ افعال کا وزن بھی استعمال ہوا ہے اب انزل ہو۔ خواہ نزل۔ عربی زبان کی رو سے افعال ”حادثہ“ ہیں جس سے سنی نقطہ نظر یعنی۔ قرآن قدیم ہے کی نفی ہو جاتی ہے۔



محکمات کیا ہیں اور متشابهات کون سے ہیں؟

54

منہ آیات محکمات

اسکی آیات وہ بھی ہیں جو ”محکم“ ہیں۔ (عمران، 7)

یہ ہے کہ یہاں ”منہ“ کا حرف استعمال ہوا ہے جو ”بعض“ کی چٹلی کھاتا ہے یعنی اسکی صرف ”بعض“ آیات ”محکم“ ہیں اور دوسرے مقام پر فرمایا کتاب احکمت آیاتہ، اسکی تمام تر آیات ”محکم“

وجہ اعتراض

ہیں۔ (ہود، 1)

من۔ کے بنیادی معنی آغاز کرنے کے ہیں ویسے یہ درست ہے کہ اسمیں ”بعضیت“ کا ”مضمون“ بھی مضمون ہوتا ہے اور اس زاویے سے ”من“ برائے ”بعض“ ہوتی ہے لیکن اسکے لئے بھی واضح

قول فیصل

قریبہ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ من جس طرح تبعیض (معنی کچھ، بعض۔ حصہ) کیلئے ہوتی ہے اسی طرح ”تبیین“ کیلئے بھی اسکا بعثت استعمال ہوا ہے یعنی ”من“ برائے جنس (جسکے حصے ٹھوس پوری جنس) کیلئے ہو جیسے فرمایا ۱۱۱ یفتح اللہ للناس من رحمۃ اللہ جو رحمت بھی انسانوں کیلئے عام کر دیتا ہے (فاطر، 2) یہاں رحمت سے مکمل رحمت مراد ہے کوئی حصہ، عجزہ نہیں کیونکہ رحمت ناقابل تجزیہ ہے اسی طرح فرمایا ۱۱۱ من آیتہ جو نشانی بھی ہو تو ہمارے پاس لائے۔ (اعراف، 132) یہاں من آیتہ سے مراد تمام نشانیاں ہیں۔ اسی طرح ”تبیین“ میں کل۔ کا مفہوم ہوتا ہے اب معنی صاف ہو گئے کہ اسکی تمام آیات محکم ہیں یعنی جو متشابہ ہیں وہ بھی محکم ہیں۔ متشابہ کے معنی ہیں جس میں گہرائی اور گیرائی ہوتے چلتے مفاہیم کی وجہ سے غور طلب ہو کہ اصناف سخن میں وضاحت اور تشابہ دونوں چلتے ہیں اسی بنا پر احکمت کے معنی ہوں گے تمام قرآن صحیح ہے سچ ہے ثابت ہے قابل فہم ہے اور ابہام و اشباہ سے پاک ہے۔



## کفار قلت کے باوجود مسلمانوں کو دہرے دکتے ہیں؟

55

### یرونہم مثلیہم رائی العین

(عمران، 13)

کافر مسلمانوں کو اصل تعداد سے دہرا سمجھتے تھے۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ دوسرے مقام پر اشارہ دیا ہے کہ۔ یہی کیفیت مسلمانوں کو بھی پیش آئی کہ وہ

بھی کافروں کو اصل تعداد سے زیادہ دیکھتے تھے فرمایا۔ واذا بریکم وہم اذا التقیتم فی اعینکم

وجہ اعتراض

قلیلا ویقللکم فی اعینہم۔

میدان جنگ میں جس طرح وہ تمہیں تھوڑے دکتے تھے اسی طرح ان کی نظروں میں تم بھی

(انفال، 44)

تھوڑے نظر آ رہے تھے۔

اس طرح یہ بات ”قطعی“ نہیں رہی کہ۔۔۔۔۔ کافروں پر اتنی ہیبت طاری ہو جاتی تھی کہ انہیں ”مسلمانوں“ کی قلت بھی

کثرت دکھائی دیتی تھی؟

کافروں کی تعداد حقیقت میں بھی زیادہ تھی لیکن جو ”ہیبت“ ان کے دلوں پر طاری تھی اسی نے ان

کے دلوں پر وہی اکثریت کا رزہ طاری کر دیا تھا لیکن مسلمان ان کی کثرت کو وعدہ الہی کے تناظر

قول فیصل

میں ”قلیل“ سمجھتے تھے۔ اور وعدہ تھا کہ اگر تم میں جم کر مقابلہ کرنے والے سو ہوں گے تو تائید ایزوی سے دو سو پر غالب

☆

آئیں گے۔ (انفال، 66)

## کام بے نتیجہ

56

### ووفیت کل نفس ما کسبت وہم لا یظلمون

(عمران، 25)

اور ہر ایک جان کو پورا دیا جائے گا اور ان پر زیادتی نہ ہوگی۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کام کا ذکر تو ہے مگر نتیجہ کا نہیں۔ یعنی نہ صلے کی بات ہوئی نہ عمل کی نوعیت

وجہ اعتراض

کی۔

یہاں کسی خاص گروہ کی بات نہیں ہوئی اپنا قانون بتلایا ہے کہ ہر ”متنفس“ کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے

اور جب کام کرتا ہے تو احساس دلایا کہ ”عمل“ اور صلے کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ ”عمل“ بغیر صلے

قول فیصل

کے اور صلے بغیر ”عمل“ کے ہوتا ہی نہیں ان کا اتصال بدیی ہے۔ اب جس وقت کہا جائے کہ ہر ایک جان کو پورا دیا جائے

گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد عمل کا صلہ ہی ہے۔۔۔۔۔ رہا یہ کہ ”مطلق“ عمل میں تو فرو گذاشت اور معافی کا عنصر بھی



شامل ہوتا ہے۔ تو یہ کوئی ایسا اعتراض نہیں جسے لامحالہ اٹھایا جائے۔ ایک طالب علم محنت کر کے امتحان دیتا ہے مگر پورے نمبر حاصل نہیں کر پایا صرف پاس ہونے کے نمبر حاصل کر سکا ہے لیکن اسے نمبروں کی کمی معاف کر دی جاتی ہے اور وہ اگلی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے اس طرح اسے محنت کا پورا پورا بدلہ بھی ملا اور نمبروں کی کمی بھی معاف ہو گئی۔ اس میں نہ تعجب کی بات ہے نہ اچھبے کی۔ اسی طرح اللہ سبحانہ نیکوں کا بدلہ بھی پورا پورا دیتے اور معمولی فروگزاشتوں کو معاف بھی کر دیتے ہیں۔ فرمایا۔ **الا للہم۔ چھوٹی چھوٹی لغزشیں معاف ہوں گی۔** (نجم، 32)



## حکومت چھیننا انصاف کے منافی ہے

57

**قل اللہم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء**

اے بادشاہی کے مالک تو جسے چاہے ملک عطا کرے اور جسے چاہے چھین لے۔ (عمران، 26)

یہ ہے کہ۔ دینا اور چھیننا دو متضاد وصف ہیں جو ایک ہی ذات میں جمع ہوئے ہیں اور واضح کرتے ہیں **وجہ اعتراض** کہ اسکیمیں بندوں کا دخل نہیں ہے وہ خود ہی ”فعال لما یؤید“ ہے لیکن ملک بذات خود ایک انعام ہے جو اللہ کی نسبت سے آزادی کا استعارہ ہے۔ اسے چھیننے کے معنی ہوں گے۔ لوگوں سے آزادی چھین کر غلام بننے پر مجبور کر دینے کے۔ جو کہ اللہ کی نسبت سے ظلم ہے۔

قومیں اپنے کردار سے حاکم بنتی ہیں اور اپنے ہی کردار سے غلام بن جاتی ہیں۔ **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم** (رعد، 12) یہاں جس تملیک کا اشارہ ہے وہ دو طرح سے ہوتی ہے **قول فیصل** علی الاطلاق یعنی وقت کی قید سے آزاد اور کسی خاص وقت سے مربوط، پھر جوں ہی اسکیمیں اضحلال اور کمزوری آجاتی ہے وہ خود کار حیثیت سے چھین جاتی ہے اور مجازاً چھین جانے کو اللہ سے نسبت دی جاتی ہے کہ لاکھوں برس سے مذہب نے باور کر رکھا ہے کہ مجاز کے ناطے سے ظلم اور دست اندازی کا ذکر ہو سکتا ہے۔



## قانونِ تخلیق کے دو بنیادی عناصر

58

**صلیب۔ اور۔ تراشب کی تشریح**

**انی اعیذہابک وذریتہامن الشیطان الرجیم**

مریم کی والدہ نے کہا ہے کہ اے اللہ۔ مریم اور اسکی "ولاد" کو تیرے سپرد کرتی ہوں تو ہی انہیں شیطان رجم سے اپنی حفاظت میں لے لے۔

(عمران، 36)

یہ ہے کہ مسیح کے بارے میں اسلامی اور مسیحی "اخلاقیات" میں لکھا ہے کہ آپ کی ولادت "غیر معمولی" طور پر ہوئی تھی جس پر آپ پر "بے پدر" کہلائے جبکہ عمران (36) اور انعام (87,86) میں اس کے برعکس آپ پر "ذریۃ" کا اطلاق کیا گیا ہے اور "ذریۃ" کے بارے میں یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کا اطلاق فرزند "بے پدر" پر نہیں ہوا۔ "نطفہ" کی اولاد ہی کو "ذریۃ" کہا گیا ہے۔

## قول فیصل

قرآن نے جس حقیقت کو واضح کیا ہے وہ "فطرتِ اشیا" اور "مشاہدہ تخلیق" کے عین مطابق ہے امام راغب (1108م) لکھتے ہیں والذریۃ اصلها الصغار من الاولاد وان کان قد یقع علی

الصغار والكبار معافی التعارف

ذریۃ۔ بنیادی طور پر چھوٹی اولاد کو کہا جاتا ہے تاہم تعارف کے مقام پر چھوٹی اور بڑوں پر اسکا اطلاق یکساں ہوا ہے۔ (مفردات الفاظ القرآن طبع دار الفکر بیروت صفحہ 181 کالم نمبر 1)

اس طرح یہ لفظ حقیقی اعتبار سے صرف "اپنی" ہی اولاد کیلئے خاص ہے جو وارث بننے کی قانونی صلاحیت رکھتی ہو۔ اپنے ہی صلب کی اولاد ہو جبکہ قرآن محکم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ

--- یہ لفظ کہیں بھی "کباء" کے لئے نہیں بولا گیا ملاحظہ ہو انعام (87) اس طرح یہ بات تو صاف ہو گئی کہ "ذریۃ" اولاد کیلئے ہی خاص ہے۔ (لغات القرآن طبع طلوع اسلام جلد 2/696)

ان حقائق کے تناظر میں مسیح کی "غیر فطری" پیدائش "مشتبہ" ہو جاتی ہے بلکہ انعام (87,86) میں تو نام لے کر آپ پر "ذریۃ" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اب اگر قرآن محکم خود ہی مسیح کو ذریۃ ٹھہراتا ہے تو فیصلہ ہو گیا کہ وہ وارث بننے کی صلاحیت رکھنے والے مولود تھے اور وارث ہمیشہ نطفہ کی اولاد ہی ہوتی ہے جس کی تخلیق اچھلتے قطرہ منی سے ہوئی۔ قرآن نے کائنات بھری کی تخلیق کا "اصل الاصول" بتلا کر اس پر غور کرنے کی صلاحیت عام دی ہے اور اللہ کے اصول نہیں بدلتے هل ترے من فطور (ملک) ان میں نہ جھول ہوتی ہے نہ ٹوٹ پھوٹ۔۔۔۔۔ قرآن اپنے "مک دار" الفاظ میں فرماتا ہے خلق من ماء دافق۔ یعنی نوب بھر کی اچھلتے پانی سے تخلیق ہوئی۔ پھر اچھلتے پانی کے "منبع" کی نشاندہی کرتے ہوئے واضح فرمایا۔ ینخرج من بین الصلب والترائب۔ اسکے منبع دو ہیں صلب اور ترائب :-

یہاں میں منافع الاعضاء۔۔۔۔۔ یا تشریح

صلب کیا ہے اور ترائب کسے کہتے ہیں؟

الابدان (ANATOMICAL) کے زلویہ

سے بات نہیں کروں گا کہ طبی اصطلاحات تک میری رسائی نہیں ہے بات کو سمجھانے کی حد تک اتنا ہی کہ سکوں گا کہ

1۔ "صلب" اس لیسڈارمادے کا منبع ہے جو مرد سے اچھل کر ٹپکتا ہے اور

”ترائب“۔ اس لیسر ارمادے کا نام ہے جو عورت کے اندام نہانی سے کشید ہوتا ہے۔

(حوالہ تفسیر رازی منبع قاہرہ جلد 31/130/6/75)

اس طرح صلب۔ مرد کے قطرہ منی کا اور ”ترائب“ نسوانی لیسر ارمادے کا استعارہ بلکہ نام ہے اور یہ حمیت قرآن کا بلیغ اشارہ ہے کہ وہ پہلے ”ماء دافق“ کو وجہ تخلیق کائنات ٹھہراتا پھر اس ”ماء“ کو دو کی طرف کی نسبت دے کر اسکا ”مخرج“ صلب اور ترائب کو بتلاتا ہے اس طرح یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ صلب و ترائب کے ”صنعی“ اجتماع کے بغیر تخلیق بعث ناممکن ہے نہ تناسل ترائب میں یہ صلاحیت ہے کہ چہ جننے کا سبب بن سکے اور نہ ہی صلب میں یہ خاصیت کہ ترائب کے بغیر وجہ تخلیق بعث بن پائے!! یہ اللہ کا قانون پیدا کس ہے جو ”صنعی اختلاط“ کو لازمی ٹھہراتا ہے اور اللہ اپنے قوانین کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ وہ با اختیار ہو کر بھی اپنے قوانین کو نہ خود توڑتا ہے نہ ہی کسی دوسرے کو توڑنے کی اجازت دیتا ہے۔ مایبدل القول لدی (ف، 29) اس نے الانسان کہہ کر اس حقیقت کا ”بر ملا“ افشاء کیا ہے کہ کائنات بھری کا ہر فرد صلب اور ترائب کے صلی ملاپ کے بغیر کسی بھی غیر فطری قانون کے ذریعہ ظہور میں نہیں آتا یعنی جب تک صلب اور ترائب کے مادے سے ”مخلول“ تیار ہو کر ”رحم“ میں قرار نہیں پاتا پھر وجود میں نہیں آتا اللہ اکبر والفرعہ للقرآن ہا ور رحم ہی میں ”صورت یابی“ کا مرحلہ طے پاتا ہے (عمران، 6) کہ اللہ۔۔۔۔۔ المصور بھی ہے (حشر، 24) اور یہ وہ حقیقت ہے جسے رازی جیسے اشعری کو بھی اعتراف ہے وہ لکھتے ہیں کہ انسان ہم شکل کیسے بنتے ہیں؟ پھر حدیث نبوی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ فرمایا نبی اکرم ﷺ نے،

”اگر مرد کا مادہ منویہ غالب ہے تو اولاد باپ، دادا اور باپ کے لواحقین کی شکل پر ہوگی اور اگر عورت کا مادہ منویہ غالب ہے تو اولاد ماں، ماموں، نانا اور ماں کے لواحقین کی شکل پر ہوگی۔“

(تفسیر رازی منبع قاہرہ جلد 31/130/18/19)

یہاں نبوی تشریح میں بھی اس حقیقت کا اعادہ ہے کہ صلب اور ترائب کے مخلول (MIXTURE) میں جس کا ”عصر“ مقابل کے ”عصر“ سے زیادہ فعال ہوگا نتیجہ غالب عصر کے مطابق ہی برآمد ہوگا اور اگر مقابل میں کوئی عنصر نہیں تو تھا ”عصر“ ضائع ہو جائے گا مثلاً فاعل کسی ”ترب“ کی حامل سے ”جفت“ ہونے کی بجائے غنث یا۔ امرد سے جفت ہوتا ہے تو یہاں تولید کا صلیبی عنصر بالکل ہی را کھا جائے گا۔ اسی طرح ”مفعولہ“ اگر صلب کے حامل کسی سے ”جفتی“ نہیں کر پاتی یا کسی مصنوعی طریقے (مثلاً چھٹی بازی یا سینہ مس کرانے) سے فارغ ہو جاتی ہے تو اس کا بھی ”ترب“ ”عصر“ ”ثمر“ ”اور نہ ہو سکے گا۔ یہ قانون فطرت ہے اور فطرت کے ضابطے اٹل ہوتے ہیں یعنی یہ عناصر اگر مل پائیں گے تو ”جہنستان بعثت“ میں لالہ و نسترن کی ”روئیدگی“ ممکن ہو جائے گی نہ ملیں گے تو کچھ بھی نہ ہوگا۔

من ”بین“ الصلب والترائب میں ”بین“

دو نطفوں کا امتزاج ہی موجب آفرینش ہے حروف ”اصداد“ میں سے ہے جسکے معنی الگ

ہو جانے کے بھی ہیں اور مل جانے کے بھی۔

(الاضداد ابن السکیت طبع بیروت صفحہ 204 حرف 364۔ الصغانی حرف 406)

اب یہاں فیصلہ قرآن کی زبانی ہو گا جو مل جانے ہی کو حتمی ترجیح دیتے ہیں یعنی صلب اور تراب مل کر ہی نتیجہ خیز ہوتے ہیں الگ الگ بے نتیجہ ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ہر ابن السکیت (858 م) اور حسن الصغانی، سے پہلے قرآن خود بھی واضح فرما چکا ہے کہ۔ انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه

ہم نے ہر انسان کو دو نطفوں کے امتزاج اور یکجا مجتمع ہونے سے پیدا کیا ہے۔ (دہر، 2)

اس طرح طارق میں فلینظر الانسان۔ اور دہر میں انا خلقنا الانسان ملکر اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ۔ ہر دو مقامات پر الانسان میں الف و لام ”جنس“ کا ہے جو ہر ”انسان“ کو متنی کے اجتماعی محلول کی پیداوار ٹھہراتا ہے اور یہ اللہ کا نیا قانون نہیں ہے فرمایا۔۔۔۔۔ فطرة الله التي فطر الناس عليها . لا تبدل لخلق الله ذالك الدين اتقوا ولكن اكثر الناس لا يعلمون

تم سرپا اخلاص سے دین و قانون خدا کو ملحوظ رکھو کہ اللہ کا قانون پیدائش وہی ہے جسکے مطابق کائنات ہماری کو تخلیق فرمایا اور اللہ کا یہ قانون تخلیق ناقابل تبدیلی قانون ہے اور پختہ قانون ہے لیکن لوگ قوانین الہی کی اہمیت کا نہ احساس کرتے ہیں نہ شعور رکھتے ہیں۔ (روم، 30)

اس طرح تخلیق کا ”حتمی“ سبب یہ بتلایا کہ عورت و مرد کا ”مشترکہ“ مادہ منویہ ہی آفرینش کا بیادی سبب ہے اور اگر مشترکہ مادہ ”منویہ“ کی تخلیق، تحلیل، امتزاج اور تخمیر (غیر اٹھنے) کے بغیر تخلیق ممکن ہو جاتی تو مٹھنوں، مفعولوں، خانقاہی اور مدرسہ خلوت کدوں میں جلوہ افروزوں کے ہاں بھی اولاد ہوتی۔ اب یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی ”قادریت“ نہ کسی قانون کی محتاج ہے اور نہ پابند؟ کیونکہ اللہ کی ”قادریت“ غیر متنازعہ ہے کہ یہ اسکے اپنے ہی الفاظ میں اسکے قانون سے مربوط ہے۔ اللہ تو اس پر بھی قادر تھا کہ گدھے کو انسان اور انسان سے خنزیر پیدا کر تا مگر اس کے قانون میں ”قادریت“ کسی غلط مفہوم کی ”متحمل“ نہ ہو سکتی تھی۔

قرآن پاک نہ صرف آیہ زیر بحث کے حوالہ سے اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ مسیح ”ذریۃ“ تھے۔ تخلیق کے الہی قوانین اور فطرت کا

### مسیح پر ”ذریۃ“ کا اطلاق

”وطیرہ“ بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ”ماء دافق“ جو (1) مرد اور (2) عورت کے جنسی اختلاط سے رحم میں جمع ہو کر پرورش پاتے اور ”صور تبانی“ کے مرحلے سے گزرتے ہیں وہی تخلیق کا بیادی سبب ہیں اسکے بغیر تخلیق ایک امر ”ناممکن“ ہے اور اسی ہی سلسلہ کی سیدہ مریم نے پرورش پا کر جب شعور کی آنکھ کھولی اور پروگرام کے مطابق راہبانہ زندگی کو اپنایا تو اسی حالت ہی میں ناموس اکبر نے انہیں اولاد دلی ہو جانے کی بھارت دیدی جسے مریم نے ”لم یمسسني بشر“ کے پیرائے میں ”نفی“ کا رنگ دے دیا جبکہ نفی کا یہ رنگ ماضی کی نسبت سے تھا اس سے حال و مستقبل کی نفی نہ ہو سکتی تھی

کیونکہ ”لم یمسنی“ میں ”لم“ کا حرف ہے جو مضارع پر واقع ہو کر اسے ماضی میں تبدیل کر گیا ہے جس سے ماضی میں ”انسانی قربت“ کی نفی مراد ہے اس کا مستقبل میں فطرت کے کسی بھی ”مظاہر“ کی نفی سے تعلق نہیں ہے اور فطرت کے اسی ہی وطرے کو ملحوظ رکھ کر والدہ مریم (علیٰ علیہ السلام) نے مریم کے پیدا ہوتے ہی اپنے احساساتِ دروں اور جی کی بابت سہانے خوابوں کا اظہار فرما دیا تھا یعنی جنی جب پیدا ہوتی ہے تو ہر ماں ”پرورش“ اور ”تربیت“ کے ہر ہر لمحہ میں اسے دعاؤں کا بھرپور سارا دینا شروع کر دیتی ہے اور نیک تمناؤں کو الفاظ میں ڈھال کر کہتی رہتی ہے کہ۔۔۔۔۔ بڑی عمر پائے۔ دودھوں نسلائے۔ خوشحال مستقبل ہو۔ ہاتھ پیلے ہوں۔ گود ”ہری“ ہو وغیرہ۔۔۔۔۔ حالانکہ ابھی وہ شیر خوار جی ہے ہاتھ پیلے اور گود ”ہری“ کا تصور تک بھی نہیں کر سکتی مگر صاحبہ ذریت بننے کی دعاؤں نے ابھی سے اسے گھیر رکھا ہے۔ بعینہ اسی طرح والدہ مریم کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے ”کنواری“ دیکھنا نہیں چاہتی تھی اسکی ”خواہش“ دعا میں بھی چھلک رہی ہے یعنی جس طرح مائیں نوزائیدہ جی کے روشن مستقبل کی دعائیں کرتی ہیں اسی طرح مائیں نوبہا جی کو رخصت کرتے وقت اسے اور اسکی ہونے والی اولاد کو اللہ کے حفظ و امان میں بھی دیتی ہیں اور ماؤں کی ایسی دعاؤں ”شیر خوارگی“ سے لے کر نئی دنیا آباد کرنے کے وقت تک بسم اللہ میں بھی جاری رہتی ہیں اور عین ممکن ہے کہ مریم کی والدہ نے ماؤں کے اسی شعور کو اجاگر کرتے ہوئے مریم اور اسکی متوقع اولاد کے غت و سلامتی کی دعاؤں زندگی بھر جاری رکھی ہوں۔ الحاصل ان ہی دعاؤں میں ”مسح“ پر ”ذریۃ“ کا اطلاق ہوا ہے جسے کوئی بھی مائی کالال حذف کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ یہ ”ذریۃ“ کا لفظ صرف اور صرف اپنی ہی اولاد پر لا جاتا ہے مثلاً بیٹا۔ پوتا۔ پڑپوتا۔ جھڑپوتا اور سکرپوتا وغیرہ لیکن جو کچھ بھی ہو چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا، اور نواسہ ذریۃ میں شامل نہیں ہو سکتے کہ وہ ”ذاتی“ ”نطفی“ سے تعلق نہیں رکھتے علامہ بستانی اپنی شہرہ آفاق لغوی تصنیف میں لکھتے ہیں ذریۃ الرجل اولادہ۔۔۔۔۔ ذریۃ کا اطلاق اپنے ہی نطفی کی اولاد پر ہوتا ہے۔

(محیط المحيط طبع بیروت صفحہ 306 کالم نمبر 31/1 تا 32)

چاہے نیچے کی طرف کتنی ہی پشتوں تک چلی جائے یعنی آپ سیدہ زینب۔ ام کلثوم، رقبہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہن کو ذریۃ رسول تو کہہ سکتے ہیں مگر عبد اللہ، امامہ، حسن اور حسین کو ذریت کے خانے میں نہیں رکھ سکتے۔

خلاصہ بحث یہ کہ کائنات بھری کا ہر فرد قانونِ تخلیق کے مطابق۔ الصلب اور الترائب سے کشید شدہ ”قطرات“ و اجزاء پر مشتمل ”محلول“ کی پیداوار ہے۔ ان میں سے جو ”عنصر“ کم اور جو ”جز“ ناقص ہے تو تھانہ صلب سے کام چل سکتا ہے نہ ترائب موجب تخلیق بن سکتا ہے۔

جس طرح مسح“ پر ”ذریۃ“ کا

**شادی ہی سے عفت و پاکدامنی حاصل ہو سکتی ہے**

اطلاق آپ کو ”وارثہ بھرت“

میں لے آیا ہے اسی طرح مریم پر ”احسان“ کا اطلاق اسے ”حبالہ“ عقد میں مربوط کر گیا ہے۔ فرمایا

عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو شادی کے ذریعہ حفاظت میں رکھا۔ ہم نے اسکے



(تحریم-12)

بچے میں روح پھونکی۔

جس خاتون نے اپنی شرم گاہ کو حرام کاری سے چانے کیلئے شادی کر لی ہم نے اسکے یلن کے بچے

(انبیاء، 91)

میں روح ڈال دی۔

یہاں ہر دو مقامات پر مریمؑ پر ”احصنت فوجھا“ کا اطلاق ہوا ہے جسے کھینچ تان کر صرف پاکیزگی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جبکہ نظم قرآن اس سے ”یہا“ کرتی اور لسان عرب اسکی تائید سے قاصر ہے پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شادی شدہ خواتین ”پاکیزہ“ نہیں ہوتیں؟ کیا وہ ”جوہر“ زعفرت و عصمت سے محروم ہو جاتی ہیں؟ جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی ہی میں ہو گا تو پھر ”پاکیزگی“ کو صرف غیر شادی شدہ خواتین ہی کے لئے خاص نہیں کیا جاسکتا۔ لغت عرب کے دانشور اور حجت قرآن کے بالغ نظر مفکر امام محمد عبدہ (1905م) احصان کے مفہوم میں لکھتے ہیں یقال احصنت المرأة اذا تزوجت لانها تكون في حصن الرجل وحمايته

عورت جب شادی کرتی ہے تو عرب کہتے ہیں احصنت المرأة وہ شادی کر کے شوہر کی حفاظت میں آکر تمام خطرات سے محفوظ ہو گئی ہے۔ (تفسیر ”النار“ طبع سوم قاہرہ جلد 5/3/13)

نیز:۔۔۔ ایک اور محاورے کا سارا بھی لیا ہے جس میں ہے کہ ویقال احصنها اهلها اذا زوجوها۔ عرب جب احصنها۔ بولتے ہیں تو ان کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ اہل خانہ نے اسکی شادی کرادی ہے۔ (النار 5/3)

اور یہی مفہوم وحی قرآن نے خود بھی متعین فرمایا ہے۔ ارشاد ہے :

یہ (لوٹدیاں) فاذا احصن۔ شادی کرنے کے بعد اگر حرام کاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو ان کی سزا۔ المحصنات (شادی شدہ دیگر عورتوں) کے نصف کے برابر ہے۔ (نساء، 24)

یہاں احصن۔ اور ”محصنات“ کو وحی قرآن نے خود ہی شوہر دار عورتوں کے مفہوم میں استعمال فرما کر تمام شبہ ”شکوہ“ شبہات کے آگے ہمد باندھ دیا ہے اور یہ وہ مفہوم ہے جسے قد آور مفسروں، لغت عرب کے راہواروں اور الفاظ کے مزاج سے بحث کرنے والوں نے واضح کر کے بحث کو ”غیر مبہم“ بنا دیا ہے۔ امام العصر محمد عبدہ لکھتے ہیں و جماہیر السلف والخلف ومنہم ائمة الفقه المشہورون علی ان المراد بالمحصنات ہنا المتزوجات ادبیات عرب کے اگلے پچھلے ماہرین اور فقہ اسلامی کے مشہور (چاروں) اماموں نے یہاں محصنات کے معنی شادی شدہ خواتین کے کئے ہیں۔ (النار 21/3/5 تا 22)

کچھ لوگ انبیاء اور تحریم میں واقع لفظ ”نفع“ سے استدلال کرتے ہیں کہ۔ اللہ کے روح

**نفع سے استدلال**

پھونکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مسیح کی ولادت ”غیر معمولی“ تھی اسکے ”تناظر“ میں مریم کا حاملہ ہونا بھی غیر معمولی تھا۔ لیکن یہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ لفظوں کے اداسناس ”غیر معمولیت“ کو



نہیں مانتے وہ کسی بھی لفظ کے متعدد مقامات پر مستعمل ہونے کو نظر میں رکھ کر پھر ان ہی کے تناظر میں معانی کا انتخاب کرتے ہیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ آدم لول سے لے کر آج تک جتنی انسانی اور غیر انسانی مخلوق ہے اسے زندگی عطا کرنا اور روح سے نوازا صرف اور صرف اللہ کا ذاتی عمل ہے۔ اللہ نے نہ صرف مریم کے بچے میں روح ڈال کر زندگی عطا کی نوعِ بشر کے ہر فرد میں بھی اسی نے روح ڈال کر زندگی کی ”رسماعیوں“ سے ہمکنار کیا ہے (سجدہ 6) لیکن ہم میں سے کوئی نہیں جو نفعِ روح کے استعارے کو زندگی و وصیت کرنے کے علاوہ کسی غیر معمولی مفہوم میں استعمال کرتا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ اللہ کے روح ڈالنے سے ہر فرد بے پدر و فرزند بن جاتا ہے؟ اگر روح ڈالنے کے فارمولے کو اسی رنگ میں تسلیم کر لیا جائے جس مفہوم میں ”اچھبہ پرست“ پیش فرماتے ہیں تو ہماری بہو، بیٹیوں کی غلط کاری کی اولاد کو بے پدر ہونے کے طعن سے نہ تو بچر روح کیا جاسکے گا اور نہ ہی ”گوارہ“ خواتین کے کردار کو سرنش اور سزا کا سزاوار ٹھہرایا جاسکے گا۔

احصان۔ کے بنیادی مفہوم کی روشنی میں سیدہ کی ازدواجی زندگی کا معاملہ قابلِ **یہ شادی کس سے ہوئی؟** فہم بن جاتا ہے جسے بغیر تبصرے کے امام رازی نے بھی نقل کیا ہے وہ مشہور تاجی وہب بن عبد (732 م) کے حوالہ سے بات کرتے ہیں لوریہ وہب وہی عالم دین ہیں جن کے بارے میں سیر و تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے۔۔۔۔۔ مورخ کثیر الاخبار من الکتب القدیمہ

یہ وہ تاریخ دان مورخ تھے جنہیں قدیم تاریخ اور نہ ہی لڑچکر پر پورا عبور حاصل تھا یہ 15 سال تک حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی صحبت اور شاگردی میں بھی رہے۔

(کتاب ”الاعلام“۔ زر کلی طبع قاہرہ جلد 4/150)

یہ وہب اپنی غیر معمولی ذہانت اور تاریخ دانی کے زور پر کہتے تھے کہ۔ ان مریم لما حملت کان معها ابن عم لها یسعی یوسف النجار

سیدہ جب حمل کے ساتھ تھیں تو اپنے عم زاد (کزن) یوسف نجار کے ہمراہ تھیں۔

(تفسیر رازی طبع محمد عبد الرحمان قاہرہ جلد 21/17/201/18)

اور یہ یوسف نجار وہی تھے جو تاریخ اور ”اناجیل“ میں سیدہ کے ”مگتیر“ اور شوہر ظاہر کئے گئے ہیں۔۔۔۔۔ منجد الاعلام کے مسیحی مصنفین لکھتے ہیں یوسف القدیس خطیب مریم العذرا..... کان نجارا یسکن الناصره (الانجیل) مقدس یوسف ناصرہ کے رہنے والے نجار تھے سریم کے مگتیر تھے۔

(منجد الاعلام طبع بیروت ایڈیشن 27 صفحہ 755 کالم نمبر 2)

امام رازی اور مسیحی مورخین کی طرح بغداد کے شہر آفاق مصنف علامہ شہاب الدین آلوسی (1854 م) نے بھی وہب کی تائید کرتے ہوئے نجار کو ایک گونہ ”شوہر“ ہی تسلیم کیا ہے بلکہ امام رازی کے ایک دوسرے حوالہ سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آپ واقعتاً بھی ”محسنہ“ (شادی شدہ) تھیں لکھتے ہیں۔

سیدہ مریم حمل کے آخری ایام میں جب باہر آئیں اور (مفسرین کے بقول) مصر چلی گئیں تو حضرت زکریا کی بجائے یوسف نجار کے ہمراہ ہی محو سفر ہوئیں۔  
(حوالہ مذکورہ)

بات صاف ہو گئی کہ سیدہ اور یوسف کا باہمی ازدواجی تعلق تھا کہ اسکے بغیر ایک ”عقیقہ“ نہ تو کسی اجنبی کو ہم سفر بنا سکتی ہے اور نہ ہی زکریا کی موجودگی میں ”خلوت و جلوت“ میں کسی کو غمخوار و ”مونس“ ٹھیرا سکتی ہے۔

آخر میں گستاخی نہ ہو تو عرض کر دوں کہ لوگ مجھ پر طنز کرتے ہیں کہ میں قرآنی الفاظ کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا۔ ان سے ادب و احترام کے ساتھ گزارش ہے کہ وہ ”ذہنی صلب، ترائب، امشاج اور احسان کے بارے میں بتلائیں کہ وہ قرآنی حاکمیت تسلیم کرتے ہیں یا رائج عقیدے کو حکم مانتے ہیں؟  
طلوع اسلام جون 1998ء

جون 98ء کے طلوع اسلام میں عنوان بالا سے میرا ایک مضمون چھپا تھا جسکی زد حضرت مسیح کی ”غیر فطری“ وادت پر بھی پڑتی تھی اور ظاہر ہے کہ مضمون کتنا ہی ”فکر انگیز“ ہو اور دعوت، فکر دے رہا ہو ”اہل تہذیب پرست“ اسے برداشت نہ کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے میرے یا ان کے الفاظ میں ذیل کے زاویوں سے اعتراضات اٹھائے تھے۔

- I۔ احصنت کے معنے روکنا۔ بند کرنا کئے ہیں۔ پاکیزگی کے نہیں۔
  - II۔ طارق نے صلب و ترائب کے معنے بھی بتا دیئے ہیں اس میں زوائد کہاں سے آگئے؟
  - III۔ اس بنا پر میں نے ”محقق“ میں لکھا تھا کہ۔ اس بات کا امکان عیسیٰ کی پیدائش میں ہے کیونکہ قواعد میں استثنائی واقعات پیدا ہو سکتے ہیں۔
  - IV۔ بعض اوقات مادہ۔ نر کے ملاپ کے بغیر بچہ پیدا کر لیتی ہے۔ (ماہنامہ محقق کے مدیر 27/5/98)
- یہ چار بنیادی اعتراضات ہیں جو لمبے کی ”تکنی“ کے ہمراہ اٹھائے گئے ہیں اب نمبر وار میری معروضات ملاحظہ ہوں:

میں نے اپنی طرف سے کہیں بھی یہ نہیں لکھا تھا کہ ”احصنت“ کے معنے صرف ”پاکیزگی“ کے ہیں لیکن اگر غلط بات میری طرف سے منسوب ہو سکتی ہے تو میری ذمہ داری ہے کہ میں سوال پوچھوں کہ۔ احصنت کے ایک معنے محفوظ کرنا آپ نے بھی تسلیم کئے ہیں تو کیا اس میں پاکیزگی کے معنے پنہاں نہیں ہیں یعنی اپنی۔ پاکیزگی کو محفوظ کرنا ”احصنت“ کے خلاف ہے؟ جواب اگر اثبات میں ہے تو مجھے مطعون کرنے کی غیر معقول وجہ کیوں بیان کی گئی؟ تاہم اگر آپ نے احصنت کا ایک مفہوم عفت، پاکدامنی اور پاکیزگی ملاحظہ کرنا ہی ہے تو نشاندہی میں کر رہا ہوں:

1۔ قرآن کے مفکر علامہ پرویز علیہ الرحمہ (1985ء) کی لغات القرآن جلد 2/10/518 صفحہ 1/519

2۔ راغب (1108ء) طبع دار الفکر بیروت صفحہ 120 ک نمبر 2/2 3

3۔ بابائے احناف علامہ مرغنیانی (1197م) کی ہدایہ طبع لکھنؤ ۱۲۹۹ھ جلد 2/290

4۔ علامہ طبرسی (1153م) کی شہرہ آفاق تفسیر مجمع البیان طبع تہران ۱۲۸۲ھ جلد 234/1

ان جہازہ فن نے ”حصص“ کے معنی عفت، پاکدامنی اور پاکیزگی ضرور کئے ہیں لیکن بعد میں آنے والوں نے سیدہ مریمؑ کی مناسبت سے صرف غیر شادی شدہ بچوں کا وصف ہی بتلایا ہے جو محل نظر ہے عقیقہ اور پاکدامنی جس طرح غیر شادی شدہ بچیاں ہو سکتی ہیں اسی طرح سیدہ عائشہؓ اور سیدہ فاطمہؓ شادی شدہ ہونے کے باوصف بھی عقیقہ، پاکیزہ اور پاکدامنی شمار ہوں گی جنہوں نے اسے نلکا جت دے کر غیر شادی شدہ عورتوں کے حصے کی چیز قرار دیا ہے وہ نظر ثانی کا محتاج ہے اور میں نے اسی ہی زاویہ سے اس غلطی کی نشاندہی کی تھی۔

اس ضمن میں میں نے لکھا تھا کہ ----- صلب اس لیس دار مادے کا منع ہے جو مرد سے اچھل کر ٹپکتا ہے اور تہ آئیب اس لیس دار

مادے کا نام ہے جو عورت کے اندام نہانی سے کشید ہوتا ہے۔۔۔۔۔ (حوالہ تفسیر رازی طبع قاہرہ، 7۵6/130/31) اس پر میں نے اضافہ کیا تھا کہ۔۔۔۔۔ اس طرح صلب مرد کے قطرہ منی کا اور ترائب نسوانی لیس دار مادے کا استعارہ بلکہ نام ہے۔۔۔۔۔ (طلوع اسلام جن 98ء صفحہ 51 کالم نمبر 1)

بات قابل غور تھی مگر ناقد محترم نے اسے ”ہٹاؤٹی“ ترجمہ کہہ کر اپنی ”بدذوقی“ کا واضح اعتراف کیا ہے کہ ”مفہوم“ واستعارے کو ہٹاؤٹی ترجمہ کہہ بیٹھے۔ میرے نزدیک امام رازی انسان تھے سود خطا سے مبرا نہ ہو سکتے تھے تاہم وہ مفکر تھے۔ متکلم تھے۔ فلسفی تھے۔ مناظر تھے۔ فقیہ تھے، محدث تھے، مفسر تھے اور اپنے وقت کے رائج تمام علوم پر عالمانہ دسترس رکھتے تھے وہ اتنے بھی گئے گذرے نہیں تھے کہ ”صلب و ترائب“ کے مرادی مفہیم کو ترجمہ کارنگ دے دیں لیکن کیا پتہ کہ آنے والے ادوار میں ایسے بھی سخن ”ناشائس“ پیدا ہو گئے جو حقائق کو ہٹاؤٹی کہیں گے کیا حضرات ناقد سے دریافت کر سکتا ہوں کہ صلب اور ترائب ایک ہی صنف (مرد) کے دو ”وصف“ ہیں یا جدا جدا حقیقتیں؟ اس کا جواب شاید ان سے نہ بن پڑے تاہم آئیے ایک بار اسی رازی ہی سے ایک اور مقام پر ملتے ہیں تاکہ وہ اپنی بات اپنی ہی زبانی واضح کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں النطفة هي للماء القليل و جمعها. انطاف ونطفه بقول الم يك ماء قليلا في صلب الرجل و ترائب المرأة فيختلطان ويخلق الولد منهما

قیامت (26) میں ”نطفہ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کی جمع انطاف (ANTAF) یا نطفہ (NUTAF) ہے جسکے معنی ہیں تھوڑا سا پانی یعنی بوند بوند قطرہ قطرہ۔ اللہ کا ارشاد الم يك ماء قليلا في صلب الرجل و ترائب المرأة فيختلطان ويخلق الولد منهما (قیامت، 26) ہے جسکے معنی ہیں۔ کیا انسان اپنی تخلیق کے ایک مرحلے میں مرد کے صلب اور ”مادہ“ کے ترائب کے چند قطروں سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتا تھا؟ جبکہ صلب و ترائب کے قطروں کے مل پانے ہی سے بچے کی ولادت ممکن ہو چلی۔ (تفسیر رازی جلد 30/234/8/9۵)

یادو اگر میں نے صلب اور ترائب کے ”مراوی“ معنے لے کر کفر تو لا تھا تو امام رازی کی لفظی تشریح کو کیا کہا جائے گا؟ کیا سخن شناسی اتنا ہی عیب ہے کہ ناقد محترم اس سے بالکل ہی الرجک ہیں؟ اور، نہیں جانتے کہ ابتداء میں یہ جرثومہ حیات رکھ دیا گیا اور بعد میں کب ایسا ہوا کہ آئندہ بلد الآباد کے لئے یہ جرثومہ دو حیثیتوں میں مادہ منویہ کی طرف منتقل ہوا اس طرح وہ مرحلہ آگیا کہ انسان ہمیشہ کیلئے نطفہ ہی سے صورت پائی کے مرحلہ میں داخل ہوا کہ اللہ ”المصور“ بھی ہے (حشر، 24) اور اس نے رحم مادر ہی میں جیسا چاہا تصویر بنا دی بصورت کم فی الارحام کیف یشاء (عمران، 6) چاہا تو ”نر کی شکل دے دی چاہا تو ”لباس زن“ میں ظاہر فرمادیا کیونکہ صورت گری کے لئے بھی اس کا قانون موجود تھا، ہے اور رہے گا اور جرثومہ حیات کے باہم دگر پوست ہوتے وقت وہ صورت میں لے آیا۔ فرمایا:

کیا تمہیں ”ماء مہین“ سے پیدا نہیں کیا یعنی اس پانی (قطرات منی) کو مقررہ معیار تک رحم میں ٹھیرا کر تمہاری تخلیق کو حتی شکل نہیں دی؟۔۔۔۔۔ (مرسلات 20: 22)

اس آیت کی تشریح میں امام رازی لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ ”ماء مہین“ سے مراد ”نطفہ“ ہے اور ”قرار مکین“ کے معنے ہیں نطفہ ٹھیرنے کا ”ظرف“ جسے رحم کہا جاتا ہے اور مفہوم یہ ہوا کہ نطفہ کا چہرہ پیدا ہونے کی میعاد تک رحم میں رہنا۔۔۔۔۔ (تفسیر رازی طبع عبدالرحمان قاہرہ جلد 23/272/30 تا آخر صفحہ 1/273)

اسی طرح سورہ حج میں فرمایا۔۔۔۔۔ ونفخ فی الارحام الی اجل مسمی ثم نخرجکم طفلاً ہم نے مقررہ وقت تک تمہیں رحم مادر میں ٹھیرایا اور پھر ایک بچے کی صورت میں باہر لے آئے۔۔۔۔۔ (حج، 5) اور یہی مضمون غافر (67) میں بھی ہے اور مقصد یہ ہے کہ اللہ کی زبان میں ہر مرد اور ہر عورت کے باہمی اختلاط ہی سے انسانی مخلوق وجود پذیر ہو جاتی ہے اور میں ناقد محترم سے عاجزی اور ادب سے پوچھتا ہوں کہ مرد کے پاس تو ”ایصال منی“ کا آلہ ہے جس سے وہ قطرات منی کو ٹپکاتا ہے لیکن اس چیز کا نام کیا ہے جس میں یہ قطرات ٹپکائے جاتے ہیں؟ کیونکہ ٹپکائی جانے والی چیز کے لئے کسی ظرف، جگہ، اور برتن کا ہونا ضروری ہے اور اللہ کی اصطلاح میں وہ ”رحم“ مادر ہے لیکن جناب کے فلسفہ کے مطابق بعض اوقات۔۔۔ مادہ ”نر“ کے ملاپ کے بغیر چہرہ پیدا کر لیتی ہے۔ اب آپ نے اگرچہ اس فارمولہ کو انسانی تخلیق میں یقینی طور پر شامل نہیں کیا لیکن ذکر کر دینے سے آپ کیا چاہتے تھے؟

امام رازی لکھتے ہیں واختلفوا فی کون تولید دو نطفوں کی تخیل ہی سے ممکن ہے النطفة مختلطة فالاکثرون علی انه

اختلاط نطفة الرجل بنطفة المرأة و هو ا صفر رقیق فیختلطان ویخلق الولد منهما

”امشاج“ کے معنے ہیں عورت و مرد کے نطفے کے مکس ہو کر لولاد پیدا کرنے کے۔ جہاں دو

نطفوں کا اختلاط نہیں وہاں ”تولید“ نہیں۔ (تفسیر رازی جلد 17/236/30 تا 18)

اس طرح یہ تمام دلائل مل کر واضح کرتے ہیں کہ کہیں بھی اشارے خواہ ”ایمانیت“ کے لہجہ میں یہ گنجائش

نہیں ملتی کہ بعض حیوانات ایسے بھی ہیں جن کی مادہ زر کے ملاپ کے بغیر چہ پیدا کر لیتی ہے؟ کیونکہ اس سے تو یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ مریم انسان نہیں۔۔۔۔۔ ان بعض حیوانات میں سے ہیں جن کی ”مادہ“ زر کے ملاپ کے بغیر چہ پیدا کرتی ہیں۔  
العیاذ باللہ۔۔۔۔۔ تاہم ناقد محترم کہہ سکتے ہیں کہ عورت و مرد کے جنسی ملاپ کے باوجود بھی اولاد پیدا نہیں ہوتی۔ جی جعفریایا آپ نے لیکن زرمادہ کے ملاپ کے باوصف اولاد کے نہ پیدا ہونے کا بھی قانون ہے اور وہ قانون ”عقم“ (STER-ILITY) یعنی یا تو مرد کے ”جرٹومہ“ میں ”عقم“ ہوتا ہے یا عورت کا جرٹومہ ”عدم تولید“ کا باعث ہے یا دونوں عقم کے شکار ہیں تو ایسی حالت میں بھی چہ نہیں ہو تا ویجعل من یشاء عقیما (شورے، 50)

جبکہ عقم۔ قابل علاج بھی ہے۔ نیز۔ چہ بڑا خوبصورت ہے جو پیدا ہونے کے چند گھنٹے بعد زندہ رہ کر مر جاتا ہے تو اس سے ماں ایسی نفسیاتی یا ”اعصابی خوف“ اور تاؤ کا شکار ہو جاتی ہے کہ آئندہ کیلئے اس کا مہبل (VAGINA) و رحم اختلاط کو آسانی سے قبول ہی نہیں کرتا تو ایسے میں بھی طبی وجوہات بتا سکتے ہیں کہ اختلاط کیوں ”بے کار“ ہے؟

ناقد محترم چونکہ ڈاکٹر ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ اب تو زرمادہ کے ملاپ کی ضرورت ہی نہیں رہی ”مصنوعی“ طریقوں سے بھی تولید و ”تخلیق“ کا عمل جاری و ساری ہے وغیرہ۔ لیکن اگر وہ ثابت کر دیں کہ مسیحؑ کی پیدائش کلوننگ کی طرح مصنوعی تھی تو ہم ان کی دلجوئی کے لئے تمام قرآنی نصوص اور لغوی شہادتوں پر ”نظر ثانی“ کر کے ان کی ہاں میں ہاں ملا سکتے ہیں۔

ناقد محترم فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ اس بات کا امکان عیسےؑ کی پیدائش میں ہے کیونکہ قواعد میں استثنائی قانون استثناء واقعات پیدا ہو سکتے ہیں۔ (مدیر محقق 27-5-98)

سوال یہ ہے کہ آپ نہ اہل زبان ہیں نہ ہی قواعد عرب سے آگاہ لہذا آپ کس طرح ”مجاز“ بن گئے کہ غیروں کی زبان کے ”اساسی قواعد“ میں من مانی استثنائیں کر کے اپنا القہیدہا کریں؟ آج ہم غالب کے کلام کو سمجھنے کیلئے اسراۃ فن اور ”غالبیات“ کے مستند اتالیقوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو غالب کے دور میں ”مستعمل“ ہونے والی تشبیہات و استعارات، توجہات اور کنایات پر کامل دسترس رکھتے ہیں کہ اسکے بغیر غالب کو سمجھنا دشوار ہے تو کیا وجہ ہے کہ قرآن فہمی کیلئے اس دور کے زیر استعمال محاورات، سماعی قواعد اور ”ادبی ضوابط“ کو جس دور میں قرآن اتر تھا سمجھے بغیر اپنے کو سند سمجھیں اور اہل زبان کے مسلمہ ضوابط میں حسب منشاء ”تصرف“ کر کے بات کی سنگینی کا احساس تک نہ کریں۔ اللہ کے قواعد و ضوابط میں تو رسول اللہ بھی ”استثناء“ اور تخصیص کرنے کے مجاز نہیں (یونس، 15)۔ آپ کون ہوتے ہیں؟ پھر آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ استثناء کرنا ”صرف“ متکلم کا حق ہے مثلاً قرآن پاک میں ہے والعصر ان الانسان لفی خسره۔۔۔۔۔ یہاں ”الانسان“ پر الف، لام استغراق کا جس میں استثناء ممکن ہے یعنی۔ فرمایا کہ زمانہ گواہ ہے کہ ہر انسان خسارے میں ہے۔ اس طرح انسان پر ”الف، لام استغراق“ نے ہر انسان کو ”خسارے بردار“ کہا ہے لیکن پھر متکلم نے حرف ”الا“ کے ذریعہ خود ہی استثناء کا اشارہ دے دیا کہ۔۔۔۔۔ الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات ماسوائے ان لوگوں



کے جو اللہ کی آیات و فرامین پر ایمان لائے اور اپنے تعمیر کردار (صالحات) کے ذریعہ خسارے سے بچنے کی راہ نکال لی۔

(العصر، 1 تا 2)

معلوم ہوا کہ استثناء کا حق صرف متکلم کو ہے اور متکلم علی الاطلاق باری تعالیٰ ہوں تو وہاں استثناء کے مجاز

بغیر بھی نہیں ہو سکتے۔

استثناء کی دوسری قسم بھی الف لام ہی کے ذریعہ متعارف ہے لیکن یہ الف و لام برائے

**الف و لام برائے جنس**

جنس واقع ہے استغراق میں تو مصنف اپنے ”اختیار“ سے استثناء کر سکتا ہے مگر الف

و لام جنس سے میان کردہ مطالب میں وہ خود ہی استثناء کی گنجائش ختم کر دیتا ہے مثلاً فرمایا انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج۔۔۔۔۔ ہم نے ہر انسان کو ”مخلوط نطفے“ سے پیدا کیا ہے۔ (الانسان، 1)۔۔۔۔۔ یہاں الف و لام جنس کے ذریعہ

استثناء کا ”دروازہ“ خود ہی بند کر دیا ہے اب آپ متکلم (باری تعالیٰ) کی زبانی کہیں بھی ثبات نہیں کر سکتے کہ اس نے اپنے اس قانون کو ”توڑ“ کر ”تضاد بیانی“ کا الزام قبول کر لیا ہے جسے کہ صلب اور ترائب والی آیت میں بھی ”دعوت فکر“ دی

کہ فلینظر الانسان مم خلق۔ ہر انسان سوچے اور اس پر غور کرے کہ اس کی تخلیق کیسے ہوئی؟ یہاں نیز الانسان پر الف و لام ”جنس“ کا ہے۔ پھر فرمایا خلق من ماء دافق وہ صلب اور ترائب سے اچھل کر نکلنے والے پانی سے پیدا ہوا (طارق)

اب فرمائیے عیسے کی پیدائش میں قواعد میں استثنائی واقعات کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ”ذہنی“ مفروضے کی گنجائش کیسے پیدا کر لی گئی؟ کیا خدا ”غافل“ تھا اسے اپنے کاموں میں استثناء کا اختیار نہیں تھا تعجب ہے ہمارے ناقد محترم اپنے ذہنی فیصلوں کو اس

خدا پر مسلط فرماتے ہیں جس نے سوال سوال ہی میں چیلنج کر رکھا ہے کہ اسکے فیصلے اٹل ہیں تم اگر علم و بصیرت کی نظر رکھتے ہو تو دکھاؤ ”فطور“، ”نقص“، ”جھول“ اور خای جو تمہیں اللہ کے کاموں اور قوانین میں نظر آتی ہے پھر چیلنج دہراتے ہوئے

کہما رجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسنا ہاں ہاں تم سائنسی بصیرت کو بھی کام میں لا کر بار بار دیکھو تم جلد ہی دیکھو گے کہ تمہاری بصیرت ناکام، ”خائب“ اور خاسر تو لوٹے گی مگر اللہ کے کاموں میں جھول اور نقص کا سراغ نہ لگا سکے

گی۔ (الملک، 4)

قرآن میں ”امشاج“ وہ فیصلہ کن لفظ ہے جو اپنے ”جلو“ میں فصاحت و بلاغت کی

دنیا لئے ہوئے ہے یہ ایک ہی مقام پر آیا ہے اور صرف یہ واضح کرنے آیا ہے کہ ہر

انسان بغیر کسی استثناء کے دو نطفوں کے کچھ کی پیداوار ہے یہی قانون قدرت ہے اور یہی انسانی تخلیق کا حتمی ”فارمولا“

۔۔۔۔۔ مشج کے معنی میں بر صغیر پاک و ہند کے فقیہ القرآن علامہ پرویز (1985 م) علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں :

مشج بینہما اس نے دونوں کو باہم دگر خلط ملاط کر دیا ملا دیا (تاج و مرغوب) لکن فارس نے اس

کے بنیادی معنی کی لکھے ہیں شیء مشج و مشج ملی ہوئی چیز اسکی جمع امشاج ہے (تاج و محیط)

۔۔۔۔۔ قرآن کریم میں ہے انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج (76/2) ہم نے انسان کو اس



نطفہ (مادہ) سے پیدا کیا جس میں مختلف جوہر امکانی شکل میں (POTENTIALITIES) مخلوط ہوتے ہیں اس سے رحم مادر میں ”جنین“ وجود میں آجاتا ہے۔

(لغات القرآن طبع 1961 جلد 4/1544)

اسی طرح فتح محمد جاندھری جس نے رواں ترجمہ کی وجہ سے نام کمایا ہے اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں :  
ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا (پھر حاشیہ نمبر 1 میں لکھتے ہیں) چونکہ مرد و عورت دونوں کے نطفوں کے ملنے سے چہ بنتا ہے اسلئے نطفہ مخلوط فرمایا۔۔۔۔۔

(ترجمہ فتح الحمید طبع تاج کمپنی صفحہ 785)

رواں ترجموں کے بانی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی (1414م) لکھتے ہیں :  
ہم نے آدمی کو مرکب نطفے سے پیدا کیا (پھر حاشیہ نمبر 1 میں لکھا ہے)  
نطفے کو مرکب اسلئے فرمایا کہ مرد و عورت دونوں کے نطفوں کے ملنے سے انسان پیدا ہوتا ہے۔

(ترجمہ نذیر احمد طبع تاج کمپنی نمبر 141 صفحہ 701)

لغت اور عربی ادب کے بڑے شاعر۔ امام زنجیری (ZAMAKHSHARI 1144م) لکھتے ہیں نطفہ امشاج مختلطة و شی مشیج و مشجہ مزجہ بمشجہ۔ امشاج کے معنی مخلوط نطفے کے ہیں عرب جب کہتے ہیں شی مشیج و مشجہ، تو اس سے دو چیزوں کو ملا دینا مراد لیتے ہیں۔۔۔۔۔ (اساس البلاغۃ طبع دار الکتب المصریہ 1922 صفحہ 430 کالم نمبر 19/1 21)

امام رازی (1210م) لکھتے ہیں۔ المشج فی اللغة الخلط۔ لغت میں مشج کے معنی خلط ملط کرنے کے ہیں ابن الاعرابی (848م) کہتے ہیں واحدها مشج و مشیج و یقال للشی اذا خلط مشج کقولک خلیط جب کوئی چیز باہمی خلط ملط ہو جائے تو عرب اسے شی مشیج یعنی خلیط کہتے ہیں (پھر ابن الاعرابی نے اسلام اور جاہلیت کے بڑے شاعر) ابو ذؤیب الہذلی (648م) کے ایک بیت سے نیز استدلال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے نزول قرآن سے پہلے بھی امشاج کے معنی خلط ملط کئے جاتے تھے۔  
(تفسیر رازی جلد 30/236/10 14)

یہ لغوی شہادتیں اور قرآنی حوالے اسی ایک بات پر متفق ہیں کہ اللہ کے نزدیک مادہ اور ”نر“ کے نطفوں کے اختلاط ہی سے چہ پیدا ہوتا ہے لہذا ہمارے نزدیک عربی زبان کے کسی ادا۔ ”ناشاس“ کی پہلوانی بار آور نہیں ہو سکتی۔  
امید ہے راقم کو ملزم گردانے کیلئے جو فرد جرم عائد کر دی گئی تھی میں بنے کسی حریف کی پگڑی اچھالے بغیر اپنی صفائی بیان کر دی یہ میری ذمہ داری تھی باقی میں نہ علامہ ہوں اور نہ مناظر، پلچہ بردار سپاہی ہوں اور خاکساری میرا پیشہ ہے اس سے زیادہ میری حیثیت عربی کچھ بھی نہیں ہے۔ ☆ والسلام

## اذا قضی امر ا فانما یقول له کن فیکون

وہ جب کسی لاوجود کو ”باوجود“ بناتا ہے تو کہہ دیتا ہے ”ہو جا“ تب وہ ہو جاتا ہے۔ (عمران، 47)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ حکم ہمیشہ موجود کو دیا جاتا ہے لیکن جس کا وجود ہی ندارد ہو اسے مخاطب کرنا اصول آفرینش کے خلاف ہے کیونکہ اشیاء کا ”وجود“ علتوں سے وابستہ ہے کہ ”مفعول“ بغیر علت کے وجود میں آہی نہیں سکتا۔

**قول فیصل** فرض کرو آپ ماہر تعمیرات ہیں اپنے ذہن میں کوئی ساقیہ راتی منصوبہ تجویز کر کے پھر اسی ”تصویراتی“ محل کو ہر زاویہ سے موزوں پا کر خیال ہی خیال میں تصویر ہی تصویر میں اس سے مخاطب ہوتے ہیں کہ تو کتنا حسین اور پیارا محل ہے بس تو تو بن جا۔ حالانکہ محل ابھی پنسل سے کاغذ پر ٹریس بھی نہیں ہو پایا مگر ”منصوبہ ساز“ اسے ”موجود“ تصور کر کے خطاب کر رہا ہے جس کے لئے نہ علت کی ضرورت سمجھی گئی نہ معلول کی احتیاج۔۔۔۔۔ اسی طرح کوئی بھی ”معدوم شے“ اللہ کے علم میں ”موجود“ پانے کی صلاحیت رکھتی اور بالفعل اسکے ”حاوی تر“ علم میں ہوتی ہے۔ یعنی کہ ”شے“ اور ”لا شے“ اسکے حاوی تر علم میں ہوتی ہے اور وہ برہمائے علم ہی لا شے کو شے کی طرح خطاب کر سکتا ہے وہ اگر لا شے ہے تو صرف ہمارے اعتبار سے ہے۔ وہ کسی مادی اور ”آلی“ علت کا محتاج نہیں ہے یعنی جس طرح کھار گھرے کو وجود میں لانے کیلئے آلات مثلاً مٹی، ہاتھ اور ”چک“ کا محتاج ہے اللہ کو ان کی نہ احتیاج ہے نہ ضرورت اس کا علم اسکا آلہ اور اسکا ”ارادہ“ اسکا ”مادہ“ ہے وہ جب ”کن“ کہتا ہے تو پہلے مرحلے پر خود ہی ”علت“ بن کر کہتا ہے پھر تمام علتیں اور اسباب جمع ہونا شروع ہو جاتی اور وقت مقررہ پر ”مرحلے وار“ اسے ظہور میں لاتی ہیں اس طرح بغیر مرحلے کے کوئی بھی چیز وجود میں نہیں آتی (تفصیل ملاحظہ ہو تفسیر ”برہان القرآن“ تضاد نمبر 58) ایسے اب ایک اور مثال سے بات واضح کریں۔ کہ انسان خواب میں قوت متخیلہ و متصورہ کے زور پر اینٹوں، لوہے اور لکڑی کے بغیر گھر بناتا ہے، شہر بناتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، لڑتا، مار مار کھاتا اور کبھی کبھار ایسی اشیاء بنالیتا ہے جن کا بظاہر وجود ہی نہیں ہوتا اس طرح وہ خواب میں نہ کوئی ”میٹر“ استعمال کرتا ہے نہ ہی ”اسباب“ و آلات کام میں لاتا ہے اب اگر ہم اپنی قوت متصورہ کے سارے، بغیر ماوے و اسباب کے اتنی ساری چیزوں کو جنم دے ڈالتے ہیں تو خدائے لایزال کے لئے بغیر کسی ”علتِ آلی“ و ”علتِ مادی“ کے اشیاء کو جنم دینا کیا مشکل ہے جبکہ وہ خود بھی ”علتِ العلل“ اور علتِ لولے ہے۔

کن۔ کی مذکورہ بالا تشریح سے بجا و پرست استدلال کرتے ہیں کہ جب علتِ آلی اور علتِ مادی اسکے ارادے کا سہارا نہیں ہیں تو کیوں نہ اسے باپ کے بغیر پیدا کرنے پر قادر تصور کر لیا جائے۔

جی، نہیں عمران (47) میں اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت کاملہ کا صرف احساس دلایا ہے ورنہ تو کمال قدرت کے باوصف اس نے ہر تخلیق کیلئے ضوابط بنائے ہیں اور اللہ اپنے ضوابط کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے۔ اس نے اپنے ہر ضابطے ہر قانون، اور ہر اصول کو غیر متبدل اور ناقابلِ تحلیل ٹھہرایا ہے کہ وہ خود ہی علتِ العلل اور خود ہی ”مسبب الاسباب“ ہے اس طرح وہ

اپنی اور اپنے ضوابط اور علتوں کا محافظ بھی خود ہی ہے۔۔۔۔۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ جی ہاں لاکھوں، کروڑوں انسان آج بھی بے پدر موجود ہیں لیکن ”بے پدر“ کے معنی ”بے نطفہ“ کے نہیں اس طرح اسکی قدرت کا غلط انداز سے اظہار کیا جا رہا ہے۔ ادھر ”مشاہدہ“ کا فتوے ہے کہ انسان یا کسی جاندار کا عام روٹھن سے ہٹ کر بغیر نطفے کے پیدائش ناممکن ہے فرمایا وانه خلق الزوجین الذکر والانثی من نطفة اذاتمنی O

اسمیں نہ شک ہے نہ شبہ کہ اس نے۔۔۔۔۔ نردمادہ کے جوڑے کو قطرہ منی ہی سے پیدا کیا ہے۔ (نجم، 49، 50) اس طرح عورت و مرد کی تخلیق کا سبب قطرہ منی کو ٹھہرا کر بطور قانون تخلیق بٹر کا سبب ٹھہرایا ہے۔ یہاں۔۔۔ الذکر۔۔۔ اور الانثی پر الف و لام جنس کا ہے جس سے ہر مرد اور ہر عورت مراد ہے کوئی مستثنیٰ نہیں یعنی وہ ”لامحالہ“ قطرہ منی ہی کی پیداوار ہے۔ اسی طرح اس آیت نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ عورت آدم کی پسلی سے پیدا نہیں ہوئی اللہ نے اسے ”مستقل“ حیثیت دے اسی قطرہ منی ہی کی پیداوار کہا ہے جس طرح آفریش آدم میں نطفہ ہی کو بنیادی سبب ٹھہرایا ہے۔ نیز فرمایا ایحسب الانسان ان یترک سدی O الم یلک نطفة من منی یعنی O

انسان سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی بے مقصد بنایا گیا ہے کیا وہ اس نطفہ کی پیداوار نہیں جو منی کے عنوان سے مشہور ہے۔ (قیامت، 26، 27)

پھر آیہ (28) میں اسی حقیقت کو دہرایا کہ۔۔۔۔۔ فجعل منه الزوجین الذکر والانثی پھر منی (کے سبب ہی) سے ہر مرد اور ہر عورت کو آفریش عطا کی۔ (قیامت، 28)

بات صاف ہو گئی کہ۔۔۔۔۔ الانسان۔۔۔۔۔ الذکر ہو خواہ۔۔۔۔۔ الانثی اسکی آفریش کا سبب صرف اور صرف ”قطرہ منی ہی ہے یہ اللہ کا مکمل نظام تخلیق ہے۔ مکمل ضابطہ ”تولید“ ہے مکمل اصول آفریش ہے۔ لہذا ”کن“ کے معنی ”بے سبب“ کے نہیں سبب کا مفہوم اسکے اندر موجود ہے وہ علتوں اور اسباب کو جو د میں لانے کا بڑا سبب خود ہی ہے بلکہ ذرا غور سے جھانک کر دیکھئے تو کیہ (26) کے مفہوم میں اگر وسعت پیدا کر لی جائے تو ”سدی“ کا لفظ اپنی گہرائی اور گیرائی کے لحاظ سے اتنا بلیغ اور اظہار کیلئے اتنا جامع ہے کہ ”بے سبب“ پیدائش کے تمام سوتے بند کر دیتا ہے جس طرح اللہ کا اصول آفریش سبب، ذریعہ اور علت سے مربوط ہے اسی طرح آفریش ہی کا یہ اصول مرحلہ دار تکمیل کا غماز بھی یعنی ہر ”تخلیق“ کا ظہور مرحلہ داری کے ضوابط سے مربوط ہے ایک ہی مرحلے میں کسی بھی جاندار کی تخلیق نہیں ہوئی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مؤمن آیات (14 وغیرہ) عمران، 59۔ انعام، 2۔ فاطرہ، 11۔ بلکہ نوح (145) میں تو صاف کہہ دیا وقد خلقکم اطوارا۔ یہاں اطوارا۔۔۔۔۔ صرف مراحل کا غماز ہے۔ یعنی

اس نے تمہیں متعدد مراحل میں ظاہر کیا۔ ☆ (القرآن)

مریمؑ نے کہا۔ پروردگار میرے ہاں سچ کیسے پیدا ہوگا کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا فرمایا۔ خدایوں ہی جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے۔ (عمران، 47)

### وجه اعتراض

(طارق، 5: 7٥)

## قول فیصل

## نظام تخلیق

اور قطع الفاظ میں اعلان فرمایا کہ۔۔ لا تبديل لخلق الله

پھر اس اعلان کے معابعد فرمایا۔ ذالک الدین القیم۔

یہاں ”الدین“ چونکہ ”خلق“ کے بعد آیا ہے لہذا اس کے معنی قانون اور نظام تخلیق کے ہوں گے اور ذالک کے

اس اشارہ میں اسی نظم کی توثیق فرمادی ہے اب اگر یہ ”ذالك“ معمولی قسم کی ”معنویت“ کا حامل ہو تا تو اسے اتنی بڑی حقیقت کے اظہار کے لئے استعمال ہی نہ کیا جاتا لیکن اللہ سبحانہ نے اتنی بڑی حقیقت کے لئے ”ذالك“ ہی کو اختیار فرما کر اسکے ”معمولی پن“ کی نفی کر دی ہے۔ اب اسکے معنی صرف ”یوں ہی“ کے نہیں ہوں گے پوری حقیقت اسکے ”احاطہ گرفت“ میں آجائے گی یعنی نرمادہ کافطری اختلاط ہی تخلیق اور آفرینش کا ذریعہ ہیں جو کسی بھی مرحلہ پر زائل نہیں ہو سکتا ذالك الدین القيم۔ کہ تخلیق کا یہی طریقہ ”مید“ سے تا ”ایندم“ چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

نظام تخلیق کے بعد اب اشارے کی اہمیت معلوم کیجئے۔

### اشارہ بلیغ ترین اظہار ہے

اشارہ نہ فنی کی علامت ہے عربی میں کہتے ہیں العاقل تكفيه الاشارة۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اشارہ فنی سے نابلد ہو وہ اسے نہ سمجھ سکتا ہے نہ استفادہ کر سکتا ہے لیکن جو صاحبان عقل و دانش ہیں وہ جانتے ہیں کہ۔ ”اشارہ“ جب ”وضاحت“ و صراحت کے مقام پر ہو تو وہ مبہم نہیں ہو سکتا بلکہ زیادہ ”وضوح“ کا حامل اور ”بڑھ کر“ وضاحت کا خواہاں ہوتا ہے تاہم عام آدمی اسکی ”گہرائی“ اور ”گیرائی“ سے محظوظ نہیں ہو سکتا غالباً یہی وجہ ہے کہ مفسرین کی اکثریت جو ”ظاہر پرستوں“ پر مشتمل تھی قرآن محکم کے بہت سے اشارات کو ”مہمات“ کے خانے میں رکھ کر ”بے مقصد“ بنا دینے کی کوشش کرتی رہی ہے وہ انہیں ”گریڈنے“ اور سمجھنے کی زحمت کرنے سے بالکل فارغ رہی ہے حالانکہ علم ”بلاغت“ والے اشارے کنایے کی بات صاف لکھ گئے ہیں کہ۔ الاشارة ابلغ من الصراحة۔ اشارہ اپنی معنویت میں اثر آفرینی میں، گہرائی میں اور گیرائی میں وضاحت سے ”زیادہ بلیغ“ ہے۔ خالص کر وضاحت کے مقام پر اسکا استعمال بڑی معنویت اور ”مقصدیت“ رکھتا ہے اسے غیر مقصود بنانے کی ہمت جاہلانہ کرنا بڑے افسوس کی بات ہے قرآن کے اشارے ”بے مقصد“ یا سطحی نہیں ہوتے وما هو بالهزل۔۔۔۔۔ خالص کر اشارہ ہمیشہ ”وجود“ کی طرف ہوتا ہے ”لا وجود“ کی ترجمانی سے قاصر ہے دوسرے لفظوں میں اشارہ عموماً ”اثبات“ کے لئے ہوتا ہے فرمایا۔ وعلى المولود له رزقهن (بقرہ، 233) اس میں اولاد پر خرچ کرنے کی بات کی گئی ہے لیکن اسی ہی سے اشارہ ملتا ہے کہ۔۔۔۔۔ اولاد نسب سے چلتی ہے اور نسب کا ”اثبات“ باپ کے ناطے سے ہوتا ہے یعنی کہ اشارے میں ”تنبیت“ بدرجہ اتم ہوتی ہے خالص کر جب اعتراض اور ”استفہام“ کے جواب میں ہو تو نفی کے مفہوم سے بالکل ہی عاری ہو جاتا ہے مثلاً زیرِ بحث آیت میں وجہ اعتراض نرمادہ کے فطری اختلاط کے بغیر ولادت پر بتلائی گئی ہے۔ اسکے جواب میں کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ آئندہ خلوت بھی ہوگی۔ اختلاط بھی ہوگا۔ حمل اور چھ بھی ہوگا لیکن اس تفصیل سے بات کرنے کی بجائے اشارے کی زبان حرکت میں آتی ہے کہ جیسا تمہارا خیال ہے ویسا ہی ہوگا۔ اس طرح كذالك نے جس بلاغت اور ”معنویت“ سے مریم کا جواب فراہم کیا وہ کئی زاویوں پر پھیلی ہوئی تفصیل سے زیادہ بلیغ زیادہ ”جامع“ اور زیادہ مقصدیت کا حامل ہے۔۔۔۔۔ مریم نے یہی کہا تھا نہ۔۔۔۔۔ کہ لم یعمسنی بشر مجھے تو کسی بشر نے چھوا تک نہیں آواز آئی كذالك ایسا ہی ہوگا قرمتِ بعر بھی ہوگی اور



ولادت پر بھی۔۔۔۔۔ اس طرح یہ کذا لک مریم کے لم یمسنی کا جواب لے کر آیا ہے جو یہ بھی واضح کر گیا ہے کہ ”یمسن“ مضارع کا صیغہ ہے جس پر ”لم“ کا حرف نفی واقع ہو کر مستقل طور پر ماضی کے پیکر میں لے گیا ہے یعنی ماضی میں قرمت اور اختلاط کا معاملہ پیش نہیں آیا مگر اب ضرور پیش آئے گا۔۔۔۔۔ غور فرمائیے عمران (47) کے کذا لک اور روم (30) کے ذالک میں مقصدیت کی کتنی ہم آہنگی ہے۔

**ولادت اسحاق** عیسے کی ولادت کو ”اچھنیوں“ کے ہاتھوں تسلیم کرنے والے یہ بھی فرماتے ہیں کہ سیدنا اسحاق کی ولادت بھی مافوق الفطرت ہاتھوں کی مرہون منت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابراہیم قوت رجولیت کے ”نقدان“ کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور حضرت سارہ ”عجوز“ بھی تھیں اور ”عقیم“ بھی۔ ایسے میں جب سیدنا اسحاق کی ولادت کی بشارت دی گئی تو دونوں ”درطہ حیرت“ میں ڈوب گئے۔ حضرت سارہ عالم سراسمعی میں گویا ہوئیں۔۔۔۔۔ قالت عجوز عقیم۔ قال کذا لک قال ربک۔

والدہ اسحاق نے جب سنا کہ حضرت ابراہیم کو دانش مند بچے کی بشارت دی گئی ہے تو شرم سے لجاتے ہوئے کہا کہ۔۔۔۔۔ اے ہائے ہائے اب چہ جننے کی ہماری کوئی عمر ہے خالص کر میں عارضہ ”بانجھ“ میں مبتلا ہوں بڑھیا بانجھ بھی بھلا چہ جن سکتی ہے؟ جواب ملا۔ تیرا رب کہتا ہے کہ جس قانون تولید کی بات تم کر رہی ہو اسحاق اسی کے مطابق تولد ہوں گے (کذا لک) (منہوم از ذاریات، 29-30) اس آیت میں ”عجوز“ اور ”عقیم“ کو عوارض ”مانع حمل“ تسلیم کر کے پھر اشارے کی زبان میں کہا گیا کہ ہاں یہ عارضے ضرور ہیں مگر اللہ کے علم میں ہے کہ یہ ابھی گہری حد تک موثر نہیں ہے، قابل علاج تھے۔

**عجوز کیا ہے اور عقیم کسے کہتے ہیں؟** عام طور پر عجوز بڑھیا عورت کو کہا جاتا ہے لیکن کچھ ضروری نہیں ہے کہ ”عجوزیت“ صرف عمر رسیدگی کی غماز ہو لغت میں اس کا اطلاق جوان اور عمر رسیدہ عورت پر یکساں ہوا ہے۔ علامہ بستانی نے یہ بھی لکھا ہے والمرأة مثابة كانت او عجوزا۔ عورت جوان ہو خواہ بڑھیا اس پر ”عجوز“ کا اطلاق یکساں ہوا ہے (محیط المحيط طبع دار البیان لبنان صفحہ 577 کالم نمبر 3) سر سید علیہ الرحمہ (1898 م) علامہ ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (1414 م) کی ”القاموس المحيط“ کے حوالہ سے لکھتے ہیں المرأة شابة كانت او شيخخة (تفسیر سر سید طبع چلن الدین جلد 27/5) بلکہ سر سید نے یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ شعرا (170) میں عجوز کا اطلاق حضرت لوط کی جواں سال بیوی پر بھی ہوا ہے۔ اسی طرح لغت والے بوڑھے والدین کے آخری بچے کو بھی عجوز کہا کرتے تھے کہ وہ بھی آخری چہ ہونے کی وجہ سے لاغر، ناتوان اور کمزور ہوتا ہے بلکہ بستانی مرحوم نے عجوزا کے ایک معنی ”ضعیف“ بھی لکھے ہیں (صفحہ 577 کالم نمبر 2)۔۔۔۔۔ بات صاف ہو گئی کہ حضرت سارہ جوانی ہی میں کمزور، لاغر اور جسمانی طور پر اس قدر نحیف تھیں کہ ”حمل“ ٹھیر ہی نہیں سکتا تھا ان پر ”یاس“ و نامیدی کی حالت اس قدر طاری تھی کہ وہ عجز کو عقم ہی کا مترادف سمجھنے لگی تھیں اور یہ منہوم بالکل ہی قابل فہم



ہے کہ بعض نسوانی عوارض اور کمزوریاں حمل ٹھیرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں لیکن اس طرح کی بیماریاں قابل علاج ہوتی ہیں اور علاج عین فطرت ہے اس میں نہ تعجب کی بات ہے نہ خلاف مشاہدہ۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت دینے والوں نے بی بی سارہ سے کہا کہ تمہیں تعجب اور حیرت ہے کہ ایسی مریضہ کو چہ کیسے ہوگا؟ یہ تو مایوسی کی بات ہوگی (ہود، 73، 74) اس پر انہیں اطمینان ہو گیا۔ اور اللہ کا یہ اشارہ (کذا لک) انہیں سمجھ آ گیا کہ اس میں اللہ نے اپنے قانون کا حوالہ دے کر تمام عوارض کے علاج کو ممکن بنا دیا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ گواہ ہے کہ عجز اور عقور مردانہ ہوں خواہ زنانہ علاج سے درست ہو سکتے ہیں یا وقت گزرنے پر ”اندرونی“ طور پر ان ”خرابیوں“ کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ طویل عرصہ تک اولاد نہ ہونے کے باعث ماں باپ فیصلہ کر بیٹھتے ہیں کہ اب انہیں اولاد کیسے ہوگی؟ کہ یکا یک چوں کی لائن لگ جاتی ہے خوشیاں اس قدر ”ٹمڈ“ ہوتی ہیں کہ والدین دنگ رہ جاتے اور پھر سے توانائی اور جوانی محسوس کرنے لگ جاتے ہیں اور اس طرح اللہ کی بات پوری ہو جاتی ہے **کذا لک قال ربک**

ہود (74) میں سیدنا ابراہیمؑ پر ”شیخ“ کا اطلاق ہوا ہے جس سے ”لامحالہ“ ایسی عمر مراد نہیں ہے جو ”حیوانی“ جذبات سے عاری ہو۔ امام ابو منصور اسماعیل ثعالبی (1038 م) اپنی نادرہ روزگار تصنیف ”فقه اللغة“ میں انسانی عمر کے سٹیجز میں جہاں شیخ کی وضاحت کرتے ہیں تو ان کے استقراء کے مطابق ”کہولت“ (چالیس برس) کے بعد اس کا نمبر شروع ہو جاتا ہے۔ شیخوخۃ کے بعد قحور۔ اسکے بعد نمایاں بڑھاپا جسے مرثی میں ”یفن“ یا ”دردح (DIRDAH)“ کہتے ہیں اور جب ضعف اور اضمحلال مزید بڑھنے لگتے ہیں تو جلد حجاب یا مہتر۔ (فقه اللغة طبع بیروت صفحہ 84)

بات کیا ہوئی کہ چالیس یا پینتالیس سال تک کہولت کا اور اسکے بعد شیخوخۃ کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح سیدنا ابراہیمؑ ایسی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ شہوانی ”خصائص“ سے محروم ہو چکے ہوں۔ (مزید وضاحت کیلئے ملاحظہ ہو ہود

☆

(173, 172)

## صلاة میں باتیں کرنا

61

### ولا تجهر بصلاتک ولا تخافت بها

(عمران، 49) صلاۃ میں نہ بلند آواز سے کام لو اور نہ دل میں دہراؤ۔

میں کہا گیا ہے کہ سیدنا زکریاؑ نماز کی حالت میں تھے کہ فرشتے نے آواز دی۔ اور آپ نے نماز ہی میں

جواب دے ڈالا جو آداب صلاۃ کے منافی ہے۔

**وجہ اعتراض**

یہاں صلاۃ کے معنی رکوع و سجود والی صلاۃ کے، نہیں۔ صرف دعا اور پکار کے ہیں جیسے فرمایا ان

صلاتک سکن لہم۔ آپ کی دعا ان کیلئے طمانیت اور سکون کا موجب ہے۔ (توبہ، 104)

**قول فیصل**

☆

مسیحؑ پنگوڑے میں باتیں کرتے تھے؟

ویکلم الناس فی المهد وکھلا

(عمر ان، 55)

اور وہ مہر اور کمولت میں کلام کرے گا۔

یہ ہے کہ اگر وہ ”ماں کے پیٹ“ ہی سے کلام کرتا ہو بلا ہر آئے گا تو یہ قانونِ فطرت کے خلاف

## وجه اعتراض

— 4 —

یہ ایک پیشگوئی ہے جو مسیحؑ کے کلام کرنے سے بحث کرتی ہے۔ یہاں ”مہد“ صفر سنی کا استعارہ

## قول فیصل

ہے جس سے شیر خواہ گی کا زمانہ مراد، نہیں ہے بلکہ یہود کے احبار اور یہاں جو عمر رسیدہ تھے سیدنا

”مسح“ ان کی مناسبت سے ہے ہی تھے ”مطلول“ کے دیباچے میں سعد الدین تفتازانی (1389م) کسمن شزاوے کی فراست

ودائشمندی کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے شاعر کی بات نقل کرتا ہے کہ اس نے اپنے زمانے کے ایک کم عمر شاعر اے کی باتوں کو۔ مہد میں کلام کرنے سے تشبیہ دی تھی۔ شاعر کہتا ہے :

في المهدي نطق عن سعادة جده

کسمن امیر المؤمنین مہدیؑ نے کم عمری ہی میں اپنی سعادت و خوش بختی کی بات کر رہا ہے۔

اس طرح کلام فی المہد۔ صرف کم سنی کا استعارہ ہے ورنہ تو کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ مشارالیه۔ اموی

شہزادہ حقیقت میں بھی پنگوڑے اور ماں کی گود میں باتیں کرتا ہوا لپٹا گیا۔ اب اگر کلام فی المہد سے معجزہ مراد لیا جائے تو

اس طرح کا ”معجزہ“ غیر پیغمبروں کے لئے بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ”محاورے“ جب تشکیل پاتے ہیں تو نہ ہی اصطلاحات

کی جدیدی سے ”ماورا“ تشکیل ماتے ہیں اور وہی ”اصنافِ سخن“ کی جان ہوتے ہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ اس سے صرف نئی

ہذا کا معجزہ مراد ہے تو بھی معجزہ کا اصول ہے کہ اس کا "اعادہ" اور تکرار نہ ہو جبکہ فرمایا۔ لیحی خذ الكتاب بقوة وآتیناہ

الحكم صبيًا -

اے بچے! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو اور ہم نے اسے بچھن ہی سے نبوت عطا کر رکھی تھی (مریم، 11)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ پیغمبرؐ کی ”نبوت“ کم سنی کی نبوت تھی اور اس نے بچپن ہی میں کلام کیا تھا جس سے

یہودی ”بدکتے“ اور رب کی جان کے لاگو بن گئے تھے۔۔۔۔۔ اب پھر اسی ہی خاندان میں دوسرے ”کم سن“ نبی کا ظہور نہیں

کیوں کر گوارا ہو سکتا تھا وہ اے نبی سے مات کرنا نبی "اتا" اور پندار کے خلاف سمجھتے اور کہتے تھے کہ کیف نکلم من کان

في المهد صبيًا -

(مریم، 29)

ہم اے آدمی سے کیسے بات کریں جو کل کالونڈا ہے۔

مات صاف ہو گئی کہ یہودیوں کا پندار اجازت نہ دیتا تھا کہ اپنے سے ”چھوٹی“ عمر کے نبی سے بات کریں۔

آیہ زیر بحث میں کھولت۔ یعنی ادھیڑ عمر میں بھی بات کرنے کا اشارہ دیا ہے جبکہ شیخوخۃ (بڑھاپے) کا ذکر بھی ہونا چاہئے تھا جی نہیں وجہ یہ نہیں بنی کہ آپ ”کھولت“ (32 سال) کی عمر میں تھے کہ ”واقعہ صلیب“ پیش آیا اس کے بعد آپ کے حالات زندگی اور ”پیغام رسانی“ کے واقعات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ لہذا ”بڑھاپے“ میں باتیں کرنے کا ذکر نہیں ہوا۔ جہاں تک ”کھولت“ میں پہنچ کر باتیں کرنے کا اشارہ ہے تو یہ واضح کر رہا ہے کہ جوں ہی آپ نے ”کھولت“ میں قدم رکھا ”پیغام زندگی“ چھلک پڑا۔ اب مزید کسی زندگی کا امکان ہوتا تو وحی کے الفاظ میں اس کی بھی وضاحت ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحی دنیا آج مسیح کی زندگی سے مایوس ہو کر ”مسیحیت“ میں ”تحلیل“ ہو چکی ہے۔ اب صرف ”مسلمانوں“ ہی کو انتظار ہے اور وہی مسیح کے نزول کے ”منظر“ بیٹھے ہیں اور ان کے لئے ”غیر معمولی“ زندگی کے اثبات کیلئے سینکڑوں معجزے تخلیق کر ڈالے ہیں۔ وہ نہ صرف قوانین فطرت کو توڑنے پر مصر ہیں۔ نزول مسیح کے ”پردے“ میں ”اجراء نبوت“ کے قائل بھی ہیں وہ آئیں گے جزیہ اور جہاد کو بھی منسوخ کریں گے جبکہ ”رسول“ یا کسی نبی کے واضح احکام کو منسوخ کرنا کسی ”مستی نبی“ کا نہیں ”مستقل پیغمبر“ ہی یہ فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ وحی قرآن اور رسالت محمدیہ ﷺ کی ”خاتمیت“ میں نقب لگانے کیلئے ہی ”انتظار مسیح“ کا نظریہ تخلیق ہوا اور ائمہ محدثین نے اسے پختہ بنانے کے لئے درجنوں دیگر معجزے تخلیق کر ڈالے۔ میرا ایمان یہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی کہ سیدنا مسیح ”کھولت“ کے بعد زندہ ہی نہیں رہے۔ مسیحی خود بھی اس کا انتظار ختم کر کے مرفون تسلیم کر چکے ہیں بیت المقدس میں ”قبر مسیح“ کا گرجا موجود ہے میں نے 65ء سے پہلے اس گرجا کو دیکھا ہے۔ اس کے متولی مسیحی ہیں مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہونا چاہئے کہ مسیح ”رسول الہی بنی اسرائیل“ (عمران، 49) تھے ہمارے آخری پیغمبر کے بعد ہمارے لئے کوئی بھی نیا خواہ پرانا فرستادہ خدا نہیں آئے گا۔

☆

## ”مسیح“ کے پیروکار ہی کامیاب رہیں گے

63

### وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

ہم آپ کو اور آپ کے پیروکاروں کو ان پر ہمیشہ فوقیت دیں گے جو آپ کے منحرف ہیں۔ (عمران، 55)

میں کہا جاتا ہے کہ جو مسیح کے پیروکار ہیں قیامت تک صرف وہی فائز و کامران رہیں گے اور مسلمان غلام و ناکام ہوں گے۔

**وجہ اعتراض**

ہم نے مسیح کی ذات سے کفر کیا نہ انکار بلکہ سب سے زیادہ قرآن ہی نے آپ کا دفاع کیا ہے

**قول فیصل**

ہمارے ہمارا شمار مخالفوں میں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہماری ”اکثریت“ مسیح کے انتظار میں اپنے

پیارے نبی ﷺ کی ”خاتمیت“ کو بھی ”داؤ“ پر لگائے ہوئے ہیں یہ بات جس پس منظر میں کہی گئی ہے وہ ہمارے ”دینی لقب“ سے چھ سو سال پہلے کہی گئی تھی اور اس وقت ہم موجود نہیں تھے نہ ہمارا قرآن اور ”رسول انسانیت“ تاکہ معلوم ہو سکتا کہ

”مسح“ اور آپ کے پیروکاروں کو کیسی فوقیت سے اور کن کے مقابل نوازا گیا تھا؟



## قانونِ فطرت کے آگے ہر چیز سرنگوں ہے

64

وله اسلم من فی السماوات والارض طوعا و کرہا

(عمران، 83)

اور خوشی یا مجبوری سے ہر شے اس پر ایمان لاتی ہے۔

یہ ہے کہ اس آیت میں جبری ایمان لانے کی بات کی گئی (کرہا) جبکہ دین میں نہ جبر ہے نہ اکراہ۔

(بقرہ، 256)

وجہ اعتراض

یہاں ایمان لانے کی بات نہیں ہوئی اشیا کا جو ”نیچر“ اللہ نے بنایا ہے اس پر جو عمل ہونے کی

قول فیصل

وضاحت ہے، یعنی ہر چیز کسی نہ کسی رنگ میں قانونِ فطرت کے آگے سرنگوں ہے مرغی کا چو

اٹھنے کے خول سے باہر آتے ہی دانے کی طرف رخ کرتا ہے تو ایسا کرنا اسکے نیچر میں شامل ہے۔ بطح کا چو باہر نکلتے ہی پانی کی

طرف دوڑتا ہے تو ایسا کرنا اس کی اتماد میں شامل ہے عطاہذا القیاس ہر چیز میں فطرت اور نیچر کا پرتو ”ضو قلن“ ہے۔ یہاں

اسلام کا لفظ استسلام کے مفہوم میں لیا ہے جو قانونِ فطرت کے آگے سر جھکانے کو واضح کرتا ہے۔



## دین بمعنی-----قانون

65

ومن یتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه

(عمران، 85)

جس نے بھی اسلام کے علاوہ دین اختیار کیا وہ قبول نہ ہوگا۔

میں کہا جاتا ہے کہ اگر اسلام کے علاوہ سب ادیان کو مسترد کر دیا جائے تو ”مصدقہ المابین یدیہ“ کا

وجہ اعتراض

مفہوم واضح نہ ہو سکے گا۔

یہاں دین کے معنی قانون کے ہیں ”اصطلاحی دین“ یا کسی ”مذہبی نیشنلٹی“ کے نہیں ہیں۔ اس

قول فیصل

طرح کہا یہ گیا ہے کہ اب اسلامی حکومت بن چکی ہے اس کا آئین مملکت بھی سامنے آچکا ہے جس کا

نام اسلام ہے اور بین الاقوامی ضابطوں کی رو سے ایک مملکت میں ایک ہی آئین چلے گا ورنہ گنجائش نہیں ہے لیکن یہ آئین

ایسا ہے جو مملکت کے ہر فرد کو تحفظ فراہم کرتا ہے وہ انصاف کو مسجد اور مندر کے تناظر میں نہیں دیکھتا۔ لا اعبد

ما تعبدون۔ کے باوصف ”لکم دینکم ولی دین“ کا درس دیتا ہے۔





## ہدایت کی صلا۔ عام نہیں ہے؟

66

### والله لا يهدي القوم الظالمين

(عمران، 86) اللہ ظالموں کے لئے ہدایت کے بند دروازے نہیں کھولے گا۔

یہ ہے کہ اگر ظالموں پر ہدایت کے دروازے بند کئے جائیں گے تو اسکے حصول کا ذریعہ کیا ہو گا اور ہدایت سے محروم رہ جانے والوں کو کس اساس پر ظالم کہا جائے گا؟

**وجہ اعتراض**

یہاں ہدایت کے معنی صرف ”رہنمائی“ کے ہیں وہ ”خاص ہدایت“ نہیں ہے جس سے کائنات بشری کو بہرہ ور کرنا مقصود ہے وضاحتاً فرمایا۔ کیف یهدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانہم

**قول فیصل**

وشهدوا ان الرسول حق وجو لوگ رسول کی رسالت کی سچی گواہی دے کر بھی یعنی ایمان سے بہرہ ور ہونے کے باوجود بھی کفر کی راہ چل پڑتے ہیں تو انہیں اللہ۔ کس طرح ہدایت کی نعمت سے فائدہ اٹھانے کا چانس دے سکتے ہیں۔ یہاں۔ کیف۔ اظہار ناراضگی کا مظہر ہے مزید اگلے عنوان میں ملاحظہ ہو۔



## بار بار نظریہ تبدیل کرنا قابل معافی نہیں

67

### ان الذين كفروا بعد ایمانہم ثم ازدادوا کفرا لن تقبل تو بہتم

(عمران، 90) جو ایمان کے بعد کفر کی راہ چل پڑے بلکہ زیادہ زور و شور سے چل پڑے تو ان کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

میں کہا جاتا ہے کہ مرتدوں کیلئے اگر توبہ کے دروازے بند کر دیے گئے تو قبولی معذرت کا دوسرا کون سا ذریعہ ہو گا جو ”محسیت کاروں“ کے کام آسکے گا؟

**وجہ اعتراض**

یہاں ”ہر“ معذرت کی نفی نہیں کی گئی اس ”توبہ“ کی نفی ہے جس سے نفع پہنچنے کی صورت باقی نہیں رہتی ہو مثلاً ایک ”شخص“ سرکشی، نافرمانی اور ایمان کے منافی امور میں اتنا ”منہمک“

**قول فیصل**

ہو جاتا ہے کہ اسے موت اگر دبوچ لیتی ہے اور وہ سنبھلے بغیر یعنی آزادانہ سوچ کی مہلت نہ پا کر توبہ کر لیتا ہے تو اس کی یہ توبہ سود مند نہیں ہو سکتی۔ اس طرح لن تقبل تو بہتم۔ استعارہ ہے فائدہ نہ پہنچنے کا۔ اس سے جو لوگ ”جان بخشی“ کا چانس نہ ملنا مراد لیتے ہیں وہ بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں کیونکہ ایمان آزادانہ غور و فکر اور پھر ”دل جماعہ“ رکھنے کا نام ہے ذرا بے اطمینانی نمودار ہوئی سوچ کے تقاضے بدل گئے۔ اب اسلام کسی کو ”منافقت“ پر قائم رہنے پر زور نہیں دیتا۔ لہذا ”دسمانی سزا“ سے بھی دوچار نہیں کرتا۔



## ایمان کے لئے ”تناظر“ نہیں ہوتا

68

### ولو آمن اهل الكتاب لكان خيرا لهم

(عمران، 110)

اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا۔

یہ ہے کہ آیہ زیر بحث میں ”خیراً“ کا لفظ ”مقابل“ کا لفظ ہے یعنی دو چیزوں کا ”تناظر“ جبکہ یہاں پر یہ لفظ ایمان کا وصف بنا ہے (ولو آمن)۔۔۔۔۔ اور ایمان کی بات ایسا محاورہ نہیں ملتا کہ۔ ایمان اس سے ”خیر“ ہے۔

وجہ اعتراض

سے ”خیر“ ہے۔

یہاں ”دو“ خیر اس طرح ہیں کہ اہل کتاب سیدنا موسیٰ پر ایمان لا کر ایک ”خیر“ کے تو حامل بن گئے ہیں لیکن اگر وہ ان ہر دو پر ایمان لانے کی طرح سید البشر ﷺ پر بھی ایمان لاتے تو

قول فیصل

تیسرا خیر بھی سمیٹ سکتے تھے۔ اس طرح نہ ایمان کی تقسیم مطلوب ہے اور نہ ”بہتر خیر“ سے مطلق خیر کی نفی۔ بلکہ آیہ زیر بحث اپنے وسیع تر مفہوم میں درس دیتی ہے کہ اچھائی و ایمان کی صرف پیشکش کی جاسکتی ہے قبول کرنے کیلئے جبر سے کام نہیں لیا جاسکتا۔

☆

حسنة. کو صیغہ ”مس“ اور ”سینة“ کو ”اصابة“ سے واضح کرنے میں کیا مصلحت ہے؟

69

### وان تمسککم حسنة تسوهم وان تصبهم سيئة يفرحوا بها

(عمران، 120)

اگر تمہیں بھلائی پہنچتی ہے تو انہیں بری لگتی ہے، نقصان کی بات ہو تو خوش ہو جاتے ہیں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”حسنة“ کو صیغہ ”مس“ اور ”سینة“ کو فعل ”اصابة“ کے پیرائے میں میان کرنے میں کیا مصلحت تھی؟

وجہ اعتراض

یہاں ”مس“ دراصل ”اصابة“ ہی کا استعارہ ہے جو کلام میں ”لفظی“ تنوع پیدا کرنے کیلئے استعمال ہوا ہے۔

قول فیصل

☆

## پیغمبر کے اختیارات وسیع یا محدود؟

70

### ليس لك من الامر شيء او يتوب عليهم او يعذبهم

(عمران، 128)

تمہیں نہ کسی کو معاف کرنے کا اختیار ہے نہ گرفت کرنے کا۔



یہ ہے کہ جب رسولِ انسانیت ﷺ کا یہ حال ہے تو دوسروں کا کیا ہوگا؟

**وجہ اعتراض**

جو مغموم لیا گیا ہے اس سے دین کی عمارت ہی ”منہدم“ ہو جاتی ہے بلاشبہ رسولِ انسانیت ﷺ۔

**قول فیصل**

مندرجہ بھی ہیں یعنی بُرے اعمال کے نتائج اور عواقب پر وارننگ دینے والے بھی ہیں اور قانونِ خدا کی حکمتِ بالغہ سے وضاحت کرنے والے بھی اگر آپ کو یہ امتیازی ”رفعتیں“ حاصل نہ ہوں تو کس بنیاد پر واجبِ اطاعت ٹھہر سکتے ہیں؟ ہاں یہ درست ہے کہ بندوں کی ”مصلحتوں“ کی تدبیر کرنا۔ یا دین میں کیا مناسب ہے اور کیا نہیں آپ کے دائرہ اختیار سے خارج ہے لیکن دنیاوی معاملات میں آپ کے اختیارات وسیع تر ہیں لہذا ساتھ ہی وضاحت فرمادی۔ اویتوب علیہم او یعذبہم فانہم ظالمون۔

ان کی معذرت قبول فرمائیں یا نہیں سرزنش کر ڈالیں ان کی پیشانی پر ظالم کا کتبہ آویزاں ہو چکا ہے اب اگر یہ ”ظلم نفس“ سے باز آتے اور اس کتبہ کو اتار پھینکتے ہیں تو آپ کی ”پردہ پوشی“ موجود ہے اور اگر باز نہیں آتے تو اللہ کا عذاب سامنے ہے جو کوئی سی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ☆

**آگ صرف کافروں کے لئے ہوگی اور مسلمان؟**

**71**

**واتقوا النار الی اعدت للکافرین**

(عمران، 131)

اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ اس میں عذاب کو صرف کفار کیلئے بتلایا گیا ہے۔

**وجہ اعتراض**

لیکن اس سے دوسرے جرائم پیشہ اور بدکاروں کیلئے عذاب کی نفی کیسے لازم آتی ہے جب کہ

**قول فیصل**

دوسروں کی حالت بھی ”حجت“ و براہین سے مربوط ہے۔ ہم جب کہتے ہیں۔۔۔۔۔ اتا سارا کھانا مہمانوں کے لئے ”تیار“ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ گھر والوں کیلئے ”تیار“ نہیں کیا گیا؟ پھر ”واتقوا“ کی ”وارننگ“ ہے ہی مسلمانوں کے لئے۔۔۔۔۔ ☆

**رحمان۔ تو غفار ہے کیا انسان بھی ”غفار“ ہو سکتا ہے؟**

**72**

**ومن یغفر الذنوب الا اللہ**

(عمران، 135)

اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخش دے؟

## وجہ اعتراض

یہ ہے کہ۔ گناہ معاف کرنا صرف اللہ کا کام ہے لیکن دوسرے مقام پر فرمایا۔ واذا ما غضبوا. ہم یغفرون جو بے حیائی اور گناہ کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں انہیں جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں (شورے، 37) اس طرح ”مغفرت“ اور قبولِ مغفرت کی نسبت خود انسان کی طرف کر کے احساس دلایا ہے کہ اس نازک اور ”حساس“ معاملہ میں خدا اور انسان کا کردار ایک جیسا ہے۔

## قول فیصل

آئیے زیرِ بحث میں ”الذنب“ کا لفظ ہے جس کا الف، لام استغراق کے لئے ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ۔ پردہ پوشی ”کا اختیار صرف خدا کو ہے البتہ اگر چھوٹی موٹی کوتاہیاں دوسرے بھی ور گذر کر سکتے

ہیں جیسا کہ شورے میں ہے۔



## قتل اور موت میں کیا فرق ہے؟

73

## افان مات او قتل

(عمران، 144)

وہ طبعی موت مرے یا قتل ہو جائیں۔

## وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ ”موت“ کے اطلاق میں قتل شامل ہے اس لئے الگ ذکر کر دینے میں کیا مصلحت ہے؟

## قول فیصل

قتل بھی اگرچہ ”موت“ ہی سے تعبیر ہے تاہم صرف ”موت“ کے اطلاق سے ”مقتول“ کا مفہوم واضح نہ ہو سکتا تھا کیونکہ موت طبعی یا حادثاتی ”جاں کنی“ کا نام ہے جس کے لئے قانونی معاوضہ نہیں ہوتا اور ”قتل“ ارادی اور ”غیر طبعی“ موت کا اسم ہے جسکے لئے قصاص یا ”معاوضہ“ ہوتا ہے۔



## قیامت میں خیانت شدہ مال کہاں سے آئے گا؟

74

## ومن یغلل یأت بما غل يوم القيامة

(عمران، 161)

خان کوروز قیامت خیانت شدہ مال کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

## وجہ اعتراض

یہ ہے کہ دوسرے مقام پر فرمایا لقد جنتموننا فرادی کما خلقناکم اول مرۃ وہ ہمارے حضور ”دستِ خالی“ آئیں گے (انعام، 94) جب وہ خالی ہاتھ آئیں تو خیانت شدہ شے کہاں سے

لائیں گے؟

## قول فیصل

یہاں ”جرم“ خیانت کی ”تعلینی“ کا احساس دلاتے ہوئے جمع خیانت شدہ مال کے پیش کرنے کا مقصد صرف ”اعتباری“ ہے حقیقی نہیں ہے۔



## مصیبت کہاں سے آتی ہے؟

75

وما اصابکم يوم التقى الجمعان فباذن الله

جو کچھ جنگسرد میں تمہیں پیش آیا اللہ کے حکم سے پیش کیا۔ (عمران، 166)

میں کہا گیا ہے کہ سابقہ آیت میں مصیبت کو ”من عند انفسکم“ فرما کر انسان کے عمل کو اس کا ذاتی فعل قرار دیا ہے اور یہاں ”باذن اللہ“ کہہ کر اللہ کا فعل ٹھیرایا ہے۔

## وجه اعتراض

اللہ کا ”وطیرہ“ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کو ”رسوائی“ سے دوچار نہیں فرماتے لہذا یہاں ”اذن“ کے معنی ”علم“ کے ہیں اس بنا پر معنی ہوں گے جو کچھ کفار نے تمہارے ساتھ کیا۔

## قول فیصل

اللہ کے علم میں تھا۔



## شهداء کے کھانے پینے کا مسئلہ

76

ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون

جو اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو زندہ ہیں اور اللہ کے ہاں کھاتے پیتے ہیں۔ (عمران، 169)

یہ ہے کہ ”عند“ کے لفظ سے اللہ کے لئے مکانیت کا ترشح ہوتا ہے۔

## وجه اعتراض

یہاں ”عند“ کا لفظ ”قرب“ اور رفع المنزلة کا استعارہ ہے اور ”رزق“ کے معنی راغب وغیرہ نے ”عزت و جاہ“ کے لکھے ہیں یعنی شہداء کا اللہ کے ہاں ”اونچا“ مقام ہے اور ان کا نام ہمیشہ یاد

## قول فیصل

کیا جاتا رہے گا۔ یہ یاد رہے کہ مطلق رزق ہمارے ہاں ”خوردنی“ اشیاء کیلئے بولا جاتا ہے جبکہ عربی میں ”ذین“ اور ”عطائے محض“ کیلئے استعمال ہوتا ہے مثلاً فلاں کا رتبہ اللہ کی دین ہے تاہم اگر کھانے پینے کا قرینہ ہو تو اس وقت لا محالہ عربی میں بھی کھانے پینے پر اطلاق ہو جاتا ہے مثلاً لایاتیکم طعام ترزقانه قبل اس کے کہ تمہارا کھانا تم تک پہنچے (یوسف، 37) یہاں طعام کے قرینے نے رزق کو ماکولات و مشروبات کا لباس پہنایا ہے۔

کفر۔ اللہ کی منشا ہی سے سرزد ہوتا ہے؟

77

ولا يحزنك الذين يسارعون في الكفر انهم لن يضروالله شيئاً يريدالله ان  
لا يجعل لهم حظاً في الآخرة

جو کفر کے لئے جلدی کرتے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا  
کچھ حصہ بھی نہ ہو۔  
(عمران، 176)

میں کہا جاتا ہے کہ اللہ۔ کافروں کے کفر کا خود ہی ارادہ رکھتے اور آخرت کی بھلائیوں سے محروم  
وجہ اعتراض کروینا چاہتے ہیں۔

قول فیصل یہاں ”یرید“ کے فعل کے بعد ”حظاً“ کا لفظ آیا ہے جو کفر کا نہ استعارہ ہے اور نہ ہم معنی۔

☆

ان کے جرائم میں اللہ خود ہی اضافہ کرتا ہے

78

ولا يحسبن الذين كفروا انما نملی لهم خیر لانفسهم انما نملی لهم  
لیزدادوا اثماً

کافر یہ خیال نہ کریں کہ ہم نے ان کے لئے جو ڈھیل دینے کا عمل شروع کر رکھا ہے ان کی بہتری کا عمل ہے۔ نہیں ڈھیل  
تو اس لئے ہے کہ وہ اور گناہ کریں۔  
(عمران، 178)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار اپنے کفر میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔

لیز داذوا اثماً۔ کے معنی ہیں وہ گناہ کریں اور اپنے کفر کو تو توں کی ”ر سواکن“ سنگین سزا بھگتیں۔

قول فیصل عربی میں ”انم“ طالب سزا فعل کو کہا جاتا ہے۔ نفس فعل۔ کو نہیں اور اس مفہوم کو ”لیزدادوا“

کے ناطے سے زیادہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہاں لام برائے عاقبت ہے یعنی وہ۔ کفر میں اس لئے ایذا کرتے ہیں کہ سزا پائیں۔

اس طرح لیز داذوا کا یہ مفہوم بھی ہے کہ۔۔۔۔۔ وہ لمبی عمر یا کر اپنے کفر میں اضافے کا موجب بنتے جائیں اور یہ اضافہ یا

ایذا۔ اللہ کی طرف سے نہیں۔ اللہ نے تو واضح کر دیا ہے۔ انما نملی لهم خیر کہ ہم نے اپنی جانب سے ڈھیل دینے کا

اہتمام تو اس لئے کر دیا تھا کہ وہ سنبھل جائیں مگر انہوں نے ڈھیل کا مفہوم غلط سمجھا اور برائیوں میں بڑھتے چلے گئے۔

☆

مَنْ۔ کا حرف عموم کے لئے ہے جو کافروں اور مسلمان کو یکساں شامل ہے

79

ربنا انك من تدخل النار فقد اخزيته

(عمران، 192)

اے رب جسے تم نے لقمہ نار بنایا اے رسوا کیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”مَنْ“ کا حرف عموم کا متقاضی ہے جو کافروں اور مؤمنوں کو یکساں شامل

وجہ اعتراض

ہے جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا یوم لا یخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ۔۔۔۔۔۔ اس دن اللہ نبی اور مؤمنوں کو رسوا نہیں کرے گا (تحریم، 8)۔۔۔۔۔۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”جہنم کا ایندھن نہیں بنیں گے۔“

قول فیصل

یہاں تضاد کی ٹوہ لگانا عبث ہے کہ آیہ زیر بحث میں ”خزی“ کا لفظ ”رسوائی“ اور ذلت کے مفہوم

میں آیا ہے جو صرف کفار کا حصہ ہے اور تحریم (8) میں اس کا مادہ (ROOT) الخزایہ ہے جس کا

مفہوم صرف ”سزا“ ہے۔ اس طرح جو بھی لقمہ نار بننے کا وہ تو ذلیل و رسوا ہو گا لیکن جو خزایہ کا نشان بنے گا اے سزا بغیر

رسوائی کے ملے گی۔ اور یہ مفہوم یوں بھی موزوں ہے کہ تحریم کی آیت۔۔۔۔۔۔ سابقہ مضمون پر بغیر ”عطف“ کے۔

”مبتداء“ کے طور پر آئی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ معتزلہ۔ اہل ایمان کے لئے نار کا دخول نہیں مانتے وہ ایسی تمام آیات کی

تصریف آیات کے قیاس میں تاویل کرتے ہیں۔ ☆

گناہوں پر پردہ ڈالنے اور محو کرنے میں فرق

80

ربنا فاغفر لنا ذنوبنا و کفر عنا سیئاتنا

(عمران، 193)

اے رب ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال اور برائیاں محو کر دے۔

یہ ہے کہ گناہوں پر پردہ ڈالنا۔ برائیوں کے محو کرنے میں شامل ہے ایسے میں فاغفر لنا۔ کے

وجہ اعتراض

دہرانے میں کیا مصلحت نہاں ہے۔

عربی میں ”غفران“ اور ”نکفیر“ کے مختلف معانی ہیں۔ غفران اس کے ”فضل“ کا غماز ہے اور تکفیر

قول فیصل

”عمل صالح“ سے مربوط ہے۔

12-2-96 ملتان

☆



## حواء آدم کی بیٹی۔ یا بیوی؟

81

### وخلق منها زوجها

(نساء، 1)

اور آدم سے حوا کو پیدا کیا۔

میں کہا گیا ہے کہ آیہ زیر بحث میں آدم و حوا کو ایک ہی جان سے پیدا کیا گیا ہے جس سے ایک تو خاری کے اس نظریہ کا اثبات ہوتا ہے کہ عورت۔ آدم کی پہلی سے پیدا ہوئی ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر حوا بھی آدم کا حصہ ہیں اور اولاد آدم بھی تو اس زاویہ سے حوا۔ ہماری بہن بنتی ہیں۔ ماں نہیں بن سکتیں۔

### وجه اعتراض

آیہ زیر بحث میں نہ آدم کا نام لیا گیا ہے اور نہ حوا کا ہم نے تقرب فہم کے لئے ان کے نام فرض کئے ہیں۔ اب جہاں تک امام خاری کے فلسفہ کا تعلق ہے تو وہ بہتر جانتے ہوں گے کہ حوا۔ آدم کی پہلی سے کیسے پیدا ہوئیں؟ کیونکہ امام خاری کی تائید نہ عقل سے ہوتی ہے نہ سائنس سے بناہیں وہ بحث کے قابل بھی نہیں ہے جہاں تک وحی قرآن کا تعلق ہے تو اس میں وضاحت ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی تخلیق ایک ہی ”جنس“ سے ہوئی ہے اسی سے ”مرد“ پیدا ہوا اور اسی سے ”وجود زن“ نمودار ہوا۔ یہاں منہا میں حرف ”من“ ”تبیین“ کے لئے ہے جو تمام تر جنس انسان کو شامل ہے ”تبعیض“ کے لئے نہیں تاکہ صرف عورت ہی کو انسان کا حصہ یا بعض کہا جائے؟

☆

## موت اور وفات میں فرق

82

### حتى يتوفاهن الموت

(نساء، 14)

تاکہ موت نے انہیں وفات دی۔

یہ ہے کہ وفات اور موت ایک ہی معنی کے حامل ہیں اس طرح گویا معنی ہوں گے موت نے انہیں موت دی۔

### وجه اعتراض

یہاں وفات کا فاعل موت نہیں وفات کے فرشتے ہیں اب معنی صاف ہو گئے۔ تاکہ فرشتہ اجل نے انہیں موت سے ہمکنار کیا۔ ☆

### قول فیصل

## خالق پر توبہ لازمی ہے؟

83

### انما التوبه على الله



(نساء، 16)

توبہ صرف اللہ پر فرض ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا گیا ہے کہ یہاں کلمہ حصر ”انما“ کے ساتھ واضح کیا ہے جس سے توبہ۔ صرف اللہ کا عمل بن جاتا ہے حالانکہ وہ گناہوں سے بھی پاک ہے اور خطاؤں سے بھی منزہ۔

قول فیصل

یہاں مضاف ”مخدوف“ ہے جبکہ۔ حذف ”والتقذیر“ کلام میں ”ایجاز“ و ”عجاز“ پیدا کرنے میں خاص ”تاثر“ رکھتے ہیں اس طرح معنی ہوں گے۔ توبہ قبول کرنا اللہ کا کام ہے کسی دوسرے نہ حق ہے نہ

اختیار۔ علاوہ ازیں توبہ کے لغوی معنی رجوع کرنے کے بھی ہیں اور وہ رجوع اس طرح ہے کہ اللہ اپنی ”عطوفت“، درگزر اور رحمت سے بندے کو نوازے۔



## باپ کی بیوی سے شادی رچانا

84

### ولاتنکحو امانکح آباً کم الاماقدسلف

جن عورتوں سے تمہارے باپ کا نکاح ہو چکا ان سے مہا نہ رچاؤ ماضی میں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ (نساء، 22)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ۔ باپ کا ایک مقام ہے لہذا اسکے احترام کو پامال نہ کرنا چاہیے لیکن یہاں فرمایا انہ کان فاحشۃ۔ بلاشبہ یہ ناشائستگی کی بات تھی۔ یہ ”تھی“ کا صیغہ واضح کرتا ہے کہ ماضی میں یہ عمل اگرچہ فحش و ناپسندیدہ تھا مگر اب وہ بات نہیں رہی۔

قول فیصل

فحش کی ”صفت“ کو اگر ماضی سے مربوط کیا جائے تو وہ ”زائل“ ہو چکی اب بحث ہوگی اس ”صفت“ کی جو ثابت ہوگی اور وجود میں آئے گی۔ سو فرمایا و لاتنکحو۔ آئندہ اس ”فحش“ کا ”اعادہ“ نہ ہو۔



## ساس اور بیوی کی سابقہ منی سے نکاح کی بات

85

### وربانیکم اللاتی فی جحورکم

(نساء، 22)

تمہاری بیویوں کی وہ بچیاں جو تمہارے گھر میں پرورش پا رہی ہیں۔

وجہ اعتراض میں کہا گیا ہے کہ ساس اور اپنی بیویوں کی جوان بچیوں سے نکاح کی بات مت کرو۔ لیکن یہاں پھر تمام حرام رشتوں کے بعد پھر فرمایا۔ الاماقدسلف۔ یہ پابندی ماضی میں تھی اب نہیں۔

قول فیصل

یہاں سلسلہ کلام رائج طریقے پر چلایا گیا ہے ورنہ تو ایسی منی جو ماں کے شوہر کے پاس پرورش نہ پا رہی ہو تب بھی حرام ہے بلکہ قرآن نے واضح بھی کر دیا ہے کہ منی کی ماں سے اگر ہم بستری نہیں

ہوئی تو اس صورت میں اس سے نکاح روا ہے رہی بات ساس سے رشتہ ازدواج کی تو فرمایا وامہات نساء کم۔ ساس بھی ناقابل ازدواج ہے۔



## سالی۔ سے ہمبستری

86

### وان تجمعو این الاختین

(نساء، 22) دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں لینا بھی حرام ہے جو ہو چکا ہو چکا۔

یہ ہے کہ یہاں بھی آخر میں۔ الاماقد سلف۔ کہہ کر ماضی کا احساس ابھارا ہے جبکہ ماضی کی وجہ اعتراض ”مستقبل“ سے استثناء روا ہی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے دو بہنوں کو ایک ساتھ عقد ”زوجیت“ میں لینے کے لئے ”تحریف“ سے کام لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص حسناؤں کے دیس میں پہنچ کر دو خوبصورت بہنیں خرید کر ایک کو آزاد کر کے نکاح کر لیتا اور ایک کو لونڈی کی حیثیت سے استعمال میں لاتا ہے تو قابل گرفت نہیں ہے۔

### قول فیصل

یوں تو سالی، ممانی، بھادج اور ساس سے ”داد عیش“ وصول کرنا موجودہ پاکستان کا کلچر بن چکا ہے تاہم اتنی گھناؤنی فحش کاریوں کے لئے یہاں نے مانا بڑا افسوس ناک ہے جن لوگوں نے تمام حرام رشتوں سے نکاح و ازدواج سے روکنے کے بعد۔ الاماقد سلف کے ”پاکیزہ“ جیلے کو اپنی ”ہوس رائیوں“ کے لئے استعمال کر رکھا ہے ان کے حال پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے عربی کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہاں اسے ”منقطع“ ہے۔ امام ابن جریر طبری (923م) لکھتے ہیں کہ بمعنی الاستثناء المنقطع۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔ الاماقد سلف میں ”استثناء منقطع“ ہے (طبری طبع مصر جلد 219/4) جس پر ماضی کا ”مستقبل“ سے استثناء روا ہے۔ اس طرح۔ الان کے معنی ہوں گے۔ لاکن۔۔۔۔۔ جو ہو چکا ہے اللہ نے اس سے درگزر فرمادیا ہے لیکن اب بات ماضی کی نہیں ”مستقبل“ کی ہوگی۔۔۔۔۔ (نیز ملاحظہ ہو تفسیر رازی طبع مصر جلد 23/10) کہ آئندہ قرآن کی ”فرماں روائی“ ہوگی۔ اور اسی کے حرام اور حلال کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

یہ یاد رہے کہ۔ الان۔ کا حرف ”بعد“ کے مفہوم میں بھی آیا ہے جیسے فرمایا۔ لایذوقون فیہا الموت الا الموت الاولیٰ یعنی۔۔۔۔۔ پہلی موت کے ”بعد“ کسی دوسری موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔۔۔۔۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا اسکے ”بعد“ اس کا اعادہ نہونا چاہیے۔ ☆

## ارادہ۔ فعل سے مربوط ہوتا ہے

87

يريد الله ليبين لكم

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر واضح کر دے۔

(نساء، 25)

میں کہا جاتا ہے کہ۔ ارادہ۔۔۔۔۔ ”فعل“ سے مربوط ہوتا ہے اس طرح یرید اللہ۔ کے معنی ہوں

گے يفعل اللہ----- اور یہ اللہ کی نسبت سے قابل اعتراض ہے۔ ہر جگہ نہیں تو بہت سی جگہوں

**وجه اعتراض**

پر ضرور قابلِ تکامل ہے۔

یہاں ”لیین“ کا لام ”اَن“ کے مفہوم میں آیا ہے جو ”مضارع“ کو ”مصدر“ میں بھی تبدیل

کر دیتا ہے۔ جیسے فرمایا و امرت لاعدل بینکم-----امرنا لنسلم لرب العالمین-----

## قول فیصل

یریدون لیطفوا اب رہی یہ بات کہ ”ارادہ“ فعل سے مربوط ہوتا ہے تو اس سے انکار نہیں لیکن اسے نظر میں رکھئے کہ۔

ار اوہ ”اندر“ کی کیفیت کا نام ہے جو اکثر اوقات ”لاموجود“ پر رک جاتی ہے یعنی ”معدوم“ کو حاصل کرنے کی اُمگ تک

بات محدود ہو جاتی ہے اور جو کیفیت ”لاموجود“ یا ”معدوم“ کو محور بنانے سے مربوط ہو وہ کسی ”فعل“ کو متعارف نہیں

کر سکتی۔ بات صاف ہے کہ ارادہ۔ نسبتوں کے تناظر میں ”فعل“ سے مراد ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا، کہ معدوم کو

خطاب کرنا شاعری تو ہو سکتی ہے واضح حقیقت نہیں بن سکتی۔ میرا مفہوم یہ ہے کہ جن آیات میں اللہ کو ہدی کا نہ

”خالق“ تسلیم کیا گیا ہے اور نہ ”فاعل“۔ ان کے قاطع میں ”برید“ کو ”یفعّل“ کے پیکر میں لے آنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔



شکیلیاں بندے کی۔ اضافہ خدا کا

88

ان الله لا يظلم مثقال ذرة وان تك حسنة يضاعفها ويؤت من لدن

## اجرا عظیم

اللہ کسی پرورہ بھر بھی زیادتی نہیں کرتے اور اگر نیکی ہے تو اسے بڑھاتے اور اپنی جانب سے بہت بڑے صلے کا اضافہ کرتے

(نساء، 30)

ہیں۔

یہ ہے کہ اس طرح کی مہنجائش سے ”بے عمل“ اور ”با عمل“ کا امتیاز مٹ جاتا ہے جو اصول مساوات

کے منافی ہے۔

## وجه اعتراض

دنیا کی ہر زبان میں دو لفظ قابل غور ہیں، (۱) انصاف اور (۲) رحم۔ انصاف یہ ہے کہ مزدور کو اجرت

پوری دی جائے اور کرم یہ ہے کہ اس غریب کو اجرت سے کچھ زائد بھی دیا جائے جبکہ زائد کو بے

## قول فیصل

انصافی سے موسوم نہیں کیا جاسکتا ہے انصافی تو مقابل میں ہوتی ہے یعنی ایک مزدور کو زیادہ سے نوازا جائے اور دوسرے کو

## آگ کا عذاب جو تصور اور گماں سے بھی ماورا ہو

89

### کَلِمَانِضَجَتْ جَلُودَهُمْ بَدَلْنَا هُمْ جَلُودًا غَيْرَهَا

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا (یعنی انہیں جھٹلایا اور سرکشی و شرارت سے مقابلہ کیا) تو قریب ہے کہ (قیامت کے دن) ہم انہیں آتش دوزخ میں جھونک دیں۔ جب کبھی ایسا ہوگا کہ ان کی کھال (آگ کی گرمی سے) پک جائے گی (یعنی جل جائے گی) تو ہم پچھلی کھال کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ (نساء، 95)

یہ ہے کہ ابد الآباد تک کھال پر کھال چڑھاتے چلے جانے سے انسان کا چھوٹا سا وجود ضخیم ہوتے ہوئے پھاڑوں سے ہم سری کرنے لگے گا جیسے کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن کافر کی ایک واڑھ ”احد“ پھاڑ کے برابر ہوگی اور اس کی جلد ستر ”میٹر“ کی موٹائی کی ہوگی۔

### وجہ اعتراض

یہ تمام تر آیت مبالغہ۔ اور عذاب کی ”سنگینی“ کے لئے جو ”شدید“ سے شدید تصور ہو سکتا تھا اس کا احساس دلانے پر مشتمل ہے جیسے ہم کہتے ہیں۔ فلاں کی پٹائی کرتے کرتے جب سوتک پہنچو تو بھول جاؤ اور نئے سرے سے پینٹنا شروع کر دو۔ اسی طرح یہاں بھی عذاب میں ”مبالغہ“ سے جرم کی ”سنگینی“ اور اسکی

### قول فیصل

”سنگین سزا“ کا احساس اجاگر کیا ہے آیہ کی ابتدا میں سوف نصلیہم۔ کا جملہ مبالغہ ہی کو واضح کرتا ہے خاص کر جیلے کی ابتدا اگر ”سوف“ سے ہو تو وہ ہوتا ہی وارنگ کے لئے ہے اور کچھ ضروری نہیں کہ وارنگ کے الفاظ حقیقت کا روپ دھار بھی لیں۔ اور اگر احادیث کی اساس پر مفہوم کا تعین ہوگا تو پھر حقیقت خرافات میں کھو جائے گی۔

☆

## بغیر سورج کے سایہ

90

### وَنَدْخَلُهُمْ ظِلَالِيلًا

(نساء، 56)

اور انہیں سایہ دار درختوں میں رکھا جائے گا۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ جنت میں سورج ہو گا نہ سایہ کا وجود۔ اور نہ گرمی کا احساس۔

### وجہ اعتراض

یہاں ”مجاز“ کا سہارا لیا گیا ہے مقصد صرف جنت کی ”سہولیات“ اور نعمتوں کا احساس دلانا تھا کہ

### قول فیصل

لق و دق پتے ہوئے صحرا میں سایہ دار درختوں سے ٹھنڈک حاصل کرنے کا تصور بڑی نعمت شمار ہو سکتی ہے لہذا صحرائی اور گرم ”ریگستانی“ باشندوں کی مناسبت سے سایہ کا ذکر ”مجازاً“ ہوا ہے۔

☆

## نبوت کا درجہ بلند تر یا صالحیت کا؟

91

فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ  
وَالصَّالِحِينَ

یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ ان میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

(نساء، 68)

### وجہ اعتراض

یہ ہے کہ۔ ادبیات عرب اور ”عادات عرب“ میں تھا کہ وہ جب کسی کی ”مدح“ کرتے تو اولے صفت سے آغاز کر کے اعلیٰ صفت پر اختتام کرنے تھے لیکن یہاں پہلے اعلیٰ صفت (نبوت) سے ابتدا کر کے اولے صفت (مقابلہ نبوت صالحین) تک سلسلہ پہنچایا گیا ہے۔

### قول فیصل

یہاں یہ فرض کر کے کہ کسی ساکن نے سوال کیا کہ انسانوں میں سب سے افضل، رفیع المراتب اور خاص الخاص کون ہیں؟ ان کے جواب میں اشرف ترین انسانوں کا حوالہ پہلے دے کر بعد میں درجہ درجہ دیگر صفات کے حاملین کی بات کی۔

☆

## زیادہ مکار۔ عورتیں۔ یا شیطان؟

92

ان کید الشیطان کان ضعیفا

(نساء، 75)

بلاشبہ شیطان کے چلتر کمزور تھے۔

### وجہ اعتراض

میں کہا گیا ہے کہ۔ دوسرے مقام پر فرمایا ان کید کن عظیم۔ بلاشبہ تم عورتوں کے چلتر بڑے بھیاںک ہیں۔

(یوسف، 28)

### قول فیصل

ہماری ”مذہبی“ قیادت چونکہ ”خواتین“ سے بھرپور جذبہ ”نفرت“ رکھتی ہے لہذا ان کو جہاں سے ان کی تذلیل و توہین کا مواد ملا۔ دوزگر لے لیا اور یہ نہ سوچا کہ وہ بات کس کے حوالہ سے کہی گئی ہے؟ قرآن کتا ہے کہ خواتین مردوں ہی کی طرح قابل احترام ہیں انہیں ”ناقص العقل والدين“ کہنے والے بھی عقل و شعور سے عاری ہیں اور ”مکار“ کے اہانت آمیز لقب سے پکارنے والے بھی۔ وہ کتا ہے کہ عورتوں کے چلتر۔ کو بڑا۔



کہنے والا عزیز (حاکم) مصر تھا اللہ سبحانہ نے اسکی بات کو صرف نقل کیا ہے اپنا فیصلہ نہیں سنایا۔



## قرآن۔ میں ”گڑبڑ“ کی تلاش

93

افلا يتدبرون القرآن ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا

(نساء، 81) اگر یہ قرآن۔ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

یہ ہے کہ آیہ زیر بحث کے آخری لفظ ”کثیرا“ کے تناظر میں زیادہ اگرچہ نہیں تاہم قرآن محکم میں تھوڑا سا اختلاف ضرور ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں اختلاف کو ”کثیرا“ کے وصف کے ساتھ صرف مبالغہ کے لئے ذکر فرمایا ہے یعنی۔ یہ قرآن اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں ڈھیروں اختلاف پاتے لیکن یہ کتاب چونکہ اللہ کی طرف سے ہے لہذا اس میں ”ڈھیروں“ کیا ذرا سا بھی اختلاف نہیں ہے۔

قول فیصل



## سچا خدا۔ یا۔ اس کا قول؟

94

ومن اصدق من الله حديثا

(نساء، 89) اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہو سکتی ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ اس عبارت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے۔ هذا القول اقول۔ یا۔ هذا العلم اعلم یہ کہنا کہتا ہوں۔ یہ جانتا جانتا ہوں۔ اس طرح کی بات غیر مقصود ہوتی ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ”اصدق“ کا اسم۔ ”قائل“ کی صفت بن کر آیا ہے ”قول“ کی نہیں۔ نیز ”من“ کا حرف ”استفہام“ کے لہجے کو واضح کرتا ہے جس سے ”نقی کامل“ مقصود ہوتی ہے۔ یعنی اللہ سے زیادہ سچا

قول فیصل

کوئی بھی نہیں ہے۔ جیسے فرمایا۔ ومن يغفر الذنوب الا الله۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو پردہ پوشی فرمائے۔۔۔۔۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ یہاں ”من“ برائے استفہام انکاری ہے۔ ☆

## لفظی۔ تکرار کس لئے؟

95

كلما ردوا الى الفتنة اركسوا فيها



(نساء، 90)

جب بھی فتنے کی طرف لوٹائے جاتے ہیں اسی میں لوٹ جاتے ہیں۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ ردوا۔ اور۔ ارکسوا۔ ہم معنے ہیں لہذا غیر ضروری تکرار سے کیوں کام لیا گیا؟

یہاں قاعل ”مختلف“ ہیں جس سے تکرار کی ”نفی“ ہو جاتی ہے خاص کر۔ ردوا۔ کے معنے پکار کے ہیں۔ یعنی جو نئی قوم انہیں شرک کی طرف بلاتی ہے۔ یہ لوٹ پڑتے ہیں (ارکسوا فیہا)

**قول فیصل**

## قتلِ خطاء کی سزا نہیں ہے؟

96

وما کان لمؤمن ان یقتل مؤمنا الا خطاء

کسی مؤمن کو چھوٹ نہیں ہے کہ کسی مؤمن کو قتل کر ڈالے ہاں غلطی سے کر سکتا ہے۔ (نساء، 96)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔۔۔۔۔ الخطاء۔۔۔۔۔ سے قتل کی ایک گونہ اجازت مترشح ہوتی ہے۔

الخطاء، میں الا۔ برائے استثناء نہیں ہے۔ حرف ”نہی“۔ لا۔ کا استعارہ ہے اس طرح معنے

ہوں گے کسی مؤمن کو چھوٹ نہیں ہے کہ کسی مؤمن کو قتل کرے نہ ہی غلطی سے ایسا

**قول فیصل**

کر سکتا ہے۔ جیسے فرمایا۔ لکیلا یكون للناس علیکم حجة الا الذین ظلموا

(یہ جو تقرر قبلہ پر اس قدر زور دیا گیا ہے تو یہ) اسلئے ہے کہ تمہارے خلاف لوگوں کے پاس کوئی

دلیل باقی نہ رہے اور نہ ہی حق سے برگشتہ لوگوں کو مخالفت کا حق ہے۔ (بقرہ، 150)

یہاں بھی۔ الا الذین۔۔۔۔۔ ”لا الذین“ کا استعارہ بن کر لیا ہے۔



## صلاة۔ ماضی میں فرض تھی اب نہیں

97

ان الصلاة كانت علی المؤمنین کتابا موقوتا

(نساء، 102)

صلاة مؤمنوں پر باوقت فرض تھی۔

یہ ہے کہ۔ کانت۔ ماضی کا صیغہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ۔ قیامِ صلوٰۃ ماضی میں فرض تھا۔ حال اور مستقبل میں نہیں رہی۔

**وجہ اعتراض**

کانت کا بہت سے پیرایوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً اسکے معنی میں ”ازل“ وابد بھی شامل ہے جیسے فرمایا وکان اللہ علیما حکیم۔

**قول فیصل**

(نساء، 10، 23)

اللہ ازل سے ابد تک علیم ہے صاحبِ حکمت ہے۔

اس طرح آیہ زیر بحث کے معنی ہوں گے۔ قیامِ صلوٰۃ ازل سے ابد تک فرض ہے۔

☆

## بے گناہ کو پھانسنے کی سزا

98

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيًّا فَقَدْ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا

جو گناہ کا کام تو خود کرتا ہے مگر کسی بے قصور کو ملوث کر ڈالتا ہے تو بلاشبہ اس نے بڑے بہتان اور

(نساء، 112)

کھلے جرم کا ارتکاب کیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ گناہوں کے سلسلہ میں سزا صرف مرتکب افراد کو ملے گی لیکن اس کے برعکس یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اپنے گناہ کا ”ملب“ دوسرے کی گردن پر ڈالنا سب سے بڑا گناہ اور بے قصور کو

**وجہ اعتراض**

پھانسنے کا کھلا جرم ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں کے ”کرتوتوں“ کا خالق بھی ہو پھر انہیں سزا بھی دے دے لہذا واضح فرمایا کہ وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً جس نے بھی ارتکابِ جرم کیا یا کسی بے قصور کو شکنجہ

**قول فیصل**

بہتان میں کسا تو وہ قابلِ ”ملامت“ ہے۔۔۔۔۔ بات صاف ہو گئی کہ جو لوگ ”عدالتی“ ذریعوں سے ظلم کا دھندا کرتے اور علامہ مشرقی (1963م) جیسے عظیم سکالر پر جرمِ قتل کی تہمت عائد کر کے ”موت“ کی کوٹھڑی میں محبوس کرانے یا کسی بے قصور کو پلیدی اوز کی عدالتوں سے تختہ دار پر جھلاتے ہیں وہ اور فیصلہ دینے والے قابلِ ملامت اور سزاوار ”تعزیر“ ہیں۔ کاش دین کو رسوا کرنے والی یہ گندی عدالتیں جہت ”قدف“ سے اگر کسی کو بری کر دیتی ہیں تب بھی تہمت ”تراش“ کو کچھ نہیں کہا جاتا جبکہ عدالت الہی سے اسکی سزا ای کوڑے ہے۔

☆

## اسم سے فعل کی استثنا

99

## لاخیر فی کثیر من نجوہم الامن امر بصدقۃ

(نساء، 113)

زیادہ سرگوشیوں میں کوئی خفی نہیں ہے ہاں جو نیکی کی بات گرے۔

یہ ہے کہ یہاں نجوی فعل سے تعبیر ہے اور من اسم ہے جبکہ فعل کی استثناء اسم سے نہونی چاہیے۔

وجہ اعتراض

یہاں ضمیر ”مقدّر“ ہے لہذا مفہوم یہ ہوگا کہ ----- سوائے اس نجوی کے جو صدقے کے حکم پر مشتمل ہو اس طرح فعل کی استثناء ”فعل“ سے ہوگی جو ناقابل اعتراض ہے فرمایا و لکن البر

قول فیصل

من آمن۔ یہاں ”بر“ اسم ہے جس کی ”آمن“ فعل سے استثناء کی گئی ہے لیکن۔ بر۔ کو فعل کا ”استعارہ“ بنا کر۔ ”مفہوم“ فعل ہی کا لیا گیا ہے لیکن و لکن بر من آمن باللہ۔ ☆

## ارتداد کے لئے جسمانی تعزیر نہیں ہے

100

ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرالم یکن اللہ

(ترجمہ امام الہند کی زبانی)

لیغفرلہم ولا ینہدہم سبیلا

جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ پھر کفر میں پڑ گئے۔ پھر ایمان لائے پھر کفر میں پڑ گئے۔ اور پھر برہ کفر میں بڑھتے ہی گئے (تو فی الحقیقت ان کا ایمان لانا۔ ایمان لانا نہ تھا)۔ لہذا اللہ انہیں بخشے والا نہیں اور ہرگز ایسا نہ ہوگا کہ (کامیابی کی) انہیں کوئی راہ دکھائی دے۔ (نساء، 137۔ ترجمان القرآن جلد 1/396)

نمبر 1۔ میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں جرم ارتداد کے لئے جسمانی سزا کی نفی گروی گئی ہے جبکہ

وجہ اعتراض

مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ”ارتداد“ کی سزا موت ہے بلکہ اس غرض کے لئے جناب عکرمہ

خارجی نے ایک حدیث بھی بنا کر پیش کر دی ہے جسے بخاری میں ان الفاظ میں سمیٹ لیا گیا ہے من بدل دینہ فاقتلوه۔ جسے اپنا عقیدہ تبدیل کیا اسے قتل کر دو۔

قتل ”مرتد“ طے شدہ فیصلہ نہیں ہے۔ جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے پیروکاروں میں دو

قول فیصل

دھڑے ہو گئے تھے ایک تو اس خیال پر قائم رہا کہ آپ اللہ کی جانب سے مقرر کردہ خلیفہ رسول ہیں

آپ کو اختیار ہے کہ فتح کیجئے (مالشی) کو قبول کر لیں۔ انہیں شیعہ کے نام سے موسوم کیا گیا اور دوسرا دھڑا ”منخرقین“ کا تھا جن کا خیال تھا کہ۔ ان الحکم الا للہ۔ حکم صرف اللہ کا چلتا ہے۔ اس طرح وہ ”تحکیم“ کو اللہ کا حق سمجھتے اور کسی غیر اللہ کو اپنا ”حکم“ تسلیم کرنے کو شرک سے موسوم کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ حضرت علیؑ نہ صرف راہ حق سے بھٹک گئے ہیں۔ مالشی قبول کر کے واجب القتل بھی ہو چکے ہیں بلکہ اس وقت کے صحابہ گرام میں سے جو گورنر تھے ان سب کو بھی منحرف

تسلیم کرتے تھے چنانچہ ان ہی خار جیوں نے مکہ میں میٹنگ کی اور طے ہوا کہ 20 رمضان کو ایک ہی وقت میں حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو حالتِ نماز میں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ طے شدہ منصوبے کے مطابق۔ کمانڈوز چل پڑے اور مقررہ تاریخ پر اپنے اپنے مقام پر پہنچ گئے۔ مصر میں طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے حضرت عمروؓ حاضر نہ ہوئے اور نائب صلاۃ مقرر کر کے امامت کا حکم دیدیا اور وہ مارا گیا۔ دمشق میں حملہ آور نے حضرت معاویہؓ پر تلوار کا وار کیا گھٹنا مجروح ہوا آپ گر پڑے حملہ آور پکڑا گیا اور عراق میں خار جیوں کا اصل نشانہ حضرت علیؓ مارے گئے۔ اب خار جیوں کے ایک اہم لیڈر جناب عکرمہ نے جو حضرت ابن عباسؓ کی مجلس میں بھی جایا کرتے تھے اپنے پارٹی فیصلہ کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک حدیث گھڑ ڈالی جس کا رسولؐ کے کسی صحبت یافتہ کو علم تھا نہ کسی تابعی کو۔ نہ رسول اکرم ﷺ ”موجود“ تھے کہ اس فیصلے کی تصدیق کی جاسکتی اس طرح یہ ”سیاسی“ حدیث آہستہ روی سے لوگوں تک پہنچتی گئی۔ اب ابتداء میں یہ سیاسی حدیث اگرچہ صحابہ کرامؓ میں سے جو گورنر تھے ان کے قتل کیلئے وضع کی گئی تھی مگر دو سو سال بعد جب بخاری میں داخل ہو گئی تو اس کا رخ نجف، دمشق اور مصر سے پھیر کر عامۃ المسلمین کی طرف کر دیا گیا اور آئندہ کے لئے طے ہوا کہ جو شخص بھی اپنی ”مذہبی“ پارٹی کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کا پیروکار بن جائے وہ واجب القتل ہے اس گروہی اور ”تقلیدی اساس“ پر اس روایت کی حکمرانی اس حد تک مضبوط ہوتی چلی گئی کہ تمام آیات قرآنی کو منسوخ کر ڈالنے کے علاوہ اس روایت کو دو دھاری کا اعزاز بھی نصیب ہوا۔ یعنی امراء نے اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف اپنے چیف جسٹسوں کے ذریعہ استعمال کیا اور تقلیدی ”فروق“ یعنی شیعہ و سنی و دیگر احزاب نے اپنے گروہی مخالفین کو کچلنے کے لئے اسے آلہ بنایا جبکہ آیہ زبر بحث واضح کرتی ہے کہ نہ صرف ایک بار بلکہ بار بار ”اصل دین“ یعنی دین حق سے انحراف کے باوصف کسی کو ”جسمانی سزا“ سے دوچار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کا مرتد۔ اس وقت ہی مرتد شمار ہو گا جب اس کی موت بھی ارتداد پر واقع ہو (بقرہ، 217) کیونکہ ایمان اور اسلام کا دل کے اطمینان اور ”جماؤ“ سے تعلق ہے اگر کوئی مسلمان ہو کر مطمئن نہیں ہو پایا تو اس کا ”اختیار“ سلب نہیں ہوا وہ جب تک کھلی بغاوت اور تحریک کاری کا مرتکب نہیں ہوتا اسلام اسے منافقت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”قتل مرتد کی شرعی حیثیت“)

نمبر 2۔ یہ ہے کہ یہاں کفر کی ”ستعداد“ کے اظہار پر ہدایت سے ”محرومی“ کی سخت وارننگ دی گئی ہے جو قبول ہدایت کے آزادانہ اصول کے خلاف ہے۔

## وجہ اعتراض

یہ ”سخت پالیسی“ ان بدترین کافروں کے لئے ہے جو کفر پر کفر تخلیق کرتے چلے جاتے اور کسی بات پر بھی ”ترم رویہ“ نہیں اپناتے ان کی بات فرمایا۔ یہ لوگ جب تک اپنے ”رویے“ میں تبدیلی

## قول فیصل

پیدا نہیں کرتے شیوہ توبہ نہیں اپناتے ہدایت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ یہ درست ہے کہ وحی الہی کی اتنی زبردست وضاحت کے قیام میں ارتداد کے لئے ”جسمانی“ سزا نہیں ہے مگر ہدایت اتنی بھی ”سستی“ نہیں ہے کہ انہیں تحفہ میں دی جائے اس کے لئے ”توبہ“ و اطمینان کی شرط کو پورا کرنا ہو گا۔ کیونکہ مرتد نے بار بار ایمان کی ”پالیسی“ کو بدل کر اپنا اعتماد

خود ہی کھودیا ہے اب ”مخلصانہ“ توبہ کی ضرورت ہے ویسے اس نے ہر بار اپنے ضمیر اور عقیدے ہی کو قتل کیا ہے کسی بندے کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا ہے کہ اسے لازمی حد تک پھانسی گھاٹ پہنچایا جائے؟



## غالب کون؟ مسلمان یا کافر؟

101

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا

(نساء، 140) اللہ کافروں کو مؤمن پر کبھی غالب نہیں کرے گا۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ۔ اللہ نے جنگِ احد میں کفار کو غالب کیا بلکہ عالمی سطح پر آج بھی ایک طرفہ ”غالبیت“ اور ”مظلویت“ کا عمل جاری ہے۔

قول فیصل یہاں سبیل کا لفظ ”حجت“ اور ”برہان“ کا استعارہ ہے یعنی مؤمن دلائل اور ”براہین“ کے زاویہ سے کبھی مغلوب نہ ہوں گے۔ سچائی کا بول بالا رہے گا۔ تاہم فتح و ”نصرت“ کے ”قدرت“ نے جو ”معیار“ بنایا ہے وہ مختلف ہے جو بھی اس معیار پر پورا اترے گا فتح پائے گا۔ کہ اللہ ”غیر جانبدار“ ہے۔ مسلمانوں کی فتح کو اس وقت ہی یقینی بنالیتا ہے جب وہ فتح کے الٰہی معیار کو عملی طور پر اپنالیں گے۔ دوسرے لفظوں میں فتح و نصرت قوموں کی صلاحیتوں، استعداد، ”حرلی قابلیت“ اور یقینی محکم سے مربوط ہے۔ نصر من اللہ فتح قریب کے یہی معنی ہیں۔



## مظلوم کو زبانی جنگ جاری رکھنے کا حق ہے

102

لَا يَحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَن ظَلَمَ

(نساء، 148) اللہ کھلے بندوں بد زبانی کو پسند نہیں فرماتے سوائے اس کے جو ظلم کا شکار ہوا۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ۔ آیہ زیر بحث میں۔ لا یحب۔ کا لفظ۔ اللہ کے فعل کا غماز ہے۔ جبکہ حب کا خیر ”حرارتِ غریزی“ سے اٹھتا ہے جو صرف اور صرف انسان اور حیوانات کا ”خاصہ“ ہے لہذا اسے ”مدح“ کے مقام پر استعمال نہ ہونا چاہئے۔ اسی طرح۔ الا۔ سے اشارہ ملتا ہے کہ مظلوم کے منہ سے فحش کلمات کا استعمال قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

قول فیصل یہاں لا یحب استعارہ ہے لا یرید کا یعنی اللہ کے ارادے میں۔ زبان کے فحش کو پذیرائی حاصل نہیں ہے جو مار کھائے گا، پٹے گا۔ جو اہل حرب و ضرب سے ناتواں ہو گا اور ظلم کی پچھلی میں پے گا وہ



گالی کا سہارا بھی لے گا زبانی جنگ بھی جاری رکھے گا بلکہ بد دعا بھی گرے گا۔ اسے کنٹرول کرنا دشوار ہے تاہم حرفِ الا سے بد زبانی کا اجازت نامہ نہیں ملتا۔ یہ استثناء کے لئے نہیں۔ لا۔ کے مفہوم میں کیا ہے یعنی زبان کا فحش کسی کے منہ سے ہو۔ اللہ کے ارادے میں اسکی پذیرائی نہ ہوگی اور نہ ہی مظلوم کی زبان کا فحش اچھا سمجھا جائے گا۔



## اللہ۔ کو دیکھنے کی سنگین سزا

103

فقد سألوا موسى اكبر من ذلك فقالوا اننا لله جهرة فاخذتهم الصاعقة

انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کر رکھا تھا کہ۔ ہمیں ان آنکھوں سے اللہ کا دیدار کرادو۔ جس پر انہیں زوردار کڑک نے گھیر لیا۔ (نساء، 153)

### وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں ”رویتِ باری“ کی نفی کی گئی ہے جو اشعری مسلک کے خلاف ہے۔

### قول فیصل

یہ درست ہے کہ بہت سی دیگر آیات کی طرح یہاں بھی ”رویتِ باری“ کی وجہ سے سنگین سزا دیتے وقت امام ابو الحسن اشعری (936 م) کے نازک احساسات کا احترام نہیں کیا گیا۔ جی درست فرمایا آپ نے لیکن رویتِ باری۔ اتنا آسان ”امر“ ہوتا تو اس مطالبہ پر شدید جہنم کے وعید سے اسرائیلیوں کو دوچار نہ کیا جاتا جس سے اشارہ ملتا ہے کہ اللہ کی رویت نہ ”ماضی“ میں ممکن تھی نہ ”مستقبل“ میں آسان کیونکہ وہ ”جسم“ اور ”مثبت“ جو آنکھ کے کیمرے میں محفوظ ہو سکتے ہیں۔ سے پاک و منزہ ہے وہ آج اگر ”مثبت“ سے پاک ہے تو مستقبل میں ان مسلمانوں کے لئے کوئی ”مثال“ اختیار نہیں کریں گے جو اربوں کھربوں سال سے اللہ سے ملنے اور دیدار کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔



## ایمان۔ لانے پر پابندی

104

بل طبع الله عليها بكفرهم فلا يؤمنون الا قليلا

(نساء، 154) ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اب چند ایک کے ماسوا ایمان لانے کے نہیں۔

### وجہ اعتراض

یہ ہے کہ اللہ نے جب مہر لگا کر ایمان لانے سے خود ہی روک دیا تو اب ان سے کیا شکوہ؟



## قول فیصل

یہ قطعاً روانہ ہو گا کہ اللہ سبحانہ کفار کو ایسی ”حالت“ میں سزا دیں جب انہیں ایمان لانے سے ”روک“ بھی دیا ہو اگر یہ رُدا ہے تو یہ بھی رُدا ہو گا کہ وہ۔۔۔۔۔ انبیاء کو اس غرض کے لئے ”مبعوث“ فرمادیں کہ جاؤ اور اپنی اپنی قوم کو ایمان لانے سے روک دو میرا کئے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایمان سے روکنا ”مقصود“ ہوتا تو۔۔۔۔۔ الاقلیلا۔ کہہ کر تھوڑے لوگوں کو بھی کہہ دیا جاتا کہ تم بھی ایمان مت لاؤ۔۔۔۔۔؟ حقیقت یہ ہے کہ طبعیہ ”کافیہ“ مفہوم ہی قابل قبول نہیں ہے۔ کفر ”عارضی وصف“ ہے جو ایمان لانے سے ”زائل“ ہو سکتا ہے اور پھر مہر بھی نوٹ سکتی ہے۔ خاص کر بکفرہم۔ میں ”باء سببیہ“ ہے یعنی ان کے کفر کے سبب دل پر ”مہر“ لگ گئی قانونِ مشیت کے سبب نہیں لگی۔ بلکہ یہ مہر زیادہ سے زیادہ اللہ کی ”ناراضگی“ کا استعارہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ خط یا کسی کتاب کے آخر میں مہر لگادیتے ہیں لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اس کا پڑھنا ممنوع بھی ہے۔ اسی طرح دل پر مہر لگانے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ ایمان قبول ہی نہ کریں جب ”قلیل“ تعداد ایمان سے مستفید ہو سکتی ہے تو ”کثیر“ تعداد بھی ہو سکتی ہے حالت سنوارے مہر توڑ ڈالئے۔

17-2-96 ملتان



مانندہ

## تکمیل دین کہاں اور کیسے؟

105

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا  
آج کے دن تمہارے لئے دین مکمل ہونے پر میری نعمتوں کا اتمام ہو گیا اور میں تمہارے لئے اسلام کو ضابطہ حیات بنا کر راضی ہوا۔ (مائدہ: 4)

## وجہ اعتراض

نمبر 1۔ میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت وفاتِ نبوی ﷺ کے چند ہفتے پہلے نازل ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بیس سال پہلے جس دین پر مسلمان اور نبی اکرم ﷺ عمل پیرا چلے آئے تھے اس میں اللہ کی رضا شامل نہیں تھی۔

## قول فیصل

یہاں الیوم کا لفظ پہلے دو جملوں اکملت اور اتممت کے لئے ”ظرف“ کی حیثیت سے آیا ہے اس طرح پسلاؤ۔ ”عطف“ کے لئے ہے۔ لیکن ”دوسرا“ واو جس سے تیسرے جملے ورضیت لکم الاسلام دینا۔ کا آغاز ہوتا ہے واو ”استینافیہ“۔ یا ”ابتدائیہ“ ہے جس سے یہ تیسرا جملہ الیوم سے مربوط نہیں رہتا ”علی الاطلاق“ بن جاتا ہے۔ اب معنی ہوں گے کہ۔ نہ صرف حال اور مستقبل میں اسلام پسندیدہ اور اللہ کی رضا کا آئینہ دار دین ہے ماضی میں بھی پسندیدہ و موجبِ رضادین تھا۔

## وجہ اعتراض

نمبر 2۔ یہ ہے کہ آیہ زیر بحث میں کم کا خطاب ”تین“ سرتبہ دہرایا گیا ہے اور یہ خطاب اپنے ”عمومی لہجہ“ میں عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کو یکساں شامل ہے لیکن عورت الیام ”حیض“

وغیرہ میں اور سچے تادقے کہ مکلف نہیں ہوتے اسی طرح بوڑھے بھی ”نا توان“ ہونے پر دین کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں تو ان کے دین کو ”مکمل“ کیسے کہا جائے گا جبکہ حضور ﷺ نے عورتوں کے بارے میں مکمل کربات کی ہے کہ ان المرأة ناقصه عقل و دین عورت کا دین بھی نامکمل ہے اور فکر بھی نارسا۔

## قول فیصل

کسی ”کو تا ہی“ یا کسی ”طبعی“ عارضے کی وجہ سے احکام الہی پر عمل پیرا نہ ہونے سے دین کے کمال میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ خاص کر عورت کے دین اور عقل کے بارے میں ”غلط“ انداز فکر سے بچنا چاہیے کہ اس طرح خود دجی قرآن پر ”حرف“ آئے گا جس نے تین مرتبہ ”کم“ کے خطاب میں عورتوں کو شامل کر کے نقص کے ”گھٹیا“ وصف سے محفوظ بنا ڈالا ہے۔ خاص کر ان المرأة ناقصة عقل و دین۔ ”وضعی“ حدیث ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”برہان القرآن“ اور کسی وضعی حدیث کی اساس پر تصریحات قرآنی کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

## وجہ اعتراض

نمبر 3۔ میں کہا جاتا ہے کہ دجی کے احکامات ہی کو اگر ”دین“ کہا جائے تو اس سے تمام ان روایات بلکہ دجی ”غیر متلو“ اور علما کے ”اجتہادی“ فیصلوں کی حیثیت دین کے ”نفی“ لازم آئے گی جو نزول قرآن کے بعد ظہور میں آئے۔

## قول فیصل

بنیادی طور پر ”دین“ مکمل ہو چکا ہے، تاہم اس کی ضو۔ میں آنے والے ادوار میں جتنے بھی نئے مسائل پیش آئیں گے انہیں اجتہادی یا شرعی مسائل کا نام دے سکتے ہیں۔ انہیں دین سے موسوم کرنے میں بہت سے بنیادی عوامل سدا رہا ہیں۔

(I) اسی طرح ہمیں علمائے کرام کو۔ اربابا من دون اللہ۔ تسلیم کرنا ہوگا۔

(II) قرآن مجید قطعی انداز میں دین اسے تسلیم کرتا ہے جو خود قرآن ہی کے ذریعہ مکمل ہو چکا ہے ورنہ تو قرآن کے کسے کی تکذیب لازم آئے گی۔

(III) جب ہم بعد کی کسی چیز کو دین میں داخل کر کے دین کا نام دیں گے تو اشتباہ پیدا ہوگا کہ دین ہر وقت تکمیل کا خواہاں ہے۔

(IV) قرآن کہتا ہے کہ دین کی نسبت صرف اللہ کی طرف ہو سکتی ہے الا للہ الذین الخالص۔ ورنہ تو ہم۔ غیر خدا کی باتوں کو دین کہہ کر ایک گونہ خدا کی طرف نسبت دینے کی جسارت کر بیٹھیں گے جو اللہ پر افترا ہوگا۔

(V) جہاں تک روایات اور دجی ”غیر متلو“ کی یکساں حیثیت کا تعلق ہے تو یہ ”بعد“ کا تھوڑا سا آپ صلوٰۃ کی رکعتوں میں الحمد کی بجائے کوئی غیر متلو چیز پڑھ ڈالیں آپ کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اگر یکساں حیثیت ہوتی تو بات اتنی سنگین نہ بن جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ روایات کو ”زیادہ“ اہمیت دینے کے لئے دجی غیر متلو۔ کا نام دیا گیا ہے ورنہ تو یہ بھی دراصل روایات ہی کا مرہون منت ہے۔ اب اگر قرآن کے علاوہ باہر کی کسی چیز کو بھی دجی کا نام دیا جائے تو نہ صرف ”اجراء دجی“ کا عقیدہ رکھنا لازم ہوگا ضمناً ”اجراءے نبوت“ کا عقیدہ رکھنا بھی لازم ٹھہرے گا یعنی ہر ”مدعی دجی“ کی تصدیق ناگزیر

ہو جائے گی۔ ”وحی“ صرف قرآن کا ”اختصاص“ ہے اور یہ ہمارے اجتماعی ”استقرار“ اور ترقی یافتہ ”شعور“ کا فیصلہ ہے جس طرح علیہ السلام پیغمبروں، رضی اللہ عنہ صحابہ رسل اور رحمتہ اللہ علیہ دیگر ہند گانِ خدا کے ”اختصاصات“ اور امتیازات تسلیم کئے گئے ہیں تاکہ اشتباہ پیدا نہ ہو اسی طرح وحی کا ”اختصاص“ اور امتیاز اگر قرآن سے ختم کیا جائے تو باہر کے ڈھیروں ”وحیوں“ کی تصدیق لازمی ٹھہرے گی (سب سے بڑی بات یہ کہ۔ وحی قرآن کو ”تنزیل“ کہا گیا ہے لیکن روایات اور وحی غیر متلو پر ”تنزیل“ کا اطلاق کہیں بھی نہیں ہوا۔ ہم انسانوں کے کسی ”مدون“ مجموعے کو۔ تنزیل من حکیم حمید۔ نہیں کہہ سکتے۔ قرآن کے پڑھنے کو ”تلاوت“ کہا جاتا ہے غیر قرآن پر اسکا اطلاق جائز ہی نہیں ہے آپ تلوت البخاری، کہیں گے تو ”ثیل قرآن“ لانے کے مجرم ٹھہریں گے)۔

غرض کہ ”وحی“ اگر خارج از قرآن متعارف ہوتی تو اسکی ”حفاظت“ کا ذمہ بھی لے لیا جاتا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کچھ وحی (متلو) کو تو خدا نے محفوظ کر لیا اور کچھ وحی (غیر متلو) ان لوگوں کی کوششوں سے محفوظ کرنی گئی جو محدثین و اہل روایات کے لقب سے شہرت پا گئے۔ پھر وحی غیر متلو کا یہ سانچہ ہے کہ اسے امام بخاری جیسے بڑے محدث پوری لگن، دلسوزی اور ”محنتِ شاقہ“ سے ڈھونڈ لاتے ہیں مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ چھ لاکھ احادیث جمع کر کے پھر چھ ہزار کو تو تسلیم کر لیتے ہیں اور پانچ لاکھ 94 ہزار حدیثوں کے ”منکر“ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ہمارے دور میں دو چار حدیثوں کو ”عقلی“ زاویوں یا قرآن کے تناظر میں ناقابلِ تسلیم کہہ دیجئے تو کفر، انکار حدیث اور وجوبِ قتل کے فتوے لگ جاتے ہیں۔ آخر کیوں۔ شیعہ سنیوں کے چھ مجموعوں کو حفاظتی کیا خود دین کی باڑی سے باہر نکال پھینکتے اور سنی شیعہ کی چار مستند کتابوں کو نہایت حقارت سے مسترد کر دیتے ہیں اہلحدیث سنی احادیث کو سنی اہلحدیث کی روایات کو دین کی اساس میں شامل ہی نہیں کرتے جب کہ ان سب کا اصرار ہے کہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں وہی اساسِ دین ہے۔



## حلال و حرام کا معیار

106

### يسئلونك ماذا احل لهم قل احل لكم الطيبات

یہ دریافت کرتے ہیں کہ ان کیلئے کون سی چیز حلال ہے؟ انہیں کہہ دیجئے سب طیبات حلال ہیں۔ (مائدہ، 5)

یہ ہے کہ ”طیبات“ غیر معلوم شی ہے جو مختلف خطوں اور علاقہ جات کی ”عادات“ اور خوردنی **وجہ اعتراض** ٹیٹ کے اختلاف کے باعث متفقہ بھی نہیں ہیں۔

عرب عام طور پر ”ذبیحوں“ پر ہی ”طیبات“ کا اطلاق کرتے اور کثرتِ اطلاق سے فقہ کا نام ہی **قول فیصل** ”طیب“ پڑ گیا تھا اسکے برعکس ”خبیث“ کا لفظ مردہ جانور کے لئے خاص ہو گیا تھا۔ اس طرح ان کے ہاں ”طیبات“ ایک ”معلوم شی“ ہی سے موسوم تھا اور اہل فن اسے ”مخصوص“ قسم کا ”عام“ ہی کہتے تھے۔

## جو ”متوکل“ نہیں وہ ”مؤمن“ نہیں

107

وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین

(ماکدہ، 25)

اگر مؤمن ہو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

میں کہنا جاتا ہے کہ ”توکل“ کو ایمان سے مربوط کرنے کے معنی ہوں گے جو متوکل نہیں وہ مؤمن نہیں حالانکہ کروڑوں مؤمن ہیں جنہیں توکل کا مفہوم تک معلوم نہیں۔

وجہ اعتراض

یہاں ”ان“ کا حرف ”اذ“ کا استعارہ ہے جو ”تعلیل“ کا مفہوم دیتا ہے جیسے فرمایا وذرُوا مابقی من

قول فیصل

الربا ان کنتم مؤمنین،

(بقرہ، 278)

تم جب مؤمن ہو تو بقیہ سود چھوڑ دو۔

اس طرح معنی ہوں گے۔ اللہ پر اعتماد کرو جب تم مؤمن ہو۔



## پابندی۔ اور پھوٹ میں کیا ربط ہے؟

108

ادخلوا الارض المقدسة التي كتب الله لكم

(ماکدہ، 21)

ارض مقدس جسے تمہارے حصے میں لکھا گیا ہے اس میں داخل ہو جاؤ۔

یہ ہے کہ یہاں ”کتب“ کے فعل میں ارض مقدس میں پہنچ کر بسنے اور داخل ہونے کا فرض حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی فرمایا فانہا محرمة علیہم اربعین سنة۔ یہ سرزمین چالیس سال تک ان

وجہ اعتراض

پر حرام کر دی گئی ہے۔

یہاں ”کتب“ میں جو بات کہی گئی وقت کی ”پابندی“ سے باہر ہے اور اگلے فقرے میں وضاحت

قول فیصل

کر کے پابندی کو وقت سے مربوط کر دیا ہے یعنی فی الحال تو صحرائے سینا میں ٹھوکریں کھاؤ چالیس

سال گزرنے کے بعد ارض مقدس میں جا کر بسو اس میں مصلحت یہ تھی کہ جو لوگ مصریوں کی غلامی کے خوگر بن چکے تھے وہ آزادی کی مشقت سے کتراتے تھے لہذا انہیں صحرائے سینا میں رکھا گیا اس طرح ہوا یہ کہ چالیس برس تک کے نوجوان بوڑھے ہو کر مر گئے اور موسیٰ کی زیر تربیت نئی نسل جوان ہو کر جذبہ آزادی سے سرشار ہوئی اور کنعانیوں کے بیت



المقدس میں بے خطر ہو کر داخل ہو گئی۔

## واحد کے صیغے سے جمع کا استدلال

109

اذ قربا قربانا

(ماندہ، 30)

جب دونوں نے قربانی پیش کی۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں قربانی دینے والے دو بھائیوں کے تناظر میں ”قربانین“ ہونا چاہیے تھا۔

قول فیصل عرب کے استعمال میں یہ بھی ہے کہ ”واحد“ کا صیغہ استعمال کر کے ”ثنیہ“ کا کام لیتے تھے۔

☆

## کفار کی طرف بعض کو تاہیاں قابلِ سزا ہیں

110

فاعلم انما يريد الله ان يصيبهم ببعض ذنوبهم

(ماندہ، 52)

اللہ انہیں بعض کو تاہیوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔

یہ ہے کہ یہاں ”بعض“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو واضح کرتا ہے کہ۔ اہل کفر کو بعض کو تاہیوں کی سزا ملے گی۔

یہاں ”بعض“ کی تفصیل پوشیدہ رکھ کر سرکشی کرنے والے ہر فرد کو سزاوار ”سزا“ ٹھیرا گیا ہے۔ جیسے قبیلہ ”بنی نضیر“ کے تمام افراد کو جلا وطن کیا گیا۔

☆

## دو ہاتھوں والا خدا

111

بل یدہ مبسو طتان ینفق کیف یشاء

(ماندہ، 64)

اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں اللہ کیلئے ہاتھ کی صفت بیان ہوئی ہے جبکہ ہاتھ کے لئے پھیلی بھی ہوتی ہے انگلیاں اور پونجے بھی جو پکڑنے اور چھوڑ دینے کا کام دیتے ہیں اور یہ تمام تر ”حادث“ ہیں لہذا اللہ کی صفت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔



**قول فیصل** ید۔ عربی میں ”طاقت“، پاور، حکومت اور ”نعمت“ کو کہا جاتا ہے اسی طرح ”یدہ“ میں دو نعمتوں کا اشارہ ہے نعمت دین کی اور نعمت دنیا کی کیونکہ عربی میں جب کہتے ہیں لفلان عندی یدہ۔۔۔۔۔ اسکا مجھ پر احسان ہے۔ یا۔ وایاد جسیمة اسکی مجھ پر بڑی مہربانیاں اور احسانات ہیں۔۔۔۔۔ یہ علاوہ اس کے کہ ”ید“ کے ساتھ جب ”بسط“ کا ذکر بمع ”انفاق“ آئے گا تو اسکا اطلاق ”بدن“ کے مشورہ جیسے ”ہاتھ“ پر نہ ہو سکے گا۔

(الہدائی صفحہ 231)



## پیغمبر کی حفاظت کیوں اور کیسے؟

112

### والله يعصمك من الناس

اللہ لوگوں کی زیادتی سے تمہیں محفوظ رکھے گا۔ (مائدہ، 70)

یہ ہے کہ۔۔۔ یہ کیسی حفاظت ہے کہ جنگ ”احد“ میں آپ کے سامنے کے دانت توڑ دیئے گئے جس سے ”شہادت“ اور ”وجاہت“ میں فرق آگیا۔

عصمت سے مراد لوگوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ کرنے کے ہیں کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وما قتلوه وما صلبوه اپنے رسولوں اور نبیوں کو ”صلیب“ اور ”قتل“ کی موت نہیں مارتا۔ اس طرح ”عصمت“ سے مراد یہ بھی ہے کہ آپ کی ”قوت نفسی“ ”مغلوب“ نہ ہوگی اور کوئی ”ساحر“ آپ پر سحر نہ کر سکے گا۔۔۔۔۔ یہ یاد رہے کہ بلاشبہ آپ زخمی تو ہوئے لیکن نہ دانت ٹوٹے نہ مشابہت وجاہت میں فرق آیا۔



## جَعَلَ۔ اور خَلَقَ میں فرق

113

### ما جعل الله من بحيرة ولا سائبة ولا وصيلة ولا حام

بحیرہ :- اونٹنی کا کان چیر کر چھوڑ دیتے اور اسکا دودھ نہ پیتے تھے۔

سائبة :- بھوں کے نام پردہ جانور جن پر بوجھ نہیں ڈالا جاتا تھا۔

وصيلة :- اونٹنی جو پہلی مرتبہ اوپر تلے دوچے دیتی اسے بھی بھوں کے نام پر چھوڑ دیتے۔

حام :- اونٹ جسکی نسل کے چند بچے لے کر اسے سواری سے آزاد کر دیا جاتا۔

ان جانوروں کے بارے میں فرمایا۔ ما جعل۔ اللہ نے انہیں اوپر ذکر کردہ اغراض کے لئے بنایا ہی نہیں۔

(مائدہ، 106)



**وجہ اعتراض** میں کہا گیا ہے کہ جَعَلَ کے معنی خَلَقَ کے ہیں جیسے فرمایا وجعل منہا ز وجہا۔ آدم کی جنس سے اسکی رقیقہ کو پیدا کیا (اعراف، 188) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدا کرنا خدا ہی کا کام ہے مگر آئیہ زیر بحث میں فرمایا: ما جعل، اللہ نے انہیں پیدا ہی نہیں کیا۔

**قول فیصل** جَعَلَ۔ یہاں استعارہ ہے۔ اَمَرَ کا یعنی ان جانوروں کو جس مقصد کے لئے خاص کیا گیا ہے اللہ نے اس غرض کے لئے حکم دیا ہی نہیں۔ ☆

## 114 مسیحؑ معمول کے مطابق انسانی نطفے کی پیداوار تھے

114

### واذ قال اللہ یعیسے بن مریم اذکر نعمتی علیک وعلی والدتک

اس وقت کو یاد رکھو جب اللہ نے مسیحؑ سے کہا اے مریم کے بچے عیسے! میرے احسانوں کو یاد رکھو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کئے۔

(مائکہ، 110)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ آئیہ ہذا میں عیسے علیہ السلام کی ”والدہ“ کا ذکر ہے خاص کر ابتدا ہی والدہ کی ”پسریت“ سے کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ مشہور عقیدے کے مطابق فرزند بے پدر تھے جبکہ فرمایا فلینظر الانسان مم خلق؟ خلق من ماء دافق

انسان کو اپنی آفرینش پر غور کرنا چاہیے کہ کس طرح ہوئی؟ (بلاشبہ) اچھلتے ہوئے قطرہ منی سے ہوئی جو صلب پدر سے رحم مادر کی طرف منتقل ہوا۔

(طارق، 5)

یہاں تخلیق انسان کا بیادی اصول واضح کیا کہ وہ ”قطرہ منی“ سے پیدا ہوا ہے، الانسان میں الف لام جنس کا ہے جو ہر انسان کو شامل ہے ایسے میں خلاف ”وضع قطری“ کسی کا جب کہ وہ ”مادہ منویہ“ سے پیدا ہونے والی مخلوق میں سے ہو بغیر نطفے کے پیدا ہونا محال اور ناممکن ہے لا تبدیل لخلق اللہ

(رودم، 30)

**قول فیصل** سورہ طارق نے آفرینش انسان کا جو اصول واضح فرمایا ہے قطعی اور ناقابل تحیل ہے کہ دیگر بیسیوں آیات بھی اسی ہی مفہوم کو اجاگر کرتی ہیں اب جہاں تک آئیہ زیر بحث میں صرف والدہ کا ذکر ہے تو

اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ”والد“ کی نفی کی گئی ہے جبکہ دنیا کی بہت سی ”تاریخی شخصیات“ نے ماں کے ”ناطے“ ہی سے پرورش اور ”ہشمت“ پائی ہے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی واقعات میں صرف ”ماں“ کی ”مناسبت“ ہی کو ملحوظ رکھا گیا ہے فاقدہ فی الیم فلیلقہ الیم (ط، 39) فالقیہ فی الیم (قصص، 7) میں والدہ موسیٰ کو ”مادر مریمان“ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ بلکہ یہی والدہ جوانی میں موسیٰ اور ہارون کے پیار کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہے۔ فرمایا۔ یا ابن ام لا تأخذہلحیثی ولا براسی ہارون نے موسیٰ سے والدہ کے ناطے ہی سے کہا اے میرے ماں جائے بھائی میرے بال نہ پکڑو۔

(ط، 93)

کیا اس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہارون و موسیٰ ”فرزند ان بے پدر“ تھے؟ قطع نظر قرآنی شہادتوں کے عرب میں والدہ کی نسبت کو ”بے پدری“ کی علامت نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ذیل میں سینکڑوں ان شخصیات میں سے جو ماں کی نسبت سے شہرت رکھتے تھے بطور نمونہ دس نام پیش کر رہا ہوں جن کے باپوں کا مشکل ہی نشان و ”تعارف“ ملے گا۔ علامہ مجددین فیروزگادی (1415م) نے اپنے شرہ آفاق تحقیقی رسالے تحفة الایہ فیمن نسب الی امہ دون ایہ۔ میں سینکڑوں نام گنوائے ہیں جو صرف نسبتِ مادری سے متعارف تھے ذیل میں صرف دس نام پیش خدمت ہیں۔

ابنِ آمنہ (آمنہ کلال) رسول اللہ ﷺ کا اسلام کے بعد دوسرا طرہ شہرت تھا (تھے الایہ طبع قاہرہ صفحہ 100)  
 بلال بن حمامہ (ماں حمامہ کے ناطے سے) ☆ حارث بن صاء (دادی بر صاء کے تعلق سے)  
 سعد بن خولہ (ماں خولہ کے حوالہ سے) ☆ معاذ و معوذہ عفرہ (ماں عفرہ کی شہرت کے ناطے سے)  
 سہل بن بیضاء ☆ سہیل بن بیضاء ☆ شریک بن السجاء ☆ صفوان بن میضاء ☆ مالک بن عفرہ  
 یہاں آمنہ، حمامہ، بر صاء، خولہ، عفرہ، بیضاء اور حمما ماؤں کی نسبت کو واضح کرتے ہیں۔



## اللہ۔ پر نفس کا اطلاق

115

### ولا اعلم ما فی نفسک

(ماکہ، 119) جو تمہارے نفس میں ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے۔

یہ ہے کہ یہاں حضرت مسیح نے۔ نفس۔ کو اللہ کی صفت بتایا ہے جبکہ ہر نفس ”جسم دار“ ہوتا ہے۔  
**وجہ اعتراض** خاص کر یہ جو ہر ”قائم بالذات“ ہونے کی وجہ سے ایسی ”توانائی“ کا نام ہے جو جسم کی ”تدبیر“ کرنے والی بھی ہے جس سے اللہ سبحانہ پاک و منزہ ہیں۔

نفس کے ایک معنی کسی شی کی ”حقیقت“ اور ذات کے بھی ہیں جیسے کہا جاتا ہے۔ نفس الذهب و  
**قول فیصل** الفضة محبوبہ۔ سونے اور چاندی کی ذات بڑی محبوب ہے اس بنا پر آیہ زیر بحث میں واقع لفظ  
 نفس کے معنی ”ذات“ کے ہوں گے اسکے باوصف اللہ سبحانہ مدبر ہیں۔ تدبیر امور انکی الوہیت کی زبردست دلیل ہے۔



انعام

## الظلمات جمع اور النور مفرد۔ یک جا کیسے؟

116

### وجعل الظلمات والنور

(انعام، 1)

جس نے اندھیروں اور روشنی کو پیدا کیا۔

میں کہا گیا ہے کہ۔ یہاں ظلمات کو جمع۔۔۔۔۔ اور نور کو مفرد کے پیرائے میں ذکر کرنے میں کیا مصلحت پنہاں ہے؟

وجہ اعتراض

جب ”دو“ لفظوں میں سے ”پہلے“ لفظ کو ”جمع“ میں بیان کیا جاتا ہے جیسے الظلمات کا لفظ ہے تو اہل زبان دوسرے لفظ (مفرد مثلاً۔ النور) کو جمع ہی کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے جیسے فرمایا

قول فیصل

الحمد لله الذى خلق السماوات والارض۔۔۔۔۔ میں السماوات ”جمع“ اور۔۔۔۔۔ الارض ”مفرد“ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں لیکن استعمالات عرب کی رو سے اور کچھ معنوی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ ”الارض“ کو جمع ہی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ خاص کر یہاں الف لام جنس کے لئے ہے جو ”عمومیت“ کا خواہاں ہے۔ امام ادب مفصل ضعی (836م) نے لکھا ہے کہ۔ ظلمت اسم ہے جسکی جمع ظلمات ہو سکتی ہے لیکن النور۔۔۔۔۔ ”مصدر“ ہے جس کی جمع ”الانوار“ بنانا ضروری نہیں ہے کہ ”مصدر“ خود بھی ”جمع“ اور مفرد کو یکساں شامل ہوتی ہے۔



## اجل۔ کی قسمیں

117

هو الذى خلقكم من طين ثم قضى اجلا واجل مسمى ثم انتم تموتون

وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر مرنے کا ایک وقت مقرر کر دیا۔ جبکہ ایک اجل اسکے

(انعام، 2)

ہاں اور بھی ہے۔

یہ ہے کہ آیہ زیر بحث میں انسان کیلئے دو موتیں مقرر ہونے کا اشارہ ہے جبکہ موت میں ”تعدد“ نہیں ہوتا۔

وجہ اعتراض

اجل دو طرح کی ہے ایک ”طبعی“ اور دوسری ”حادثاتی“۔۔۔۔۔ ”حادثاتی“ موت جیسے کسی

قول فیصل

”موذی جانور“ کے ڈسنے۔ پانی میں ڈوب مرنے۔ آگ میں جل جانے اور کسی کے ہاتھوں اچانک قتل ہو جانے کی موت ہے اس طرح پہلی موت کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ غیر طبعی حادثات پیش نہ آتے تو متاثر ہ انسان کی طبعی موت کچھ مرصہ تک واقع نہ ہو سکتی رتھی۔ لیکن غیر طبعی موت کا اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ اسکا ”علم“۔ ”اندازے“ اور قیاس سے ماوراء ہے۔ یہ اگر ”مسمیٰ“ ہے تو علم الہی میں ”مسمیٰ“ ہے علم انسانی میں ”مسمیٰ“ نہیں ہے۔ اس فنی توجیہ کے علاوہ ایک توجیہ امام ابو مسلم اصفہانی کی طرف سے حاضر ہے فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ پہلی موت سے مراد اہل ماضی کی موت ہے جو گذر گئے۔ اور اجل مسمیٰ سے مراد آنے والوں کی موت ہے جو ابھی مرے، نہیں۔ اور نہ ہی ان کی موت کا کسی کو علم ہے۔



کیا اللہ تبارک اوپر کی منزل پر تشریف رکھتے ہیں؟

118

### وہو القاهر فوق عباده

(انعام، 18)

وہ اپنے بندوں سے اونچا ہے (اور ان پر غالب ہے)۔

میں کہا جاتا ہے کہ ”فوق“ ایسی عمارت سے تعبیر ہے جو منزل دار اور اونچی ہو۔ اس طرح اللہ کے لئے سکانت اور جہت کا تصور ابھرتا ہے جو تنزیہ و تقدیس کے خلاف ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ”فوقیت“ سے ”مکانی“ و جسمانی ”فوقیت“ مراد نہیں ہے۔ رتبے اور ”منزلت“ کی فوقیت مراد ہے۔ اس طرح فوق کا لفظ صرف ”مبالغہ“ کا مفہوم واضح کرتا ہے۔ جیسے کہا جائے کہ عمر

قول فیصل

عالم فوق غیرہ۔ عمر دوسرے عالموں سے علم میں زیادہ فائق ہے۔ الامر فوق الادب تعمیل حکم۔ احترام پر فائق ہے۔

☆

عدالت میں اللہ کو گواہ بنانا

119

### قل اللہ شہید بینی و بینکم

(انعام، 19)

میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔

یہ ہے کہ۔ عدالت میں کوئی مدعی اگر اپنی صفائی میں اللہ کو بطور گواہ پیش کر دے تو ایسی شہادت مسترد ہوگی جبکہ یہ ہذا ایسی شہادت کا اعتراف کراتی ہے۔

وجہ اعتراض

نبی اکرم ﷺ کو یہ ”اختصاص“ حاصل ہے کہ اللہ سبحانہ کو گواہ بنا لیں کہ آپ صاحبِ وحی ہیں لیکن کوئی غیر نبی ایسی شہادت پیش نہیں کر سکتا کہ اسے نہ ”عقلًا“ اللہ کا ”خشا“ معلوم ہے اور نہ ”وحیًا“۔

قول فیصل

☆

اللہ کی مشیت یہ تھی کہ ہدایت عام نہ ہو؟

120

### لو شاء اللہ لجمعہم علی الہدی

(انعام، 35)

اللہ چاہتا تو انہیں ہدایت پر لے آتا۔

میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت کی رو سے ہدایت کو عام کرنا اللہ کی مشاء میں شامل نہیں۔

وجہ اعتراض

## قول فیصل

یہاں۔ اللہ کی منشا کو ”دو“ زاویوں سے دیکھنا ہوگا۔۔۔۔۔ اختیار اور ”خوشدلی“ کے زاویے سے کہ انسان ”ارادے“ اور اختیار کا مالک ہے اسے ہدایت قبول کرنے کے لئے اللہ مجبور نہیں کرے گا کہ مجبور کرنا۔ اللہ کی عادت میں شامل ہے نہ منشاء میں۔۔۔۔۔ ”جبر و اکراہ“ کے لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی ہدایت کا اصول یہ ہے کہ اس میں جبر نہیں ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ان کے ارادے اور اختیار کو اگر نہیں چھیڑا گیا تو وہ اپنے طور پر بھی ہدایت قبول کرنے کے مکلف نہیں۔ ☆

## انسانوں کی طرح پرندوں کی امتیں

121

### ولا طائر يطير بجناحية الا امم امثالكم

کوئی بھی جانور جب حرکت کرتا ہے کوئی بھی پرندہ جب پرواز کرتا ہے تو تمہاری ہی طرح کی امتیں ہیں۔ (انعام، 38)

یہ ہے کہ ”غیر انسانی“ مخلوق جب ہماری ہی کی طرح کی ”امتوں“ میں سے ہے تو انہیں شریعت کے احکام بھی ملے ہوں گے۔

## وجہ اعتراض

یہ درست ہے کہ غیر انسانی مخلوق ہماری ہی طرح کی ”امتیں“ ہیں لیکن یہاں ”مثلیت“ سے عقل و فکر میں بعینہ ”مثلیت“ مراد نہیں ہے صرف اسی زاویہ سے ”مثلیت“ ہے کہ وہ بھی انسان کی طرح کھانے پینے، زندگی کی تنگ دو اور ”حیوانیت“ میں انسان ہی کی مانند ہیں یہ علم الحیوانات کے ماہرین اور سچے فلسفوں سے دریافت کیجئے وہ ایسی تشریحات و تفصیلات سامنے لائیں گے جس سے عقل دنگ رہ جائے گی غرض کہ وہ بھی ہماری ہی طرح ”خا“ اور ”بقا“ کی ”حامل“ ٹولیاں ہیں۔ لیکن اس سے ان میں کسی طرح کی شریعت کی ٹوہ لگانا ضروری نہیں جبکہ فطرت شریعت کے مطابق ان کی ہر نوع ”محو عمل“ ہے۔ اگر وحی الہی ”غیر عاقلوں“ سے خطاب کرتی تو شریعت احکام بھی مل سکتی تھی مگر حیوانات سے کلام کرنا سنت اللہ کے خلاف ہے۔ اللہ جانوروں اور ”لا یعقلون“ سے کھلے عام بات نہیں کرتا جو کچھ کرنا یا کھنا تھا وہ ان کی ”سرشت“ میں رکھ دیا اب وہ شریعت فطرت پر عمل پیرا ہیں شریعت احکام صرف انسانوں کے لئے خاص ہے۔ ☆

## بات نہ چھپانے والے سے پوچھ گچھ کیسی؟

122

### ولا يكتُمون الله حدیثا

(انعام، 41)

وہ اللہ سے کچھ بھی چھپانہ رکھیں گے۔



**وجہ اعتراض** میں کہا گیا ہے کہ جب اللہ سے کچھ بھی چھپانہ رہے گا تو ان سے سوال اور پوچھ کچھ کس لئے؟

**قول فیصل** قیامت کے طویل عرصے میں کئی ”مراحل“ ہوں گے بعض میں کچھ باتیں پوشیدہ ہوں گی اور بعض مراحل میں وہی باتیں ”فاش“ ہوں گی کہ ”تفتیشی“ امور اور مراحل ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے

☆

مختلف نوعیتوں میں ملے ہوتے ہیں۔

**باتیں۔ رات کو ہوتی ہیں دن کو نہیں**

123

ويعلم ما جر حتم بالنهار

(انعام، 60) اور تمہاری ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو دن کو کرتے ہیں۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ یہاں باتیں گرنے کو دن کا عمل قرار دیا ہے جبکہ باتیں راتوں کو بھی ہوتی ہیں۔

**قول فیصل** یہاں ”جو حتم“ کے معنی ”کسبتم“ کے ہیں کیونکہ انسان دن ہی میں کام کاج میں مصروف اور دفتری و تجارتی معاملات میں مجہز حرکت رہتا ہے جبکہ رات آرام اور سکون کے لئے ہوتی ہے۔ لہذا یہاں کام کاج اور حکومت کے امور کو چلانے کی مناسبت سے ان ہی کا ذکر ہوا تاہم اس سے رات کو باتیں گرنے کی نفی لازم نہیں آتی۔

☆

**اللہ۔ صرف مسلمانوں کے مولے ہیں؟**

124

ثم ردوا الى الله مولهم الحق

(انعام، 62) پھر مولائے برحق کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

**وجہ اعتراض** میں کہا گیا ہے کہ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ کفار کے ”مولے“ نہیں جیسے کہ خود ہی فرمایا۔ وان الكافرين لا مولى لهم۔ کافروں کا مولے کوئی بھی نہیں۔ (محمد، 11)

**قول فیصل** یہاں ”مولے“ کے معنی ”مالک“، خالق اور ”معبود“ کے ہیں اور دوسری آیت میں ”حاشی“ اور ”ناصر“ کے ہیں جس سے وجہ اعتراض باقی نہیں رہی۔

☆

قرآن۔ میں غور و خوض کرنے والے کا بائیکاٹ

وإذا رأيت الذين يخوضون في آياتنا فأعرض عنهم حتى يخوضوا في حديث

غیر ۵

جس دیکھو کہ یہ لوگ ہماری آیات میں غرض کرتے ہیں تو ان سے لا تعلق ہو جاؤ۔ (الانعام، 68)

یہ ہے کہ اس طرح قرآن محکم میں غور و تدبیر سے رک جانا لازم آتا ہے جبکہ ہر مرحلے پر قرآن میں تدبیر کرنے کا حکم ہے۔

## وجه اعتراض

یہاں آیتِ اٰلی میں غور و تدبیر سے نہیں روکا گیا اس طرح سوچنا فکری ”کجی“ کا شاخسانہ ہے اس غورو ”فوض“ سے روکا گیا ہے جو قرآن میں کیڑے نکالنے، ڈالنے اور ”قرآن شکنی“ کیلئے بروئے کار

## قول فیصل

لائے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ”خوض“ کو پورے قرآن میں کہیں بھی ”اچھے“ مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ”مذموم“ مقصد کیلئے ہی استعمال ہوا ہے۔

بدی۔ کا خالق جب اللہ ہے تو پھر سزا کیسی؟

وخلق كل شيء۔ خالق كل شيء

(انعام، 2-101)

وہ ہر شے کا خالق ہے۔

ویدیا کہ ”بدی“ کا خالق بھی وہی ہے۔

## وجه اعتراض

خَلْق کے معنی۔ ”پیدا نگ“ اور ”تقدیری پیمانے“ مقرر کرنے کے ہیں۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے :

## قول فيصل

ولانت تغری ما خلقت وبع

ض. القوم يخلق ثم لا يفري

تم جو پلاننگ کرتے ہو اسکے مطابق بہترین چیز سامنے لے آتے ہو ورنہ تو بہت سے لوگ پلاننگ تو کرتے ہیں چیز اچھی نہیں بناتے درزی جب ناپ لے کر کپڑا کاٹ اور سی لیتا ہے۔۔۔۔۔ موچی جب پاؤں کا ناپ لیتا۔ چمڑے کو کاٹ کر آر سے سی لیتا ہے تو یہ سب کام تخلیق (پلاننگ) اور نقدیری پیمانے کے مطابق ہوتے ہیں۔ مسیح نے بھی چڑیوں پر ”تخلیق“ کا اطلاق کیا تھا یعنی وہ انکھل سے پرندے تخلیق کرتے تھے جبکہ وہ سج مج کے اڑنے والے نہیں تھے۔ اب معنی صاف

ہو گئے کہ اللہ ہی نے ہر شے کی پلاننگ اور تخلیق کی۔ عمل پیرائی اسکی ذمہ داری نہیں۔



## ان آنکھوں سے اللہ نہیں دیکھتا

127

### لا تدركه الابصار وهو يدرك الابصار

(انعام، 103)

اللہ کو نظریں نہیں پاسکتیں۔

یہ ہے کہ یہاں دنیا میں خواہ آخرت میں اللہ کے دیدار کی کلی نفی کی گئی ہے جس سے سینوں کا عقیدہ

بمروج ہو جاتا ہے۔

وجہ اعتراض

یہ درست ہے کہ اللہ نے تقدس اور تنزیہ کا دنیا اور آخرت میں یکساں ”احساس“ دلاتے ہوئے واضح

قول فیصل

کیا ہے کہ وہ ”جسم“ نہیں جسے نظر پاسکے لیکن ابوالحسن اشعری اور سنی حضرات کے زاویہ سے اللہ

کے تقدس اور تنزیہ کی لازمی حد تک نفی کی جائے گی حالانکہ یہاں لغت کا سہارا لینا بھی ضروری ہے کہ ”ادراک“ کو

جب ”بصر“ کا ردیف بنایا جائے تو اس سے ان آنکھوں سے دیکھنا مقصود نہ ہوگا۔



## جنوں میں رسول؟

128

### يُمعشر الجن والانس الم يأتكم رسل منكم

(انعام، 130)

اے انس و جن کیا تمہارے پاس میرے رسول نہیں آئے؟

میں کہا گیا ہے کہ اس آیت میں جنوں کے لئے رسولوں کی آمد کا احساس دلایا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں جس لفظ کو ”رسل“ (اپنی قوم کے قاصد) کے پیرائے میں واضح کیا ہے دوسرے مقامات پر

قول فیصل

نفر۔ یا۔ نفر من الجن کے پیکر میں لایا گیا ہے (جن، 1۔ احقاف، 29) اس طرح ”رسل“ وہ

”اجنبی لوگ“ جنہیں جن کہا گیا ہے مراد ہیں یعنی ان ہی ”اجنبیوں“ نے نبی اکرم ﷺ سے قرآن سن کر پھر آپ کے

”رسول“ بن کر اپنی قوم کے پاس پہنچ کر قرآن کا پروگرام پیش کیا۔ عربی میں چونکہ نفر۔ کا اطلاق کسی ”غیر انسان“ پر نہیں

ہوا۔ اور ہر رسل کا اطلاق بھی یہاں ”غیر نبی“ انسانوں پر ہی ہوا ہے لہذا یہاں نفر۔ اور۔ رسل۔ سے ”انسان محض“ ہی

مراد ہیں۔ اور ان ہی سے فرمایا کیا تمہارے پاس رسول ﷺ کے رسول نہیں پہنچے؟ مختصر یہ کہ یہاں دسل۔ کو لغوی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔



## اولاد۔ کو قتل کرنے کا محرک کون ہے؟

129

و كَذَلِكَ زَيْنَ لَكثِيرٍ مِنَ الْمَشْرِكِينَ قَتَلَ اَوْلَادَهُمْ شُرَكَاءَهُمْ

اس طرح شرک والوں کے لئے ان کے شرکاء نے اولاد کا قتل کیا جانا خوش نمائند کر پیش کیا۔ (انعام، 137)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ مشرکین کو یہ برائی اللہ ہی نے خوشنمائی کر۔ راہ بھائی۔

**قول فیصل** یہاں ”زین“ کا فاعل آخر میں ”شُرکاءہم“ کی صورت میں ظاہر و باہر ہے۔ اشتباہ کس لئے؟



## کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟

130

قُلْ لَا اَجِدُ فِي مَا اَوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا

انہیں کہہ دیجئے مجھے توحی کے ذریعے کسی ایسے حرام کی نشاندہی نہیں ہوئی جو کوئی کھانے والا استعمال میں لایا ہو۔ (انعام، 146)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کلمہ ”حصر“ سے بات چلا کر واضح فرمایا کہ کھانے والا ہو تو کوئی بھی چیز حرام نہیں ہے۔

**قول فیصل** یہ مفہوم کم از کم آیہ زیر بحث سے مترشح نہیں ہوتا اس میں صرف اتنا ہے کہ۔ غیر مسلم۔ زمانہ جاہلیت سے جن چیزوں کو حرام کہتے چلے آئے ہیں۔ میرے پاس تاحال انکی حرمت کی اطلاع نہیں

آئی۔

اس وضاحت کے ساتھ ہی یہ بھی روشن ہو کہ یہ جو چاروں مذاہب نے حلال و حرام کی ”طویل“ اور وہ بھی اختلافی ”جدولین“ بنا کر لوگوں کو حرام و حلال سے شناسا کر رکھا ہے۔ اللہ کے ہاں انکی ”پذیرائی“ ہے نہ ”اصلیت“۔ حرام وہ ہے جسے اللہ نے ”قرآن“ میں حرام کہا اور حلال وہ ہے جسے اللہ نے قرآن میں ”حلال“ فرمایا۔ اور جن اشیاء کا ذکر ہی نہیں کیا وہ انسانوں کی عادات سے مربوط ہیں۔



14-2-96۔

ظلم خدا کی دی ہوئی توانائی سے وجود میں آتا ہے؟

131

الا ان قالوا انا كنا ظلمين

(اعراف، 5)

جب ان کے سر پر عذاب آن پہنچا تو کہنے لگے بلاشبہ ہم ظالم تھے۔

یہ ہے کہ۔ جب عذاب کو دیکھا تو اپنی زیادتیوں کا اعتراف کرنے لگے حالانکہ ظلم کا ”صدر“ امر الہی سے ہوا تھا۔

وجہ اعتراض

یہ فرقہ ”مجبورہ“ کا عقیدہ ہے اگر ایسی بات ہوتی تو وہ گناہ کا اعتراف کرنے کی بجائے کہتے کہ۔ بار الہا آپ ہی نے ظلم کی ڈگر پر چلایا۔ سیدھی راہ سے ہٹایا۔ ہمارے دلوں پر مہر لگا دی اور ایمان لانے

قول فیصل

کی توفیق ”سلب“ کر ڈالی ایسے میں ہم بدی کے پجاری نہ بنے تو کیا کرتے؟



اعمال وزن کرنے کی بات

132

فمن ثقلت موازينه \_\_\_\_\_ ومن خفت موازينه

(اعراف، 8)

جسکے عملوں کا پلڑا جھک گیا اور جس کے عملوں کا پلڑا ہلکا ہو گیا۔

میں کہا گیا ہے کہ دیگر بہت سی آیات کی طرح زیر بحث آیہ میں بھی اعمال کے ”وزن“ کی بات ہوئی ہے جبکہ اعمال ”جوہر“ نہیں ہوتے بنا بریں نہ ”جسم“ رکھتے ہیں نہ ”وزن“ ہو سکتے ہیں۔

وجہ اعتراض

کچھ ضروری نہیں کہ وزن کا اطلاق جسم والی اشیاء کے علاوہ کسی چیز پر بھی نہ ہو۔ ہم جب کہتے ہیں کہ سرسید (1898) وزین الرائے۔ تھے یعنی ان کی رائے وزنی اور ”دقیع“ تھی۔ ابو الکلام

قول فیصل

(1958) ”نہی تلی“ بات کرتے تھے۔ تو اسکا مطلب یہ نہیں لیا جاتا کہ ان کی رائے تولوں اور گراموں میں وزن کی ہوتی تھی۔ شعر و شاعری میں بھی وزن چلتا ہے مگر اس میں بھی جسم اور ”ثقل“ کی بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح وزن اعمال بھی



حقیقت میں ”توازن“ اور انصاف کا استعارہ ہے۔

اہر من کو یزداں ہی نے بد راہ کیا

133



## فبما اغويتني لا قعدن لهم صراطك المستقيم

(اعراف، 16) آپ نے مجھے بد راہ کیا اب میں بھی ان کا راستہ روکنے کیلئے ان کی راہ میں بیٹھ رہوں گا۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ ابلیس کا شکوہ حجاب ہے کہ اسے اللہ ہی نے بد راہ کر کے گناہ کی ڈگر پر چلایا۔

**قول فیصل** یہاں ابلیس ہی نے اپنی ”بد رہی“ کو اللہ سے منسوب کیا ہے۔ ہر مجرم کا یہی ”دو طیرہ“ ہے کہ وہ اپنی ”روسیاہی“ کا سبب کسی اور کو گردانتا ہے۔ بہر حال ابلیس نے جو کچھ کہا اللہ سبحانہ نے اس کا اعتراف نہیں فرمایا۔ لہذا اشعریوں کو خوش نہ ہونا چاہیے۔ خاص کر غویں کے معنی بتائی، ہلاکت، ”ناکامی“ اور محرومی کے بھی ہیں۔ قطع نظر اس کے یہاں ابلیس بدی کی طاقت کا ”رمزی“ نام ہے خارج میں کسی ”وجود“ سے تعبیر نہیں ہے جو راہ میں بچ چکا ”دھرنا“ مار کے بیٹھے۔ اس طرح یہ تمام گفتگو عالم ”خیال“ کی ہے عالم ”مثال“ کی نہیں۔



## کپڑے اتار کر شجرہ چکھنا

134

## فوسوس لهما لیبدي لهما ما وری عنهما من سوا تهما

(اعراف، 21) شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا غرض یہ تھی کہ ان کی عریانی ان پر عیاں کر دے۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ شیطان نے ان کے کپڑے کس غرض کے لئے اتاروائے؟

**قول فیصل** غرض یہ تھی کہ ”شجرہ“ چکھنے سے کچھ وقت کیلئے روک دیا گیا تھا اور شیطان چاہتا تھا کہ وہ ”شجرہ“ ضرور چکھیں لیکن یہ شجرہ ایسا تھا کہ اسکے چکھنے کیلئے کپڑے ”اتارنے“ پڑتے تھے چنانچہ انسان اول نے کپڑے اتار کر ہی شجرہ چکھنے کا لطف اٹھایا لیکن بد وقت ”عریانی“ کا احساس نہ ہو سکا اور جو نہی فارغ ہو گئے تو جسم لباس سے عاری تھا۔ اب شرم کے مارے لگے ادھر ادھر بھاگنے اور درختوں کے پتوں سے شجرہ کو ڈھانپنے کیونکہ اب ان پر کھل چکا تھا کہ شجرہ عورت کے ”اندام نہانی“ کا ”استعارہ“ تھا حقیقت میں نہ کوئی درخت تھا نہ کوئی پھل۔ اور یہ وہ حالت ہے جو آج بھی پہلی مرتبہ ہر انسان کو پیش آتی ہے کہ وہ جفتی کے عمل سے فارغ ہوتے ہی خجالت اور شرمندگی سے آنکھیں جھکا لیتا ہے گو بعد میں ”بار بار“ شجرہ چکھتے رہنے سے یہ کیفیت طاری نہیں رہتی غرض کہ ”قربت زن“ سے پورا لطف اٹھانے کے لئے کپڑوں سے محروم ہونا ضروری تھا اور انسان کے اندر کے انسان نے اسے یہ راز بھی سمجھا دیا۔ یوں بھی

”طب“ اور سائنس جو دھڑا دھڑ قدرت کے ”راز ہائے سرستہ“ کو فاش کرتی جا رہی ہیں وہ خود بھی قانون کا حصہ ہیں اور قانون بھی لکھتا ہے کہ ”سیکس“ کے آداب میں کپڑے اتارنے ضروری ہیں۔



## ابتداء کی طرف پلٹ آنا

135

### کما بداً کم تعودون

(اعراف، 29) تمہیں اس حالت پر لوٹائے گا جس سے ابتداء ہوئی تھی۔

یہ ہے کہ۔ انسان پہلے نطفہ تھا پھر لو تھڑے میں تبدیل ہوا پھر ہڈیوں کے ڈھانچے میں کیا آخر میں گوشت پوست کے لباس میں نمودار ہوا اب اگر پہلی حالت پر لے کیا گیا تو اسکا مطلب ہے جس ترتیب سے ابتداء ہوئی تھی اسی ترتیب سے انتہا سے ابتدا کی طرف آنا ہوگا۔

### وجہ اعتراض

اسکے معنی صرف اتنے ہیں کہ تمہاری ابتدا ”مٹی“ سے ہوئی تھی اور انجام کار مٹی ہی میں ”مدفن“ ہوگا نیز اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس طرح تمہاری آفرینش ”نیت“ سے ”ہست“ کی میز حیاں طے کرتی ہوئی ”نقطہ کمال“ تک جا پہنچی تھی ہو سکتا ہے کہ کمال کے بعد زوال کی رجعت ”قہقری“ سے بھی واسطہ پڑے۔



## بے جان لاشوں سے خطاب

136

### يقوم لقد ابلغتكم رسالة ربي ونصحت لكم

(اعراف، 78) اے قوم میں نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچایا اور خیر خواہی کا فرض پورا کیا۔

میں کما جاتا ہے کہ یہاں صالح نے اُن مردوں سے بات کی جو ”رجفہ“ کے باعث مر چکے تھے۔

### وجہ اعتراض

عرب کیا دنیا کی تمام ”ادبیات“ میں یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ وہ مردوں سے سر عام اسلئے خطاب کرتے تھے کہ زندہ انسان نصیحت ٹھکرا کر نقصان اٹھانے سے عبرت پکڑ لیں۔ یہ قطع نظر اسکے کہ آئہ زیر بحث میں ”رجفہ“ کا لفظ آیا ہے جس کے ایک معنی سمندر اور پہاڑوں میں ”بھونچال“ آنے کے بھی ہیں جو مساوات ”ارتعاش“ اور خفیف بے ”تحرك“ سے بھی تعبیر ہو جاتا ہے جس سے بھاری جانی نقصان نہیں ہوتا چند افراد ”ظمء اجل“

### قول فیصل

من جاتے ہیں عربی میں کہتے کہ ”بحر دَجَاف“ ”طوفانی سمندر۔ اور کچھ ضروری نہیں کہ ان سمندری یا زمینی جھٹکوں سے پورے خطے میں تباہی آجکی ہو۔ راغب لکھتے ہیں کہ۔ رجفة۔ ”قول“ سے بھی ہوتا ہے اور ”فعل“ سے بھی مثلاً۔ ایوان حکومت میں زورِ خطابت سے ”تہلکہ“ مچا دینا حکومت کے درو دیوار ”ہل گئے“۔ اس نے زورِ تقریر سے ذہنوں میں ”بھونچال“ پیدا کر دیا۔ (راغب طبع بیروت صفحہ 194) ان تمام استعمالات کی ”ضوء“ میں کچھ ضروری نہیں کہ صالح علیہ السلام نے حقیقی مُردوں ہی سے خطاب کیا ہو زندہ متاثرین بھی مخاطب ہو سکتے تھے۔



## سُقَطُ فِی اَیْدِیْہِم۔ کی وضاحت

137

### ولما سقط فی ایدیہم

جو نبی ان کے ہاتھ گر پڑے۔ محسوس کرنے لگے کہ ہم گمراہ ہو گئے۔ (اعراف، 148)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ یہاں ”سقط فی ایدیہم“ کا محاورہ کس مناسبت سے استعمال ہوا ہے؟

**قول فیصل** یہ عرب کا ایک محاورہ ہے جو ”ندامت“ اور حسرت کے مقام پر بولا جاتا ہے جس طرح انسان کسی خلاف توقع معاملہ سے دوچار ہو کر نادام ہو جاتا ہے اور غم و ”حسرت“ سے انگلیاں چبانے لگتا ہے اسی طرح موئے چالیس دن کے بعد واپس آئے اور اسرائیلیوں کی بت پرستی پر خفا ہوئے تو وہ مارے ”ندامت“ کے اپنی گمراہی کو محسوس کرنے لگے۔ اس طرح سقط فی ایدیہم۔ ”ندامت“ کا استعارہ اور ”ایدیہم“۔ انا ملہم (انگلیوں) کا کنایہ بھر آئے ہیں کیونکہ حسرت و ندامت کے وقت منہ میں انگلیاں ڈالی جاتی ہیں۔ اور عرب میں ایسے کنایوں کا ”چلن“ عام تھا۔ اصحاب کف کے بارے میں ”وضربنا علی اذانہم“ نیند۔ کا ”کنایہ“ بن کر آیا ہے۔ حالانکہ ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ ہم نے ان کے کانوں کو ”مارا“۔



## اور = وہ انسان تھے بند رہن گئے

138

### قلنا لہم کونوا قردة خاسئین

(اعراف، 166) جب نافرمانی میں حد سے بڑھ گئے تو ہم نے کہا تم رخصس بند رہو۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں بند رہن جانے کا ایسا حکم دیا گیا ہے جسکی تعمیل۔ ضابطہ تکلیف مالا یطاق کی

رو سے ناممکن ہے۔

یہ درست ہے کہ جس قانون کے ذریعہ ایک مخلوق کو ”انسانی حلیہ“ میں پیدا کیا گیا اس قانون کو توڑ کر دوسری شکل میں لے آنا ”سید اللہ“ کے خلاف ہے۔ لیکن یہاں قانون شکنی نہیں ہوئی بلکہ ”خاصین“ کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ”ذسیں پن“ کو ملحوظ رکھ کر پھٹکار اور ملامت کے لہجہ میں کہا گیا۔ دور ہنومت تو ہندوؤں کی طرح ذسیں اور گھٹیا حرکت کرنے والے ہواسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دانشمند کسی کو سمجھاتے سمجھاتے انتہا کر دے۔ پھر مایوس ہو کر اسے کہہ دے کہ ڈوب مر تو تو انسان ہی نہیں ”حیوان“ ہے قرآن میں بے عمل ”عالموں“ کو ”گدھا“ بھی کہا ہے۔ (جمعہ، 5) اور ”کتا“ بھی، (اعراف، 175) لیکن وہ نہ سچ بچ کے گدھے تھے اور نہ حقیقت میں کتے۔

☆

عبد کن سے لیا گیا تھا۔ انسانوں سے یا انسانی اعضاء سے

139

واذ اخذ ربك من بنى آدم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم

اور جب اللہ نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی اور انہیں گواہ بنایا۔ (اعراف، 172)

یہ ہے کہ اولاد آدم جب ناجیز ذروں کی صورت میں انسانی پیٹھوں میں بکھری پڑی تھی ان سے گواہی کیسے طلب کر لی گئی؟ کیا بے جان ذروں سے بھی گواہی لی جاسکتی ہے؟

وجہ اعتراض

آیہ زیر بحث میں ”بنی آدم“ کا لفظ ہے جو جیتے جاگتے انسانوں سے تعبیر ہے اس کا انسان کے ”اجزاء“ اور جسم کے ”ذرات“ پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اجزاء ”مركب“ ہوں خواہ ”منتشر“ جب

قول فیصل

تک روح سے ”عاری“ ہیں قابل خطاب نہیں ہیں اب لامحالہ یہاں ”تاویل“ کا سہارا لے کر ذریعہ آدم سے صرف وہی ”ذریعہ“ مراد ہوگی جو صلب آدم سے ظہور پذیر ہو چکی تھی کیونکہ۔ انا کنا من هذا غافلین۔ کا قرینہ صرف اسی مفہوم کا غماز ہے۔

☆

کیا رسول عالمی نہیں صرف مؤمنوں کے ”نذیر“ تھے

140

ان انا الا نذیر و بشیر لقوم يؤمنون

(اعراف، 182) میں تو صرف مؤمنوں ہی کے لئے بشیر اور نذیر ہوں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”کلمہ دہر“ کے ساتھ رسول کی ”نذارت“ کو صرف مؤمنوں سے مربوط کیا گیا ہے جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا۔ وما ارسلناك الا كافة للناس بشیرا ونذیرا۔ ہم نے

وجہ اعتراض

آپ کو پوری کائنات بھری کے لئے بعیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے (سبا، 28) اور یہاں بھی کلمہ حصر کا استعمال ہوا ہے۔

”کلمہ حصر“ اپنے مدلول میں ”حقیقت“ کو جس مفہوم میں منحصر کرتا ہے اس سے انکار نہیں ہے

## قول فیصل

لیکن بسا اوقات یہی ”کلمہ حصر“ صرف ”مبالغہ“ کے لئے بھی ہوتا ہے۔ یہاں اس اصول سے

صرف نظر کیا جائے تب بھی ہدایت کا ”اصول“ یہ ہے کہ۔ جو شخص ہدایت سے استفادہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ ہو

اور ”نذرات“ کی ”نفسیات“ سے مٹوئی آگاہ ہوا نہیں کی بات فرمایا انعامت مندر من یخشاہا۔ آپ اسی کے لئے ”مندر“

ہیں جو ”وارنگ“ کے تقاضوں کو سمجھنے والا ہو (رعد، 8 - نازعات، 45)۔۔۔۔۔ بات صاف ہو گئی کہ مؤمن چونکہ

”بشارت“ و نذرات کا شعور رکھتا اور استفادے کے لئے ذہن کے درجے وار کھتا ہے وہی خطاب کا زیادہ اہل ہے۔

☆ 14-6-96 (مطابق 24 رمضان 1416 ہجری)

انفال

## حق و باطل میں امتیاز کی صورت

141

### لیحق الحق و یبطل الباطل

(انفال، 8)

تاکہ سچ کو سچ اور باطل کو باطل کر کے دکھائے۔

یہ ہے کہ۔ یہ تو مشکل۔ یا پھر حاصل شدہ شی کو حاصل کرنے کے مترادف ہے۔

## وجہ اعتراض

یہاں حق سے ”ایمان“ اور ”باطل“ سے ”شُرک“ مراد ہے اب معنی ہونگے تاکہ ایمان کو توانا اور

## قول فیصل

☆

شُرک کو ناتواں کر دے۔

## اللہ۔ میدانِ وعائیں

142

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ

انہیں تم نے قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا۔ اے محمد جب تم نے مخالفین پر پتھر پھینکے وہ بھی تم

(انفال، 17)

نہیں ہم نے ہی مارے تھے۔

## وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ مشاہدہ یہ ہے کہ بدز کی جنگ میں مسلمانوں ہی نے کفار کو موت کے گھاٹ اتار

کر شکست کو فتح میں تبدیل کیا تھا یہ ان ہی کا ہمتا تسلیم کرنا چاہیے اگر خدا نے ”خود“ ہی یہ کام سر

انجام دیا تھا تو اس میں مسلمانوں کی کیا خوبی ہے نیز عملِ خداوندی کا ظاہر نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ سرے سے 313 صحابہؓ



رسول قتل ہی نہ ہوتے اور ”کرشمہ فتح“ ظہور میں آجاتا۔

**قول فیصل** اسلامی آداب میں یہ بات شامل ہے کہ جب کوئی بھی اہمیت اور ”شان والا“ معاملہ سامنے آئے تو اسکی اہمیت کے پیش نظر خدا کی طرف نسبت دی جائے اور اس سے صرف اپنی عبودیت و ”بیچارگی“ کا اظہار مقصود ہوتا ہے اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے کسی سے اچھے کام سرزد ہوئے یا کسی سے برے عمل ظہور میں آئے تو کوئی مقتدر شخص ان سے کہے کہ یہ تمہاری ”گفتار“ یا تمہارے کردار کا کمال نہیں جو ”علیہ العلیل“ خدا ہے اسی کی ”توانائیوں کا پرتو“ ہے اس طرح مسلمانوں کے اچھے عمل کو عمل خداوندی کہا گیا تاکہ اس کی اہمیت ہر زاویہ سے ”دوچند“ ہو۔ یہی بات کہ یہاں پہلے فرمایا و مازمیت: کنکر تم نے نہیں پھینکے پھر فرمایا۔ اذمیت جب تم نے کنکر پھینکے۔ اسکے بعد ایک بار پھر فرمایا و لکن اللہ رمی۔ وہ تو اللہ نے پھینکے تھے۔ جس سے بندے کے عمل کا واضح تصور نہیں ابھر تا۔

**قول فیصل** نمبر 2۔ یہاں ”رمی“ کی اضافت نبی اکرم ﷺ کی طرف بھی ہے اور خدائے لایزل کی طرف بھی اس میں تضاد اسلئے بھی نہیں ابھر تا کہ مساوات کسی شے کو ”فاعل“ کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھار یہی اضافت اسکی طرف بھی منتقل ہو جاتی ہے جس نے اس سلسلے میں معاونت کی۔ بچے کو والد بھی آداب سکھاتا ہے اور استاد بھی ایسے میں آداب کی اضافت ہر دو کی طرف کی جاسکتی ہے۔ ☆

## مفرد بمعنی۔ تشنیہ اور جمع

143

ياايهاالدين آمنوا اطيعواالله ورسوله ولا تولوا عنه

(انفال، 20) مسلمانو اللہ اور رسول کے قوانین پر عمل پیرا ہو اور اس سے روگردانی نہ کرو۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ یہاں قوانین کے سلسلہ میں اطاعت و ”فرمانبرداری“۔ اللہ اور رسول کے لئے مشترکہ طور پر فرض ٹھہرا دی گئی ہے۔ لیکن ممکنہ ”نافرمانی“ کے ذکر میں فرمایا۔ اور اس سے روگردانی نہ کرو۔ اس طرح بات وضاحت کے جوہر سے عاری ہو گئی ہے۔

**قول فیصل** محاورات عرب میں ”بثرت“ اسکی مثالیں ملتی ہیں کہ جب وہ لوگ تشنیہ اور جمع کا ارادہ کرتے تو یہی کام ”مفرد“ سے بھی لے لیتے تھے جیسے فرمایا۔ واللہ ورسوله احق ان یروضہ۔ اللہ اور رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اس (یعنی ان) کی رضا جوئی کی جائے۔ (توبہ، 63) یہاں۔ بروضہ میں ”ہ“ کے ضمیر مفرد کو اللہ کی طرف بھی راجع کیا گیا ہے اور رسول کی طرف بھی جبکہ کہنا چاہیے تھا بروضہا۔ اسی طرح اسی ضابطے کی رو سے لاتولوا عنہ کا مفہوم ہوگا۔ لاتولوا عنہما۔ ☆

## انسان کا دل اللہ کے کنٹرول میں ہے

144

## ان الله يحول بين المرء وقلبه

(انفال، 24) انسان کا دل اللہ کے قابو میں ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہ قلب جسے مرکزِ ایمان بننا ہے اسکے اور صاحبِ قلب کے درمیان اللہ حائل وجہ اعتراض ہے۔ اور ”حائل“ وہ چیز ہوتی ہے جو ”پردے“ کے طور پر ”درمیان“ میں روک بن جائے دوسرے لفظوں میں ایمان لانے میں خود اللہ سبحانہ رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اللہ سبحانہ ”حائل“ ہیں لیکن اس ”جملولت“ کو کسی پوشیدہ اور ”محبوب“ شئی کی طرح نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ محسوس کر سکتے ہیں۔ یہاں نہ لوہے کا ”مادی جنگلہ“ حائل ہے اور نہ ”اینٹوں“ کی دیوار۔ ایک نادیدنی اور صرف ”اعتباری جنگلہ“ ہے لہذا وجہ اعتراض مفقود ہونی چاہیے پھر یہ ”جملولت“ کچھ ضروری نہیں کہ حقیقی ہو ”مبالغہ“ کے لئے بھی ہو سکتی ہے جیسے فرمایا۔ نحن اقرب الیہ من جبل الوردید۔ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں (ق، 16) یہ قرب ”جسمانی“ نہیں علم الہی کے ”حاوی“ ہونے کا مبالغہ ہے یعنی خدا اکتاہے۔ میں تمہارے دل میں گزرنے والے خیال تک سے واقف ہوں۔



بارش اوپر سے ہوتی ہے السماء کے حوالے کی ضرورت کیا تھی؟

145

## فامطر علينا حجارة من السماء

(انفال، 32) تم کر سکتے ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسائے۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ جب برسن (مطر) آسمان ہی سے ہوتا ہے تو ایسے میں ”السماء“ کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟

”مطلق“ برسن تو آسمان ہی سے ہوتا ہے لیکن یہ ”برسن“ (مطر کا لفظ) جب ”مضاف“ کے مقام پر آئے جیسے پتھروں کا برسن تو یہ برسن کبھی کبھار پہاڑوں کی چوٹیوں، رہائشی مکانات اور دیگر مقامات سے ”آتش فشاں“ کے نتیجے میں بھی ہوتا ہے اور یہاں اسی ہی مناسبت سے السماء کا ذکر ہوا تاکہ اشتباہ نہ ہو کیوں کہ صرف ”مطر“ (برسنے) سے پتھروں کا برسن صریح نہیں ہو سکتا تھا۔ ☆

نبی کی موجودگی میں تباہی کا دھارا منجمد ہو جاتا ہے

146

## وما كان الله ليعذبهم وانت فيهم

(انفال، 33) تمہاری موجودگی میں یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ انہیں عذاب سے دوچار کر دے۔

میں کہا جاتا ہے کہ پہلے تو یہی کچھ فرمایا لیکن پھر پالیسی بدلتے ہوئے احساس دلایا کہ و ما لهم ان

لا يعذبهم الله۔ (کوئی وجہ نہیں کہ اللہ انہیں عذاب نہ دے) (انفال، 34)

وجہ اعتراض

دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کے اور طالبان مغفرت کے نکل جانے کے بعد کوئی وجہ نہیں

کہ ان پر کوئی آفت نازل نہ ہو۔ اب وہ آفت کسی معرکے میں شکست کھانے کی صورت میں ہو یا صلح

قول فیصل

حدیبیہ کے دوسرے سال مسلمانوں کے مکہ پر قابض اور غالب آجانے کی شکل میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔



## تالیاں پیٹنے اور سیٹیاں بجانے پر ”صلوٰۃ“ کا اطلاق

147

### ماکان صلاتهم عند البيت الامكاء وتصدية

(انفال، 35) بیت اللہ میں ان کی صلاۃ یہ تھی کہ سیٹیاں بجا میں اور تالیاں پیٹیں۔

یہ ہے کہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا صلاۃ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے بائیں ہمہ ان کے صلاۃ شکنی

وجہ اعتراض

کے عمل کو صلاۃ ہی سے موسوم فرمادیا۔

یہ درست ہے کہ انہوں نے ”سیٹیوں“ اور ”تالیوں“ کو صلاۃ کے مقام پر استعمال کیا ہے لیکن اس

سے یہ اخذ کرنا کہ ان کی صلاۃ ہی یہی کچھ تھی غلط ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے جیسے کوئی

قول فیصل

کے میں شمر سے ملا سے جفا (زیادتی) کا صلہ دیا۔ یعنی صلے کے مقام پر جفا کر ڈالی۔ فرزوق کتاب ہے:

اخاف زیادا ان یکون عطاء

اذا هم سودا او مجد رجة سمرا

میں زیادہ سے ڈرتا ہوں کہیں اسکا انعام قید و کوڑوں کی صورت میں نہ ہو۔۔۔۔۔

اسی طرح یہاں ”عطاء“ (انعام) کو ”قید“ و کوڑوں کے مقام پر استعمال کیا ہے یہ نہیں کہ عطا ہی قید و کوڑے



ہیں؟

## تھوڑی تعداد کو زیادہ کر دیکھانا

148

ويقللکم فی اعینہم

(انفال، 40)

اس نے تمہیں دشمن کی نظروں میں تھوڑی تعداد میں کر دکھلایا۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ اگر کفار کی نظروں میں مسلمانوں کو کم تعداد کر کے دکھلایا گیا تاکہ وہ حوصلہ پا کر حملہ آوری میں پھل کریں یعنی ان کے دل سے ”ہیبت“ اور رعب جاتے رہنے کا امکان ہو سکتا تھا تو

یہی فارمولا اسکے برخلاف بھی استعمال میں لایا گیا تھا۔

اس میں مصلحت یہ تھی کہ ”کم تعداد“ دیکھ کر حملہ کی جسارت کرتے اور پھر اچانک انہیں پتہ چلتا

قول فیصل

کہ وہ حملہ آوری میں پھل کر کے غلطی کر بیٹھے اس طرح نہ صرف انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا دہشت اور خوف زدگی کے عالم میں فرار کی بھی سوچنے لگے۔ لیکن یہ ایک تدبیر تھی جسے مسلمانوں پر بھی منطبق کیا گیا تھا وضاحت اپنے مقام پر عمران (13) میں ہو چکی۔ ☆

پھوٹ سیاسی ہو خواہ مذہبی عنوانِ تباہی ہے

149

ولاتنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم

(انفال، 42)

آپس میں جھگڑومت۔ اس طرح تم ناکام ہو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ اگر ”منازعہ“ ترک کیا جائے تو غیر مسلموں سے ”مناظرہ“ اور مکالمہ کیسے ہو سکے گا؟

وجہ اعتراض

”منازعہ“ ”وسیع المعنی“ لفظ ہے جسکے ایک معنی۔ امورِ جنگ میں ”آکھ ملا“ کر دشمن سے بات کرنا

قول فیصل

ہیں۔ یعنی جب جنگ کے خاتمے پر یا جنگ کے دوران ہی دشمن سے ”نیبل ٹاک“ ہو تو پوری قوم متحد ہو کر بات کرے کیونکہ ایسے نازک مرحلے پر دشمن نے اگر اندرونی ”کشاکش“ یا کمزوری کو ”سوگھ“ لیا تو تمہاری خیر نہیں وہ تم ہی میں سے کچھ لوگوں کو ملا کر مکمل تباہی لاسکتا ہے۔ ☆

توبہ

مشرکین۔ حرمِ کعبہ میں داخل نہ ہوں

150

کیا ملیچھ اور پوتر۔ کا اسلام میں تصور ہے؟

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامہم هذا

حقیقت یہ ہے مشرک نجس ہیں اس برس (یعنی 9 ہجری) کے بعد مسجد الحرام کے نزدیک نہ بھگیں۔ (توبہ، 29)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اس آیت کی ابتداء حرف ”انما“ سے ہوئی ہے جو مشرکوں کو بول و براہ اور خنزیر کی طرح ”نجس“ ٹھہراتی ہے جس سے ملیجھ کا تصور اجاگر ہو کر انسان کو ”پوتر“ اور ”مٹیجھ“ کے دھڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے جو خود قرآن حکیم کی عمومی پالیسی کے منافی ہے۔

**قول فیصل** جس ”ممانعت“ کی ابتداء حرف ”انما“ سے کی گئی ہے اسکی ”اثر آفرینی“ مسلم لیکن یہی حرف با اوقات ”حصر“ برائے ”مبالغہ“ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جس کا ادنیٰ مفہوم ”زیادہ سے زیادہ“ پر ہیز کا احساس دلانے کے لئے ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی ”نجاست“ کی حقیقت معلوم کیجئے کہ جو دو طرح کی ہے امام راغب (1108م) لکھتے ہیں :

ایک نجاست وہ ہے جو ”جسم دار“ ہو اور محسوس کیجاسکتی ہو مثلاً ہاتھ لگانے سے پتہ چلے کہ جسم دار چیز کو مس کیا گیا ہے دوسری نجاست وہ ہے جو ”محسوس“ نہ کی جاسکتی ہو یعنی ”وجود“ نہ رکھتی ہو ”اوراک“ اور بصیرت سے معلوم کی جاسکتی ہو قرآن پاک میں اہل شرک کو اسی دوسرے مفہوم میں ”نجس“ کہا گیا ہے۔ (مفردات طبع دار الفکر بیروت صفحہ 503)

راغب کی یہ تعبیر ”اسوۃ“ رسولؐ کے بالکل ہم آہنگ ہے کہ یہاں ”نجاست“ سے ”جسمی“ نہیں ”قلبی“ نجاست“ مراد ہے کہ وحی قرآن کے نزدیک انسان ”پلید“ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ”حدیبیہ“ کے دوسرے ہی سال مکہ جب فتح ہوا تو قرآن پاک نے پہلی فرصت میں یہ پالیسی عطا فرمائی کہ من دخلہ کان آمنا جو مشرک بھی حرم کعبہ میں داخل ہوا امان میں آگیا۔ (عمران، 97)

اب مشرک اگر بول و براہ اور ”خنزیر“ کی طرح ”ناپاک“ اور نجس ہوتے تو انہیں دخول جرم کا ”پروانہ“ کیسے مل سکتا تھا۔

امام العصر محمد عبدہ (1905م) لکھتے ہیں :

**نجاست کے مفہیم** قرآن میں ”نجاست“ کا لفظ ”لغوی“ مفہوم میں استعمال ہوا ہے جسکے معنی

شرارت اور ”تخریب کاری“ کے ہیں فقہانے جو معنی تجویز کئے ہیں وہ مطلوب قرآن نہیں ہیں۔

(تفسیر ”النار“ طبع مصر 1960م جلد 10/325)

اور امام العصر ہی لکھتے ہیں کہ

عرب جب کسی کو ”نجس“ کہتے تو اشارہ ہوتا کہ وہ ”بد فطرت“، ”غندہ اور ”جھگڑالو“ ہے۔

(النار، 10/323)

امام العصر کی یہ تعبیر یوں بھی عقل لگتی ہے کہ ”المشرکون“ میں الف و لام ”عمد“ کا ہے جس کے معنی ہیں ”سب“ نہیں صرف وہ ”مشرک“ جو نجس“ یعنی جھگڑالو ہیں وہی کعبہ اقدس سے دور دور رکھے جائیں کیونکہ وہی مشرک



حرم میں داخل ہو کر اہل توحید کی عبادات میں نہ شامل ہونے اور مشرکانہ رسوم کا اظہار کر کے اشتغال پھیلانے کا ارادہ کئے ہوئے تھے لہذا ”نادیہ“ اور سیاسی طور پر ممکنہ شرارتوں اور قتل و غارت کا سد باب کرنے کے لئے ان کو حرم کے داخلہ سے روکا گیا۔ اس طرح ان کی نجاست ”حسی“ یا ”وجودی“ نہیں ”اعتباری“ اور ”ادراکی“ تھی ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں گندے اور فتنہ پرداز عناصر کے بارے میں کہتے ہیں وہ بڑا خبیث ہے تو اس سے انکی اندر کی خباثت مراد لیتے ہیں ظاہر کی خباثت نہ محاور تا صحیح ہے نہ حقیقتاً۔ انما المشرکون کی وضاحت میں امام الہند (1958م) فرماتے ہیں :

”اس آیت میں ”مشرکوں“ کے نجس ہونے سے مقصود ان کی قلبی نجاست ہے نہ کہ جسمانی کیونکہ اسلام کسی انسان کے جسم کو ناپاک قرار نہیں دیتا اور انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے ایک درجہ پر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام چھوٹ و چھات کی ہر قسم اور ہر شکل کو ناجائز قرار دیتا ہے خود عظیم اسلام کا یہودیوں اور مشرکوں سے ہر طرح کی معاشرت رکھنا ایک ساتھ کھانا پینا۔ ان کی دعوتوں میں جانا اور انہیں دعوتوں میں بلانا حتیٰ کہ انہیں مسجد کے اندر ٹھہرانا ثابت ہے۔“ (ترجمان القرآن طبع مجوریوپی جلد 2/85 نوٹ نمبر 18)

کہ رواں صدی کے ”اوائٹل“ تک ”فرقہ بند“ اپنی اپنی مساجد میں مخالف کو باایں ہمہ یہ بات تسلیم ہے! نماز قائم کرنے کی نہ صرف اجازت نہ دیتے اگر بھولے سے کوئی نماز قائم کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو چٹائی جلادی جاتی اور فرش دھولیا جاتا کہ ان کے خیال میں مخالف کتے سے زیادہ نجس تھا۔ لیکن فرقہ بندوں کا کوئی بھی کردار سند اور حجت نہیں بن سکتا۔

صلح حدیبیہ (628) کے دوسرے سال جب مکہ مشرک حرم کعبہ میں داخل ہو سکتے ہیں فتح ہوا تو قرآن پاک نے انتظار کئے بغیر ہی یہ

پالیسی عطا فرمائی کہ من دخلۃ کان آمنا۔ مشرکوں میں سے جس نے بھی حرم میں پناہ لی وہ امان میں آگیا (عمران، 97) اب کسی بھی فاتح مسلمان کی تلوار اس پر وار نہیں کر سکتی اور ظاہر ہے کہ مشرک اگر ”فقہی“ اصطلاح والے ”ملیچہ“ شمار ہوتے تو انہیں دخول حرم کا ”پروانہ“ ہی نہ مل سکتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ فتح مکہ کے وقت جب زور کارن پڑا ہوا تھا انسانی جذبات ”طیش“ میں بدل چکے تھے قرآن محکم نے ویسے نازک ”لمحات“ میں بھی انسانی ”شرف و کرامت کو“ ”پامال“ کرنے کی اجازت نہیں دی مشرک اگر قاتل ہے تب بھی کعبہ میں داخل ہونے کا اسے حق ہے اس کا یہ حق کسی فقہی نجاست کے باعث ”صلب“ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وحی قرآن مزید سبقت کر کے ”نجاست بردار“ مشرکوں کو حرم کعبہ میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے کہ ان میں سے اگر کوئی پناہ طلب ہے اور ساتھ ہی پیغمبرؐ کی زبانی کچھ سننا بھی چاہتا ہے تو بلا جھجک حرم کعبہ میں آ سکتا ہے فرمایا :

اور (اے پیغمبرؐ) اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے پناہ مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں

تک کہ وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سن لے پھر اسے (بہ امن) اسکے ٹھکانے پہنچا دو۔ یہ بات اس لئے ضروری ہے کہ لوگ (دعوتِ حق کی حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔ (توبہ، 6)

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین جب ”مفتوح“ ہو گئے ان کا زور ”ٹوٹ گیا اور اب وہ شرارت پھیلانے کے قابل بھی نہیں رہے تو انہیں مسجدوں میں آنے دیا جائے تاکہ وہ تمہارے پروگرام، اہداف اور مقاصد سے آگاہ ہوں اور حصولِ ہدایت میں رکاوٹ محسوس نہ کریں۔

**روایات کیا کھتی ہیں** ثمامہ بن اثال (633م) جب مشرک تھا تو کسی جرم کی پاداش میں مسجدِ نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ لیا گیا۔ (لکن حجر۔ الاصابہ طبع مصر 211/1)۔۔۔۔۔ ابن عبد البر

الاستیعاب طبع مصر 203/1

یہ یاد رہے کہ اس ستون والا مسجدِ نبویؐ کا حصہ اب ”ریاض الجنۃ“ میں شامل ہے۔

احمد اور ابو داؤد۔ حضرت جابر بن عبد اللہ (697م) سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی معیت میں مشرکوں سے لڑائیاں لڑتے تھے جب وہ ”ہزیمت“ سے دوچار ہو کر اپنا ساز و سامان۔ اثاثہ اور برتن چھوڑ جاتے تو ہم ان کے برتنوں کو بے کھٹکے اور بن دھوئے استعمال میں لاتے اور کوئی سرزنش نہ ہوتی۔

حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک ”مشرکہ خاتون“ کی ”مشکیزہ“ سے وضو بھی کیا اور پانی بھی پیا۔ یہ روایات بھی واضح کرتی ہیں کہ اسلام کسی بھی انسان کے جسم کو ناپاک نہیں ٹھہراتا اور ہر انسان کو انسان ہونے کے ناطے سے ایک ہی درجہ پر رکھتا ہے خود سید البشر ﷺ کا جیسا کہ ابھی معلوم ہوا غیر مسلموں اور مشرکوں سے ہر طرح کی ”معاشرت“ رکھنا، ہاتھ ملانا، ایک ساتھ کھانا کھانا، ان کی دعوتوں میں جانا اور اپنی ضیافتوں میں بلانا ثابت ہے نجران کے عیسائی، ”یمن“ کے مشرک اور ”ایران“ کے مجوسیوں کے وفد مسجدِ نبویؐ میں ہی سید البشر ﷺ سے ملنے اور مسجد ہی میں ٹھہرائے جاتے (حوالہ ”النار“ 13/8/324/10) اور پھر کہیں یہ ثابت نہیں کہ رسالتکب ﷺ ان سے ملنے کے بعد ”تخلیہ“ میں جا کر نہ طحیٰ یا کسی طرح کے صابون سے ہاتھ دھو ڈالتے یا مہمانوں کے چلے جانے کے بعد مسجد کی چٹائیوں کو جلا ڈالتے یا فرش اکھڑا دیتے تھے پس جب آپؐ کا ”أسوہ حسنہ“ نجاست کو ظاہر کی جائے اندر کی پلیدی کے روپ میں پیش کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم امام رازی کے ”جدلی“ انداز استدلال سے مرعوب ہو کر غیر مسلموں یا مشرکوں کو خنزیر یا انسانی بول و براز کی طرح حقیقی ”نجس“ تسلیم کر لیں یہ قرآن کی ذاتی وضاحتیں ہیں جن میں نہ تاویل راہ پاسکتی ہے نہ کوئی فقہی ”فارمولا“ اثر انداز ہو سکتا ہے۔



دینِ حق۔ کو = الہدی = پر عطف کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟

151

## هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق

(توبہ، 34)

اس ہی نے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔

یہ ہے کہ۔ دین حق۔ ہدایت ہی کا دوسرا نام ہے ایسے میں اسے ”ہدایت“ پر عطف کرنے میں کیا مصلحت پنہاں تھی؟

وجہ اعتراض

الہدیٰ۔ ”قرآن“ کا۔۔۔۔۔ اور ”دین الحق“ اسلام کا ”استعارہ“ ہے اس طرح دو مختلف چیزوں کا ایک دوسرے پر عطف جائز ہے۔ ☆

قول فیصل

اسلام۔ کو صرف کسی ایک دین پر غلبہ ہوگا

152

## لیظہرہ علی الدین کلہ

(توبہ، 34)

تاکہ اسے پورے دین پر غالب کر دے۔

یہ ہے کہ یہاں ”الدین“ کی بجائے ”الادیان“ ہونا چاہیے تھا کہ دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنا مقصود تھا۔

وجہ اعتراض

یہاں ”الدین“ پر الف و لام جنس کا ہے جسکے معنی ”جنس ادیان“ پر غالب آنے کے ہیں کیونکہ ”جنس“ مفرد اور جمع کو یکساں شامل ہے جیسے کہتے ہیں کثر الدرہم والدینار فی ابیدی

قول فیصل

الناس۔ لوگوں کے ہاتھوں میں درہم و دینار کی بہتات ہے۔ یہاں۔ درہم۔ اور دینار پر ”الف و لام جنس“ کا ہے جسے انہیں معنادر اہم اور دنانیر۔۔۔۔۔ بنادیا ہے خود ہماری زبان میں روپے پیسے کی فراوانی کہ کر روپوں اور پیسوں کا مفہوم لیا جاتا ہے۔

☆

ذکر چاندی اور سونے کا۔ بات صرف چاندی کی؟

153

## ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ

(توبہ، 35)

جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے رہتے اور راہ خدا میں کھلا نہیں رکھتے۔

میں کہا جاتا ہے کہ آیہ ہذا میں بات سونے چاندی کے ذخیرہ کرنے سے چلائی گئی ہے مگر ضمیر۔ صرف چاندی کی طرف راجع ہے۔

وجہ اعتراض

یہ اسلئے کہ ”ضمیر“ ہمیشہ قریب کی طرف لوثا ہے جبکہ چاندی ہی ”قریب تر“ ہے خاص کر ”مشترب“ مفہوم رکھنے والی دو چیزوں میں سے عرب ہمیشہ کسی ایک کی طرف ”ضمیر“ راجع کر کے

قول فیصل

مراد ”دونوں“ چیزیں ہی لیتے تھے حضرت حسانؒ کہتے ہیں :

فمن يك امسى بالمدينة رحله

فانى وقيار بها لغريب

یہاں ”المدينة“ اور ”رحل“ کی طرف ضمیر ”مفرد“ (بہا) راجع ہے اور اسی مناسبت سے ”لغریبان“ کی

جائے ”لغریب“ کہہ دیا قرآن میں اسکی درجنوں مثالیں موجود ہیں۔



154

سال کے مہینے بارہ ہی ہوتے ہیں پھر بارہ کے عدد کو دہرانے میں کیا مصلحت تھی؟

ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا

(توبہ، 37)

اللہ کے ہاں سال کے بارہ مہینے ہی ہیں۔

یہ ہے کہ تمام مذاہب و ممل میں سال کے بارہ مہینے ہی تسلیم کئے گئے ہیں۔ مہینے قمری ہوں یا شمسی

سبھی سال کے لئے بارہ کی تعداد ہی سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں بطور خاص وضاحت کرنے میں

**وجہ اعتراض**

کیا مصلحت نہاں ہے؟

یہ بتانا مقصود تھا کہ بارہ کی تعداد انسانوں کی تجویز کردہ نہیں اللہ کی مقرر کردہ ہے۔

**قول فیصل**



155

کیا اللہ کی باتیں ”حادث“ ہوتی ہیں؟

وجعل كلمة الدين كفروا السفلى و كلمة الله هي العليا

(توبہ، 40)

اس نے کفار کے کلمہ کو نیچا اور اپنے کلمے کو اونچا کیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”کلمہ“ کو جعل کے فعل کا ”مفعول“ بنایا ہے جبکہ جعل - ”حدوث“ کو

متقاضی ہے اور ”حدوث“ اللہ کا فعل نہیں بن سکتا پھر ”سفلی“ اور ”علی“ بھی جسم یا ”جسم دار

**وجہ اعتراض**

”چیز کے ”وصف“ ہیں۔

آپ کلمۃ اللہ کو حادث کے ”جال“ سے جتنا کچھ نکالنے کی کوشش فرمادیں گے اتنا ہی یہ ”جال“

**قول فیصل**

عقیدے کی ”کھال“ میں گھستا چلا جائے گا اور حالی کے بقول -

تڑپو گے جتنا جال کے اندر

جال گھسے گا کھال کے اندر

اب بھریہ ہے کہ آپ حقیقت ”تسلیم“ کر لیں۔ تاہم آپ کے اطمینان کے لئے عرض ہے، کہ یہاں ”سفلیہ“ اور ”علیہ“ کو کلمہ کے اوصاف بنانے کیلئے ”مجاز“ کا سہارا لیا گیا ہے۔

☆

## میدان جنگ میں شامل نہ ہونے کی پابندی کیوں؟

156

ولو ارادوا الخروج لاعدوا له عدة ولكن كره الله انبعاثهم فبطهم

اگر وہ میدانِ و غامیں نکلنے کا ارادہ کرتے اس کے لئے سامان بھی کرتے لیکن خدا نے ان کا اٹھنا (اور میدان میں نکل آنا) پسند ہی نہیں کیا جیسی تو ان کو ہٹنے جلنے ہی نہ دیا اور انہیں کہہ دیا جہاں معذور بیٹھے ہیں تم بھی ان ہی کے ساتھ بیٹھو۔ (توبہ، 46)

یہ ہے کہ پہلے انہیں حکم دیا کہ حالات جیسے بھی ہوں جہاد اور دفاعِ وطن کے لئے نکل کھڑے ہوں۔ پھر فرمایا کہ تمہارا نکلنا ہمیں پسند ہی نہیں تم اپا بچوں اور معذوروں کی صف میں جا بیٹھو۔ یہ

وجہ اعتراض

عجیب پالیسی ہے کہ۔ وجہ بھی واضح نہ ہو اور پالیسی بھی مجمل۔

یہاں استثناء ”غیر اعلامیہ“ ہے جو کلام کے ”سیاق“ سے تعلق رکھتی ہے اس میں ہے کہ۔ اللہ نے

قول فیصل

سب مسلمانوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جہادِ وطن میں بھرپور حصہ لیں پھر ان سب سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جو ”خوشدلی“ سے جہاد میں شمول سے گریزاں تھے کہ ان کے دلوں میں کھوٹ تھا یہ لگھو شامل ہو بھی گئے تو مجاہدوں میں ”بددلی“، ”فتنہ“، ”فساد“ اور ”اختلاف“ کی باتیں کر کے جیادوی مقصد کو نقصان پہنچائیں گے لہذا انہیں یہ کہہ کر روک دیا۔ لو خرجوا فيكم مازادوكم الا خبالا ولا اوضعوا خللکم یفونکم الفتنۃ۔

اگر یہ لوگ تم سے مل کر نکل بھی کھڑے ہوتے تو بھی تمہارے خلاف شرارتیں اور فساد برپا کرنے کی غرض سے کھڑے ہو جاتے جبکہ تم میں جاسوس بھی گھسے ہوئے تھے جو لمحہ بہ لمحہ کی خبریں دشمنوں کو پہنچاتے۔

(توبہ، 47)

اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ نکلنے کا حکم ان سے ”مخصوص“ نہ تھا سب لوگوں کیلئے ”عام“ اور یکساں تھا اور اسی عام سے ان کو مستثنیٰ کر کے نکلنے سے روک دیا۔ حالانکہ ان میں ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ الذن لی ولا تفتنی الا فی

الفتنة سقطوا

ہمیں صاف کہہ دو امتحان میں نہ ڈالو۔ آگاہ رہو کہ یہ امتحان میں تو پڑ ہی گئے ہیں اب تو ”خدا“ کا جہنم

(توبہ، 49)

ہی ان کا ٹھکانہ ہے۔



یہاں فتنے میں پڑنے سے یہ مراد نہیں کہ وہ کفر کی ”گھاٹیوں“ میں کھو گئے؟ بلکہ وہ جماد میں پیش آنے والی ”مشکلات“ اور مصائب سے گھبرا گئے۔



## اب بیٹھے ہی رہو

157

### وقیل اقعدا مع القاعدین

(توبہ، 47) انہیں کہا گیا اب بیٹھنے والوں کے ساتھ مل کر تم بھی بیٹھ رہو۔

**وجہ اعتراض** میں کہا گیا ہے کہ پہلے انہیں بیٹھ رہنے کو کہا پھر اس پر مذمت کر ڈالی۔

یہاں بھی ساتھ آیات ہی کا مضمون دہرایا گیا ہے لیکن اس کا آغاز ”قیل“ کے ”مجبول“ کے صیغے سے ہوا ہے جس سے کہنے والے کا پیر نہیں چلتا۔ ہو سکتا ہے کہ اندر کے ”خناس“ نے انہیں بیٹھ رہنے پر اکسایا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے اندر میں جھانک کر ان کے ”عزائم“ کو تازہ کیا ہو پھر ناراضگی میں انہیں بیٹھ رہنے کا کہا ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ”گوشمالی“ اور سرزنش کے طور پر اللہ سبحانہ نے انہیں دور رہنے کا خود ہی حکم دیا ہو۔ اور ایسے ”احتمالات“ کی موجودگی میں اللہ سبحانہ کو کسی ”ناگوار“ صورت حال کا ذمہ دار گردانا آدابِ احترام کے منافی ہے۔



## منافقوں پر قرآن۔ کا نزول

158

### يحذر المنافقون ان تنزل عليهم سورة

(توبہ، 65) منافقوں کو ڈر ہے کہ ان میں کوئی سورت نازل نہ ہو۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ وحی قرآن تو نبی اکرم ﷺ پر ہی نازل ہوئی ہے منافقین پر نازل ہونے کے چہ معنی؟

یہاں حرف ”علی“ بصورت ”علیہم“۔۔۔۔۔ ”فی“ کے مفہوم میں آیا ہے یعنی کفار ملکہ ”منافقین“ کو خطرہ تھا کہ کہیں وحی قرآن ان کے بارے میں ”نازل“ ہو کر ان کا ”کچا چٹھا“ ظاہر نہ کر دے۔ خاص کر اس مقام پر تنزل۔ کا فعل ”تنزل“ کا استعارہ بن کر آیا ہے اس طرح ان پر قرآن کے نزول کی بات ہی ختم

ہو گئی۔ اب ڈر یہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ ہمارے ”کر تو توں“ کو اگر پڑھ کر سنائیں تو ہمارا کیا بنے گا۔



## اللہ سے ملاقات کی حقیقت

159

### فاعقبہم نفاقا فی قلوبہم الی یوم یلقونہ

(توبہ، 77) اس دن تک کہ وہ خدا کے حضور پیش ہوں ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا۔

### وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں۔ اللہ سے ملاقات کی بات ہوئی ہے جبکہ ”ملاقات“ کا تعلق جسم سے ہے اور ”جسم“ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ نظر میں سما جانے والی شے ہے جبکہ اللہ۔ نہ ملاقات میں ”منصافحہ“ کریں گے نہ ”چھٹی“ ڈالیں گے اور نہ ہی نظر میں سما جائیں گے۔

### قول فیصل

ملاقات عربی میں وفات سے بھی تعبیر ہوتا ہے اہل زبان کہتے ہیں فلان قد لقی اللہ۔ فلاں اللہ سے جا ملا ہے یعنی فوت ہو گیا ہے اس طرح یوم یلقونہ کے معنی ہوں گے جب وہ موت سے سامنا کریں گے۔ اسکے علاوہ ”لقا“ جب انسانوں کی بات بولا جائے گا تو ”ملنے“۔ سینہ کا سینہ سے ٹکرانے، ”معانقہ“ کرنے اور چھٹی ڈالنے کے معنی ہوں گے اور جب اسکی نسبت اللہ کی طرف ہوگی تو یہ تمام صورتیں حذف کر کے ”روبرو“ محض کے مفہوم میں استعمال ہو گا جو کسی بھی طرح کی رویت اور مست کو مستلزم نہیں۔



## مختلف وقتوں کی بات ایک جیسی نہیں ہوتی

160

### لا تعلمہم نحن نعلمہم

(توبہ، 102) انہیں تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔

### وجہ اعتراض

یہ ہے کہ یہاں ”منافق شناسی“ کو اپنا کام ٹھہرایا ہے جبکہ دوسری جگہ فرمایا ولنعرفہم فی لحن القول ہم ان کی باتوں ہی سے ان کے نفاق کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ (محمد، 30)

### قول فیصل

ایک وقت میں اگر ان کے حالات کا علم رکھنے کی نفی کی اور دوسرے وقت میں اثبات۔ تو اس سے تناقض کا استدلال نہیں ہو سکتا۔ کہ ہر حالت ”مختلف وقت“ سے مربوط ہے اور مختلف اوقات کی باتیں یکساں نہیں ہوتیں۔



## بُرے بھلے میں تمیز نہ کرنا

161

## خلطوا عملاً صالحاً وأخر سيناً

(توبہ، 103)

بھلے بُرے کو گڈ مڈ کر دیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”عملِ صالح“ یا ”عملِ باطل“۔ یا قولِ حق اور قولِ باطل کے گڈ مڈ ہونے کی بات تو ہو گئی مگر جس چیز سے گڈ مڈ کیا گیا اس کی وضاحت نہیں ہوئی۔

وجہ اعتراض

یہاں ”اصولِ مبالغہ“ کو ملحوظ رکھا گیا ہے دیے عملِ صالح کو جس چیز (مخلوطہ) سے ملا یا گیا ہے وہ عملِ باطل ہے۔ دودھ میں پانی ملا دیا گیا۔ یہاں ”مخلوطہ“ دودھ ہے۔

قولِ فیصل

15-2-96 مطابق 25 رمضان۔

☆

یونس

## زندگی بارش کی مانند ہے

162

### انما مثل الحياة الدنيا كماءٍ انزلناه من السماء

(یونس، 24)

دنیا کی زندگی اس پانی کی مانند ہے جو آسمان سے برستا ہے۔

یہ ہے کہ زندگی کو آسمان کے پانی سے تشبیہ دی ہے جبکہ تشبیہ کے لئے زمین کا پانی ہونا چاہیے جو ہر وقت ہماری دسترس اور کنٹرول میں ہے۔

وجہ اعتراض

آسمان کے پانی سے ”تشبیہ“ کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کو یکساں سیراب کرتا۔ بغیر ”باری“ کے انسانی اور غیر انسانی مخلوق کی ”مسادی“ آبیاری کرتا ہے۔ اسمیں اسیر و غریب۔ عام اور خاص انسانوں

قولِ فیصل

کے علاوہ حیوانات و نباتات و جمادات بھی محروم نہیں رہتے۔ اسکے برعکس زمین کے پانی کو۔ ”حاصل“ کیا جاتا ہے جبکہ آسمان کا پانی سب کو۔ ”حاصل“ ہو جاتا ہے زندگی بھی اسی کی طرح ہے کہ اسکی جہاں بھی ”رُمت“ پڑتی ہے ”عام ہی پڑتی

☆

ہے۔

## بَيَاتًا كَالِاسْتِمَالِ

163

### بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا

(یونس، 50)

رات کو یا دن کو۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”نہاراً“ کی مناسبت سے ”لیلًا“ کہنا چاہیے تھا کہ وحی قرآن کے استعمالات میں نہار۔ اور لیل ہمیشہ ساتھ ساتھ آئے ہیں۔

وجہ اعتراض

یہاں یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ عرب ہی اپنے استعمالات میں جب ”گرفت“، ”وعید“، ”تباہی“ اور

قولِ فیصل

وارثک کا اظہار کرتے تو نہار کے ساتھ۔ بیانا۔ کور دیف بنا لیتے کہ وہ ”جامع“ بھی تھا اور ”مجرموں“ کو سزا سنانے کی نسبت سے ”موزوں“ بھی۔



## نبیؐ کا اپنی ہی وحی۔ میں شک کرنا

164

فان كنت في شك مما انزلنا اليك

(یونس، 94)

جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اس میں اگر شک ہو تو۔

یہ ہے کہ آیہ۔ کی ابتداء میں حرف ”ان“ استعمال ہوا ہے جو شک کا فائدہ دیتا ہے جبکہ نبی اکرم ﷺ کو وحی قرآن میں شک تھا ہی نہیں۔

وجہ اعتراض

یہاں کنت کے ”مخاطب“ نبی اکرم ﷺ نہیں۔ عام ”انسان“ ہیں جیسے فرمایا۔ یا ایہا الناس قد جاءکم برهان من ربکم وانزلنا الیکم نورامینا۔

قول فیصل

اے لوگو بلاشبہ تمہارے پاس رب کی برہان آچکی اور ہم نے تمہارے لئے ”نور مبین“ نازل کیا۔ (نساء، 173)

اسی طرح آیہ زیر بحث میں نبی اکرم ﷺ کی بجائے اس انسان کو مخاطب کیا جسے قرآن میں شک تھا۔



## جبر سے کام لیا جاتا تو سبھی مسلمان ہو جاتے

165

ولو شاء ربك لآمن فی الارض کلہم جمیعاً

(یونس، 99)

اگر تمہارا رب چاہتا تو سب کے سب دولتِ ایمان سے مالا مال ہو جاتے۔

میں کہا گیا ہے کہ۔ حرف ”کلہم“ کے بعد ”جمیعاً“ کہنے میں کیا مصلحت تھی جبکہ کلہم میں ”احاطے“ اور ہر چیز پر شامل ہونے کی پوری صلاحیت ہے۔

وجہ اعتراض

بلاشبہ حرف کلہم۔ میں احاطے اور ہر چیز پر ”شامل“ ہونے کی صلاحیت ہے لیکن یہ ”اجتماعی سطح“ پر لانے کا غماز نہیں ہے۔ خاص کر اس آیت میں یہ ”بلغ اشارہ“ موجود ہے کہ اللہ کی مشیت یہ نہ

قول فیصل

تھی کہ ایمان کے معاملہ میں ”جبر“ سے کام لیا جائے تاکہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں بلکہ اس نے ایمان کو انسان کے ”ارادے“ اور ”اختیار“ سے مربوط کر کے ”لائق“ دیدی کہ اللہ کے قانون میں ”جبر“ ہے ہی نہیں۔



## آسمان کی ہر چیز ”دید“ سے او جھل ہے

166



## قل انظر واما في السماوات والارض

(یونس، 101) آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسے نظر میں رکھو۔

یہ ہے کہ ہم آسمانوں اور زمین کی ”موجودات“ کو دیکھنے سے قاصر ہیں لہذا ہمیں ہماری بساط سے **وجہ اعتراض** ”اور“ حکم دینا عدل خداوندی سے بعید ہے۔

یہاں ایسے لہجہ میں بات کی ہے جو ہماری بساط کے عین مطابق ہے یعنی سائنسی نظر سے نہ بھی دیکھیں تب بھی پوری آسانی سے سورج، چاند، ستاروں، پہاڑوں، سمندروں، کانوں، حیوانات، اشجار، طیور، نباتات اور پودوں کا ان ہی آنکھوں سے بخوبی مشاہدہ کر کے اللہ کی صنعت اور کاریگری کے ”شاہکار“ ذوقِ نظر میں لا سکتے ہیں۔



## مَسَّ اور راد کے استعمال میں فرق

167

### وان یمسک اللہ بضر

(یونس، 107) اور اگر اللہ تمہیں ضرر اور نقصان سے دوچار کر دے۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ ضرر۔ کو ”مس“ کے اور بھلائی کو ”رادے“ کے فعل سے بیان کرنے میں **وجہ اعتراض** کیا راز ہے؟

مکمل آیت کے دوسرے حصے میں ”ولا راد نفضلہ“ کا فقرہ ہے لہذا ”مس“ کو ”راد“ کے تناظر میں دیکھنا چاہیے تو واضح ہو گا کہ۔۔۔۔۔

”مس“ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب امر ”واقع“ ہو چکا ہو اور۔۔۔۔۔ ”راد“ اس وقت کہا جاتا ہے جب ”واقع“ ہی نہ ہوا ہو اس طرح پوری آیت کے معنی ہوں گے :  
”اگر اللہ اپنے قانون کے مطابق تمہیں نقصان سے دوچار کرے تو اسے دور کرنے والا کوئی نہیں اور اگر بھلائی کرے تو اسے روکنے والا نہیں۔“

☆ 15-2-96 ملتان

ہود

## قرآن۔ حادث یا۔ قدیم؟

168

الر کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر

قرآن ایسی کتاب ہے جسکی آیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں جو حکیم و خبیر کی طرف سے عطا کردہ



ہیں۔

(ہود، 1)

یہ ہے کہ یہاں ان تھیہ (1328 م) کے لفظ نظر کی تردید ہو جاتی ہے بلکہ تمام سنی اور اشعری بھی اسکے معوا ہیں کہ قرآن مخلوق نہیں ہے، لکن تھیہ کے مشہور ”بول“ ہیں کلام اللہ غیر مخلوق

منہ بدأ والیہ يعود۔

قرآن غیر مخلوق ہے اسی سے نکلا ہے اور اسی کی جانب لوٹے گا۔

(مجموعۃ الرسائل النکمل لاین تھیہ طبع مصر جلد 1/411)

### قول فیصل

کسی کے ”ذہنی“ فیصلہ کرنے پر کیا پابندی ہے لیکن ان تھیہ خود ہی ابتدا۔ اور ”عود“ کی بات کر کے اپنے نظریے کا توڑ فراہم کر گئے ہیں۔ کیونکہ ”ابتدا“ قدامت کے منافی ہے اسی طرح ”عود“ ایک ”حادث“ صنف ہے جو قدامت کے خلاف ہے۔ پھر یہ تصور بھی عجیب ہے کہ۔ قرآن اللہ سے نکل کر اسکا ”جز“ بن چکا ہے اور بعد میں یہی جز دوبارہ ”کل“ سے جا ملے گا کیونکہ اس طرح اللہ سبحانہ قائل ”تجزیہ“۔ ذات سے تعبیر ہو گئے۔ جو میں نہیں کہہ سکتا کہ۔ جو ذات نہ جسم سے تعبیر ہونہ ”جنت“ اور مکانیت کی حامل وہ ”تجزیہ“ و تحلیل کی لہجہ لاری میں لائی جائے۔ خاص کر یہاں کہ ”احکمت“ کا لفظ ہے جو مستحکم کرنے کو کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے استحکام ناقابل تغیر ہونے کے بلا وصف ”امر حادث“ کا غماز ہے کیونکہ اسی آیت کا دوسرا لفظ ”فصلت“ ایجاد و ”اختراع“ کے مفہوم میں استعمال ہو کر فصلت کے ”حدوث“ کو پختہ بنا گیا ہے۔ تحلیل کڑے کو ناپنے۔ لہجائی، گھیرے، تیرہ۔ آستین گردن، سینہ وغیرہ کا ناپ لے کر کاٹنے اور پھر سینے کو کہتے ہیں اور یہ تمام تر ”حادث“ در حادث ”صفیں“ ہیں جو ”تفصیل“ میں جمع ہو گئی ہیں پھر اسی کیفیت میں ”الذن“ کے لفظ کو ”مضاف“ اور حکیم و خیر کو ”مضاف الیہ“ کے طور پر استعمال فرمایا ہے جو نیز قدامت کے منافی ہے۔ اسی طرح ”کتاب“ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جو اپنی تمام ”توجہات“ کے بلا وصف ”حادث“ ہے اور اگر قدیم ہوتی تو ”الذن“ کے ذریعہ اللہ کی جانب مضاف نہ ہوتی۔

☆

### توبہ۔ پہلے یا۔ استغفار؟

169

### وقل استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ

(ہود، 3-52-60-90)

اپنے رب سے استغفار کرو اور تائب ہو جاؤ۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”توبہ“ سے پہلے استغفار کا حکم دیا ہے جبکہ ترتیب کے لحاظ سے پہلے توبہ۔

بعد میں ”استغفار“ ہے۔

### رجد اعتراض

مقابل کہتے ہیں یہاں استغفار توبہ سے پہلے آیا ہے اس میں کوئی قباحہ نہیں ہے اور اسی مفہوم کے

### قول فیصل

دوسرے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ یہاں ”ثم“ کا حرف۔ ”واو“ کے مفہوم میں آیا ہے جو ترتیب کو غیر ضروری ٹھہراتا ہے۔



## ”فی“ کے بجائے ”علی“ ہونا چاہیے تھا

170

### وما من دابة فى الارض

(ہود، 6)

زمین کی کوئی بھی جاندار چیز نہیں لیکن اس کی روزی اللہ۔ پر ہے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ یہاں ”الارض“ کی مناسبت سے ”فی“ کے بجائے ”علی“ ہونا چاہیے تھا۔

یہاں ”فی“ کا حرف ”علی“ ہی کے مفہوم میں آیا ہے جیسے فرمایا لا صلیبکم فی جزوع النخل

### قول فیصل

(ط، 71) علی جزوع النخل۔۔۔۔۔ ام لهم مسلم یستمعون فیہ (طور، 38) علیہ۔ اس نئی

گنجائش کے باوصف یہاں ”فی“ کے استعمال میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ یہاں ”جامعیت“ کے لحاظ سے ”فی“ کا حرف ہی زیادہ ”موزوں“ ہے کہ علی۔ زمین کے ”اندرونی“ حصوں کی ”جاندار“ مخلوق کی وضاحت سے ”قاصر“ ہے۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ۔ ہر جاندار جو زمین کے ”لوپر“ ہے اور ہر جاندار جو زمین کے ”اندر“ ہے قانون قدرت کی رو سے سب کا رازق اللہ ہے۔



## خود ساختہ سورتوں کا اعتراف

171

### فاتوا بعشر سور مثله

(ہود، 13)

اس طرح کی بنی ہٹائی دس سورتیں ہی دکھا دو۔

میں کہا گیا ہے کہ خود ساختہ سورتوں کو قرآن ہی تسلیم کر کے پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے جس

### وجہ اعتراض

سے جعلی قرآن کے اعتراف کا ترشح ہوتا ہے۔

یہاں باطل سورتوں کا اعتراف نہیں بحث کی خاطر باطل پرستوں کو چانس دیا گیا ہے کہ وہ ”جعلی“

### قول فیصل

ہی ہسی اگر اپنے میں قدرت کلام رکھتے ہیں تو قرآن ہذا کی چھوٹی بڑی دس سورتوں جتنی ہی

بنا کر لے آئیں تاکہ عرب کے فصحاء اور بلغاء کے تناظر میں حقیقت واضح ہو سکے کہ۔ تم کس پانی میں ہو۔ اس طرح یہاں ”خود ساختہ“ سورتوں کو قرآن کی سورتوں کے ”مثل“ تسلیم نہیں کیا یہاں ”مثلیت“ سے مراد اس فصاحت و بلاغت میں

”ہماری“ کے علاوہ ان مقاصد و ”اہداف“ میں شکیف بھی مطلوب ہے جو قرآن کا خصوصی ”امتياز“ ہے۔



## قرآن کے آگے لا جواب ہونا

172

فان لم يستجيبوا لكم فاعلموا انما انزل بعلم الله

(ہود، 19) اگر جواب نہ دیں تو نوٹ کر لیں کہ قرآن اللہ کے علم کا شاہکار ہے۔

یہ ہے کہ یہاں قرآن کو ایسے علم سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے اشیاء کی ”معلومات“ حاصل ہو سکتی

ہوں۔ اس طرح قرآن ایک ایسی توانائی اور آلے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر کچھ بھی حاصل

وجہ اعتبار احسن

نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں بجاوی طور پر یہ مسئلہ صاف کیا ہے کہ قرآن کے چیلنج کا ان کے پاس کوئی ساز و سامان

نہیں ہے وہ اسکی ”فصاحت“ و بلاغت اور ”طریق ہدایت“ کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے اور یہ تمام

قول فیصل

امور ”علم“ سے مربوط ہیں جبکہ ان کے پاس علم ہے ہی نہیں لہذا علمی بیادوں پر یہ سامنے آ ہی نہیں سکتے یہی وجہ ہے کہ

قرآن نے ہر مقام پر اپنی ”علمی برتری“ کا حوالہ بھی دیا اور علمی و سائنسی بیادوں پر اپنے پروگرام پر بات کرنے کی دعوت بھی

دی فرمایا لکن الله يشهد بما انزل اليك. انزله بعلمه

(نساء، 166) اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کچھ تم پر نازل کیا علمی بیادوں پر نازل کیا ہے۔

ولا يحيطون بشئ من علمه.

اور جن علمی بیادوں پر اللہ نے بات کی اس علم الہی کا ”شمہ بربر“ بھی ان کے دائرہ معلومات میں

(ہود، 266)



نہیں آ سکتا۔

## ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی ہٹاؤ

173

واصنع الفلك باعيننا

(ہود، 37)

ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کی رہنمائی میں کشتی تیار کر لو۔

میں کہا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ نے نہ صرف ایک آنکھ بلکہ ذمروں (اعتین) آنکھوں کو اپنی صفت

غیر لیا ہے جبکہ آنکھیں سر کا اور سر جسم کے لوہر کے حصے کا نام ہے۔ اور محمد شین بھی اللہ کے لئے

وجہ اعتبار احسن

سر، غیر ہاتھ اور آنکھوں کا مجسماتی عقیدہ رکھتے ہیں۔

## قول فیصل

یہاں ”اعین“ کو حرف با (B) سے ”متعدی“ بنا کر اشارہ دیا ہے کہ ”اعین“ سے ظاہری آنکھ مراد نہیں ہے کیونکہ وہ کوئی آرہ یا تیشہ نہیں۔ اسکے معنی صرف ”بہیرت“، معرفت اور ”فنِ نجاری“ میں مہارت کے ہیں یہی وجہ ہے کہ راغب نے اسکے معنی میں لکھا ہے وللماعی للشی عین۔ وفلان یعنی اے احفظہ و اراعید۔

کسی چیز کی ”نگرانی“ اور نگہداشت کرنے والے کو بھی عین کہتے ہیں پھر استدلال میں دیگر کلمات کے علاوہ زیرِ بحث آئے ہیں ”باعیننا“ سے بھی استدلال کیا ہے۔ (راغب دار الفکر ہر دت صفحہ 367)۔ ابو بکر عبدالقادر رازی نے بھی اس کے ایک معنی حفاظت اور نگرانی کے لکھے ہیں۔ (صفحہ 460 کالم نمبر 2) اب بات صاف ہو گئی کہ اللہ نے نوحؑ سے فرمایا کہ ہم نے جو بہیرت اور فنِ ”نجارہ“ میں تمہیں ”مہارت“ دی ہے اس سے کام لو اور اسے ہی ہماری حفاظت و نگرانی کا ظاہری سبب گردان کر کھٹنی سازی میں لگ جاؤ۔ ☆

## ہمہ گیر طوفان و باد و باراں

174

قال سآوی الی جبل یعصمنی من الماء قال لا عاصم الیوم من امر الله الا من

رحم

نوحؑ کے بیٹے نے جواب میں کہا میری ذات مجھے طوفان سے بچانے کیلئے کافی ہے۔ نوحؑ نے کہا آج کے دن اللہ کے تباہ کن طوفانِ باد و باراں سے بچانے والا کوئی نہیں۔ سوائے اسکے جسے اللہ اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔ (ہود، 43) یہ ہے کہ آیہ کے آخر میں.. فلکان من المغرقین (وہ یقینی طور پر غرق ہونے والوں میں تھا) کے تاثر میں۔ الامن رحم۔ کی استثناء۔ کی ضرورت نہیں تھی۔

وجه اعتراض

## قول فیصل

یہاں ”کلام الہی“ سے کوئی ”استثناء“ نہیں ہوئی سیدنا نوحؑ نے اپنے بیٹے سے ”لا عاصم“ کہا اور ساتھ ہی خود ہی الامن رحم کے پیرائے میں استثناء بھی کر دی۔ اب اسکا ”بارگور“ ہونا یا ”نہ ہونا“ ان کے ”اختیار“ میں نہیں تھا طوفان جب آتا ہے تو اپنے پورے تقاضوں سے آتا ہے اُسے ”فطری“ ذرائع سے روکا بھی جاسکتا ہے اور ”قانونِ حفاظت“ کی رو سے اس سے بچا بھی جاسکتا ہے لیکن یہاں پھر نوحؑ نے کسی بھی ”قانون“ اور ذریعہ حفاظت سے کام نہیں لیا اپنی ہی ”ذات“ کو پہاڑ کی ”لونچائی“ سے تعبیر کر کے بچ جانے کا ڈھونگ رچایا اس وضاحت کے علاوہ یہاں عاصم۔ کا اسمِ معصوم کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے عربی میں ”سیر کا تم“ کہہ کر ”سر مکتوم“ مراد لیا جاتا ہے۔ من ماء دافق۔ کے معنی ہیں ”مدفوق“ کے۔ فہم فی عیشۃ راضیۃ کے معنی ہیں۔ ”فی عیشۃ مرضیۃ“۔ کے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عاصم کے معنی ”مفعول“ کے پیرائے میں ”معصوم“ کے مفہوم میں آیا ہے یعنی سیدنا نوحؑ نے لا عاصم۔ کہہ کر اس سے ”لا معصوم“ کا مفہوم لیا اور بیٹے پر واضح کیا کہ اس تباہی سے اپنے کو ”بچا“ ہو کوئی نہ

مجھے نہ اپنی شخصیت کے گھمنڈ کے ناطے سے نہ خاندانی شرف و کرامت کی رو سے۔ یہاں آیہ کی ابتدا میں۔ فرزندِ نوحؑ کے ضمن میں فرمایا۔ مآوی الی جبل بعصمی۔ میں جبل پر چڑھ جاؤں گا جو طوفان سے چالے گا۔ یہاں ”جبل“ کی ذیل میں امام انفخ لوسط (830 م) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”معانی القرآن“ میں لکھا ہے۔ یزید نفسہ۔ یہاں فرزندِ نوحؑ نے اپنی ذات ہی کو جبل کہا ہے (معانی القرآن طبع کویت نومبر 1979 جلد 2/353/4۔ المطبعة المصرية)۔ عربی میں بڑے لوگوں کو جبل بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ شہاب الدین آہ سی۔ اسی ہود (43) میں واقع جبل کی تفسیر میں کہتے ہیں اے ماء لتجی الیہ الدماغ واعتصم بالعقل المشرق لیحفظنی من امتیلاء۔۔۔۔۔ الھیولی فلا احرق۔

میں اپنے دماغ کی بلند یوں (جبل) پر چڑھ جاؤں گا اور عقلِ تامناک کا سارا لے کر بیونے کے سمندر کی طغیانی سے بچ جاؤں گا۔ (روح المعانی طبع مصر جلد 12/106/5/95)

## آسمان وزمین کو صیغہ امر سے خطاب کرنا

175

وقیل یا ارض ابلعی ماء لک ویا سماء اقلعی

(ہود، 44)

زمین سے کہا گیا اہلپانی نکل جا اور آسمان سے کھم جا۔

وجہ اعتراض میں کہا گیا ہے کہ یہاں زمین و آسمان کو صیغہ امر سے خطاب کیا گیا ہے جبکہ دونوں غیر عاقل ہیں۔

وجہ اعتراض

یہاں دونوں سے جو خطاب ہے وہ صرف ”صورتِ خطاب“ ہے دیگر یہ کہ یہاں امر برائے ”ایجاب“ نہیں ہے برائے ”ایجاد“۔ ہے جس میں ”عاقل“ سے خطاب کرنے کی ”شرط“ نہیں

قول فیصل

ہوتی عاقل و غیر ”عاقل“ ”برابر ہوتے ہیں۔ اب بات صاف ہو گئی کہ بنیادی طور پر ہر چیز۔ اللہ کے ”ویدہ“ و ”نادیدہ“ قوانین کے مطابق ”محو عمل“ ہے آسمان ہو خواہ زمین بھی اپنے اپنے ”محور“ میں حرکت کناں ہیں۔



## قانون کو خاطر میں نہ لانے کی سزا

176

فان تولوا فقد ابلغتکم

(ہود، 57)

اگر تم روگردانی کرتے ہو تو بلا۔ سے میں نے ابلاغ کی ذمہ داری پوری کر دی۔

یہ ہے کہ یہاں ابلاغ کو تولی (قانون کو خاطر میں نہ لانے) کی ”جزا“ دیا گیا ہے جبکہ اس کی جزا

وجہ اعتراض



”محذوف“ ہے۔

مقال نے محذوف کی وضاحت میں کہا ہے کہ۔ فان تولوا فقل لهم لقد ابلغتكم  
قول فیصل اگر انہوں نے قبول حق سے منہ موڑ رکھا ہے تو انہیں کہہ دیجئے۔ میں نے اپنا تبلیغ کا فرض پورا

کر دیا ہے اب تم مانو نہ مانو۔ میری ذمہ داری منوانا نہیں ہے۔ ☆

## او نثنی باعث ہلاکت بن گئی

177

يقوم هذه ناقة الله لكم آية فذروها تا كل في ارض الله ولا تمسوها بسوء فياخذكم عذاب اليم

خذاكم عذاب اليم

اے قوم یہ اللہ کی لونثنی ہے تمہارے لئے ایک نشانی ہے اسے اللہ کی زمین پر چرنے پھرنے دو اور دکھ نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں عذاب الیم گھیر لے گا۔ (ہود، 64)

میں کہا جاتا ہے یہاں ناقہ۔ کو اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے حالانکہ اللہ سوار ہونے سے بے نیاز ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک جانور کی خاطر انسانوں کی بمعیوں کو ہلاک کر دیا گیا۔

وجہ اعتراض

ناقہ۔ تو ایک ”جانور“ ہی تھا اللہ کی جانب ”نسبت“ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی ”خلق“ میں سے تھا۔ ہم اپنی روزمرہ کی باتوں میں جب کسی چیز کو اللہ کی طرف نسبت دیتے ہیں تو وہ

قول فیصل

”نسبت“ دراصل ”خلق“ کا ”استعارہ“ ہوتی ہے حدیث میں ہے الارض لله والخلق لله۔ یعنی زمین بھی اللہ کی خلق ہے اور زمین پر بسنے والی ہر شئی بھی اللہ کی خلق ہے۔ اس معنی سے اگر کسی مقام پر خلق کا لفظ استعمال نہ بھی ہو تو بھی ”نسبت“ کا لفظ اس ”مفہوم“ کو ادا کر سکے گا یہ بات کہ ایک ناقہ کی خاطر اتنی ساری انسانی کبادیوں کو ہلاکت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تو بات دراصل یہ ہے کہ ناقہ ان کی ہلاکت کا ”موجب“ نہیں تھی ”ہلاکت“ کا ”نشان“ تھی۔ ہلاکت کا ”موجب“ ان کی ”کرتوتیں“ اور ”سرکشی“ تھی۔ نشان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دارنگ کے موقعہ پر عام طور پر ”جو اہل عمل“ سے پہلے باغیوں کو ”تہیارت ڈالنے“ یا منظر سے ہٹ جانے کو کہا جاتا ہے اور پھر 16 منٹ آدھا گھنٹہ مہلکت ”دی جاتی ہے اس پر بھی اگر ”سرکشوں“ کی سرکشی فرو نہیں ہوتی تو ادھر سے ”فائر“ کھول دیا جاتا ہے اور اس فائر کا جیادی سبب ”بغاوت“ اور سرکشی ہے۔ ☆

## نوے سال کی عمر میں بچے کی پیدائش؟

178

وقالت عجوز عقیم (زاریات، 26) والد وانا عجوز (ہود، 72)

خاتون نے کہا میں تو بانیجہ بڑھیا ہوں۔ بھلا میں بڑھیا ہو کر بچہ جننے کی صلاحیت رکھ سکتی ہوں؟

یہ ہے کہ تورات اور ہماری اسرائیلیات میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم جب سو سال کے ہوئے اور سیدہ سارہ نوے برس کی تب اسحاق کی ولادت کا مژدہ سنایا گیا جب کہ ابراہیم قوت ”رجولیت“ سے اور سیدہ سارہ ”ماہواری“ کے تکلف سے فارغ تھیں ایسے میں ”طبعی“ قوانین اور ”ضوابط تولید“ کے برعکس ولادت کی بشارت۔ قدرت کی ”سنا جارہی“ کے سراسر خلاف ہے تفاسیر میں ”شیخ“ اور ”عجوز“ کو ایسے بوڑھے اور بڑھیا سے ظاہر کیا گیا ہے جو اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے بالکل ہی ”محروم“ ہو چکے ہوں۔

”شیخ“ اور ”عجوز“ کے ”اچھٹھ پرستوں“ نے جو معانی تجویز کئے ہیں وہ ان کی گردن کالا جھ ہے کہ محاورات عرب ان کے تجویز کردہ معانی کو ”سنبھالا“ دینے سے قاصر ہیں۔ امام ثعالبی (1038م) جو ”الفاظ“ کے ”سراج“ سے بحث کرتے تھے ”شیخوخة“ کے بیان میں لکھتے ہیں۔ یقال شاب الرجل ثم

شمط ثم شاخ ثم کبر ثم نوحه ثم دلف ثم معج ثم هذج ثم ثلب

”چکنے کے بعد شباب کا دور آتا ہے پھر ”شمط“ کا پھر ”شیخوخة“ کا پھر بزرگی کا پھر ”توجہ“ کا پھر ”ذلت“ کا پھر ”دب“ کا پھر ”ج“ کا پھر ”هذج“ کا پھر ”ثلب“ کا۔ (فقه اللغة۔ طبع دارالعلمیہ بیروت صفحہ 84 عنوان ”شیخوخة الکبر“)

اس طرح ثعالبی نے عمر کی دس سٹج میان کی ہیں جو اہل زبان کے ہاں متعارف چلی آرہی ہیں ان میں سے تیسری سٹج ”شیخوخة“ کی بیان کی ہے جبکہ مشاہدہ اور ”طبعی“ کو طبی تحقیقات کی رد سے یہ سٹج مانع اولاد نہیں ہو سکتی ذیل میں اس کی سٹج میں سے آٹھ کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

شمط :- جب سر میں تھوڑے سے سفید بال نمودار ہوں۔

شیخ :- جبکہ آدھے بال سیاہ اور آدھے سفید ہوں۔ (یعنی 40 سے 66 سال)

نوحہ :- شیخوخة کا اگلا مرحلہ (المعجم صفحہ 889)

دلف :- جب رفتار میں دھیمپاں آجائے اور قدم چھوٹے اٹھنے لگیں۔ دب اسکا اگلا مرحلہ

معج :- بڑھاپے کی وجہ سے منہ سے ”رال“ نکلنے لگے۔ (المعجم صفحہ 747)

هذج :- جب جسم میں ریشہ اور پاؤں میں ”لڑکھڑاہٹ“ کی کیفیت پیدا ہو۔ (المعجم صفحہ 858)

ثلب :- جب ”بوھلپا“ آخری سٹج کا ہو اور دانت باقی نہ رہیں۔ (المعجم صفحہ 889)

اس تعریف کی رد سے سیدنا ابراہیم ”شیخوخة“ میں قدم رکھ چکے تھے یعنی 40 سے 66 کے ہو چکے تھے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ عمر مرد کے لئے ”مانع اولاد“ نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ جو ملی سارہ نے اپنے ”عجوز“ اور ”عقم“ کے ساتھ سیدنا ابراہیم کی شیخوخة کا حوالہ بھی دیا ہے تو اس سے اولاد کے نہ ہونے کے اسباب میں ”تعدد“ پیدا کرنا مقصود تھا۔ اظہار حقیقت نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ”عقم“ بھی قابل علاج بیماری ہے بلکہ ہمالو قات 18-20 سال تک

عورت کے ہاں پیدائش نہیں ہوتا اور وہ اپنے کوچ بچ کی ”عقیمہ“ سمجھنے لگتی ہے بلکہ شوہر صاحب بھی ”مایوس“ ہو کر بغرض ”لولاد“ دوسری شادی رچا لیتے ہیں لیکن اب اتفاق ملاحظہ ہو کہ ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ ”عقیمہ“ تو بچوں پر پئے پیدا کرتی چلی جاتی ہے اور بچاری نئی منکوحہ ”یاس“ کو رونا میدی“ کے گرداب میں ڈوبتی جا رہی ہے۔

لی لی صاحبہ نے اپنے کو ”عجوز“ بھی کہا ہے تو آئیے دیکھیں عجوز کسے کہتے ہیں؟  
**عجوز کسے کہتے ہیں؟**  
 مفسرین کا خیال ہے کہ ماہواری سے فارغ ہو گیا کو ”عجوز“ کہا جاتا ہے لیکن عربی ”ادبیات“ میں اسکی ”پذیرائی“ نہیں ملتی کیونکہ ”عجوز“ کے لفظ کا جہاں مرد اور عورت پر ”یکساں“ اطلاق ہوا ہے وہاں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اسکا اطلاق ”جوان“ عورت پر بھی ہوا ہے علامہ بستانی (1887م) اپنی مبسوط لغوی انسائیکلو پیڈیا محیط المحیط میں لکھتے ہیں والمرأة شابة كانت او عجوز۔

یعنی درجنوں معانی کے علاوہ عجوز۔ کے یہ معنی بھی ہیں کہ عورت جوان ہو خواہ عمر رسیدہ دونوں پر اطلاق ہوا ہے۔ (محیط المحیط طبع مکتبہ لبنان صفحہ 577 کالم نمبر 3 حرف میم)

اسی ضمن میں سر سید احمد خان مرحوم (1898م) لکھتے ہیں:

”یہ خیال کرنا کہ ابراہیم“ و حضرت سارہ کی اولاد ”ما فوق الفطرت“ ہوئی تھی اس پر قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں ہے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم“ کی نسبت لفظ ”شیخ“ آیا ہے اور لفظ ”شیخ“ ایسا نہیں ہے کہ اس سے یہ سمجھا جائے کہ حضرت ابراہیم“ اس ”حد“ سے جس میں ”موافق“ قانون قدرت کے اولاد ہو سکتی ہے گذر چکے تھے۔“

حضرت سارا کی نسبت لفظ ”عجوز“ آیا ہے ”عجوز“ کا لفظ اور شیخ کا لفظ دونوں مرادف ہیں بلکہ کبھی جوان عورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے قاموس میں لکھا ہے والجز المرأة شابة كانت او شیخ۔ اور یہی عجوز کا لفظ سورہ شعراء میں حضرت لوط کی ”بیوی“ کی نسبت سے بھی آیا ہے پس اس لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سارا ایسی حد پر پہنچ گئی تھیں جو موافق قانون قدرت کے ان سے اولاد ہونی ناممکن ہو۔“ (تفسیر سر سید احمد طبع کنگرہ جلد 9/27/5، 275)

قاموس، محیط المحیط اور سر سید کی تحقیق کے مطابق جب ”جوان عورت“ کو بھی ”عجوز“ کہا جاسکتا ہے بلکہ سر سید کے استدلال کے بموجب شعراء میں حضرت لوط کی ”جوان بیوی“ پر بھی ”عجوز“ کا اطلاق ہوا ہے تو ایسے میں اسکے مفہوم میں ”مزید“ وسعت پیدا کرنا ہوگی یعنی عجوز کے مادے۔ ع. ج. ز. کو نظر میں رکھنا ہوگا کہ اہل زبان ”لاغر“، ناتواں اور ”درماندہ“ کو بھی عجوز کہتے تھے (محیط المحیط صفحہ 577 سطر 41) بلکہ لغات القرآن کے مفسر لکھتے ہیں کہ،

”العجوز کے قریب ایک سومعانی کتب لغت میں لکھے ہیں قرآن کریم میں یہ لفظ عجوز عقیم (51/29) بوز می یا کمزور اور ”ضعیف“ عورت کے لئے آیا ہے۔“

(لغات القرآن طبع طلوع اسلام جلد 3/1143)

بات صاف ہو گئی کہ یہاں عجوز کا لفظ ”کنزوری“، ضعف، ”درماندگی“ اور اگر اپنے کے تناظر میں کسی ”نسوانی“ ”عارضے“ کا استعارہ ہے اور ایسے ہی کسی عارضے کی وجہ سے ملی سارہ اپنے کو اولاد کے قابل نہیں سمجھتی تھیں یا وقتِ ”بھارت“ نہیں سمجھتی تھیں لیکن ”عوارض“ ہمیشہ ”عارضی“ ہوتے ہیں جو علاج سے زائل ہو سکتے ہیں۔

ملی صاحبہ مختلف عوارض کی وجہ سے اپنے کو جب ”نا قابل“ اولاد

**خوشی کے موقعہ پر چہرہ پیشا؟**

سمجھنے لگیں تو ”حسن اتفاق“ ایسا ہوا کہ ایسے ہی لمحوں میں سیدنا

اسحاق کی ولادت کی بھارت آپ کی سماعت تک پہنچی تب فصکت و جھپٹا اپنا چہرہ پیٹ ڈالا۔ لیکن ”امامیہ“ کی اس تشریح پر ”چہرہ پیٹنے“ کی کیا وجہ بن سکتی تھی؟ کیا کسی نے ہمت لگائی تھی؟ کیا آپ شوہر بردار، نہیں تھیں؟ تو پھر اتنے ”شدید رد عمل“ کا اظہار کیا جو از رکھتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی، نہیں ہوئی خوشی کے موقعہ پر زیادہ سے زیادہ اظہار ”تعجب“ ہی ہو سکتا ہے کہ ”عموماً“ جب عرصہ دراز تک اولاد نہ ہو اور پھر کوئی کہے کہ ————— ”مایوسی“ اور تعجب کی کیا بات ہے؟ اللہ ضرور اولاد دے گا تب وہ ازراہ تعجب ہی کہہ دے کہ ————— اے ہائے ہائے اب پتہ چلنے کی ہماری بھی کوئی عمر ہے؟ میں بانجھ بڑھیا ہوں بھلا بانجھ بھی چہ جن سکتی ہے؟ غرض کہ خوشی کے موقعہ پر ”تعجب“ تو کیا جاسکتا ہے ”سینہ کوئی“ اور ”چہرہ پیٹنے“ کی کوئی تک نہیں بنتی خاص کر امامیہ کے ”سوا“ کسی نے بھی ”صکت“ کے معنی ”چہرہ نوچنے“ کے، نہیں کئے۔ جبکہ بعض لوگ مایوسی کے بعد جو نئی خوشخبری یا ”امید“ کی بات سنتے ہیں تو ان کے ”چہرے دمک“ اٹھتے اور ہاتھ پیساختہ ماتھے پر جاتے اور وہ ازراہ تعجب ہی کہہ پاتے ہیں کہ بھلا ہمارے دن بھی بدلیں گے؟ اس طرح ان کا تعجب کسی ”حقیقت“ کی ”نفی“ کرنے کیلئے نہیں ہوتا ”حیرت“ و ”استعجاب“ کے اظہار کا انداز ہوتا ہے۔ دیکھئے ملی صاحبہ نے خوشخبری سننے پر جب تعجب کا اظہار فرمایا تو کہا گیا تعجبین من امر اللہ اللہ کے قانون ولادت پر آپ تعجب کرتی ہیں (ہود، 73) یہ تو وہ قانون ہے جسکے بموجب تمام مخلوق پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح ”ہود“ ہی میں ”صکت“ کی بجائے ”فضحکت“ کا لفظ آیا ہے جو صرف اور صرف اس ”کیفیت“ سے تعبیر ہے جو کسی ”مایوس“ انسان پر طاری ہوتی ہے اور وہ اپنی مایوسی کی حالت کی تبدیلی کا سن کر ”خندہ زن“ ہو جاتا ہے۔ یہاں ”صکت“ کو ”فضحکت“ کے تناظر میں دیکھئے تو یہ مفہوم کھل کر سامنے آئے گا تو اس کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ”بھاگ“ جاگنے کا مرادہ سن کر اسکے چہرے پر بے کراہت پھیل گئی۔

☆

ناپ تول میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے

179

ولا تنقصوا المکیال والمیزان

(ہود، 83)

ناپ تول میں دوسرے کا نقصان نہ کرو۔

میں کہا گیا ہے کہ یہاں کم تولنے اور کم ناپنے سے روکا گیا ہے جبکہ اس ”نمی“ میں یہ امر پوشیدہ ہے کہ پورا تولو اور پورا ناپو۔ اسکے باد صف یا فوم او فوا المکیال والمیزان کنے میں کیا خوںی ہے؟

وجہ اعتراض

یہاں خطاب میں تاکید اور ”تنوع“ پیدا کرنے کیلئے پہلے لا تنقصوا المکیال فرمایا پھر سزید تاکید کیلئے او فوا المکیال۔ کہہ کر احساس دلایا کہ یہاں ”نمی“ اور ”امر“ ایک ہی حقیقت کے دو

قول فیصل

”زخ“ ہیں، نمی ہے تو تم تولنے سے اور امر ہے تو پورا تولنے کا۔ ☆

## قوم لوط کے عذاب کے حوالہ سے بات کرنا

180

### وما قوم لوط بعید

(ہود، 89)

اور قوم لوط کے انجام کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔

یہ ہے کہ۔ قوم۔ انسانی گروہ کو کہا گیا ہے جسکے لئے ”بعید“ جیسے مفرد کے صیغے کو خبر بتایا گیا ہے؟

وجہ اعتراض

بعید۔ ”فعیل“ کے وزن پر ہے اور اس ”وزن“ کی یہ خاصیت ہے کہ جو بھی لفظ اس وزن پر ہوگا وہ مفرد ہو کر بھی مفرد، مشکبہ اور جمع کو یکساں حاوی ہوگا۔

قول فیصل

☆

## ظالم۔ بستی یا۔ لوگ؟

181

### اذا اخذ القرى وهى ظالمة

(ہود، 103)

بستیاں جب ظلم کی حدیں پھاند چکیں تو گرفت میں آئیں۔

میں کہا گیا ہے کہ۔ ظلم ہمیشہ عقل و دانش والوں سے سرزد ہوتا اور ان ہی کی صفت ہے لیکن یہاں اسکی نسبت بستیوں کی طرف کی گئی ہے جبکہ بستیوں مخاطب نہیں بن سکتیں۔

وجہ اعتراض

یہاں ”اسناد مجازی“ کا سہارا لے کر مراد بستی ”والے“ لئے گئے ہیں جیسے فرمایا۔ اخر جنا من هذه القرية الظالم اهلها اس ظالم بستی سے ہمیں چالے۔ (نساء، 74) واسئل القرية

قول فیصل

(یوسف، 82)

بستی سے دریافت کرو۔



یہاں استدلال کی دونوں آیتوں میں ”احساس“ دلایا ہے کہ ”ظلم بستی، نہیں بستی کے باسی کرتے ہیں مگر“ اسناد مجازی“ کے تناظر میں ذکر بستی کا ہوا ہے کہ کلام میں حسن پیدا کرنے کیلئے اصنافِ سخن کا سہارا لینا عرب کا محبوب معمول تھا۔

☆

## بد نخت اور نیک نخت کے کتبے

182

### فمنهم شقی و سعید

ان میں کچھ تو قسمت کے مارے ہیں اور کچھ قسمت کے دھنی۔ (ہود، 105)

یہ ہے کہ یہاں انسانوں کو ”بد نختوں“ اور ”خوش نختوں“ میں بانٹ دیا گیا ہے جس سے ”عمل“ کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کو بد نختوں اور ”خوش قسمتوں“ میں تقسیم کرنے والے کی نشاندہی نہیں کی گئی ایسے میں اللہ سبحانہ پر ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی۔ لہذا عمل کی اہمیت بدستور باقی رہے گی یعنی ”شقی“ اور ”سعید“ اللہ نے نہیں فرمایا۔ لوگوں کے کسے کی نقل ہے۔

قول فیصل

☆

## جنت میں لامتناہی عرصہ رہیں گے

183

### ففي الجنة خالدین فیہا مادامت السماوات والارض الا ماشاء ربك

خوش قسمت تو آسمان وزمین کی بقاء تک جنت میں رہیں گے مگر جتنا پروردگار چاہے۔ (ہود، 108)

میں کہا گیا ہے کہ اس آیت کے پہلے حصے میں ”جنتوں“ کو ”ہمیشہ“ کے لئے جنتی ٹھہرایا گیا ہے لیکن پھر آخر میں حرفِ استثناء۔ (الا ماشاء ربك) سے نفی کر دی گئی ہے جو شانِ خداوندی کے

وجہ اعتراض

خلاف ہے۔

امام فراء نحوی (823م) کہتے ہیں کہ یہاں۔ الا۔ ”استثناء“ کے مفہوم میں نہیں ہے اسکے معنی

قول فیصل

”سوا“ یا غیر کے ہیں اس طرح معنی ہوں گے۔۔۔ دخول جنت ”خلود“ کا متقاضی ہے ماسوائے

مدت کے کہ اسے زیادہ یا کم جتنا خدا چاہے کر دے۔۔۔ ابن قتیبہ۔ کے اور زمالی سے واضح کرتے ہیں کہ۔۔۔ ”مدت“ کی فی ہدہ امدار حول الا ماشئت۔۔۔ تمہیں اس مکان میں ایک سال تک رہنے کی اجازت ہے، سوائے اسکے جتنا مزید اضافہ کروں۔ اس طرح عربی ادبیات میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں جنکے تناظر میں۔ الا۔ برائے استثناء کی حد بندی ”نرم

”پڑ جاتی ہے۔“



کیا ”اختلاف“ کو فروغ دینا ہی اللہ کو پسند تھا؟

184

ولو شاء الله لجعل الناس امة واحدة ولايزالون مختلفين الا من رحم ربك  
ولذلك خلقهم

اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی جماعت بنا دیتا۔ لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جن پر اللہ رحم کرے ورنہ اختلاف ہی ان کی پیدائش کا مقصد ہے۔

یہ ہے کہ یہاں لذلک۔ اسم ”اشارہ“ ہے سوال یہ ہے ”رحم“ کی طرف ہے یا ”اختلاف“ کی

وجہ اعتراض طرف۔

اختلاف کے لئے پیدا کرنا حمت الہی کے ”خلاف“ ہے کیونکہ اختلاف ”قیح“ شئی ہے اور اللہ سبحانہ

قول فیصل

”قباحت“ کا حکم دیتے ہیں نہ ”اشارہ“ فرماتے ہیں اور نہ پروان چڑھانے کی بات کرتے ہیں۔ بات

صاف ہے کہ لذلک۔ کا اشارہ اختلاف کی طرف نہیں ”رحم“ کی طرف ہے خاص طور پر اشارہ کا اصول یہ ہے کہ قریب تر کی طرف ہوتا ہے ہاں قرینہ وسعت چاہتا ہے تو اور بات ہے اس طرح معنی ہوں گے۔۔۔ اللہ نے ان کو رحم کے لئے پیدا کیا ہے کہ رحم ہی اسکے شایان شان ہے۔



رسولوں۔ کے بہت سے واقعات پر پردہ پڑا ہوا ہے

185

و كلا نقص عليك من انباء الرسل

(ہود، 120) تم پر تمام رسولوں کے واقعات بیان کرتے ہیں۔

میں کہا گیا ہے کہ یہاں تمام رسل (کل) کے حالات بیان کرنے کا اشارہ ہے جبکہ دوسرے مقام پر

وجہ اعتراض

فرمایا۔ رسلاً قد قصصنا هم عليك من قبل ورسلاً لم نقصصهم عليك

ان میں سے ایسے بھی رسول ہیں جن کے حالات پہلے سے بتا دیئے ہیں اور ایسے بھی ہیں جن کے حالات ابھی صیغہ راز میں ہیں۔

(غافر، 77)

اس طرح دوسری آیت نے حرف ”کل“ کے مفہوم و معنی کی نفی کر دی ہے۔

یہاں ”کل“ کا لفظ ”بعض“ کے مفہوم میں آیا ہے جیسے فرمایا و جاء هم الموج من كل مكان

قول فیصل

(یونس، 22)

بعض مقامات سے لہریں اٹھیں اور انہیں گھیر لیتی ہیں۔

بعض نعمتیں لامحالہ زوال پذیر ہیں۔

یوسف

## تیرہ کو گیارہ کیوں شمار کیا

186

انى رأيت احد عشر كوكبا والشمس والقمر

(یوسف، 4)

میں نے گیارہ کو اکب اور ٹئس و قمر کو سجدہ کرتے دیکھا۔

یہ ہے کہ یہاں بات کو طول دیا گیا ہے جبکہ ثلاثہ عشر کو کب۔ کہنے سے بھی کام چل سکتا تھا جو

کلام کے لحاظ سے بلیغ بھی تھا، مختصر اور موجز بھی۔

**وجه اعتراض**

یہاں الشمس و القمر۔ کا الگ ذکر کر کے۔ کو اکب پر ان کی زیادہ ”برتری“ کا احساس

ولایا ہے کیونکہ یہاں شمس و قمر۔ یوسفؑ کے ماں باپ کا استعارہ ہے اور گیارہ کو اکب سے ان کے

گمراہ بھائی مراد ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ والدین رتے اور عزت کے لحاظ سے اولاد سے برتر ہیں۔

★

جب یوسفؑ اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرنے لگے

187

وقالت اخرج عليهن

(یوسف، 31)

اور خاتون مصر نے یوسفؑ کو اپنے ”جمال“ و جلال کا مظاہرہ کرنے کی دعوت دی۔

میں کہا گیا ہے کہ یہاں عربیت کے لحاظ سے ”اخرج علیہن“ کی بجائے ”اخرج الیہن“ کہنا

۱۹۹۱

## وجه اعتراض

”اخراج“ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ ”فوقیت“ اور جمال و ”زینت“ یا کسی دیگر ”اہمیت“ کے

جملانے کے لئے ہو تو اس وقت حرفِ "علی" سے "متعدی" بنادیا جائے گا جیسے فرمایا فخرج

علی قومہ فی زینتہ (نقص، 79)۔۔۔ یہاں علی کا مقصد برتری اور "اہمیت" کے اظہار کے لئے ہے نیز فرمایا

## قول فيصل

☆ فخرج علی قومہ من المحراب (مریم، 10)

فرشتے جب نظر نہیں آتے تو ان کے حسن کا تذکرہ کیسا؟

188

ماہذا بشر ان هذا الا ملک کریم

(یوسف، 31)

یہ آدم زاد، نہیں فرشتہ ہے۔

یہ ہے کہ یہاں ”ان“ اور ”الا“ کے استزاج سے ”کلمہ حصر“۔ وجود میں آگیا ہے جو تمام ”کمالات

وجہ اعتراض

بغری“ کو صرف یوسفؑ کی ذات میں ”مرتکز“ کر دیتا ہے نیز مصری خواتین نے جب فرشتوں کو دیکھا ہی نہیں تو ان کے ”حسن بے مثال“ کا انہیں پتہ کیسے چل گیا۔ ایسے میں انہوں نے یوسفؑ کو فرشتہ کیسے کہا؟

اگر دیکھا نہیں تو اپنی ادبیات کے حوالے سے سن تو رکھا تھا کہ حسن ”فرشتوں“ کی طرف اور

قول فیصل

بد صورتی ”شیطان“ سے منسوب ہوتی ہے اسی طرح ہر ذہن میں ”قدیم“ ہی سے یہ بات ”رچی

بسی“ تھی کہ ”فرشتہ“ حسن کا ”استعارہ“ ہے اور اسی ہی زاویہ سے انہوں نے یوسفؑ کو ”ملک کریم“ کہا تھا اور جہاں تک

کلمہ حصر کے ساتھ یوسفؑ کے علاوہ دوسرے بندگانِ خدا کو بغری کمالات سے ”عاری“ تصور کیا گیا ہے کم از کم کلمہ حصر کا

یہ مفہوم قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکتا کہ۔ یہ کلمہ۔ ”قرائن“ کے تناظر میں ”مبالغہ محض“ کا عکاس بھی بن جاتا ہے اور مبالغہ

کے تقاضے اہل زبان غولی جانتے ہیں۔

☆

کیا یوسفؑ روشِ کفار پر عامل رہے تھے؟

189

انی ترک ملة قوم لا يؤمنون بالله

(یوسف، 37)

جو لوگ خدا اور یومِ آخر پر ایمان نہیں رکھتے انکی ملت کو چھوڑ چکا ہوں۔

میں کہا گیا ہے کہ۔ کسی چیز کا ترک کرنا اس وقت ہی کہنا وزن رکھتا ہے جب کہنے والا امیرِ عامل ہو۔ یا

عامل رہا ہو۔ مثلاً فلاں نے شراب نوشی ترک کر دی۔ سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔ اس تناظر میں سوال

پیدا ہوتا ہے کہ کیا یوسفؑ کبھی ملتِ کفار کے ہموار تھے؟ اسکے بغیر ”ترکت“ کا لفظ اپنے مفہوم و معنی میں ”نارسانہ“ بن

جاتا ہے۔

عربی میں ”ترک“ کرنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ”برائی“ کے ارتکاب کے ”بعد“۔ اور برائی کے

ارتکاب سے ”پہلے“۔ اس طرح یوسفؑ ”برائی“ اور ارتکاب سے پہلے ہی ملتِ کفار سے

”یکسو“ ہو چکے تھے گویا وہ کفر کے قریب بھی نہ تھے قصہٴ موسیٰؑ میں فرمایا۔ ویذک و آلہک۔ (اعراف، 126)

قول فیصل

حالانکہ موسے نے شرک سے کوئی واسطہ رکھا ہی نہیں تھا لیکن واسطہ نہ رکھنے کے باوصف ”ویذر“ کے لفظ میں قبل از ”ارتکاب“ نیزاری کا عکس جھلک رہا ہے۔



## اپنی ضد سے حقائق کی پہچان

190

### امران لا تعبد والا ایاہ

اس نے حکم دے رکھا ہے کہ صرف اسکے قوانین کی اتباع کرو۔ (یوسف، 40)

یہ ہے کہ یہاں ”امر“ کی تفسیر ”نہی“ سے کر دی۔ امران لا تعبدوا۔ جبکہ امر ہو خواہ نئی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں لہذا ایک دوسرے کی تفسیر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

وجہ اعتراض

قاعدہ ہے کہ نعرف الاشیاء باضدادھا۔ اشیاء کی ”حقیقت“ اپنی اپنی ”ضد“ سے پہچانی جاتی ہے روشنی کی ضد اندھیرا۔ محبت کی ضد عداوت۔ کفر کی ضد ایمان۔ ظلم کی ضد انصاف علیٰ

قول فیصل

هذا القیاس۔ امر وہ نہی بھی ایک دوسرے کی ضد میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ مت بول۔ کی ضد ہے سچ بول۔ شور نہ مچا کی ضد ہے آہستہ بول۔ اسی طرح اضداد۔ اپنے مختلف تقاضوں کے تناظر میں ”جملوں“ سے مفاہیم کی ”اضداد“ تک کو حاوی ہیں۔ اور یہاں جس الجھن کا ذکر ہوا ہے وہ بھی عربیت کی اساس پر وجہ ”تشویش“ نہیں ہے بلکہ ”امر“ کے بعد ایک دوسرا ”امر“ ”مقدر“ ہے گویا فرمایا امر۔ امر اقتضیٰ ان لا تعبد والا ایاہ۔ اس نے ایسا حکم دیا ہے جو احکام ”غیر خدا“ کی پابندی ”نہ کرنے“ کا متقاضی ہے۔ اور ”مقدرات“ ادبیات عرب کی جان ہوتے ہیں کہ ان سے کلام میں ”حسن“ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور الجھاؤ بھی باقی نہیں رہتا بضر طیکہ قرینہ ”متقاضی“ ہو اور مقدر کا شدت سے خواہاں ہو۔ نیز یہ کہ ”مقدرات“ فنی کا ”ادراک“ بھی حاصل ہو۔



وما ابرئ نفسی۔ کا اظہار یوسفؑ نے کیا یا خاتونِ مصر نے؟

191

### وما ابرئ نفسی

اپنی پاکدامنی کا اظہار نہیں کر رہی۔ (یوسف، 33)

میں کہا جاتا ہے کہ پیغمبر تو ہوتے ہی پاک و امن ہیں وہ اپنی پاکدامنی کا ناپاک لوگوں کے سامنے کیوں بیان کرنے لگے؟ ایسے میں سیدنا یوسفؑ کا وما ابرئ نفسی کے پیکر میں اعترافِ گناہ کرنا

وجہ اعتراض

کیا معنی رکھتا ہے؟

وما ابرئ نفسی کے پیکر میں اپنے گناہ اور یوسفؑ سے روار کھی گئی ”زیادتوں“ کا

قول فیصل



اعتراف ”خاتونِ مصر“ نے کیا تھا سیدنا یوسف کو ان ”اعترافات“ کا موجب قرار دینا ”قرآن، فہمی“ کے تقاضوں سے مراحل دور ہے۔ یہاں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں ان کا پس منظر یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ مصر میں جن دنوں زور کا قحط پڑا ان دنوں سیدنا یوسف جیل کی سلاخوں میں بند تھے آپ نے رہا ہونے والے ایک قیدی کو قحط سے محفوظ رہنے کی پلاننگ سے آگاہ کر دیا تھا اس پر ”فرماں روا“ مصر نے سیدنا یوسف کی رہائی کا حکم دے دیا مگر سیدنا یوسف نے رہا ہونے سے پہلے اس ”گناہ“ کی وضاحت چاہی جس کی ”پاداش“ میں مدتوں جیل میں رہنا پڑا چنانچہ اس پر حاکمِ مصر نے ”محلات“ کی خواتین کو اکٹھا کر کے جرمِ یوسف کی وضاحت طلب کی اور کہا کہ۔۔۔۔۔ جب تم سب نے مل کر یوسف کو اپنی طرف ”ماکل“ کرنے کے ”چلتر“ کئے تو اسکی کیا پایا؟ سب خواتین نے بیک آواز کہا کہ کچھ بھی برائی، نہیں پائی اور خدا وہ تو ”رعصمت“ کے اونچے ”مقام“ پر کھڑا تھا بلکہ خاتونِ مصر نے آگے بڑھ کر تمام حقیقتِ حال ”منکشف“ کر دی کہ میں نے ہی اس کو اپنی طرف مائل کیا تھا اور آج میں ”کھلے ہمدوں“ اعتراف کر رہی ہوں کہ میں ہی اس کی ”مجرم“ ہوں اور یہ بات اسلئے کہہ رہی ہوں تاکہ اسے بھی پتہ چلے کہ میں اس کی غیر موجودگی میں اسے ”ملوث“ نہیں کر رہی ہوں یہ تو خیانت ہوگی اور بلاشبہ اللہ سبحانہ خیانت کرنے والوں کی ”چترا یوں“ کو پسند نہیں فرماتے۔۔۔۔۔ جی ہاں میں نے ہی سب کچھ کیا تھا اور میں اس مرحلے پر اپنے کو ”پاک دامن“ نہیں ٹھیراتی (وما ابرئ نفسی) بلاشبہ نفسِ برائی سکھاتا اور ”برائی“ کی ترغیب دے ڈالتا ہے۔

(یوسف، 61 تا 63)

بات صاف ہو گئی کہ وما ابرئ نفسی۔ یوسف نے نہیں آپ پر ”جان سے فدا“ خاتونِ مصر نے جرم کے اعتراف میں کہا تھا۔ کاش ”داستانِ سرا“ مفسر ”دامنِ یوسف“ کو زبردستی ”آلودہ“ نہ کرتے اور اپنے سر پر ”اہانت“ پیغمبر کا الزام نہ لیتے۔



## یوسفؑ نے بے گناہ بھائیوں کو چور ٹھیرا دیا

192

### ایتھا العیر انکم لسارقون

(یوسف، 70)

اے قافلہ والو تم تو چور ہو۔

یہ ہے کہ اس آیت میں قافلے والوں کو چور بنایا گیا ہے جو کہ سراسر ہمت اور یوسفؑ صدیق کے زاویہ سے بہتانِ عظیم ہے۔

وجہ اعتراض

کس ”وثوق“ سے کہا جا رہا ہے کہ یوسفؑ نے ماضی کا ”انتقام“ لینے کے لئے اپنے بھائیوں پر ”چوری“ کا الزام دھرا؟ یہ درست ہے کہ بھائیوں کی ”زیادتیاں“ ناقابلِ معافی تھیں لیکن یہاں

قول فیصل

جس ”کھلے بہتان“ سے کام لے کر یوسفؑ کو سامنے لایا جا رہا ہے وہ جرمِ انتقام سے زیادہ ”سگین“ جرم ہے ”اخلاقی“ زاویہ سے بھی اور ”صدیقاً نبیاً“ کے تناظر میں بھی خالص کر قافلہ کی روانگی کے وقت یوسفؑ وہاں موجود تھے اور نہ ہی انہیں

”علم“ ہو سکا کہ قافلے والوں کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ اذن مؤذن کے الفاظ ہیں جو بجائے خود گواہی دیتے ہیں کہ یوسف نہیں کسی سرکاری ”اہلکار“ یا ”توشہ خانے“ کے عہداران نے انہیں روک دیا۔ یہاں ’اذن‘ کا فاعل مذکور نہیں ہے آخر کس ”ضابطہ لسانی“ کے سہارے ہمارے مفسروں نے سیدنا یوسفؑ ہی کو فاعل بنا کر اپنا ”ٹارگٹ“ پورا کیا؟ خاص کر ”مؤذن“ کا اسم ”نکرہ“ ہے جو کسی بھی صورت میں یوسف کو نامزد کر کے ”ممر فہ“ نہیں بنایا جاسکتا۔

ۛۛ

## یوسفؑ کے لئے خدا کی ”حیلہ سازیاں“

193

### كذالك كد ناليوسف

(یوسف، 76)

اسی طرح یوسفؑ کے لئے ہم نے فریب کا سہارا لیا۔

میں کہا گیا ہے کہ۔ دھوکہ، فریب اور غلط ذرائع سے مقصد برآری کا کام لینا عام لوگوں کی نسبت سے بھی ایک گھناؤنا عیب ہے چہ جائیکہ یوسفؑ کی خاطر اسے اللہ سبحانہ بذاتِ خود دطیرہ بنالیں۔

### وجه اعتراض

یار دیکھ تو خیال کرو۔

کبد۔ کالفظ ”دقیق تدبیر“ اور کسی کو نقصان پہنچانے بغیر حکمتِ عملی۔ کا نام ہے۔ اس طرح بات

### قول فیصل

واضح ہو گئی کہ جو کچھ ہو چکا اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ برادرانِ یوسفؑ اور سرکاری عملہ کی

”معمولی تفتیش“ نے یہ راہ نکال لی کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے ”از خود“ ہی یہ فیصلہ کر ڈالا کہ یوسفؑ کے ”ماں جائے“ بھائی بیامین ہی چور ہیں اور یہ فیصلہ ”ہادی النظر“ میں کتنا ہی ”شر پسندی“ کا حامل تھا مگر اس سے دامنِ یوسفؑ بھی پاک ہو اور یوسفؑ کے علم میں آئے بغیر اس تدبیر سے ان کا بھائی بھی روک لیا گیا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے اتنا افسانہ بنا دیا گیا کہ جرم ”فریب کاری“ میں خدائے ”لایزال“ بھی ملوث بنادیتے گئے۔ اور سیدنا یوسفؑ بھی۔ حالانکہ بیامین کو قصور وار بنانے میں صرف اور صرف برادرانِ یوسفؑ ہی کا ہاتھ تھا اور انہوں نے ہی بیامین کو ”ملوث“ کرنے کیلئے ان کے سامان میں پیالہ رکھ دیا تاہم ان کے اور سرکاری عملہ کے باہمی فیصلے کے بعد جب ”آقائے مصر“ سیدنا یوسفؑ کو پتہ چلا تو اب یہ عرصہ صحت مند نمودار ہو گئی کہ اس راز کو راز ہی رہنے دیا جائے ورنہ تو مصریوں کو جب پتہ چلتا کہ ”بیامین“ یوسفؑ کے سنگے بھائی ہیں تو طرح طرح کی باتیں بنا کر ”اجنبی“ خاندان کے مشکوک و مشتبہ ہونے کی رسوائی پھیلاتے اس طرح اصل بات لوگوں تک نہیں پہنچ سکی اور معاملہ صیغہ راز میں رہ گیا اور یوسفؑ نے اپنے بھائی کو ان ہی کے فیصلے کے مطابق اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا کر اپنے ساتھ رکھا اور اسے جتنا دیا کہ میں تمہارا بھائی یوسفؑ ہوں تاکہ وہ اپنے کو ”مجرم“ محسوس نہ کریں اور اجنبی ”ویس“ میں اجنبی حکام کی تحویل میں اپنے کو ”محبوس“ نہ سمجھیں۔ یہی ادگوں کا وہ فیصلہ ہے جسے قرآن پاک نے ”بے ضرر تدبیر“ کہہ کر بحق یوسفؑ ”موزوں“ ٹھہرایا۔ اس طرح یہ کبد۔ کالفظ ”نسبتی“ زاویہ سے بھی برائی سے پاک مفہوم کا حامل بن گیا

شریف، جر جانی، سیر سید، اور ابوالکلام وغیرہ نے ”نسبت“ کی اہمیت کے پیش نظر الفاظ کے ”ناپسندیدہ“ مفہوم کو ”پسندیدہ“ مفہوم میں بدلنے کو روار کھا ہے اس طرح کید۔ کا لفظ نسبت کی ”اہمیت“ کے زلویہ سے ”برے مفہوم“ میں استعمال نہ ہوگا خفیہ، وقتی تدبیر اور حجت عملی کے مفہوم میں استعمال ہوگا۔

☆

آنکھوں کی سفیدی پینائی کمزور پڑنے کا استعارہ ہے

194

وَابْيَضَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزَنِ

(یوسف، 84)

شدتِ غم سے آنکھیں سفید ہو گئیں۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ غم اور حزن، آنکھ میں سفیدی لانے کا موجب نہ محاورہ ٹھہرتے ہیں نہ فنی طور پر۔

سیدنا یعقوب کی آنکھیں کثرتِ گریہ و زاری سے ”سفید“ ہو گئی تھیں جن کا سبب یوسف کی جدائی کا صدمہ اور شدید ”نوعیت“ کا غم و حزن تھا۔ یہاں اسی سبب (یعنی حزن) کو استعمال کر کے مستب (رونے) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی یہ احساس دلایا ہے کہ ہمارا وقت آنکھ کی ”سفیدی“ پینائی کمزور پڑنے کا استعارہ بھی بن جاتی ہے۔

☆

سب نے رسمِ شرک ادا کی پھر موحّد کیسے کہلائے

195

وَرَفَعَ ابُوهُ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجْدًا

(یوسف، 99)

اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب نے یوسف کو سجدہ کیا۔

وجہ اعتراض میں کہا گیا ہے کہ سجدہ شرک ہے جس کا صدور انبیاء سے نہ اپنی ذات کے لئے۔ مستحسن ہے نہ کسی اور کے لئے۔

یہاں سجدہ ”گردن جھکانے“ کا کنایہ بن کر آیا ہے جس سے ”تعظیم“ کا ایک ”رعرعی“ مظاہرہ مطلوب ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ عربی ادبیات میں الفاظ ایک دوسرے کا کنایہ بھی بنتے ہیں اور استعارہ بھی اس سے جہاں مفہوم میں ”حسن و جامعیت“ پیدا ہوتی ہے وہاں سجدے کے معنی صرف ”انحناء“ اور ”کونر نش“ بحالانا ہو جاتے ہیں جیسے فرمایا وَاذْكُرُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ۝ یہاں اڑ کھوا۔ اور ”الراکعین“ کے الفاظ۔ صلوٰۃ اور

مصلین۔ کا استعارہ ہے گویا فرمایا کہ۔ صَلُّوا مَعَ الْمُصَلِّين۔ نمازیوں سے مل کر نماز قائم کرو۔ (بقرہ، 43)

یہ یاد رہے کہ یہاں ”خروالہ“ میں لام برائے ”سبب“ ہے یعنی یوسفؑ کی تعلیم کے ”سبب“ سب کے سب اللہ کے آگے جھک پڑے یہاں سوال ہو گا کہ لہ۔ میں ”ہ“ کا مرجع۔ اللہ کیسے بن کیا تو بسالوقات ”مرجع“ کی ”اہمیت“ کے پیش نظر۔ مرجع مذکور نہ ہونے کے باوصف۔ مذکور شمار کر کے کام چلایا جاسکتا ہے جیسے فرمایا انا انزلناہ فی لیلۃ القدر یہاں ”ہ“ کا پہلے سے ”مرجع“ مذکور نہیں ہے لیکن مرجع کی ”اہمیت“ کو دیکھتے ہوئے ”القرآن“ کو مرجع بنایا گیا ہے اس تاویل سے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب نے یوسفؑ کی ہدایات کے مطابق اللہ کو سجدہ کیا۔

☆

رعد

خدا اب نہیں آئندہ کسی وقت عرش پر مستوی ہوگا

196

اللہ الذی رفع السماوات بغير عمد ترونها ثم استویٰ علی العرش وسخر

الشمس والقمر

اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو ستونوں کے بغیر اونچا کیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو پھر مرش پر مستوی ہوا اور سورج و چاند سخر کر ڈالے۔ (رعد، 2)

یہ ہے یہاں ”استوا“ کا لفظ ”جسم“ کا متقاضی ہے کہ اسکے بغیر ”تحت نشینی“ ممکن نہیں ہے، دوسرا یہ کہ صرف ”ثم“ مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی اب، نہیں آئندہ ایسا ہو گا کہ اللہ سبحانہ تخت پر بیٹھیں گے۔

یہاں یا جہاں کہیں اللہ کی نسبت سے ”استواء“ کا استعمال ہوا ہے ”اقدار“ اور غلبہ کا ”استعارہ“ بن کر ہوا ہے۔ اسی طرح تسخیر شمس و قمر کے ظاہر میں حرف ”ثم“ تدبیر امر کے لئے آیا ہے اس طرح معنی ہوں گے۔۔۔۔۔ تب شمس و قمر کو کنٹرول میں لے کر ان کے امور کی تنظیم کی طرف متوجہ ہوا۔

اس ضمن میں یہ بات قابل ”توضیح“ ہے کہ آیہ زیر بحث میں آسمان کو بغیر ستونوں کے بلند کرنے کی بات ہوئی ہے۔ جبکہ یہ ناممکن ہے کیونکہ ستون ہی جسم اور ثقل کو متقاضی ہیں اگر وہ نہ ہوں تو آسمان کا کھڑا ہونا ”خام خیالی“ ہے؟۔۔۔۔۔ جی نہیں یہاں صرف یہ واضح کرنا تھا کہ اللہ قادر ”لذاقمہ“ ہے وہ بغیر ستونوں کے بھی یہ کام کر سکتا ہے دوسرے لفظوں میں ”بے ستون“ آسمان کی ”تلمیح“ سے اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ آسمان حقیقت میں کوئی وجود ”رکھتا ہی نہیں“۔ بلکہ یہی بات آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے قرآن کے علاوہ کون فاش کر سکتا کہ آسمان کا ازروئے ”مشاہدہ“ بھی کوئی ٹھوس وجود نہیں تھا۔ فرمایا۔ فار تقب بوم تاتی السماء بدخان مبین،۔۔۔۔۔ اس وقت کو سامنے رکھو جب یہ آسمان مشاہدے

(دخان، 10)

کی نظر میں دھواں ہی دھواں ثابت ہوگا۔

اور جو چیز اپنی ”اساس“ میں دھواں تھی (حم السجدہ، 11) آج مشاہدے کی آنکھ نے بھی اسے دھواں یعنی ”ٹھوس“ وجود کے بغیر ہی تصدیق کر دی ہے۔ دھواں یعنی پکڑ میں نہ آنے والی شے اور یہ کتنی ”سچی“ حقیقت ہے جسے قرآن محکم اپنے مضبوط ”پیرایہ بیان“ میں پیش کرتا ہے اس سے نہ صرف اہل ”جبر“ کے اس عقیدے کی نفی ہو جاتی ہے کہ آسمان ٹھوس وجود رکھتا اور غیر مرئی ستونوں کے سہارے کھڑا ہے؟



## مستخف۔ پر سارب کا عطف

197

(رعد، 10)

وَمَنْ هُوَ مُسْتَخَفٌّ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ

کوئی تم میں سے چپکے سے بات کرے یا پکار کر..... رات کو کہیں چھپ جائے یا دن کی روشنی میں کھلم کھلا چلے پھرے اسکے نزدیک برابر ہے۔

میں کہا کیا ہے کہ ”مستخف باللیل“ سے پہلے فرمایا وَمَنْ هُوَ..... لیکن سارِب بالنہار سے پہلے وَمَنْ هُوَ نہیں کہا۔ تاکہ ”مستخف“ اور ”سارِب“ میں یکسانیت کا مفہوم زیادہ نکھر کر سامنے آجاتا۔ اب ہوا یہ کہ شخص ایک ہی ہے وہی غائب ہے اور وہی ظاہر۔ جبکہ غائب اور حاضر میں یکسانیت، نہیں پائی جاتی۔

سارِب۔ کا عطف۔ مستخف پر نہیں ”مَنْ“ پر ہے جو اپنے ”عموم“ کے لحاظ سے ”غائب“ کو بھی شامل ہے اور حاضر کو بھی خاص کر گرائمر کی رو سے یہاں حرف ”مَنْ“ تثنیہ کا مفہوم لے کر وارد ہوا ہے جیسے شاعر کہتا ہے:

نَكُنْ مِثْلَ مَنْ يَأْتِيكَ بِصُطْحَانِ

یہاں ”مَنْ“ تثنیہ کے مفہوم میں آیا ہے اور اسی ہی مناسبت سے بصطحبان کا فعل ”تثنیہ“ کے پیرائے میں ذکر ہوا ہے۔



## قوموں کا۔ عروج۔ اور ”زوال“ عمل سے مربوط ہے

198

ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم واذا اراد الله بقوم سوء فلا مرد له



کسی قوم کو جو (ترقی و آزادی کی) نعمت حاصل ہے اللہ اسے زائل نہیں کرتا جو کچھ ہوتا ہے ان کی اپنی طرف سے ہوتا ہے (بفرض محال) اللہ اگر کسی سے برائی کا سلوک کرنا چاہے تو اسے نال کوئی نہیں سکتا۔ (رعد، 11)

یہ ہے کہ۔ یہاں برے سلوک (سوء) کے بارے میں پوری وضاحت ہے کہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

**وجہ اعتراض**

آیہ زیر بحث میں دو لفظ قابل غور ہیں۔ بقوم۔ اور۔ بانفسہم۔ یہاں دونوں لفظوں کی ”ابتدا“

**قول فیصل**

حرف با (B) سے ہوتی ہے جو ”سببیہ“ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ نعمتوں کے ”زوال“ کا سبب قومیں خود بنتی ہیں۔ اسکے بعد فرمایا لو اراد اللہ۔ اگر خدا چاہتا۔ یہاں لو۔ حرف ”شرط“ ہے جو قانون کی رو سے ”جزا“ کو خواہاں ہے اور ”جزا“۔ فلا مرد کے جملے میں موجود ہے۔ لیکن کچھ ضروری نہیں کہ شرط کا استعمال جزا کے بغیر بھی ہوا ہو اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نافرمان بندہ بیوی سے کہہ دے کہ اگر تم نے فلاں جگہ پر قدم رکھا تو ”طلاق یافتہ“ ہوگی۔ اب اگر ”محترمہ“ اس جگہ میں ”قدم رنجہ“ نہیں فرماتیں تو کچھ ضروری نہیں کہ ”لو“ کا وارکار گر ہو سکے۔ اسی طرح انسان کو برائی یا۔ کوئی ناخوشگوار صورت حال سے واسطہ ہی نہیں پڑتا تو کچھ ضروری نہیں کہ لو اراد اللہ۔ کا ”تادیبی“ عمل ”ظہور میں آجائے“ خاص کر یہاں اراد۔ کا لفظ ”علم“ اور ”میان“ کے مفہوم میں آیا ہے یعنی اللہ کو علم ہے کہ ان کی برائی اگر ظہور میں آگئی تو ٹٹنے والی نہیں۔ لیکن اس طرح یہ ”کھوج“ لگانا مشکل ہے کہ۔ پیش آنے والی برائی کا ”فاعل“ کون ہے کیونکہ اللہ کے علم میں یہ تو ہے کہ ”برائی“ کا ظہور ہوگا مگر اس سے اللہ کے ”منشا“ اور ”مشہور معنی“ میں ”ارادے“ کو ”منسلک“ نہیں کیا۔

☆ 19-2-96 ملتان۔

**ابراہیم**

زبان اور قومیت کے حوالے سے بات گرنا کفر ہے نہ اسلام سے بغاوت

199

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لهم

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں بات کرنے والا تاکہ انہیں اپنی ہی زبان میں بات سمجھا سکے۔ (ابراہیم، 4)

میں کہا جاتا ہے کہ جو عالمی رسول ہو اس کو صرف ایک ہی زبان میں کلام کرنا اور ایک ہی قوم کی

**وجہ اعتراض**

طرف ”بھجنا“ ”آفاقی نفسیات“ کے منافی ہے اس طرح دوسری قومیں کہہ سکتی ہیں کہ ہم رسول کی بات سمجھ ہی نہ پائے تھے ایمان لاتے تو کس طرح لاتے۔

آیہ زیر بحث میں ”ایک“ ہی زبان میں بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ”متعدد زبانوں میں بات کرنے

**قول فیصل**

سے تحریف اور تبدیل کا دروازہ کھل جاتا ہے لہذا پالیسی عطا ہوئی کہ، متن محفوظ ہو اور ترجمہ کی

زبان میں پیغام رسانی کا سلسلہ جاری کیا جائے کہ بہترین کی حفاظت سے ترجمہ کی ماریٹائی اور کج رفتاری کی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے۔ اب آئیے اس زاویہ سے بات کریں کہ ایک رسول آفاقی ہو کر بھی وطن قوم اور زبان کے ناطے سے علاقائی ہو سکتا ہے اس طرح وہ اس ہی قوم کی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنالیتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا کہ ہمیشہ اولین مخاطب ہی خطاب کے سزاوار ہوتے ہیں اس طرح زور دے کر فرمایا کہ رسول اسے ہی بنایا گیا جسکی قوم بھی رتھی اور زبان بھی بیٹنے رسول تو قومیت کا جز اور حامل ہوتا ہے لیکن ترجمہ کے ذریعہ اس کا پیغام ”عالمی“ بن جاتا ہے۔

قرآن پاک نے اسکی وضاحت

**مادری زبان کو ذریعہ اظہار بنانا کیوں ضروری ہے؟** میں فرمایا ہے لیکن لہم کہ اپنی

ہی زبان میں مقاصد و اہداف سے آگاہ کرنا اصولِ فطرت کے ہم آہنگ ہے کہ وہ جن اصنافِ سخن سے کام لیتا، اشارہ کنایہ، ایجاز و اختصار کو استعمال کرتا۔ حقیقت و مجاز میں سخن رانی فرماتا ہے قوم ان استعالات و ادویات سے پہلے ہی مانوس اور آگاہ ہوتی ہے اسی طرح پیغمبر کے لئے کسی قوم کا فرد ہونا بھی ضروری ہے کہ اس پر مشتبہ النسب کی تہمت لگانا آسان نہ ہو۔ یوں بھی وطنی یا قبائلی قومیت کو اخفاء میں رکھ کر کسی مذہبی نیشنلسٹی سے شریت پانے والا ایک طرح سے اپنی قومیت کو مشتبہ بنانے والا ہی شمار ہوگا۔ الحاصل پیغمبر بطور خاص نسب قوم اور زبان کا حامل ہونا چاہیے ورنہ تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر مکہ کا نہیں مقط کا تھا وہ قریشی نہیں بنی اسد میں سے تھا۔ اس طرح پیغمبروں کے نسب کو مشکوک و مشتبہ بنانے والا ان حزم کے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے دور کے میخرفین نے زبان کے اس فطری اصول کے برعکس اپنی مادری زبان میں کلام، نہیں کیا ایران نے مرزا حسین علی بہاء اللہ کو منصب نبوت پر فائز کیا اور ان کی دیکھا دیکھی ہندوستان نے بھی مرزا غلام کے چہرے پر نبوت کا چہرہ سجایا۔ لیکن بہاء اللہ نے اپنی تعلیمات کی بنیادی کتاب ”کتاب اقدس“ کو عربی میں لکھا جبکہ عربی کی معمولی سدا بدھ رکھنے والا اسکی سینکڑوں غلطیاں پکڑ سکتا ہے کیونکہ ملہم الہ۔ الہی زبان نہیں تھے۔ میں نے 1952ء میں بیہائیوں کے حاضر دماغ و فصیح البیان مبلغ سید محفوظ الحق علمی سے کتاب اقدس کی اغلاط کا تذکرہ کیا تو انہوں نے جواب مرحمت فرمایا کہ الہامی الفاظ جیسے بھی نازل ہوں ان کی نوک پلک درست کرنا کسی غیر ملہم کا کام نہیں ہے تاہم میرا اصرار تھا کہ انہیں اپنی ہی فارسی میں کلام کرنا چاہیے تھا۔ اسی طرح ہمارے پنجاب کے پیغمبر نے بھی نفسیاتِ بلاغ سے انحراف کرتے ہوئے اردو، عربی اور فارسی میں تو کلام کیا مگر اپنی مادری زبان پنجابی میں الہامات کو مرتب نہ کر پائے۔

ادھر قرآن بلاغ و اظہار کے لئے مادری

**مذہبی نیشنلسٹی اور امپورٹڈ زبان کی جارحیت** زبان کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے اپنی

قدرت کا شاہکار ٹھہراتا اور قومیت کو تھپہ نسل کے زاویہ سے اساسی حیثیت دیتا ہے اور مقابل میں وہ لوگ ہیں جو قرآنی حقائق کو تسلیم ہی نہیں کرتے مادری زبانوں کو نظریہ پاکستان اور قومی پہچان کو اسلام سے بغاوت ٹھہرا کر خود اختراعی

نظریات کو دماغوں میں ٹھونٹے چلے جا رہے ہیں۔ اردو زبان، نہایت ٹیٹھی، ہل اور پیدی زبان ہے مگر تریوں کی موج میں بہنے والوں نے اسے جارح زبان بنا کر پاکستان کے بنیادی مقاصد ہی کی نفی کر ڈالی۔ انہوں نے پاکستان کے پہلے سال ہی نگلہ دیشی زبان پر جان لیوا حملہ کیا اور خوں ریز فسادات کی بجائے مکی بلی پاکستان نے بروقت پہنچ کر اس فتنے کا تدارک کیا تاہم نگالیوں کی غیرت قومی، بیدار تھی انہوں نے اپنی زبان کو محو ہونے سے بچالیا لیکن سندھ والے کامیاب نہ ہو سکے یہاں حملہ کوروں کی منصوبہ بندی کامیاب رہی بہاں چار صوبے تھے تین صوبوں اور کشمیر کی تدریسی زبان، نہیں تھی سندھ ہی سے بھی الگ جگہ تھے چنانچہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو والوں نے ایوب خان اور اصغر خان سے مل کر سندھ کی زبان کو بالکل ہی جڑ سے اکھیڑ دیا جسے کہ ریلوے اسٹیشنوں کے نام جو مخصوص سندھ کی صوتیات سے مربوط اور سندھ ہی ہجا اور رسم الخط سے متعارف تھے اردو میں تحریر کر ڈالے سندھ کی زبان سولہویں صدی سے رونما اور بکی کھاتے کی زبان کی حیثیت سے صوبے میں رائج چلی آرہی تھی اور وہ اپنے ہی گھروں میں اجنبی ہو کر رہ گئی نہ صرف یہ کہ سندھ کی اپنی زبان سے محروم کر دیئے گئے ایک اہم ذریعہ معاش سے بھی محروم بنادئے گئے۔ سندھیوں کا دوسرا ذریعہ معاش، ہمدرد گاہ تھا لیکن اردو فیکٹر نے کراچی کی حدود میں وسعت کرتے ہوئے پانچ سو مربع میل کا مزید علاقہ۔ کراچی میں شامل کر ڈالا جس سے ہمدرد گاہ کا پورا علاقہ سندھ کی تحویل سے نکل کر مرکز کے پاس چلا گیا۔ پھر نہ اس کا معاوضہ ملا اور نہ متبادل۔ اب ہی پورٹ فریڈ وٹن کے قبضے سے نکل کر اجنبیوں کے تصرف میں چلا گیا غرض کہ پنجاب مضبوط مرکز کے حوالے سے اپنا حصہ تو لیتا رہا مگر سندھیوں کو قابض اور مسلط لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا پنجاب والے چونکہ تدریسی زبان سے محروم تھے لہذا انہیں بھی سندھ کی زبان سے نفرت تھی اس طرح مہاجر دوں اور پنجابیوں نے مل کر سندھیوں کے خلاف تعصب، نفرت اور حقارت کا زہر گھونٹنا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے والے کے سیاہ کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا یہ رحیم نگر مسلمان ہوتے ہوئے نظریہ پاکستان کا صحیح شعور رکھتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ۔ زبانوں اور نسلوں کے اختلاف کو قدرت نے اپنا شاہکار اور کیمیا قرار دے کر گلوں کے رنگ دو کے اختلاف سے تشبیہ دی اور اس احساس کو ابھارا ہے کہ مادری زبان ہی سب سے زیادہ بلیغ اور محفوظ ذریعہ اظہار ہے، اس سے نفرت۔ اللہ کی پسند اور کیمیا سے نفرت کرنے کے مترادف ہے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اشتیاق قریشی مرکزی وزیر تعلیم تھے مگر حالت یہ تھی کہ ہر سال غیر ملکی یونیورسٹیوں سے وظائف آنے اور ڈاکٹر موصوف جب کوئی اردو والا وظیفہ کا اہل نہ پاتے یا جتنے پاتے باقی ضائع کر دیتے۔



## فرعون کا طریقہ ذبح کیا تھا

200

یسر مونکم سوء العذاب و یذبھون ابناء کم ویستحیون نساء کم

اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب اس نے تمہیں فرعون کی فیملی سے نجات دلائی جبکہ وہ عذاب کی مختلف صورتوں سے تمہیں

(ابراہیم، 6)

اذیت پہنچاتے ہیں کو ذبح اور خواتین کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔

یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں یذبحون اور اعراف میں یقتلون بغیر واو کے ہے جبکہ واقعہ ایک ہی ہے اور یہاں اسی زیر بحث آیہ میں واو کے ساتھ و یذبحون کا صیغہ آیا ہے۔

**وجہ اعتراض**

بقرہ اور اعراف میں۔ ذبح اور قتل کا صیغہ عذاب کی تفسیر میں کر لیا ہے جہاں واو۔ لانے کی ضرورت نہیں تھی اور آیہ زیر بحث میں واو کے اظہار میں یہ مصلحت پوشیدہ تھی کہ یہاں ذبح اور

**قول فیصل**

قتل کے عذاب کے علاوہ کسی دوسری جس عذاب میں نیز مبتلا دکھلایا گیا ہے۔ مثلاً ذہنی کرب وابتلا اور غلامی کا عذاب کیونکہ ذلت و رسوائی، بے غیرتی اور دیوثی پر بھی مجازاً قتل اور ذبح کا اطلاق ہوا ہے اس مفہوم کو یستحیون کے تناظر میں سمجھنا ہوگا کہ یہ باب استعمال سے ہے جسم الف سلب کا ہے اس طرح معنی ہوں گے فرعون مردوزن کو ذلت اور غلامی کی مار پلاتا اور ان کی خواتین کا جوہر حیات سلب کر ڈالتا تھا یعنی وہ دہرے عذاب میں مبتلا تھے غلامی کے عذاب میں بھی اور بے غیرتی کے عذاب میں بھی اور یہ مقصد واو کے اظہار ہی سے حاصل ہو سکتا تھا۔



## ملت کفر کی طرف پلٹ جانا

201

او لتعودن فی ملتنا

(ابراہیم، 13)

یا پھر ہماری ملت پر لوٹ آؤ۔

میں کہا جاتا ہے کہ عودہ مرثی میں اس نظر سے، عقیدے اور مشن پر لوٹ آنے کو کہا جاتا ہے جس پر کوئی عامل پہلے سے عمل پیر ہو چکا ہو لیکن اللہ کے رسول پیدا ہوئے موجد اور حنیف ہوتے ہیں ان سے یہ کہنا کہ تم سابقہ ملت کفر پر لوٹ آؤ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ شرک و کفر میں ملوث تھے۔

**وجہ اعتراض**

عود سے جو مفہوم اخذ کیا گیا ہے وہ سطحی سوچ کا منظر ہے ورنہ تو عربی میں عود کا لفظ کثرت سے صیرورت کے مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے مثلاً عاد فلان بکلمنی وہ مجھ سے سلام کاام

**قول فیصل**

کرنے لگا ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے ترک سلام کیا تھا اب پھر سے پہلے کی طرح سلام کرنے لگا ہے۔ عاد فلان مال فلان مال و دولت والا بن گیا ہے۔ بات صاف ہو گئی کہ عود کے ضمن میں کسی سابقہ عمل کے حوالے سے بات چلانا ضروری نہیں ہے یہاں قرآن کا سارا الینا پڑے گا جیسا قرینہ ویسے معنی فرمایا۔ حتی عاد کالعرجون القدیم۔ چاند کی منزلیں مقرر ہیں وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے (یس 39) عاد ہو جانا۔ بن جانا۔

شمس و قمر کی تسخیر اس وقت جب دنیا اس سے آشنا ہی نہیں رہتی

202



## وسخر لكم الشمس و القمر دائبين

سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا اور دونوں ہی اپنے معمول پر چل رہے ہیں۔ (ابراہیم، 33)

یہ ہے کہ یہ تسخیر کے معنی کسی چیز کو اپنے منشا اور مرضی کے مطابق کام میں لانے کے ہیں جیسے مانوس اور سدھائے ہوئے جانور کشتیاں، سوٹر، ریل گاڑیاں، عری اور ہوائی جہاز وغیرہ۔

**وجه اعتراض**

شمس و قمریوں تو اب انسانی قد سوں کی جو لا نگاہ من کرہ تسخیر کے دائرے میں آچکے ہیں ویسے بھی، سورج و چاند، دن اور رات کا تسلسل سو سموں اور مزاج پر اثر انداز ہو کر ہمارے لئے منافع اور فوائد

**قول فیصل**

کی گونا گوں شکلیں پیش کرتے چلے آ رہے ہیں جو عملاً فسجیہ ہی کے مظہر ہیں آپ چاہیں یا نہ چاہیں ان کی نفع رسانی جاری رہے گی اور ساری مخلوقات کیلئے تسخیر شدہ توانائی کی حیثیت سے فوائد جلتا رہیں گی۔ اس طرح تسخیر کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ۔ اللہ ہی تسخیر کا فاعل ہے۔ اس طرح اس کی نسبت ہماری طرف بھی صحیح ہے، اور اللہ کی طرف بھی۔



## مراد تو کسی کی بھی ”بر“ نہیں آتی

203

واتا کم من کل ما سألتموه

اس نے ہر وہ شے عطا کی جس کا تم نے سوال کیا۔ (ابراہیم، 34)

میں کہا جاتا ہے کہ مشاہدے کی رو سے ہر کسی کو اسکے سوال کا عملی جواب نہیں ملا۔

**وجه اعتراض**

یہ شکوہ تو راقم الحروف کو بھی ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا کبیت و افلاس کو اپنے ساتھ چپکا ہوا پایا اور ظاہر ہے کہ میں نے اس دشمن میں جس دلسوزی، اور اضطرابِ دروں سے اپنے رب کے آگے

**قول فیصل**

دست سوال پھیلا یا ہو گا وہ جنوں کی حدوں سے ماورا ہو گا لیکن مجھے دشتِ معیشت میں ابلہ پائی کا کوئی صلہ نہیں ملا۔ تاہم یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ یہاں اللہ کے دینے کا قانون، نہیں بدلا وہ، مستحکم ہے مجھے تو حکم ہے کہ میں اللہ کی نعمتوں کا جتنا بھی شمار کروں نہیں کر سکتا۔ (نحل، 18)۔۔۔۔۔ اس نے میرے دل میں ڈال دیا ہے اور دلائل اپنی جگہ پر دے چکا ہوں کہ یہاں کل کا لفظ بعض کے مفہوم میں لیا ہے اور معنی ہوں گے۔ اللہ نے لاکھوں، کروڑوں نعمتیں انسان کو ارزاں کر رکھی ہیں تاہم ایسا بھی ہوا کہ انسان کی فکریار سا اور اللہ کی حکمتِ بالغہ سے بعض باتوں کی پذیرائی، نہیں بھی ہوئی۔





## نعمتوں کا شمار کس زاویہ سے؟

204

وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها

(ابراہیم، 34) اگر اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو نہ کر سکو گے۔

یہ ہے کہ۔ تعدوا۔ اور تحصوا۔ کو جو بری (1005م) نے ہم معنی قرار دیا ہے اس طرح بات یوں ہوگی اگر تم نعمتوں کا شمار کرو تو شمار نہ کر سکو گے۔ اس طرح اردو۔ میں کسی طرح کام چل جائے گا مگر عربیت کے لحاظ سے تعدوا۔ امر کا صیغہ ہے یعنی شمار کرنے کا حکم ہے۔ اور۔ لا تحصوها۔ نہی کا صیغہ ہے یعنی شمار نہ کرنے کا حکم ہے اور یہ کھلا تضاد ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہو کہ۔ **ان قور۔** زید لا تبصرہ۔ یہاں رویت اور البصار ایک ہی چیز ہے۔

کچھ لوگوں نے۔ لا تحصوا۔ کو حصر کے لئے استعمال کیا ہے جسکی رو سے وجہ اعتراض باقی نہیں رہتی۔ زنجیری نے بھی اسے ہی ترجیح دی اور کہا ہے۔ لا تحصوها کے معنی ہیں لا تحصروہا ولا تطبقوا اعدھا۔ یعنی تم اگر اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تب بھی نہ احاطہ کر سکو گے اور نہ اعداد کی گرفت میں لا سکو گے۔

## یہاں موزوں افئدة الناس ہے یا افئدة من الناس؟

205

افئدة من الناس

(ابراہیم، 36) کچھ لوگوں کے دلوں کو مائل فرما۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں اگر افئدة الناس کہہ دیا جاتا تو زیادہ موزوں اور انسانی قلوب کے لئے زیادہ باعث پاکیزگی ہوتا۔

یہاں گراسر کی رو سے **من** "بعضیہ" ہے یعنی کائناتِ بھری کے کچھ افراد جو لاکھوں اور کروڑوں بھی ہو سکتے ہیں لیکن حرف **من** کو اگر درمیان سے نکال لیا جائے اور جملہ۔ افئدة الناس کے بیکر میں رہنے دیا جائے تو کائنات کا ہر فرد مخاطب تصور ہوتا اور ہر فرد پر "مسلم" ہو خواہ غیر مسلم، امیر ہو خواہ غریب، سواری رکھتا ہو خواہ پیدل ہو ان پر حج فرض ہو جاتا اور اژدہا م بے پایاں کے باعث عرفات کے حدود غیر محدود ہو جاتے۔ منے، مزدلفہ اور مکہ کے احکامات موجود حالت میں ناقابلِ نفاذ ہوتے۔

## مکرو فریب کا اللہ کے پاس پورا ریکارڈ موجود ہے

206

وقد مکرو امکروهم وعند الله مکروهم

انہوں نے مکرو فریب سے کام لیا اور اللہ کے ہاں بھی مکرو موجود ہے۔ (ابراہیم، 46)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ عند کے تناظر میں مکرو جیسا قبیح فعل۔ اللہ کا فعل بن جاتا ہے۔

یہاں عند سے ”علم الہی“ مراد ہے اور معنی ہوں گے :

قول فیصل

انہوں نے مکاری سے کام لیا جبکہ علم الہی میں ان کی ہر ”مکاری“ اور فریب کاری کا ریکارڈ موجود ہے اس نے ان کے ہر ”چلتر“ کا احاطہ کر لیا ہوا ہے اس طرح ان کی ”مکاری“۔ ارادہ الہی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ☆

## اللہ کے حضور پیش ہونا

207

وبرزوا للہ الواحد القہار

سب لوگ خدائے واحد کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔ (ابراہیم، 48)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ برزوا اس وقت کننا صحیح ہوتا جب فریق مخالف (اللہ سبحانہ) کے لئے جسم تسلیم کر لیا جاتا تو نہ اس کے سامنے نکل کھڑے ہونے کے معنی واضح ہو سکیں گے۔

قول فیصل

یہاں برزوا سے وہ ”غرض“ مراد ہے جو اسکے نتیجہ میں ظاہر ہو۔ مثلاً صلیت للہ۔ وحججت لہ، وطقت۔ یہاں صلوٰۃ۔ حج اور طواف سے ”تقرب“ الے اللہ کی ”غرض“ مراد ہے یہ، نہیں کہ اللہ کو سامنے ٹھا کر صلیت کا فریضہ سرانجام دیا۔ رو برد لا کر حج اور طواف کیا؟۔۔۔۔۔۔ یہ مفہوم اخذ کرنا نہ صرف ”ادلی تقاضوں“ کے منافی ہے، مجاز، ”استعارہ“ اور غرض و ”غایت“ کے خلاف بھی ہے۔ خاص کر یہ برزوا محاسبہ اور ”جزا“ کو متقاضی ہے اور یہی اسکی غرض و ”غایت“ ہے۔ ☆

حجبر

## کفر پر چلانا کس کے بس میں ہے

208

## كذلك نسلکہ، فی قلوب المجرمین

(حجر، 12)

اسی طرح اسے مجرموں کے دلوں میں اتار دیتے ہیں۔

یہ ہے یہاں كذلك کا اشارہ کس طرف ہے؟ کیونکہ عام طور پر اسے کفر اور گمراہی کی طرف راجع کیا جاتا ہے۔

وجہ اعتراض

کفر کی طرف راجع کرنے کی صورت میں مفہوم ہوگا کہ۔ اسی طرح ہم کفر کو کافروں کے دلوں میں بسا لیتے ہیں جبکہ پہلے سے کفر کا ذکر نہیں ہے اور مفہوم مہمل ہو جاتا ہے کیونکہ کافروں کے

قول فیصل

دل میں تو کفر پہلے ہی سے جاگزیں ہے انہیں کفر پر چلانے کی بات عجیب سی لگتی ہے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ۔ كذلك۔ کا اشارہ ”قرآن“ کی طرف ہے کہ آیہ نمبر 9 میں قرآن ہی کا ذکر ہے۔ اس بنا پر معنی ہوں گے اور اسی طرح ہم قرآن کو ”مجرموں“ کے دلوں میں اتار دیتے ہیں۔ کیونکہ قرآن ہی کو مجرموں کے دل تک پہنچانے کی بات معقول ہو سکتی ہے۔

☆

## خدا کے وارث ہونے کا مفہوم

209

### انا لنحن نحي ونميت و نحن الوارثون

(حجر، 23)

اور ہم ہی زندگی عطا کرتے اور موت کو مسلط کر دیتے ہیں کہ ہم ہی وارث ہیں۔

میں کہا جاتا ہے کہ وارث تو وہ ہوتا ہے جو کسی کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد وغیرہ کا مالک بن جائے اس طرح مورث پہلے اور وارث بعد میں آتا ہے تو کیا معاذ اللہ۔۔۔۔۔ اللہ سبحانہ کے بھی کوئی

وجہ اعتراض

مورث تھے جسکی خدائی کے وہ وارث بن سکتے۔

وارث لغت میں ”باقی رہنے والے“ کو بھی کہتے ہیں یعنی سب تو ”فانی“ ہوں گے وہ حی و قیوم کی حیثیت سے ”باقی“ رہے گا اور اللہ۔ ان کے مال و املاک بلکہ ہر شئی کا جس طرح پہلے مالک تھا سب

قول فیصل

کے فنا ہو جانے کے بعد بھی وہی ”باقی“ اور مالک رہے گا۔ ☆

## ابلیس۔ کی نافرمانی اسکی رسوائی کا سبب بن گئی

210

### الا ابلیس ابی

(حجر، 30)

لیکن ابلیس نے انکار کیا اور سجدہ ریزی پر آمادہ نہیں ہوا۔

یہ ہے کہ ابلیس جب اپنے کفر پر قادر نہیں تھا انکار پر کیسے قادر ہوا؟ کیونکہ جو کسی امر پر قادر نہیں

وجہ اعتراض

انہی کا عمل اس سے سرزد نہیں ہو سکتا۔

کیہ زیر بحث میں ابلیس کی ”قدرت“ کا بیان ہے وہ چاہتا تو سجدہ ریزی کر سکتا تھا مگر اس نے سرکشی کا راستہ اختیار کر لیا اور ”عظمتِ آدم“ کو ”خاطر“ میں نہیں لایا۔ اس طرح ابی کا اطلاق صرف ”قادر“ پر نہیں ہو سکتا جیسے کہنا کہ ----- ”گو نگے“ نے بات کرنے سے انکار کر دیا جبکہ وہ بات کرنے پر ”قادر“ ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ پاؤں کئے نے چلنے سے انکار کر دیا کہ وہ چلنے پر ”قادر“ ہی نہ تھا۔۔۔۔۔ ہرے نے بات سننے سے انکار کر دیا کہ وہ سننے پر قادر ہی نہ تھا اس طرح ابا کا اطلاق صرف ”قدرت“ رکھنے والے پر ہوتا ہے جو ابلیس کو حاصل تھی۔

رہی یہ بات کہ جب فسجد الملائكة کلہم کہا تو اس کے بعد اجمعون کہنے کی کیا مناسبت تھی؟

## قول فیصل

اسکی توجیہ میں گرامر کے ایک بڑے راہوار امام خلیل نحوی (778م) کہتے ہیں کہ اجمعون کہنے سے واضح کرنا ”مقصود“ تھا کہ سجدے کا حکم ”سب“ کو شامل تھا اور اسی کو ”موکد“ کرنے کے لئے اجمعون کو کلہم کا ”ردیف“ بنادیا۔ گرامر کے دوسرے بڑے راہوار میروٰذ نحوی (898م) کہتے ہیں کہ کلہم سے صرف ”سب“ کے مسجودہ کرنے کے ”وجود“ کی خبر ہے جبکہ اجمعون سے یہ بھی ثابت کرنا مقصود تھا کہ سب کے سجدے کا ”زمانہ“ اور وقت بھی ایک ہی تھا یعنی یہ سجدہ ایک ہی وقت میں سب مل کر جالائے تھے۔ رہی یہ بات کہ خود ”سجدہ“ کیا چیز ہے تو ظاہر ہے اس سے ”تو انین خداوندی“ کے آگے سر اطاعت خم کر دینا ہی مراد ہے اس مفہوم کی وضاحتیں بار بار کر چکا ہوں۔

## دلوں میں کھوٹ کون پیدا کرتا ہے؟

211

## ونزعنا ما فی صدورہم من غل

(مجر، 47)

ہم نے ان کے دلوں سے کدورت کو نکال دیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں غل کے معنی کفر کے ہیں کہ ان کے دلوں میں کفر ہی بھرا ہوا تھا اور اسے ہی دلوں میں سے نکالنا موزوں ہو سکتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر یا ایمان۔ پیدا کرنا عمل خداوندی ہے۔

## قول فیصل

آپ غالباً کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ”بدی“ اور کفر کی ”تخلیق“ اور اسے ختم کرنا خدا کا عمل ہے لیکن یہاں غل کے معنی ”کفر“ کے نہیں ہیں بغض، ”حسد“ اور دل کی ”کدورت“ جس میں مسلمان اور کافر برابر ہیں کے ہیں۔ یہاں بتلانا یہ مقصود ہے کہ ”اہل جنت“ کے دلوں سے رشک و حسد کا جذبہ ختم ہو گا اور چونکہ وہاں ”اونچ نیچ“ نہ ہوگی لہذا یہ ”جذبہ خیس“ پروان ہی نہیں چڑھے گا سبھی اعتماد اور باہمی ”احترام“ کے یکساں حامل ہوں گے۔

## فرشتے من مانی کریں تو اُسے کیا کہا جائے گا

212

قدرنا انھا لمن الغابرين

(حجر، 60)

ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ لوط کی بی بی پیچھے رہنے والوں میں سے ہوگی۔

قول فیصل

یہ ----- ہے کہ یہاں فرشتوں نے جو کام کیا انکے مجاز نہ تھے۔

قول فیصل

یہاں قدرنا میں "اسناد مجازی" سے کام لیا گیا ہے۔ جیسے شاہی "الہکار" کہتے ہیں کہ ہم نے یوں۔

یوں "پلاننگ" کی اور فلاں کام کا "حکم جاری" کیا۔ فلاں بات سے روک دیا۔ تو یہ تمام امور

"بادشاہ" ہی سے منسوب ہوں گے۔ الہکاروں کی طرف نسبت مجازی ہوگی۔

20-2-96۔ ملتان

۶۰

الحل

## مشقت اور تکلیف احسان کی نفی کرتے ہیں

213

حين تريحون وحين تسرحون و تحمل اثقالكم الى بلد لم تكونوا بالغيه الا

بشقي الانفس

ان چوپایوں کو جب تم شام کو جنگل سے لاتے ہو اور صبح کو جنگل کی طرف چرانے لے جاتے ہو ان سے تمہاری شان اور

(نحل، 6)

عزت ہے۔

اور دور دراز کے شہروں میں جہاں تم زحمت شاقہ کے بغیر، نہیں پہنچ سکتے وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ (نحل، 7)

میں کہا جاتا ہے کہ ان کلمات میں اللہ نے اپنے احسانات کو جتلاتے ہوئے فرمایا ہے کہ، تم محنت اور

وجہ اعتراض

مشقت اٹھا کر بھی اتنی لمبی مسافتیں طے نہ کر سکتے تھے۔۔۔۔۔ وغیرہ۔۔۔۔۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اسمیں منت اور احسان کی کون سی بات ہے؟ کیونکہ مشقت اور محنت سے تو احسان کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس کا اثبات کیسا؟

سفر کی محنت اور مشقت تو اب بھی ہے۔ چاہیے تھا کہ منت جتلانے کے بعد زائل ہو جاتی۔

یہاں "مشقت" دو طرح کی ہے۔ بار برداری کی مشقت کہ اگر یہ چوپائے نہ ہوتے تو تمہیں سامان

قول فیصل

سر پر اٹھانا پڑتا۔ سفر کی مشقت کہ تم پیادہ چلتے چلتے "تھکن" سے چور ہو جاتے۔ ایسے میں گدھے،

گھوڑے، خچر، اونٹ، یاک اور بر فانی کتوں کے منافع کو سامنے رکھ کر جتلیا کہ۔۔۔۔۔ یہ سب تمہاری ہی خدمت کا سامان

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/rana.jabirabbas



☆ ہے اور وقت کے لحاظ سے تم پر سب سے بڑا احسان ہے۔

کفر اور گمراہی۔ برحق کیسے؟

214

فمنهم من هدى الله ومنهم من حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ

انہیں سے کسی کو ہدایت ملی اور کسی کی گمراہی حقیقت بن گئی۔ (نحل، 36)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ ضلالت کا لفظ جب ”ہدایت“ کے مقابل استعمال ہو تو اس سے کفر کے معنی حتیٰ ہو جاتے ہیں لیکن یہاں کفر کو حَقِّق کے فعل سے ظاہر کیا گیا ہے یکہ اپنے مفہوم و معانی کے لحاظ سے کفر برحق ہو ہی نہیں سکتا۔

**قول فیصل**

یہاں میرے ترجمہ کی رو سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔ تاہم اعتراض کی وجوہ بیان کی گئی ہے اس کا جواب راغب اور مرتضیٰ زبیدی نے اس طرح دیا ہے کہ یہاں حق ۔ اس طرح ہے کہ کسی چیز کا اس طرح موجود اور ثابت ہو جانا کہ اسکے واقع اور ثابت ہونے سے انکار ممکن نہ ہو سکے۔ اسی طرح ضلالت کے معنی ”راغب“ نے ”رائگان“ جانے سے بھی لکھے ہیں ذہب دمہ ضلفہ اس وقت کہتے ہیں جب کسی کا خون رائگاں جائے نہ قصاص ہو نہ خون بہا۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ ..... ان میں کسی کو تو ہدایت مل گئی اور کسی کی گمراہی حقیقت بن کر اسکی محنت کو رائگاں کر گئی۔ ☆

معدوم۔ پر۔ موجود کا اطلاق

215

انما قولنا لشيء إذا اردناه ان نقول له كن فيكون

جب ہم کسی لادجود کو وجود میں لانے کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کن----- (ہو جاتب) وہ وجود پذیر ہو جاتی ہے۔  
(فصل، 40)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں معدوم (اور لاوجود) شے سے خطاب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قباحت نہیں ہے لیکن ابھن یہ ہے کہ علماء کا اجماع ہے کہ معدوم سے خطاب روا نہیں ہے۔

**قولِ فیصل** یہ معدوم؛ موجود ہماری حد علم سے مربوط ہے۔ اللہ کے علم میں ہر شئی معلوم ہی معلوم ہے موجود ہی موجود ہے بایں ہمہ معدوم پر شئی کا اطلاق صرف مجازاً ہے جیسے فرمایا۔۔۔۔۔ ان زلزلۃ الساعة لشیء عظیم اس وقت کا بھونچال بلاشبہ بڑی شئی ہے (حج، 1) یہاں انقلاب کی گھڑی ابھی معدوم ہے مگر اسے شئی کہہ کر موجود بنا دیا ہے۔

## خطا انسان کی اور گرفت چوپایوں پر؟

216

لو يواخذ الله الناس بظلمهم ما ترك عليها من دابة

(نحل، 61)

اللہ اگر لوگوں کی زیادتی پر گرفت کئے رکھتا تو کوئی بھی جاندار نہ بچ سکتا تھا۔

یہ ہے کہ ظالموں کو تو ظلم کی وجہ سے گرفت ہوتی ہے مگر اس سلسلے میں دیگر حیوانات کا استنصال کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ خدائے حکیم کی حکمت کے منافی نہیں ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ظلم۔ ”کفر“ کا۔۔۔۔۔ اور دابة۔ ”تنفس“ کا استعارہ ہے یعنی کسی بھی زیادتی اور کفر کرنے والے تنفس کو اگر کفر کی سزا دی جاتی تو کسی بھی تنفس کا بچ جانا ممکن نہ تھا۔

قول فیصل

☆

## شہد کی مکھی ہر جگہ ”چھتہ“ کیوں نہیں بناتی؟

217

من الجبال بیوتا ومن الشجر

(نحل، 68)

اللہ نے شہد کی مکھی کو وحی کر دی کہ پہاڑوں، درختوں اور چھتریوں میں گھر بنائیں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ومن الشجر۔ کی بجائے وفي الشجر۔ کہنا زیادہ فصیح تھا جیسے کہا جاتا ہے

وجہ اعتراض

اتخذ فلان بیتا فی الجبل او فی الصحراء

من: کے متبادل فی کے لانے سے کسی سارے جبل۔ یا کسی سارے صحرا کو چھتہ بنانے کا اشارہ

قول فیصل

ہوتا جبکہ ایسا ممکن نہ ہوتا اور یہاں مخصوص جگہ جو پہاڑوں اور درختوں (یا پھولوں) کی نسبت سے

تھوڑی سی جگہ ہو سکتی ہے مطلوب تھی لہذا من کا حرف لا کر بعض مقامات کا مفہوم واضح کیا کیونکہ یہاں من بعض کے مفہوم کے لئے ہے کل کے نہیں۔ زخمی نے اسی ہی توجیہ کو ترجیح دی ہے۔

☆

## بہنوں اور بیٹیوں کو۔ بیوی۔ بنانے کی سوچ

218

والله جعل لكم من انفسكم ازواجا

(نحل، 72)

اللہ نے تمہارے نفسوں میں سے تمہاری بیویاں پیدا کیں۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اگر ہماری بیویاں ہمارے ہی نفسوں کا حصہ ہوتیں تو بیویاں نہ بن سکتی تھیں۔

**قول فیصل**

معرض کی نظر شاید بخاری کی اس حدیث کی طرف گئی ہے جس میں ہے کہ عورت آدم کی پہلی سے پیدا ہوئی ہے پہلی چونکہ ٹیڑھی ہوتی ہے لہذا اسے اگر سیدھا کرنے کی کوشش کر دے تو ٹوٹ جائے گی۔ غرضیکہ حوا کا آدم کے وجود سے ظہور پذیر ہونا محدثین اور اہل تورات کا مسئلہ ہے۔ قرآن نے کم از کم اس آیت میں جَعَلَ کالفظ ذکر فرما کر اس تصور کو خاک میں ملادیا ہے اگر خَلَقَ کالفظ ہوتا تو شاید ان کی سوچ کا زاویہ درست کرنا پڑتا۔ لیکن ”جعل“ نے اس کی گنجائش ہی ختم کر دی ہے خاص کر یہاں اور درجنوں دیگر مقامات پر نفس کالفظ ”جنس“ کا استعارہ بن کر آیا ہے اور ای ہی مفہوم میں اہل زبان استعمال میں لاتے رہے ہیں فرمایا۔۔۔۔۔ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ۔ رسول (ؐ) تمہاری ہی جنس میں سے آیا ہے (توبہ، 129) اب معنی ہوں گے اللہ نے تمہاری بیویاں تمہاری ہی جنس سے بنائیں یعنی تم بھی جنس آدم وہ بھی جنس آدم۔ ☆

حرف۔ او۔ بات کو مشکوک بنادیتا ہے

219

الا کلمح البصر او هوا قرب  
آنکھ جھکنے پاس سے بھی پہلے۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں کو کا حرف استعمال ہوا ہے جو شک کے لئے خاص ہے جبکہ شک اللہ کی نسبت سے فعل قبیح ہے۔

**قول فیصل** یہاں آؤ ہماری نسبت سے تو شک کا مفہوم دے سکتا ہے اللہ کی نسبت سے صرف تو کا مفہوم ہوگا۔ ☆

## مشرکین کا اعتراف اور بیزارى

220

انکم لکا ذبون

بلاشبہ تم جھوٹے ہو۔

یہ ہے کہ جب اصنام نے اپنے پجاریوں سے کہا کہ تم جھوٹے ہو تو اس میں جھوٹ کی کیا بات تھی۔  
 کما یہ حقیقت نہ تھی کہ مشرک اپنے بنائے ہوئے بتوں کے بارے میں کہیں گے کہ۔۔۔۔۔ بار اُتھا

یہ وہی تو تھے جنہیں ہم آپ کو چھوڑ کر۔ پکارا کرتے تھے۔

## قول فیصل

یہاں مشرکین نے اس حقیقت کا بالآخر اعتراف کیا ہے کہ جنہیں وہ پکارتے یا۔ جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ جمادات و بے جان ہونے کی حیثیت سے انہیں کسی کی پکار اور عبادت کا پتہ ہی نہ تھا۔ لہذا وہ زبان گویا سے کہنے لگے کہ۔ تم تو جھوٹے ہو۔ اور اس لہجہ میں جمادات کو مخاطب کرنا نہ صرف شعر و شاعری میں رائج تھا عام گفتگو میں بھی روا تھا۔ اے نسیم سحر۔۔۔۔۔ اے بادِ صبا۔۔۔۔۔ اے بادلو۔۔۔۔۔ اے سورج و چاند تم گواہ رہنا ہر قوم کی ادبیات اور اصنافِ سخن میں رائج فقرے تھے۔



## قرآن میں ہر چیز کی وضاحت کے معنی کیا ہیں؟

221

### ونزلنا علیک الكتاب تبیاناً لكل شیء

ہم نے تم پر قرآن نازل کیا جو ہر چیز کی وضاحت کرنے والا ہے۔

(نحل، 89)

## وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ اگر قرآن ہر بات کو کھول کر بیان کرتا یا ہر شئی کی تفصیل فراہم کرتا۔ تو یہ جو شریعت کی ہر بات میں اختلاف پاتے ہیں اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔

## قول فیصل

یہاں کل معنی ”بعض“ کے آیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ دین میں کوئی ابہام رہنے نہیں دیا گیا اس کی مبادیات کی پوری وضاحت ہے شریعت کے نام پر جو اختلاف روار کھا گیا ہے اس کی ذمہ داری شریعت ساز علماء اور پیروانِ مذہب پر عائد ہوتی ہے پھر یہ اختلاف فردی ہے اسے بنیادی حیثیت سے لے لینا اجتہاد اور فتویٰ کے دائرہ کار کو بلا وجہ غیر محدود بنانے کے مترادف ہے۔ ☆

## اللہ کی باتیں بدلتی ہی رہتی ہیں ان میں ثبات ہے نہ استقلال

222

### واذا بدلنا آية مكان آية

جب ہم کسی آیت میں دوسری آیت کے ذریعہ تبدیلی لاتے ہیں۔۔۔۔۔ تو یہ کہتے ہیں انما انت مقرر تم تو اقرار کرتے ہو۔

(نحل، 101)

## وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں قرآن کی آیات میں نسخ و تبدیلی کا واضح اشارہ موجود ہے اور اس بنا پر بعض علمائے حدیث مثلاً حنیف ندوی وغیرہ کا کہنا ہے کہ اللہ کی باتوں میں ثبات ہے نہ استقلال۔

## قول فیصل

حنیف ندوی کا جواب برہان القرآن کے تیسرے باب میں شامل کر دیا گیا ہے یہاں واضح کرنا یہ مقصود ہے کہ۔ یہاں آیت کا لفظ دوم مرتبہ آیا ہے اور دونوں ہی مرتبہ ”نکرے“ کی صورت میں آیا ہے



اسے جبر ”معرفہ“ بنا کر آیاتِ قرآنی ثابت کرنے کا جواز پیدا کرنا قرآنِ فہمی سے محرومی کی دلیل ہے۔ میرے استقراء اور ایقان کے مطابق یہاں آیت کے معنی ”حکم و احکام“ کے ہیں یعنی نزولِ قرآن سے پہلے کے جن بعض (من) احکام میں ہم تبدیلی لائے تو وہ ہماری مصلحت بلکہ انسانی فکر کے ارتقائی سفر کے عین مطابق تھا کیونکہ ”جزوی“ (من) طور پر تبدیلی کسی ”بنیادی“ تبدیلی کی متقاضی نہیں ہوتی تاہم کوئی سی بھی تبدیلی ہمارے علم کا معاملہ ہے اس میں کسی کے اختیار اور مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے رسولؐ نے ہماری ہی بات (واذا بدلنا آیت) کی تو انہیں توہین آمیز لہجہ بکا گیا۔ انما انت مفتر۔ تم تو افتر پر واز ہو (نحل، 101) خدا ہمارے تورات (یا انجیل) میں کیوں تبدیلی کرنے لگا؟ فرمایا یہ ہماری ”قدرت“، اختیار اور ”ہمدوں“ کے ارتقائی حالات کو ملحوظ رکھ کر فیصلے کرنے کا معاملہ ہے۔

اس وضاحت کے باوصف کچھ لوگ دلیل و برہان کے بغیر ہی ”نکرے“ کو ایہ قرآن۔ بنا کر ”معرفہ“ بناتے اور قرآن کے حتمی دعوے کو مسترد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن میں نسخ (تبدیلی) ضروری ہے اور آیتِ نحل (101) میں اس کی طرف اشارہ ہے حالانکہ اللہ کا یہ حتمی فرمان ہے کہ لا تبدیل لکلمات اللہ (اللہ کے کلمات میں تبدیلی ناممکن ہے) (یونس، 64) لا تبدل لکلمات اللہ (اللہ کے کلمات میں نسخ و تبدیلی سرایت کر ہی نہیں سکتے) (انعام، 34)۔ انعام، 16۔ اور کھف، 27) اس طرح ان آیات میں ہر فرد و بشر کے لئے تبدیلی لانے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے بلکہ اپنی بات کی حفاظت کو پختہ بنانے کے لئے کھلے ہمدوں کہہ دیا کہ ما یبدل القول لدی۔ میں خود بھی اپنی بات میں تبدیلی نہیں لاتا (ق، 29) یہاں القول پر الف، لام ”استغراق“ کا ہے جو پورے قرآن کے لئے نسخ (تبدیلی کے امکانات کو مستعد رکھنے دیتا ہے اس طرح واضح فرمایا کہ یہ تبدیلی میں خود بھی اسلئے نہیں کرتا کہ کوئی بوالہوس یہ نہ کہے کہ جب خدا خود ہی اپنے اصولوں کو توڑتا چلا جاتا ہے تو کسی دوسرے کے لئے کیا پابندی ہے کہ اسکے قوانین اور اصولوں کا احترام کرے اور تبدیلی کی گنجائش ختم کر دے۔

یہ تمام آیات واضح کرتی ہیں کہ قرآن میں تبدیلی اور نسخ باطل ہے جو لوگ تبدیلی کے قائل ہیں وہ قائل ہیں کہ قرآن میں باطل ہے۔ حالانکہ چیخ ہے کہ۔۔۔۔۔ لا یتاہیہ الباطل من بین یدہ ولا من خلفہ اس قرآن میں نہ آگے سے نہ پیچھے سے نہ دائیں سے نہ بائیں سے کوئی سب باطل راہ پاسکتا ہے۔

ان آیات میں کلمات اللہ۔ یا القول لدی معرفہ کی حیثیت سے قرآن محکم کا تعین کرتے ہیں جبکہ آیہ زیر بحث میں آیت کا لفظ نکرے کی صورت میں کلمات اللہ سے موسوم ہو ہی نہیں سکتا۔ لہذا بغیر کسی قاعدے و قانون کے القول لدی اور کلمات اللہ کو نسخ و تبدیلی کے دائرہ میں کھینچ کر لانا انتہائی محرومی کی بات ہے اور سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ہمارے محدثین خاص کر سنی حضرات من حیث الجماعت قرآن کو دوسرے درجے کی دلیل ٹھہراتے اور کہتے ہیں السنۃ قاضیۃ علیہ الكتاب ولیس الكتاب بقاض علی السنۃ

”قرآن اور سنت میں جب تضاد محسوس ہو تو فیصلہ کن حیثیت سنت ہی کو حاصل ہوگی اسکے برعکس قرآن کا فیصلہ



مسترد ہوگا۔“ (کتاب الاعتبار امام حازمی (1188م) طبع منیر و متقی ۱۳۴۶ھری قاہرہ صفحہ 171۔ سنن داری طبع دمشق ۱۳۴۹ھری جلد 1/145/2)

اسی ضمن میں عبد الوہاب شعرانی (1565م) لکھتے ہیں۔ حدیث قرآن پر حاکم ہے۔ نہ یہ عکس اس کے۔ (المیزان طبع مصر جلد 31/10) نیز ملاحظہ ہو باب التاویل مطبوعہ مصر جلد 3/110 ان ابن عبد البر (1071م) اور شاطبی (1388م) نے امام عبد الرحمن الاوزاعی (774م) سے نقل کیا ہے کہ الكتاب احوج الى السنة من السنة الى الكتاب

یہاں احوج مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی ”محتاج تر“۔ جس طرح شیر خوار بچہ۔ پرورش، رضاعت، خوراک، صفائی اور آرام کیلئے ماں کا محتاج ہے ماں اگر سہارا نہ دے تو اسکی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اسی طرح قرآن بھی حدیث کا سب سے زیادہ محتاج اور ”وریوزہ گر“ ہے۔ اوزاعی کا مفہوم یہ ہے کہ :

”قرآن کلی طور پر حدیث کا محتاج ہے لیکن حدیث قرآن سے بے نیاز ہے۔“

(بحوالہ جامع بیان العلم طبع مصر جلد 2/19-----الموافقات طبع مصر جلد 4/8،-، 10)

ان حالات میں آپ جتنا بھی زور لگائیں کہ قرآن محکم ان کے دلوں میں اتار لیں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہاں تو حدیث کے ناطے سے یہ لوگ جرات سے انکار کی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے ہیں۔ تعجب تو فقہائے احناف پر ہے کہ جن کے رہبر و پیشوا قرآن کو ہر بات میں حدیث پر مقدم رکھنے کے جرم میں۔ صاحب الرائے۔ منکر حدیث اور امام اہل الرائے کی گالیاں سنتے رہے ان کے پیروکار بھی پوری دھڑائی سے فرماتے ہیں کہ جو قرآن ہمارے فقہی زاویوں سے مختلف ہے وہ قرآن ہی نہیں ہے۔ احناف کے مسلمہ پیشوا۔ امام ابوالحسن عبید اللہ الکرخی (952م) فقہا کے موقف کو جامع حیثیت سے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”ہر وہ آیت جو اس طریقے کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ۔“

(تاریخ الفقه الاسلامی مصنفہ علامہ خضریٰ اردو ترجمہ طبع دارالمصنفین اعظم گڑھ صفحہ 421)

بات کیا ہوئی کہ دین میں قرآن پاک نہیں فقہائے احناف کی رائے ہی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن اگر ان کی رائے کے مطابق ہے تو قابلِ تسلیم ہے اگر نہیں ہے تو اس کی تاویل کر کے فقہی سراج میں ڈھال لیا جائے گا اگر نہ ڈھال سکے تو مسٹر دیا پھر منسوخ کر دیا جائے گا اس طرح تمام سنی مدارس الفاظ قرآن کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے روایات اور اقوال کو علی الاطلاق ”فوقیت“ اور ترجیح دیدیتے ہیں کہ ان کے عقیدے کے مطابق قرآن ”محیط“ اور اقوال و روایات ”محیط“ ہیں العیاذ باللہ۔ کسی ول جلع نے اس حادثہ جانکاہ کی مناسبت سے کیا خوب کہا ہے ۔

وہ کتاب جو سارے جہاں سے بھاری ہے  
اسی کے علم سے شیخ الحدیث عاری ہے  
نبی پر اللہ نے فقط اک کتاب اتاری ہے  
اللہ کے دین میں شامل کہاں عاری ہے؟

19-2-96ء



کافروں کو ہدایت نہیں ملتی جبکہ ہزاروں صحابہ کافر تھے

223

وان الله لا يهدي القوم الكافرين

(نحل، 111)

اللہ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

میں کہا جاتا ہے کہ ہزاروں صحابہ جو پہلے ہدایت یافتہ نہیں تھے بعد میں ہدایت یافتہ ہو گئے ایسے میں فرمان الہی کا مطلب کیا ہوگا؟

وجہ اعتراض

یہاں کفر کے معنی تجدد کے ہیں یعنی باطل پر اڑے رہنے والے ہدایت سے استفادہ نہیں کر سکتے۔

قول فیصل



ہر نفس اپنے نفس کا دفاع کرے گا وہ کیسے؟

224

یوم تأتي كل نفس تجادل عن نفسها

(نحل، 111)

جب ہر نفس اپنے نفس کا دفاع کرے گا۔

یہ ہے کہ۔ ہر نفس اپنے نفس کا دفاع کس طرح کرے گا؟

وجہ اعتراض

یہاں پہلے ”نفس“ سے ”انسان“ اور دوسرے سے ”ذات“ مراد ہے یعنی ہر انسان اپنی ہی ذات

قول فیصل

کا دفاع کرے گا۔



لباس پہنا جاتا ہے اسکا ”چکھنا“ کیسے؟

225

فاداقها الله لباس الجوع والخوف

(نحل، 112)

جب اللہ اسے بھوک اور ڈر کا لباس پہناتا ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ ”ذائقہ“۔ زبان سے معلوم کیا جاسکتا ہے اور زبان ہی کا یہ دھبہ ہے۔ اسے

وجہ اعتراض

لباس کا دھبہ بنانے میں کیا مناسبت ہے؟ لہذا یہاں ہونا چاہیے تھا فکسہا الله لباس الجوع

## قول فیصل

بھوکا روٹی کھانے کا خواہاں ہوتا ہے جیسا کہ الجوع کی "تمیغ" سے واضح ہے اور "کھانا" ذائقہ کا متقاضی لہذا یہاں ذائقہ مستعار۔ (یعنی) بھوک (الجوع) کی مناسبت سے آیا ہے اسے علم "بیان"

کا ایک لطیف پیرایہ شمار کیا جاتا ہے اس طرح پہلے فقرے کو تجرید الاستعارہ اور دوسرے کو توشیح الاستعارہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

الاسراء

## رسول کو "عبد" کیوں کہا؟

226

### سبحان الذی اسری بعبدہ

پاک ذات ہے وہ۔ جس نے اپنے بندے کو (رات کے پچھلے حصے میں) سیر کرائی۔ (اسراء، 1)

یہ ہے کہ یہاں رسول اکرم ﷺ کی عظمت اور رفیع منزلت کا اظہار مقصود تھا ایسے میں اپنے "بندے" کہنے کی بجائے اپنے حبیب۔ اپنے رسول یا۔ اپنے نبی کہنا چاہیے تھا۔

## وجہ اعتراض

جب آپ کی رفیع منزلت کے مقام پر عبد کہا تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ عبد کی اضافت جب "رب" کی طرف ہو تو رفعت کم نہیں دوچند ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ عبد کہنے میں یہ "مصلحت"

## قول فیصل

پہاں تھی کہ مسلمان یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ رسول کائنات ﷺ مسیح یا کسی دیگر فرستادہ خدا کی طرح حاجت رولیا معبود ہیں اور پھر اسی گھمنڈ میں اترتے پھریں کہ ہمارے نبی حاجت روائی کے درجے پر پہنچے ہوئے ہیں۔ لہذا اشارہ دیا کہ جو ہمارا "عبد" ہے وہ کسی کا "معبود" نہیں ہو سکتا۔

☆

## مکہ سے مسجد اقصیٰ کی سیر خواہگاہی

227

### بعبدہ لیلًا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حوله

ایک رات مکہ سے مسجد اقصیٰ تک اپنے بندے کو میر کرائی وہ مسجد اقصیٰ جسکے ارد گرد برکتیں ہی برکتیں مہیا کر دی ہیں۔ (اسراء، 1)

میں کہا جاتا ہے کہ مکہ سے بیت المقدس لے جانے اور پھر وہاں سے معراج کرانے کی بجائے ایسا کیوں نہیں ہوا کہ مکہ المکرمہ سے براہ راست معراج کرائی جاتی۔

## قول فیصل

معراج کی بات ہوتی یا اسی آیت کے ساتھ۔ ثم عرج به الی السماء۔ کے الفاظ ہوتے تب تو معراج کی بات ہو سکتی تھی یہاں صرف بیت الحرام اور بیت المقدس کی عظمت و اہمیت واضح کرنا

## وجہ اعتراض

مقصود تھی۔ خاص کر مکہ المکرمہ۔ نبی اکرم ﷺ کا مسکن تھا اور بیت المقدس الہی کتاب کا کعبہ مقصود اس طرح اشارہ ہوا کہ شرق اوسط کے دونوں ادیان میں قربت پیدا کرنے اور خیر سگالی کا اظہار کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ پہل کریں۔ کیونکہ دو۔ دار الحکومتوں کے مابین حائل نفرتوں کی دیوار گرانے کا یہی نفسیاتی وسیلہ تھا جو صاحب لطف و کرم ہمارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ نے استعمال فرمایا خاص کر انبیاء کے بیاد میں فراخ دلوں میں دلوں میں محبت و مودت کے جذبات پیدا کر کے نفرتوں کا قلع قمع کرنا بھی ہے نبی اکرم ﷺ نے اپنے شیوہ پیغمبری کے مطابق قربوں کے محل تعمیر کئے۔ اور نفرتوں کے حصار پیوند زمین گزائے۔ بار کنا حولہ کی تبلیغ واضح کرتی ہے کہ شام کا پورا علاقہ جس میں بیت المقدس بھی شامل تھا، سرسبز و شاداب۔ ہر قسم کے پھل، فروٹ۔ باغات۔ اناج وغیرہ کی نعمتوں سے مالا مال تھا اور تجارت کی غرض سے نبی اکرم ﷺ متعدد بار ادھر کا سفر بھی کر چکے تھے۔ اپنے بیچا زبیر کے ساتھ بھی اور اپنے بھولی ویاہ غار ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ بھی بلکہ حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلے بھی لے کر یہاں آتے رہے ہماریں آپ کو اس خطہ سے بڑی مانوسیت ہو گئی تھی۔ آپ جاگتے اور خواب میں اس علاقے کو بھلاہ سکتے تھے۔ ☆

## شادابی صرف بیت المقدس کی کیوں؟

228

### بار کنا حولہ

ہم نے اسکے آس پاس برکتوں کی بہتات گروئی۔ (اسراء، 1)

یہ ہے کہ یہاں بار کنا حولہ۔ فرمایا جبکہ کنا چاہیے تھا بار کنا علیہ۔ یا۔ بار کنا فیہ۔ کیونکہ بابرکت مقام صرف مسجد اقصیٰ تھی۔ خارج از اقصیٰ کو برکتیں منتقل کرنے میں کیا مصلحت تھی؟

وجہ اعتراض

یہاں۔ بار کنا سے مقام کی ”متبرکی“ مراد نہیں اسکی عظمت تو اے المسجد الاقصیٰ کے روپ میں واضح ہے یہاں جس خطے میں مسجد اقصیٰ واقع ہے اسکی سرسبزی و شادابی کا مذکور ہونا ضروری تھا جو

قول فیصل

ظاہر ہے کہ مسجد کے اندر نہ انگوروں کے باغ تھے نہ انار اور کینوؤں کے تختے۔ اگر بار کنا علیہ۔ اور فیہ کہا جاتا تو مسجد کے صحن اور محرابوں میں ان ہی پودوں اور درختوں کا ہونا لازمی ہو جاتا۔

☆

## اسرائیلی سرکشوں اور زیادتیوں کی داستان خوںچکاں

229

وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین و لتعلن علوا

کبیرا

ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو کہہ دیا تھا کہ تم دو مرتبہ بڑے زور میں آکر سرکشی اور زیادتیوں کا ارتکاب کرو گے۔

(اسرا، 4)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں قضینا ماضی کا صیغہ ہے یعنی ہم نے پہلے کہا تھا۔۔۔۔۔ اور لتفسدن (فساد

وجہ اعتراض

پھیلاؤ گے) مستقبل کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ماضی میں فساد پھیلانے کی

صلاحیت نہیں تھی لیکن آئندہ کے لئے اللہ نے ان میں یہ صلاحیت پیدا کر دی (وقضینا)

یہ درست ہے کہ قضینا کے معنی فیصلہ کر دینے کے بھی ہیں لیکن یہ لفظ وسیع تر استعمالات کی وجہ

قول فیصل

سے متعدد معانی کا حامل ہے اس کے ایک معنی مطلع کرنے اور خبر دینے کے بھی ہیں۔ یعنی انہیں

پہلے سے مطلع کر دیا گیا۔ یہ نہیں کہ بعد میں ان میں تخریبی صلاحیتیں تخلیق کر دی گئیں؟ قضا۔ معنی تخلیق۔ یہاں آنے کا

نہ قرینہ ہے اور نہ موزونیت۔ اسکے زیادہ سے زیادہ یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ پیانہ، پلاننگ۔ نہ کہ تخلیق اور ایجاد!!

☆ 21-2-96 شب عید الفطر۔ ملتان

زیر دستوں پر زور آوروں کو مسلط کرنا عمل خداوندی ہے

230

فاذا جاء وعد اولهما بعثنا عليكم عبادا لنا اولی باس شدید فجاسوا خلل

الديار

پھر جب دو قوتوں میں سے پہلا وقت آگیا تو (اے بنی اسرائیل) ہم نے تم پر ایسے ہمدے بھیج دیئے جو بڑے ہی خوفناک تھے۔ پس وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے۔ اور اللہ کا وعدہ تو اسلئے تھا کہ پورا ہو کر رہے۔

(اسرا، 5)

یہ ہے کہ یہاں بعثنا۔ کے رفل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ قتل و غارت کو پسند کرتے اور اپنے

وجہ اعتراض

ہمدوں کے ذریعہ مجرموں کی بستیاں تہ و بالا کرتے رہتے ہیں۔

بات کو جس نہج پر ڈالا گیا ہے کم از کم زیر بحث آیہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتی کیونکہ اللہ سبحانہ نے

قول فیصل

ظلم اور فساد کا باقاعدہ کوئی حکم نہیں دیا تھا تاکہ نتیجہ کے بطور شرانگیزیوں کی ٹھکانی کے لئے کسی غیر

قوم کو بھیج دینے کی نوبت پہنچی ہو۔ ان کی باہمی کڑوتیمیں اور خانہ جنگیاں اس حد تک زور پکڑ گئی تھیں کہ وہ خود کار حیثیت سے

تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے ایسے میں کسی جانب سے اگر کسی نے حملہ کر کے ان کے کٹن بل نکال دیئے تو اس عمل کو مجازاً

”تدبیر“ خداوندی کہا جاسکتا ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی آیات زیر بحث کا تاریخی پس منظر معلوم کر لیں۔

یہاں آیہ نمبر 4 میں کتاب سے مراد انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے ہیں چنانچہ بسعیاء، یرمیاء اور حزقیل کی

کتابوں میں بنی اسرائیل کے دو بڑے فسادوں اور دو بڑی بربادیوں کی خبر دی گئی تھی (جیسا کہ آیہ نمبر 4 میں مذکور ہے)۔

پہلی بربادی بابل کے بادشاہ ہو کد نر (نخت نھر) کے حملہ سے ہوئی اور دوسری رومیوں کے حملہ سے جو ٹیٹس کے زیر



قیادت ہوئی تھی۔

(ملاحظہ ہو۔ ترجمان القرآن امام المند جلد 2/347)

اس طرح بابل پر یو کد نذر کے حملے نے صرف یہود دیا۔ کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی لیکن ایک صدی کے بعد گردش زمانہ نے پھر پلٹا کھایا اور کار ساز قدرت نے وقت کی سب سے بڑی شہنشاہیت کو ان کی اعانت و دستگیری کے لئے کھڑا کیا یعنی شہنشاہ فارس کو۔۔۔۔۔ اب یہودیہ کی تمام بڑی بستیاں پھر سے آباد ہو گئیں اور یہودی جمیعت کا جسم سرورہ پھر زندہ ہو گیا جس کا آیہ نمبر 6 میں اشارہ کیا گیا ہے فرمایا۔ اگر تم نے اچھے کام کئے تھے اپنے ہی لئے کئے تھے یعنی اسکے نتائج تمہارے ہی حصے میں آئے۔ اور بد عملیاں کی رہیں تو وہ بھی اپنے ہی لئے کی تھیں۔ اسکی پاداش بھی تمہارے ہی حصے میں آئی چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اس دوسری مہلت کی بھی تم نے قدر نہ کی اور اپنی توبہ و انابت کے وہ تمام عہد بھلا دیئے جو بابل کی امیری کے زمانے میں کئے تھے تو پھر دوسری ہلاکت کا وقت نمودار ہو گیا یعنی رومی حملے کا۔۔۔۔۔ بنی اسرائیل کی آخری ہلاکت تھی۔ (ترجمان القرآن جلد 2/347-348)

(رف. 21/2/96 بروز عید رمضان۔ و۔ فیئر. 28/4/96 بروز عید الاضحیٰ ملتان)



## لہا۔۔۔۔۔ اور۔ علیہا۔ میں فرق

231

وان اسأتم فلہا

(اسراء، 7) اگر برا کرو گے تو برائی پیش آئے گی۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ لہا۔ کا صلہ۔ فائدے کے لئے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وبال کے لئے علیہا۔ کا حرف

(حم السجدہ، 42)

خاص ہے جیسے فرمایا۔ من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فلعلہا۔

وجہ اعتراض

اس طرح ”صلہ“ کے لئے۔ ”ل“۔۔۔۔۔ اور سرزنش و سزا کے لئے علیہ کا حرف استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔

یہاں لہا۔۔۔۔۔ علیہ کا استعارہ بن کر آیا ہے جو اویات عرب کے عین مطابق ہے۔۔۔۔۔ فرمایا

وتلہ للجبین (صافات، 103) جو۔ علیہ الجبین۔ کا استعارہ ہے۔۔۔۔۔ ویخرون للاذقان

قول فیصل



(اسراء، 109)۔ جو علیہ الاذقان سے مستعار ہے۔

## بدکاروں۔ کو بدی کا چانس خدا ہی فراہم کرتا ہے

232

امرنا متر فیہا ففسقوا فیہا

(اسراء، 16)

ہم نے ان کے خوشحال لوگوں کو فسق و فجور کا حکم دے رکھا تھا۔

## وجہ اعتراض

یہ ہے کہ آیہ زیر بحث میں واقع فعل امر "نا" سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے خود ہی برائی کی راہ چلنے کا لوگوں کو حکم دے رکھا ہے۔

## قول فیصل

امروہ کے معنی لغت میں "کثرت" کے ہیں یعنی ہم نے خوشحال لوگوں کو مال و دولت، مویشیوں اور جائیداد کی کثرت سے نوازا۔ لیکن انہوں نے اسے بدی کی راہ پر چلنے کا ذریعہ بنایا۔ اس طرح ففسقوا میں واقع حرف فاء جزا ہے خوشحالی کی۔ یعنی ففسقوا کے فاعل وہ خود تھے جس سے واضح ہوتا ہے کہ بدی کا راستہ ان کا خود پسند کردہ راستہ ہے اللہ سبحانہ بدی کا حکم نہیں دیتے فرمایا۔ ان الله لا يامر بالفحشاء والمنكر۔ اللہ نہ فحش کا حکم دیتے ہیں نہ دیگر منکرات کا۔ ☆ (اعراف، 27)

## دستر خواں کی مساوات

233

### وما كان عطاء ربك محظورا

اللہ کی دین کسی سے رکی ہوئی نہیں ہے۔ (اسراء، 20)

## وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ آیہ زیر بحث میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ ہر حق ہے لیکن مشاہدہ اس سے ہموا نہیں ہے۔ کیونکہ لاکھوں کروڑوں انسان غربت، افلاس، تکلیت اور ادبار کی چکی میں پس رہے ہیں جبکہ ان ہی کے دیگر لبتائے جنس وہ لوگ ہیں جن کے خوشحالی قدم چوم رہی ہے اور پھر وہ اللہ کے نافرمان بھی درجہ اول کے ہیں۔

## قول فیصل

یہاں عطا کے معنی "رزق" کے ہیں جسے اللہ نے کسی نیک و بد، کسی فرماں بردار اور نافرمان کے زاویہ سے محدود اور خاص نہیں کیا اس نے نہ تو بدی کے بہانے کسی کی روزی میں کمی کی ہے اور نہ ہی نیکی کو ملحوظ رکھ کر اپنے قانون "ریویٹ عامہ" میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہے اس نے روزی کو یہاں غیر محظور (اور غیر ممنوع) کہہ کر بات واضح کر دی ہے بلکہ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ وضاحت سے فرمایا عطاء غیر مجذوذ۔ اسی عطاء جسکے ٹکڑے نہ ہوں گے کہ کسی کو زیادہ ملے اور کسی کو کم (ہود، 109) اس طرح اللہ کی جانب سے نہ کمی ہے نہ بیشی۔ نہ امتیاز ہے نہ فرق۔ یہ جو کچھ فرق نظر آرہا ہے اس نظام کا خاصہ ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ یہ تیری یہ میری کا نظام۔ زور آوروں نے زیر "دستوں پر مسلط کر کے مذہب کی مہر ثبت کرادی ہے تاکہ ذہنوں میں یہ غلط تصور رائج کیا جائے کہ۔ یہ اونچ نیچ کا سارا نظام ہی دست قدرت کا شاہکار ہے۔ حالانکہ اللہ فرماتا ہے۔ اپنی ضرورت سے جو کچھ زیادہ ہے اس پر ان لوگوں کا حق ہے جو محروم و نادار ہیں (معارج و ذاریات) نیز فرمایا ضرورت سے جو نیچ رہے اسے کھلا رکھو۔ (اعراف، 198) بلکہ زور دے کر فرمایا۔۔۔۔۔ اتارو پیہ پیہ، دولت و جائیداد۔ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہاری صلاحیتوں کا ماحصل ہے لہذا تم تمہا اسکے مالک ہو۔ (نحل، 71) ☆

## لعنتی۔ درخت سے کیا مراد ہے؟

234

### والشجرة الملعونة في القرآن

(اسراء، 60)

اور لعنتی درخت جو قرآن میں ہے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ قرآن میں کسی ایسے درخت کا ذکر نہیں ہے جسے قرآن نے نام لے کر ملعون کہا ہو۔

عبدالقادر رازی کہتے ہیں کہ ان العرب تقول لكل طعام مكروه اضرار. ملعون، عرب ہر ناگوار۔ اور مضر صحت کھانے کو ملعون کہتے تھے۔ (صفحہ 194)۔

### قول فیصل

بات صاف ہو گئی کہ ہر ضرر رساں چیز جو طبعی نقطہ نظر سے مضر صحت ہے وہ ملعون ہے۔ اور یہ ملعونیت حرام کے مترادف نہیں طبائع کے اعتبار سے ناگوار۔ اور ملعونیت کی حامل ہے یہاں پھر سوال ہو گا کہ اس شجرہ کا کوئی نشان و پتہ ہونا چاہیے تو تفسیر آیات کو ضواء میں پتہ چلتا ہے کہ وہ تھوہر کا درخت ہے جس میں انسانی غذا بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ناگوار بھی ہے۔ بد ذائقہ اور مضر صحت بھی فرمایا ان شجرة الزقوم طعام الاثیم۔ تھوہر کا درخت ہی ہے جو مجرموں کی غذا ہو گی (دخان، 43۔۔۔۔۔ واقعہ، 52) اس سے معلوم ہوا کہ جرائم پیشہ لوگ ہی ناگوار غذا کھلائے جائیں گے۔

21-2-96 ملتان

☆

### کھف

## مکمل مفہوم کے بعد مترادف کیوں؟

235

الحمد لله الذي انزل على عبده الكتاب ولم يجعل له عوجا قيما لينذر باسا

شدیدا

ہر گونہ حمد و ثناء اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر (یہ) کتاب نازل کی جس میں نہ کجی ہے نہ پیچیدگی، سیدھی اور سلیس ہے تاکہ خوفناک صورتحال نمودار ہونے کے نتائج سے آگاہ کرے۔

(کھف، 2، 1)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں فقرہ ولم يجعل له عوجا اپنے مفہوم میں مکمل تھا اسکے بعد قيما کہنے میں کیا مصلحت تھی کیونکہ جب کجی اور میزہا پن کی نفی ہوئی تو استقامت۔ خود بخود اسکے مفہوم میں شامل ہو گئی۔

### وجہ اعتراض

### قول فیصل

یہاں۔ ولم يجعل له عوجا کے مفہوم کو قيما سے مزید مؤکد بنایا گیا ہے تاکہ جن کے دل

ٹیزھے ہیں انہیں مزید احساس ہو کہ جس تناقض اور تضاد کی انہیں تلاش ہے وہ قرآن میں نہیں ہے اور فقروں میں تاکید پیدا کرنا اہل زبان کا شعار تھا۔



## دل مضبوط کرنے کا محاورہ

236

وربطنا علیٰ قلوبہم

(کف، 13)

ہم نے ان کے دلوں کو باندھ لیا۔

یہ ہے کہ یہاں ربط - کو دل کا وصف بنایا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ربط دل کی مضبوطی اور تقویت کا استعارہ ہے۔

قول فیصل



## حرفِ دُون کا استعمال کب اور کیسے؟

237

واتخذوا من دون الله آلهة ليكونوا لهم عزا. والذين اتخذوا من دونه اولياء  
ومالکم من دون الله من ولی ولا ناصر

میں کہا جاتا ہے کہ ان آیات میں دون کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔

وجہ اعتراض

ادبیاتِ عرب میں دون کے معنی غیر، علاوہ، دیوا کے ہیں جیسے کہتے ہیں لفلان مال دون هذا  
فلاں کے پاس اس کے علاوہ بھی مال ہے۔۔۔۔۔ یا جیسے فرمایا۔ ولهم اعمال من دون ذالك۔

قول فیصل

اس کے علاوہ بھی ان کے عمل ہیں (مؤمن، 64) اس بنا پر آیات کے معنی ہوں گے۔

I انہوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی خدا بنائے رکھا تاکہ ان کو عزت نصیب ہو۔

II یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے ماسوا بھی اولیا بنائے رکھے ہیں۔

III یاد رکھو اللہ کے ماسوا تمہارا نہ کوئی ولی ہے نہ حامی و ناصر۔



## قرآن میں ہر چیز کا ہونا کس معنی میں؟

238

ما - لہذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها

یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی بات کو مگر شمار میں لے آتی ہے۔ (کہف، 49)

یہ ہے کہ یہاں بڑے گناہوں اور چھوٹی کو تاہوں کو شمار میں لے آنے کا تذکرہ ہے جبکہ دوسرے

**وجہ اعتراض**

مقام پر فرمایا۔ ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ نکفر عنکم سبنا تکم

اگر تم بڑے گناہوں کے ارتکاب سے رک جاؤ تو دیگر کو تاہیاں معاف کر دی جائیں گی۔۔۔۔۔ (نساء، 30)

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آیہ زیر بحث میں گناہ کسی بھی سائز اور حجم کا ہو قابلِ معافی نہیں ہے مگر دوسری آیت میں ہے اگر بڑی برائیوں سے رک جاؤ تو چھوٹی برائیاں معاف کر دی جائیں گی۔

آیت کے پہلے حصہ میں فترے المجرمین مشفقین (مجرموں کو سہا ہوا پاؤ گے) یہاں مجرم

**قول فیصل**

سے مراد کافر ہیں اور دوسری آیت میں مجرم سے اہل ایمان مراد ہیں یعنی اہل ایمان اگر بڑے گناہ

شرک اور احکامِ الہی کی تکذیب سے رک جائیں گے تو ان کی چھوٹی لغزشیں نظر انداز کر دی جائیں گی۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ اعتراض ہو۔ شرک تو جہاں سے بھی اور جس سے بھی سرزد ہو معاف نہیں ہو سکتا۔ باقی لغزشیں معاف کرنے کا حاکم علی الاطلاق کو اختیار ہے۔ بلکہ بسا اوقات معاف کر دیا گناہ سے رک جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

☆

## انہیں پکارو اگر دادرسی کر سکتے ہیں تو۔۔۔۔۔

239

ویوم یقول نادوا شرکائی الذین زعمتم فأعوہم

جب انہیں کہا جائے گا کہ جنہیں تم نے شریک (خدا) بنا رکھا تھا انہیں بلاؤ (کہف، 59)۔۔۔۔۔ (وہ کہیں گے) وہ تو جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں بتوں کے کلام کی نفی کی گئی ہے جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا الیہم القول

**وجہ اعتراض**

انکم لکاذبون۔

وہ ان کے جواب میں کہیں گے تم جھوٹ بولتے ہو ہم نے تمہیں شرک کرنے کو نہیں کہا۔ (نحل، 86)

اس طرح ایک مقام پر بتوں کے کلام کرنے کی نفی اور دوسرے مقام پر اثبات کی خبر۔ کھلے تضاد کی متقاضی

ہے۔



**قول فیصل** آیہ زیر بحث میں ”امنام“ کے حاجت روائی سے عاجز آنے کی بات ہے اس طرح جواب دینے کی صلاحیت کی نفی کا بھی بیان ہے اور نحل میں زندہ امنام (مولوی، پنڈت، پیر اور نجومی) وغیرہ کی بات کرنے کا اشارہ ہے کہ وہ اپنے پجاریوں اور غلط پیروکاروں کے جواب میں کہیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو ہم نے تمہیں کبھی بھی شرک کا نہیں کہا۔

☆

## 240 صورت جب ناقابل برداشت ہو تو صبر کیسا؟

240

### قال انك لن تستطيع معي صبرا

(کہف، 67)

تم میرے ساتھ صبر کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

یہ ہے کہ فرض کرو انسان کی سوچ، عمل کے قالب میں نہیں ڈھل سکتی وہ اسکی تکمیل سے قاصر ہے تو ایسی صورت حال میں اس سے صبر کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟

**وجہ اعتراض**

آیہ زیر بحث میں لن تستطيع کا فعل نفی وارد ہے اور لن کی خاصیت یہ ہے کہ یہ جب فعل مضارع پر واقع ہو تو اسے مستقبل سے مربوط کر دیتا ہے۔ اب بات صاف ہو گئی کہ وہ سر دست صبر کی

**قول فیصل**

مقدرت نہیں رکھتا تو نہ اسی آگے چل کر ضرور رکھے گا اور یہی مفہوم مستجد فی انشاء اللہ صابرا سے بھی کشید ہوتا ہے اس کا مفہوم یہ کہ ---- انشاء اللہ آئندہ مجھے صابر پاؤ گے (کہف، 69) یہاں صبر کو میں نے عام مفہوم ہی میں استعمال کیا ہے ورنہ تو اس کے معنی وسیع ہیں۔ حالات کا مقابلہ کرنا صورت حال سے نمٹنا۔ مخالف سے پنجہ آزمائی کرنے کا مفہوم اس میں شامل ہے قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ حالات اگر دیگر گوں ہوں تو حوصلہ ہار کر بیٹھ جاؤ اور کچھ بھی نہ کرو۔ اسے وہ رہبانیت ٹھہراتا اور فرار کی دانستہ کوشش قرار دیتا ہے۔ ☆

## 241 امراً۔ کے معنی کیا ہیں؟

241

### لقد جئت شیئا امرا

(کہف، 7)

تم نے بچے کو قتل کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔

میں کہا گیا ہے کہ یہاں شینا امرا کہا ہے اور سفینہ غرق کرتے وقت شینا نکرا کہا ہے۔ اس طرح امرا اور نکرا میں کیا فرق ہے۔

**وجہ اعتراض**

امرا۔ کا لفظ۔ الف کے زیر کے ساتھ آیا ہے جسکے معنی نکرا۔ ہی کے ہیں یعنی امر منکر۔ یا فعل

**قول فیصل**

تنبیہ!

☆

## دیوار۔ جاندار نہیں ہے اسکا ارادہ کیسا؟

242

یرید ان ینقض

(کہف، 77)

دیوار گر اچاہتی تھی۔

یہ ہے کہ۔ ارادہ۔ ذی عقل مخلوق کا فعل ہے جلد اور بے جان شے ارادے، خواہش اور چاہت کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

وجہ اعتراض

یہاں۔ مجاز۔ کو سہارا بنایا گیا ہے۔ جیسے آہستہ بولو۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ان درود دیوار سے

پوچھو۔ یوں بھی عرب میں تو یہاں تک رواج تھا کہ معدوم کو موجود تصور کر کے بھی خطاب

کرتے تھے دیوار تو پھر بھی موجود چیز ہے غرض کہ وہ ذی عقل۔ کے الفاظ کو غیر ذی عقل کی طرف منسوب کر کے مجازاً مضاف الیہ کر دیتے تھے۔ شاعر کہتا ہے۔

یرید الرمح صدر ابی براء

و بعد لی عن دماء بنی عقیل

تیرا اور ابرام کے سینے میں پوست ہونے کا ارادہ رکھتا اور بنی عقیل کے خون ٹپکانے سے کریز کرتا ہے یہاں

ارادے۔ اور کریز کرنے کو تیر کا فعل قرار دیا ہے جبکہ تیر۔ جاندار یا ذی عقل چیز نہیں ہے۔ نیز فرمایا۔ ولما سکت عن

موسی الغضب۔ جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا (اعراف، 153)۔ یہاں غصہ کو ذی عقل شے سے تشبیہ دے کر "فرو"

ہونے کی اضافت کا استعمال کیا ہے۔ اسی طرح دیوار کا مائل بہ سقوط ہونا بھی مجازاً جائز ہے۔



## کسی کی بات کو وزن میں نہ لانا

243

فلا نقیم لهم یوم القيامة وزنا

(کہف، 106)

قیامت کے دن ان کا وزن ہی نہ ہوگا۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ میزان تو نصب ہوتی ہے کفار کے عملوں کو وزن کرنے کے لئے جبکہ ان کے

اعمال باطل ہونے کی وجہ سے زائل ہو جاتے ہیں اور زائل کا وزن عجیب مسئلہ ہے فرمایا۔ فجعلناہ

ہباء منشورا۔ اسنے جو عمل بھی کیا اسے غبار کی طرح بکھیر دیتے ہیں (غافر، 23)۔ اور ہبوء اس باریک غبار کو کہتے

ہیں جو ریزن دیوار سے یا روشندان سے سورج کی کرنوں کی وجہ سے نظر آتا ہے جو نہ پکڑ میں آسکتا ہے نہ اسکا وجود محسوس

وجہ اعتراض

کیا جاسکتا ہے۔ مقصد یہ کہ کفار کا غیر نافع عمل قابل وزن ہی نہ ہوگا۔

## قول فیصل

عمل کافر کا ہو یا مسلمان کا وہ اگر انسانیت کے مفاد اور نفع حشری سے ٹکراتا ہے تو سمندر کی جھاگ کی طرح لا وجود بن جاتا ہے (رعد، 19) جہاں تک وزن کرنے کی بات ہے تو محاورات عرب میں کسی کی بات کو وقعت، نہ دینے اور اہمیت کو گھٹانے کو بھی وزن میں نہ لانے کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہاں نہ ماویٰ ترازو کی بات ہوگی۔ نہ بھوں کی۔ وہ نپی تلی بات کرتا ہے وہ پہلے تو لٹا پھرتا ہے یہ سب محاورے ہیں ایسا کہیں بھی نہیں ہوا کہ کسی بات کو تولوں اور گراموں میں وزن کیا گیا ہو۔

☆

مریم

## اندر کی آواز پر۔ ندا۔ کا اطلاق

244

### اذا نادى ربه نداء خفيا

(مریم، 3)

جب انہوں نے اپنے پروردگار کو دل کی آواز سے پکارا۔

یہ ہے کہ ندا بلند آواز کو کہا جاتا ہے اس کی صفت خفیا لگانے سے مفہوم میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے

## وجہ اعتراض

کیونکہ خفیا دل کی آواز کو کہا جاتا ہے جو سماعت نہیں ہو سکتی۔

خفیا۔ یہاں ”وہیمی“ آواز کا استعارہ ہے اسی طرح نداء کا لفظ ”بلند آواز“ کی بجائے ”پکار“ محض

## قول فیصل

کے مفہوم میں ہے۔

☆

## عورت کی جانب وحی؟

245

### واو حینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ

(مریم، 16)

موسے کی والدہ کو دودھ پلانے کی وحی کر دی۔

یہ ہے کہ عورتوں کی جانب وحی نہیں ہوتی۔ اسکے باوصف بہت سے مقامات جہاں موسے کے چہنچہ

## وجہ اعتراض

کی بات ہوئی ام موسے کی طرف وحی کا اشارہ ہوا۔

یہاں ”وحی“ سے مراد فطرتِ اشیاء کی کارکردگی ہے۔ یوں تو شہد کی مکھی کو بھی وحی ہوئی ہے پس

## قول فیصل

اگر ایک لایعقل شئی کی طرف وحی ہو سکتی ہے تو ایک انسان خواہ عورت ہی کیوں نہ ہو اسکی طرف

کیوں نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں اور بہت سے مقامات پر ”وحی“ سے قابلِ زیست اشیاء کی ”فطرت“ مراد ہے جو اپنے معمول کے مطابق محو عمل ہیں۔ بچہ کو دودھ پلانا۔ ماں کی فطرت میں شامل ہے یہاں ام موسے کو اس نظر سے دودھ

پلانے کی وجہ ہوئی کہ۔ فرعون فیملی موئے کو متنبہ ہانے کا فیصلہ کر چکی تھی لہذا اب پرورش کا بار گراں تو شاہی خاندان والوں نے اٹھانا ہی تھا لیکن دودھ پلانے کا مسئلہ ابھی حل طلب تھا کیونکہ اندیشہ تھا کہ موئے جس عورت کا دودھ قبول فرمادیں اس پر مصائب اور آفات کا نزول شروع ہو لیکن اس اندیشہ اور واہمہ کو وحی کے ذریعہ قلب ام موئے سے زائل کر کے اسے سمجھا دیا گیا کہ وہ ”مرضعہ“ (دودھ پلانے والی) کی تلاش میں آپ کے دروازے پر بھی دستک دیئے جائیں گے۔ آپ بے خطر ہو کر یہ ذمہ داری قبول کر لیں۔ اب رہی یہ بات کہ عورت کی طرف وحی نہ ہونی چاہیے تو یہ قرآن کا مسئلہ نہیں ہے خاص کر وحی کے معنی ان فطری صلاحیتوں کو ودیعت کرنے کے بھی ہیں جو عام طور پر حیمنس انسانوں کو حاصل رہتی ہیں اور کچھ ضروری نہیں کہ وہ رسول بھی ہوں کیونکہ وحی رسالت کی نوعیت مختلف ہے والدہ مسیحؑ سے بھی کہا گیا تھا وہنزی الیک بجزع المخلۃ (کھجور کے تنے کو ہلاؤ تا نہ کھجوریں گریں گی)۔



## بغیا۔ کی بجائے بغیۃ ہونا چاہیے

296

### ولم اک بغیا

(مریم، 19)

اور نہ میں بدکار ہوں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں۔ نسوانی عمل کی مناسبت سے ولم اک بغیۃ ہونا چاہیے تھا۔ متکلم کا موجودہ صیغہ مشترک ہے جبکہ بغیۃ سے جنس متکلم کی تخصیص ہو سکتی تھی۔

### وجه اعتراض

عربی اوصاف جو صرف عورتوں سے خاص ہیں اسے کلام کے سیاق میں اہل زبان مردانہ سیغے میں استعمال کر سکتے ہیں یہاں چونکہ سیدہ مریمؑ کو بتائے تشبیہ کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لہذا آپ نے متکلم کا

### قول فیصل

مشترک صیغہ استعمال کر کے تہمت کی ذمہ داری سے انکار کیا اس طرح بات چونکہ ایک عورت سے متعلق ہو رہی تھی لہذا کچھ ایہام نہ ہو سکتا تھا کہ یہ متکلم کوئی مرد بھی ہو سکتا ہے۔ عربی میں اسکی مثالیں بشرات ملتی ہیں مثلاً حیض مردوں کو نہیں آتا لہذا امرأۃ حائضہ کہنے کی بجائے حائض کہنے میں نہ فنی سقم ہے نہ لسانی کج بیانی۔ اسی طرح بغیا۔ عام طور پر فحش کے مفہوم میں استعمال ہو کر عورت کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے لہذا کسی بھی فاسق و فاجر مرد کو بغیا نہیں کہا گیا۔ مرد اگر حشفہ لینے کا عادی ہے تو بھی رجل بغیا۔ کہنے کی بجائے۔ رجل مأبون۔ یا۔ رجل آبن کہا جائے گا۔



## اضطراب اور بے چینی کے بول

247

يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَنْسِيًّا

کاش آج میں زندہ نہ ہوتی بھلاوی جانے والیوں میں سے ہوتی۔ (مریم، 22)

یہ ہے کہ سیدہ مریم کی بے چینی، اضطراب اور پریشانی کس باعث تھی؟ ایام وضع میں ماکول و مشروب کے نہ ہونے کے سبب یا غلط کاری کی تہمت کی وجہ سے؟

## وجه اعتراض

غلط کاری کی تہمت یہودیوں نے نہیں لگائی۔ یہ ہمارے سنیوں کی تراوشِ فکر کا شاخسانہ ہے۔ البتہ فقہانِ طعام کی بات ہو سکتی ہے کہ۔ وھزی الیک بجوز النخلة۔ کے قرینے سے صرف یہی

## قول فیصل

معنی ہی موزوں ہو سکتے ہیں یعنی کھجور کے تنے کو جھینکے دو تازہ کھجوریں گریں گی جن کو کھالیں۔



جب وہ یہ تھا اب جواں ہے تب بات مشکل تھی اب ہوگی

248

من كان في المهد صبيا

جو کل تک مہمہ کا پیروہ چکا ہے اس سے بات کیسے کریں (یہ تو ہماری شان کے خلاف ہے)۔ (مریم، 29)

میں کہا جاتا ہے کہ۔۔۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی کہ مہر کے بچے سہا نہیں ہو سکتی۔

## وجه اعتراض

یہاں کان کا فعل برائے ماضی ہے یہود کے احبار و رہبان جس پندار میں دھت ہو کر مسیح کو منہ لگانا نہیں چاہتے تھے ان کو اپنے دلم کے بگھمنڈ کے علاوہ اپنی عمر کا پندار بھی تھا کہ ۔ ہم علم اور عمر

## قول فیصل

میں بزرگ ہو کر مسیح جیسے کم عمر اور ابھی تک گود میں رہنے والے بچے سے کلام کریں یہ تو ہمارے لئے ذوب مرنے کا مقام ہے۔ غرض کہ مسیح بالکل ہی پنگوڑے کے بچے نہیں تھے جب احکام ملے تو ”مراہتی“ تھے۔

(ملاحظہ ہو یہاں القرآن)



مسیح نے اس وقت کلام کرنا شروع کیا جب احکام مل چکے تھے

249

و اوصاني بالصلوة والزكاة ما دمت حيا

(مریم، 31)

مجھے صلاۃ و زکوٰۃ کا عمر بھر کے لئے حکم دیا گیا ہے۔



**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ صلاۃ و زکوٰۃ یعنی بدنی اور مالی احکام ٹکٹن میں، نہیں ملتے۔

**قول فیصل** سورہ مریمؑ میں حضرت حجیہ کے بارے میں فرمایا۔ و آتیناہ الحکم صبیحا (ہم نے حجیہ کو ٹکٹن ہی میں نبوت سے سرفراز فرمایا تھا) (مریم، 11)۔۔۔۔۔ اسی طرح اسی فیصلی کے دوسرے فرد سیدنا عیسیٰؑ کو بھی ٹکٹن ہی میں تاج نبوت پہنایا گیا جس سے یہودیوں میں طیش و اضطراب پھیل گیا اور کم عمری کی نبوتوں سے ”بدکنے“ لگے۔ چالیس سال نبوت کا نصاب نہیں ہے اس پر بھی اسی، نوے سال کے عمر رسیدہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ توکل کے بچے تھے اب لگے ہیں یہودیوں سے باقیں کرنے۔ ☆

## 250 استغفار کا ایک مفہوم

### سا استغفر لك ربی

(مریم، 47) میں جلد ہی اللہ سے تمہاری مغفرت کی کوشش کروں گا۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ استغفار کسی کافر کے لئے روا نہیں ہے لیکن سیدنا ابراہیمؑ نے ایک ناروا عمل کے لئے باپ سے وعدہ کیوں کیا؟

**قول فیصل** یہاں استغفار سے دست سوال دراز کرنا مراد ہے یعنی دعا کرنی ہے کہ اللہ اسے ایمان اور اسلام قبول کرنے کی توفیق نصیب کرے۔ ☆

## 251 طور پر تجلیات ربانی۔ دائیں یا بائیں؟

### من جانب الطور الایمن

(مریم، 53) طور کے داہنی جانب۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ طور ایک پہاڑ ہے جس کا نہ داہنا ہے نہ بائیں۔

**قول فیصل** عرب اپنے خاص ”مذاق“ کے مطابق محاورات کو جنم دیتے تھے مثلاً وہ جب یمین القبلة و شمالہا کہتے تو اس سے روشن کستریٰ مراد لیتے تھے کیونکہ قبلہ کے ہاتھ نہیں ہوتے تاکہ اسکا

دایاں اور بایاں ہاتھ کہا جاسکے۔ خاص کر یہاں۔ یمن۔۔۔۔۔ شمال کے مقابل والا یمن، نہیں ہے یمن سے ماخوذ ہے اور مبالغہ کے طور پر یمن کے وزن پر ہے جسکے معنی ڈھیر ساری برکتوں کے ہیں۔ اس طرح مفہوم ہوگا۔ طور کے برکتوں والے اطراف سے۔



## معاصر نبی صرف معاون ہوتا ہے

252

ووهبنا له من رحمتنا اخاه هرون نبيا

(مریم، 53)

ہم نے اپنی خاص عنایت سے اسے نبی ہارون معاون بنادیا۔

میں کہا جاتا ہے ہبہ کا لفظ اولاد عطا کرنے کے بھی ہیں جبکہ ہارون نہ صرف موسیٰ کی اولاد میں سے نہیں تھے عمر میں بھی بڑے تھے۔

وجہ اعتراض

یہاں وھبنا۔۔۔۔۔ ساتھ، معاون، حامی اور دست راست بنادینے کے مفہوم میں ہے۔

قول فیصل



## وعدہ الہی پورا ہی ہوتا ہے

253

انه، كان وعده مأتيا

(مریم، 61)

بلاشبہ اس کا وعدہ پورا ہونے والا ہوتا ہے۔

یہ ہے کہ یہاں مأتیا کی جگہ پر آتیا ہونا چاہیے تھا۔ جیسے فرمایا۔ ان ماتو عدون لآت (انعام،

وجہ اعتراض

(134)

یہاں مأتیا اگرچہ مفعول ہے لیکن فاعل کے مقام پر استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کہیں مفعول فاعل

قول فیصل

کے اور کہیں فاعل مفعول کے مقام پر آتا ہی رہتا ہے جیسے فرمایا حجابا مستورا (اسراء، 45)

یہاں مستور اگرچہ اسم مفعول ہے مگر ساتھ کے معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح مریم (51) میں مأتیا کے معنی آتیا کے



ہیں۔

## جہنم کا سامنا ضرور ہوگا

254

وان منكم الاورادها

(مریم، 71)

تم میں سے کوئی نہ ہوگا جو اسکیں داخل نہ ہو۔

میں کہا جاتا ہے کہ قیامت میں مؤمن ایک بار جہنم میں ضرور داخل ہوں گے اسکے بعد نجات کا مرحلہ آئے گا کیونکہ ان گے بعد۔ الا۔ کا حرف بات کو حتمی اور یقینی سطح کا بناتا ہے۔

**وجہ اعتراض**

وارد۔ کا لفظ لازمی حد تک دخول کا موجب نہیں بن سکتا اسکے معنی مقام مقررہ تک پہنچنے، قریب ہونے اور کسی چیز کا سامنا کرنے کے ہیں فرمایا۔ ولما ورد ماء مدین۔ موسے جب مدائن کے

**قول فیصل**

کنویں کے قریب پہنچایا کنویں تک پہنچا (قصص، 22) اب اسکے معنی ورد۔ کے بے قید مفہوم کی رو سے یہ نہیں ہوں گے کہ موسے جب مدائن کے کنویں میں گر گئے۔ یا اتر گئے۔ کیونکہ یہ مفہوم متنازع کا مقصود ہی نہیں ہے۔ اس مفہوم کے علاوہ ایک مفہوم یوں بھی ادا ہو سکتا ہے کہ جو شخص راہ سے آگاہ ہو اور قافلے اور مویشیوں کو گھاٹ یا پتھر پر لے آیا ہو وہ بھی وارد ہے۔ لیکن اس مفہوم میں ہمیں کہ وہ پانی میں داخل ہو کر ڈبچیاں کھا رہا ہے۔



## شیطانوں پر۔ رسالت کا اطلاق

255

الم ترانا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین تؤزہم ازا

تم نے غور نہیں کیا کہ ہم شیطان کو کافروں کے پاس روانہ کرتے ہیں جو انہیں چھیڑتے ہیں۔ (مریم، 63)

یہ ہے کہ شیطان جو کفار کو کفر پر برا بھلا کہتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس طرح ایک تو شیطانوں کو رسول کہا گیا ہے۔ نیز کفر پر برا بھلا کہنے والے رکھنا۔ فعل خداوندی کہا گیا ہے۔

**وجہ اعتراض**

یہاں رسالت کو لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے جسکے معنی صرف، ”چھوڑ دینے“ کے ہیں جو لوگ

**قول فیصل**

کسی کو ڈرانے یا پیچھا کرنے کے لئے کسی پر کتے چھوڑ دیتے ہیں اسے عربی میں۔ انہ ارسل کلبہ

علی الناس۔ کہتے ہیں یعنی اس نے لوگوں پر کتا چھوڑ دیا۔ (ہمدانی، صفحہ 467)۔ نیز اہل زبان سے ایک یہ محاورہ بھی نقل

ہے کہ بادشاہ نے فوج کو لوگوں پر لوٹ مار کے لئے چھوڑ رکھا ہے انہ قد ارسلہم علی الناس۔

بادشاہ نے رہزنی کے لئے فوج کو چھوڑ رکھا ہے۔ (متشابهات القرآن صفحہ 467)

اس طرح یہ آیت اس زاویہ سے بحث کرتی ہے کہ اگر وہ خود ہی شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ دیتے تو شیطانوں کو

ذکر کر دینے سے کیا فائدہ؟ جبکہ یہاں ارسل۔ کے لفظ کو علی کے حرف سے متعدی بنایا گیا ہے جو ہمارے ہی مفہوم کا

مقتاضی ہے۔ اگر الی الکافرین۔ ہو تا تو وجہ اعتراض جائز ہو سکتی لیکن علی نے بات صاف کر دی کہ اللہ نے شیطان کے

عمل میں رکاوٹ پیدا نہیں کی آزاد ”چھوڑ دیا“۔



## ”فعل“ موجود ”فاعل“ غائب

256

فالقی السحرة سجدا

(طہ، 70)

تب ساحر لوگ مجھ سے میں گر پڑے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں اللہ سبحانہ نے خود ہی انہیں مجھ سے میں گرادیا۔

### قول فیصل

القی فعل ہے مگر اس کا فاعل ذکر نہیں ہوا۔ اب کسی قاعدے قانون کا سارا لئے بغیر خدائے لایزال کو موردِ طعن نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔ اب لامحالہ فاعل ان ساحروں ہی کو تسلیم کرنا پڑے گا جو اپنے منصوبے میں ناکام ہونے پر مجھ سے میں گر گئے اور۔ ربِ موسیٰ و فرعون پر ایمان لے آئے۔

☆

## چیز سامنے ہے۔ پوچھنا کہ کیا ہے؟

257

وما تلتک بيمينک يا موسىٰ

(طہ، 17)

موسے تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

### وجہ اعتراض

یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ جانتے تھے کہ موسے کے ہاتھ میں ”عصا“ ہے تو ایسے میں دانستہ پوچھنا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کیا یہ تجاہلِ عارفانہ ہے یا مخاطب کو چڑانا ہے؟

### قول فیصل

نہ تجاہلِ عارفانہ ہے اور نہ مخاطب کو چڑانے کی بات۔ لسانیات کے ایک رائج طریقہٴ مخاطب میں بات کی گئی ہے جیسے کسی بچے کے ہاتھ میں سیب ہو اور کوئی مونچھوں والا۔ ہڈ بیت آدمی اس سے دریافت کرے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اسکے ہاتھ میں کیا ہے مگر بچے کی حاضر دماغی کی گہرائی کا اندازہ کرنے کے لئے سوال کر ڈالتا ہے۔ اسی طرح سوال موسے سے بھی ہوا تھا۔ اب ہو سکتا ہے کہ لاٹھی کے ”ذو جت“ مقاصد کے پیش نظر موسے کے اندر چھپے ہوئے موسے نے سوال کیا ہو۔ پھر اندر ہی سے جواب ملا ہو کہ یہ تو لاٹھی ہے جس سے فلاں فلاں کام لیا جاسکتا ہے۔ سانپ نہیں ہے۔ اس طرح سائل بھی موسے تھے اور مسئول بھی موسے۔ اندر کے موسے پوچھتے ہیں اور اندر کے موسے جواب دیتے ہیں اس طرح تجاہلِ عارفانہ۔ نہ اللہ سے صادر ہوا۔ نہ مخاطب کو چڑانے کا

## کلام میں "صوتی" ردیف کی رعایت

258

### قالوا آمنا برب هارون و موسى

(ط، 70)

انہوں نے کہا ہم "رب" ہارون و موسیٰ پر ایمان لائے۔

### وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ ہارون، موسیٰ کے وزیر اور تابع فرمان تھے اُسے بعد میں آنا چاہیے تھا لیکن یہاں رتبے کی رعایت نہیں کی گئی۔

### قول فیصل

کلام مسجع و مقفے کا اپنا مزاج ہوتا ہے اس میں ہر فقرے کے آخری لفظ کی صوتی مناسبت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہاں ط کی ہر آیت کے اختتام پر "آ" کا آہنگ اسی مزاج کی غمازی کرتا ہے اسے

شاعری کی اصطلاح میں "ردیف" بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر بیت کے پہلے مصرعہ کے آخری لفظ کے وزن اور آواز میں دوسرے مصرعہ کے آخری لفظ کو لے آنا۔ اب قرآن شاعری تو نہیں ہے تاہم اس نے اصنافِ سخن کی نفی بھی نہیں کی۔ کہ صوتیات کو حسنِ کلام کے لئے کام میں لایا جاتا رہا ہے۔ کلام مسجع اور مقفے بھی اصنافِ سخن کی اہم صنف ہے اسے قرآن محکم کہیں، کہیں ذکر میں لے آتا ہے مثلاً سورہ طہ کی 137 چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں الا ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ اور ہر آیت کا اختتام آ کے آہنگ پر ہوتا ہے جیسے تشفیٰ۔۔۔۔۔ علے۔۔۔۔۔ استوی۔۔۔۔۔ تحت الثرے۔۔۔۔۔ اخفی۔۔۔۔۔ اسماء الحسنیٰ۔۔۔۔۔ ہدیٰ۔۔۔۔۔ طومے۔۔۔۔۔ لما یوحیٰ۔۔۔۔۔ بما نسیٰ۔۔۔۔۔ فتولے۔۔۔۔۔ مارب آخرے۔۔۔۔۔ میرتھا الاولے۔۔۔۔۔ اور آیتنا الکبرے۔۔۔۔۔ لہذا اس آہنگ کے تناظر میں ہارون کا ذکر پہلے ہوا اور آخر میں "آ" کی صوتی رعایت کو ملحوظ رکھ کر فرمایا۔ موسیٰ۔۔۔۔۔ اور یہ ادبیات کی اس نوع کا نہ صرف طہ میں اعادہ ہوا ہے۔ بہت سی دیگر سورتوں میں بھی اس کا اعادہ ہوا ہے۔ انا عطیناک الکوثر۔۔۔۔۔ فصل لربک وانحر۔۔۔۔۔ ان شانک ہوالابتر۔۔۔۔۔ والنجم اذاہومے۔۔۔۔۔ ماضل صاحبکم وماغومے۔۔۔۔۔ وماینطق عن الہومے۔۔۔۔۔ ان ہوالادحی یوحیٰ

اسی طرح النجم کی 57- آیات اسی نچ سے اختتام کو پہنچیں اور آخر کی آیات کے لئے صوتی ردیف مختلف ہو گئی پھر

☆

اسی پر سورہ ختم ہو گیا۔

## اسرائیلی کیسے گمراہ ہو گئے

259

### فانا قد فتننا قومک من بعدک

(ط، 85)

ہم نے تیری غیر موجودگی میں تیری قوم کو ضلالت اور کفر کے فتنے میں ڈال دیا۔



**وجہ اعتراض** اسرائیلیوں کی ہتھیار پرستی کے شرک کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

**قول فیصل** کچھ ضروری نہیں کہ فتنہ سے شرک اور ہتھیار پرستی کی ابتلا مراد ہو۔ کیونکہ ساتھ ہی وضاحت فرمادی کہ واضلہم السامری۔ انہیں سامری نے گمراہ کیا اور اسی نے ہتھیار پرستی پر لگا دیا (طہ، 66)۔ بات صاف ہو گئی کہ فتنہ کو شرک اور کفر کے مترادف نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

☆

## انقلاب۔ جو اونچ نیچ ختم کر دے

260

لا ترے فیہا عوجا ولا امتا

(طہ، 107) وہ دن جس میں نہ ٹیڑھا پن (اور پستی) دیکھو گے اور نہ بلندی (اور سرکشی)۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ اس کا اشارہ یوم قیامت کی طرف ہے جس میں نہ معلوم ہم پرید حواسی اور ہولناکی کی کیا کیفیت طاری ہوگی اور ہم اونچ نیچ کا اور اک کر سکیں گے یا نہیں؟

قول فیصل یہاں یوم کا لفظ نکرے کے مقام پر آیا ہے جسے کھینچ تان کر معرفہ بنانے کا تکلف بے جواز ہے۔ کیونکہ یہاں ماضی کے فراعنہ اور حال کے قوم موئے کے متکبر و جاہل سرمایہ داروں کا ذکر ہے عربی

میں جبال بڑے لوگوں کو کہا جاتا ہے یہ نہ صرف ”استعارہ“ ہے۔ ”محاورہ“ بھی ہے۔ اسی طرح واضح کرنا بیہ مقصود تھا کہ۔ ”انقلاب“ کے وقت کوئی بھی بڑا اور سرکش ہوگا تو اللہ اسے اکھاڑ پھینکے گا۔ اب ذہنی سطح ایسی ہموار ہوگی کہ نہ فراعنہ اور یہودی سرمایہ داروں کی ”اونچ“ رہے گی نہ ماضی کے اسرائیلی غلاموں کی ”نیچ“۔ سب قانون الہی و قانون موئے کے آگے دلی آواز میں ہوں گے۔ کہ ہر انقلاب کے بعد یہی صورت حال نمودار ہو جاتی ہے کہ سب انسان مساوی ہو جاتے ہیں۔ انقلاب سے مراد ہم جو فوجیوں کا انقلاب نہیں ہے۔ ☆

## انسان اول۔ کی۔ لغزشیں

261

وعصی آدم ربہ فغوی

(طہ، 121)

آدم نے رب سے عصیان کیا اور راستے سے بھٹک گیا۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ یہاں آدم پر عصیان اور غمے کا اطلاق ہوا ہے جبکہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔

**قول فیصل** یہاں آدم سے مراد۔ نوع انسانی ہے۔ تاہم رائج مفہوم کو اگر ملحوظ رکھا جائے تب بھی عصی آدم۔ کی ترکیب میں تبدیلی پیدا کر کے۔ کان آدم عاصیا۔ کناروانہ ہوگا۔ کیونکہ فعل کے اطلاق سے فاعل کے نام کا استدلال جائز نہیں ہے آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ۔ تبارك الله۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے۔ الله تبارك۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قیام الله علیہ آدم لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ الله تائب۔ کیونکہ اللہ تائب کہنے سے معاذ اللہ۔ اللہ سبحانہ ایک مجرم کے روپ میں مذکور ہوں گے۔ یہ مثالیں وہ لوگ سمجھ سکیں گے جو عربی زبان کی لطافتوں، گہرائی اور گیرائی کا ادراک رکھتے ہوں گے۔



## کیا گناہ روزی کو گھٹاتے ہیں؟

262

**من اعرض عن ذکرى فان له معيشتة ضنكا**

(طہ، 124)

جو میرے ذکر سے اعراض کرتا ہے اسکی روزی تک ہو جاتی ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ آیہ زیر بحث کی رو سے گناہوں سے روزی کم ہو جاتی ہے جس سے اللہ کا

**وجہ اعتراض** "بلا امتیاز" روزی رسائی کا قانون "مفلوج" ہو جاتا ہے۔

یہاں قرآن نے کسب معاش کا جو قانون بنایا ہے اس کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے میرے

**قول فیصل**

"قانون معیشت" سے اعراض کیا اور دیگر ناجائز ذرائع معیشت کا سہارا لیا اب خواہ لاکھوں کروڑوں

کمائے ہوں وہ سب کے سب ناجائز اور حرام کی کمائی کا حاصل ہوں گے۔ ضنك ایسی دولت کو کہتے ہیں جو ناجائز ذرائع سے

حاصل کی گئی ہو اور جائز ذریعہ قرآن کے نزدیک یہ ہے کہ قانون خدا (ذکری) کے مطابق حاصل کیا گیا ہو۔ تفصیل برہان



القرآن میں ملاحظہ ہوں۔

## جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ حق پر کون ہے؟

263

**فستعلمون من اصحاب الصراط السوی ومن اهتدی**

(طہ، 136)

تمہیں جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ کون سیدھے راستے پر ہے اور کون ہدایت یافتہ؟

یہ ہے کہ سیدھا راستہ (صراط السوی)۔ اور "ہدایت" ایک ہی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں

**وجہ اعتراض**

دہرانے میں کیا مصلحت ہے۔

صراط السوی۔ سے وہ لوگ مراد ہیں جو خدا کے قانون پر چلنے کے آرزو مند اور طالب منزل ہیں۔ اور من اہندی۔ سے وہ لوگ مراد ہیں جو منزل پا چکے ہیں۔

## قول فیصل

☆

انبیاء

جو حساب لیا گیا اس سے مراد فتح مکہ ہے

264

## اقترب للناس حسابہم

قریب کے دنوں میں ان سے (کفر و زیادتی کا) حساب لیا گیا جبکہ وہ غفلت کی اونگھ رہے تھے۔ (انبیاء، 1)

میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے ہزاروں برس تک تو یوم الحساب کا پتہ نہ چل سکا حالانکہ

وجہ اعتراض فعل اقترَب میں تھوڑے ہی عرصے میں حساب لینے کا اشارہ دیا گیا ہے اتنا لمبادقتہ تو اقترَب کے مفہوم میں شامل ہی نہ ہو سکتا تھا۔

یہاں اقترَب، فعل ماضی کا صیغہ ہے بلاشبہ اگر قرینہ ہو تو مستقبل کے مفہوم میں بھی لایا جاسکتا ہے

## قول فیصل

بلا قرینہ اسے کھینچ تان کر مضارع میں لے آنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہاں فتح مکہ و طائف میں نہ

صرف ان پر حساب کا دن آچکا تھا جنگ بدر اور خیبر کی لڑائیوں میں ان سے انسانی حساب بھی چکایا جا چکا تھا۔ یعنی بات منہ سے نکلی اور ایک سال کے اندر اندر پوری ہو گئی۔ یہ علاوہ اس کے کہ سقوط فارس نے اس حقیقت کو مزید آشکارا کر دیا کہ آتش پرستوں کا یوم حساب بھی رسول کے رسولوں کے ہاتھوں پورا ہو چکا تھا۔

☆

ذکر۔ کا اطلاق۔ حدیثوں پر؟

265

## مآیاتیہم من ذکر من ربہم محدث

ان کے پاس جب کبھی ذکر محدث آتا ہے۔ (انبیاء، 2)

یہ ہے کہ۔ یہاں ذکر۔ محدث سے مراد محدث رسول ہے ورنہ تو قرآن کو ”حادث“ کہنا پڑے گا جو

## وجہ اعتراض

سب سے بڑا پایا ہے۔

احادیث کو ”ذکر“ سے موصوم نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں ”ذکر“ کو من ربہم سے مربوط اور

## قول فیصل

منسوب کیا گیا ہے جو اس ”واہمہ“ کو قطعی لہجہ میں مسترد کئے دیتا ہے کہ اس سے مراد حدیثیں

ہیں۔ کیونکہ حدیثیں انسانی تراوش فکر کا نتیجہ ہیں ان پر من دبہم کا اطلاق کسی بھی زلویہ اور جہت سے نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ بات کہ آیہ کریمہ میں ذکر کے ساتھ من کا حرف لگا ہوا ہے جو سارے قرآن کی قرآنیت کو محدود کر دیتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ذکر وہ بھی ہے جو احادیث کے رنگ میں موجود حاضر ہے لیکن یہاں یہ نظر انداز نہ کیجئے کہ آپ کا اصل ہدف قرآن کو حدوث کے دائرے سے نکالنا ہے اسکے لئے آپ نے احادیث کو آغوش پناہ میں لے کر اپنی طرف سے ایک استدلال سا پیش کیا ہے جبکہ یہ استدلال سراسر مفلوج ہے اور اس پر من دبہم کی چھاپ لگ ہی نہیں سکتی۔



## سرگوشی اور پوشیدہ؟

266

### واسروا النجوی

اور انہوں نے سرگوشی کو پوشیدہ رکھا۔ (انبیاء، 3)

میں کہا جاتا ہے کہ النجوی خود بھی ”رازدارانہ بات“ کو کہا جاتا ہے ایسے میں اسے ”پوشیدگی“ کے فعل سے واضح کرنے میں کیا مصلحت نہاں ہے؟

وجہ اعتراض

سرگوشی کو مبالغہ کی حد تک پوشیدہ رکھنے کے لئے اسروا کو ردیف بنایا گیا تاکہ بات زیادہ پر اسرار بن کر مطلوبہ مبالغہ کا تقاضا پورا کر سکے۔ قرآن میں اسکی بھڑت مثالیں موجود ہیں۔

قول فیصل



## رویت = سے کیا مراد ہے

267

### اولم یرو

کیا وہ دیکھتے نہیں۔ (انبیاء، 30)

یہ ہے کہ آیت کی ابتدا۔ اولم یرو۔ سے کی گئی ہے جسکے معنی ہیں کیا یہ دیکھتے نہیں۔ حالانکہ جن اشیاء کو دیکھنے کا اشارہ ہے وہ ہماری ”دید“ کے احاطے میں نہیں آ سکتیں۔

وجہ اعتراض

کچھ ضروری نہیں کہ رویت کو ان آنکھوں سے دیکھنے سے مربوط کیا جائے۔ علم و بصیرت اور سائنس کی آنکھ سے دیکھنے کو بھی قرآن نے رویت کے پیرائے میں میان فرمایا ہے۔

قول فیصل

## انسان اول ہوا مسیح ہوں ضابطہ تخلیق سب کے لئے یکساں ہے

268

## وجعلنا من الماء كل شيء حي

(انبیاء، 30)

ہم نے ہر شئی کو پانی ہی سے زندگی عطا کی ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہر شئی کو پانی سے زندگی فراہم ہوئی ہے تو مشاہدہ اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ کیونکہ فرشتے اور جن۔ نور اور نار سے پیدا ہوئے ہیں۔ جس سے ضابطہ تخلیق بدل جاتا ہے۔

وجہ اعتراض

قول فیصل

یہاں کل کا حرف ”عوض“ کے مفہوم میں آیا ہے جس سے ہر وہ جاندار مراد ہے جو ماء سے پیدا ہوا۔ یہاں ماء سے مراد قطرہ منی ہے۔ اور قرآن نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو غیر مبہم

طور پر دہرایا ہے۔ اب پھر آپ کی سطح ذہن پر سوال ابھرے گا کہ آدم اور شیخ: قطرہ منی سے پیدا نہیں ہوئے۔ لیکن یہاں پھر ان کی سوچ کا زاویہ۔ کج نگہی کا شکار ہو گیا ہے اور قرآن ان کا رستہ پوری توانائی سے روک دیتا ہے فرمایا فلینظر الانسان مم خلق خلق من ماء دافق۔

انسان سوچے کہ اسکی تخلیق کس سے ہوئی ہے اسکی تخلیق پیٹھ اور سینے کے اچھلتے ہوئے پانی سے ہوئی ہے۔ (طارق، 6) یہاں۔ الانسان۔ پر الف و لام جنس کا ہے جس سے تمام نوع انسانی مراد ہے جس میں انسان اول اور مسیح بھی شامل ہیں۔ یعنی ماء دافق (قطرہ منی) کا ضابطہ ان پر بھی لاگو ہے۔ یہاں سوالیہ لہجہ میں بات کر کے پھر خود ہی جواب مرحمت فرما کر تمام شکوک و شبہات کے سوتے بند کر دیئے ہیں۔ رہی فرشتوں یعنی کائناتی قوتوں کی تخلیق کی بات تو اس کی تفصیل میں جانے کی زحمت نہ فرمائیے۔ بلاشبہ ابلیس اور جن کی تخلیق نار سے ہوئی مگر ایک تو یہاں نار ان کے آتشیں اور تخریبی مزاج کا استعارہ ہے۔ نار کسی تخلیقی مادہ کا نام نہیں ہے جبکہ جنوں کو رائج مفہوم میں تسلیم کرنے والے جنات میں نرودادہ۔ کا وجود بھی مانتے ہیں تو وہ بتلا سکتے ہیں کہ قرآن میں کس مقام پر نار۔ کو قطرہ منی سے موسوم کیا گیا ہے۔



جلد۔ بازی انسانی مزاج کا خاصہ ہے

269

## خلق الانسان من عجل

(انبیاء، 37)

انسان عجلت سے پیدا ہوا ہے۔

یہ ہے کہ یہاں جلد بازی (عجل) کو ایک عنصر کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی فلاستعجلون جلد بازی سے کام نہ لیں، کا حکم دیا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

جلد بازی کسی عنصر کا نام نہیں ہے لیکن انسان جب کسی معاملہ میں حد سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے مثلاً کھیل کود سے زیادہ شغف رکھتا ہے تو اسے کھلنڈرا کہا جاتا ہے اسی طرح کوئی نیکی کو شیعہ

قول فیصل



ہا لیتا ہے تو کہتے ہیں شرافت کا ”پتلہ“ ہے تو ایسے محاورات کا مطلب یہ نہیں لیا جاتا کہ رکھیل۔ یا۔ نیکی کسی کے طبعی عناصر ہیں؟

کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ انسانی تخلیق کے مراحل کچھ باقی تھے کہ وہ ظہور میں آگیا۔ یعنی جلدی تخلیقی سلسلہ میں داخل ہو گیا۔ اس پر میرا تو کوئی اعتراض نہیں لیکن قرآن اسے جلدی سے موموم نہیں کرتا دھر سائنس بھی اسکی تصدیق کرتی ہے کہ انسان کو کیچڑ دار مٹی سے پیدا کیا اس طرح کروڑوں برس تک یہ حالت قائم رہی پھر اس کیچڑ میں جرثومہ حیات رکھ دیا گیا اسی طرح کروڑوں برس کے مزید مراحل گزر گئے پھر اس جرثومے میں نرمادہ کی صلاحیت رکھی۔ اس طرح جب انسان وجود میں آیا تو کروڑہا در کروڑہا سال اسی پر گزر چکے تھے۔ تب جا کر موجودہ صورت میں نوع انسانی شکل ہوئی اور اس تشکیل کو بھی پندرہ کھرب سال ہو چکے ہیں۔ اب جو چیز کھربہا سال کے تغیر و تبدل کے بعد وجود میں آئی اسے آپ عجلت کی تخلیق کہیں طرفہ تماشہ ہے۔

☆

## لاشوں کے کان نہیں ہوتے

270

ولا يسمع الصم الدعاء اذا ما يندرون

(انبیاء، 45)

بہرے لوگ جب انذار کے لئے بلائے جاتے ہیں تو سن نہیں پاتے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ بہرے اگر انذار نہیں سن پاتے تو نوید اور خوشخبری کیوں کر سن سکیں گے؟

یہاں الصم میں الف لام ”عمد“ کا ہے یعنی وہ بہرے جو سنی ان سنی کر دیتے ہیں!!

قول فیصل

☆

## بتوں کی خدائی داؤ۔ پر لگ گئی

271

بل فعلہ کبیر ہم هذا۔ فاسئلو ہم ان کانوا ينطقون

بلکہ ان کی گت ان کے بڑے نے بنائی ہے۔ اگر یہ بات کر سکتے ہیں تو ان سے دریافت کر لو۔ (انبیاء، 63)

یہ ہے کہ لہذا ہم نے غلط بیانی سے کام لے کر اپنے کام کو اضماع کے کام سے موموم کیا ہے جو ایک نبی کی شان سے بعید ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں وقف اشارہ ہذا پر ہے یعنی ہاں اس بڑے ہی نے ان کی گت بنائی ہے۔۔۔۔۔ اگر یہ بات

قول فیصل

کر سکتے ہیں تو ان سے تصدیق کرالو۔ فرمائیے اس میں اعتراض کی بات کیا ہے اور لہذا ایٹم نے کون سی غلط بیانی فرمائی ہے؟



آگ ہوش و خرد سے عاری ہے اس سے خطاب کیسے؟

272

قلنا یا نار کونی بردا وسلاما

(انبیاء، 69)

اے آگ سلامتی والی ٹھنڈ بن جا۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ یہاں خطاب کا رخ ایک ”لا یعقل“ شئی کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

خطاب جب ”تحویل“ اور ”تکوین“ کی نوعیت کا ہو تو اسمیں عاقل اور لایعقل خطاب کے مساوی

اہل بن جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں آیات (عمران، 83 --- ہود، 44)

قول فیصل



جہنم کا ایندھن، کون کون؟

273

انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم

(انبیاء، 98)

تم، اور جن کی تم پرستش کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہو گئے۔

یہ ہے کہ۔ پجاری تو جہنم میں جائیں گے لیکن جن کی پوجا کی جاتی ہے ان میں راست باز لوگ بھی

شامل ہیں وہ کس گناہ کی پاداش میں جہنم یا ترا کریں گے؟

وجہ اعتراض

انہیں کچھ نہ ہو گا وضاحت ساتھ ہی شامل کر دی گئی ہے ان الذین سبقت لهم منا الحسنیٰ

قول فیصل

اولئك عنها مبعدون .

جن کے بارے میں حسنت کا پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہے وہ جہنم سے دور دور رہیں گے جو لوگ کریں گے اس کا وبال ان ہی پر



ہو گا۔ یہاں ان کے لئے منہ نہیں ہے۔

حج

جہنم کی ہدایت۔ کیا معنی؟

274

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَإِنَّهُ يَضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَى عَذَابِ السَّعِيرِ

یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ جنے ابلیس سے ناطہ جوڑا وہ اسے گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذاب کا راستہ دکھا کر رہے گا۔ (ج 4، 4)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں تولاہ کا ضمیر شیطان کی طرف راجع ہے لیکن ساتھ ہی فائدہ میں جوہ کا ضمیر ہے وہ اللہ کی طرف ہے یعنی گمراہ کرنے کا ذمہ ہر حال میں اللہ سبحانہ پر عائد ہوتا ہے۔

**قول فیصل** فانہ کے ضمیر کو اللہ کی جانب راجع کرنے کا نہ قرینہ ہے اور نہ فنی جواز جبکہ کتب کا فاعل بھی مذکور نہیں ہے۔ اب فعل مجہول کو معروف بنانے کے لئے اللہ سبحانہ پر ذمہ داری عائد کرنا بڑی

وہٹائی کی بات ہے۔۔ جہاں تک جہنم کی ہدایت کا تعلق ہے تو یہاں ہدایت صرف رہنمائی کے لغوی مفہوم میں استعمال ہوئی ہے۔

پیغمبر کے مقاصد میں رکاوٹیں ڈالنا

275

إِلَّا إِذَا تَمَنَّى الْقَيُّ الشَّيْطَانُ فِي أَمْنِيَّتِهِ

رسول یانہی نے جب بھی کوئی تمنا کی تو شیطان نے اسکی تمنا میں کچھ شامل کر دیا۔ (حج، 52)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ یہاں امانتہ کے معنی پڑھنے کے ہیں یعنی جب بھی رسول اللہ ﷺ کوئی قرأت فرماتے تو شیطان آپ کی قرأت میں اپنے الفاظ شامل کر ڈالتا۔ مثلاً ایک بار کسی کو اُزدار نماز میں آپ سورہ

نجم کی تلاوت فرما رہے تھے جسکے الفاظ میں افرأ یتم اللات والغریمۃ ومناة الثالثة الاخری۔۔۔۔۔ تو شیطان نے وقفہ (رک کر بڑھنے) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تلك الغرائق العلیٰ وان شفاعتھن لیرجی۔۔۔۔۔ کے شرکیہ الفاظ زبان

رسالت پر جاری کر دیئے۔ اس سے بتوں کی برائی خوبی میں بدل گئی۔ مفہوم یہ ہوا کہ۔۔۔۔۔ بلاشبہ یہ عالیشان ہے۔ اس یوزیشن میں ہیں کہ ان کی سفارش سے فائدہ اٹھانے کی اُمید رکھی جاسکتی ہے۔ (فتح الباری و دیگر تفاسیر)

چنانچہ ان حجر و دیگر محدثین ایسی تمام روایات کی اصلیت تسلیم کرتے اور یقین رکھتے ہیں کہ۔۔۔ شیطان اور پیغمبرؐ کی آواز سننے والوں پر مشتبہ ہو گئی اور بتوں کی عظمت کی بات شرت یا گئی۔۔۔۔۔ نہ صرف یہ کہ محدثین اس نبوت شکن

روایت کو حقیقت کے بہ طور تسلیم کرتے ہیں اس کا پس منظر بھی بیان کرتے ہیں کہ ---- نبی الاسلام۔ اسلام کی سر بلندی کے لئے عرصہ دراز سے جانے لگے تھے کہ ایسی کوئی آیت نازل نہ ہو جس سے مشرکین ناراض ہو کر۔ قرآن سننا چھوڑ دیں

چنانچہ آپ کی اس تمنا اور دلی خواہش کی تکمیل کی نہ صرف راہ نکل آئی اس سے بڑھ کر آپ ہی کی زبانی تِلْكَ الْغُرَاقِبُ الْعَلَىٰ کا اعلان بھی ہوا تو مشرکین نے حد خوش ہوئے۔

**قولِ فیصل** ناظرینِ محترم یہ پس منظر اور۔ تمنے کے مفہوم کو خواہش اور تمنا سے نکال کر "پڑھنے" کے مفہوم میں دھال لینا واضح کرتا ہے کہ سازش بڑی گہری اور کامیاب رہتی۔ کہ نہ رسولِ گویتہ چل

سکا اور نہ صحابہ رسولؐ سراقہ بن مالک کی سازش سے آگاہ ہو سکے۔ پھر تعجب یہ ہے کہ یہاں نبی اور رسولؐ کے مقام پر آئے ہیں جس سے یہ اصول مستبط ہوتا ہے کہ جو نبی کسی نبی۔ نے اپنے مشن کا آغاز کیا شیاطینِ رستم کے لوگوں نے (القی الشیطان فی امینتہ) ان کے مشن میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں۔ لیکن کارسازِ قدرت ان کی سازشوں اور رکاوٹوں کو۔ اپنی آیات کی توانائی سے زیر کرتا رہا۔ اور پھر اہلِ ردلیات جلد ہی منصفہ شہود سے غائب ہوتے رہے۔

☆

## برداشت سے باہر۔ دین نہیں ہو سکتا

276

### ما جعل علیکم فی الدین من حرج

(حج، 78)

اللہ نے دین میں کوئی دشواری نہیں رکھی۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ دین میں دشواری اور سخت احکامات کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟ سنگساری اور قطعید زندہ مثالیں موجود ہیں۔

وجہ اعتراض

### قول فیصل

عرب میں چور کا ہاتھ کاٹنے کا رواج اسلام سے پہلے بھی تھا۔ ودیک نامی چور نے کعبہ اللہ کے طلائی اثاثے چوری کئے تھے پکڑا گیا اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا عرب اس سے پہلے اس سزا سے آشنا ہی نہیں تھے بعد میں اسلام نے اس کا اعتراف کیا اور فرمایا۔ السارق والسارقة فاقطعوا یدیهما لیکن ساتھ ہی، نکالاً من اللہ۔ فرما کر قطع کو نئے مفہوم سے آشنا کیا یعنی چور کو ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر اس کی چوری کا راستہ قطع کرنا۔ یا جیل بھیج کر مقررہ مدت تک ”ردک“ میں رکھنا یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے قطع کے ”ادبی“ مفہوم سے انکار کیا وہ دو سو سال میں صرف چھ ہاتھ کاٹ پائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چور کوئی نامی گرامی اور عادی رستم کے ہوں گے جو کسی بھی سزا کو خاطر میں نہ لاتے ہوں گے۔ رہی سنگساری جیسی سنگین سزا کی بات۔ تو قرآن نے قصاص کے علاوہ کسی بھی جرم کے لئے سزائے موت تجویز نہیں فرمائی اور قصاص میں بھی مقتول کے ورثاء کے مشورے کو اہمیت دی گئی ہے کہ وہ معاف کر دیں یا معاوضہ پر راضی ہو جائیں تو سزائے موت نہیں ہے۔ اس طرح سنگساری محدثین کا مسئلہ بن جاتا ہے قرآن سے اس کا تعلق ہے نہ واسطہ۔۔۔ غالباً یہی وہ مسائل تھے جن کی سنگین سزا فرض کر کے اسلام کی رہنمائی پر غبار اڑایا جا رہا ہے۔

☆

مؤمنون

## علیٰ کی جگہ پر عن موزوں ہے

277

والذین ہم لفرو جہم حافظون الاعلیٰ ازواجہم

(مؤمنون، 6)

جو اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھتے اور اپنی ازدواج پر اکتفا کرتے ہیں۔

یہ ہے کہ حفاظتِ فرج کو عن کے حرف سے متعدی بنایا جاتا ہے جبکہ آیہ زیر بحث میں علی سے  
بنایا گیا ہے

وجہ اعتراض

یہاں عرب ہی کے استعمالات کی رو سے علی کو حرفِ عن ہی کا استعارہ بنایا گیا ہے۔ شاعر  
کہتا ہے:

قول فیصل

۱۵۱ رضیت علی بنی قشیر

لعمرو اللہ اعجبنی رضاها

یہاں علی کو حرفِ عن ہی کا استعارہ بنایا گیا ہے۔ یعنی جب ہو قشیر مجھ سے راضی ہیں تو عذا الکی رضا میرے تعجب میں  
اضافہ ہے۔



## عطف اور معطوف کا اصول

278

ثم انکم بعد ذالک لمیتون ثم انکم یوم القیامة تبعثون

(مؤمنون، 15-16)

اسکے بعد تم مر کر رہو گے اور یومِ قیامت ضرور اٹھو گے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں لمیتون کو لامِ تاکید سے ذکر فرمایا اور تبعثون کو بدو لام تاکید لے  
آئے۔

وجہ اعتراض

عطف کا اصول یہ ہے کہ وہ حکم ہو معطوف علیہ کے حکم ہی میں ہوتا ہے مثلاً یں جب معطوف

علیہ (مثلاً لمیتون) کو لامِ تاکید سے ذکر فرمایا تو عطف (ثم) کی وجہ سے بات ایک ہی

قول فیصل

ہو گئی (یعنی تبعثون۔ لتبعثون۔ بن گیا)



## موت کے ساتھ قتل کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا

279

وهو الذی یحیی ویمیت

(مؤمنون، 80)

اللہ وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔

یہ ہے کہ ”موت“ اللہ کا فعل ہے اسی طرح ”حیات“ بھی۔ انہیں تو ذکر فرمادیا اور ”قتل“ کو چھوڑ

وجہ اعتراض

دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل۔ موت کے علاوہ ہے کیونکہ ہم جب کسی کے موت کی بات

کریں گے تو اسے ”مقتول“ نہیں گے۔



## قول فیصل

یوں تو آیہ کریمہ کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ زندگی اور موت اللہ کے قانون کے ماتحت ہے۔ اس طرح موت کی نوعیت سے تعرض نہیں فرمایا۔ کیونکہ قتل کا معاوضہ ہوتا ہے جو صرف قاتل کے فعل سے تعبیر ہے لیکن موت کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ ☆

## اللہ کے لئے جمع کا صیغہ

280

### قال رب ارجعون

تب کما اے اللہ مجھے لوٹاؤ۔ (مؤمنون، 100)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ارجعون کی بجائے ارجعنی واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا لیکن جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس سے الہم کے تعدد کا ترشح ہوتا ہے۔

یہاں جمع کا صیغہ عظمت و اجلال کے لئے ہے گنتی اور تعداد کے لئے نہیں فرمایا انا نحن نحی الموتی۔ (نہس، 12) ☆

## قول فیصل

نور

## ”شہوت، عورت میں زیادہ ہے یا مرد میں؟“

281

### الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة

زنا کار عورت اور زنا کار مرد کو ایک ایک سو کوڑے رسید کرو۔ (نور، 2)

یہ ہے کہ یہاں ”زنا“ کی سزائیں ”پہل“ عورت سے۔ اور ”سرقت“ کی سزائیں ”کبتاء“ مرد سے کی گئی ہے۔

اسکی توجیہ میں منفیوں کے امام۔ ابو بحر عبد القادر رازی (1229 م) لکھتے کہ۔ لان الزانی تولد من شهوة الوقاع وشهوة المرأة اقوی واكثر. والسرقة تولد من الجساسة والجراة

## قول فیصل

والقوة وذلك في الرجل أكثر واقوی

”کیونکہ زنا کی وجہ خواہش جماع ہے جو مرد کے مقابل عورت میں زیادہ اور توانا تر ہے اور ”سرقت“ کا تعلق مرد سے ہے کہ مردوں میں جسارت، جرأت، مردانگی اور طاقت زیادہ ہوتی ہے۔“ (مسائل الرازی صفحہ 228)

یہاں رازی مرحوم نے عورت کے خلاف جو زہر انگا اور فلسفہ زنا کی منطق بگھاری ہے وہ زبانی فحش کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ شاذ و نادر کوئی عورت ایسی ہوگی جو مرد سے زیادہ قوت باہ کی حامل

## قول فیصل

ہوگی ورنہ جبری بلکہ اجتماعی زنا اور قصور محلات کو حسیناؤں سے سجانے والے یہ مرد ہی تو ہوتے ہیں ان کی شہوت اگر عورتوں کے مقابل کم ہوتی تو اتنی ڈھیر ساری عورتیں جو تین سو سے لے کر ہزار تک محلات میں رکھی جاتی تھیں ان کی زیادہ قوتِ باہ کا مداوا کس طرح کیا جاتا ہوگا؟ ہم کسی ”زن پیشہ“ عورت کی بات نہیں کر رہے کہ وہ پیٹ کے ایندھن کو بھرنے کے لئے مجبور ہے کہ اپنے گاہک کا دل بھانے میں ”پہل“ کرنے اور مصنوعی عشوہ و ناز کا مظاہرہ کر کے پیشہ ورانہ آداب کا حق ادا کرے۔۔۔۔۔ یا پھر وہ عورت جسے شریعت والوں نے 11 سال کی عمر میں اسی سال کے اذکار رفتہ بڑھنے کے پلو سے باندھ کر ایک گونہ زندہ درگور کر دیا۔ وہ اگر ناکارہ بڑھے سے قوتِ باہ زیادہ رکھتی ہے تو عین ممکن ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ احیائے سنت کے پیش نظر ہمارے رازی نے بڑی عمر میں کسی کمسن و شیرہ سے مباحہ رچایا اور پھر جب کچھ نہ بن پڑا تو عورت کی زیادہ شہوت اور قوتِ جماع کی خواہش کی لگے منطق بگھارنے۔ رازی مرحوم اپنے تجزیہ میں نہ صرف احترامِ نسوانی کے منافی بات کہنے پر اکتفا کرتے ہیں آگے چل کر مزید زہر چکانی کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ والمرأة ہی الاصل فی تلك الجنایة۔ عورت ہی جرمِ زنا کا بنیادی سبب ہے (صفحہ 1229/ سطر 3 تا 4) لیکن یہ عورتیں مسجدوں سے ملحقہ حجرہوں میں، نہیں ہوتیں وہاں کارِ خلوت (غیر فطری عمل) کا مظاہرہ کون کرتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے رازی کی نہ کوئی بہن تھی نہ بیٹی۔ نہ بہو۔ نہ بھانجی۔ نہ بھتیجی اور نہ نواسی کیونکہ ان رشتوں کی موجودگی میں کوئی بھی شخص زبانی فحش اور مزے لے لے کر نسوانی سیکس کا ذکر اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک یا تو ان رشتوں سے فارغ نہ ہو یا پھر کسی زور میں شہوت گزیدہ رہ چکا ہو۔ اس تلخ نوائی کے بعد میں پھر کموں گا کہ رازی جس ”شہوتِ کاسراغ لگانا چاہتے ہیں وہ لاکھوں میں ایک ہوگی ہر عورت نہیں ہو سکتی۔

یہ بات کہ رازی مرحوم یا اس قماش کے لوگ حقیقت میں بھی احترامِ نسواں کے قائل نہیں تھے اور انہوں نے جس بیہانے سے بھی عورت کو لیا دل کے پھپھو لے پھوڑ کر اسکی پاکیزگی کو اچھا لالہ ہے بلکہ ایک خود ساختہ حدیث کے سارے عورت کا مقام اس طرح بیان کیا جاتا ہے محترم مولوی امجد علی مرحوم (1948ء) بیمار شریعت کے عنوان حقوق الزوجین میں لکھتے ہیں :

”حدیث نمبر 7۔ امام احمد۔ انس سے راوی ہے :

فرماتے ہیں ﷺ اگر آدمی کا آدمی کے لئے سجدہ کرنا درست ہو تا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے کہ اسکا اسکے ذمہ بہت بڑا حق ہے۔ قسم ہے اسکی جسکے قبضہ قدرت میں میری جان ہے شوہر کے اگر قدم سے سر تک تمام جسم میں زخم ہو جس سے پیپ اور کچھ لہو بہتا ہو پھر عورت اسے چائے تو حق شوہر ادا نہ کیا۔“

(بیمار شریعت حصہ ہفتم صفحہ 52 تا 53 طبع مکتبہ اسلامیہ اردو بازار ناہور۔)

یعنی۔ رسول اکرم ﷺ۔ اللہ کی قسم کھا کر عورت کا اصلی مقام بیان فرما رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

## بنتِ صدیق کا دامن کس نے آلودہ کیا؟

282

ان الذین جاءوا بالافك عصبه منكم لا تحسبوه شرًا لكم بل هو خير لكم

(نور، 11)

جن لوگوں نے افترا پر دازی سے کام لیا وہ چند لوگ تھے تم پر محسوس نہ کرو۔ یہ خیر کا پہلو رکھتا ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ پر افترا کیا اسے برا محسوس نہ کرو قرآن کہتا ہے اس برائی میں بھی خیر کا پہلو پنہاں ہے جبکہ ایک پاکیزہ عورت کو جھوٹی تہمت اور افتراء کا نشانہ بنانے

**وجہ اعتراض**

میں خیر کا پہلو کونسا ہے؟

کیہ افک میں نہ عائشہؓ کا ذکر ہے نہ اشارہ۔ محدثین کی جھوٹی روایات پر سیدہؓ کو ملوث کرنا بدیہی رستم

**قول فیصل**

ظریفی ہے یہاں تو صرف یہ ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ جن احکام کی ابھی وضاحت نہیں ہوئی تھی اور وہ حادثاتی طور پر سامنے آئے تو اب وجہ حادثہ پر نظر نہ رکھو یہ دیکھو کہ پیش آمدہ مسئلے کے بارے میں پالیسی کیا عطا ہوئی ہے؟ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مفسری اور افک کی کوئی سزا ہی نہیں ہے قرآن کہتا ہے مما کسبت من الاثم۔ جس نے جرم افک میں جتنا حصہ لیا اسی تناسب سے وہ مجرم ہوگا۔

(نور، 16)

## سرزنش ارادے پر یا عمل پر؟

283

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا

(نور، 19)

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی برائی راہ پالے۔

یہ ہے یحبون (چاہتے، پسند کرتے ہیں) کا تعلق افعال قلب سے ہے جن پر سزا نہیں ہوتی۔

**وجہ اعتراض**

یہ درست ہے کہ آپ چوری کا ارادہ کرتے زنا اور مردانہ اختلاط میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں لیکن اپنی دلچسپی اور ارادے کو جب تک عملی سانچے میں حبس ڈھالتے تو سزا میں ہے لیکن افعال قلب مثلاً

**قول فیصل**

کفر و شرک و ارتداد کے اگر مظہر ہیں تو ان پر گرفت تو ہے مگر تعزیری یا جسمانی سزا نہیں ہے۔

☆

## ہاتھ پاؤں کی گواہی کا مسئلہ

284

## یوم تشهد علیہم السنہم وایدیہم وارجلہم بداکانوا یعملون

وہ لمحے یاد رکھو جب ان کی زبان، ہاتھ اور پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ (نور، 24)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ زبان کی گواہی تو سمجھ میں آتی ہے ہاتھ، پاؤں کی شہادت خلافِ نیچر ہے۔

**قول فیصل** یہاں گواہی سے مراد ”قرآن“ اور چہرے پر جھوٹ کے آثار نمودار ہونے کی گواہی ہے اور یوں بھی یہ کوئی آن ہونی بات نہیں ہے۔ نبض (یعنی ہاتھ) کی رفتار ہماری اور صحت پر گواہی دیتی ہے۔ ناک کا گر جانا کسی اندرونی بیماری کا غماز ہوتا ہے۔ رنگ کی زردی، جگر کی خرابی کی شہادت فراہم کرتی ہے۔ ایک فن کار (ایکٹر) اپنی حرکات و سکنات کو ”سکرین“ پر مشاہدہ کر کے اپنے جسم اور اعضاء کی شہادت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ اسے آپ کیا نام دیں گے اور کس عنوان سے موسوم کریں گے۔ آیہ کریمہ کی ابتداء یوم کے لفظ سے ہوئی ہے جو ”نکرہ“ ہے اسکے معنی دور وقت۔ زمانہ۔ پیریڈ کے ہیں مگر نکرہ کے مقام پر استعمال ہونے کے باعث یوم آخر سے مربوط نہیں ہے یعنی کسی بھی دور میں وہ حال ہو خواہ مستقب۔ اس میں اعضاء کی گواہی ممکن ہے بلکہ یہ آیت میں گواہی سے محاوراتی یا پھر قرآن کی گواہی مراد ہے۔ بلکہ اب تو ”فنگر پرنٹ“ نے اعضا کی گواہی کو یقینی بنا دیا ہے۔ کیا اب بھی ”صنعت خداوندی“ میں شک ہے۔

☆

## نسوانی چہرہ کا پردہ

285

## ولیضربن بخمرهن علی جیوبهن ولا یبدین زینتھن الالبعلتھن

اور مومنات کو چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈالیں۔ (نور، 31)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت نسوانی پردے کے لئے صریح پالیسی رکھتی ہے۔

**قول فیصل** چہرے کے پردے کیلئے صریح پالیسی تو اس وقت کہہ سکتے تھے جب جیوبہن کی بجائے وجوہن کا لفظ ہوتا یعنی آیہ کریمہ اس طرح ہوتی ولیضربن بخمرهن علی جیوبهن ہ لیکن یہاں جیوبہن کے لفظ نے اہل اعتراض کا سرہ کر کر کر دیا ہے۔ جہاں تک پردے کا سادہ مفہوم ہے اسے قرآن نے نظریں نیچر رکھنے سے تعبیر کیا ہے اس طرح غصہ بصر شرم و حیا کا استعارہ ہے جو عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں نظریں جھکا کر چلنے کا اشارہ دیتا ہے۔

عورت جو کہ 80 فی صد زرعی معاشرے سے تعلق رکھتی اور دیہی معیشت میں ایک خاص اہمیت اور مقام کی حامل ہے وہ ڈھور ڈنگر بھی چراتی ہے گھاس بھی کاٹتی ہے۔ زمین کا پیٹ چیر کر غلہ بھی اگاتی ہے۔ فصل بھی کاٹتی اور گاہتی بھی ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اگر اتنے سارے کام نہ کر پائے تو خود بھی اور بچے بھی ناقوں مرنے پر مجبور ہوں گے۔ دیہی معاشرے میں ”وٹے سٹے“ کی شادی ہوتی ہے یا پیسہ دیکر بیٹے لڑکی خرید کر شادی کی جاتی ہے لہذا کام اسکی ذمہ داری بن جاتی ہے وہ مرد کی لونڈی بنتی اور اسکا فرض بن جاتا ہے کہ بعض صورتوں میں کام کر کے سرد کا پیٹ بھی پالے۔ لہذا قرآن نے اسے ”زندہ“ رہنے کا بھرپور حق دیتے ہوئے پورے جسم کو سیاہ گنبد میں محصور کرنے کی بجائے۔ صرف۔ سینے پر اوڑھنی ڈالنے کا حکم دیا ہے کہ یہ سینہ کا ابھار ہی سردوں کے جذبات میں۔ طم پیدا کر تا اور ”انار کی“ پراکساتا ہے۔

سینے کے ابھار کو ڈھانپنے کے علاوہ تمام عورتوں خاص کر خوشحال گھرانوں کی عورتوں کو اضافی حکم وید یا کہ زمانہ جاہلیت کی عورت کی طرح بن سنور کر۔ بازاروں، پر رونق مقامات اور خانقاہوں وغیرہ پر جانے سے احتراز کریں انکی زینت اور آرائش جمال عام نہ ہونی چاہئے صرف گھر والے کے لئے ہونی چاہئے۔

جیسا کہ عرض کیا ہے قرآن محکم کا بیادی مطالبہ ”غض بھر“ کا ہے جو ہر دو اصناف سے یکساں ہے لہذا مردوں کو بھی قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر پاکیزہ و پاکدامن ہونے کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ اوھر یہ بھی حقیقت ہے کہ روایات کی اساس پر جن عورتوں کے قل جسم کو سیاہ گنبد میں محبوس کیا گیا ہے اس کی کٹنگ، ساخت اور سلائی میں اتنی کشش اور جاذبیت رکھی جاتی ہے کہ سرد زیادہ سے زیادہ اس چلتی پھرتی شاہکار کا از سر تا بقدم مطالعہ شروع کر دیتے ہیں بلکہ آنکھوں کی ”مقتناطیسیت“ کو زیادہ ”جاذب“ اور پر کشش بنانے کے لئے عورتیں انتہائی باریک جار جٹ کا چار انچی نکڑا رکھا دیتی ہیں اور وہ بھی صرف گھر والوں سے پردہ کرنے کے لئے۔ ورنہ تو دوکانوں، بازاروں، پارکوں و دیگر مقامات پر اسے بھی اتار۔ پھینکتی ہیں اب فرمایا جائے کہ اتنی ساری غیر فطری پابندیوں کو عائد کرنے کے باوصف کسی بات کی بھی پابندی نہیں ہوتی تو اس سے بہتر نہیں کہ وہی قرآن کے فطری پردے (سینے پر اوڑھنی ڈالنے کی) پابندی کی جائے جس میں ”غض بھر“ کی فطری تجویز بھی ہے اور عملی طور پر آسان اور قابل عمل بھی۔ یہاں برقعہ کا ذکر نہیں ہوا کہ لغت اور خود روایات میں اسکا ذکر نہیں ہے پھر چادر کے دوبارہ رواج نے اس کے ذکر کی ضرورت ہی ختم کر دی ہے۔

☆

## تسبیح۔ کا مفہوم کیا ہے؟

286

الم تر ان الله يسبح له من في السماوات والارض والطير صافات

تم نے غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین کی ہر جاندار مخلوق تسبیح میں لگی ہوئی ہے۔ (نور، 41)

میں کہا جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز تسبیح ہے۔ مشاہدے کی رو سے صداقت سے بعید ہے۔ ہر چیز

وجہ اعتراض



چھوڑ دو، حضرت انسان جسے ہم مسلمان کی زبان میں کافر کہتے ہیں طحہ، منکر اور مرتد سے موسوم کرتے ہیں وہ بھی تسبیح کے تکلف سے عاری ہیں۔

**قول فیصل** اس آیت کو ضابطہ تصریف آیت کے تناظر میں سمجھنا چاہیے فرمایا کل قد علم صلاحہ و تسبیحہ۔ کائنات کی ہر چیز اپنی جداگانہ فطری صلاحیتوں کا علم رکھتی ہے اس طرح اسکا فطری عمل ہی اسکی صلاۃ ہے اور تسبیح ہے۔ (نور، 41)

اس طرح صلاۃ اور تسبیح - زندہ رہنے - زندگی کا فطری ڈھنگ اختیار کرنے روزی اور رہن بہن کے طریقے اپنانے اور حصول مقصد کے لئے تگ و تاز کرنے کا نام تسبیح ہے اس طرح تسبیح زندگی کی حرارتوں اور ”فطری حرکات“ کا پیکر ہے پرندے جب گھونسلوں سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پہنچ کر روزی حاصل کرتے ہیں تو یہ بھی ان کی تسبیح ہے۔ تسبیح کے معنی تیرنے اور آگے بڑھنے کے بھی ہیں جو تگ و تاز کا استعارہ ہے غرض کہ زندگی کے تمام فطری حرکات کو تسبیح کے پیکر میں بیان فرما کر احساس دلایا کہ اسکے معنی تسبیح کے دانے چلانے کے نہیں جو عمل کے منافی، ساکت و سامت رہنے اور صرف کچھ چھپنے کا درس دیتی ہے۔ اسی طرح صلاۃ - کا ایک کائناتی تصور بھی ہے بلکہ اسکے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے اللہ کی طرف سے محسوس پیکر میں رکوع و سجود والی عبادت بھی شامل ہے یہ پانچ وقتی فرض عبادت ہے اس میں شک کرنا یا اسکی ادائیگی کا مذاق اڑانا - کسی بھی حامل قرآن کو زیب نہیں دینا یہ وسیع تر مفہوم کا حامل لفظ بھی ہے اور شیوہ عبادت گذاری کا، تعلیمات رسول کا عنصر بھی۔

چلنا پاؤں سے خاص ہے پیٹ کے بل نہیں

287

من یمشی علی بطنہ

ان جانوروں میں وہ بھی ہیں جو بیٹ کے بل چلتے ہیں۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔۔ چلنا پاؤں کا عمل ہے پیٹ کے بل رہنا جوتا ہے۔۔

**قول فیصل** یہاں مجاز کو ”مشابہت“ کے طریقے پر استعمال کیا گیا ہے جیسے اہل زبان کہتے ہیں۔۔۔۔۔ مشی  
هذا الامر۔ وفلان لا يتمشى له امر۔ فلان ماشى الحال۔ ان تمام محاوروں میں ”چلنے“ کے  
عمل کو مشی کے فعل سے تعبیر کیا ہے جبکہ چلنا پاؤں کا عمل ہوتا ہے لیکن معاملہ چلانا۔ چونکہ بات چلانے کے مشابہ  
ہوتا ہے لہذا اسی مناسبت سے یہاں مشی۔ ہی کو استعمال کیا گیا ہے ویسے یہ بھی تو حقیقت ہے کہ سانپ و دیگر حشرات  
رینگ کر ہی تو چلتے ہیں یعنی۔ رینگنا ان کا چلنا ہے۔ ☆

اپنے گھر کھانا ہر کوئی کھاتا ہے اس پر کسی کو اعتراض کیوں؟

288

ولا على انفسكم ان تأكلوا من بيوتكم

(نور-61)

اور نہ ہی اپنے گھروں سے کھانا کھانے میں کوئی رکاوٹ ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ اپنے گھر کھانے میں یوں بھی حرج نہیں ہے کہ یہ انسان کے معمولات میں شامل ہوتا ہے۔

## وجه اعتراض

یہاں بیوتکم کے وسیع تر، مفہوم کا اظہار مقصود تھا کہ اولاد جو کہ ماں باپ سے الگ گھر بسا چکی

## قول فیصل

سے۔ سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے علیحدگی کے بعد کھاپی سکتی ہے۔۔۔۔۔؟

فرمایا کہ ماں باپ کا گھر ان کا اپنا ہی گھر ہوتا ہے اسی طرح ماں باپ بھی اگر چاہیں تو اولاد کے گھر سے کھاپی سکتے ہیں۔ کچھ لوگ بیٹے، بیٹیاں کے بعد ان کی گھر کی چیز استعمال کرنا عیب سمجھتے ہیں قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے۔

☆

گھر میں داخل ہوتے وقت اپنے پر سلام کرنا

289

فاذا دخلتم بيوتا فسلموا على انفسكم

(نور، 61)

جب گھروں میں داخل ہو تو اپنے پر سلام کیا کرو۔

یہ ہے کہ سلام کے معنی امن و سلامتی کے ہیں اس طرح انفسکم کے معنی ہوں گے اپنے کو امن

## وجه اعتراض

وسلامتی کا پیغام دے دو۔۔۔۔۔ لیکن یہ کیا معنی ہوئے؟

انفسکم۔ سے مراد اہل و عیال ہیں یعنی جب گھر میں داخل ہو تو لٹکانہ کو سلام کرو۔

## قول فیصل

☆

## فرقان

پیدا۔ اللہ بھی کرتا ہے پیدا مسیح بھی کرتا ہے

290

خلق كل شيء <sup>٤</sup>فقدرة تقديره

(فرقان، 2)

اللہ نے ہر شی کی ”تخلیق“ کی اور اس کے پیمانے مقرر کئے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں خلق ----- اللہ کے فعل کا پرمتو ہے جبکہ دوسری جگہ فرمایا۔ واد نخلق

## وجه اعتراض

من الطین جب تم مٹی سے چیزیاں پیدا کرتے تھے (مائدہ، 113) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے مسیح کے فعلِ تخلیق کا اعتراف بھی کیا ہے۔

آیہ زیر بحث کا فقرہ۔ فقدرہ تقدیرا۔ فعلِ خلق کی تفسیر ہے اس طرح تخلیق کے معنی ہوں گے اسکے پیمانے مقرر کرنے کے۔ رہی بات اللہ اور مسیح کے یکساں تخلیق کے بارے میں تو یہاں مفاہیم کا تعین ”قرائن“ سے ہوگا کیونکہ تنزیل کی نسبت اگر اللہ کی طرف ہوگی تو اس سے پلاننگ بمع ایجاد اور وجود میں لانا مراد ہے۔ نسبت اگر غیر اللہ کی طرف ہے تو اس سے صرف پلاننگ۔ اور پیمانے مقرر کرنا مراد ہوگا جیسے مسیح چیزیاں بنانے کی صرف پلاننگ کرتے اور انکل سے چیزیاں بنالیتے تھے مگر ان میں روح نہ ڈال سکتے تھے یعنی پلاننگ کی حد تک خالق تھے۔



## خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنا

291

وقال الذین لا یرجون لقاءنا . لولا انزل علینا الملائکة او نرے ربنا جو ہمارا قرب، نہیں چاہتے۔ کہتے ہیں کہ کاش ہم پر بھی فرشتے اترتے یا پھر رب کو ان آنکھوں سے دیکھ پاتے۔ (فرقان، 21)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ آیت کے پہلے حصے میں اللہ سے ملاقات کا ذکر ہے جبکہ ملاقات جسم کو متقاضی ہے۔

ملاقات کے مفہوم میں متعدد بار واضح کر دیا ہے کہ اس سے مراد صرف ”قرب“ کے ہیں جیسے فرمایا نحن اقرب الیہ من حبل الورد۔ ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اسکے قریب ہیں (ق، 16)

ظاہر ہے شہ رگ سے زیادہ قربت صرف مبالغہ کے لئے ہے جیسا ڈالنے۔ معانقہ کرنے اور مصافحہ کے لئے نہیں ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح یہاں دویا (اونرے دینا) کو لوگوں کی ناسودہ خواہش کہہ کر۔ وزن میں لانے سے خارج کر دیا اور احساس دلایا کہ۔ دیدار باری۔ کی خالی آرزو کرنا بھی سنگین جرم ہے مومن کے پیروکاروں نے جب ارنا اللہ جہور یعنی خدا کے ظاہر و ظہور دیکھنے کا مطالبہ کیا تو اتفاق ایسا ہی گیا کہ زلزلہ۔ ان کا جواب بن کر آیا یعنی اس طرح۔ دیدار کا مطالبہ ہی سنگین پاداش کا مظہر بن گیا۔



## پیروانِ حق کی مخالفت

292

و کذالك جعلنا لكل نبی عدوا

یہ ہمارا دستور ہے کہ ہم نے ہر پیغمبر کے خلاف دشمن کھڑے کر دیئے۔ (فرقان، 31)

میں کہا جاتا ہے کہ انبیاء کے خلاف دشمن کھڑے کر دینا گویا نبیاء کے دشمن کو دانستہ قیل کر دینا ہے جبکہ یہ عمل شانِ خداوندی سے بعید بھی ہے۔

## وجه اعتراض

جعل۔ کا فعل پیدا کرنے کے مفہوم میں نہیں، اسباب اور دیگر حکومتی کاموں کو بھی کہا جاتا ہے۔

## قول فیصل

[illegible]

ایک کو ایک کہنا۔ کیا مطلب؟

293

وانزلنا من السماء ماء طهورا لنحيي به بلدة ميتا

ہم نے آسمان سے پاک پانی ہر سایا تاکہ مردہ بستی کو حیاتِ نو سے آشنا کریں۔ (فرقان، 49)

یہ ہے کہ پانی۔ بارش کا ہو یا دریاؤں کا پاک ہی ہوتا ہے۔ اسے پاک کہنے میں کیا خاصیت ہے۔ نیز بلندہ مؤنث ہے اسکی صفت مذکر میتا بیان ہوئی ہے یہاں میتا ہونا چاہیے تھا۔

**وجه اعتراض**

یہاں بارش کے پانی کو پاک اور چھور۔ اسلئے کہا کہ اسمیں اکودگی نہیں ہوتی اسکے برعکس دریاؤں کے چشمے یوں تو صاف ستھرے ہوتے ہیں مگر جب ندیوں نالوں کے ذریعہ میدانی علاقوں میں پہنچتے

## قول فیصل

میں تو ان میں خس و خاشاک کے علاوہ زمین کی مٹی بھی شامل ہو جاتی ہے جس سے اسکا شفاف پن اور صفائی ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم پانی کوئی سا ہودونوں کا مقصد بجز زمینوں کو آباد کرنا اور سرسبز و شاداب بنانا ہے۔۔۔۔۔ رہی یہ بات کہ موصوف مونث کے لئے صفت بھی مونث ہی ہونی چاہئے تو یہاں بلدہ کی معنویت کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ۔ یہاں مقام یا مکان کا استعارہ بن کر آیا ہے لہذا صفت کو معنوی سانچے میں ڈھال لیا گیا ہے۔



## تبلیغ رسالت کا معاوضہ

294

## قل ما اسئلكم عليه من اجر

(فرقان، 57)

ان سے کہہ دو میں کسی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرتا۔

### وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ۔ من اجر۔ میں من: کا حرف "نفی" کے عموم اور پختگی کو ظاہر کرتا ہے یعنی میں تم سے کوئی سا بھی مطالبہ نہیں کرتا لیکن دوسرے مقام پر اسکے برعکس فرمایا قل لا اسئلكم

عليه اجرا الا المودة في القربى۔

میں تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا میرا تو صرف یہ مطالبہ ہے کہ رشتے کے حقوق کا خیال

(شورے، 23)

کرو۔

اس طرح جس چیز کو نفی کامل سے مربوط کیا گیا تھا اسے رشتہ کی استواری کا رنگ دے ڈالا۔ تاہم ضحاک اور ابن عباس کا خیال ہے کہ شورے (23) منسوخ ہے۔

### قول فیصل

ابن عباس اور ضحاک پر کیا پابندی ہے وہ شورے (23) چھوڑ پورے قرآن ہی کو منسوخ کر سکتے ہیں

لیکن یہاں نسخ کس راوی سے؟ نسخ تو باطل ہے جبکہ باطل قرآن میں سرایت کر ہی نہیں سکتا۔ کیا نسخ سے چنے کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو سکتا تھا؟ کیا یہ نہ ہو سکتا تھا کہ یہاں استثناء کو اسی کی جنس سے استثناء نہ ٹھہرا کر کہا جائے کہ۔۔۔۔۔ لیکن میں قرأت کے رشتے کا احساس دلاتا رہوں گا کیونکہ الا کے ایک معنی لکن کے بھی ہیں۔ لکن المودة فی

القربى۔

شعراء

## بات ایک کی حوالہ۔ دو کا

295

## فقولا انارسل رب العالمین

(شعراء، 16)

اسے کہہ دو۔ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔

یہ ہے کہ یہاں (فولا۔ میں) حوالہ دو کا ہے اور (انا۔ میں) بات ایک رسول کی ہے حالانکہ

### وجہ اعتراض

دوسرے مقام پر ثنیہ کا واضح صیغہ اختیار فرمایا ہے۔ انارسلوا ربك۔

یہاں رسول۔ "مصدری" معنی میں آیا ہے جو مفرد، ثنیہ اور زیادہ کو یکساں شامل ہے۔

### قول فیصل

☆

## کیا۔ موئے۔ نبوت کی "ضیا" سے محروم تھے؟

296



## قال فعلتها اذا. وانا من الضالين

(شعراء، 20)

اُس وقت میں نادان تھا قتل کر بیٹھا۔

میں کہا جاتا ہے کہ سیدنا موسیٰ نے قبلی کے قتل کو اپنی ضلالت اور گمراہی سے تعبیر فرمایا ہے جبکہ انبیاء ”ضلالت“ سے معصوم ہوتے ہیں۔

وجہ اعتراض

قول فیصل

آپ نے یہ فرما کر ساتھ ہی کہہ دیا۔ فوہب لی حکما وجعلنی من المرسلین لیکن بعد میں جب اللہ نے مجھے پچھلی دی اور رسولوں میں شامل کر دیا (شعراء، 21) تو بھری خامکاری کا احساس ہوا۔۔۔ اس طرح آپ نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا اسے ضلالت اور گمراہی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ انبیاء پر جہاں کہیں ”ضلالت“ کا اطلاق ہوا ہے اس سے اصطلاحی ضلالت مراد نہیں لی گئی۔ ایسی ضلالت جو اپنے ادنیٰ مفہوم میں استعمال ہوئی اسی کا اطلاق ہوتا رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بابت فرمایا۔ ووجدك ضالا فهدی۔ اللہ نے آپ کو ہدایت کا حلالی پایا اور راہ بھادی (الضحیٰ، 7) سیدنا یعقوبؑ کے رُمن میں ہے۔ وان ابانا لفی ضلال مبین ہلباجان تو عشق یوسفؑ میں حواس کھو بیٹھے ہیں (یوسف، 8) اس طرح ضلالت کا لفظ نہ ہر جگہ گمراہی کے مفہوم میں آیا ہے اور نہ ہی ایمان کے مقابلہ میں کفر کے معنی میں۔ یہاں قرآن فیصلہ کریں گے کہ زیر بحث لفظ کس مفہوم میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اس تناظر میں سیدنا موسیٰ کا اپنی نادانی کا اعتراف کرنا کسی گمراہی کے مستلزم نہیں ہے خاص کر فعلتھا ماضی کا صیغہ ہے۔ یعنی ماضی کی ایک نادانی کا اعتراف ہے بعد میں یہ کیفیت نہ رہ سکتی تھی کہ فوہب لی حکما۔ تو نا محافظ بن چکا تھا یعنی یہاں وہب لی حکما کو اگر عطاءے نبوت سے تعبیر کیا جائے تو سنی نقطہ نظر سے قبلی کا قتل قبل از نبوت کا واقعہ بن جاتا ہے۔

☆

## اللہ۔ عقل سے عاری؟

297

ما رب العالمین

(شعراء، 23)

رب کیا ہوتا ہے؟

یہ ہے کہ۔ ما۔ کا صلہ ”غیر عاقل“ کیلئے ہے لیکن رب السماوات والارض پر اس کا اطلاق ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اللہ کو بھی عقل سے عاری ذات میں شمار کیا ہے۔

وجہ اعتراض

قول فیصل

یہاں ما کا لفظ فرعون نے استعمال کیا ہے جو دل کی ضیاء سے اندھا اور اللہ کو بھی اپنی ہی طرح کا ”لا یعقل“ تصور کرتا ہو گا اسے اللہ سبحانہ کا نہ عرفان تھا نہ پہچان۔ وہ تو اللہ کے وجود ہی کا منکر تھا اور لا وجود پر ما کا اطلاق اسکے نقطہ نظر سے جا ہو سکتا تھا خاص کر اسے ما اور من میں تمیز کرنے کا شعور بھی نہیں تھا۔ یہ قطع نظر اس کے کہ ادبیات عرب میں شخصیت کی عظمت کے زاویہ سے ما ہمیشہ من کا استعارہ بن کر استعمال ہوتا رہا ہے اور

قرآن نے اسی زاویہ کو ملحوظ رکھ کر فرعون کے ماکور ہنے دیا۔ ☆

## ایمان ہے تو خدا بھی ہے

298

رب السماوات والارض وما بينهما ان كنتم مؤمنين

(شعراء، 24) اگر تمہیں یقین ہے تو پھر آسمانوں اور زمین کے مابین جو کچھ ہے ان سب کا رب وہی ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ موسیٰ نے آسمان و زمین کے رب ہونے کو فرعون اور اسکی قوم کے ایمان سے مربوط کیا ہے حالانکہ اللہ کی ”رہبیت“ کسی کے ایمان لانے اور نہ لانے کی محتاج نہیں ہے۔ جس سے اس شرط (حرف ان) کی طرف اشارہ کی نفی ہو جاتی ہے۔

قول فیصل یہاں حرف ان برائے شرط نہیں ہے۔ برائے نفی ہے اور معنی ہوں گے۔ اگر تم آسمان و زمین کی موجودگی پر یقین نہیں رکھتے تب بھی وہ ”موجود“ ہے۔

☆

## ساحروں کی فنکاری کا اعتراف

299

القوا ما انتم ملقون

(شعراء، 43) تم جو کھیل کھیلتا چاہتے ہو شروع کر دو۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ فرعون کے ساحر کافر تھے موسیٰ نے ان کے سحر کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے اپیل کی کہ وہ اپنے کام کا آغاز کریں حالانکہ ایک پیغمبر کے منصب کے خلاف ہے کہ اہل کفر کو ”پہل“ کرنے کی دعوت دیں۔

قول فیصل کبھی بحث کی خاطر مخالف کے موقف کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اسکے بغیر بات نہیں چل سکتی۔ موسیٰ کی یہ دعوت اس لئے نہیں تھی کہ آپ نے انکی فنکاری کو دل سے تسلیم کر لیا تھا۔ یہ چیلنج اور مناظرے کی دعوت تھی جسیں عموماً ”مخالف“ کو پہل کرنے کا چانس دیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میرے پاس تو ”سحر“ ہے نہیں تم اگر دسترس رکھتے ہو تو جی بسم اللہ۔ شروع کیجئے۔ تو یہ شروع کرنے کی دعوت اگرچہ صبحہ امر (القوا) سے ہے لیکن مقصد ان کے کرتب کو سامنے لانا اور پھر ان پر۔ جو اہل وار کرنا ہے چنانچہ انہوں نے مبارزت میں پہل کی اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ ”جو اہل عمل“ سے ان کے اہلک کا تیلانچہ ہو گیا۔

☆

## وہ نکل رہے تھے اور یہ اتر رہے تھے

300

### وازلنا ثم الآخرین وانجینا موسیٰ

(شعراء، 64) دوسروں کو سمندر میں اترنے کے لئے قریب لے آئے اور موسیٰ کو نجات دلا دی۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ فرعون اور اسکے حمایتیوں کو سمندر کے قریب لے آنے کے عمل کو اللہ نے اپنا عمل ٹھیر لیا ہے۔

### قول فیصل

جی نہیں۔ سیدنا موسیٰ جب پایاب سمندر کو پار کر گئے تو فرعون جو اپنے لاؤ لشکر سمیت آدم کا اور یہ نہ سوچا کہ اب سمندر کی سطح بلند ہو رہی ہے پانی میں اترنے سے رک جانا چاہیے لیکن وہ نہ رکا۔ اور اللہ سبحانہ نے صرف اس حد تک اس کے عمل کو اپنی تدبیر میں شامل کر لیا۔ کہ اس طرح اس کی ہلاکت کے عوامل میں خفیہ عامل بھی شامل تصور کر لیا جائے۔

☆

نمل

## برے عملوں کو زیادہ پرکشش کون بناتا ہے؟

301

### ان الذین لا یؤمنون بالآخرہ . زینا لهم اعمالهم

(نمل، 4) آخرت پر یقین نہ رکھنے والوں کے اعمال کو ہم نے پرکشش بنا رکھا ہے۔

یہ ہے کہ یہاں کفار کے عمل کو پرکشش بنانے کی ”نبت“ اللہ کی طرف کی گئی ہے جبکہ دوسری آیت میں ہے وزین لهم البشطان اعمالهم۔ ان کے اعمال کو شیطان نے خوبصورت بنا کر دکھلایا ہے۔

### وجہ اعتراض

اللہ نے ان کے عملوں کو اس زاویہ سے پرکشش بنایا ہے کہ ان کے خمیر میں ”شہوت“ اور

### قول فیصل

مباشرت کا عنصر شامل کر دیا ہے اور یہ ہر مخلوق کا بنیادی وظیفہ ہے اپنے وظیفے کو اپنے اختیار سے جس طرح چاہے بروئے کار لا سکتا ہے اور۔ شیطان ان کے عملوں کو اس معنی سے پرکشش بنا کر دکھلاتا ہے کہ ان کے دل میں جنتی کے عمل کا اشتیاق اور لذت کا جاذب تصور پیدا کر کے جائز و ناجائز حدوں کو عبور کرنے کا درس دیتا ہے۔

☆

## قرآن۔ نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ نازل ہوتا ہے، یا۔۔۔۔۔

302

## وانك لتلقى القرآن من لدن حكيم عليم

(نمل، 6) تمہاری طرف یہ قرآن حکمت و علم والے خدا کی طرف سے القا ہوتا ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ سنیوں کا عقیدہ ہے کہ ”قرآن قدیم“ ہے جبکہ یہ آیت اسکے نوبہ نوناازل ہونے کا اشارہ دیتی ہے۔

قول فیصل یہاں اللقاء غور کے قابل ہے جو حال اور مستقبل کی ”چغلی“ کھاتا اور ”قدامت“ کی نفی کرتا ہے کیونکہ قرآن اگر القا کے وقت موجود ہوتا تو بعد میں حکمت والے خدا کی جانب سے اللقاء ہونے کا



مفہوم بے نتیجہ ہو جاتا۔

## س۔ اور لعل میں فرق؟

303

### سأتيكم

(نمل، 7) میں جلد ہی کوئی خبر لے آؤں گا۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ روشن آگ نظر آرہی ہے تم ٹھیرو میں جلد ہی کوئی خبر لاؤں گا۔ اس طرح پورے وثوق سے خبر لانے کا ”مزودہ“ ہے لیکن اسکے برعکس دوسرے مقام پر فرمایا۔ لعلی آتیکم۔ امید ہے آگ کی کوئی خبر لاؤں گا۔ (طہ، قصص، 29) اس طرح خبر لانے کو ”امید“ سے مربوط کر کے ”وثوق“ کی نفی کر دی ہے۔

قول فیصل انسان مختلف کیفیتوں کا ”منبع“ ہے اگر کامیابی کی کیفیت ”طاری“ ہوتی ہے تو وثوق کا سارا لے بیٹھتا ہے۔ اگر غیر یقینی کیفیت کا پہلو رائج ہے تو معاملہ کو ”امید“ پر اٹھا رکھتا ہے۔ اس طرح تضاد اگر ہے تو انسان کے قول و عمل میں ہے خدائے لایزال کا قول تضاد سے پاک ہے۔ جہاں تک انسان کے قول و عمل میں تضاد کا تعلق ہے اگرچہ معیوب ہے تاہم کیفیات و ”واردات“ کے اختلاف کو تضاد سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ اس وضاحت کے بعد سأتیکم کا صیغہ ہو یا لعلی آتیکم دونوں کا تعلق مستقبل سے ہے۔



## رسولوں سے ظلم سرزد نہیں ہوتا

304

### انني لا يخاف لدي المرسلون

(نمل، 10) میرے رسول کسی سے خوف نہیں کھاتے ماسوائے جس نے ظلم کیا۔







## فَقَالَ مَالِي لَا أَرَى الْهَدَاهِمَ كَانِ مِنَ الْغَائِبِينَ لَا عَذْبَهُ عَذَابًا شَدِيدًا

سلیمانؑ نے رسالہ کا جائزہ لیا اور ہد ہد کو نہ پایا اور کہا کیا وجہ ہد ہد کیوں نظر نہیں آ رہا۔ کیا کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ میرے ہاتھ لگا تو اسے سنگین سزا دوں گا۔ (نمل، 20-21)

میں کہا جاتا ہے کہ ہد ہد ایک پرندہ ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک سدھایا ہوا پرندہ ہے۔ کسی شرعی امر کا مکلف نہیں ہے اس کے لئے سنگین سزا کس لئے؟

**وجہ اعتراض**

ہد ہد شاہی خبر رساں اور خفیہ ادارے کے افسر اعلیٰ کا نام تھا۔ جو افواج کے معائنے کے وقت موجود نہ تھا جبکہ اتنے اہم منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے ایک اہم تقریب میں اسے حاضر ہونا چاہیے

**قول فیصل**



تھا۔

ساز و سامان سلیمانؑ کے زیادہ تھے یا ملکہ سبا کے

307

**ولہا عرش عظیم**

اس کا عرش عظیم بھی ہے۔ (نمل، 23)

یہ ہے کہ۔ خفیہ ادارے کے افسر اعلیٰ نے اپنے ذرائع سے ملکہ سبا کے ٹھاٹھ بانٹھ کا سراغ لگایا تھا اس کی تحقیق میں لگا ہوا ہونے کی وجہ سے فوجی تقریب میں شامل نہ ہو سکا۔ بعد میں اس نے یہ بھی بتا دیا کہ ولہا عرش عظیم اسکے پاس بہت قیمتی سناہی تخت بھی ہے۔ یہ خبر کوئی غیر معمولی انداز میں نہیں تھی۔ ہد ہد نے اس انداز سے سناہی کہ سلیمانی تخت کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔

**وجہ اعتراض**

اس میں کوئی اچھبے کی بات ہے اور نہ تخت سلیمانؑ کی اہمیت کو کم کرنے کا مسئلہ۔ کیونکہ رساوقات بڑے بڑے شاہنشاہوں کے پاس ہر گونہ سامان ترنمین ہونے کے باوصف بھی بعض امراء اور والیان ریاست کے پاس ایسے نوادر پائے جاتے ہیں جس سے شاہی خزانے خالی ہوتے ہیں۔

**قول فیصل**



تَوَلَّوْا لَهُمْ

308

فَالْقَهْلُ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُمْ فَأَنْظِرْ مَا ذَا بَرِ جَعُونَ

میرا یہ خط ملکہ سبا کے سامنے ڈال دو اور پیچھے ہٹ جاؤ اور دیکھو جواب کیا ملتا ہے۔ (نمل، 28)

میں کہا جاتا ہے کہ۔ تول کا امر چلے جانے کا غماز ہے اب سوال یہ ہے کہ اگر خط دے کر ہد ہد نے

**وجہ اعتراض**

چلے جانا تھا تو وہ کس طرح معلوم کر سکتا کہ جواب میں گیا لکھا گیا ہے۔

تو۔ کے معنی دور چلے جانے کے، نہیں ہیں آداب شاہی کے مطابق خط سپرد کروینے کے بعد چند قدم پیچھے ہٹ جانے کے ہیں۔ ☆

**قول فیصل**

”رحمان“ پہلے یا ”سلیمان“

309

انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

(نمل، 30)

یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے (جسکا مضمون یہ ہے کہ)

یہ ہے کہ یہاں سلیمان نے پہلے اپنا اور بعد میں ”اللہ“ کا نام تحریر کیا۔

**وجہ اعتراض**

سبا والے سورج پرست تھے وہ اپنے عقیدے میں اللہ رحمان رحیم کو جانتے ہی نہیں تھے صرف

**قول فیصل**

سلیمان کے نام سے آشنا تھے لہذا ان کی پہچان کی مناسبت سے پہلے اپنے نام کا اظہار کیا۔ تاکہ وہ لا علمی میں اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ کر بیٹھیں اسکے بعد اللہ کا نام لکھ کر اپنے تبلیغی مشن کا اظہار فرمایا کہ ہم اہل توحید ہیں۔ ☆

سلیمان اور ملکہ سبا ایک ساتھ مسلمان ہوئے تھے؟

310

واسلمت مع سلیمان لله رب العالمین

میں سلیمان کی معیت میں اللہ رب العالمین (کی پارٹی میں شامل ہو کر) مسلمان ہوتی ہوں۔ (نمل، 43)

میں کہا جاتا ہے کہ سلیمان تو پہلے سے ہی مسلمان تھے اسکی معیت میں مسلمان ہونے کا اعلان

**وجہ اعتراض**

کیا معنی رکھتا ہے؟

بلیس سبا کی ملکہ تھی اس نے وضاحت کر دی کہ وہ سلیمان کے کہنے (و اتونی مسلمین) پر ان کی

**قول فیصل**

پارٹی یعنی مسلمانوں میں شامل ہو رہی ہے قیدی یا لونڈی کی حیثیت سے تابع فرمان نہیں بنی۔

یہاں ”معیّت“ کے معنی ایک ساتھ مسلمان ہونے کے نہیں ہیں کسی کی دعوت پر اسکی پارٹی میں شامل ہونے کو بھی

”معیّت“ سے تعبیر کیا جاتا ہے بہر حال ملکہ نے معیت کا لفظ استعمال کر کے۔ سبا کی غلامی یا کسی کی ذیلی حکومت بننے کی نفی

☆

کر دی ہے۔

## پھاڑوں کے چلنے سے کیا مراد ہے؟

311

وتری الجبال تحسبها جامدة وهي تمرّ مر السحاب

اور تم پھاڑوں کو اپنی جگہ پر جما ہوا دیکھتے ہو جبکہ وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوتے ہیں۔ (نمل، 88)

یہ ہے کہ پھاڑ اگر چلتے تو ٹکرا کر خود بھی پاش پاش ہو جاتے اور دنیا بھی کبھی کی خرابات میں شمار ہو جاتی۔

وجہ اعتراض

پھاڑ زمین کا حصہ ہیں اور زمین بھی چلتی رہتی ہے ہم اسکی وسیع و عریض سطح پر آباد ہیں اور اسکا چلنا

قول فیصل

محسوس نہیں کرتے۔ سمندر میں بھی جہاز چلتا رہتا ہے اسکیں بھی ایک شہر آباد ہوتا ہے کوئی

سویا ہوا ہے کوئی کام میں لگا ہوا ہے دکانیں ہیں چہل پھل ہے مگر ہم جہاز کا چلنا محسوس نہیں کرتے پورے سکون سے ہوتے ہیں قرآن پاک میں شمس و قمر و دیگر عظیم و جسیم کو اکب کی حرکت کا ذکر ہے (انبیاء، 33) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ”کھرہما“ سال پہلے زمین اور چاند ایک ہی جسم سے تعلق رکھتے تھے بعد میں الگ ہو گئے تاہم دونوں کے خواص آج بھی ملتے جلتے ہیں چاند اگر اپنے ”محور“ میں محور حرکت ہے (کل فی فلک یسبحون) تو زمین کے محور گردش ہونے میں کون سی چیز مانع ہے۔ ہم اگر اسکی بڑی جسامت کے باعث حرکت محسوس نہیں کرتے تو اس سے حرکت کی نفی نہیں ہو سکتی۔ اسکے علاوہ جبال کے مفہوم میں ایک اور توجیہ بھی پیش کی جاسکتی ہے جو لغت اور استعمالات عرب کی رد سے قوم کے وڈیروں، سربراہان اور قباہل کے سرداروں کو بھی حبیباں ٹھہراتے ہیں بلکہ قرآن پاک میں بیشمار مقامات پر جبال کے معنی ہی سرداران قوم ہیں۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ جن لوگوں کو تم مضبوط اور اپنے حاکمانہ طغیانی کے ساتھ جما ہوا اور مستحکم سمجھتے ہو ان کی حیثیت بھی چلتے بادلوں کی سی ہے ذرا انقلاب کی ہوا چلی یہ ہل گئے۔



قصص

## خوف یعنی۔ یقین

312

فاذا خفت عليه فالقيه في اليم ولا تخافي

(قصص، 7)

جب خوف محسوس کرو تو سوئے کو دریا کی لہروں کی نذر کر دو۔

یہ ہے کہ یہاں پہلے خفت اور پھر لا تخافی کہہ کر تضاد بیانی سے کام لیا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

**قول فیصل** پہلے خفت کی نسبت والدہ موسیٰ کی طرف ہے اور خفت بمعنی یقین کے ہے یعنی تمہیں یقین ہو کہ فرعون کے آدمی اسے قتل کر دیں گے تو اسے دریا کی موجوں میں بہا دو (پھر ڈھارس بہا دھائی کہ) ولا تخافی اسکے ڈوب جانے کا ڈر دل سے نکال دو۔ ☆

### لا فانی ذات کی 'فانی شی' سے استثناء

313

کل شیء ہالک الا وجہہ

(نقص، 88)

ہر شی فانیذیر ہے سوائے اسکے چرے کے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ یہاں "وجہ" کا ذات لایزال پر اطلاق ہوا۔ جو تجسیم کا غماز ہے۔

**قول فیصل** یہاں اور بہت سے دیگر مقامات پر لغت کے دانشوروں اور قرآن کے اپنے استعمالات میں وجہ کو صرف "ذات" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس سے تجسیم کی نفی بھی ہو جاتی ہے اور یہ اعتراض بھی باقی نہیں رہتا کہ لا فانی ذات کی فانی شے سے استثناء کی گئی ہے؟ خاص کر جب کہ یہاں استثناء جنس کی جنس سے نہیں بنا کر استثناء منقطع ہے جو جائز ہے نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں حرف الا کا استعارہ ہے اور معنی ہوں گے ہر چیز فانیذیر ہے صرف اسکی ذات فانیذیر نہیں ہے۔ یہ بات کہ ہالک کا صیغہ حال کا متقاضی ہے مستقبل کی غمازی نہیں کرتا۔ تو یہ بھی کوئی طے شدہ بات نہیں ہے کیونکہ ہالک۔ فاعل کا صیغہ ہے جس میں دوام اور استمرار کا مفہوم لازمی ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ ہر چیز فانیذیر ہے یعنی حال میں بھی فنا کی صلاحیت رکھتی ہے اور مستقبل میں بھی فنا ہونے والی ہے۔

یہ بات کہ اللہ سبحانہ "شیء" ہیں لہذا قابل تجسیم و فنا ہیں تو فرمایا لیس کمثلہ شیء۔ اللہ کی مانند کوئی شی نہیں ہے جس سے "شی" پن کی نفی ہو جاتی ہے اور یہ اسلئے بھی کہ اللہ سبحانہ واجب الوجود ہیں کبھی نہ معدوم ہونے والے جبکہ شیء معدوم ہونے والی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ معتزلہ حالات موجودہ جنت اور دوزخ کو تخلیق شدہ نہیں مانتے کہ آیہ زیر بحث میں ہر چیز کی فانیذیری کی خبر ہے۔ ☆

### خوف۔ اور۔ حزن۔ میں فرق

314

ولا تخافی ولا تحزنی

(نقص، 7) اسے دریا میں ڈالتے وقت نہ خوف کھاؤ نہ دل میں ملال آئے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ۔ جب خوف اور حزن دل پر طاری ہونے والی ایک ہی کیفیت کا نام ہے تو کیا وجہ بنی کہ دونوں کا ذکر الگ الگ کر دیا؟

قول فیصل خوف سے اس کیفیت کا نام ہے جو خارج سے دل پر طاری ہو سکتی ہے مثلاً شیر، پولیس اور کلاشکوف کو دیکھ کر ڈر جانا اسکے برعکس زن اندرونی پریشانی۔ کسی کی ناگہانی موت یا ایسی ہی کسی

25-2-96.

☆

ملال انگیز کیفیت کا دل پر طاری ہو جانا۔

موسىٰ نے ”مکا“ مار اور قبلىٰ نے تڑپ کر جان دے دی

315

فاستغاثہ الذی من شیعته علی الذی من عدوہ فوکرہ موسیٰ فقصیٰ علیہ

موسے کے ہم قوم نے اس سے مدد مانگی آپؑ نے اسکی فریاد پر قبلیٰ کو مکا مارا اور اسکا کام تمام کر دیا۔

(نقص، 15- واجبی ترجمہ)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ سیدنا موسےؑ پیغمبرانہ دل و دماغ کے مالک تھے یوں بھی فرزانے۔ حالات کو جذبات کے ترازو میں نہیں تولتے میزان عقل اور وحی ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر سیدنا موسےؑ نے کسی بھی اصول کو سامنے نہیں رکھا۔

قول فیصل نقص کی آیات (15 تا 19) کو اگر اپنے ظاہر پر ہی رکھا جائے تو بھی واضح ہو گا کہ یہ قتل عمد نہیں تھا غیر ارادی فعل تھا۔ خاص کر اگر بقتلان پر نظر کی جائے تو معاملہ سر پھنول اور دست بدست

لڑائی سے آگے نہیں بڑھتا اور ایسی ہی حالت میں اسرائیلی نے موسےؑ کو دیکھ کر ”چاؤ چاؤ“ کی آوازیں دیں جس پر موسےؑ نے آگے بڑھ کر اسرائیلی کو چھڑوانا چاہا مگر۔ جیسا کہ ایسے حالات میں ہوتا ہے کہ مارنے والا چھڑانے والے سے الجھ پڑتا اور بدکلائی پر اتر آتا ہے قبلیٰ نے بھی سیدنا موسےؑ کو نشانہ تو ہیں بھی بنایا اور دست درازی بھی کر ڈالی جو اہل طور پر سیدنا موسےؑ نے اسکا دماغ درست کرنے کے لئے زور کا دھکا دے ڈالا عربی میں تو کزن کے حقیقی معنی دھکا دینے کے ہیں جنہوں نے مکا مارنا کئے ہیں مشہور لغت نویس محمد بن ابی بکر رازی (1229م) نے ان کی رائے کو کمزور لہجے میں نقل کیا ہے۔ گر امر کی رو سے قبل کا صیغہ ”نا تو انی اور ضعف“ کا غماز ہے (مختار الصحاح طبع دمشق 1978م صفحہ 734 کالم نمبر 14/1) بلکہ رازی سے پہلے راغب (1108م) نے بھی اسکے معنی الدفع (دھکا دینے) کے کئے ہیں (راغب طبع دار الفکر بیروت صفحہ 568) عربی میں جب دروازے یا گیٹ کو دھکا دے کر کھولنا ہو تو لکھا ہوتا ہے ادفعوا (PUSH) اس طرح سامنے سے دھکا دینے کو الو کزن اور پیچھے سے دھکا دینے کو اللکزن کہتے ہیں۔ بات صاف ہو گئی کہ سیدنا موسےؑ نے ”مکا“ نہیں ”دھکا“ دے دیا تھا جس سے قبلیٰ زور جا پڑا فقصیٰ علیہ جس سے اسکی جان پرین گئی اور موسیٰؑ پریشان ہو کر فرمانے لگے ہذا من عمل الشیطان۔



خود و کز سے یہ مضمون تیار ہوتا ہے کہ۔ قبلی نے چھڑانے والے موئے کو فریق سمجھ کر آپ پر جھپٹنے کی کوشش کی ایسے میں آپ نے سامنے ہی سے دھکادے کر ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہر نہ سکا اور جا پڑا۔

### قضیٰ علیہ

قرآن محکم میں قضیٰ کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ الحاقہ (27) میں۔ کانت القاضیۃ اور زخرف (47) لبقض علینا ربک۔ میں قضیٰ۔ موت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن قصص (15) میں ”موت“ کا مفہوم لینے کے لئے کوئی واضح قرینہ موجود نہیں ہے۔ علیہ کا ”صلہ“ ضرور ہے مگر تنہا یہ ”صلہ“ واضح مفہوم نہیں دے سکتا۔ سورہ سبا (14) میں ہے فلما قضینا علیہ الموت فما دلہم علی موتہ۔ جب سلیمان پر ہم نے موت کو مسلط کیا تو موت کی اطلاع کسی نے فراہم نہیں کی ماسوائے دابة الارض۔ کے۔ یہاں دوبار موت کا لفظ استعمال ہوا ہے جسے قضیٰ کے مفہوم کو متعین جت دی ہے کہ اس سے قطعی موت مراد ہے۔ اسی طرح سورہ زمر (42) میں فیمسک النبی قضیٰ علیہ الموت۔ میں بھی اسی اصول کو دہرایا ہے کہ ”فعل“ قضیٰ کے بعد اگر الموت کا واضح قرینہ ”مفعول“ کی حیثیت سے ذکر ہو تب ہی اسکے مفہوم و مطلب میں ”مر جانا“ شامل ہوگا۔ ان قرآنی توجیہات کی رو سے قصص (14) میں قضیٰ علیہ کا ”فعل“ تو ہے مگر اس کا مفعول ”الموت“ نادر ہے جس سے لامحالہ طور پر ”موت“ کے معنی واضح نہیں ہو سکتے بات واضح ہے کہ سیدنا موسیٰ کے دھکے دینے سے اسکی موت واقع نہیں ہوئی قبلی لڑکھڑا کر گر پڑا اور اسکی جان پر بن گئی۔

### شیطانی فعل

اب یہ بات کہ آپ نے پریشان ہو کر اپنے ”عمل“ کو شیطانی فعل سے موسوم کیا تو یہ بھی طے شدہ نہیں ہے کیونکہ ہذا کا اشارہ موسیٰ کی طرف نہیں اسکا مشار الیہ۔ قبلی ہے امام رازی (1210) لکھتے ہیں ہذا اشارۃ الی المقتول بعنرۃ من جند الشیطان و حزبہ  
یہاں ”عمل“ سے مراد قبلی کی ذات ہے یعنی یہ قبلی شیطان کا کارندہ اور ساتھی ہے اور ہم سبھی کا کھلا دشمن ہے عربی کا محاورہ ہے فلان من عمل الشیطان امی من حزبہ فلان شیطان کا عمل ہے یعنی اسکے ساتھیوں اور کارندوں میں سے ہے۔

(تفسیر رازی طبع قاہرہ جلد 24/234/19/20)

نہ صرف قدیم عربی میں ”عمل“ کا لفظ ساتھی، ہمد اور معاون کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے جدید عربی میں بھی پارٹی، گروہ اور کارندہ کو عیب کہا جاتا ہے الیاس انطون الیاس مادہ ع. م. ل. کی ذیل میں لکھتا ہے عمیل وکیل (AGENT)۔ القاموس الجامعی قاہرہ۔ صفحہ 459) پاکستان نے جب عرب اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے لئے بغداد پیکٹ کی رکنیت اختیار کی تو جمال عبدالناصر نے شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا الباکستان عمیل لاستعمار۔ پاکستان سامراج کا ایجنٹ ہے اسکی مزاحمت کرو اور کچھ مرب حکمرانوں کے بارے میں بھی عملاء الاستعمار کی گالی استعمال کرتے رہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ع. م. ل. کے مادے سے تیار شدہ الفاظ میں۔ حلیف ساتھی، مددگار،

ایجنٹ اور ندیم کا مفہوم حسبِ قرینہ شائع و ذائع تھا خود اردو میں بھی کارندوں کا پروانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے حکومتی اعمال تاہل ہیں۔ تمام عملہ برخواست کیا گیا۔ اور اسی ہی مناسبت کو سامنے رکھ کر وحی قرآن نے عمل الشیطان کو شیطانی گروہ میں سے۔ کے مفہوم میں استعمال کیا۔

یہاں امام رازی نے یہ توجیہ بھی پیش کی ہے کہ عمل۔ کو لڑائی جھگڑے کا استعارہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ (جلد 23424) **موسیٰ کا اعترافِ جرم** آپ سے جرم سرزد ہوا ہے۔ اسکے جواب میں امام رازی فرماتے ہیں کہ فعلی نہج

آدم ربنا ظلمنا انفسنا ----- وان لم یکن هناك ذنب قط

”موسےؑ نے کسی جرم کے ارتکاب پر نہیں انبیاء کا وطیرہ ہی یہی رہا ہے کہ جرم نہ ہو تب بھی اللہ کے سامنے اپنی ناکردہ کوتاہیوں پر معذرت کرتے رہتے تھے جیسے آدم نے کہا تھا ربنا ظلمنا انفسنا (مزید مثالیں بھی دی ہیں)“ (رازی 21/234/24 تا 22)

یہاں دعا میں ایک لفظ ہے فَعَفَرَكْہُ۔ اللہ نے موسےؑ کو بخش دیا جس سے ارتکابِ جرم کی توثیق ہو جاتی ہے۔ لیکن رازی ”مغفرت“ کے معنی بخش دینا نہیں کرتے وہ کہتے ہیں بسترہ عن **معافی کی طلب**

الوصول الی فرعون۔ اللہ نے موسےؑ کا پردہ رکھا اور بات فرعون تک پہنچ نہ پائی (234/24۔ پردہ رکھا) رازی کہتے ہیں ”مغفرت“ بمعنی ”پردہ پوشی“ کی اصل قرآن میں موجود ہے کہ موسےؑ نے کہا تھا۔ اے اللہ تیرا یہ احسان ہے کہ میں کسی بحرم کا معاون اور ساتھی نہیں ہوں۔ (قصص، 17) ولو كانت اعانة المؤمن ههنا سببا للمعصية لما قال ذالك۔ ایسے میں مؤمن اور مظلوم کی فریاد رسی کرنا اگر معصیت کا سبب ہو تا تو آپ ظہور المجرمین نہ فرماتے۔ (235/24)

سیدنا موسےؑ نے یہ بھی کہا تھا فعلنها اذا وانا من الضالین۔ جب دھکا دے کر قبلی **موسیٰ کی گمراہی** کو گرایا تھا تو اس وقت میں گمراہ ہو چلا تھا وغیرہ اسکی توجیہ میں رازی لباسِ اعتزال میں نمودار ہو کر فرماتے ہیں۔ ضال کے معنی گمراہی کے نہیں ”حیرت“ اور کشمکش کے ہیں (261/234/24) یعنی قبلی کے جارحانہ وار سے میں کشمکش اور حیرت میں پڑ گیا اور اسی حالت میں ہی اسے مزہ چکھایا ان لغوی اور قرآنی توجیہات کی روشنی میں سیدنا موسےؑ کا دامن صاف ہو جاتا ہے اور وجہ اعتراض ختم ہو جاتی ہے وہو المقصود

☆

منگیتر کا تعین کئے بغیر نکاح

316

انی ارید ان انکحک احدی ابنتی ہ تین

(قصص، 27)

میں چاہتا ہوں ان دو بیٹیوں میں سے ایک آپ سے بیاہ دوں۔

یہ ہے کہ۔ جب تک مخطوبہ کا تعین نہ ہو نکاح کی بات نہیں ہو سکتی۔

وجہ اعتراض

بات ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے جب موئے آمادہ ہو کر اپنی پسند کا اشارہ کریں گے تب نکاح کا مرحلہ آئے گا۔ تاہم ان تمام مراحل کا تعلق چونکہ شادی بیاہ سے تھا لہذا نکاح ہی سے موسوم

قول فیصل



کیا گیا۔

## گناہوں پر الزام

317

وجعلناهم ائمة يدعون الى النار

(قصص، 41)

اور یہ اہلِ نار کے امام بنادئے گئے۔

میں کہا جاتا ہے کہ جب تک کسی کا ”شخصی“ اور ”اسمی“ تعین نہ ہو۔ اضافت کا ضابطہ کارگر نہیں ہو سکتا جیسے یہاں اہلِ نار۔ لیڈروں کا معاملہ ہے کہ ان کے نام لے کر بات نہیں کی گئی۔

وجہ اعتراض

اپنے اپنے وقت میں انبیاء و عرسلین سے مقابلے کرتے کرتے ان لوگوں نے اتنی شہرت حاصل کر رکھی تھی کہ نام لینے کی ضرورت ہی نہیں رہی اشارے ہی سے پتہ چلتا کہ کس گمراہ لیڈر نے

قول فیصل



کس نبی محترم کا مقابلہ کیا۔

عنکبوت

## ہزار سال سے پچاس نکال کر

318

الف سنة الا خمسين عاما

(عنکبوت، 14)

ہزار سال میں سے پچاس نکال کر۔

یہ ہے کہ عربی میں سنة اور عامہ ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔ اس طرح صرف ایک ہی لفظ سے کام چل سکتا تھا۔ بلاوجہ تکرار سے فصاحت و بلاغت پر زبرد پڑتی ہے نیز نو سو پچاس کہنے سے مفہوم زیادہ

وجہ اعتراض

قریب الفہم بن سکتا تھا بہ نسبت ہزار سال میں سے پچاس نکال کر۔

کلام میں ”تنوع“ سے حسن پیدا ہوتا ہے جو کہ فصاحت و بلاغت ہی کا اعادہ ہے۔

قول فیصل



## روزی کے لئے فریاد کس سے کی جائے؟

319

ان الذين تعبدون من دون الله لا يملكون لكم رزقا فابتغوا عند الله الرزق

جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تمہیں کچھ بھی روزی نہیں دے سکتے لہذا اللہ ہی سے روزی مانگو۔ (عنکبوت، 17)

میں کما جاتا ہے کہ۔ رزق کو پہلے نکرہ (رزق) کی صورت میں بیان فرمایا اور پھر معرفہ (الرزق)

وجہ اعتراض بنادیا۔

اسمیں یہ وضاحت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جن سے تم روزی کی امید کئے ہو وہ کچھ بھی نہیں

دے سکتے (رزق) لہذا روزی اس سے مانگو جو روزی رسانی کا ساز و سامان بھی رکھتا ہے اور اسباب بھی

قول فیصل

فراہم کرتا ہے۔ ☆ (الرزق)

## گناہ جو لذت فراہم کرے اور سزا نہ ہو

320

انکم لتأتون الرجال وتقطعون السبل

تم لونڈوں سے ڈرتے ہو اور (اس طرح) نسلی افزائش کا سلسلہ منقطع کرتے ہو۔ (عنکبوت، 29)

انکم لتأتون الرجال شهوة من دون النساء

تم عورتوں کو چھوڑ کر لونڈوں ہی کو شہوت رانی کا ذریعہ بناتے ہو۔ (نمل، 55)

یہ ہے کہ یہاں ذہب زنی پر ”اتیان“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو صرف ”ڈرانے“ کو کہا جاتا ہے اور اس

ڈرانے کی حضرت انسان نے ناف سے لے کر وہن و در تک رسائی حاصل کر کے صورتیں نکال لی

وجہ اعتراض

ہیں جو جرم کی سنگینی کے احساس کو ابھارنے میں مدد نہیں دے سکتیں۔

امام بدر الدین زرکشی (1392م) جلال الدین سیوطی (1505م) اور امام سوکانی (1834م) نے

وضاحتیں کی ہیں کہ عرب جس بات کو اپنی بول چال میں خلاف آداب زبان و بیان سمجھتے اسکے لئے

قول فیصل

”کنائے“ کا سہارا لیتے چنانچہ وہ نسوانی خواہ غلامی جسم کے حساس شہوانی حصوں تک در آنے کو ”اتیان“ کے کنایہ ہی میں

ذکر کرتے تھے چنانچہ نساء (15) میں جہاں دو نروں کے باہمی اختلاط کو بیان کیا ہے وہاں بھی ”اتیان“ ہی سے مفہوم واضح

کیا ہے۔ بلکہ دو عورتوں کے مصنوعی طریقوں سے فاعل و مفعول کا کام سرانجام دینے کے لئے بھی ”اتیان“ ہی کے کنایہ کو

درمیان میں لایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ”اتیان“ کوئی معمولی در آنے کا غماز نہیں ہے بلکہ نمل (55) کی ضد

میں بات زیادہ قرین فہم بن جاتی ہے کہ یہ ڈر آنا۔ غیر معمولی ہے جو پورے نظام ”شہوت رانی“ (شهوة) کو شامل ہے

-----اپنی بیوی کے فطری راستہ پر در آنا ہے تو (فاتوا حوثکم)----- چٹنی بازی کے لئے دو عورتوں کا ایک دوسرے کے پاس در آنا ہو تو (واللائی یاتین الفاحشة)----- یا غلام بازی کے لئے در آنا ہو تو (واللذان یاتیانہا منکم)----- ان تمام صورتوں میں ”اتیان“ کا کنایہ ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ کنایہ سبھی اصولیوں نے تسلیم کیا ہے کہ جہاں اعلیٰ ذہانت کا غماز ہے وہاں صراحت و صاحت سے زیادہ بلیغ بھی ہے اس سے نہ تو جرم کی سنگینی کا وزن گھٹانا مقصود ہے اور نہ ہی دانستہ فحش کے ارتکاب پر پردہ ڈالنا مطلوب۔ غرض کہ وحی الہی نے ”اتیان“ کو صاف لفظوں میں فطری خواہ غیر فطری فعل کا کنایہ ٹھہرایا ہے ارشاد ہے۔

واللذان یاتیانہا منکم فاذوہما----- اسکے ترجمہ میں امام الہند (1958م) فرماتے ہیں :  
 ”اور جو دو شخص تم میں سے بد چلتی کے مرتکب ہوں تو چاہیے کہ ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ۔“

(ترجمان القرآن طبع 1947 جلد 1/363)

بات واضح ہو گئی کہ یہ ”اتیان“ کسی معمولی نوعیت کے در آنے سے تعبیر نہیں باقاعدہ شہوت رانی کے مقامات کو استعمال میں لانے کا کنایہ ہے۔ زیر بحث آیہ میں ونقطعون السبیل سے اس پر روشنی پڑ سکتی ہے کہ ”ذریزنی“ کے فلسفہ کو پر دان چڑھانے سے افزائش نسل کا راستہ منقطع ہو جاتا ہے۔ جو کہ مطلوب خدا ہے اور نہ ہی ذریعہ تخلیق انسانی (خواتین) کو بے مقصد بنانا۔ ملحوظ خاطر۔

یہاں نساء (16) میں اللذان یاتیانہا منکم۔ فاذوہما۔ سب مردانہ صیغے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ وحی الہی نے اپنا منشاؤں کا چھپا نہیں رکھا۔ وہ جرم ”ذریزنی“ کی باقاعدہ سزا تجویز فرماتا ہے تاہم اس سزا کو۔ صلابہ دیدی تعزیر۔ سے موسوم کرتا اور عدالت کو ذریزنی کا اختیار دے دیتا ہے یعنی عدالت چاہے تو ملزم کو نقد جسمانی (غیر معزز) سزا مثلاً چالیس پچاس کوڑے رسید کر دے چاہے تو جیل بھجوا دے۔ بلکہ اسلامی تاریخ بتلاتی ہے کہ اسلامی عدالتوں نے اس جرم کی سزا اپنی اپنی صوابدید کے مطابق ہی دیدی ہے مقصد یہ ہے کہ ملزم کو ذہنی اور جسمانی اذیت سے دوچار کیا جائے۔ چنانچہ قدآور قرآنی دانشوروں نے جو الفاظ وحی کی گرائی اور گیرائی کا عمیق ادراک رکھتے تھے آیہ نساء کے مردانہ صیغوں کو جرم لواطت سے مربوط قرار دے کر علما کے موقف کو پوچھا ثابت کیا ہے امام مجاہد بن جبر (722م) امام ابو مسلم (934م) امام رازی (1210م) علامہ سیوطی (1505م) سید احمد خان (1898م)۔ امام محمد عبدہ (1905م) سید رشید رضا (1935م) وغیرہ نے ”اتیان“ کا جو مفہوم واضح کیا ہے لغت، استعمالات عرب اور وحی قرآن نے اسے دو مردوں کے فعل سے مربوط ٹھہرا کر احساس دلایا ہے کہ یہ جرم۔ جرم زنا۔ کے علاوہ مستقل نوعیت کا جرم ہے لیکن،

مفسرین بڑے کائنات میں تھے وہ اپنے ہم مشرب علماء کی در پردہ عادات سے آگاہ تھے وہ جانتے تھے کہ اگر آیہ نساء کو بنیاد بنا کر اغلام بازی سے متعلق ٹھہرایا گیا تو اس سے کسی بھی ذی علم کے کار غلوت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تیز گائی، دکھلائی کہ خود ان کا محمل فکر بھی ان کے پیچھے اٹھے ہوئے گرد و غبار میں چھپ کر رہ گیا تب انہوں نے



آگے بڑھ کر اس آیہ ہی کو منسوخ کر ڈالا اور بظاہر تاویل کا سہارا لیا کہ اس کا تعلق زنا سے ہے جبکہ زنا کی سزا سورہ نور میں واضح ہو چکی ہے اس طرح انہوں نے انکار محض کی روش اختیار کرنے کی بجائے سرے سے نساء کے مردانہ صیغوں ہی پر ہاتھ صاف کر دیا۔ حالانکہ یہ آیت اگر منسوخ کر دی جائے تو پورے قرآن میں دوسری کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو ”ذیر زنی“ کو جرم بھی ٹھہراتی ہو اور اس کھلے جرم کے لئے سزا بھی تجویز کرتی ہو۔ ہمارے مذہبی دانشوروں کے جھروکوں میں اگر جھانک کر دیکھا جائے تو ان کے شیخ کے پس پردہ بھی ان کا یہ اصرار خراں نظر آئے گا کہ یہ جرم قابلِ تعزیر ہے ہی نہیں کیونکہ شیخ شدہ حکم اپنے مالک و ماعلیہ کے تمام زلو یوں سے منسوخ ہی تسلیم کرنا ہو گا۔ چنانچہ وحی قرآن کی پالیسی کو جھٹک پھینکنے کے بعد ان لوگوں نے کھلے عام اغلام بازی کو انعام باری کہنا شروع کر دیا۔ یہ نہ اتمام ہے نہ الزام۔ امام عبدالرؤف مناوی (1662م) نے علامہ بلقینی کے تذکرے سے اغلام بازی کے موضوع پر منعقد علامہ ابو علی بن الولید اور علامہ ابو یوسف قزوینی کے ایک مناظرے کی تفصیل دی ہے جو میری علمی تصنیف منسوخ القرآن اور برہان القرآن میں جمع مرئی عبارات موجود ہے اس میں علامہ ابو یوسف قزوینی نے ابو علی بن الولید کو ہرا کر بدلائل ثابت کیا ہے کہ۔ جنت میں بھی اغلام بازی بطور انعام باری کا چلن ہو گا۔ اس پر اعتراض ہوا کہ یہ راستہ اس کام کے لئے نہ خالص ہو اور نہ ہی ایک مرد کا دوسرے مرد سے بھیاکی سے پیش آنا روا ہے اسکے جواب میں کہا گیا کہ یہاں حرمت کی صرف ایک ہی علت بیان ہوئی ہے کہ یہ راستہ غلاظت کے اخراج کے لئے ہے۔ لیکن حقیقت میں تو نظام ہضم ہی بدل جائے گا جو کھاؤ پیو فضلہ نہیں بنے گا۔ اس طرح یہ راستہ بھی اہل جنت کے چلنے کے لئے کھل جائے گا۔ قزوینی کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی بھی مصنوعی طریقہ سے غلاظت کو صفائی میں بدل دیا جائے تو اغلام بازی سے روکنے کی پابندی ختم ہو سکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو مناوی کی فیض القدیر شرح جامع الصغیر طبع مصر

۱۳۳۹ھ جلد 16/226/6 (20۱۱)

اس مناظرے سے مذہبی لوگوں کے اغلام بازی سے شغف اور دلچسپی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اب ذیل میں خافقہ اور مذہبی لوگوں کے چند واقعات عرض کر کے اپنے مدعا کو زیادہ واضح کر رہا ہوں کہ ان لوگوں نے کسی فنی توانائی کا سہارا لئے بغیر نساء (15) کو اسلئے منسوخ ٹھہرایا ہے کہ اس طرح ان کے محبوب مشغلہ اغلام بازی کی حرمت اور تعزیر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے رک جائے گا۔

امام ابو العباس احمد الجرجانی۔ ابو حیان سے امام جاحظ (868م) کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ۔۔۔۔۔  
(حذف مرئی عبارت) ”ذیر زنی“۔ صوفیاء کا پسندیدہ مسئلہ ہے بلکہ مانی (276م) کے بہت سے ماننے والے اسے۔ قطعی حلال سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اسکے فلسفہ ”تجرد“ سے متاثر مسلم صوفیا بے حد متاثر تھے اور بر ملا ذیر زنی کو مباح کہتے تھے اور کہتے کہ۔ فلاں صاحب ”ہرن“ سے زکوٰۃ لیتا ہے یعنی مرد لڑکے سے ڈرتا ہے۔ اس طرح ہرن۔ لونڈے اور درآنا۔ فعل بد کے کنایہ کے بطور استعمال کر دیا جاتا تھا۔ المنتخب من کتبات الادباء طبع دار البیان بغداد (صفحہ 28)

مانی کے حوالے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قدیمی آرٹ کالیڈیا اور پردیشا میں یکساں متعارف و بے عار مشغلہ تھا اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ صوفیا کا سلسلہ ان ہی دو خطوں سے نمودار ہو کر اسلامی اخلاقیات پر حاوی ہوتا گیا مشہور مصری سکالر۔ عباس محمود عقاد مرحوم لکھتے ہیں کہ۔ مشہور صوفی ابو العتہبہ (825م) اغلام بازی کے رسیا تھے (المجلد طبع لندن صفحہ 92 عدد 55 سال نمبر 2) حافظ ابن حجر (1449م) نے رئیس المحدثین سلیمان بن ارقم اور اس کے پوتے کے بارے میں لکھا ہے کہ دونوں اپنے شاگردوں کو حدیثیں بھی پڑھاتے تھے اور ان کی ویر زنی بھی کرتے تھے۔

(ابن حجر بر روایت ابو عبد اللہ اندلسی (840م) تہذیب التہذیب طبع دکن جلد 4/165/1)

بغداد کے چیف جسٹس سید بن اکثم اسدی (857م) کوئی معمولی آدمی نہیں تھے خلیفہ مامون کے عہد حکومت میں امور مملکت کے مدیر اعلیٰ تھے فقیہ تھے درجہ اجتہاد پر فائز اور مقنن تھے (مجدد الاعلام طبع دہم بیروت صفحہ 784 کالم 2) ان ہی کے اخلاقی سفلہ پن کی بابت ابو العباس احمد الجرجانی (1089م) لکھتے ہیں کان القاضی یحییٰ بن اکثم مشہور باللواط حتی صار يعرف بہ

قاضی یحییٰ بن اکثم۔ ویر زنی کے شدید رسیا تھے جسے کہ لواطت ہی ان کا طرز شہرت بن گئی۔

(المنتخب من کنایات الادباء طبع بغداد صفحہ 29)

اسی جسٹس کے بارے میں احمد بن یوسف کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جسٹس موصوف کے آفس میں اسکا ریڈر زیدان (جو کہ نہایت ہی حسین و جمیل تھا) فائل کھولے یحییٰ کے سامنے کچھ دیکھ رہا تھا کہ یحییٰ اپنے پر قابو نہ رکھ سکا اور اٹھ کر زیدان کو اپنی آغوش میں بچھ لیا اور رخسار و بدن پر کرم کرم بوسے چست کر دیئے۔ زیدان غصے ہوا قلم چھوڑ جانے لگا یحییٰ نے بڑی منت سماجت کر کے ٹھکرایا (النتخب 11/30 تا 13)۔۔۔۔۔ اسی قاضی کے بارے میں مشہور عرب دانشور احمد بن ابی سلمہ اور احمد بن نعیم و دیگر شعراء نے ڈھیر سارے اشعار کہے ہیں۔ اوہر خلیفہ مامون عباسی (813م) کو نیز ”ویر زنی“ کی عادت تھی یہ اور یحییٰ مل کر غلطو توں میں ”ہر نوں“ کا شکار کھیلتے تھے ایک دفعہ مامون کی میز پر لکھا ہوا ملا :

امیر نا یوشی و حاکمنا

یلوط والراس شرماراس

مامون نے پوچھا یہ کس کا شعر ہے؟ یحییٰ نے کہا تمہارے فشی احمد بن نعیم کا ہے۔ اس پر خلیفہ نے اسے مملکت کے دور دراز علاقے سندھ کی طرف تبدیل کر دیا۔ اس بیت کا مفہوم ہے :

”حکام رشوت لینے میں لگے ہوئے ہیں اور خلیفہ اغلام بازی میں مگن۔ اُف حکومت کرنے کے

لئے کیسے کیسے دماغ مسلط ہوئے ہیں۔“

(المنتخب صفحہ 18/30 تا 23)

اسی زمانے میں حسینوں سے خراج لینے کیلئے کنایہ مشہور ہوا تھا کہ۔ یہ جسٹس یحییٰ کا پیر و کار ہے۔ اسی عادت کا رسیا ایک شاعر کہتا ہے :

ادین بدین الشیخ یحییٰ بن اکثم

وانی لمن یهوی الزنا لمجانب

میں دین خبیث کا پیروکار ہوں لو اطم میرا دین ہے۔ فطری عمل سے مجھے نفرت ہے۔ (المنتخب صفحہ 29)  
مشہور محدث عبد الرزاق بن ہمام صنعانی (827م) سے۔ سلیمان بن داؤد الشاذکونی (847م) کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیسے ہیں تو عبد الرزاق نے غصہ ہو کر ہاتھ کی مٹھی بھد کر کے اندر اور باہر لے جا کر کہا کہ۔ یہ شاذکونی خبیث لوٹوں سے یوں یوں کرتا ہے۔ پھر کہا۔ کان یومی بالغلمان۔ اغلام بازی میں داغدار رہتا تھا۔

(لسان المیزان معنی علامہ ابن حجر طبع دکن جلد 84/3 885)

خود ابن حجر (1449م) جو کہ حدیث نبوی کے بڑے شارح اور پشتیبان تھے اپنے اندر کے چور پر پردہ نہ ڈال سکے اور لہجے کو نیا انداز دے کر۔ بیویوں کی دہر زنی کے قائل تھے اور اسکے لئے اتنی روایات جمع کر رکھی تھیں کہ بہتے بڑے محدث مجال انکار نہ پا کر اعتراف پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس پر کسی نے اعتراض کیا آپ کے مدوح امام بخاری (870م) بو ذہبی و دیگر نے ان روایات کو پوچھ قرار دیا ہے تو ابن حجر نے پلٹ کر جواب دیا کہ یہ بخاری اور ذہبی وغیرہ کی کیا مجال ہے کہ صحیح روایات کو مسترد کر دیں لیکن طرقہا کثیرہ فمجموعہا صالحۃ للاحتجاج بہ جبکہ روایات اور ان کی متعدد صحیح سندیں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم ان پر عمومی نظر کرتے ہوئے قابلِ حجت (اور قابلِ عمل) تسلیم کر لیں۔

امام خطیب بغدادی جو بڑے پائے کے مؤرخ اور محدث تھے اپنی شہر کا فاق اصولی کتاب الکفایہ میں لکھتے ہیں :  
”فسق و فجور میں مبتلا راوی کی روایت کو مسترد کر دینے پر تقریباً بھی ائمہ حدیث متفق تھے اور اسی ہی بنا پر انہوں نے فقیہ اعظم سفیان بن عیینہ (816م) کے یار غار شیخ الحدیث ابو منذر کی روایات کو اس بنا پر مسترد کر دیا تھا کہ موصوف ”شاہ باز“ بھی تھے اور محدث اعظم عبد الوہاب ثقفی (809م) کے خور و لڑکے کی دہر زنی بھی کرتے تھے۔ اس پر اسے بصرے سے نکال بھی دیا گیا تھا۔“

(الکفایۃ الخطیب طبع مصر صفحہ 84/157)

خطیب (1071م) ایک بلند پایہ حدیث دان اور مؤرخ تھے ان کی گواہی ہے کہ ابو منذر بایں جلالت دہر زن اور فحش کار تھے۔  
**ناظرین محترم۔** تلخیصات کے زیر سایہ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ملوک اور ملاں نے ہمیں جس انحطاطی کلچر کا عادی بنا دیا ہے وہاں ہماری اخلاقی سطح اتنی پاکیزہ نہ بن سکتی تھی کہ ہم قومی روایات کی پاکیزہ تھمیری کر سکیں لوط اور ہیروان مانی نے اپنے غیر فطری عمل کے لئے عورتوں کو معاف کر رکھا تھا مگر ہم غلامت چاٹنے کے اتنے رسا بن گئے کہ عورتوں کو بھی معاف نہ کر سکے نہ صرف اتنا جسارت یہ کہ ابن حجر ہم سے وجہ انکار دریافت کرنے کی پوزیشن میں بھی سامنے آچکے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ایک ناگوار بحث کو زیر بحث لایا لیکن اگر یہ لوگ نساء (15) کو منسوخ نہ کرتے اور مردانہ

صیغوں کو معطل و بے معنی قرار دے کر اپنی ناآسودہ خواہشوں کی آمیزش نہ کرتے تو مجھے آئینہ دکھانے کے لئے اتنی کاوش نہ کرنی پڑتی۔ شکریہ۔



## رسول اللہ پڑھنا بھی جانتے تھے اور لکھنا بھی

321

### ولا تخطه بيمينك

(عنکبوت، 48)

اور نہ ہی تم اپنے داہنے ہاتھ سے لکھنا جانتے تھے۔

میں کہا جاتا ہے کہ لکھا تو ہاتھ ہی سے جاتا ہے ایسے میں ”نہ ہی تم لکھ سکتے“ کافی ہو سکتا تھا ہاتھ کا حوالہ کچھ ضروری نہ تھا۔

وجہ اعتراض

یہاں لا تخط کی۔ لا میں پوشیدہ ”نہی“ کو مؤکد بنایا گیا ہے اور ایسی ہی تاکید اثبات کے موقع پر

قول فیصل

بھی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ جیسے کہنا کہ۔ هذا الكتاب مما كتبه فلان بيمينه۔ یہ وہ کتاب ہے جسے فلاں نے اپنے ہی داہنے ہاتھ سے لکھا ہے مقصد یہ کہ خود لکھی ہے کسی سے لکھائی نہیں۔ اس طرح کہا جاتا ہے۔ رایت فلانا یعنی۔ میں نے فلاں کو اپنی آنکھوں نے دیکھا ہے۔ حالانکہ دیکھنا آنکھوں ہی کا عمل ہے۔ صرف ”دیکھا ہے“ سے کام چل سکتا تھا مگر کلمات کو پختہ اور یقینی بنانے کے لئے اپنی آنکھوں کا حوالہ دیا۔

اس آیت کی ذیل میں کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی نبی اکرم ﷺ کے ان پڑھ ہونے کا احساس کیا جاسکتا ہے جی ہاں۔ ایسا ہو گا مگر آیہ کریمہ سے تو اسکے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ نزول وحی کے بعد آپ پڑھ بھی لیتے تھے اور لکھ بھی سکتے تھے فرمایا۔ يتلوا صحفا مطهرة۔ آپ دیکھ کر پڑھ لیتے تھے۔ (بنہ، 2)۔ اتل ما وحي اليك من ربك۔ آپ اپنی وحی کو دیکھ کر پڑھ لیں (عنکبوت، 40۔۔، کف، 27)۔ تلاوت عربی میں دیکھ کر پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اس طرح آپ سابقہ صحیفوں کو دیکھ کر بھی تلاوت کرتے اور قلم تمام کر لکھ بھی لیتے تھے اس طرح قرآن نے رسول اکرم ﷺ کے دیکھ کر پڑھنے اور قلم تمام کر لکھنے کو مضارع کے صیغے سے سات اور متکلم کے لہجے میں پانچ مرتبہ ذکر کر کے اس خیال اور نظریے کو مفلوج کر دیا ہے کہ آپ نزول قرآن کے بعد بھی ان پڑھ تھے؟ ☆

## جہنم کن کن کو گھیرے میں لئے ہوئی ہے؟

322

### وان جهنم لمحيطه بالكافرين

(عنکبوت، 54)

بلاشبہ جہنم کافروں ہی کو گھیرے میں لے لے گی۔

یہ ہے کہ۔ محیطۃ پر لام واقع ہے جو جہنم کو صرف کافروں کے لئے ہی خاص کرتا ہے۔

وجہ اعتراض

## قول فیصل

لیکن اس سے کب ثابت ہو کہ جنم دوسرے بحرِ مومن کا احاطہ نہ کر سکے گی؟ مروجہہ کا یہ کہنا کہ جنم کسی کو بھی محیط نہ ہوگی اور خوارج کا یہ عقیدہ کہ جس پر بھی کفر کا اطلاق ہو گا وہ لازمی طور پر جہنم میں جائے گا کم از کم آیہ زیر بحث سے دونوں کی مطلب برآری نہیں ہو سکتی۔

☆

روم

## زمین و آسمان کی تخلیق

323

ما خلق الله السماوات والارض وما بينهما الا بالحق

کیا وہ سوچتے نہیں کہ اللہ نے آسمانوں، زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے اسے حق کے ساتھ پیدا کیا۔ (روم، 8)

میں کہا جاتا ہے کہ۔ جب ہر چیز کو وجود میں لانے والے خدائے الیزال ہیں کیا بری کیا بھلی؟ تو

”حق“ کہنے سے کیا مقصد ہے؟

وجہ اعتراض

حق کہنے سے یہ مقصد ہے کہ اللہ کے سب کام حسن و خوبی لئے ہوئے ہیں بدی کا فاعل وہ نہیں

حضرت انسان خود ہے یہاں دعوتِ فکر (اولم یفکروا) کی غایت بھی یہی ذہن نشین کرانے

کے لئے ہے کہ اللہ بدی کا خالق نہیں صرف ”برحق“ سچائیوں کو جوئے نئے والا ہے۔

قول فیصل

25-2-96 ملتان

☆

## خدا کو دیکھنے کے منکر۔ کافر ہیں؟

324

وان كثيرا من الناس بقاء ربهم لكافرون

(روم، 8)

اور بہت سے لوگ۔ لقاء رب کے منکر ہیں کافر ہیں۔

یہ ہے کہ اس آیت میں رویتِ باری کے منکر کو کافر کہا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

لقاء۔ اور رویت دو مختلف لفظ ہیں ان کی معنوی ہم آہنگی بھی نہیں ہے۔ لقاء نزدیکی اور

سامنا کرنے کا صرف استعارہ ہے اس سے ”لمس“ یا شج کرنے والا فعل مراد نہیں ہے خاص کر

جہاں تلاش منزل کا مرحلہ درپیش ہو تو منزل تک پہنچانے کے واسطے کو بھی لقاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علاوہ یہاں

☆

کافرون سے اصطلاحی کفار مراد نہیں ہیں۔

قول فیصل



## زبان اور رنگ قدرت کے انمول شاہکار

325

ومن آياته خلق السموات والارض واختلاف السنتكم والوانكم

اور اسکی انمول نشانیوں میں سے زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا بھی ہے۔ (روم، 22)

میں کہا جاتا ہے کہ لسانی اختلاف کو قدرت کے انمول شاہکار میں شمار کیا گیا ہے جبکہ یہاں ہر فتنے کا سبب لسانی اختلاف ہی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

**وجہ اعتراض**

زبانوں کو فتنے کا موجب ٹھہرانا۔ اہل اردو۔ جماعت اسلامی اور نظریہ پاکستان والوں کا شاخسانہ ہے

**قول فیصل**

اللہ نے اگر زبانوں کو اپنا ”تخلیقی شاہکار“ ٹھہرایا ہے تو ہمارا ایمان ہے کہ اللہ نے کچھ کہا ہے اور کوئی

بھی شاہکار۔ فتنے کا موجب نہیں بن سکتا۔ ان کا اختلاف بہ تخلیق کار کی گونا گوں صفات کا اظہار ہے۔ اریوں انسان ہزاروں بولیاں بولتے ہیں جس سے بنانے والے کی قدرت کاملہ کے شوق پسندی کا احساس ابھرتا ہے۔ جس طرح ایک ہی والدین کی درجن بھر اولاد کے چہرے، صرے۔ قد، قامت، خدو خال، نقوش و خطوط۔ آواز و آہنگ میں یکسانیت نہ ہونے کے باوصف وحدت خالق کی چغلی کھاتے ہیں۔ اسی طرح قوموں کی بولیاں۔ وطنی عادات، اور رنگ و نسل بھی اپنے اپنے دائرے میں وحدت خالق پر گویا اور ناطق ہیں۔ اب جو لوگ مذہب کی غلط توجیہات کے شکار ہو کر قدرت کے نشانات کو فتنے کا موجب ٹھہراتے ہیں وہ اپنی ذہنیت اور ناسودہ سوچ کے اسیر ہیں۔ ان کے منہ سے جو کچھ نکلے گا ان کے بغض دروں کا کرشمہ ہی ہوگا۔ یہاں لوگوں نے بلاوجہ اردو کو چارچ زبان بنا کر۔ نفرت کے اصنام تراشے ہیں۔ مقامی زبانوں نے اردو کا کھلے دل سے استقبال کیا تھا۔ مگر کافروں کے دیس سے آنے والوں نے نگالیوں اور بندھیوں سے الجھ کر اسلام شکنی کا کھلا ثبوت دیا ہے اور اس ”کفر گرمی“ میں جماعت اسلامی کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کے نام پر تعصب اور نفرت کے جوہر تراشے ہیں اب یہ ہمیشہ پوجے جاتے رہیں گے۔

☆

## کائنات کو دوبارہ جنم دینا۔ آسان یا مشکل؟

326

وهو الذي يبدأ الخلق ثم يعيده وهو أهون عليه

وہ ہی تو ہے جس نے مخلوقات کی تخلیق کی پھر اسے دہرائے گا اور یہ کام اسکے لئے آسان تر ہے۔ (روم، 27)

یہ ہے کہ یہاں کسی نئی تخلیق کو آسان ”تر“ کہا ہے جبکہ اسکے لئے کوئی کام غیر آسان ہے ہی نہیں۔

**وجہ اعتراض**

## قول فیصل

اَفْعَل۔ کا صیغہ بلاشبہ زیادہ مبالغہ کیلئے ہے یعنی کسی چیز کو کسی چیز پر ترجیح یا برتری دینے کے لئے مبالغہ کی آخری سٹیج (افعل) کو استعمال کرنا اسی طرح معنی ہوں گے نئی تخلیق اللہ کے لئے نہ صرف آسان سے آسان تر بھی ہے لیکن عرب میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ مبالغہ کے لئے آخری سٹیج کا صیغہ بول کر بھی ”خالی“ مبالغہ مراد لیتے تھے فرزدق شاعر کہتا ہے :

ان الذی سمک السماء وبنی لنا  
بیتا دعائمہ اعز و اطول

یہاں اعز۔ اور۔ اطول۔ زیادہ مبالغہ کے لئے استعمال نہیں ہوئے صرف مبالغہ کے لئے ہوئے ہیں اسی طرح معن بن اوس شاعر کہتا ہے :

لعمرك ما اذی وانی لاوجل  
علی اینا تعدوا المنیة اول

یہاں اووجل۔ کا مبالغہ صرف وجل میں منحصر ہو گیا ہے معنی ہوں گے :  
”تمہاری قسم میرا دل اسی خوف سے کانپ رہا ہے کہ ہم میں سے موت پہلے کس کو دبوچ لیتی ہے؟“

اسی تناظر میں اہون کے معنی صرف آسان کے ہوں گے۔ ☆

## آفرینش کے اُصول فطری اور اٹل ہیں

327

### فطرة الله التي فطر الناس عليها

اللہ نے فطری قوانین کے مطابق ہی انسانوں کو پیدا کیا ہے (تم اسی فطری اصول کو ملحوظ رکھو کہ) اللہ کا قانون تَنْجِیْوُنا قَاتِلِیْ تَغْیْرِہ۔ (روم، 30)

میں کہا جاتا ہے کہ فطرت قوانین الہی سے تعبیر ہے پس جب ہر چیز کی تخلیق کے لئے مقررہ قانون ہے تو صلہ و سزا عتاب اور جزا۔ کی بات ختم ہو جاتی ہے وہ تو جو کچھ ہونا ہوتا ہے قانون کے محور میں ہو چکا ہوتا ہے۔

## وجه اعتراض

فطرت کی جو حیثیت ہے اور اس سے جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے۔ اس سے نہ آپ کے مقصد کی برامی ہو سکتی ہے اور نہ ہی فطرت کی نفی بلکہ جہاں تک صلہ و سزا کا تعلق ہے تو ان کی سرے سے بات ہی نہیں ہوئی۔ یہاں صرف یہ احساس دلایا گیا ہے کہ انسان فطرت اللہ کے مطابق انسان ہی پیدا ہوا ہے اسی طرح چوپائے، چرند، پرند کیڑے مکوڑے و دیگر حشرات بھی قانون فطرت کے مطابق اپنی اپنی فطرت لئے پیدا ہوئے ہیں۔ کوئی انسان

## قول فیصل

چوپایہ، نہیں بن سکتا۔ کوئی درندہ انسان نہیں بن جاتا۔ کہ اللہ کے قوانین مستحکم اور ناقابل تغیر ہوتے ہیں ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ نے پہلی تخلیق میں جس طرح کا چہرہ، آنکھ، ناک اور پیشانی انسان کے لئے بنائے پھر اربوں سال کے بعد جب کبھی اسی انسان کو حیات نو۔ میں لے آئیں گے تو اسکے چہرے پر گھوڑے کے چہرے، مینڈک کی آنکھ اور ہاتھی کی سونڈ چپکادیں گے ولن تجد لستہ اللہ تبدیلا۔ اسی طرح قانون، تخلیق یہ ہے کہ زرد مادہ کے اتصال جسمانی سے مخلوق جنم لیتی ہے یہ فطرت ہے اور ماورائے فطرت مخلوق پیدا نہیں ہو سکتی۔ ☆

لقمان

## موسیقی حلال۔ یا حرام؟

328

### ومن الناس من يشترى لهُوا الحديث

لوگ ایسے بھی ہیں جو غافل کرنے والی چیزوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ (لقمان، 6)

یہ ہے کہ۔ آئیے بحث میں گانے جانے کی حرمت کی بات کی گئی ہے جبکہ حقیقت اسکے برعکس

وجہ اعتراض ہے۔

آئیے ہذا میں۔ لہوا الحديث سے گانا موسیقی مراد لینا صریح تحریف یا قرآن میں ایسی چیز کا اضافہ

### قول فیصل

کرنا ہے۔ جسے قرآن ہضم ہی نہیں کر سکتا۔ ”موسیقی“ وغیرہ میں۔ مانا کہ خرابیاں ہوں گی مگر یہ مسئلہ قرآن کا نہیں۔ محدثین اور فقہا کا ہے۔ قرآن نہ تو انسانوں کی ”جسمی رغبات“ کو کچلتا ہے اور نہ کچلنے دیتا ہے۔ وہ خرابی کو خرابی کی حیثیت سے دور تو کرتا ہے مگر ”غیر فطری“ ہتھکنڈوں سے ختم نہیں کرتا۔ ”فنون لطیفہ“، مصوری، موسیقی اور طریقہ ”قص انسان کی ”جسمی رغبات“ سے مربوط ہیں۔ ”پابندی“ کے قواعد و ضوابط صاف اور صریح ہونے چاہئیں ”استدلالات“ کی کج بحثی کسی کے لئے شریعت نہیں بن سکتی۔ لہذا میرے نزدیک لہوا الحديث کا تعلق نہ گانے جانے سے ہے اور نہ ہی طریقہ رقص اور موسیقی وغیرہ کی ممانعت سے۔ میں نے ان موضوعات پر بڑی تفصیل سے لکھا اور گروہ علماء پر حقیقت حال واضح کر دی ہے میرے مقالے،

I ابن حزم کا موسیقی نامہ

II تصویر اور اسلام۔ اور

III طریقہ رقص علمی حلقوں میں بے حد پسند کئے گئے ہیں۔

☆

## سنی۔ ان سنی کر دینا

329

واذا تتلى عليهم آياتنا ولے مستكبرا كان لم يسمعها كان في اذنيه وقرا

جب اسکو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اکڑ کر منہ پھیر لیتا ہے گویا ان کو سنائی نہیں یا اسکے کانوں میں رقتل ہے۔ (لقمان، 7) میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کافر کے سننے کو ایسے لہجہ میں ذکر فرمایا ہے جس سے اسکی سماعت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ بدایت کی بات سن ہی نہ سکے۔

قول فیصل

آیہ زیر بحث کے آخر میں کان کا حرف تشبیہ کے لئے ہے اس طرح سنی۔ ان سنی۔ کر دینے کو کافروں کے نہ سننے اور کانوں میں کپاس ڈالنے کے پیرائے میں بیان کر کے۔ دوبار اسلئے ذہن نشین کرایا کہ۔ وہ سننے والے بھی تھے اور ان کے کان بھی کھلے تھے۔ مگر حالت یہ بنا رکھی تھی جیسے (کان) سماعت نام کی چیز ان کے پاس ہی نہ ہو۔ کان بالکل ہی بند ہوں غرض کہ اس طرح کے لہجے سے صرف تشبیہ برائے تشبیہ ہی مقصود ہوتی ہے کہ کسی بات کی تثبیت۔ اور اعتراف مطلوب نہیں ہوتا۔ بھلا جو کسی کی بات کو سنی ان سنی کر دے اُسے آپ کیا کہیں گے۔ تشبیہ یا اعتراف؟

☆

کلمات۔ کالفظ کیا چغلی کھاتا ہے

330

والبحر یمدہ من بعدہ سبعة ابحر مانفدت کلمات اللہ

اگر سمندر روشتائی بن کر۔ کلمات ربی لکھنا شروع کر دیں۔ (لقمان، 27)

یہ ہے کہ یہاں ”کلمات“ اگر انم کی رو سے جمع ”قلت“ کا غماز ہے اور مقصد بات کی صرف عظمت اور اہمیت کو واضح کرنا ہے لیکن اسکے لئے جمع کثرت کا حرف الکلم زیادہ موزوں ہو سکتا تھا۔

وجه اعتراض

حقیقت یہ ہے کہ یہاں کلمات (جمع قلت) کا لفظ ہی بلیغ اور اظہار کے لئے جامع تر ہے کیونکہ اگر جمع قلت سے قلموں اور دواتوں کا۔ کافی نہ ہو نا ثابت ہوتا۔ تو ”جمع کثرت“ اس کے لئے کفایت کا۔ کام کیسے کر سکتی تھی؟

☆

السجده

خدا کی تخلیق حسن و خوبی کا مرقع ہے

331

الذی احسن کل شیء خلقه

جس نے ہر شئی کی تخلیق میں حسن کا رانہ عمل جاری رکھا۔ (سجدہ، 7)

میں کہا جاتا ہے کہ اللہ نے ہر شئی کی تخلیق میں حسن کو ملحوظ رکھا ہے جبکہ اہل سنت کے عقیدے

وجه اعتراض

کے مطابق انسانی جرائم اور معاصی کی تخلیق بھی خدائے لایزال نے کی ہے اور بلاشبہ جرائم اور معاصی سے دُش سے تعبیر نہیں ہو سکتے۔

یہاں احسن کے معنی احکام اور اتقن کے ہیں یعنی مستحکم بنایا اور کمال کارگیری سے جنم دیا۔ تاہم

**قول فیصل** اگر احسن کے معنی خوبی و حسن کارانہ عمل کے کئے جائیں تب بھی اللہ کی طرف حسن و خوبی ہی کو نسبت دی جاسکتی ہے۔ قباح اور بدی کو منسوب کرنا الہیات کے پروٹوکول کے مطابق ناجائز اور ناروا ہے۔



ہدایت۔ کو انسان کے خمیر میں شامل کیا گیا ہے

332

ولو شئنا لأتينا كل نفس هداها

(سجده، 13)

اگر ہم چاہتے تو ہر تنفس کو ہدایت پر لے آتے۔

یہ ہے کہ یہاں خدائے لایزال نے کفار کو ہدایت اور ایمان سے خود ہی دور رکھا۔

**وجہ اعتراض**

اللہ نے متعدد مقامات پر اپنی اس مشیت کا ذکر فرمایا ہے کہ ہماری ”مشیت“ ہدایت کے باب میں

”جبر“ واکراہ کی خواہاں نہیں ہوتی۔ ہم ہدایت و ”بدی“ کو ”نمایاں“ اور جدا جدا کر کے سامنے

لے آتے ہیں اب جس نے جس چیز کو قبول کرنا ہے سوچ سمجھ کر قبول کر لے۔ اس طرح ہم نے ہدایت و گمراہی کو اسکی

فطرت (یا خمیر) ہی میں شامل کر کے عمل کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اس مفہوم کو سمجھنے کے لئے ذیل کی آیات کو ملحوظ

رکھنا ضروری ہے۔ فرمایا۔

(القصص، 7-8)

I فالهما فجودها وتقواها پھر اس نفس کو نیکی اور بدی سمجھا دی۔

(الدہر، 3)

II ہم نے اسے نیکی اور بدی آشکارا کر دی (اب) چاہے وہ شکر گزار بنے اور چاہے کفر پر چلے۔

(البلد، 8-10)

III اور اسکو نیکی اور بدی کی دونوں راہیں نہیں سمجھا دیں؟

یہ تمام آیات ملکر واضح کرتی ہیں کہ۔ خدا خالق شر و ”بدی“ نہیں ہے نہ براہ راست نہ بالواسطہ بلکہ یہ بات تو اسکی شان ہی



کے خلاف ہے کہ وہ خالق شر ہو۔

خبر کا لفظ کس فعل کی غمازی کرتا ہے

333



## انما يؤمن بآياتنا الذين اذا ذكروا بها خروا سجدا

(سجدہ، 15) ہماری آیات پر صرف وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں جو سنتے ہی سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

میں کہا جاتا ہے کہ انما کے کلمہ حصر سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ قرآن سن کر سجدے میں نہیں گر پڑتے وہ مؤمن ہی نہیں۔

**وجہ اعتراض**

انما کسی کے ایمان کی "حرارت" معلوم کرنے کا "تھرمامیٹر" نہیں ہے اس کے ذریعہ صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ "مؤمن" عمل بھی کرتا ہے۔ اس طرح سجدا کے معنی احکام الہی کے

**قول فیصل**

آگے سر تسلیم خم کر دینے کے ہوں گے۔ یہ نہیں کہ اللہ نے اگر حکم دیا کہ چوری مت کرو۔ تو یہ حکم سن کر فوراً سجدے میں گر جائے۔ اللہ فرمادیں کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو تو اس حکم پر عمل کرنے کے بجائے سجدے میں پڑ جائے۔ یہ مفہوم کوئی بھی نہیں لے سکتا۔ یہاں خود کا فعل اگرچہ مکمل گر پڑنے کے لئے ہے لیکن مکمل گر پڑنا بھی حقیقت میں مبالغہ ہی کو ظاہر کرتا ہے یعنی وہ احکام الہی سنتے ہی اطاعت میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح انما صرف مبالغہ کے مفہوم کو واضح کرتا ہے یا زور دے کر واضح کرتا ہے۔

☆

## مؤمن اور فاسق میں یکسانیت کیسے؟

334

## افمن كان مؤمنا كمن كان فاسقا؟ لا يستوون

(سجدہ، 18) کیا مؤمن، فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے کہ۔ یہ آیت اپنے عمومی مفہوم میں واضح کرتی ہے کہ۔ کوئی بھی فاسق مؤمن ہو ہی نہیں سکتا۔

**وجہ اعتراض**

جب کافر اور مشرک پر ایمان کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تو اس سے کم تر مجرم کسی فاسق و فاجر پر کیسے بند ہو سکتا ہے یہاں جتلانا یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں کا عالم ہو خواہ عام آدمی فاسق و فجور ان کا دلپسند

**قول فیصل**

مشغلہ ہے اب اگر فاسق و فجور کے حوالہ سے ان کے ایمان کو ناپا جائے تو ظاہر ہے وہ کسی اطاعت شعار کی سطح کا مسلمان نہیں بن سکتا۔ اب لامحالہ یہاں فاسق کو کافر کا استعارہ ہی ٹھہرانا پڑے گا اور مفہوم ہو گا کہ اس آیت میں ذکر کردہ فاسق ہی کافر ہے۔ ہر فاسق نہیں۔

☆

## کون سی فتح مراد ہے؟

335

ويقولون متى هذا الوعد

(سجدہ، 28)

یہ کہتے ہیں کہ فتح کا مرحلہ کب آئے گا۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ یہاں فتح سے کون سی فتح مراد ہے؟ اگر اسی دنیا کی فتح مراد ہے تو اسکے لئے دھمکی آمیز لہجہ اختیار نہ کرنا چاہیے کہ فتح کے دن کوئی ایمان کام نہیں آئے گا۔

وجہ اعتراض

یہاں فتح سے۔ فتح مکہ اور فتح بدر ہی مراد ہے۔ آخرت سے اس فتح کو مربوط کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

قول فیصل

وہاں فرشتوں سے ہم کیسے لڑیں گے۔ وہاں کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ بات یہاں کی ہے اور یہیں کی فتح مقصود مؤمن ہے۔ اب جہاں تک وارننگ کا تعلق ہے تو اسکے معنی عین حالت جنگ میں ایمان کے فائدہ نہ دینے کے ہیں۔ کہ جب زور کا رن پڑا ہو اور کوئی صاحب ایمان کا اعلان فرماتے ہوں تو انہیں کہا جاسکتا کہ اسے یقینی فائدہ پہنچ سکے گا؟ البتہ لڑائی کے بعد انہیں ایمان کا فائدہ پہنچا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ فائدہ پہنچا۔ تاریخ نے ان کو طلقاء کے نام سے یاد کیا ہے اس طرح انہیں کہہ دیا گیا کہ جاؤ تم آزاد ہونہ جنگی قیدی ہونہ تباد لے کے اسیر۔ 25-2-96 ملتان۔



احزاب

عورتیں شوہروں کی "نسبت" استعمال نہ کریں

336

ادعوہم لا بآء ہم

(احزاب، 5)

ان لے پالکوں۔ کو اپنے اصلی بآء کی نسبت سے یاد کرو۔

یہ ہے کہ یہ آیت اپنے وسیع تر مفہوم میں عورتوں کو اپنے شوہروں کی طرف نسبت دینے سے مانع

وجہ اعتراض

ہے لیکن آج یہ مسلم معاشرے میں نسبت کے اس اصول کو خاطر میں نہیں لایا جاتا اور عورتیں بے محابا اپنے تعارف میں مسز فلاں کہہ کر مطمئن ہو جاتی ہیں۔

قول فیصل

اس آیت کا پس منظر بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ زید بن حارثہ کو اپنے گھر کا فرد مانتے تھے

جس پر لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ زید۔۔۔ محمد کے بیٹے ہیں۔۔۔ اس کے جواب میں اللہ نے کہا

کہ ہمارے "قانون" میں جو "نطفہ" کی اولاد نہ ہو اسے "نسبت" کے زاویہ سے اپنی اولاد نہیں کہا جاسکتا اور ہمارا یہ قانون عام ہے کہ کسی بچے کا والد معلوم ہو یا نہ معلوم اسے اپنی اولاد نہیں بتایا جاسکتا ادعوہم لا بآء ہم انہیں اپنے باپوں کی نسبت سے پکارو اگر باپ معلوم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ (احزاب)

اس طرح یہاں پس منظر تو خاص ہے لیکن یہ بھی قاعدہ ہے کہ احکام اپنے پس منظر سے "خاص" ہو کر بھی "عمومیت" کے خواہاں ہوتے ہیں بلکہ یہاں عربی گرامر کا ایک اور قاعدہ بھی عورت و مرد کی اضافت میں مانع ہے قاعدہ یہ ہے کہ جب دو اسم ایک دوسرے کی طرف مضاف ہوں اور کسی طرح کی لفظی وضاحت بھی نہ ہو تو وہاں پہلا اسم بیٹے یا بیٹی کے معنی میں اور دوسرا باپ کے لئے استعمال ہوگا مثلاً محمد احمد۔۔۔ یہاں دو اسم ہیں جو عربی گرامر کی رو سے بیٹے اور باپ کی نسبت کو واضح

کرتے ہیں عائشہ صدیق کے معنی ہیں عائشہ بنت صدیق۔ فاطمہ محمد کے کہنے سے فاطمہ بنت محمد سمجھا جائے گا۔ عربی کا یہ قانون اردو والوں کی یلغار سے پہلے سندھ میں بھی رائج تھا۔ مگر انگریزی تہذیب و ثقافت کے تسلط کے بعد ہند میں چونکہ نسبت کا ”اسلامی“ یا قرآنی معیار ملحوظ نہیں رکھا گیا اور اونچے گھرانوں کی خواتین میں مردوں کی نسبت فیشن بن گئی اور بے سوچے اپنے کو مسز فلاں کہنے لگیں یعنی اپنی شخصیت کو شوہر کی شخصیت میں ”ضم“ کرنے میں قباحت محسوس نہ کرنے لگیں حالانکہ اسلام نے عورت کی شخصیت کو مستقل و خود مختار بنایا ہے وہ اپنی ذات میں کسی کا ”جز“ نہیں بن سکتی اپنی کمائی کی خود مالک ہے، گھر میں پورے اختیارات استعمال کرنے کی مجاز ہے وہ نہ ”ذیلی“ مخلوق ہے اور نہ کسی غیر کا ”ضمیمہ“۔ اسی خوبی اور خرابی کے تناظر میں اسلام نے اپنی پالیسی عطا کی کہ عورت ہو خواہ مرد، وہ نسبت کو صرف اپنے والد سے خاص کرے کہ اس طرح انسان کے نسب و نسل کے تحفظ کے ساتھ اس کی شخصیت بھی ابہام اور اشتباہ سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

یہاں تک قاعدے اور اصول کی بات تھی اس سے متنبہ ہانے کی نفی نہیں ہوتی صرف یہ واضح کرنا ہے کہ متنبہ اپنے والد سے منسوب ہو قرآن فرماتا ہے ماجعل ادعیاءکم ابناءکم۔۔۔۔۔ اللہ کے قانون میں منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹے نہ منائے جائیں (احزاب) دیسے آپ کسی بچے کو کو دل لیں۔ پال پوس کر بڑا بنائیں۔ پڑھائیں اس کا مستقبل سنواریں یہ امر نہ ہنس ہے اور اللہ توفیق دے تو یتیم بچوں کو اس طرح کا سارا ضرور فراہم کریں۔



### موت پر احسان کیسا؟

337

### و بلغت القلوب الحناجر

(احزاب، 10)

تمہارے دل گلوں تک پہنچ گئے۔

یہ ہے کہ دل اگر گلوں تک پہنچ جائیں تو موت واقع ہو جاتی ہے اس پر احسان جتلانے کی بات کیا رہ

وجہ اعتراض

جاتی ہے؟

یہ صرف، دہشت، خوف زدگی اور ”دلی اضطراب“ کی ”کیفیت“ کا استعارہ ہے اس سے زیادہ کچھ

قول فیصل

نہیں۔



وہ کونسی بستی ہے جس تک مسلمان پہنچ نہ سکے؟

338

### و اورثکم ارضہم و دیارہم و اموالہم و ارضالہم تطنوہا

اور اس نے تمہیں ان کی زمینوں، بستیوں، مویشیوں اور ایسے علاقوں کا وارث بنایا جن پر ابھی

(احزاب، 27)

تمہارے قدم نہیں پہنچے تھے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ یہاں اور دُکھ ماضی کا صیغہ ہے جبکہ یہ قرینہ ہنوز نہ مفتوح ہوئے تھے اور نہ ہی ان کے مال مویشی اور زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھیں ایسے میں وہ وارث بنے تو کیسے بنے؟

مجاوراتِ عرب میں جب ”مستقبل“ میں کسی ”کامرانی“ کا ”یقین“ ہو تا تو ”ماضی“ کا صیغہ استعمال کر کے ”مستقبل“ مراد لیتے تھے گویا وہ امر مستقبل میں ”طے شدہ“ ہے۔۔۔۔۔ یہاں ماضی کے

صیغے سے جس سرزمین پر قبضے کا اشارہ ہے اس سے مکہ۔ خیبر اور بعد میں بلادِ فارس و روم کی اراضی مراد ہیں، اور ان علاقوں تک نزولِ آیت کے وقت مسلمان نہیں پہنچے تھے۔ ☆

اہل بیت سے کون سی نجاست لگی ہوئی تھی؟

339

ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهر كم تطهيرا

تاکہ۔۔۔۔۔ اے نبی کے اہل خانہ اللہ تمہیں رجس سے پاک و صاف کر دے۔ (احزاب، 33)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ یہاں رجس سے مراد کفر اور نافرمانی ہے جبکہ نبی کے اہل خانہ پاک و طہیات تھیں۔

عرب کے کسی بھی لغت میں ”رجس“ کے معنی کفر اور نافرمانی کے نہیں لکھے۔ ناپاکی پر اسکا اطلاق ضرور ہوا ہے لیکن اس کا انحصار بھی قرآن پر ہے اور یہاں اہل بیت کا قرینہ بتا رہا ہے کہ یہاں

رجس سے وہ ”بھری کوتاہیاں“ مراد ہیں جو ”غیر دانستہ“ طور پر سرزد ہوتی ہیں یہ خامکاریاں ہماری نسبت سے اگرچہ وزن نہیں رکھتیں لیکن نبی کی پاکیزہ فیملی کی مناسبت سے وزن رکھ سکتی تھیں لہذا اللہ سبحانہ نے اتنا بھی گوارا نہیں فرمایا اور ”عملی تطہر“ کے ذریعہ پاکیزگی کے احساس کو ابھارا۔ ☆

خدا کے نئے نئے کام ”حدوث“ کی غمازی کرتے ہیں

340

وكان امر الله مفعولا

(احزاب، 37)

اور اللہ کا ہر کام ہو چکا ہوتا ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ۔ کان۔ کے زاویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے امور قدیم ہی سے طے شدہ

ہیں۔

ہر حکم کسی واقعہ کے نمودار ہونے سے مربوط ہوتا ہے۔ اب یہاں ”امر“ کو اگر ”مفعولا“ کہا ہے

## قول فیصل

تو مفعول ہر حالت میں حادث ہی ہے۔ اب جہاں تک ”کان“ کا تعلق ہے تو یہ ”دوام“ کا استعارہ ہے و کان اللہ علیما حکیم۔ کے معنی ہیں اللہ دائماً اور ہمیشہ ”علیم“ ہے ”حکیم“ ہے۔ یہ نہیں کہ ماضی میں تو علیم اور مجسم تھا مگر اب نہیں ہے۔



رسول اللہ۔ زینہ اولاد سے کیوں محروم کر دیئے گئے

341

ما کان محمد اباً احد من رجالکم

(احزاب، 40)

محمد کسی بھی مرد کے والد نہیں ہیں۔

یہ ہے کہ مردوں میں سے آپ طاہر، قاسم اور ابراہیم کے والد تھے۔

## وجہ اعتراض

لیکن ان میں سے نزولِ آیت کے وقت چونکہ کوئی ایک بھی زندہ نہیں رہا تھا لہذا فرمایا گیا کہ چونکہ

## قول فیصل

آپ کی زینہ اولاد نہیں ہے لہذا آپ کو کسی ”متبنی“ یا کسی گود لئے بچے کا حقیقی باپ نہیں کہا جاسکتا۔ وجہ یہ بنی کہ اللہ کو یہ منظور نہیں تھا کہ آپ کے بعد آپ کے نام پر کوئی دکان چکے کوئی خانقاہ تعمیر ہو کوئی ”دارالشُرک“ وجود میں آجائے۔ جو آپ کے رُشن اور مقصد کو لے ڈوبے کیونکہ آپ خود تو معصوم تھے لیکن آپ کی اولاد کی پیشانی پر عصمت کا جھومر، نہیں سجایا جاسکتا تھا وہ شیطان کے بھکاوے میں آسکتے تھے بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جو آپ کی اولاد میں سے تو نہیں تھے مگر ”وصایت“ اور ولی عہدی کے دعوے لے کر اٹھتے تھے۔ لوگوں نے انہیں بھی نہ صرف ”مبودود“ حاجت روا“ بتایا بلکہ ان کی اولاد و اولاد کو بھی حاجت روائی کا غلط اطلاق ”تمغہ“ دے ڈالا۔ یہ تو صرف خلفائے ثلاثہ کو امتیاز حاصل رہا کہ ان کے نام پر ”شُرک“ کے ”اصنام“ تراشے نہ جاسکے اس طرح نہ وہ خود حاجت روائی کے لئے سامنے لائے جاسکے اور نہ ہی ان کے ذریعہ ”وحدانیت“ کے آئینے چور چور ہوئے۔ رضی اللہ عنہم۔



انتظاری عقیدہ، نبوت کی خاتمیت کی نفی کرتا ہے

342

ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین



(احزاب، 40)

جی ہاں نبی اکرم اللہ کے رسول بھی ہیں اور خاتم انبیاء بھی۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ عیسے نبی اللہ۔ آپ کے بعد تشریف لے آئیں گے جس سے آپ کی "خاتمیت" مفلوج ہو جاتی ہے۔

وجہ اعتراض

رسول اللہ کی "خاتمیت" برحق ہے آپ کے اس امتیاز کو چھیننے والا پیدا ہی نہیں ہوا قرآن اپنے رسول کی خاتمیت کا توانا محافظ ہے۔ مسیح کی دوبارہ تشریف آوری قرآن کا، نہیں حدیثوں کا مسئلہ ہے یا۔ اُن

قول فیصل

سنیوں کا جو نبوت کو ختم بھی کہتے ہیں اور انتظاری عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ بات کہ سیدنا عیسیٰ زندہ ہیں اور اسلئے زندہ ہیں کہ دوبارہ آئیں گے تو یہ۔ قرآن کی "ضوء" میں ہے ہودہ اور "خرافاتی" عقیدہ ہے فرمایا۔ وما محمد الا رسول قد خلت

من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم على اعقابكم

یہ محمد ایک رسول ہی تو ہیں جن سے پہلے (انبیاء) رسل (آئے اور) گذر چکے تو کیا اگر ان کو طبعی موت آجائے یا غیر طبعی طور پر یہاں سے رخصت ہو جائیں تو تم پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ (عمران، 144)

اس طرح یہاں دو حقیقتوں کا "اکتشاف" ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ پہلے انبیاء کی طرح آئے اور چلے جائیں گے۔ دوسری اہم حقیقت یہ کہ آپ اس وقت ہی تشریف لے آئے جب سابقہ انبیاء و رسل میں سے کوئی زندہ موجود نہیں تھا۔ "خلت" ماضی کا صیغہ ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ اس پر جب "قد" واقع ہو تو سہ آئندہ ماضی بن جاتا ہے یعنی ایسی ماضی جو حقیقت بن چکی ہو دوسرے الفاظ میں مسیح ہوں یا کوئی اور صاحب رسالت۔ بعثت نبوی کے وقت جسم عنصری کے ساتھ آسمانوں اور زمیں میں زندہ موجود نہیں تھے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ موجود تھے تو نہ قرآن پر ایمان باقی رہتا ہے نہ اسکی "صدقہ بیانی" قابل ایمان رہتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسیح علیہ السلام اب لباس نبوت اتار کر "امتی" کی حیثیت سے تشریف لے آئیں گے۔ لیکن پہلے تو کروڑوں سالوں تک انہیں زندہ رکھنے کا تکلف برتا ہوگا جبکہ اللہ کا قانون توئی مقررہ معیار سے زیادہ طویل

نہیں ہو سکتا فرمایا ما جعلنا لبشر من قبلك الخلد افان مت فہم الخالدون کل نفس ذائقة الموت

ہم نے آپ سے پہلے کسی بھی فرد کو لمبی اور دائمی زندگی عطا نہیں کی۔ کیا تمہارے لئے تو موت (وقت پر) مقدر ہو اور یہ ہمیشہ حیاتِ لدی کے حامل بنادے جائیں (ایسا نہیں ہے بلکہ) ہر نفس کے لئے ذائقہ موت مقدر ہے۔ (انبیاء، 34)

اس طرح مسیح کی غیر معمولی زندگی کی مکمل نفی کر دی گئی ہے اور مراد انسان واپس، نہیں آسکتا۔ اللہ کا یہ "حتمی" قانون ہے۔ رہا یہ کہ وہ جامہ نبوت اتار کر آئیں گے تو یہ بھی نہ صرف سنت اللہ کے خلاف ہے کفر بھی ہے۔ اللہ نے جسے

نبوت عطا کی اس سے کبھی، نہیں چھینی کہ اس طرح اسکے علم میں نقص آجاتا تھا اسے سنیوں میں سے فخر الدین رازی نے بھی نہ صرف تسلیم کیا ہے کسی نبی کو دوسرے نبی کا امتی تسلیم کرنے کو کفر بھی کہا ہے۔ امید ہے میرا مفہوم واضح ہو چکا ہوگا۔

رہی یہ بات کہ۔ خاتم۔ کے تاء کے نیچے زیر (Zair) آنا چاہیے تھا تاکہ ہر قسم کا خاتمہ واضح ہو جاتا۔ تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا بلکہ اس طرح مخالف الٹا یہ کہتے کہ سابقہ نبوتوں کو اللہ نے تو نہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنی جانب سے خود ہی ختم

کیا ہے کیونکہ وہ یہ ختمیت کے فاعل خود ہی بن جاتے جو ضابطہ کے خلاف ہے لہذا اللہ سبحانہ نے اپنے حکیمانہ اندازِ تکلم میں صیغہٴ فاعل کو استعمال نہ فرما کر احساس دلایا ہے کہ نبوتوں کو ختم کرنے والے رسول اللہ نہیں اور نہ ہی آپ کو اس طرح کا اختیار حاصل ہے۔ یہ اللہ کا کام تھا جو کسی دوسرے پیرایہ میں ہو کر رہا۔ حاقم۔ عربی میں اس کو مہر کہتے ہیں جو قبائل یا کسی اہم دستاویز کے مضمون کے خاتمہ پر ثبت کی جاتی تھی حکمران یا افسر مجاز اپنی سہولت کے لئے اپنا نام انگشتی پر کندہ کراتے تھے اس طرح انگشتی کا نام بھی خاتم پڑ گیا۔

☆

## رسول اللہ۔ آفتابِ عالم تاب۔ یار و شن چراغ؟

343

### وسراجاً منیراً

ہم نے تمہیں جہاں تاب اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔ (احزاب، 46)

یہ ہے کہ سراج کی روشنی محدود ہے اور سورج کی غیر محدود۔ یہاں اللہ نے آپ کو روشن چراغ سے تشبیہ دی ہے جبکہ سورج سے زیادہ موزوں اور مکمل تشبیہ نہ ہو سکتی تھی۔

وجہ اعتراض

چراغ کی یہ خاصیت ہے کہ اس سے چراغ و روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اور بے حد و حساب چراغ وجود میں آتے اور ہر طبیعت و ہر دل میں روشنی پھیلاتے رہتے ہیں۔ پھر یہ مستزاد کہ اللہ نے انتہائی پیار سے جو خطاب تجویز فرمایا ہے اس سے زیادہ موزونیت کس خطاب میں ہو سکتی ہے؟

قول فیصل

☆

## درود۔ پڑھنے کی بات

344

ان الله وملائكته يصلون على النبي يا ايها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليماً

اللہ اور ملائکہ۔ نبی پر درود بھیجتے ہیں اے مومنو تم بھی ان پر درود بھیجو اور سلام پڑھو۔ (احزاب، 55)

میں کہا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ تم درود پڑھو۔ اور ہم تعمیلِ حکم میں کہتے ہیں اللہم صل علی محمد "تم پڑھو"۔۔۔۔۔ اب سوچنا یہ ہے کہ۔ تم پڑھو تم پڑھو سے بات گیا

وجہ اعتراض

بنتی ہے؟

پہلے تو ہم نے صلاۃ کے معنی درود۔ کر ڈالے۔ جسے پڑھنا لازمی ٹھہر گیا۔ پھر اسمیں الجھن پیدا کر دی کہ۔ اللہ سبحانہ ہمیں حکم دیں کہ۔ "تم پڑھو" اور ہم۔ امر ہی کے صیغے میں اللہ سے کہیں۔ تم پڑھو۔

قول فیصل

اسکے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ۔ نہ تم پڑھو نہ ہم پڑھیں۔ لیکن یہ دماغ رفتہ لوگوں کی بات ہوگی۔ تاہم ضروری ہے کہ یہاں صلاۃ کے مفہوم میں تبدیلی کی جائے۔ یعنی جس طرح کوئی بڑا آدمی کسی اہلکار کی خدمت سے خوش ہو کر اسے شاباش کتا اور اپنے ساتھیوں اور ملنے والوں سے اسکی غیر معمولی صلاحیتوں کا تذکرہ کرتا ہے یا۔ کوئی والد اپنی اولاد میں سے کسی کی ذہانت اور غیر معمولی کارکردگی و حسن کارانہ عمل پر خوش ہو کر اسکی حوصلہ افزائی کرتا اور گھر والوں کے سامنے اسکی تعریف کرتا ہے اسی طرح بغیر تشبیہ کے اللہ سبحانہ اپنے پیارے رسول کی غیر معمولی تبلیغی و اصلاحی کارگزاریوں پر آپ کی عظمت کو غیر معمولی حیثیت دے کر ملائکہ، اور ہر فردِ باعز کو حکم دیتے ہیں کہ آپ کی عظمت کا گن گائیں تحسین و مرہبہ کے آداب جا لائیں اور آپ کے پیش کردہ پروگرام کو پوری تن دہی سے تسلیم کریں اور آگے بڑھائیں و سلموا تسلیما۔ اس طرح قرآن اور ”مناسبتوں“ کے تناظر میں صلاۃ کے معنی ”تعظیم و تجلیل و تمجید“ کے ہوتے ہیں مرتلہ زبیدی (1790م) نے اپنے لغوی انسائیکلو پیڈیا تاج العروس میں صلاۃ کے ایک معنی ”تعظیم“ کے بھی لکھے ہیں بلکہ وحی قرآن کے بڑے شاعر امام راغب (1108م) لغوی دانشوروں کی اکثریت کے حوالہ سے ”تعظیم“ ہی کے مفہوم کو سامنے لاتے ہیں لکھتے ہیں۔ ہی الدعاء والتبریک والتمجید يقال صلیت علیہ ای دعوت لہ۔

نیک تمنائوں کے ساتھ ہدیہ تبریک پیش کرنا غیر معمولی تعظیم اور تمجید کا اظہار کرنا عربی میں صلیت علیہ کے معنی ہیں حوصلہ افزائی اور اچھی تمنائوں سے یاد کرنا۔ (مفردات القرآن طبع دار الفکر بیروت صفحہ 293 کالم نمبر 1)

اب و سلموا تسلیما کے معنی صاف ہو گئے کہ نبی اکرم ﷺ کو بہترین ہدیہ تبریک اور حق تعظیم جلالا نہیہ ہے کہ آپ کے پیش کردہ احکام و نظریات کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا اور رو بہ عمل لایا جائے نہ کہ خود ساختہ درود پڑھ کر جان چھڑائی جائے۔

☆

## سادات۔ اور اکابر میں فرق

345

انا اطعنا سادتنا و کبرائنا

(احزاب، 67)

ہم نے سرداروں اور بڑوں کی پیروی کی۔

یہ ہے کہ۔ سادتنا و کبرائنا۔ ایک ہی حقیقت کے غماز ہیں لہذا ایک کا عطف دوسرے پر نہ ہو سکتا تھا۔

وجہ اعتراض

ہم معنی ہونے کے باوصف۔ الفاظ اگر مختلف ہیں تو ایک دوسرے پر عطف ہو سکتے ہیں اسے۔

قول فیصل

عطف اللفظ علی اللفظ کہا جاتا ہے مثلاً۔ عاقل لیبب۔ و هذا حسن جمیل۔ یہاں عاقل اور

لیبب۔ حسن اور جمیل۔ ہم معنی ہیں لیکن لفظی اختلاف کے باعث ایک دوسرے پر عطف ہو سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ع

معاذ اللہ من کذب و مین

یہاں۔ کذب اور۔ مین (MAIN) ہم معنی ہیں لیکن الفاظ مختلف ہونے کے باعث ایک دوسرے پر عطف ہو سکتے تھے۔

25-2-96 ملتان یوم الاحد



سبا

## بین ایدیہم . سے کیا مراد ہے؟

346

اقلم یروا الی ما بین ایدیہم وما خلفہم من السماء والارض

(سباء، 9) کیا وہ اس پر غور نہیں کرتے جو آسمان اور زمین میں ان کے سامنے اور پیچھے سے ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں الی ما بین ایدیہم وما خلفہم کی بجائے الی ما فوقہم وما تحتہم ہونا چاہیے تھا۔

وجہ اعتراض

ما بین ایدیہم (جو سامنے ہے) کا استعارہ ہے ہر اس چیز کا جس پر نظر پڑ سکتی ہے اور ”ما خلفہم“ استعارہ ہے ہر اس چیز کا جو نظر سے اوچھل ہے لہذا آیہ میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ جامع بھی

قول فیصل

ہیں اور ہر چیز پر حاوی بھی۔



## داؤد کے تابع فرمان پہاڑ اور پرندے؟

347

ولقد آتینا داود منا فضلا . یا جبال اوبی معہ والطیر

(سباء، 10) ہم نے داؤد کو برتری بخشی اور جبال سے کہا اس کے حکم پر چلو اور یہی حکم طیر کو بھی دیا۔

یہ ہے کہ ”جبال“ اور ”طیر“ غیر عاقل ہیں انہیں عقلاء کے لمحے میں کس طرح مخاطب کیا گیا ہے؟

وجہ اعتراض

عرب میں اگرچہ غیر عاقل کو عاقل تصور کر کے خطاب کرنے کا رواج ملتا ہے اس پر سب سے

قول فیصل

زیادہ معتبر سند عبد اللہ بن متق (760 م) کی کتاب کلید دمنہ ہے جو جانوروں کی زبانی کہانیوں پر

مشتمل ہے اور انسانی لہجوں میں بات کی گئی ہے۔ لیکن یہاں جبال۔ اور ”طیر“ سے انسان ہی مراد ہیں کیونکہ لغت اور اوب کے راہواروں نے معلوم کر لیا ہے کہ ”اوب“ صرف انسان کا فعل ہے اور اسی کے لئے ہی بطور صفت استعمال ہو سکتا ہے اس بنا پر ”جبال“ کے معنی۔ ”سرداران قوم“ اور ”طیر“ کے معنی وہ گھڑ سوار دستے جو آؤ کر دشمن کے مراکز پر وار کرتے ہیں اب معنی صاف ہو گئے کہ

”ہم نے داؤد کو برتری بخشی حکومت سے نوازا اور سردارانِ قبائل سے کہا کہ اس کا ساتھ دو اس کے

حکم پر چلو اور یہی حکم بادور فتار گھڑ سواروں کو دیا۔ جو مملکت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے



ہیں۔



## فنون لطیفہ اور مصوری کا فروغ

348

یعملون له مايشاء من محاريب و تماثيل و جفان کا لجواب و قدور راسيات اور سليمان کے پاس ماہر فنکاروں کا ایک گروہ تھا جو ہر وقت حکم کی تعمیل میں لگا رہتا تھا وہ جو چاہتا، ماڈا لے بڑے بڑے قلعے، مجسمے، بڑے لگن اور دیگیں جو ایک ہی جگہ رکھی رہتی تھیں۔ (سباء، 13)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ تصویر سازی حرام ہے اسے اللہ کی نعمتوں میں شمار نہ ہونا چاہیے۔

وجہ اعتراض

قرآن مجھے والے خدا نے یہ آیت نازل فرماتے وقت اگر جناب رازی سے مشورہ کر لیا ہوتا تو یہ الجھن پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ خیر سوچ کی سطح اپنی اپنی ہوتی ہے۔ یہ لوگ وہی مانیں گے جو ان کے اکابر نے انہیں سمجھا دی ہے لیکن صورت گری نہ صرف آج بھی روا ہے ہماری ضرورت بھی ہے اسے حرام کہنے والا کون ہوتا ہے؟ تفصیل و دلائل کے لئے ملاحظہ ہو، مصوری، موسیقی اور طریقہ رقص۔۔۔ تحریر ہندہ۔ 25-2-96 ملتان

قول فیصل

فاطر

## ماضی سے مضارع کی طرف درآنا

349

والله الذی ارسل الریاح فتشیر سحابا فسقناہ الی بلد میت فاحینا بہ الارض بعد موتہا

اللہ وہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا جو بادلوں کو چلاتی ہیں اور ہم انہیں بجز زمینوں میں لے جا کر برساتے ہیں جس سے وہ میراب ہو کر زندگی پاتی ہیں۔ (فاطر، 9)

یہ ہے کہ یہاں ارسل - سقنا - اور احینا - سب ماضی کے صیغے ہیں درمیان میں ”فتشیر“ مضارع کا صیغہ آیا ہے جو اصول عربیت کے خلاف ہے۔

وجہ اعتراض

عرب استعمالات میں ماضی کو مضارع کے مفہوم میں لایا جاتا رہا ہے اسی طرح مضارع بمعنی ماضی بھی استعمال ہوتا رہا ہے جیسے فرمایا واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ (احزاب، 37) اسی طرح

قول فیصل

یہاں بھی تشیر - ماضی ہی کے مفہوم میں ہے قرینہ ہم زلف صیغے ہیں۔



## جو مر گئے انکے سننے کی صلاحیت مفقود ہو گئی

350

ان الله يسمع من يشاء وما انت بمسمع من في القبور

اللہ جسے چاہے سنا سکتا ہے لیکن آپ ان مردوں کو کچھ بھی نہیں سنا سکتے۔ (فاطر، 22-23)

میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے قبر والوں کو بات سنانے کا اثبات ہوتا ہے کہ اللہ ہماری بات ان تک پہنچا دیتے ہیں۔

وجہ اعتراض

یہاں آپ کے حسن استدلال کی داد دینی چاہیے کہ قرآن محکم اپنے بلیغ انداز میں جس آیت سے مردوں کے ”سماع“ کی نفی کرتا ہے آپ اسی ہی سے مردوں کی سماعت کا استدلال فرماتے ہیں کیا

قول فیصل

خوب ہے؟۔۔۔۔۔ اللہ تو جسے چاہیں سنا دیں، اس پر کیا اعتراض ہے لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ ”نیچرلی“ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ جواب اگر نفی میں ہے تو یہ شور شرابا فضول ہے اور اگر سنتے ہیں تو پھر رسول کی کیوں نہیں سنتے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ان کفار کو جو سنی ان سنی کر دیتے ہیں انہیں مردوں سے تشبیہ دے کر احساس دلایا کہ انہیں سنانا ہمارا کام ہے آپ کا نہیں۔ ☆ 96-2-26 ملتان

## کیا غیر پیغمبر بھی ”مصطفیٰ“ بن سکتے ہیں؟

351

ثم اورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد

ومنهم سابق بالخيرات

ہم نے اپنی کتاب کا وارث بنانے کے لئے جن کو مصطفیٰ بنایا ان میں سے کوئی تو ظالم نکلا۔ کوئی میانہ رو۔ اور کوئی نیکوں میں بڑھ کر حصہ لینے والا۔ (فاطر، 32)

یہ ہے کہ اصطفینا کے لفظ سے انبیاء و مرسلین مراد ہوتے ہیں وہ تو ظالم نہیں ہو سکتے یہ مستزاد

وجہ اعتراض

کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے علاوہ دوسروں پر بھی مصطفیٰ کی اصطلاح کا لائق ہوا ہے۔

یہ درست ہے کہ اصطفینا۔ کا لفظ انبیاء ہی کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن یہ کچھ طے شدہ بات

قول فیصل

نہیں ہے۔ صفات کا اطلاق یوں بھی قرآن کا محتاج ہوتا ہے۔ فرمایا۔ لا مصطفیٰ مما یخلق۔ اپنی

مخلوق میں سے جسے بیٹھانا لیتا منتخب کر سکتا تھا۔ (زمر، 4) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے لغوی مفہوم (جن لئے جانے،

پسند کئے جانے) میں بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ابو بکر رازی نے ”مختار الصحاح“ (صفحہ 366) میں متعدد معانی لکھی ہیں ان

میں ایک معنی یہ بھی ہیں کہ جس میں ملاوٹ اور کھوٹ نہ ہو۔ بلکہ اسی مناسبت سے حضور نبی اکرم ﷺ کو بھی مصطفیٰ کہا گیا کہ

آپؐ کھرے انسان تھے نہ مزاج میں ”ہیرا پھیری“ شامل تھی نہ کردار اور گفتار میں کھوٹ اور نااستواری!!  
اس طرح بات صاف ہو گئی کہ کتاب کا وارث جن کو بنایا گیا وہ ”عہدِ رسولؐ ہی کے انسان تھے ان میں سے وہ  
بھی جو حقیقت محمدیؐ کو سمجھ نہ سکے (ظالمِ نفسہ)۔۔۔۔۔ اور وہ بھی تھے جو اعتدال پسند و نرم خوتھے (مقصد) اور وہ بھی جو  
دولتِ ایمان سمیٹنے میں سب سے زیادہ سبقت لے گئے۔ (سابق)

☆

یس

## مُرسلون۔ اور۔ لمرسلون میں فرق

352

### انا الیکم مرسلون (14) انا الیکم لمرسلون (16)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک ہی سلسلہ کلام میں ایک جگہ مرسلون۔ کو بغیر لام کے اور دوسری  
جگہ لمرسلون مع لام کے ذکر کیا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

ان دونوں رسولوں نے قوم سے کہا کہ ہم رسول ہیں اس پر جب وہ نہ مانے تو پھر ”زور“ دے کر کہا  
کہ لوگو ہم رسول ہیں۔ اور اسی ”زور“ دے کر بات کرنے کے لئے عربی میں لام تاکید کا سارا بھی

قول فیصل

☆

لیا جاتا رہا ہے۔

## ہاتھ پاؤں۔ بات کرنے کی صلاحیت، نہیں رکھتے

353

### وتکلمنا ایدیہم و تشہد ارجلہم

(یس، 66)

ان کے ہاتھ بات کریں گے اور پاؤں گواہی دیں گے۔

یہ ہے کہ یہاں کلام کو ہاتھوں اور ”گواہی“ کو پاؤں کا عمل ٹھہرایا ہے جبکہ یہ دونوں کام صرف اور  
صرف زبان گویا کے ہیں۔

وجہ اعتراض

یہ اس لئے کہ ہاتھ براہِ راست کام کرتا ہے لہذا وہ ”زبانِ حال“ بیان کر سکتا ہے اور پاؤں صرف  
موجودگی کا غماز ہے لہذا وہ ”شہادت“ کا سبب بن کر ”اعتباری گواہی“ فراہم کرتے ہیں۔ (نیز

قول فیصل

☆

ملاحظہ ہو نمبر 261)

## پیغمبرِ سخنِ سنج تھے سخن طراز، نہیں تھے

354

وما علمناہ الشعر

(یس، 69)

اور ہم نے اسے شعر کی تعلیم دی ہی نہیں۔

میں کہا گیا ہے کہ یہاں شعر کہنے کی نفی کی گئی ہے جبکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آپؐ نے شعر کہا ہے

وجہ اعتراض مثلاً۔

انا النبى لا كذب انا ابن عبد المطلب  
هل انت الا اصبع دمي ولى سبيل الله ما لقيت

شعر۔ عربی کے اصنافِ سخن کا معیاری اور فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ (یا صنف) شمار ہوتا تھا۔

قول فیصل

جبکہ اس میدان کے ہر سوار کی کمی نہیں تھی ایسے میں اگر آپؐ اپنے ”اہداف“ و مقاصد کو شعر

میں ڈھال دیتے تو وہ امتیاز اور خصوصیت باقی نہ رہتا جو قرآنی نثر کو حاصل ہو اور عربی، دنیا کی اعلیٰ ترین اور زندہ زبانوں میں شامل ہو گئی۔ دوسرا، شعر میں مرثیہ و مقاصد کو پیش کرنے کا رواج کم تھا اس میں اپنے سیاہ بھدی شکل والے محبوب کو

چندے ماہتاب اور چندے آفتاب بنا کر پیش کر دیا جاتا مخالف کے حسن و جمال کا مذاق اڑا دیا جاتا غرض کہ زیادہ جھوٹ اور مبالغہ سے کام لیا جاتا جبکہ مبالغہ سے مقصد کلام میں حسن اور نکھار پیدا کرنا چاہیے لیکن یہاں اعلیٰ شعری مذاق رکھنے کے

باوجود شاعر حضرات اپنے شاہ پاروں کو ”سُفلی“ مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے ایسے میں رسول اکرم ﷺ اپنے کلام برحق کو جو عرب کے تمام اصنافِ سخن پر مشتمل بھی تھا اور رہے گا کو ”شاعری“ کی زبان میں پیش نہ کر سکتے تھے۔ آپؐ

کے نام پر جو دو شعر پیش کئے گئے ہیں ان کی نہ فنی اہمیت ہے نہ تاریخی حیثیت۔ ویسے آپؐ نہ صرف اعلیٰ شعری مذاق رکھتے تھے سخن فنی میں بھی اپنا ٹھکانہ رکھتے تھے بعض شاعر صحابہ کے اشعار سن کر مکرر کہہ کر سماعت فرماتے تھے آپؐ کے

داماد سیدہ زینبؓ (630 م) کے شوہر ابو العاص بن ربیع بھی بڑے شاعر تھے۔ جب تجارتی قافلہ لے کر شام کو جاتے تو سیدہ کے فراق میں شعر فرماتے۔

الغرض آپؐ شاعر نہیں تھے اور نہ بننے کی وجہ بتلا دی گئی ہے جہاں تک آپؐ سے منسوب دو اشعار کا تعلق ہے وہ نہ

صرف فنی اور تاریخی حیثیت سے بغیر مسلمہ ہیں خلیل نحوی (786 م) کے بقول رجز کی صرف ”دھن“ تھے شعر نہیں تھے۔ گویا کہ آپؐ سخنِ سخن تھے سخن طراز نہیں تھے۔ ☆

چوپائے اللہ۔ نے خود ہی بنائے ہیں

355

مما عملت ایدینا انعاما

(یس، 71)

ہم نے اپنے ہاتھوں سے ان کے لئے چوپائے بنائے ہیں۔

یہ ہے کہ۔ چوپایوں کی تخلیق کو اللہ نے اپنے ہی ہاتھ کا عمل قرار دیا ہے جبکہ ہاتھ جسم کے اعضاء

وجہ اعتراض

میں سے ہے اس طرح ہاتھ کی مناسبت سے اللہ سبحانہ کے لئے نہ صرف اعضاء اور جوارح تسلیم۔

کرنے پڑیں گے جسم کا عقیدہ بھی رکھنا پڑے گا۔

یہاں صرف اپنی ”انفرادیت“ کا احساس دلایا ہے کہ تمہارے مفاہ کے لئے یہ چوپائے (دو دیگر حیوانات) ہم ہی نے بنائے ہیں تم ان کا دودھ پیتے ہو۔ گوشت کھاتے ہو اور سواری کرتے

**قول فیصل**

ہو۔ عربی کی ضرب المثل ہے ذالك بما صنعتہ بدالك یہ سب تمہارے ہاتھوں کا کیا کرایا ہے۔ حالانکہ یہاں ”صنعت“ اور ”ید“ سے صرف قول و کلام مراد ہے مگر اس پر بھی ہاتھ کے کئے دھرے کا اطلاق ہوا ہے۔ 26-2-96.



صافات

## طلوع وغروب کے مقامات

356

### رب السماوات والارض وما بينهما ورب المشارق

جو آسمانوں، زمین اور ان کے مابین ہے اور سورج کے طلوع کے مقامات کا رب ہے۔ (صافات، 6)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں معمول کے خلاف صرف ”المشارق“ کا ذکر ہے والمغارب، نہیں فرمایا حالانکہ معمول یہ ہے کہ مفرد خواہ ثنیہ بلکہ جمع تک میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہو تا رہا ہے۔

**وجه اعتراض**

قرآن پاک عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے جو بہت سی اصناف سخن کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان کے کلام میں اجمال بھی ہے اور تفصیل بھی، اختصار بھی ہے اور تطویل بھی وہ کبھی اپنی بات مختصر

**قول فیصل**

کر کے (رب المشرقین ورب المغربین) کہتے اور مراد ”گرمی“ کے دو مطلع لیتے۔ جو کبھی تو مشرق سے طلوع ہوتے نظر آتے اور کبھی جنوب مشرق سے اسی طرح غروب کے بھی دو مقامات ہوتے تھے۔ اور یہی عرب کبھی اپنی بات کو زیادہ تفصیل سے سناتے (رب المشارق والمغارب)۔ جس سے سال کے تمام ”مقامات طلوع“ اور تمام ”مقامات غروب“ مراد لیتے تھے اسی طرح سورہ رحمان میں ثنیہ اور دوسرے مقام پر مفرد کے صیغوں میں ذکر ملتا ہے۔ ایسے میں یہاں اگر صرف ”مشارق“ کا ذکر ہوا ہے تو اس سے ”مغارب“ کی نفی کیوں کر ہونے لگی جبکہ یہاں صرف اس فضیلت کا اظہار ہے جو طلوع و شروق (روشنی) کو غروب (اندھیرے) پر حاصل ہے۔ ☆

## کواکب صرف سماء۔ دنیا میں کیوں

357

### انا زینا السماء الدنيا بزينة الكواكب

ہم نے آسمان دنیا کو ”کواکب“ سے زینت بخشی ہے۔ (صافات، 6)

یہ ہے کہ۔ کواکب۔ تو آسمان دنیا کے علاوہ دوسرے آسمانوں میں بھی موجود ہیں صرف آسمان دنیا کی

**وجه اعتراض**



تخصیص کیوں؟

سماء الدنيا - کے کواکب کے ذکر سے دیگر سادات کے کواکب کی نفی متصور نہیں۔ اظہار  
صرف اس بات کا ہے کہ۔ سماء الدنيا کو ہم دیکھ پاتے ہیں دیگر سماء۔ عام نظر سے نہیں دیکھ

قول فیصل



جاسکتے۔

## نجوم کی ساخت اور حرکات پر غور کرنا

358

### فنظر نظرة فی النجوم

(صافات، 88)

تب ایک اچھٹی نگاہ ”نجوم“ پر ڈالی۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں نظرة کو ”فی“ کے ذریعہ متعدی کیا ہے جبکہ ”الی“ کے ذریعہ کرنا

وجہ اعتراض

(اعراف، 142)

چاہیے تھا جیسے فرمایا ولكن انظر الى الجبل۔

فی۔ یہاں۔ الی۔ ہی کا استعارہ ہے جیسے فرمایا فردوا ايديهم في افواههم (ابراہیم، 9) یہاں فی

قول فیصل

”الی“ ہی کے مفہوم میں ہے اسکے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دوں کہ۔ یہاں ”نظر“ کا لفظ ہے

جو دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ نظر فکر۔۔۔۔۔ اور نظر عین۔۔۔۔۔ یہاں چونکہ فکر و نظر سے کام لینا مقصود ہے لہذا ”فی“

(اعراف، 186)

کے ذریعہ متعدی کرنا صحیح ہے فرمایا۔ اولم ينظروا ”فی“ ملکوت السماوات والارض

26-2-96 ملتان



## بیمار نہ ہو کر بیمار ظاہر کرنا غلط بیانی ہے

359

### فقال اني سقيم

(صافات، 89)

ابراہیم نے ساتھ چلنے سے یہ کہتے ہوئے معذرت کر لی کہ میں سقیم ہوں۔

یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم بیمار نہیں تھے اسکے باوصف غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اپنے کو بیمار کہا۔

وجہ اعتراض

ایک شخص کہتا ہے کہ میری طبیعت ناساز ہے تو آپ کے پاس جھٹلانے کا کیا جواز ہے؟ جھوٹے پر تو

قول فیصل

خدا کی لعنت ہوتی ہے تو کیا صرف بخاری کا بھرم رکھنے یا اسکے رلو یوں کو معصوم ثابت کرنے کے

لئے یہ ضروری ہے کہ سیدنا ابراہیم کے سر سے عصمت کا تاج اتار لیا جائے؟ پھر یہ بھی تو ہوتا ہے کہ چلتا پھرنا آدمی بھی



ذہنی اضمحلال کا مریض ہو جاتا ہے۔ کبیدہ خاطر بھی اپنے کو سقیم کہہ سکتا ہے جسے کسی تکلیف اور نوبت سے پالا پڑے وہ بلاشبہ اندر اندر ہی سے سقیم ہے حریفوں کی شرارت اور حلیفوں کی شہادت سے بھی دلفگار ہو جاتا ہے۔



## اصنام ڈر کے مارے دوڑتے رہے؟

360

### فراغ علیہم ضربا بالیمین فاقبلوا الیہ یزفون

(صافات، 94)

پھر ان کو جب مارنا شروع کیا تو دوڑتے ہوئے سامنے آئے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ پروہتوں اور پجاریوں کو پتہ چل گیا تھا کہ ان کے بتوں کی اہم اہمیت ہی نے گت بنائی ہے کہ وہ مارے ڈر کے آپ کی طرف دوڑنے لگے۔ لیکن یہاں الجھن یہ ہے کہ سورۃ انبیاء میں پجاریوں نے کہا کہ من فعل هذا بالہتنا۔ ہمارے معبودوں کا یہ حشر کس نے کیا؟ اور پھر انہیں یہ بات ذہن میں آگئی کہ گت بنانے والے تو اہم اہم ہی تھے۔

واقعہ جب ایک ہی ہو اور میان میں کوئی کڑی رہ گئی ہو تو اسے میان والے اس حصے سے مکمل

قول فیصل

سمجھا جائے گا جس میں وہ میان ہوئی ہو۔ ☆

## ابراہیم اور ذبیح کا خواہی مکالمہ

361

### فانظر . ماذا . ترے

(صافات، 102)

مناوآب تمہاری رائے کیا ہے۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ اہم اہم نے جب کہا۔ انی ارے فی المنام انی اذبحک۔ میں نے تمہیں ذبح کرنے کا خواب دیکھا ہے اب بتاؤ کیا کریں؟ اس پر حضرت ذبح نے کہا۔ یا ابت افعل ماتلومر۔ با حضور جو فیصلہ کیا گیا ہے کر گدرو۔

یہاں سوال و جواب اور نتیجہ۔ سب ہی خواب کی باتیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے آپ

قول فیصل

نے ذبح کے ”ذہنی علق“ کا جائزہ لینے کے لئے خواب ہی میں دریافت کیا؟ اور پھر اندر کے اہم اہم نے زبان ذبح بن کر خواب ہی میں جواب دیا۔ افعل جو فیصلہ کیا گیا ہے کر گدريے۔ کس نے فیصلہ کیا تھا؟ اسکی وضاحت نہیں ہے تاہم چونکہ اللہ کے حوالہ سے بات نہیں ہوئی لہذا یہاں اہم اہم کے اندر کے اہم اہم نے خود ہی ”افعل“ بھی کہا اور خود ہی ”تومر“ بھی اور پھر اندر کے اہم اہم ہی نے خواب میں خواب کی تصدیق بھی کر ڈالی۔ (قد صدقت الرؤیا)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تصدیق تو اس بات کی ہوتی ہے جس کا وجود ہو یہاں ذبح کا وجود ہی ندارد ہے۔ لہذا تصدیق کیسی؟۔ جی نہیں واقعہ چونکہ خواب کا تھا لہذا سوال وجواب بھی اسی منہج کے ہوں گے اسے خارجی مثال میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔

☆

## ذبح عظیم سے کیا مراد ہے؟

362

### وفدیناہ بذبح عظیم

(صافات، 107)

بلاشبہ خواب کا واقعہ بھی ایک تھا اور ہم نے اسے قربانی کا صلہ دے دیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ اللہ سبحانہ فرماتے ہیں ہم نے ابراہیم کو ذبح عظیم کا بدلہ دے دیا سوال یہ ہے کہ وہ بدلہ کیا تھا؟۔ ذبح تو ذبح نہیں ہوئے۔ بدلہ کس چیز کا تھا؟

وجہ اعتراض

سیدنا ابراہیم کا لیڈیا کے رہائشی اور بڑے پیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے مگر جب توحید خدائے

قول فیصل

لا ایزال کی تبلیغ شروع کی تو کا لیڈیا کی شاہی فیملی نرود سے مڈ بھڑ ہو گئی۔ آخر الامر نوبت یہاں تک

پہنچی کہ آپ کو شام و فلسطین کی جانب ہجرت کرنے کا حکم ملا۔ یہ علاقہ نیز سرسبز و شاداب اور حسین و جمیل قدرت کے مناظر سے مالا مال تھا۔ لوگ بڑے خوشحال تھے اللہ کی برکتیں ہمیں پر سمٹ آئی تھیں۔ آرام و سکون کی ہر ہور ہی تھی کہ

آپ کو حجاز کی وادی بے آب و گیاہ کی طرف ہجرت کا نیا حکم ملا۔ (انہی ذاہب الی ربی، صافات، 99)۔ اور بلاشبہ ابراہیم

سے یہ ایک ”بڑی“ قربانی کا مطالبہ تھا۔ یعنی کہ اپنے آرام و آسائش کو تیاگ دے کر سر زمین حجاز کی طرف چلے جانا ہی اصل

میں ”نفس کشی“ اور آرزوؤں کو ذبح کرنے کا استعارہ ہے۔ یہاں مکہ میں نہ پانی تھا نہ خوردنی پیداوار کا ذریعہ۔ دکھ ہی دکھ تھا

لیکن قربانی رتھی جو آپ نے دے ڈالی۔ لیکن اللہ نے اسکے صلے میں مکہ کی بے آب و گیاہ وادی کو مرکزی حیثیت دے کر ابراہیم

و آل ابراہیم کو ابد الابد تک کے لئے یہاں بسایا اور سلمان زیت کی اس طرح فراہمی ہوئی کہ دنیا بھر کی اشیاء فراہم ہونے

لگیں اس طرح جو سلسلہ۔ خواب سے شروع ہو کر خواب پر ختم ہوا تھا حقیقت بن کر نمودار ہوا۔ یہاں نہ دنبہ تھا نہ اسے

اسماعیل کا متبادل ٹھہرا کر ذبح کیا گیا۔

☆

26-2-96 ملتان

یس

## ایک فرضی مقدمہ کا فیصلہ

363

### خصمان بغی بعضنا علی بعض

(م، 22)

ہم دونوں کا ایک مقدمہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔



## المتقين كالفجار

کیا باعمل مسلمانوں کو مفسدین فی الارض کی طرح بنائیں؟ کیا اہل انقاء اور بدکردار برابر ہو سکتے ہیں؟ (ص، 28)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ ”موجیہ“ عقیدے کے مطابق انسان اگر مؤمن ہے تو فاسق و فاجر مساوی ہیں۔

**قول فیصل** جب خدائے لایزال۔ اپنی زبانی فاسق فاجر۔ متقی اور بدکار میں فرق بتلاتے اور ان کی مساوی حیثیت کو تسلیم نہیں فرماتے تو ”اہل ارجاء“ کو اعتراض کیوں ہے؟



زمر

## شفاعت ایک ناممکن بات

366

افمن حق علیہ کلمۃ العذاب افانت تنفذ من فی النار

اے محمدؐ جسکی بابت عذاب کا فیصلہ ہو چکا تو کیا اسے (شفاعت کے زور پر) آگ سے نکال سکیں گے۔ (زمر، 19)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔ شفاعت محمدیہؐ سنیوں کا متفقہ عقیدہ ہے لیکن اس آیت سے شفاعت کا مسئلہ واضح نہیں ہو سکتا۔

**قول فیصل** نظریہ شفاعت اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن اسے رواج دے کر انصاف کو پروان چڑھانے میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شفاعت جب کسی ایک کی ہوگی تو دوسروں کا حق بھی بن جائے گا کہ انہیں سزا سے بچالیا جائے۔ یہ علاوہ اسکے کہ یہ بھی صرف اللہ۔ کا حق ہے اور اس نے اپنے فرشتوں کو بھی یہ حق تفویض نہیں کیا اور جو لوگ۔ الالمن ارتضیٰ (انبیاء، 28) میں حرف ”الا“ سے ”شفاعت“ کا ”استنباط“ فرماتے ہیں انہیں ہدائی جواب دیتے ہیں کہ یہاں۔ الا۔ بھی دراصل ”لا“ ہی کا استعارہ ہے یعنی۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے نہ انکی جن سے خدا راضی ہے۔

27-2-96 ملتان



## اللہ نہ وعدہ میں خلاف کرے گانہ وعید میں

367

وعد اللہ لا یخلف إلیہ المیعاد

یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ وعدہ شکنی نہیں کرتا۔ (زمر، 20)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ ہم سنیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ انعام دینے کا جو وعدہ فرماتے ہیں وہ تو پورا کر دیتے ہیں لیکن

و عید کے وعدے پر قائم نہیں رہتے اسے دیوبندیوں کی اصطلاح میں ”خلف و عید“ کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ سرور سرزنش کے وعدے کے خلاف کرپائے گا۔

آیہ زیرِ بحث میں ”المیعاد“ کا لفظ ہے جو وعدے اور عید کو یکساں شامل ہے یعنی وہ اگر انعام دینے کے وعدے کا پابند ہے تو سزا دینے کے وعدے کی خلاف ورزی بھی نہیں کرپائے گا۔ دیوبندی غصہ

**قول فیصل**

تھوکیں اور اللہ کے معاملات میں مداخلت نہ کرنا چاہیے۔ ☆

## قتل اور موت پر ”وفات“ کا اطلاق

368

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا

(زمر، 42)

موت کا وقت پورے ہونے پر ہی اللہ وفات دیتے ہیں۔

میں کہا جاتا ہے کہ وفات کا قتل اور موت پر اطلاق نہیں ہوتا۔

**وجہ اعتراض**

”توفی“ کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ روح کو پوری طرح جسم سے نکال لیتے ہیں خود یا بالواسطہ۔ یہ اسکے اصلی معنی ہیں۔ اسکے برعکس ”موت“ اسکا مجازی مفہوم ہے جس کا قتل پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے۔

**قول فیصل**

☆

## شفاعت کا حق کسی کو تفویض نہیں ہوتا

369

قل لله الشفاعة جميعا

(زمر، 44)

انہیں بتلا دیجئے کہ ہر قسم کی شفاعت کا حق اور اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔

یہ ہے کہ یہ آیت سنی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ہم سنیوں کا عقیدہ ہے کہ۔ انبیاء صلحاء اور اولیاء و شہداء کو شفاعت کا حق حاصل ہے۔

**وجہ اعتراض**

یہ سنی جانیں اور ان کا عقیدہ۔ خدا نے تو پالیسی واضح کر دی کہ ”شفاعت“ کوئی چیز نہیں۔ ”عمل صالح“ ہے تو صلہ بھی ہے اور ستائش بھی اور کر توت اگر ٹیڑھے ہیں تو سرزنش چھی اور ملامت

**قول فیصل**

بھی۔ بات آگئی من ذالذی یشفع عنده الا باذنہ (بقرہ، 250) کی رو سے بد عملوں کی سفارش کی تو یہاں پھر حرف استثناء (الا) کے حوالہ سے بات چلائی گئی ہے جبکہ اہل فن یہاں اسے بمعنی ”لا“ استعمال کر کے استدلال کی جڑ ہی کاٹ چکے



ہیں۔ اس طرح معنے ہوں گے :

کون ہے جو اللہ کے پاس سفارش کر سکتا ہے (نہ ہی) جسے اجازت ہو۔ اور یہی وہ مضمون ہے جو ص (22) کے ناظر میں پوری پالیسی واضح کرتا ہے۔ فرمایا۔ قل انی لن یجیر نى من اللہ احد ولن اجد من دونہ ملتحدا

انہیں کہہ دیجئے کہ اگر خدا مجھے عذاب سے دوچار کر دے تو مجھے بھی کہیں جائے پناہ مل سکتی ہے اور

نہ کوئی چانے والا۔ (جن، 22)

بات صاف ہو گئی اور سفارش کا ”پتہ“ ہی کٹ گیا کہ بفرض محال اگر خاتم الانبیاء کہیں گرفت میں آجائیں۔ تو اللہ سبحانہ انہیں بھی چانے پر مجبور نہیں ہو سکتے۔ وہ پاک و منزہ ہے کوئی دباؤ۔ قبول کرنے سے کیونکہ بات کھول کر واضح کر دی کہ۔ ہو یجیر ولا یجار علیہ وہ خود تو پناہ میں ”لے“ سکتا ہے کسی کے کہنے پر ”دے“ نہیں سکتا۔ (مؤمنون، 89)۔ نیز فرمایا۔ وانیبوا الی ربکم واسلموا لہ۔ من قبل ان یأتیکم العذاب ثم لا تنصرون۔

اور اس سے پہلے کہ تم پر ہلاکت مسلط ہو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اسکے قانون پر چلنا سیکھو، کہ تمہیں کہیں سے بھی مدد نہیں ملے گی۔ (زمر، 54)

یہاں۔ ”ثم لا تنصرون“ نے بات واضح کر دی کہ عذاب سفارش سے نہیں (واسلموا لہ) اسکے قانون پر عمل درآمد سے ٹل سکتا ہے۔

☆

### جو حکم حسب حال ہو صرف اسی پر عمل کرو

370

### واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم

تمہارے رب نے جو کچھ نازل کیا ہے اس میں سے بہتر اور خوب کو لے لو۔ (زمر، 55)

میں کہا جاتا ہے کہ قرآن تو سراپا حسن ہے اس کی کسی آیت کو ”احسن“ اور کسی کو غیر احسن۔ نہیں کہا جاسکتا۔ کیا ایسا تو نہیں صرف ”مناسب“ پر عمل کرنے کا احساس دلایا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ”احسن“ قرآن حکیم کی صفت ہے یعنی قرآن جو تمہارے رب کی بہترین کتاب ہے اس کے احکام پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اس سے پہلے اعراف میں بھی فرمایا۔ وأمر قومک یاخذوا باحسنہا۔

قول فیصل

ہم نے مومنین سے کہا ان ”الواح“ کی باتیں بہت بہتر ہیں انہیں تمام لو۔ (اعراف، 144)

☆

### کلید۔ مادی ذریعہ ہے اللہ کے استعمال میں کیسے آتا ہے

371

## له مقاليد السماوات والارض

(زمر، 63)

آسمانوں اور زمینوں کی کنجیاں اسکے لئے ہیں۔

### وجه اعتراض

یہ ہے کہ کنجیاں مادی سہارا ہیں اور اللہ مادی سہاروں سے بے نیاز ہیں۔

### قول فیصل

ہوں گے :

علم کی وسعت اور گیرائی سے آسمانوں اور زمین کو اور ان میں ودیعت کردہ ہر شئی کو احاطہ اور قابو کرنا۔ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں۔ اسکی کنجی فلاں کے ہاتھ میں ہے یعنی وہی اسے قابو کر سکتا ہے۔ نیز۔ مقالید کے معنی یہ بھی ہیں فرمایا ولله خزائن السماوات والارض۔ زمینوں اور آسمانوں کے خزانے کا مالک اللہ ہے اس کی رو سے مقالید۔ لامحالہ کسی مادی وسیلہ کے بطور استعمال نہیں ہوئیں جن کے لئے ہاتھ کا استعمال لازمی ہو جاتا ہے اب باوجود دے کہ اللہ سبحانہ واسطوں اور ذرائع کے محتاج نہیں تاہم کارِ حیات میں ہمارے پیائے فہم کے مطابق اپنی خفیہ توانائیوں کو ذریعہ بنایا بھی ہے اس نے آگ کے مزاج میں ”سوختنی“ کی صلاحیت رکھ کر گویا جلانے کا اشارہ دیا ہے پانی میں سیراب کرنے یا ڈوبنے کی صلاحیت رکھ کر پیاس نچھانے اور گویا ڈوبنے کا حکم دیا۔ زہر کے مزاج میں ”مارنے“ کی تاثیر رکھ کر گویا اشارہ دے دیا کہ استعمال کنندہ کی جان لے لے۔ موسمِ ربیع میں تاثیر رکھی کہ سبزیاں اور پودے آگاکر زمین کو زرخیز بنا دے۔ اسی طرح اس نے ہر کام اور ہر تاثیر کے لئے اشیاء میں ”خواص“ پیدا کئے جو اپنے اپنے لحاظ سے اللہ کا ”حکم“ کہلاتے ہیں۔

☆

اللہ۔ بہت بڑا جسم ہے

372

## والارض جميعا قبضته يوم القيامة والسماوات مطويات بيمينه

قیامت کے دن تمام زمین اسکی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اسکے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ (زمر، 67)

یہ ہے کہ قبضہ ہاتھ کی ہتھیلی اور انگلیوں سے ہوتا ہے جو جسم کو متقاضی ہیں اور جسم بھی اتنا بڑا کہ

### وجه اعتراض

آسمانوں اور زمینوں کے مجموعی سائز سے بھی بڑا کیونکہ ”مقبوضہ“ چیزِ حجم میں ہمیشہ چھوٹی ہوتی ہے۔

خاص کر داہنے ہاتھ۔ کی وضاحت اسکے ”جسامتی“ مفہوم کو پختہ بنالیتا ہے۔

یہاں ہمارے پیائے فہم اور استعداد، تفہیم کو ملحوظ رکھ کر بات کی گئی ہے کیونکہ ہم اسی بات کو زیادہ

### قول فیصل

سمجھ سکیں گے جو ہمارے روزمرہ کے محاورے کی عکاس ہو۔ اس طرح عربوں میں اپنے محاورات

کو افہام و تفہیم کے لئے زیادہ اہمیت دی جاتی رہی تھی وہ قبضہ اور داہنے ہاتھ کو، ”اقتدار“ اور ”مملکت“ کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے یعنی تمام کروں کو اللہ نے کنٹرول کر رکھا ہے۔

27-2-96 ملتان



المؤمن

قرآن میں وہی لڑتے جھگڑتے ہیں جو مسلمان ہو کر بھی کفر کی راہ چلتے ہیں

373

## ما یجادل فی آیات اللہ الا الذین کفروا

ہمارے احکام میں وہی لڑتے جھگڑتے ہیں جو حقیقتوں کو چھپانے کے عادی ہیں۔ (مؤمن، 4)

میں کہا جاتا ہے کہ۔ قرآنی احکام کی مخالفت صرف کافر ہی نہیں کرتے مسلمان بھی گروہی ”اساس“ پر ہی قبول بھی کرتے ہیں اور مسترد بھی بلکہ فقہی مزاج کے مطابق منسوخ بھی کر ڈالتے ہیں۔

وجہ اعتراض

ابو بکر رازی حنفی کہتے ہیں کہ یہاں ”یجادل“ سے مراد تکذیب ہے لیکن ان کی یہ توجیہ ”عکبوتی“ سہارے سے زیادہ کمزور ہے قرآن اپنی آیات پر عمل کرانے کے لئے آخری حد تک جاتا ہے

قول فیصل

فرمایا۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکفرون

جو اللہ کے دیئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (مائدہ، 44)

یہ آیت مدنی ہے اور مدینہ میں اس وقت نازل ہوئی ہے جب قرآنی احکام پوری توانائی سے نافذ ہو رہے تھے اور غیر مسلم خال خال تھے اور جو تھے انہیں آیات قرآنی میں لڑنے جھگڑنے کی تاب و توانائی نہیں رہی تھی ایسے میں حرف ”من“ سے بات چلا کر احساس دلایا کہ صرف اصطلاحی کافر ہی نہیں اصطلاحی مسلمان بھی اگر آیات الہی کو مسترد کر دیں تو۔ حرف مذمت ان پر بھی استعمال ہو گا کیونکہ ”من“ کے عموم میں کافر و مؤمن یکساں شامل ہیں، یعنی جو بھی احکام الہی کو مسترد کرتا ہے وہ تکذیب ہی کرتا ہے لہذا وہ جب تک اپنی سوچ کا زاویہ درست نہیں کرتا اور گروہی اساس پر قرآن شکنی۔ سے کام لیتا ہے مجادل ہے اور قرآن کے ابدی حقائق پر پردہ ڈالنے والا ہے یعنی کم از کم لغوی کافر ضرور ہے۔ کیونکہ احناف کھلے طور پر قرآن کو غیر مشروط نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ،

ہر وہ آیت جو ہمارے اس طریقے کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا مؤول ہے یا منسوخ۔ (تاریخ الفکر الاسلامی اردو ترجمہ دارالمصنفین اعظم گڑھ صفحہ 421)

یہ رائے فقہائے احناف کے بڑے عالم۔ امام ابوالحسن عبید اللہ الکرخی (952م) نے تمام فقہاء کے موقف کو جامع صورت میں پیش کرتے وقت دی ہے۔ تاہم انہوں نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ ایسی آیات کی تاویل کر کے فقہاء کے مسلک کے مطابق مفہوم لیا جائے گا پھر بھی فٹ نہ آئے تو ایسی آیت کو مسترد و منسوخ کیا جائے گا۔۔۔۔۔ احناف کی طرح حاملین احادیث کا موقف بھی یہی ہے کہ۔ قرآن اور حدیث میں جب کہیں تضاد نظر آئے۔ بے کھٹکے قرآن کو مسترد کر دیا جائے۔ امام

عبدالرحمان اوزاعی (774م) فرماتے ہیں کتاب احوج الى السنة من السنة الى الكتاب  
 ”قرآن کلی طور پر حدیث کا محتاج بلکہ (احوج) محتاج تر ہے۔“

(حوالہ جامع میان العلم طبع مصر جلد 2/19-الموافقات للعلانی طبع مصر جلد 4/108)

اسی طرح رئیس الحدیث امام بیہقی (747م) فرماتے ہیں۔ السنة قاضیة علی کتاب و لیس کتاب بقاض  
 علی السنة

قرآن اور حدیث جب متضاد ہوں تو فیصلہ کن حیثیت حدیث ہی کو حاصل رہے گی اسکے برعکس قرآن کا فیصلہ مسترد کیا  
 جائے گا۔ (کتاب ”الاعتبار“ امام حازمی (1188م) طبع منیر دمشق ۱۳۴۶ھ قاہرہ صفحہ 17)

یہ دونوں حوالے اپنے مفہوم میں واضح اور ابلاغ معانی میں غیر مبہم ہیں اور ہمارے اسلاف کے عقائد کی پوری  
 ترجمانی کرتے ہیں ایسے میں ابو بکر رازی کا ”جدال“ کو تکذیب کے مفہوم میں بدلنا عرفی سازی کا عجیب شاہکار ہے تاہم  
 فرض کرو کہ ”جدال“ کے معنی تکذیب ہی کے ہیں تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسترد کرنے سے غیر قرآنی  
 احکام کو تقویت دینے یا حکم بنانے کا خطرناک رجحان پیدا نہیں ہوتا۔ کاش ہمارے اسلاف کی اس نزاکت خیال کو کوئی ہمیں  
 سمجھا سکتا۔ ☆

29-2-96 ملتان۔

## خدا کی رہائش گاہ کئی منزلوں پر مشتمل ہے

374

### رفیع الدرجات ذو العرش

(مؤمن، 15) وہ مالک درجات عالی (اور) صاحب اقتدار اعلیٰ ہے۔

یہ ہے کہ درجات (منزل دار طبقہ) عمارت کی صفت ہے اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ --- اللہ کی  
 رہائش گاہ منزل دار طبقوں پر مشتمل ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ”درجات“ سے رفعت منزلت مراد ہے جیسا کہ ترجمہ سے عیاں ہے بلکہ ہمارے محاورات

قول فیصل

میں بھی ”مقام“ کا لفظ عزت اور بڑائی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں۔ سرسید کا

بہت اونچا مقام ہے۔ تو یہاں مقام سے ان کی رہائش گاہ یا جائے قیام مراد نہیں لیتے سید کے مقام و منزلت کا احساس دلاتے  
 ہیں۔ اسی طرح اللہ کے لئے ”درجات“ کا لفظ ہوا ”ذو العرش“ کی اضافی صفت کا تذکرہ ہو اس سے اقتدار اعلیٰ اور بلند  
 مرتبہ مراد ہے۔ ☆

## اپنی بڑائی کا اظہار

375

(مؤمن، 16)

لمن الملك اليوم.

اسی طرح فاتحہ میں ملك يوم الدينج (56) میں الملك يومئذ للهفاطر (13) میں ذالکم الله ربکم وله الملكتغابن (1) میں له الملك وله الحمد ہے

یہ اور دیگر آیات واضح کرتی ہیں کہ ملک اور بادشاہت صرف اللہ کی ہے

یہ ہے کہ اپنے منہ اپنی بڑائی بیان کرنا، شائستگی اور وقار کے منافی ہے۔ تکبر، خود ستائی اور شیخی بگھارنا اس ذات بے ہمتا کو زیب نہیں دیتے۔

وجہ اعتراض

علم اور عقل کی رو سے اللہ کے لئے اپنی زبانی خود ثنائی اور بڑائی بیان کرنا شانِ کبریائی کے عین مطابق ہے انگلستان کا بادشاہ اگر کہے کہ ہم ہندوستان کے شہنشاہ ہیں اور ہماری سلطنت میں سورج کبھی

قول فیصل

غروب نہیں ہوتا تو یہ شیخی ہے نہ غلط بیانی۔ بلکہ مشاہدے میں آنے والی حقیقت ہے۔ اور کسی بھی ”ادعا“ کے ساتھ جب ”حقیقت“ مربوط ہو تو وہ خلاف واقعہ اور خلاف آدابِ لسانی نہیں ہو سکتا۔ اللہ سبحانہ اپنے حاوی تر علم اور طاقت کی بنا پر اگر اپنی ”مالکیت“ کا اظہار فرماتے ہیں تو یہی اسکے شایانِ شان ہے وہ اگر اپنی کتاب کے بارے میں کہتا ہے کہ ”لاریب“۔ اور۔ ”لامثل“ ہے تو حقیقت اس ادعا کے ”ردیف“ ہے۔ ☆

تولی۔ اور۔ ادبر۔ میں فرق

376

یوم تولون مدبرین

(مؤمن، 33)

جس دن پیٹھ دکھاتے ہوئے پھر جائیں گے۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ تولی۔ اور۔ ادبر۔ کا ایک ہی مفہوم ہے لہذا ایک ہی لفظ کافی ہو سکتا تھا۔

وجہ اعتراض

بات کو پختہ اور مؤکد بنانے کے لئے جس طرح ہم اپنی بول چال میں مترادفات کا استعمال کرتے ہیں۔ عرب میں بھی اسکا بھرت رواج تھا فرمایا۔ وخر علیہم السقف من فوقہم (نحل، 26)

قول فیصل

یہاں ”سقف“ اور ”فوق“ ایک ہی مفہوم کے لئے استعمال ہیں ایک سے کام چل سکتا تھا مگر بات میں تنوع پیدا کرنے اور



پختہ بنانے کا رنگ نہ بھرا جاسکتا تھا۔



## اسباب۔ کالفظ دومرتبہ کیوں؟

377

لَعَلِّي ابلغ الاسباب . اسباب السماوات

(مؤمن، 37)

تاکہ میں اس بلند عمارت پر چڑھ کر آسمان پر جانے کے راستوں پر قبضہ کر لوں۔

یہ ہے کہ یہاں اسباب کے لفظ کے ایک بار استعمال سے بھی کام چل سکتا تھا۔

وجہ اعتراض

ایک بات کو پہلے ”ممم“ رکھ کر پھر اسکی وضاحت کرنا عرب کا ایک خاص اسلوب تھا اس سے کسی چیز کی اہمیت بڑھانا مقصود ہوتا تھا یہاں پہلا ”اسباب“ ”ممم“ ہے دوسرا سماء کی اضافت سے

قول فیصل

29-2-96 جمعرات ملتان۔



مفصل۔

فصلت (حم السجدہ)

## ”حجاب“ کا مفہوم

378

ومن بیننا و بینک حجاب

(فصلت، 5)

ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں حرف ”مین“ کے استعمال کا کیا فائدہ ہے جبکہ بیننا۔ اور بینک میں کوئی تعلق نہیں تھی؟

وجہ اعتراض

یہاں ”مین“ کے بغیر اگر بات چلائی جاتی تو اس سے ”طرفین“ کے مابین ”حجاب“ کا معاملہ ابہام میں رہ جاتا جبکہ ”مین“ کے اضافے سے بات یوں بنی کہ۔ میرے اور تمہارے درمیان جو حجاب ہے

قول فیصل

وہ فاصلے کا حامل نہیں۔ نیز یہ کہ یہاں حجاب ”تمثیل“ کے بطور استعمال ہوا ہے اس سے کسی چیز کا اثبات مقصود نہیں ہے اگر اثبات مقصود ہوتا تو ”منہ پھیرنے“ والوں کے لئے انحراف کی دلیل بن جاتا۔



## وہ ایمان کے بعد کیوں بھٹے؟

379

واما ثمود فهديناهم فاستحبوا العمى على الهدى

(فصلت، 17)

ثمودیوں کو ہم نے ہدایت دی لیکن انہوں نے روشنی پر اندھیرے کو ترجیح دی۔

یہ ہے کہ یہاں ہدیٰ کے معنی ”ایمان“ کے ہیں۔

وجہ اعتراض

یہاں ”ہدیٰ“ کے معنی راہنمائی ”دلالة“ یا وضاحت کے ہیں یعنی اللہ نے انہیں راہنمائی کی اگرچہ

وہ کافر تھے لیکن انہوں نے روشنی پر اندھیرے کو ترجیح دے کر اپنے اختیار کا غلط استعمال کیا۔

قولِ فیصل



قرآن کی پذیرائی۔ متن سے ہے یا مفہوم سے؟

380

ولو جعلناه قرآنا اعجميا لقالوا لولا فصلت آياته الاعجمي وعربي

اگر ہم اس قرآن کو کسی عجمی زبان میں بیان کرتے تو یہ کہتے کیا اچھا ہوتا اسکی تفصیل بھی ہو جاتی کہ کیا عجمی ہے اور کیا عربی

(فصلت، 44)

ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ قرآن کو دانستہ عربی۔ بنا کر اس کی آفاقی حیثیت مجروح کر دی گئی ہے یہی وجہ ہے

کہ دوسرے ملکوں میں اسکی پذیرائی اور افادیت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

وجہ اعتراض

پذیرائی خوب ہوئی اس کی لسانی مقبولیت جیسی بھی ہوئی لیکن اس نے جو ”لائحہ عمل“ اور انسانیت

کو نجات کا پیغام دیا اسکا مقابلہ کرنے کے لئے آج تک کہیں سے جواب فراہم نہ ہو سکا۔ اس سے

قولِ فیصل

زیادہ پذیرائی کیا ہو سکتی تھی؟ زبان ترجمہ ایک حقیقت ہے اور کہ تمام ”تنزیلات“ ترجمہ کے ذریعہ ہی آگے بڑھیں اور

دلوں میں اترتی چلی گئیں خاص کر وحی کی نفسیات میں یہ شامل ہے کہ ”منزل من اللہ“ کا پہلا مخاطب نبی خود ہوتا ہے

جسکی اپنی زبان ہوتی ہے (الابلسان قومہ) جس میں وہ کلام کرتا ہے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبی کی زبان کچھ ہو اور تنزیل کا

آہنگ کچھ اور اگر ایسا ہوتا تو ہر نبی اپنے اوپر نازل شدہ وحی کو سمجھنے سے خود بھی قاصر ہوتا اور جو اپنی ہی وحی سمجھ نہ سکتا وہ

ارادۃ الہی کی ترجمانی کیوں کر کر سکتا تھا۔ لہذا ہمارے نزدیک وجہ اعتراض بالکل ہی بلا وجہ ہے اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ

قرآن ہر زاویہ سے پذیرائی کی منزلیں طے کر چکا ہے۔

29-2-96.



شورے

اللہ۔ کس طرح بات کرتا ہے؟

381

كذلك يوحى اليك والى الذين من قبلك

(شورے، 2) اسی طرح اللہ تمہاری اور تم سے پہلے لوگوں کی طرف وحی کرتا رہتا ہے۔

یہ ہے کہ یہاں۔ وحی۔ کے بارے میں مضارع کا صیغہ (یوحی) استعمال ہوا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی نسبت سے تو درست ہے لیکن سابقہ انبیاء کی نسبت سے نادرست ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں اللہ سبحانہ کی عادت اور طریقہ کار کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنی وحی کے ذریعے ہی خطاب کرتا رہا ہے اور یہ مفہوم مضارع کے صیغے ہی سے آشکارا ہو سکتا تھا۔ کہ ماضی میں اظہار کا یہ پہلو واضح نہ ہو سکتا تھا۔ اس فرق کو ذہن پر زور دے کر سمجھنے کی کوشش کریں۔ ☆

قول فیصل

مثل۔ کسے کہتے ہیں؟

382

لیس کمثلہ شیئی

(شورے، 11) اس کی مثل کوئی بھی نہیں ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ کمثلہ۔ کے لفظ میں بظاہر ”مثلیت“ کا مفہوم پوشیدہ ہے اور۔ لیس۔ میں مثال کی مثلیت کی نفی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے لیس کذا او زید فی دار۔ کیونکہ یہ محاورہ زید کے لئے گھر کے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

وجہ اعتراض

لغت اور ادبیات عرب میں ”مثل“ کا لفظ ”ذات“ کا کنایہ ہے اس طرح معنی ہوں گے۔ اس کی ذات کی مانند کوئی بھی نہیں ہے۔ ☆

قول فیصل

آسمانوں میں ”زندگی“ کا وجود

383

ومن آياته خلق السماوات والارض وما بث فيهما من دابة

(شورے، 29) اسکی نشانیوں میں سے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ”حرکت“ ہے اللہ کی تخلیق کے شاہکار ہیں۔

یہ ہے کہ دو اب۔ یعنی چوپائے، چرند، پرند یا ہر جاندار زمین پر رہتا ہے یہاں ”فیہما“ کے حشر کے ضمیر میں آسمانوں کو بھی ”دواب“ کا مسکن بنایا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ”دابة“۔ ”زندگی محض“ کا استعارہ ہے یعنی احساس دلایا ہے کہ ”زندگی“ کا وجود کفارِ مٹنے سے باہر بھی ہے اس طرح اس بارے میں قرآن نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے اپنا عندیہ دے دیا ہے اب مستقبل میں یہ سائنس کا کام ہے کہ اس ”زندگی“ سے نقاب الٹائے۔ ☆

## قول فیصل

مایوسی جب چھا جائے تو اُمید کی کرن پھوٹتی ہے

384

وہو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمته

اللہ مایوسی کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو عام کرتا ہے۔ (شورے، 28)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رحمت کو مایوسی سے مربوط کیا گیا ہے جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا۔

## وجہ اعتراض

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ (زمر، 53)

یعنی ”مایوس“ ہونے سے حماروک دیا گیا ہے اس طرح یہ عجیب تضاد ہے کہ اگر مایوسی نہ ہو تو رحمت کے پٹ نہیں کھلتے اور ساتھ ہی یہ کہ مایوس ہونا حکمِ عدولی ہے۔

دنیا اُمید پر قائم ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان مہمہ حیات میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دے جس سے قدرت کی

## قول فیصل

عطا کردہ توانائیاں، ماند پڑنے کا امکان بھی ہے اور زندگی کے بے مصرف ہونے کا خطرہ بھی۔ یہ

درست ہے کہ ”قنط“ کے معنی مایوسی کے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ رحمتہ کے معنی رحمت ہی کے ہیں لیکن آیہ زیر بحث میں یہ لفظ ”بارش“ کا استعارہ ہے۔ اس طرح بعد۔ کالفظ بھی حروفِ اضداد کی نمایندگی کرتا ہے جسکے معنی بعد کے بھی ہیں اور ”پہلے“ کے بھی اس بنا پر معنی ہوں گے۔ اللہ۔ چرک زمین کو شاداب رکھنے والوں کی مایوسی سے پہلے ہی بارش برساتے ہیں۔ ☆

رسول اللہ۔ قرآن اور ایمان کا بخوبی اور اک رکھتے تھے

385

ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان

تمہیں تو ایمان اور کتاب کا پتہ بھی نہ تھا۔ (شورے، 52)

یہ ہے کہ انبیاء کرام فطرتاً۔ مؤمن بھی ہوتے ہیں اور موحّد بھی وہ روشنی طبع ہی سے ہر چیز سے آگاہ

## وجہ اعتراض

ہوتے ہیں۔

روشنی طبع۔ نبوت کے دیگر تقاضوں کی نفی نہیں کرتی جبکہ یہاں زور دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ

## قول فیصل

نبی اکرم ﷺ نبوت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی۔ ایمان کے تقاضوں اور قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کی صلاحیتوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ اس پر روشنی طبع مستزاد۔

☆

زخرف

## جَعَلَ۔ اور۔ خَلَقَ۔ میں فرق

386

انا جعلناه قرآنا عربيا

(زخرف، 3)

ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں۔ جعل۔ کو قرآن کا فعل بنایا ہے جسکے معنی ”مجعلول“ کے ہیں جبکہ سنی عقیدے کے مطابق۔ قرآن مجعول (مخلوق) نہیں ہے۔

وجہ اعتراض

لیکن کوئی حقیقت سنی عقیدے سے بدل نہیں سکتی۔ تاہم کسی پر جبر نہیں ہے کوئی نہیں مانتا تو نہ ہسی۔ لیکن عربی ادب میں ”جعل“ کا اطلاق غیر مخلوق پر بھی ہوا ہے اس طرح آپ یہ تو کہہ سکتے

قول فیصل

ہیں کہ۔ جعل۔ کے معنی ”قول“ کے بھی ہیں جیسے فرمایا۔ ویجعلون للہ البنات۔ (نحل، 53) وجعلوا للہ اندادا (ارہام، 30)۔ یعنی وہ کہتے ہیں (یجعلون) اللہ کے لئے عیاں ہیں نیز کہتے ہیں (جعلوا) کہ اللہ کے ساجھی بھی ہیں۔

☆

## رسول سے مراد ”دینی قیادت“ ہے

387

وَأَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا

(زخرف، 45)

تم سے پہلے جو رسول مبعوث ہوئے ان ہی سے دریافت کر ڈالو۔

یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نہ ان سے ملے اور نہ ان کے ہم عصر تھے ان سے کچھ دریافت کرتے تو کیسے کرتے؟

وجہ اعتراض

یہاں ”مجاز“ کے پیرائے میں کہا کہ۔ ان کی ”دینی قیادت“ سے دریافت کر لو۔ کیونکہ اصحاب رسول کو بھی رسول کے رسول کہا گیا ہے تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

قول فیصل

☆

## ہر نشان پہلے سے زیادہ اہم تھا

388



## وما نريهم من آية الا هي اكبر من اختها

(زخرف، 48)

جب بھی انہیں کوئی نشان دکھلاتے وہ پہلے سے بڑا ہوتا۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ اس طرح پہلا نشان دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے اور انھوں نشان

نویں سے بڑا ہوتا یعنی کہ ہر نشان فاضل بھی ہوتا اور مضمحل بھی جبکہ ایک ہی وقت میں کوئی شخصیت یا شئی دو متضاد وصفوں کی حامل نہیں ہوتی۔

**وجہ اعتراض**

اس چمرایہ بیان کا مقصد یہ ہے کہ ہر آیت اپنے مقام پر ”کبرے“ تھی۔ ان میں چھوٹی بڑی کا تفاوت

**قول فیصل**

نہیں تھا دیوانہ حمار میں ہے۔

مَنْ تَلَّقَ مِنْهُمْ تَقْلًا لَا قِيَتَ سِيَدَهُمْ

مثل النجوم التي يسرى بها الساري

ان میں سے جس سے بھی ملو گے تو کہہ انھو گے ان کے سردار سے ملا۔ ان کی مثال تو ستاروں جیسی ہے کہ چلنے والا ان کی

رہنمائی میں چلتا ہے۔

☆

دخان

## موت بار بار۔ یا صرف ایک بار؟

389

## لا يذوقون فيها الموت الا الموتة الاولى

(دخان، 56)

وہ صرف (ایک بار) پہلی موت ہی کا ذائقہ چکھیں گے۔

یہ ہے کہ یہاں دو موتوں کا ذکر ہوا ہے جبکہ موت میں تعدد تو نہیں ہوتا۔

**وجہ اعتراض**

یہاں زجاج (923م) اور فراء (822م) کے نزدیک ”الا“ برائے استثناء نہیں۔ اسکے معنی ”سوا“ کے

ہیں جیسے فرمایا۔ الا ما قلد سلف۔ الا ما شاء الله۔ (سوائے اسکے جو ہو چکا۔ نساء، 22) یا۔

سوائے اسکے جو اللہ چاہے اس طرح معنی ہوں گے اس موت کے سوا جو ایک بار آچکی کوئی دوسری موت نہ ہوگی۔ نیز۔ الا۔

☆

کے معنی ”بعد“ کے بھی ہیں۔

جاثیہ

## مردہ اجداد کو زندہ کرنے کی شرط صداقت

390

وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَا كَانَ حُجَّتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا بِمَا نُبَيِّنُ عَنْكُمْ صَادِقِينَ. قُلِ اللَّهُ يَحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ

جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو دلیل نہ پا کر کٹ حجتی کا سارا لینے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے مردہ اجداد کو زندہ کر دکھلاؤ۔۔۔۔۔ (اے محمدؐ) انہیں کہہ دو کہ جس خدا نے تمہیں زندگی بخشی اور پھر موت سے ہمکنار کیا وہ اس پر بھی قادر ہے کہ روز قیامت جو شک و شبہ سے بالا ہے اس دن تمہیں جمع کر دے۔ (جاثیہ، 25، 26)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ سوال مردوں کو زندہ کرنے کا تھا۔ جمع کرنے کا نہیں تھا۔

یہاں ”یجمعکم“ کا جامع لفظ اسلئے استعمال فرمایا کہ اسمیں ”احیا“ کی الگ وضاحت نہ کرنی پڑتی کیونکہ جمع ہونا زندگی ہی کا وصف ہے۔

☆

احقاف

## درجات اور درجات میں فرق

391

### ولکل درجات مما عملوا

ہر فریق کے لئے درجات ہوں گے۔ (احقاف، 19)

یہ ہے کہ یہاں ”لکل“ میں ہر دو فریق یعنی اہل نار اور اہل جنت کے بارے میں فرمایا ان کے ”درجات“ ہوں گے حالانکہ درجات صرف اہل جنت کے ہوں گے اہل نار کے لئے ”درجات“ ہوں گے۔

درجات کی تخصیص برائے اہل جنت کوئی طے شدہ نہیں ہے اسکی نسبت اہل جنت کی طرف ہوگی تو ان کے بلند رتبے اور درجات مراد ہوں گے اور اگر اہل نار کی طرف نسبت ہوگی تو ”نچلے“ درجات میں پہنچا دینا مراد ہوگی اس طرح نسبت کے اختلاف سے مفہیم مختلف ہوں گے۔

☆

## وہ ”جن“ کون تھے؟

392

## واذ صرفنا اليك نفراً من الجن

(احقاف، 29)

جب ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو آپؐ تک پہنچادیا۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ یہاں جنوں کے ایمان بالقرآن کی بات ہوئی ہے جبکہ انہیں کسی نے دیکھا نہ سنا۔

**قول فیصل** یہاں ”جن“ سے مراد وہ اجنبی ہیں جو شہر مکہ میں داخل ہو کر اپنا ”مدعا“ بیان نہ کر سکتے تھے، انہیں ڈرتھا کہ اہل مکہ انہیں اجنبی سمجھ کر اذیت سے دوچار نہ گردیں لہذا وہ جناب رسالتؐ سے ”خلوت“ کے طالب ہوئے چنانچہ آپؐ نے اشارۃ الہی (وصرفنا) پاگران کے مطالبہ کی پذیرائی فرمائی اور رات کے وقت گھروں سے کچھ فاصلے پر جا کر ان سے ملے۔ ان کو نفرا۔ یا نفور۔ کے لفظ میں یاد کیا گیا ہے اور عرب کے تمام لغت گوواہ ہیں کہ۔ نفور۔ کا لفظ صرف مرد ”انسانوں“ ہی کے لئے خاص ہے غیر انسانوں کو نفراً۔ یا۔ نفور، نہیں کہا جاتا لہذا یہاں جنوں سے مراد انسان ہی ہیں جو امتِ موسیٰ سے واسطہ تھے دور دراز سے قرآن کا شرہ سن کر آئے تھے اور بہت سی باتوں کو کتبِ موسیٰ (تورات) کے ہم آہنگ پا کر مسلمان ہو گئے تھے نظر میں آسکتے تھے اور اظہار کے لئے انسانوں والا اسلوب ہی اختیار کر پائے تھے۔

☆

393

سارے۔ یا کچھ گناہ؟

## یغفر لکم من ذنوبکم

(احقاف، 31)

تمہارے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ۔ من ذنوبکم۔ کی بجائے ”ذنوبکم“ کہنا موزوں تھا کہ یہاں ”من“ کے باعث کچھ گناہوں پر پردہ ڈالنے کا مفہوم مترشح ہوتا ہے۔

**قول فیصل** من۔ کو حذف کر کے۔ ذنوبکم۔ کو مفعول کے مقام پر لے آنا تب موزوں ہو تا جب تمام سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا مقصود ہوتا بھی تو وہ ایمان لائے تھے عملِ صالح کے مراحل سے گذرنا بھی باقی تھا کیونکہ ایمان کے باوصف، عمل کے ٹمپر پچر کو دیکھنا ضروری ہے۔

96-3-1 جمعہ

☆

محمد

جنگی قیدیوں کا مستقبل

394

## فاما منا بعد واما فداء

جب قتلِ غلام ہند ہو چکا اور جنہیں اسیر بنایا گیا ان کی بابت (آئندہ کے لئے) فیصلہ یہ ہے کہ یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دیا کچھ معاوضہ لے کر۔

(محمد، 4)

### وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ۔ روایات و احادیث میں اس پالیسی کو مسترد کرتے ہوئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ جنگی قیدی مرد ہوں تو غلام اور عورتیں ہوں تو داشتہ بنائی جائیں۔

### قول فیصل

یہاں جنگی قیدیوں کے بارے میں نئی پالیسی عطا کی گئی ہے کہ اب اسلام نے صرف مسلمانوں کے لئے، نہیں پوری نوعِ انسانی کے لئے رحمت بننا تھا جہاں تک خرید و فروخت کے ذریعہ صعبِ نازک اور صعبِ کثیف کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کا سوال ہے تو اسلام نے اسکی سرے سے اجازت ہی نہیں دی یہاں بات ہو رہی ہے جنگی قیدیوں کے لئے رائج پالیسی میں تبدیلی لانے کی سوا اشارہ دیا کہ۔ اللہ کا مشاغل سے یہی تھا اور لہٰذا تک یہی رہے گا کہ اسکے بندوں کو اس ہی کا بندہ رہنے دیا جائے۔ لیکن اللہ کے اس مشاکل احترام نہ پہلے ہوا اور نہ۔ مسلم رہبانیت اور ملوکیت نے اسے پذیرائی بخشی۔ تاہم قرآنِ مجید نے اپنا فرض پورا کیا اور پہل کر کے نئی جنگی پالیسی دی کہ آج کے بعد انہیں غلام اور داشتہ نہ بنایا جائے۔ چنانچہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری مرحوم نے ”رحمۃ للعالمین“ میں واقعہ بدر کے ضمن میں تفصیل دی ہے کہ جنگِ بدر میں آپ کے پاس 72 قیدی لائے گئے آپ نے نئی پالیسی کے مطابق ستر قیدیوں کو تو تہاد لے میں رہا کر دیا اور مزید تہاد لے میں کوئی نہ آیا۔ لہٰذا آپ نے دو قیدیوں سے نقدِ فدیہ طلب فرمایا لیکن ان کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا وہ عرض گزار ہوئے یا رسول اللہ نہ ہمارے پاس کچھ ہے نہ ہمارے ورثہ ہا کرانے کی سکت رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ کام کیا جانتے ہو وہ مرضِ پرداز ہوئے کہ عفو و کرم کے مالک ہم پڑھے لکھے ہیں چنانچہ آپ نے ان سے دو سال تک چوں کو پڑھانے پر معاملہ طے کیا۔ غرض کہ وہی اللہ کی نئی پالیسی پر آپ نے عمل کر کے اپنی امت کے سامنے غلامی کے بارے میں قطععی اور آخری فیصلہ رکھ دیا۔ اب اگر روایات والوں نے آپ کی تعلیمات کو مسترد کر کے غلاموں اور غیر مسلموں کے اشتاؤں کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تو اسکی ذمہ داری قرآنِ یارِ رسول انسانیت پر عائد کیونکر ہو سکتی ہے؟

96-3-1 جمعہ



## مرنے کے بعد ہدایت کیسی؟

395

والذین قتلوا فی سبیل اللہ فلن یصل اعمالہم سیدہم ویصلح بالہم

جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے۔ اللہ ان کے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا اور انہیں سیدھے راستے پر چلائے گا۔ (محمد، 5)

یہ ہے کہ یہاں شہدا کے بارے میں کہا کہ انہیں سیدھے راستے پر چلائے گا سوال یہ ہے کہ سیدہم (سیدھے راستے پر چلانا) تو موت سے پہلے ہونا چاہیے۔ موت کے بعد ہدایت کیسی؟

### وجہ اعتراض

## قول فیصل

امام عبد الجبار ہمدانی کے نزدیک قتل کے بعد ہدایت کا قرینہ واضح کرتا ہے کہ یہاں ”ہدایت“

1-3-96.

سے مراد وہ ”صلہ“ ہے جو شہید کو جسے یہ کہہ دیتا ہے۔



فتح

## رسول کے اگلے پچھلے گناہ

396

انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله ماتقدم من ذنبك وما تأخر

ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے تاکہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں۔ (فتح، 1)

میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں رسول اکرم ﷺ کے سابقہ اور مستقبل کے گناہوں کا ذکر ہے اب

## وجہ اعتراض

سوال یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت۔ ماضی کے گناہوں کی بخشش کیسی؟ وہ تو وقت نزول

ایک طرح سے معدوم ہی تھے۔ کیا معدوم پر بخشش کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ نیز مستقبل کے گناہ ابھی ظہور ہی میں نہیں آئے

تھے، بلکہ رسول تو ماں کے پیٹ ہی سے۔ معصوم ہوتے ہیں ایسے میں گناہ کا مرزو ہونا کیسے ممکن ہوا؟

ہمارے سنی بھائی یا تو پیغمبر کے سر پر ”الوہیت“ کا تاج سجا کر حاجت روا اور مشکل کشا بنا ڈالتے ہیں یا

## قول فیصل

حالت یہ ہے کہ نبیوں کی عصمت کو اچھالنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ سابقہ

گناہوں سے حضرت ماریہ (637 م) سے بد سلوکی مراد ہے اور آئندہ کے گناہوں سے حضرت زینب (641 م) کے بارے میں

لغزش کھانا مراد ہے۔ لیکن کیا وحی قرآن ان خود ساختہ مفادیم اور پس منظر کو ہضم کر سکتی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے

اور نفی ہی میں رہے گا کیونکہ ”ذنب“ کے معنی ”ذم“ کے ہیں یعنی دم جس طرح جانور کے پچھلے حصے سے لگی ہوتی ہے اسی

طرح کچھ گناہ بھی انسان سے لگے رہتے ہیں لیکن یہ گناہ ایک تو شمار میں نہیں آتے جو آتے ہیں وہ ”ذنب“ کے وسیع تر مفہوم

کی رو سے، تہمت اور الزام کا ”استعارہ“ بن جاتے ہیں اس طرح مفہوم یہ ہو گا کہ۔۔۔۔۔ لوگوں نے سید البشر پر جو الزام

تراش رکھے تھے اور آپ کی وحی کو ”افترا“ سے تعبیر کر رکھا تھا فح کی صورت میں ایک گونہ ان الزامات کا ازالہ بھی مقصود تھا

کہ حاکم اور فاتح بننے کے بعد نفسیاتی طور پر بھی مفتریوں اور تہمت تراشوں کا ناطقہ بند ہو جاتا ہے۔ یہاں غفر۔ کے معنی

بخش دینے کے نہیں ہیں پردہ ڈالنے کے ہیں۔ یعنی الزامات کے فتح کی صورت میں ازالے کے بعد تمام باتیں پس پردہ چلی

گئیں اور آپ صاف ستھرے تھے اور صاف ستھرے سامنے آ گئے۔ ☆

2-3-96 ملتان۔

## کیا مشیت یہ تھی کہ رسول اللہ کعبہ میں داخل نہ ہوں؟

397

لقد صدق الله رسوله الرؤيا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله



آمنین

بلاشبہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے خواب کو سچا کر دکھلایا۔ کہ خدا نے چاہا تو تم مسجد الحرام میں پرامن طریقے پر داخل ہو گے۔

(فتح، 27)

وجہ اعتراض

یہ ہے کہ مسجد الحرام میں فاتحانہ در آنے کو اللہ نے اپنی مشیت سے کیوں مربوط کیا؟ کیا اللہ کی مشیت نہ تھی کہ رسول اللہؐ کعبہ میں داخل ہوں؟

قول فیصل

ان شاء اللہ۔ کہنے سے دخول کعبہ کی نفی کہاں سے لی گئی؟ نیز یہاں ”الرویا“ ”دلی خواہش“ کا استعارہ ہے جو اللہ کی منشا سے پوری ہو گئی۔ نیز۔ ان۔ یہاں۔ اذ۔ کے معنی میں آیا ہے یعنی۔ فتح مکہ جب ارادۃ الہی کا مظہر بنی تو ممکن ہو گئی۔ اس طرح ان شرطیہ۔ اذ (جب) کے مفہوم میں تبدیل ہو کر وجہ اعتراض کو بلا وجہ بنا گئی۔

یہاں یہ توجیہ بھی گوارا ہے کہ۔ ان۔ کو اگر حرف استثناء سے تعبیر کیا جائے تب بھی مفہوم میں کوئی فنی سقم نہیں رہتا کہ اسے ”لقد خلن“ سے مربوط کرنے کی جائے۔ اگلے فقرے ”آمنین“ سے متعلق ٹھہرایا جائے۔ اسی طرح فتح 27۔ اور فتح 29 کا مضمون ایک ہی ہو جائے گا۔ فرمایا۔ وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات منهم مغفرة واجرا عظیما

اللہ نے ان مؤمنوں سے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح کئے مغفرت اور بہت بڑے صلے کا وعدہ کیا ہے۔ (فتح، 29)

اور وعدۃ الہی مشیت الہی کا مظہر ہوتا ہے۔



حجرات

محل رسولؐ کے آداب

398

یا ایہا الذین آمنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ

(حجرات، 1)

مؤمنو اللہ اور رسولؐ کے آگے کسی کو نہ بڑھاؤ۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں اللہ اور رسولؐ سے آگے کسی کو بڑھانے سے روک دیا ہے جس سے معلوم

وجہ اعتراض

ہوتا ہے کہ کسی غیر کو آگے بڑھانے سے روک دیا ہے۔

مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں

یہاں گرائمر کے ضابطے کی رو سے ”قدم“ لازمی۔ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے متعدی مفہوم

قول فیصل

مطلوب نہیں ہے جیسے بین تبیین۔۔۔۔۔ فکر تفکر۔۔۔۔۔ وقف توقف میں متعدی اور لازمی

ادب اپنی اپنی خاصیتوں سے مفہوم رکھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے :

اذا نحن سرنا سارت الناس خلفنا

و ان نحن اوماننا الى الناس وقفوا

جب ہم چلتے ہیں تو سب لوگ ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیتے ہیں اور اگر رک جانے کا اشارہ کرتے ہیں تو وہیں ٹھہر جاتے ہیں یہاں وقفوا فعل لازمی ہے مگر شاعر نے اسے توقفوا میں بدل کر فعل متعدی بنا ڈالا ہے۔  
غرض کہ یہاں کھل نبویؐ میں بیٹھنے اور بات کرنے کے ادب سے روشناس کراتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اپنی بات کو یا اپنے آباؤ اجداد۔ بزرگوں اور اماموں کے ملفوظات اور فتاویٰ کو فرامینِ سببر پر ترجیح نہ دو۔



رسول اللہ سے بات کرنی ہو تو ادب سے کرو

399

ولا تجهروا له بالقول

آپ کے سامنے زور زور سے یا چلا کر بات نہ کرو اس سے آپ کو اذیت ملتی ہے۔ (حجرات، 2)

یہ ہے کہ۔ بعض لوگ عادتاً ”یا طبعاً“۔ زور زور سے بات کرنے کے خوگر ہوتے ہیں اور انہیں وجہ اعتراض احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کا لہجہ کڑھتا ہے۔

یہاں لوگوں کی اضطراری اور طبعی حالت پر کنٹرول کرنے کے لئے ہی کھل رسولؐ میں آنے والوں کو درس دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے لہجہ کی تلخی میں تبدیلی پیدا کریں کہ انہیں آگے چل کر دنیا کی ”امامت“ کا بوجھ بھی اٹھانا ہے۔ اور لوگوں سے بات کرنے کا ”سلیقہ“ بھی سیکھنا ہے چنانچہ جب لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ اپنے اجدادین اور نواسنتہ کڑھت لہجہ کی عادت سے دستکش ہو کر موم کی طرح نرم عادات کے حامل بن گئے۔



کیا صحابہؓ کے عمل ضائع ہو گئے تھے؟

400

ان تحبط اعمالکم و انتم لا تشعرون

تم شور مچا کر بات نہ کرو جس سے رسولؐ کی بات دب جائے اور آپ کا مفہوم واضح نہ ہو سکے اس طرح تمہارا اچھا کردار ضائع جائے گا اور تمہیں پتہ بھی نہ چل سکے گا۔ (حجرات، 2)

میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیہ۔ امامیہ کے نزدیک ابو بکر و عمرو و دیگر سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے وجہ اعتراض

ایمان کو تاپنے کے لئے نازل ہوئی ہے کہ یہ لوگ خاص کر ابو بکر و عمرؓ آپؐ کی جناب میں بد تمیزی اور گستاخی سے پیش آتے تھے بلکہ روایت کی حد تک سنی بھی اس کا نزولی پس منظر یہی تسلیم کرتے ہیں حالانکہ اعمال کا اکارت جانا کفر کا استعارہ ہے جبکہ بلند آواز میں بات کرنا کفر نہیں ہے۔

### قول فیصل

یہاں حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما پر خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس آیت کے لئے بلاوجہ کسی پس منظر کی تخلیق حراما نصیبی ہے یہاں عام لہجے میں **اولیٰ جہل و آداب گفتگو کی اہمیت واضح** کی گئی ہے۔ اس میں کسی کے کفر و عصیان سے تعرض نہیں کیا گیا۔ ”حبوط“ اعمال سے ارفع کردار سے محرومی مراد ہے۔ رہا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو نشانہ مذمت مانتا۔ یا۔ تحبط اعمالکم۔ کے مطابق ان کے کفر کا کھوج لگانا۔ تو غصہ تھوکنے ان آیات کے عمومی لہجہ کو خاص شخصیات سے مربوط کرنے کا یہاں نہ جواز ہے نہ قرینہ۔ آپ مانیں یا نہ مانیں اس سے رسول اللہ کے دل کو اذیت پہنچتی ہے۔ آپ کو اپنے رفقاء کا رے بھد پیار تھا۔ آپ ہر گز یہ پسند نہ فرمائیں گے کہ انہیں برا کہا جائے۔



## فسق اور عصیان میں فرق

401

### و کرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان

اللہ نے تمہارے لئے، کفر، فسق اور عصیان کو ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے۔ (حجرات، 7)

یہ ہے کہ عصیان کا لفظ عام ہے جو فسق کو بھی شامل ہے ایسے میں دونوں کو ایک ساتھ ذکر وجہ اعتراض کرنے میں کیا مصلحت تھی؟

### قول فیصل

لکن عباس فرماتے ہیں کہ۔ فسق۔ یعنی جھوٹ اور عصیان دیگر معاصی کے مفہوم میں آیا ہے لہذا دونوں میں فرق واضح ہے مثلاً عقیدے کا فسق یہ ہے کہ اللہ کے ماسوا دیگر کو حاجت روا تسلیم کرنا یا



نوع بہ نوع کی ”پرستیوں“ میں مبتلا ہو جانا۔

## ایمان اور اسلام میں فرق

402

### قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا

انہیں کہہ دو۔ تم ایمان نہیں لائے۔ مسلمان ہوئے ہو۔ (حجرات، 14)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ایمان اور اسلام میں فرق بتلایا ہے جبکہ عام طور پر ان میں فرق ہے نہ

### وجہ اعتراض

تفاوت۔

**قول فیصل** اسلام نظام حکومت کا نام ہے اسے تسلیم کر کے مسلمان ہوا جاسکتا ہے۔ اس طرح جو لوگ مدینہ کی ریاست کے قیام کے بعد نئے نظام کو تسلیم کر پائے تھے انہیں مسلمان تو کیا گیا لیکن جہاں تک ”ایمان“ کا تعلق ہے وہ ”ظاہر“ کی بہ نسبت ”اندر“ سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور یہاں ان ہی لوگوں کی بات ہو رہی ہے جن کا اندر ابھی ایمان کا ”ظرف“ نہیں بنا انہوں نے صرف نظام کو قبول کر لیا ہے جس کا تعلق ظاہر سے ہے۔



ق

## حَبّ - اور - حصید میں فرق

403

### فانتبنا به جنات و حبّ الحصید

پس بارش سے ہم نے باغ و بستیاں اور کھیتی سے دانے پروان چڑھائے۔ (ق، 9)

یہ ہے کہ حبّ - اور حصید - ایک ہی چیز ہے اس طرح گویا چیز کو اپنی ہی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

**وجہ اعتراض**

جب مضاف اور مضاف الیہ ”لفظی“ اعتبار سے مختلف ہوں تو ان میں اضافت کا رشتہ جائز ہے جیسے فرمایا۔ حق الیقین ----- حبیل الورد ----- دار الآخرة اور ----- وعد الصدق -

**قول فیصل**

یہاں وردید - ”تار نفس“ کو کہتے ہیں اور حبیل تار ہی کا نام ہے لیکن ایک ہی چیز ہونے کے باوصف الفاظ چونکہ مختلف ہیں لہذا اضافت میں رکاوٹ نہیں سمجھی گئی اسی طرح ”حب“ اور ”حصید“ میں لفظی مغایرت موجود ہے لہذا اضافت جائز ہے۔



## تشبیہ مجمع جمع - کیوں اور کیسے

404

### القیافہ جہنم کل کفار عنید

(ق، 24)

ہر سرکش اور ناشکرے کو جہنم میں جھونک دو۔

میں کہا جاتا ہے کہ - ألقیا - تشبیہ کا صیغہ ہے جو واحد کے لئے استعمال ہوا ہے۔

**وجہ اعتراض**

اس کی توجیہ تو وہ ہے جو نحوی لام ”سبرد“ (898 م) کے حوالہ سے سامنے آئی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہاں فعل کا تشبیہ - فاعل کے تشبیہ کے مقام پر استعمال ہوا ہے جس سے بات میں پختگی پیدا کرنا

**قول فیصل**

مقصد ہوتا ہے جیسے امر القیس کہتا ہے ”قفانك“ یعنی قف قف (ٹھیرو ٹھیرو)

دوسری توجیہ فراء سے منقول ہے کہ اس نے اکثر عربوں کو سنا ہے کہ وہ اپنی عادت کے مطابق فرد واحد کو۔

ثنیہ کے صیغے سے بھی خطاب کرتے تھے۔ فقالت لصاحبی لا تحبسانا = بنزع اصولہ واجتز مشیحا

یہاں لا تحبسانا۔ ثنیہ کا فعل ہے جو مفرد کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی لا تحبسن۔ امر القیس کہتا ہے۔

خلیلی مرا۔ بی علی ام جندب = تقضی لبانات المعذب

یہاں مرا۔ ثنیہ ہے مگر واحد کے مفہوم میں ہے۔

☆

خدا کے لئے ”خلف وعید“ کا عقیدہ کافرانہ سوچ ہے

405

لا تختصموا للدی وقد قدمت الیکم بالوعید ما یبدل القول لدی

ہماری جناب میں رد و کد نہ کرو ہم تمہارے لئے وعید ہی کا فیصلہ کر چکے ہیں اور ہم اپنے وعید کو

(ق، 28/29)

نہیں بدلا کرتے۔

یہ ہے کہ یہاں وعید کو ”غیر مشروط“ ملایا گیا جبکہ اکابر دیوبند کا عقیدہ ہے کہ اللہ وعدے کا تو پکا ہے

وجہ اعتراض

مگر وعید پر نظر ثانی بھی کرتا ہے۔

یہ آیات اپنے مفہوم میں نہ مجمل ہیں نہ مبہم۔ اور نہ ان کا عموم کسی یہ تخصیص کی زد میں آیا ہے نہ ہی

قول فیصل

وعید کے بارے میں اللہ کی حتمی پالیسی میں تبدیلی کا اشارہ ہے ایسے میں سنیوں کا وعید کے باب میں

اللہ کی پالیسی کو جھٹلانا ہماری سمجھ سے ماوراء ہے۔ اللہ فرمادیں کہ وعید کا اگر فیصلہ ہے تو اٹل ہے (ما یبدل) اس میں نہ تبدیلی

ہوگی اور نہ نظر ثانی کی گنجائش!! اور یہ کہیں کہ وعید میں اللہ کا خلاف چلنا لازمی ہے۔ اب ہم کہیں تو کیا کہیں؟

(نیز ملاحظہ ہو نمبر 363)

☆

جنت کی صفت مذکر کس لئے؟

406

غیر بعید

(ق، 31)

جنت اہل انقاء سے دور نہ ہوگی قریب کر دی جائے گی۔

میں کہا جاتا ہے کہ جنت مؤنث ہے اسکی صفت بھی مؤنث یعنی ”غیر بعیدہ“ ہونا چاہیے۔

وجہ اعتراض



## قول فیصل

## 407

## وجه اعتراض

## قول فیصل

سرایت کر جائے گی۔ بلکہ جس طرح معجزات نے توحید باری کو نقصان پہنچایا ہے اسی طرح سفارش نے بھی انصاف کے سوتے ہند کر دیے ہیں۔

## 408

## وجه اعتراض

## قول فیصل

قرآن میں نصیحت و عبرت پذیری کا سامان ہے۔

96-3-2 يوم السبت ملتان

## فاعل بمعنی مفعول

409

### انما توعدون لصادق

(ذاریات، 5)

جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچا ہے۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ صادق۔ بولنے والے کا وصف ہوتا ہے یہاں وعدے کا وصف بنا گیا ہے۔

یہاں صادق مفعولی معنی میں ہے یعنی لمصدق اس طرح وہ وعدہ کا وصف بن جائے گا جو عرب

قول فیصل کے رواج کے عین مطابق ہے۔ ☆

## زکوٰۃ کے بعد ٹیکسز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

410

### وفی اموالہم حق للسائل والمحروم

اور دولت مندوں کے مال و دولت میں ناداروں اور وسائل معیشت سے محروم لوگوں کا حق (اور

(ذاریات، 19)

حصہ) ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے باوصف ”محصولات“ کے دیگر وسائل بھی کام

وجہ اعتراض میں لائے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ علمائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد مال و

دولت محفوظ ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ محصولات کے جتنے بھی دیگر وسائل بیان کئے جاتے ہیں وہ منسوخ اور شرعاً ”معطل“ ہیں۔

جہاں تک نسخ کا تعلق ہے تو یہ ایک یہودہ نظریہ ہے اسے اس مقام پر ان علما حضرات نے بھی مسترد

قول فیصل کر دیا ہے جو عموماً اس کے قائل ہیں حضرت عبداللہ بن عمر (692م) عبداللہ بن عباس (687م)

شعبی (721م) ابراہیم نخعی (715م) مجاہد (722م) طاؤس (724م) رازی (1210م) ابن جریر طبری (923م) اور انھما لامی (1064م) نے صاف لفظوں میں آیہ زیر بحث کے نسخ کا انکار کیا ہے۔

(ابن جریر طبری طبع حلبی قاہرہ جلد 81، 80/29۔ المحلی طبع میز دمشق قاہرہ جلد 158/6)

بلکہ ابن حزم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس آیت میں دھن والوں کے مال میں ناداروں اور عدیم المعیشت لوگوں کا ایسا حق ہے

جو بزر طاقت بھی وصول کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس حد تک تو روایات کو بھی اعتراف ہے کہ اس بارے میں رسول اکرم ﷺ نے واضح پالیسی دی ہے کہ۔ ان فی المال لحقاً سبوی الزکوٰۃ۔ دھن دولت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی وصولی کا حق بنتا ہے۔ (ملاحظہ ہو مسلمان مفکرین کے معاشی نظریات)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین میں دیگر ”وصولیات“ پر اختلاف، نہیں پایا جاتا انہوں نے، کہیں بھی زکوٰۃ کے علاوہ دیگر ”انفاقات“ کا انکار نہیں کیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وحی قرآن نے زکوٰۃ کے قانون کے ساتھ ساتھ ”انفاق“ کا قانون بھی دیا ہے۔ فرمایا،

ولكن البر من آمن بالله واليوم الآخروا لملائكة والكتاب والنبیین وآتے المال علی حبہ ذوی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفي الرقاب واقام الصلاة وآتی الزکوٰۃ

نیکلی یہ ہے کہ اللہ پر یوم آخر پر اللہ کی کائناتی قوتوں پر اللہ کی کتاب پر اور اسکے رسولوں پر ایمان کامل ہو۔ اور انسان ولی رغبت سے اپنا مال یتیموں، مسکینوں، لٹائے سبل، ضرورت مندوں اور غلاموں کو آزاد کرنے پر خرچ بھی کرے اور صلاۃ بھی قائم کرے اور زکوٰۃ بھی ادا کرے۔ (بخاری، 1770)

یہاں زکوٰۃ اور انفاق کے فرق کو خود وحی الہی نے واضح کیا اور دونوں کو مملکت کے استحکام کا اہم ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ تاہم زکوٰۃ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اسکے مصارف محدود ہیں کہ انما سے ذکر کئے گئے ہیں جبکہ ”انفاق“ وغیرہ کے مصارف غیر محدود ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں ”انما“ (توبہ، 51) اپنے اولیٰ مفہوم میں استعمال ہوا ہے جو ”ضرورت و اقلیہ“ کا صرف احساس دلانے کے لئے ہے ورنہ تو زکوٰۃ کے مصارف بھی ”غیر محدود“ ہیں اس طرح قانون زکوٰۃ ہو خواہ صدقات و ”انفاق“ بنیادی طور پر ضابطہ ”العفو“ کی روشنی میں طے پائیں گے۔

(تفصیل ملاحظہ ہوں۔ مسلمان مفکرین کے معاشی نظریات)

پہلا دور :- جس میں مقررہ ٹیکس کا وجود نہیں ملتا کیونکہ ان دنوں معیشت

نا کسی چیز کا وجود ہی نہیں تھا متعدد قبائل اور گروہ اپنی ضروریات کی

تکمیل رعایا کے اموال سے بزر شمشیر کر ڈالتے تھے۔

دوسرا دور :- ٹیکس اختیاری کا ہے کیونکہ اپنے قبیلے کی حفاظت کے لئے شاہراہوں، قلعوں اور کمین گاہوں کی تعمیر کے لئے نیز تلواروں، گھوڑوں اور وقت کے مطابق سامان حرب و ضرب کی خریداری کے لئے پیسے کی فراہمی ہوتی تھی جبکہ حالات نارمل ہونے پر وصولی روک دی جاتی تھی۔

تیسرا دور :- جب ذرائع غیر کافی ہونے لگے تو ”اختیاری“ صورت ختم کر دی گئی تاہم وصولی کے لئے ”تاوان“ قسم کے ذرائع اپنائے گئے مثلاً I۔ بغیر اجازت سکے ڈھالنے والوں، لاوارثوں، ناپ و تول میں گھپلا کرنے والوں اور دولت سے عبث کھیلنے والوں پر جرمانے، عائد کر کے ضروریات کی تکمیل کی جاتی تھی اس طرح جہاں مملکت

کے دفاع کے لئے ضروری ہوتا وہاں ناجائز ذرائع آمدنی پر کنٹرول کرنا بھی شامل ہوتا ایسے ٹیکسوں کو قرون وسطیٰ میں (TRIONDA NECESSITAS) یعنی تین ضروریات الف فوجی ضروریات ب پولیس برائے امن کی تعیناتی اور ج قلعوں اور پلوں کی تعمیر! تاہم یہ ٹیکسز عام رعایا سے نہیں لئے جاتے تھے۔ غیر ملکی تاجریا غیر ملکی اہلکار۔ گذرگاہ کے بطور سڑکیں، پلیں یا سرائیں استعمال کرتے یا روزی کی خاطر ہنر مند اور مزدور درآتے یا کوئی تاجر تجارتی مرکز قائم کرتا تو ایسے لوگوں پر ٹیکس عائد کئے جاتے اور ایسے ٹیکسز رعایا سے وصول کرنا عام سمجھا جاتا تھا۔

**جوتھا دور :-** ٹیکسز عائد کرتی اسے مفاد عامہ پر خرچ کیا جاتا۔

**پانچواں دور :-** تہذیب و تمدن جب ”ارتقاء“ کی طرف گامزن ہوتے گئے اسی کے مطابق ”وصولیات“ کی صورتیں بھی تجویز ہوتی رہیں اور یہ پانچواں دور ہی ”میزانیات“ کی تکمیل کا آخری حتمی اور کسی حد تک عالمی اور سائنٹفک دور کہلاتا ہے۔

جیسا کہ سابقہ میں واضح ہو چکا کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں حساس

**ٹیکس کتنا عائد ہونا چاہئیں**

منصوبے، نہیں ہوتے تھے نہ سڑکیں نہ ہسپتال نہ کالج نہ دیگر رفاهی ادارے بلکہ نہ ہی دفاع کا انتظامی ڈھانچہ لہذا نبی اکرم ﷺ نے قانون زکوٰۃ اور قانون انفاق کو ضابطہ ”العفو“ سے مربوط کر کے ارسامیں بھی آنے والوں کی صرف محدود ضروریات کو ملحوظ رکھا یعنی خود ”العفو“ کو بھی سر دست ”صولبید“ پر چھوڑ دیا۔ لیکن جب فتوحات کا وسیع سلسلہ شروع ہوا جو مراکش سے لے کر ملتان اور نصف افریقہ سے لے کر ایشیائے کوچک اور اقصائے چین سے لے کر بوسنیا تک پھیل گیا تو دفاع اور مفتوحہ علاقوں میں انتظامی ڈھانچوں کو مضبوط کرنے کے تقاضے مختلف ہوتے چلے گئے اور ”وصولیات“ جو مرکز کا حق بنتی تھیں ان میں ترمیم کر کے ”مقامیات“ سے مربوط کیا گیا یعنی اب ہر علاقے کے ”خراج“ فدیہ دو گراہم ذرائع وصولیات کو خود اسی علاقے پر خرچ کیا جانے لگا محمد بن قاسم (717 م) نے سندھ اور ملتان کی ”حاصلات“ کو سندھ اور ملتان کی بہبود کے لئے مقامی انتظامیہ کے سپرد کر دیا ان دنوں ذرائع پیداوار عموماً زرعی ہوتے تھے۔ اور وہ بھی متفاوت۔ یعنی چابی، نہری، کاریزی اور بارانی ذرائع سے کاشت ہوتی تھی اور ذرائع کے تفاوت کے مطابق ہی وصولی ہوتی تھی اور یہ وصولی اتنی مناسب ہوتی کہ ہر شخص خوشدلی سے ادا کر دیتا تھا۔ اس طرح کے تناسب کو رسول اکرم ﷺ نے بذات خود اور نہ ہی خلفائے راشدین نے  $\frac{1}{2}$  صدی سے مربوط کیا اور نہ ہی صحابہ کرام نے  $\frac{1}{2}$  صدی کی بات کی لیکن خلیفہ ہشام بن عبد الملک (705 م) نے پہلی بار علماء حجاز و شام کو اکٹھا کر کے فی صد کا متعین فیصلہ طلب کیا یہ علما نے معاشیات کے ماہر تھے نہ مختلف ذرائع پیداوار میں نامواری کا انہیں ادراک تھا انہوں نے تمام تفاوتات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سائنٹفک طریقہ زکوٰۃ نافذ کر دیا مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خالص چاندی جب  $\frac{1}{2}$  تولے ہو اور سونا 7 تو تب  $\frac{1}{2}$  فی صد سے زکوٰۃ واجب ہوگی لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں دونوں دھاتوں کے

نصاب کے جو اوزان مقرر کئے گئے ہیں انکی مالیت میں نہ ہم آہنگی ہے نہ مناسبت مثلاً آج 15 اگست 1996 میں روئے تو لے چاندی کی قیمت 4305 روپے بنتی ہے اور 7 تو لے سونے کی قیمت 42375 روپے۔ اور چاندی عام طور پر غریب لوگ استعمال کرتے ہیں دوسرے الفاظ میں غریب 4305 روپے بھی ہضم نہیں کر سکتے لیکن سرمایہ دار اگر سال گزرنے سے ایک گھنٹہ پہلے سونے سے ایک رتی نکال کر بیوی بچوں کو ہبہ کر دے تو آسانی سے 42375 چا سکتا ہے۔ پھر اونٹ، گائے، بھینس وغیرہ جانوروں کے بارے میں فقہی اختلافات کے تناظر میں 1/2 فی صد کا فلسفہ مذاق بن جاتا ہے بعض فقہا کہتے ہیں بڑے جانور اگر سو 100 ہوں تو ایک اونٹ کافی ہے اور بعض اختلاف کرتے ہیں اسی طرح بھیڑ بھری ودیگر چھوٹے جانوروں کی زکوٰۃ میں بھی اختلاف موجود ہے۔ ایسے میں 1/2 فی صد سے مملکت کی کون کون سی ضرورت پوری ہوگی ایک شخص ایک ارب روپے پر 1/2 کروڑ روپے زکوٰۃ دے کر پورے ساڑھے 1/2 کروڑ روپے کو محفوظ کر لیتا ہے اور فقہ اسلامی اسے تحفظ بھی فراہم کرتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں۔ عبد الملک کا تجویز کردہ نصاب ہے جبکہ اس پر عائد کردہ ٹیکس جوں کا توں آج کے دور میں نافذ نہیں ہو سکتا اس نصاب اور فیصد کی ذمہ داری نہ رسول اکرم ﷺ پر عائد ہو سکتی ہے نہ خلفائے راشدین پر۔ اس ”نار کی“ کالمبہ ڈالا جاسکتا ہے۔ یہاں فیصلہ دہی ہوگا جو قرآن کے گا اور قرآن نے قانون زکوٰۃ اور قانون انفاق کو مستقل حیثیت سے بیان فرما کر ضابطہ ”العفو“ سے مربوط کیا ہے جب تک مملکت کا ہر فرد خوشحالی کی فہم کو نہیں پہنچتا جب تک مملکت ہر خطرے سے محفوظ نہیں ہو جاتی ضابطہ ”العفو“ ہی مؤثر اور کارگر رہے گا یہ نہیں ہوگا کہ سرمایہ دار چھ چھ ارب روپے ہارس ٹریڈنگ اور اپنی مخالف حکومت میں عدم استحکام پیدا کرنے پر خرچ کرنے کا مجاز ہو اور العفو کے اطلاق سے محفوظ بھی۔ ایسے میں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ زکوٰۃ کے اس فرسودہ نظام کو یکسر بدل ڈالیں اور پھر سے قرآنی کلچر کا احیا کر کے ایثار و قربانی کا لازوال دور لوٹائیں۔ تہذیب جدید نے ضروریات کی ہزاروں شکلیں روشناس کرائی ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے ہزاروں ذرائع و صولیات کو جنم دینا ہوگا۔ اب 1/2 فی صد کا دور، نہیں رہا۔ اب دسائل کی تقسیم کو مساوی سطح پر لانے کے لئے ضروری ہے کہ ضابطہ العفو کو سامنے لایا جائے قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ تم کماتے ہو اسکے مالک تہاتم نہیں ہو (نحل، 71) وہ بھی ہیں جو تمہاری ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں فرمایا۔ و آتی المال علیہ حبہ۔ دھن والے کو

### زکوٰۃ اور انفاق جرمانے نہیں ہیں

چاہیے کہ بخوشدلی سے کام لے۔ و صولیات کو جرمانہ تصور نہ

کرے۔ (177)۔ امام ابن حزم لکھتے ہیں کہ واما القيام بالمجهود ففرض ودين وليس بصدقة

سرمایہ دار طبقے کو چاہیے کہ مملکت کے عام افراد کی ضروریات کا اہتمام فرض حیثیت سے کرے یا۔

یہ سمجھ کر کہ اس نے کسی کا قرض ادا کرنا ہے خوشی خوشی ادا کر دے اسے جرمانہ اور تادان تصور نہ

کرے۔ (المحلی طبع منیرہ قاہرہ جلد 6/156/11)



## جبری وصولی کا قانون

السلطان علیہ ذالک۔

اور بیت حاکمہ کی ذمہ داری ہے کہ ٹیکس نادہندہ سے جبراً وصول کرے۔ (الحلی جلد 5/155/12)

ان حزم کا مفہوم یہ ہے کہ ٹیکس نادہندہ صرف بیت حاکمہ کا باغی ہی نہیں مملکت کو فنا کے گھاٹ اتارنے والا دشمن بھی ہے کیونکہ مملکت جب حاصلات سے محروم ہوگی تو اسکے زندہ بچنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ یہ ”حاصلات“ وہ خون ہے جو مملکت کے رگ وریشے میں دوڑ کر زندہ رکھتا اور توانائی بخشتا ہے۔ صدیق اکبرؒ (634 م) نے مانعین زکوٰۃ و ٹیکس نادہندگان کے خلاف جہاد کرتے وقت فرمایا تھا کہ یہ مالدار لوگ آج اگر اونٹ کے گھنے باندھنے والی رسی (عقال) روکنے میں کامیاب ہو گئے تو کل کو زکوٰۃ کا اونٹ بھی روک دیں گے۔

وحی قرآن نے اتفاق و زکوٰۃ کو ایک ہی سطح کا فریضہ بھی قرار دیا ہے اور عبادت بھی اور عبادت کا درجہ اس لئے دیا تاکہ وہ خوشدلی سے (علیٰ حبہ) ادا کریں کہ انسان عبادت کا نام سن کر عموماً ناگواری کا اظہار نہیں کرتا۔ لیکن بائیں ہمہ زکوٰۃ۔ صوم و صلاۃ اور حج کی طرح کی عبادت نہیں ہے جن کی عدم ادائیگی پر کوئی تعزیر نہیں ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے جس سے مملکت کی توانائی اور استحکام وابستہ ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے فرمایا گیا خذ العفو و امر بالعرف و اعرض عن الجہالین۔ ان کے اموال پر جو حق بنتا ہے ان سے لے لیں (اعراف، 198) یہاں ”خذ“ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جب خوشدلی سے مملکت کا حصہ دینے آئیں تو ان سے قبول فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ یہ اگر نادہندہ ہیں تو ان سے مملکت کا حصہ برور چھین لیں۔ مقصد یہ کہ خذ میں چشم پوشی اور معاف کر دینے کی گنجائش نہیں ہے کہ اس سے مملکت کا استحکام وابستہ ہے مکمل آیت اس طرح ہے خذ العفو و امر بالعرف و اعرض عن الجہالین۔ ان سے (مملکت کا حصہ بھی لے لیں اور) فاضل دولت بھی۔ قاعدے قانون (بالعرف) کے مطابق حکم چلائیں اور جہالت کا مظاہرہ کرنے والوں کی پرواہ نہ کریں۔ (اعراف، 198)

## وصولی کی میعاد

علماء حضرات کہتے ہیں کہ زکوٰۃ لئے جانے والے مال پر جب ایک سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہے اور یہی علماء حضرات یہ بھی کہتے بلکہ عملاً گرتے ہیں کہ اگر سال گزرنے سے دو چار گھنٹے پہلے مال مذکورہ کا کچھ حصہ یا تمام تر صاحب مال اپنی بیوی کو ہدیہ گردے پھر دو چار بیابانچ گھنٹے گزرنے پر وہ مال (ہدیہ) واپس لے لے تو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اس طرح آئندہ پھر اسی ترکیب سے زکوٰۃ سے بچا جاسکتا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سال گزرنے سے پہلے وطن عزیز پر دشمن حملہ آور ہوتا ہے مہلادیاں اور دیگر آفات کی وجہ سے ملکی پیداوار تباہ ہو جاتی ہے کوئی متعدی و باپھیل جاتی ہے جس سے انسان اور مال و مویشی کھیت ہو جاتے ہیں تو کیا تب بھی سال گزرنے کی میعاد کو سامنے رکھ کر وصولی روک دی جائے گی؟ اس کا جواب غالباً نفی میں ہو گا اور نفی ہی

میں ہونا چاہئے۔ بلکہ وصولی کی میعاد کی نہ اصل ہے نہ اساس یہی وجہ ہے کہ صحابہ رسول اور سیدنا معاویہؓ سال گزرنے سے پہلے ہی وصولی شروع کر دیتے تھے۔ لہذا میرے نزدیک بعد والوں نے سال کی میعاد رکھ کر ”ہبہ“ کی ترکیب کا صرف جواز پیدا کیا ہے۔

اسلام کی ان واضح ہدایات، نصوص اور تصریحات کے باوصف۔ قدیم یا جدید سرمایہ داروں کا مذہبی قیادتوں کو خرید کر کے فیصلے حاصل کرنا قرآن کے مالیاتی نظام کے سرسبز منافی ہے۔ ذرا شکی قرآن کا ”ناو“ ہے اسے زکوٰۃ کے بعد نسخ کی ڈھال سے غیر مؤثر نہیں بنایا جاسکتا۔ اور نہ ہی کسی میں یہ اتھارٹی ہے کہ اڑھائی فیصد کی سیرھیوں پر چڑھ کر قرآن کے احکامات کو روندنا چلا جائے۔ جہاں تک نسخ کا تعلق ہے کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ جن کتابوں میں یہ عقیدہ درج ہے انہیں دریابردیا۔ آتش فروزان کی نذر کیا جاتا۔ جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کائنات بھری کے خورد و کلاں اور چیر و جواں جتنا زور لگائیں قرآن محکم کے کسی حکم، کسی حرف، کسی زیر اور زیر کو منسوخ نہیں کر سکتے۔

نکے سے بھی ہوتا ہے کبھی سلی رواں ہند



## 411 جب تباہی کا نشان ہی ہو تو عبرت کیسی؟

### وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ

ان بستیوں میں ہم نے خوفناک تباہی سے ڈرنے والوں کے لئے نشانات چھوڑے ہیں۔ (ذاریات، 37)

میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں سیدنا لوط علیہ السلام کی بستیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں نشانات عبرت بنادینے کی بات کی ہے جب کہ دنیا میں ان نشانات کا وجود ہے نہ پتہ۔

وجہ اعتراض

یہاں ”فیہا“ کا حرف۔ من۔ بمعنیہ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس طرح معنی ہوں گے۔ ان بستیوں میں سے بعض بے عیاں آج بھی نشان عبرت ہیں بلکہ اثری اکتشافات نے جنوبی عراق میں

قول فیصل

”ار“ کے کھنڈرات کی کھدائی کر کے بہت سے پس پردہ حقائق کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ عنکبوت میں ان ہی بستیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً بَيْنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ یہاں فیہا کی جائے حرف ہی ”منہا“ کا استعمال ہوا ہے جسے زبان وحی میں وضاحت کر دی کہ تباہی کے بعض آثار اب بھی موجود ہیں صاحبان عقل اور عالمان آثار کوئی ادراک رکھتے ہیں (عنکبوت، 35) اس طرح آیت کے معنی (دونوں مقامات پر) عبرت کے صرف ظاہر نشانات تک محدود نہیں رہتے زمین میں دبے ہوئے مکانات اور آثار بھی اسکے عموم میں شامل ہیں۔ ☆ 3-3-95 یوم الاحد ملتان

## 412 مرسم اور مسیح نے شادی کیوں نہیں کی؟

## ومن كل شیء خلقنا زوجین

(ذاریات، 49)

ہم نے تمام اشیاء کو ”جوڑ“ کے اصول پر پیدا کیا ہے۔

یہ ہے کہ۔ رات اور دن۔۔۔۔۔ عورت اور مرد۔۔۔۔۔ سر دیاں اور گر میاں۔۔۔۔۔ دھوپ اور

چھاؤں۔۔۔۔۔ اندھیرا اور اجالا۔۔۔۔۔ زندگی اور موت غرض کہ یہ اشیاء اضداد کے زاویہ سے

”جوڑ“ ہوں یا ہم جنسی کی اساس پر ”جوڑ“ کا اصول ان پر جاری دساری ہی رہے گا۔

جہاں تک سیدنا مسیحؑ کے جوڑ نہ ہونے کا تعلق ہے تو اسکی وجہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل ان کے

مخالف تھے یہودی راہبوں نے طرح طرح کی ہتھتیں عائد کر رکھی تھیں بالآخر بغاوت کی آخری

تہمت لگا کر اپنے زعم میں صلیب کی موت مار بھی ڈالا تھا۔ ایسے مخالفانہ ماحول میں جب زندگی کا چھانا بھی مشکل تھا شادی کا

امکان کیسے ہو سکتا تھا لہذا آپ جوڑ (معنی سہار تھی) کے اہل نہ بن سکے۔ اب جہاں تک سیدہ مریم علیہ السلام کے ”بے جوڑ“

ہونے کا عام مفہوم کے زاویہ سے تعلق ہے۔ قرآن اسکی نفی نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے شادی سے پہلے کے ایک مکالمہ کی

اساس پر ”بے جوڑ“ ہونے کا استدلال کیا ہے وہاں تمام تراویح کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ

جب کسی کنواری بچی سے اولاد کی بات کی جائے تو وہ یہی جواب دے سکتی ہے کہ بچہ کیسے ابھی تو میری شادی بھی، نہیں

ہوئی۔ (عمران، 47) اس طرح سیدہ مریمؑ اس وقت کے حوالے سے بات کر رہی ہیں جب آپ عذرا تھیں۔ لیکن بعد میں

جب یہ مرحلہ پیش آیا تو سابقہ بات نہیں رہی خود مسلمان مفکرین صحابہ و تابعین کے امام رازی نے جو اقوال نقل کئے ہیں وہ

غیر مبہم طور پر بعد میں سیدہ کی شادی کی گواہی دیتے ہیں اس طرح آپ بے جوڑ نہیں رہی تھیں۔

☆

## عبادت یا قوانین فطری کی پیروی

413

## وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

(ذاریات، 56)

جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کسی استثناء کے بغیر جنوں اور انسانوں کی ”تخلیق“ برائے عبادت، بتلائی گئی

ہے جبکہ مشاہدہ ہے کہ صرف مومن ہی اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

یہاں عبادت کے معنی پرستش کے ہیں۔ فطرت کے ان قوانین کے ہیں جن پر عاقل اور غیر

عاقل شعوری اور لاشعوری طور پر محو عمل ہیں یہاں جن و انس ریزی کرداروں کے طور پر صرف

☆

وضاحت مطلوب کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

## نکاح کے بغیر زینتِ آغوش بنانا

414

### وزو جنہم بحور عین

(طور، 20)

اور ہم نے انہیں ”حوروں“ کا سا رتھی بنا دیا۔

یہ ہے کہ ”حوریں“ جنت میں لونڈیوں کی حیثیت سے عطا ہوں گی آزاد عورتوں کی طرح نکاح کے لئے نہ ہوں گی جبکہ یہاں ان جنتی لونڈیوں پر زواج کا اطلاق ہوا ہے جو نکاح اور حق مہر کا متقاضی

**وجہ اعتراض**

ہے۔

### قول فیصل

ہمارے اکابر کے اعصاب پر چونکہ لونڈیوں سے جنسی ملاپ بغیر نکاح و حق المہر کے ذریعہ ہی سے مسلط ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان پر زواج کا اطلاق ہو کیونکہ ان کے نزدیک آزاد عورت اور کنیزوں کے بارے میں جو پالیسی ملاں اور ملوک نے ملکر وضع کی ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ لونڈی سے نکاح جائز نہیں ہے ورنہ اسے آزاد عورت کے برابر تسلیم کرنا پڑے گا۔ مہر مقرر ادا کرنا ہوگا۔ ہم بستر کی کیلئے باری کا تعین ہوگا۔ مرنے کی صورت میں وارث بنانا ہوگا۔ اسکی لولاد کو آزاد اولاد کی حیثیت دینا ہوگی۔ تعداد بھی چار تک محدود رکھنا ہوگی۔ طلاق اور خلع کی بات بھی ہوگی۔ مالی مشکلات کے وقت فروخت بھی نہ کرنا ہوگا غرض کہ تمام وہ شرعی پابندیاں جو نکاح سے مربوط ہیں کنیز کو بسانے میں حاصل نہ ہو سکیں گی وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک کنیز سے نکاح نہ کرنے کا تعلق ہے تو اسکی نہ اصلیت ہے نہ اساس بلکہ سورہ نساء میں فانکحوا ما

طاب لکم من النساء کے بعد فرمایا۔ وان خفتم ان لاتعدلوا فواحدة۔ پھر فرمایا۔ او ما ملکت ایمانکم۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ”ملک یمین“ جسے ہمارے اکابر کی اصطلاح میں ”لونڈیاں“ کہا جاتا ہے پر

”ملکت“ ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ماضی میں عورتوں کی ملکت ایمانکم۔

کی خاص قسم کا وجود تھا۔ اس اعتراف کے باوصف ارشاد ہوا کہ تم اپنی پسند کی شادی کرو اور اگر بے انصافی کا خطرہ ہو تو ایک

کافی ہے یا پھر۔ تمہارے پاس جو ملک یمین کی حیثیت سے ہیں ان پر اکتفا کرو۔ یہاں ”او“ کو حرفِ عطف کے مقام پر لا کر

اشارہ دیا کہ۔ لونڈیوں کا حکم بھی وہی ہے کہ جو حرفِ عطف کے ذریعہ آزاد عورتوں کا ہے یعنی فانکحوا ما طاب لکم من

النساء پر۔ او ”ما ملکت“ کا عطف ہے۔ اس طرح جو پالیسی ”ماطاب“ کی ہوگی وہی۔ ”ما ملکت“ کی ٹھیرے گی یعنی

ماطاب کے ساتھ اگر انکحوا۔ کا حکم ہے تو عطف کے ذریعہ یہی انکحوا۔ ما ملکت کی حیثیت کا تعین کر کے۔

لونڈی کی قربت کو بھی نکاح ہی سے مربوط کر دے گا۔ اس تحلیل کے بعد آپ کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ ہر وہ چیز جو

کسی کے قبضے میں ہو اس پر ملک یمین کا اطلاق ہوتا ہے یعنی داہنے ہاتھ کی ملکیت کیونکہ بائیں ہاتھ میں پکڑ کی وہ طاقت نہیں



ہوتی جو مضبوطی سے تھام لینے کا کام دے سکتی ہو لہذا ”قبضے“ کے مفہوم میں ”ملک یمن“ کا استعارہ ایجاد ہوا۔ ذاتی اثاثہ ہے تو ملک یمن ہے۔ زرعی یا سکنی زمین ہے تو ملک یمن ہے۔ مکان ہے تو ملک یمن ہے۔ دکان ہے تو ملک یمن ہے سواری ہے تو ملک یمن ہے۔ بیوی ہے تو ملک یمن ہے۔ اس طرح خریدی ہوئی عورتوں یا۔ اسیر عورتوں سے خاص کرنے کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ملاں اور ملوک نے بہت اسلام کو حقوق و واجبات سے محروم بنا کر لوٹڈی بنی بنا ڈالا ہے تاہم دم توڑتی اصطلاحی حدود ابھی باقی ہیں اور مستقبل میں ایسا وقت آسکتا ہے کہ ان کا احساس کیا جائے۔ اب آئیے زوجناہم کا فنی جائزہ لیں۔ تو جناب ”زوج“۔ نکاح کے مفہوم میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا لوٹڈیوں کو بغیر نکاح کے حاصل کرنے کے شوق میں مولوی صاحب نے بلاوجہ معاملہ کو الجھا کر رکھ دیا ہے کیونکہ عرب میں ”زواج“ کو جب کہی۔ با (B) سے متعدی کیا جاتا اس سے ”شادی بیاہ“ والا ازدواج مقصود نہ ہوتا اس کے لئے باء کا۔ لانا جائز نہیں نہ سمجھا جاتا عبد القادر رازی لکھتے ہیں بقال زوجہ امرأه ولا یقال بامرأه

تزوج کو (بیوی کے مفہوم میں) کہا۔ سے متعدی نہیں کیا جاتا اگر کیا جائے تو اس سے شادی و بیاہ کا مفہوم کشید نہ ہو سکے گا۔ (مسائل الرازی طبع قاہرہ صفحہ 327)

جیسے زوجناہم۔ کو با سے متعدی (---) بنا کر واضح کیا گیا ہے کہ یہاں میاں بیوی والی زوجیت مراد نہیں ہے اسکے لئے ہونا چاہیے تھا زوجناہم حورا۔ جبکہ فنی لحاظ سے ”حور“ سے بھی بھستری ناممکن ہو جاتی ہے کیونکہ یہ عورت اور مرد کا مشترکہ وصف ہے صرف عورت کے لئے ”حوراء“ اور صرف مرد کے لئے ”احور“ کا لفظ ہے۔ ایسے میں طالبان حوران بہشتی کو چاہیے کہ کہیں سے اختلاف قرأت کی روایت نکالیں جو ”زوجناہم ---“ کی جائے۔ زوجناہم حوراء۔ کی وضاحت پر مشتمل ہو۔

☆

النجم

## قرآن کی قسم

415

### والنجم اذا هوى

نجم کی قسم جب وہ اترتا ہے۔

(نجم، 1)

میں کہا جاتا ہے کہ خدائے لایزال کے علاوہ کسی چیز کا نام لے کر قسم کھانی حرام ہے لیکن یہاں نجوم کی قسم کھانے والے بذات خود اللہ سبحانہ ہیں۔

وجه اعتراض

فاطر ارض و سماء کا اصول یہ ہے کہ وہ آئندہ کو ذکر کرنے والی اشیاء سے پہلے۔ ”و“۔ یا اسی طرح کا کوئی حرف لاتے ہیں جس سے گواہ بنا مراد ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے باوصف میں نے منسوخ

قول فیصل

القرآن اور برہان القرآن میں۔ اسی داؤ کو برائے قسم ہی استعمال کیا ہے کیونکہ میرے مشاہدے میں یہ چیز آگئی تھی کہ اللہ



سبحانہ نے ہمیشہ اس ہی شے کی قسم کھائی ہے جسکی عظمت و اہمیت عیب و معمولی تھی مقصد یہ تھا کہ ایسی اشیاء کی "ماہیت" اور "منافع" پر غور کیا جائے انسان اپنی آنکھوں اور اولاد کی قسم بھی کھاتا ہے کہ اسکے لئے آنکھوں اور اولاد کی "اہمیت" واضح ہے اور عرب میں اسکا خاص رواج بھی تھا لیکن کچھ ضروری نہیں کہ یہی طے شدہ بات ہی ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہی "واو"۔ برائے شہادت استعمال ہوتی رہی ہو بلکہ قرآن بتاتے ہیں کہ "واو"۔ برائے شہادت بھرت استعمال ہوتی رہی ہے اب واو برائے قسم ہو یا برائے شہادت۔ ہمیشہ ابتدا ہی میں استعمال ہوتی ہے جیسے یہاں فرمایا والنجم اذا هوم۔ یہ کہہ کر پھر تقریباً آٹھ آیات کے موضوع کو نجم کی گواہی سے مربوط دکھلایا۔ یہ نجم کیا ہے۔ یہ وہ روشن ستارہ ہے جو ہمیں روشنی دیتا ہے لیکن "هوم" کے معنی اگر۔ غروب ہونے یا اتر جانے کے ہیں تو اس صورت میں نجم کی نہ قسم فائدہ دے سکتی ہے نہ گواہی کا رگر۔ لہذا یہاں "نجم" کے معنی میں بھی تبدیلی لانی ہوگی اور "هوم" کا مفہوم بھی منتخب کرنا ہوگا۔ لیکن کچھ ضروری نہیں کہ میرے مفہوم کو حرف آخر سمجھا جائے آپ خود بھی ذکر اور تدبر سے کام لیں تاکہ صحیح راستہ فہم معلوم ہو سکے۔ لیجئے اب میں اپنا مفہوم پیش کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک یہاں "نجم" قرآن کا استعارہ ہے اور "هوم" کے معنی اترنے یا نازل ہونے کے ہیں اس طرح معنی ہوں گے۔

قرآن جس وقت نازل ہوتا ہے وہ گواہی دیتا ہے کہ تمہارے ساتھی (محمدؐ) نہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں اور جو منہ سے نکالتے ہیں وہ وحی شدہ قرآن ہی نکالتے ہیں۔

(نجم، 1، 8۵)

یہاں کہا جاتا ہے کہ "ضل"۔ اور "غوم" ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔

جی ہاں کلام میں تنوع۔ اور پختگی پیدا کرنے کے لئے اتحاد مفہوم کے لئے مختلف الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس وضاحت کے باوصف۔ ضل اور غوم میں جو فرق ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ کہ۔

یہاں بلکہ عموماً ضلال کا لفظ "ہدمے" کی ضد۔ اور غوم۔ کا فعل۔ رشد کے متناقض استعمال ہو تا رہتا ہے۔



رسول اللہ نے اللہ کو کتنی بار دیکھا ہے؟

416

ولقد راہ نزلة اخری عند سدرۃ المنتہی

(نجم، 13، 14)

اس نے اے سدرۃ المنتہی کے پاس دوسری بار بھی دیکھا۔

یہ ہے کہ صحابہ کبار کی تشریح کے مطابق "راہ" میں "ہ" کا ضمیر حضرت جبریل کی طرف راجع

وجہ اعتراض

ہے جیسے کہ فرمایا۔ علمہ شدید القوى ذو مرة فاستوی

(نجم، 4، 7)

اے طاقت والے اور قوت والے جبریل نے یہ قرآن سکھلایا۔

☆

## 417

امام رازی (1210م) خلق الجنان من مارج من نار (رحمان) کی توجیہات بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ ان الآیة مذکورہ لبيان القدرة لالبيان النعمة

یہ آیت نعمت کا تذکرہ بیان کرنے کے لئے نہیں ”قدرت“ کا بیان کرنے کے لئے ہے۔

(تفسیر رازی طبع خیر یہ مصرع ۱۳۰۷ ہجری جلد 8/13)

امام رازی ہی بخارج منہما اللؤلؤ والمرجان (رحمان) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ہذہ بیان عجائب اللہ

تعالیٰ لالیان النعم

اس آیت میں الآئی کے معنی الہی عجائبات (اور قدرت) کے ہیں نعمتوں کے، نہیں۔ (تفسیر رازی جلد 8/15)

بات صاف ہو گئی کہ ”الآء“۔ کا لفظ ہر مقام پر نعمتوں کے مفہوم میں استعمال، نہیں ہوا اہل زبان اس کے معنی ”قدرت“ کے شاہکار کا بھی کرتے اور قرآن کے تعاون سے حسب موقع۔ بروئے کار لاتے تھے۔



## شعرے - کا مفہوم

418

وانہ هو رب الشعری

(نجم، 49)

اور وہی تو شعرے - کا رب ہے۔

یہ ہے کہ شعرے گرمی کے موسم میں نمودار ہونے والے ایک رستارہ کا نام ہے جس کی عربوں کی

وجہ اعتراض ایک قوم پرستش کرتی تھی۔

عربوں کی پرستش سے کسی حقیقت کی نفی، نہیں ہوتی یہاں جتلانا یہ مفہوم ہے کہ بڑی چیزوں

قول فیصل

کو وجود میں لانا بھی اللہ کیلئے آسان ہے اس کی قدرت کے سامنے بڑی سے بڑی چیز کوئی حیثیت، نہیں

رکھتی۔ زمین و آسمان اور سورج وغیرہ بلکہ ان سے سائز میں بہت بڑا ”سائرس“ (شعرے) بھی اپنے بھاری بھر کم وجود کے

لحاظ سے ہچ ہے سب اس کے اشارے اور قانون کے تابع و حرکت ہیں۔



قمر

## چاند ٹکڑے ہوتے کس نے دیکھا؟

419

اقتربت الساعة وانشق القمر،

(قمر، 1)

وہ گھڑی آن پہنچی کہ چاند میں شکاف پڑ گئے۔

یہ ہے کہ ---- یہاں ”الساعة“۔ کا مفہوم ہمہم ہے اس سے ”قیامت“ مراد لے کر اس ابہام کو

وجہ اعتراض دور کیا جاسکتا ہے۔

## قول فیصل

الساعة - کالفظ مبہم نہیں ہے عربی میں ہر "ناگوار" اور "مصیبت بدوش" گھڑی پر "الساعة"

کا اطلاق ہوا ہے اسے دانستہ مبہم بنا کر یا تو قیامت سے موسوم کیا گیا ہے یا مشہور "دیومالائی" قصہ "شق القمر" سے جبکہ چاند پھٹنے کا خود اختراعی مفہوم تاریخ اور قوانین فطرت کے تناظر میں کوئی وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ عربوں کے ہاں بھی شق القمر - مصیبت کے نازل ہونے سے تعبیر ہے کہ ان کے نزدیک مصیبت کا نزول اوپر ہی سے تصور کیا جاتا ہے اس طرح کبھی تو وہ کہتے کہ - آسمان کا ٹکڑا گراؤ - کبھی کہتے کہ چاند پھٹ گیا وغیرہ - یہاں چونکہ لفظی تحلیل اور تفصیل کی گنجائش نہیں لہذا آیہ ہذا کو اسی سورہ کی آیات (44 تا 47) کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ جن میں جنگ بدر کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کفار کی سازشوں، شرارتوں اور اذیتوں کو دیکھتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے ان کے انجام کے بارے میں فرمایا تھا کہ..... وہ گھڑی یا وقت آنے والا ہے جب ان پر شکست کا عذاب مسلط ہوگا۔ ان کی طاقت پاش پاش ہو جائے گی پھر اقتربت الساعة کی تشریح میں واشکاف طور پر بتلایا کہ - سیہزم الجمع ویولون الدبر۔ بل الساعة موعدهم والساعة ادھمے وامر

(کفار کہتے ہیں کہ ہماری جماعت ناقابلِ تسخیر ہے۔ جی نہیں) اب یہ لوگ بہت جلد شکست کھائیں گے اور پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوں گے ان سے جس ناگوار گھڑی کا وعدہ تھا وہ "ناگوار" اور تلخ گھڑی سامنے آگئی ہے۔

چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ - مخالفین "بدر" میں بھی اس تباہ کن گھڑی سے دوچار ہو گئے اور انہوں نے اپنے گئے کا مزہ چکھ لیا۔ ان آیات میں "دارنک" کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے (سیہزم) جو صرف اسی دنیا سے تعلق رکھتی ہے ورنہ تو دارنک ایک نامعلوم شی بن کر رہ جائے گی پھر قیامت میں کفار سے کون سا رن پڑے گا جس میں وہ شکست کھائیں گے اور - مسلمان فتح یاب ہوں گے۔

یہاں چاند پھٹنے کو جنگ بدر کا نتیجہ قرار دیا ہے کہ بدر (اور احد) ہی میں ان کی طاقت ریزہ ریزہ ہو گئی اور پھر ان پر شکست کے پیہم نزول سے مصائب کے وہ پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ "نہیکر نہ سکے۔ اس طرح قمر میں تینوں مقامات پر الساعة کالفظ اس ناگوار گھڑی سے تعبیر ہے جو مخالفین کے سروں پر مصیبت بن کر نازل ہو گئی اور شق القمر حقیقت بن گئی معجزے کی نفی ہو گئی کیونکہ حقائق ہمیشہ معجزات کی نفی ہی کرتے ہیں اس طرح شق القمر - کا "دیومالائی" مفہوم - از خود ہی لایعنے اور بے مفہوم بن کر رہ گیا۔ ہزاروں صحابہ میں سے کس نے دیکھا کہ ابو قیس پہاڑی کے پیچھے چاند کا کوئی ٹکڑا گرا تھا؟ گیا سینکڑوں برس کے محدثوں نے سرانديپ کے راجہ کے حوالہ سے جو قصہ تراشا ہے حقیقت بن سکتا ہے جبکہ اللہ کے قوانین میں نہ ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اور نہ کسی مصنوعی انتشار سے عناصر میں خرابی۔

خدا نے لایزال کی آفرینش میں ہمیں کوئی فرق نظر آتا ہے نہ آنکھ اٹھا کر دیکھو کہیں ٹوٹ پھوٹ کہیں کوئی شکاف نظر آتا ہے۔؟ ہاں ہاں دوبارہ (سہ بارہ) نظر اٹھا کر دیکھو۔ ناکام اور "ماندہ" ہو کر

(الملک-3 تا 4)

رہ جائے گی۔ (مگر ٹوٹ کا کھوج نہ لگا سکے گی)۔

بات صاف ہو گئی کہ یہاں محاورات عرب کی رو سے ”الساعة“ ناگوار گھڑی اور ”شق القمر“ ان کی تباہی کا عنوان بن کر رہ گئے۔  
(تفصیل ملاحظہ ہوں ”برہان القرآن“ تضاد نمبر 268)۔ 6-3-96 ملتان



رحمان

## فنا سے کیا مراد ہے؟

420

### کل من علیہا فان

(رحمان، 26)

ہر وہ چیز جو اس (زمین) پر ہے فنا پذیر ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں ہر چیز کے فنا ہو جانے کا ذکر ہے جس سے جنت اور اسکی نعمتوں کے زوال پذیر ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

وجہ اعتراض

فنا - کالفظ - بقا - کے مقابل استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں اسکے معنی ایسی چیز کے ہیں جس پر

قول فیصل

فنا کا اطلاق بھی ہو اور وہ باقی بھی ہو کیونکہ قریب المرگ انسان پر بھی فنا کا استعمال ہوا ہے حالانکہ

ابھی وہ سرا نہیں عرلی میں شیخ فان - بوی عمر کے بوڑھے کو کہا جاتا ہے اور چونکہ ”بقا“ کسی چیز کا اپنی پہلی حالت پر ثابت رہنے سے تعبیر ہے لہذا فان - کے معنی ہوں گے اس چیز کا اپنی حالت پر قائم نہ رہنے کے۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ ہر چیز

میں اضمحلال اور ضعف واقع ہو گا صرف ذات باری ہے جو اس طرح کے اوصاف سے پاک و بے نیاز ہے وہ ہمیشہ باقی و توانا ہے فنا - کے مذکورہ معنی کی رو سے کلی فنا - کے نظریہ کی نفی ہو جاتی ہے اور ہر مشاہدہ بھی یہی گواہی دیتا ہے کہ جو چیز

پیدا ہوئی وہ کلی طور پر فنا نہ ہو گی کیونکہ جس طرح ”خلق“ ایک فعل ہے اسی طرح ”فنا“ بھی ایک فعل ہے اب جس طرح فعل خلق - کے بغیر کوئی چیز وجود پذیر نہیں ہو سکتی اسی طرح فنا - بھی اسکا ایک فعل ہے۔ وہ نہ چاہے تو اسکا فعل فنا -

کلی فنا پر شمتی نہ ہو گا اس سے سرا - اضمحلال، کھجی، خستہ حالت اور بوسیدگی ہو گی ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق - عمر گذرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی باتوں میں نقص اور کمی واقع ہو جاتی ہے۔

غرض کہ پیدا شدہ چیز کسی نہ کسی حالت اور صورت میں مکمل فنا کا نشانہ بن کر بھی معدوم نہیں ہوتی منتشر ہو جاتی ہے کہ ہر سرکب کے لئے منہ بننا ہو نا طے شدہ فارمولا ہے۔ ☆

واقعہ

## زمین اور پہاڑوں کا جنبش کھانا اور ریزہ ریزہ ہو جانا

421



## اذا رجّت الارض رجاً. وبُست الجبال بساً

ان لمحوں کو نظر میں رکھو جب زمین لرزاں ہوگی اور پہاڑ بڑھ بڑھ ہو جائیں گے۔ (واقعہ، 4، 5)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ یہاں زمین کی حرکت کی خبر دی گئی ہے جبکہ جیاد پرست نہیں مانتے۔

**قول فیصل** قرآن محکم کسی جیاد پرست کے مشورے سے نازل نہیں ہوا کہ زمین کے لرزہ کھانے اور جنبش میں آنے کا اشارہ تک نہ ہوتا۔ جبکہ چاند زمین کا حصہ تھا چاند اگر وحی کی ”ایمانیت“ کے مطابق اپنے ”محور“ میں ہر لمحہ اور ہر آن محو حرکت ہے تو زمین کے لئے بھی یہی اصول ہے بلکہ وحی قرآن نے اپنے مبلغ پیرایہ میں زمین کی حرکت کا نام لے کر اشارہ دیا ہے فرمایا **من آیاتہ خلق السماوات والارض وما بث فیہما من دابة**

اللہ کے نشانات قدرت میں سے آسمانوں اور زمینوں کی اور ان میں پھیلائی ہوئی زندگی کا ودیعت کرنا ہے (شورے، 29) اب اگر زمین پر پھیلی ہوئی ”حیات“ محض کا وجود ہے تو یہ مبلغ اشارہ ہے کہ زمین بھی ”حرکت کناں“ اور زندہ ہے کیونکہ پیٹ کے بچے کی ماں اگر ”بیماری“ یا کسی حادثے میں مر جاتی ہے تو اندر ہی اندر چہرہ بھی مر جاتا ہے الایہ کہ فی الفور اپریشن کے ذریعہ اسے نکال لیا جائے۔ اسی طرح زمین اگر ”حرکت“ سے مستحضر ہوتی تو زندگی کی رعنائیوں سے بے بہرہ ہوتی یہاں رجّت الارض۔ کو۔ اذا زلزلت الارض زلزالها۔ کے تاثر میں دیکھنا چاہیے جس میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے زلزلے آئے اور آتے رہیں گے خاص کر آتش فشاں سے نہ صرف زمین کا متاثرہ حصہ شدید ”جنبش“ اور سخت لرزش کا نشانہ بنا ہے اور بتا رہا ہے گاماضی بعید میں ہمارے ہمسائے عراق۔ میں ”ار“ اور ”عامورہ“ نے آتش فشاں کے جو آثار چھوڑے وہ آج تک ذہنوں سے محو نہیں ہوئے۔ بلکہ اب تو زمین کی اندرونی تہوں سے ”معدنیات“ وغیرہ نکالنے کے لئے ”ڈائنامیکی“ ذرائع سے جنبش اور زلزلہ بھی پیدا کر لیا جاتا ہے اور سرکیں بنانے کے لئے چٹانوں کے چیتھڑے بھی اڑائے جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر انسانی کمالات اتنا تغیر و تبدل لاتے ہیں تو اللہ کے ”عناصر طبعی“ میں زیادہ توانائی ہے کہ وہ بھونچال بھی لائیں اور آبادیوں کو نہ وبالا بھی کر ڈالیں۔ یہاں اس آیت کو دوسرے معنوں میں بھی لیا جاسکتا ہے کہ آنے والے دور میں ماضی کی طرح جابر سلاطین و فرماں روا جو اپنے کو پہاڑوں کی طرح مستحکم و مضبوط سمجھتے تھے ان کے تاج اچھالے جائیں گے اور ان کی طاقت اور ”مصنوعی“ توانائی پاش پاش ہو جائے گی اور وہ روئی کے گالے کی طرح بے وزن ہو کر انقلاب۔ کے گرم جھونکوں کی طرح جھلٹے اور اڑتے پھریں گے۔ ☆

6-3-96 ملتان

تنزیل۔ کے معنی

422

تنزیل من رب العالمین

یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے جو کتب محفوظ میں لکھا ہوا ہے اسے وہی پاک باز ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک و صاف ہیں (اور یہ کتب کائنات کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ (واقعہ، 77:80)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ یہاں، شعراء (193) اور دیگر مقامات پر قرآن پر نازل کیا۔ یا۔ تنزیل کا اطلاق ہوا ہے اور تنزیل کا اصول یہ ہے کہ یہ جب اپنے نازل کنندہ سے الگ ہو تو ”مخلوق“ کے درجے میں آجاتی ہے اس طرح قرآن ”مخلوق“ ثابت ہو جاتا ہے۔

قول فیصل قرآن اگر مخلوق اور ”حادث“ بن جاتا ہے تو اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس کے خدا کی ”صفت“ بننے سے بھی مفر نہیں ہے اور ”ناصفت“ بننے سے بھی گریز محال۔ تو کیا کوئی درمیانی تدبیر کام نہیں کر سکتی؟ ذرا غور فرمائیے۔ یا پھر جو لفظ خدا نے قرآن پر خود اطلاق فرمائے ہیں انہیں تسلیم کر ڈالئے۔



حدید

## فتح مکہ سے پہلے کے انفاق اور جہاد کا مقام

423

### لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ

جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے انفاق اور جہاد کیا برابر نہیں ہو سکتے۔ (حدید، 10)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ گیارہ مرتبہ ”یستوی“ کا فعل ہے جو ”استواء“ سے مشتق ہے اور یستوی ہو خواہ استواء دو کے وجود کے متقاضی ہیں مثلاً لا یستوی الخبیث و الطیب (مائدہ، 103) خبیث اور طیب برابر نہیں ہو سکتے۔ یا۔ اصحاب النار اور اصحاب الجنة برابر نہیں ہو سکتے۔ (حشر، 20) اس طرح استواء اور یستوی دو ہی چیزوں کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن آیت زیر بحث میں صرف ایک چیز کا ذکر ہے اور نہ معلوم کس سے برابری کی نفی ہے۔

قول فیصل آیت کریمہ کے دوسرے حصے نے خود ہی اس الجھن کو دور کر دیا ہے فرمایا من الذین انفقوا من بعد و قاتلوا کہہ کر وضاحت فرمادی کہ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے کے نازک لمحات میں مال و جان کی قربانی دی ان کا مقام ان سے بلند ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد کے نازل حالات میں انفاق اور جہاد کا عمل سرانجام دیا۔



## نوشتہ تقدیر

424

ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان

## نبرأها ان ذالك على الله يسير

ملک میں جب کوئی آفت پڑتی ہے یا تم پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے قبل اس کے کہ تم دنیا سے آفریش میں قدم رکھو اسے کتابِ تقدیر میں لکھ دیا جاتا ہے اور یہ کام اللہ کے لئے مشکل نہیں ہے۔

(الحمدید، 22)

یہ ہے کہ اس آیت سے صریح ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ انسان زندگی کی پہلی سانس لے اسکی تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اور نوہتہ تقدیر کسی حال میں ٹل نہیں سکتا۔

وجہ اعتراض

I۔ منسوخ القرآن II۔ برہان القرآن اور III۔ اب میزان القرآن کے متعدد مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ ”مصائب“ و ”آفات“ کا نزول ”بلا سبب“ نہیں ہوتا ان کے نزول میں انسان کے تخریبی عمل کا

قول فیصل

بڑا دخل ہے بلکہ برہان القرآن کے دیباچے میں ”سعادت و شقاوت“ کا سفر کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ کے عنوان میں پوری وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ سے ظلم سرزد نہیں ہوتا وہ بے انصافی کو پسند نہیں فرماتا۔ اس طرح وہاں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جہاں ”مکافاتِ عمل“ کی بات ہوگی وہاں نظر ”حادثے“ کے ”سبب“ پر پڑے گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ بلا وجہ۔ کوئی فرد یا جماعت ”گرفت“ یا تکلیف میں مبتلا ہو اس بنا پر آیہ زیر بحث میں ”کتاب“ کے معنی ”قانون“ کے ہیں اور یہ وہ قانون ہے جو آفریش انسان سے پہلے مقرر کیا گیا ہے۔ اس ”قانون“ میں ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اچھا ہے تو اچھا، برا ہے تو برا۔ اور یہ وہ اہل قانون ہے جو عمل اور نتیجہ کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے اور اللہ اپنے قوانین کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ انانحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون اس کتاب میں یہ نہیں کہ انسان یا کسی خاص فرد کا نام لے کر بُرے بھلے کا فیصلہ لکھ دیا گیا ہے بلکہ ”قانون“ اپنی نفسیات کے مطابق عام ہوتا ہے انسان کا جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق اس پر اطلاق ہوگا اگر اس زاویہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو صلہ و سزا۔ سرزنش اور انعام کا فلسفہ بیکار ہو جائے گا۔ یہاں کوئی ”انارکی“۔ کوئی ”لاقانونیت“ نہیں ہے ہر کام ضابطے کے مطابق ہے اور اللہ کے ضوابط میں بگاڑ نہیں ہوتا ہل توہمے من فطور۔ یہاں ”نبرأھا“ میں ہاء کا ضمیر مصیبت کی طرف راجع ہے یعنی جب کوئی حادثہ ظہور میں آتا ہے تو ہم نے اس کے وقوع، ظہور اور نتیجہ کا پیشگی قانون مقرر کر رکھا ہے مثلاً قانون یہ ہے کہ آپ ریل کی پٹری پر نہ چلیں ریل کے آنے پر آپ کچلے جائیں گے۔ سامنے گڑھا ہو تو کنارہ کر جائیں ورنہ اس میں گر کر مر جائیں گے۔ تو یہ قانون آپ کے ہونے سے پہلے ہی موجود ہے اور کچھ ضروری نہیں کہ آپ کا نام بھی پہلے سے لکھ دیا گیا ہو۔ ☆

جذبات خوشی کے ہوں خواہ غمی کے انہیں قابو میں ہونا چاہیے

425

لکے لا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتکم

(حدید، 23)

جو مطلب تم سے فوت ہو گیا اس پر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ اس نے تم کو دیا اس پر زیادہ نہ اتراؤ۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص نقصان اٹھانے پر۔ غم کی کیفیت طاری نہ کرنے پر قادر نہیں ہے اسی طرح فائدے کی صورت میں خوشی کے جذبات کو روکنے پر بھی قادر نہیں ہے جبکہ آیہ زہرِ حث میں دونوں صورتوں میں انسان کی قدرت کو چیلنج کیا گیا ہے۔

**قولِ فیصل** جی نہیں، غم اور خوشی جو انسان کے خمیر میں شامل ہیں انہیں جبراً الگ نہیں کیا جاسکتا یہاں مقصد یہ ہے کہ انسان غم پر حوصلہ نہ ہارے اور خوشی پر آپے سے باہر نہ ہو جائے۔



لوہا۔ اگر اوپر سے نازل ہو تو ہر چیز فنا ہو جائے

426

وانزلنا الحديد فيه باس شديد و منافع للناس

اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں خطرہ بھی شدید ہے اور نفع بھی خطیر۔

(حدید، 25)

یہ ہے کہ یہاں ”لوہے“ پر نزول کا اطلاق ہوا ہے اور نزول اوپر سے ہوتا ہے بلکہ چوپایوں (زمر 6)

**وجہ اعتراض** اور ملبوسات (اعراف، 25) پر بھی اسکا اطلاق ہوا ہے حالانکہ یہ تمام اشیاء اوپر سے نازل نہیں ہوتیں۔ اسی سر زمین جس پر ہم بستے ہیں کی پیداوار ہیں۔ اوپر سے کوئی ایسی چیز نازل ہوتی تو ہم تباہ ہو جاتے۔

ان تمام مقامات پر ”انزلنا“۔ ”خلقنا“ کا استعارہ ہے۔

**قولِ فیصل**



مؤمن سے ایمان کا مطالبہ ؟

427

يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله و آمنوا برسوله

(حدید، 28)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مؤمن ہیں ان سے مطالبہ کہ ایمان لے آؤ۔ کیا مفہوم رکھتا ہے۔

اسکے معنی یہ ہیں جو لوگ سیدنا موسیٰ و سیدنا عیسیٰ پر ایمان لائے (آمنوا، صیغہ ماضی سے) انہیں کہا گیا کہ ان پر ایمان لانے کی طرح محمد رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان لا کر دوہرے انعامات کے

**قولِ فیصل**



مستحق ہو اس طرح پہلا آمَنُوا۔ فعل "ماضی" اور دوسرا "آمَنُوا" فعل امر کا صیغہ ہے۔ میم کی زیر سے ماضی اور میم کی زیر سے مستقبل مراد ہے۔

6-3-96 ملتان



مجادلہ

## ظہار کا کفارہ نقدیا۔ ادھار

428

فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ  
فَاطْعَامَ سِتِينَ مَسْكِينًا

ظہار کے بعد جو صاحب رجوع کرنا چاہیں تو میاں بیوی والی قرمت سے پہلے دو ماہ لگاتار روزے رکھیں اگر روزوں کی سکت نہ ہو تو ساٹھ ناداروں کو کھانا کھلائیں۔ (مجادلہ، 4)

یہ ہے کہ یہاں "ظہار" کے کفارے میں قرمت سے پہلے دو ماہ روزے رکھنے کی بات کی گئی ہے اس طرح استطاعت کو بنیادی حیثیت دے دی گئی ہے یعنی روزے رکھنا لیکن روزہ کے بارے میں اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ شروع کرنے کے بعد بلا ناغہ دو ماہ تک رکھنا ہوں گے استطاعت ہو یا نہ ہو۔

ان آیات میں جاہلیت میں رائج ایک رسم طلاق کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر کوئی صاحب اپنی بیوی کے چسان حصے کو اپنی ماں کے چسان حصے سے تشبیہ دے کر کہتا ہے کہ تم اسکے چسان حصے کی طرح مجھ پر حرام ہو تو اس سے طلاق ہو جاتی تھی گویا تشبیہ طلاق کا کنایہ شمار ہوتی تھی لیکن مسلمانوں میں اس نوع کی طلاق کارواج نہیں تھا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ کسی نو مسلم نے اسی رسم کا اعادہ کر ڈالا تھا۔ جس پر از سر نو وضاحت ہوئی کہ۔ طلاق اگرچہ نہیں ہوئی تاہم جرمانہ ادا کئے بغیر قرمت حلال بھی نہیں ہو سکتی۔ اب رہی یہ بات کہ "کفارہ" اگر روزوں کی صورت میں ہو تو استطاعت ایک مرحلے پر ختم بھی ہو سکتی ہے ایسے میں مریض بن کر اگر جان کا خطرہ مول لینا پڑے تب بھی روزوں کی تکمیل لازمی ہوگی؟ یہ ایک فرضی صورت ہے جو امکانی بن سکتی ہے لیکن خود اجماعیوں کے خلاف بھی جاتی ہے کہ۔ انہوں نے "فعل" کو "مقدرت" سے مربوط کر رکھا ہے جبکہ "مقدرت" کا "فقدان" بھی ہو سکتا ہے۔ اور فقدان کی صورت میں تکمیل کی لازمی پالیسی زائل بھی ہو سکتی ہے۔ ☆

## اللہ کا ہر جگہ ظہور۔

429

مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اِدْنِي



## من ذالك ولا اكثر الا هو معهم

کسی جگہ تین کا اجتماع اور خفیہ مشورہ نہیں ہوتا مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے نہ کہیں پانچ ہوتے ہیں مگر ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ ہوتے ہیں مگر اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

(مجادلہ، 7)

### وجه اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ خفیہ: محفلین سجانے والے کسی نہ کسی مکان کے مکین ہی ہوں گے اس طرح وہ جہاں کہیں منتقل ہوں گے اللہ سبحانہ بھی ان کے ساتھ منتقل ہوتے رہیں گے۔ جس سے نہ صرف تجسیم کا اثبات ہو جاتا ہے خدائے لایزال کی نقل مکانی یا تقسیم در تقسیم بھی لازم آجاتی ہے۔

### قول فیصل

آیہ کی ابتداء میں فرمایا۔ ان الله يعلم ما فی السماوات وما فی الارض۔ اللہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے ان کا علم رکھتا ہے۔ اور آگے چل کر اسی علم (یعلم) پر آیاتِ نبویہ کا عطف ہے جو ضابطہ کی رو سے نبوے کی تمام ”مشمولات“ کو معطوف علیہ (یعنی علم) سے مربوط کر دیتا ہے۔ اس طرح مفہوم ہوگا کہ نبوے کرنے والے اس خیال میں نہ رہیں کہ ان کی شرارتوں، یا خفیہ عزائم کو کوئی نہیں جانتا۔ اللہ کو اس کا علم ہے اور اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے اور نبوے کرنے والے کتنی ہی تعداد میں ہوں اس کا علم انہیں گھیرے ہوئے ہے اس طرح نہ تجسیم کی بات رہی نہ تقسیم اور نقل مکانی کی۔

### الحشر

430

متروکہ جائیداد کا مالک کون؟

## والذین تبوا الدار والایمان من قبلهم

(حشر، 9) ان لوگوں کا بھی حق ہے جو فرزند زمیں ہیں اور ایمان کے چکے۔

یہ ہے کہ اس آیت میں متروکہ جائیداد میں سے جن لوگوں کو دینا کیا گیا ہے اس میں قدیمی باشندوں یعنی لوکل کو بھی حقدار بنایا گیا ہے حالانکہ متروکہ جائیداد پر صرف مساجروں کا حق ہے۔

### وجه اعتراض

جب قرآن نے اپنے غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ متروکہ جائیداد میں ”لوکل“ کا حق بھی ہے تو اس حق کو زائل کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ لیکن یہاں افتاد یہ ہے کہ ایک سازش کے ذریعہ

### قول فیصل

مسٹر لیاقت علی نے اپنے ہم وطنوں کے ہاتھ مملکت کے تمام وسائل مرکوز کرنے کے علاوہ متروکہ جائیداد پر بھی دانستہ ہاتھ صاف کر ڈالا۔ حالانکہ یہ لوگ اسلام کے نام پر اٹھے تھے ایک ملک بنانے۔ لیکن قرآن سے نابلد ہونے کے باعث ان لوگوں نے جو پہلا تیر چلایا وہ سینہ قرآن ہی میں پیوست کیا گیا۔ اس پر لیاقت کے ”پانچ رتن“ جو خیر سے واقفانِ دین و

مذہب بھی تھے ان میں سے کسی کو بھی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ انھیں اور تاریخ کے اس ”سفاکانہ“ عمل میں رکاوٹ بن جائیں اور میرا مشاہدہ ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی، سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالحامد بدایونی اور محترم احتشام الحق تھانوی بھی ہم زبان اور ہم علاقہ تھے انہوں نے دانستہ لوکل کے حق کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی اپنی بساط کی حد تک اس لوٹ مار میں سے حصہ پاتے رہے حالانکہ انہیں پتہ تھا کہ سورہ حشر کی آیات (10۳:6) میں بتلایا گیا ہے کہ ایسی جائیداد جو بغیر ”مقابلہ“ و ”مقاتلہ“ اور بغیر ”رن پڑے“ غیر مسلم چھوڑ کر چلے جائیں اسکی قرآنی ”تقسیم“ نہ تو قابلِ ترمیم ہے اور نہ ہی قابلِ تسخیر۔ اور تقسیم اس طرح ہے کہ اسمیں۔ یتیم، نادار، پردیس کی مشکلات جھیلنے والے، رسول کے قرابت دار اور وہ مہاجر جو اپنے کبابی گھروں سے جبراً نکالے گئے اور کچھ بھی ساتھ نہ لاسکے اور وہ فرزند وطن جو پہلے سے ایمان اور اسلام کی پناہ سے ہوئے ہیں۔

ان آیات میں مہاجر کے ساتھ شرط لگادی گئی ہے کہ ”اصلی“ مہاجر ہو ”ترغیبی“ یا بعد از وقت ہجرت نہ کر آیا ہو طے شدہ علاقے سے ہو۔ اس طرح ان آیات میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ اگر کوئی حقیقی مہاجر ہے تو مملکت اپنی صوابدید سے تو اسکی مدد کر سکے گی مگر وہ ”کَلِیم“ نہ کر سکے گا کہ ”کَلِیم“ ملکیت کا ہوتا ہے جبکہ علامہ شامی حنفی (937م) کے ناظر میں ہر مہاجر جائیداد ”غیر منقولہ“ اپنے ساتھ نہیں لاسکتا لہذا وہ اپنے وطن میں چھوڑی ہوئی جائیداد کا یہاں مالک تصور نہ ہوگا۔ اب وہ ”لاملکیت“ ہے جبکہ کَلِیم ملکیت پر ہوتا ہے جس میں جائیداد کی تفصیل، اور مقدار، متعین کی جاتی ہے جس کا کھوج لگانا ایک ناممکن امر ہے۔ اگر ممکن ہو جو ناممکن ہے تب بھی کَلِیم کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ (تفصیل مع حوالہ ملاحظہ ہو برہان القرآن) فرمایا ما اتکم الرسول فخذوہ۔ ایسی جائیداد میں سے جتنا کچھ رسول دیدے۔ لے لو۔ مزید کی بات نہ کرو۔ (حشر، 9۳:3) بات صاف ہو گئی کہ یہ جو ہجرت کے نام پر اربہا کھربہا کی متروکہ املاک کو ”مخصوص“ (اور غیر طے شدہ) علاقے کے لوگوں کو ”دان“ کیا گیا ہے اللہ و رسول کی صریح نافرمانی کے علاوہ اونچ نیچ، رشک و حسد، ”یافت“ اور نیافت کے ”شجر خبیث“ کو پروان چڑھا کر لوکل کے لئے آزادی کا مفہوم موہوم بھی بنا دیا گیا ہے وہ اس لگائے بیٹھے تھے کہ ان املاک میں سے انہیں بھی کچھ ملے گا اور یہ بھی اپنے دکھوں کا مداوا کر سکیں گے لیکن ان کے خواب نہ صرف ادھورے رہ گئے ”بے تعبیر“ بھی ثابت ہوئے۔ اس طرح ”کشکش“ اور ”پاکستان شکنی“ کا سبب بنیاد وہ لوگ خود ہی رکھ گئے جو اسکو وجود میں لانے کے دعویدار بنے پھرتے تھے۔ اس ”خونی“ ڈرامہ کا ناظم الدین، میاں افتخار الدین، سندھی قائدین اور حسین شہید سہروردی نے بروقت احساس کیا تھا مگر جاگیردارانہ غیر ملکی ”جبر“ کی سیاست مسلط تھی وہ تدارک نہ کر سکے اور پھر رفتہ رفتہ یوپی کے جاگیرداروں نے ان سب کو دیوار سے لگادیا۔ اور پھر آزادانہ ”لوٹ کھسوٹ“ کا ایسا چکر چلا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا معیشت کی اونچ نیچ نے آنے والوں کے ذہنوں میں ”برتری“ کا جذبہ پیدا کیا۔ لسانی برتری، علاقائی برتری، تعلیمی برتری، ثقافتی برتری اور تہذیبی برتری غرض کہ یہ ”برتریاں“ امت اسلام کے لئے ”زہر ہلاہل“ ثابت ہوئیں۔ احترام کے ”جذبات“ ماند پڑ گئے ”انقام“ کی دودھاری تلوار نے فرزند وطن کے لئے جینا دو بھر کر دیا جبکہ

میں مسلم فرزند وطن کو اپنے وطن سے پیار تھا وہ نہ لسانی تلوار چلاتے اور نہ تہذیبی برتری کے زہر میں تجھے تیر پھینک کر بے قصور انسانوں کو خاک و خون میں تڑپاتے۔ انہیں معاشی برتری ضرور حاصل تھی مگر اس خطہ میں کم تعداد میں ہونے کے باعث زبان و تہذیب کے ناٹے سے زیر کرنے کا سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

نمبر 1۔ میں کہا جاتا ہے کہ آیہ کریمہ میں تبوا۔ کا لفظ ہے جو ”مکانیت“ کو مستلزم ہے جبکہ یہاں ایمان کا ذکر بھی ہوا ہے اور ”ایمان“ کسی مکان کا نام نہیں ہے جس میں ”مکانیت“ ممکن ہو۔

**وجہ اعتراض**

یہاں ”الایمان“ مجاز اور استعارے کے مقام پر آیا ہے۔ اس طرح مفہوم ہو گا کہ ان لوگوں نے اپنے سینے میں ایمان کے لئے جائے پناہ اور وطن مہیا کیا پھر اس پر قائم اور متمکن رہے۔

**قول فیصل**

6-3-96 ملتان

☆

**غد کے معنی**

431

**ولتنظر نفس ما قدمت لغد**

(حشر، 18)

ہر انسان کو سوچنا ہے کہ اس نے کل کے لئے کیا کیا ہے؟

یہ ہے کہ ”غد“ کے دو مفہوم ہیں۔ گزشتہ کا ”کل“ اور آنے والا ”کل“۔

**وجہ اعتراض**

یہ لفظ ”مطلق وقت“ کے لئے بھی آیا ہے اس طرح وہ ماضی اور مستقبل سے بطور خاص مربوط نہیں ہے، اس سے مطلق زمانہ ماضی بھی مراد ہے اور مطلق زمانہ مستقبل بھی۔ اب یہ قرآن اور سیاق بتلائیں گے کہ کہاں ماضی کی کل ہے اور کہاں مستقبل کی۔

**قول فیصل**

☆

**صف**

**پورا نہیں ادھورا نبی ضرور ہوں**

432

**وقد تعلمون انی رسول اللہ**

(صف، 5)

تم جانتے ہی ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پورے جملے پر ”قد“ واقع ہوا ہے جو ”قلت“ کا مفہوم دیتا ہے اس طرح معنی ہوں گے میں زیادہ نہیں تھوڑا رسول ضرور ہوں۔

**وجہ اعتراض**

## قول فیصل

یہ درست ہے کہ قد۔ جب مضارع پر آتا ہے تو ”قلت“ کا مفہوم دیتا ہے مگر عربی میں ”قلیل“ الوقوع“ اور ”نادر“ کو بھی کہا جاتا ہے اور کبھی صرف اظہار حقیقت کا وسیلہ بھی بن جاتا ہے جیسے کہنا کہ۔ ان الکذوب قد یصدق۔ کبھی جھوٹا بھی سچ بول لیتا ہے۔ اور یہ ”قد“ ”کبھی کبھار“ کثرت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

قد اعسف النازح المجھودُ معسِفُ

فی ظل اخضر یدعوا ہامۃ الیوم

شاعر نے یہاں مدح کو ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے جو کثرت سے ”نپا“ جاتا ہے۔ اس طرح معنی وہی ہوں گے جو ترجمہ میں واضح کئے گئے ہیں۔



## احمد۔ کہا محمد کیوں نہیں کہا؟

433

### و مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد

میں آنے والے رسول کی (نام لے کر) بشارت دینے آیا ہوں جو احمد کے نام کا حامل ہے۔ (صف، 6)

یہ ہے کہ یہاں احمد کے نام سے تعارف کرایا گیا ہے محمد کا نام، نہیں لیا گیا خاص کر انجیل بردو ناموں سے خالی ہے۔

## وجہ اعتراض

حضرت مسیح نے احمد کا نام لے کر بشارت دی تھی لہذا قرآن نے مسیح کے حوالہ سے اسی نام ہی کو دہرایا ہے جو کچھ بھی ہو قرآن نے اگر اسمہ احمد کہا ہے تو سچ ہی کہا ہے ومن اصدق من اللہ قیلا

## قول فیصل

(۔۔۔) اب اگر کسی الہامی نوشت میں کسی ظل قدیمہ کے بطون میں احمد کا نام نہیں ملتا تو قرآن پر اعتبار کرنا چاہیے کہ مسیح نے جو نام لیا ہے ذاتی نام ہی ظاہر کیا ہے۔ انجیل کی چونکہ اپنی زبان نہیں رہی لہذا اسکی گواہی تو بھی احبار و رہبان شاید ہی تسلیم کرتے لہذا ہمیں قرآن کی روایت کافی ہے۔



## احمد مرسل کا آنا مسیح کی موت سے مربوط ہے

434

### مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد

میں تمہیں یہ بتلانے آیا ہوں کہ میرے بعد ایک ایسا رسول آئے گا جو احمد نام کی شہرت رکھتا ہوگا۔ (صف، 6)

اس آیت میں واضح لفظوں میں کہا گیا ہے رسول انام سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ جناب مسیح کے

## وجہ اعتراض

دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہی تشریف لے آئیں گے۔ یہاں ”بعدی“ کے لفظ نے بات صاف کر دی ہے کہ مسیح کے حقیقی موت مر جانے کے بعد ہی نبوت محمدی کا بند دروازہ کھل جائے گا لیکن احادیث و آثار سے

پایا جاتا ہے کہ امام بخاری اور تمام محدثین ”انتظاری“ عقیدے کے قائل تھے اور ختم نبوت جیسے ”نازک“ اور حساس مسئلہ کے باوصف کہتے تھے کہ مسیح تاحال زندہ و سلامت ہیں اور ابھی گھر بہا سال تک زندہ رہ کر پھر ”مبع نبوت“ نزولِ اجلال فرمائیں گے اور چالیس سال تک نبوت کا کاروبار چلا کر مر جائیں گے اور ان کے مرتے ہی قیامت قائم ہو جائے گی یا تھوڑی دیر کے لئے احمد مرسل ﷺ تشریف فرما ہوں گے۔

یہ روایات قرآن، مشاہدہ اور قانونِ فطرت کے خلاف ہیں اتنی غیر معمولی زندگی کہ عناصر کی ٹوٹ پھوٹ تک دراز ہو۔ ”ناممکن“ اور ”محال“ ہے دنیا نے دیکھ لیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ 571 م میں دنیا میں تشریف لے آئے اور اپنے مشن کی تکمیل کر کے (632 م) میں رحلت فرما گئے ایسے میں اگر مسیح زندہ ہوتے تو آپ کیسے تشریف لا سکتے تھے کیونکہ آپ کا تشریف لانا مشروط ہے مسیح کے طبعی موت مر جانے سے لیکن جب مسیح مرے ہی نہیں تو آپ تشریف کیسے لے آئے۔ کیا ہم ذہنی توازن کھو کر دنیا کو باور کرائیں کہ چونکہ مسیح مرے ہی نہیں لہذا تاحال حضور نبی اکرم ﷺ بھی تشریف فرما نہیں ہوئے؟ کیا یہ سن کر لوگ ہمیں ”اختلالِ دماغ“ کا مریض نہیں کہیں گے؟ ماورائے عقل و دانش عقیدہ رکھنے پر ”بیمار سوچ“ کا حامل نہیں ٹھہرائیں گے۔ پھر محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی تو مختصر اور صرف چھ عشروں پر محیط ہو اور جناب مسیح علیہ السلام کی حیات مبارکہ کو اتنا خلود اور ”دوام“ نصیب ہو کہ۔ ان کی موت کا تصور ہی حی و قیوم کے وصف میں ڈھل جائے ایک لایعنے اور غیر منطقی بات ہے ارشاد ہے۔ **ما جعلنا لبشر من قبلك الخلد افان مت فهم الخالدون کل نفس ذائقة الموت**

ہم نے آپ سے پہلے کسی بھی فرد بشر کو زندگیِ دوام سے نہیں نوازا۔ کیا آپ کے لئے تو موت مقدر ہو اور دوسرے ابد الابد تک زندہ و سلامت رہیں۔ (ایسا نہیں ہے ہمارے قانون میں ہر فرد طبعی عمر پا کر) ذائقہ موت چکھنے کا پامند ہے۔

(انبیاء، 34)

اس آیت نے کسی بھی انسان کے لئے ایسی زندگی کی ”نفی“ کر دی ہے جو ”غیر معمولی“ حد تک دراز ہو۔ اور پھر حقیقت یہ ہے کہ نبوتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ہند دروازہ مسیح کی موت کے بعد ہی کھلنے سے مشروط ہے۔ وہ شرط پوری ہو گئی مسیح ”تیس“ سال کے لگ بھگ ”طبعی“ عمر پا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت سے ہمکنار ہو گئے۔ ان کی ”بعدیت“ غیر ”ذاتی حد تک دراز نہ تھی وہ حی و قیوم نہیں تھے نہ بن سکتے تھے بیت المقدس میں ”مسیح“۔ قبر المسیح کی بلند و بالا عمارت میں ان کی قبر موجود ہے۔ نئی تازہ نہیں کم از کم 1900 سال پرانی ہے راقم نے 6 مرتبہ مسجد اقصیٰ کی زیارت کی اور ان آثار کو بھی دیکھا ہے ہزاروں لاکھوں زائرین یہاں آتے اور ان آثار کی تصویریں لے جاتے ہیں۔ ”مذکرہ“ میں علامہ مشرق عنایت اللہ خان نے بھی اس قبر کا ذکر کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مسیح کو آسمان دنیا پر زندہ و سلامت دیکھا اور سلام کیا تھا وغیرہ جی نہیں یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے قرآن اسکی ”تصدیق“ نہیں کرتا اور ”مشاہدہ“ اسے ”بھٹلاتا“ ہے خاص کر ان روایات میں



یہ بھی ہے کہ آپ نے اس سفر میں اپنے اپنے مقام پر ہر نبی سے ملاقات بھی کی اور سلام بھی کہا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف مسیحؑ بلکہ سبھی انبیاء زندہ و پایندہ ہیں۔ جی نہیں واقعہ معراج کی نوعیت اور اس رات کی بہت سی باتیں ”زعب داستان“ کے لئے ہیں فرض کرو ایسا ہوا ہے تو بھی اسمیں مسیح کے لئے زندہ رہنے کی ”خصوصیت“ کہاں سے لی گئی؟ اس طرح تو تمام انبیاء کی زندگی ثابت ہو کر صرف مسیح کی زندگی کا ”اختصاص“ ختم کر دیتی ہے تو کیا سبھی انبیاء جی و قیوم تھے اور جنہیں پورے عزت و احترام کے ساتھ قبروں میں اتارا گیا تھا وہاں سے نکل کر آسمانوں پر جا بیٹھے تھے؟ یا روکھ تھوڑا کر۔ ”عقل و آگہی“ سے اتنی دوری اور اتنی بے گانگی اچھی نہیں لگتی۔ مرنے کے بعد ”احساس و شعور“ والی زندگی بالکل ہی ”زائل“ ہو جاتی ہے۔ لازوال صرف اللہ کی ذات ہے اسے ہی بقاء اور دوام حاصل ہے کوئی بھی انسان ”غیر معمولی“ زندگی نہیں پاسکتا۔ لہذا حیات و سوت کے تمام وہ قوانین جو ”عام“ انسانوں پر لاگو ہوتے ہیں ”انبیاء“ پر بھی ہوتے ہیں ماسوائے وحی کے اور یہ اللہ کا اختیار ہے۔



جمعہ

## رسول اللہ۔ ان پڑھ کیسے؟

435

### هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیہم آیاتہ

وہی (اللہ ہی) تو ہے جس نے اُمیوں میں رسول بھیجا جو اسکی آیتیں انہیں پڑھ کر سنا دے۔ (جمعہ، 2)

میں کہا جاتا ہے کہ ”امی“ عام طور پر ان پڑھ کو کہا جاتا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ آپؐ بھی ان پڑھ تھے لیکن ایک ان پڑھ آیات الہی کی تلاوت کیسے کر سکتا ہے؟ (یتلوا)

وجہ اعتراض

یہاں ”امیین“ سے مراد ام القریٰ یعنی مکے والے مراد ہیں جو تاریخ بتلاتی ہے کہ ان میں ان پڑھ

قول فیصل

بھی تھے اور ڈھیر سارے پڑھے لکھے بھی (وضاحت برہان القرآن میں موجود ہے) وہ لوگ بڑے جفاکش اور تجارت پیشہ تھے اور حسب ”سیرن“۔ شام اور یمن کو تجارتی قافلے لے جاتے اور حساب و کتاب لکھ لیتے تھے اسی طرح نبی اکرم ﷺ بھی چونکہ ”ام القریٰ“ کے ”مولود“ تھے لہذا آپؐ کا سکونت محل سے متعارف ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے لیکن آپؐ ”ان پڑھ“ نہیں تھے بلاشبہ آپؐ کے ابتدائی حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے تاہم نزولِ قرآن سے پہلے آپؐ اگرچہ ایمان اور کتاب سے آگاہ نہیں تھے ولا تخطہ بيمينک۔ لکھنے پڑھنے سے بھی آگاہ، نہیں تھے لیکن بعد میں آپؐ لکھ پڑھ سکتے تھے ”تلاوت“ دیکھ کر پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اب قرآن اگر آپؐ کے دیکھ کر پڑھنے کی گواہی دیتا بلکہ ”اتل ما اوحی الیک“ کے مطابق آپؐ کو حکم دیتا ہے کہ اپنی ”وحی“ کو دیکھ کر پڑھ سناؤں (عنکبوت، 45۔۔ کف، 2)۔ اب اگر آپؐ ان پڑھ ہوتے تو کسی ان پڑھ کو کہنا کہ دیکھ کر پڑھ سناؤں ”غیر معقول“ ہو سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپؐ ان پڑھ ہرگز نہیں تھے ورنہ قرآن کی گواہی ”مشتبہ“ ہو جائے گی یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے برہانِ تعلیم اہل کتاب سے بھی فرمایا کہ۔ فاتوا

بالتوراة فأتلوها۔ تم تورات لادو میں تمہیں پڑھ کر سناؤں (عمران، 93) یہاں اگر صرف پڑھنا مقصود ہوتا تو آپؑ فاقرؑ تھا۔ فرماتے کہ۔ قرأت دیکھ کر پڑھنے کو بھی کہتے ہیں اور بن دیکھے حافظہ کے سہارے پڑھنے کو بھی۔ لیکن آپؑ نے ”معمول“ کے پڑھنے سے ہٹ کر ہر مقام پر ”تلاوت“ یعنی دیکھ کر پڑھنے کی وضاحت کی ہے یہی وجہ ہے کہ آپؑ کو نہ صرف ”علم کتابی“ اور تورات کو دیکھ کر پڑھ سنانے کی ”وسٹرس“ حاصل تھی تمام صحائف جو اس وقت دستیاب تھے انہیں بھی دیکھ کر پڑھ ساتے تھے (پینہ، 2) غرض کہ آپؑ کے دیکھ کر پڑھ سنانے کی ”خبر“ بے شمار آیات میں موجود ہے ملاحظہ ہوں آیات یونس، 16۔۔۔۔۔ رعد، 32۔۔۔۔۔ کہف، 84۔۔۔۔۔ نحل، 92۔۔۔۔۔ انعام، 151۔۔۔۔۔ مائدہ، 30۔۔۔۔۔ اعراف، 174۔۔۔۔۔ یونس، 71 وغیرہ وغیرہ۔ ☆

96-3-7 ملتان

## صلوٰۃ کے لئے دوڑ لگانا سنجیدگی کے خلاف ہے

436

### فاسعوا الی ذکر اللہ

(جمعہ، 9)

جب صلاۃ جمعہ کی اذان ہو تو ذکر اللہ کے لئے دوڑ پڑو۔

یہ ہے کہ۔ صبح۔۔۔ دوڑ کر چلنے کو کہا جاتا ہے جبکہ صلاۃ کے لئے دوڑ لگانا سنجیدگی اور متانت کے خلاف ہے کوئی دیکھ کر کیا کہے گا کہ یہ لوگ کیا چگانہ حرکت کر رہے ہیں؟

وجہ اعتراض

یہاں پاؤں سے دوڑ کر چلنا مقصود نہیں ہے۔ صرف ”سعی و عمل“ مراد ہے مسلمان دعائے قنوت

میں ”الیک نسعی“ پڑھتے ہیں لیکن اسکا مفہوم یہ نہیں لیتے کہ۔ ”ہم تمہاری جناب میں دوڑ

لگاتے ہیں۔“ حسن بھری (728م) ”خالی نیت“ اور ارادے یعنی دل کے عمل پر بھی ”سعی“ کا اطلاق کرتے تھے قرآن میں

فرمایا۔ وان لیس لانا انسان الا ماسعی۔ انسان جو سعی و عمل کرتا ہے اسکا پھل پاتا ہے (نجم، 39) اسکے معنی یہ نہیں کہ

ہر کام دوڑ لگا کر کرتا ہے۔ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ مال و دولت جمع کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے تو اس سے حقیقی دوڑ لگانے

کا مفہوم کوئی بھی نہیں لیتا۔

☆

منافقون

## سچ کو جھوٹ کہنا۔ انصاف نہیں ہے

437

### واللہ یعلم انک لرسولہ

(منافقون، 1)

اللہ جانتا ہے کہ تم اس کے رسول ہو۔

میں کہا جاتا ہے کہ جب اللہ سبحانہ رسول کی رسالت کی گواہی دیدیں وہ تو قابل پذیرائی ہے لیکن وہی

وجہ اعتراض

گواہی اگر منافقین دیدیں تو وہ جھوٹ کس طرح بن گئی؟ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر رسولؐ کے حق میں انکی یہ شہادت جھوٹی ہے تو کیا رسولؐ اللہ کی رسالت کی نفی کرنے والی بات معاذ اللہ سچی ہوگی؟

اسکے معنی یہ نہیں کہ ان کی ”صداقت رسولؐ“ والی گواہی جھوٹی ہے بلکہ جو جھوٹ ان کے دل میں چھپا ہوا ہے یہاں اس جھوٹ کو جھوٹ کہا گیا ہے۔

## قول فیصل



تغابن

کافر کے کفر اور مؤمن کے ایمان کا فیصلہ ہو چکا ہے

438

## فمنکم کافر ومنکم مؤمن

تم میں سے وہ ہیں جو کافر ہیں اور وہ ہیں جو مؤمن ہیں۔ (تغابن، 2)

یہ ہے کہ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں کے کافر اور مؤمن بننے کا فیصلہ ہو چکا ہے اب نہ تبلیغ کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس راہ میں سرکھانے کی بلکہ آمد (تغابن، 2) بھی عبث ہے۔

## وجہ اعتراض

اس کا مفہوم یہ نہیں کہ ”خدا نے لایزال“ نے لوگوں کو ”ازل“ ہی سے کافر اور مؤمن میں تقسیم کر رکھا ہے اب نہ تبلیغ کی ضرورت ہے نہ ہدایت گری۔ کے کسی دیگر ہنر کی۔ یہاں آیت کی ابتداء

## قول فیصل

میں فرمایا۔ هو الذی خلقکم۔ اللہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اس طرح صرف یہ وضاحت مقصود تھی کہ اس نے تمہارے ”جسموں“ کی تخلیق کی ہے یہ نہیں کہ تمہارے افعال یعنی ایمان اور کفر کو بھی پیدا کر دیا کہ اب جو مؤمن ہے وہی مؤمن رہے گا اور جو کافر ہے وہ کافر ہی ہوگا۔ جبکہ ایمان و گمراہی اس کے فکری خمیر میں شامل ہیں وہ خود ہی مؤمن ہے اور خود ہی کافر۔



پہلے ہدایت۔ یا ایمان؟

439

## ومن يؤمن بالله يهد قلبه

جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اسکے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ (تغابن، 11)

میں کہا جاتا ہے کہ ہدایت کا نمبر ایمان سے پہلے ہوتا ہے لیکن یہاں پہلے ایمان کی بات ہوئی ہے۔

## وجہ اعتراض

یہاں ”یهد“ کے معنی۔ ايقان، ”تسلیم“ اور رضا کے ہیں یعنی ایمان لانے کے بعد جن ”مصاب“

## قول فیصل

مشکلات کے پیش آنے کا امکان ہے اس پر دل کے ”جماؤ“ اور ثابت قلبی مراد ہے۔



طلاق

## بے حساب رزق کا مسئلہ

440

ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب

جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اسے پریشانیوں سے نکال لے گا اور ایسی جگہ سے روزی کا انتظام فرمائے گا

جو اسکے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ (طلاق، 3۲:2)

یہ ہے کہ ”صلحاء“ سے بڑھ کر رمتی کون ہوگا لیکن مشاہدہ کہتا ہے کہ ان پر معاش کی ”تنگیاں“ منڈلاتی رہیں اور وہ فقرِ معاش میں ”جٹلا“ رہے۔

وجہ اعتراض

یحتسب۔ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ دیتا ہے لیتا، نہیں اس طرح معنی ہوں گے اللہ اپنے قانون کے مطابق جب روزی کے اسباب فراہم کرتا ہے تو ان کا معاوضہ، نہیں لیتا۔ جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دی ہوئی چیز کو حساب میں، نہیں لاتا۔ یہ، نہیں کہ تم کچھ نہ کرو وہ پکی پکائی دیتا چلا جائے۔

قول فیصل



## جو مقدر میں لکھا۔

441

قد جعل الله لكل شیء قدرا

(طلاق، 3)

اللہ نے ہر چیز کو تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ روزی یا اچھے اور بُرے حالات انسان کے مقدر میں لکھ دیئے گئے ہیں۔

وجہ اعتراض

قدر۔ کے معنی مقدر میں لکھ دیئے جانے کے نہیں ہیں، ہر چیز کا ”پیمانہ“ مراد ہیں یعنی دکھ سکھ کے لئے بھی پیمانہ مقرر ہے اور اسی کو سمجھنے سے دکھ کو سکھ میں اور سکھ کو دکھ میں بدلا جاسکتا ہے۔

قول فیصل



## حمل والیوں کے اخراجات

442

## وان كن اولات حمل فانفقوا عليهن

(طلاق، 6)

اگر طلاق کے وقت حمل سے ہوں تو ان کا نان و نفقہ جاری رکھو۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ طلاق بائنہ کے بعد نان نفقہ کی بات ہوئی ہے۔

**قول فیصل** اور یہ اس لئے کہ بسا اوقات۔ طلاق کے بعد حمل کے ایام کچھ طویل سے ہو جاتے ہیں اور طلاق دہندہ سمجھتا ہے کہ عدت کے ایام گزرنے پر خرچہ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اسکی وضاحت فرمائی کہ اب اسکی عدت۔ وضع حمل سے مربوط ہوگی اور خرچہ کی ذمہ داری مزید جاری رہے گی۔



تحریم

## توبۃ کی صفت "نصوحۃ" ہونا چاہیے

443

يا ايها الذين آمنوا توبوا الى الله توبة نصوحا

(تحریم، 8)

مؤمنو! اللہ کے آگے صاف دلی سے توبہ کرو۔

میں کہا جاتا ہے کہ توبۃ۔ مؤنث ہے اس کی صفت بھی مؤنث ہی ہونا چاہیے یعنی توبۃ نصوحۃ۔

لیکن یہاں صفت مذکر (نصوحا) لا کر قاعدہ شکنی کی گئی ہے۔

فعلول۔ مبالغہ کے اوزان میں سے ہیں جسکے لفظ میں مؤنث اور مذکر یکساں شامل ہوتے ہیں جیسے



"امراۃ صبور و شکور"۔

**قول فیصل**

ملک

## موت پہلے یا حیات؟

444

خلق الموت والحياة

(ملک، 2)

اس نے موت اور زندگی تخلیق کئے۔

یہ ہے کہ یہاں "موت" کا پہلے اور "حیات" کا بعد میں ذکر ہوا ہے جبکہ معاملہ اس کے برعکس

ہے۔

**وجہ اعتراض**

یہاں "موت" سے "نیمت" اور حیات سے "ہست" مراد ہے۔ کہ ہر جاندار مخلوق پہلے نیست

**قول فیصل**



تھی پھر اللہ نے اسے وجود و یادہ ”ہست“ ہو گئی۔ بس اسی رعایت سے ”موت“ کا پہلے اور ”حیات“ کا بعد میں ذکر فرمایا۔  
ارشاد ہے،

وکنتم امواتا فاحیاکم ثم یمینکم ثم یحییکم

تم نیست تھے تمہیں زندگی عطا کی پھر نیست ہو جاؤ گے اور از سر نو زندگی پاؤ گے۔  
(قرہ، 28)

کہ زندگی کہیں جا کر ختم نہیں ہو جاتی کہ جوئے زندگی رواں دواں رہتی ہے۔



## معجزات۔ ناممکنات

445

### ماترے فی خلق الرحمن من تفاوت

(ملک، 3)

اللہ کی تخلیق میں کوئی فرق نہ پاؤ گے۔

میں کہا جاتا ہے کہ ہم ایک دو نہیں بی شمار چیزوں میں ”تفاوت“ پاتے ہیں بلکہ قانون ”اضداد“ کے  
تأظر میں مقابل کی اشیاء ہمیشہ مختلف سائز اور حجم کی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ”سماء“ بڑا ہے۔ ”ارض“  
چھوٹی ہے۔ وہ ”بلند“ ہے اور یہ ”پست“۔

یہاں سائز اور حجم کا تفاوت مقصود، نہیں ہے وہ تفاوت مطلوب ہے جو لاء آف نیچر میں ہونا چاہیے  
جس کی بابت فرمایا ”ولن تجد لسنة الله تبديلا“ اللہ کے قانون میں ہر گز ہر گز تغیر اور تبدیلی  
نہ پاؤ گے (احزاب، 62) کیونکہ فطرت کے قوانین انسانی دست برد سے محفوظ ہیں لہذا ان میں نہ ”تفاوت“ نظر آئے گا اور  
نہ خلل۔ نہ عیب دیکھے گا اور نہ نقصان بلکہ زور دے کر فرمایا۔ فارجمع البصر هل ترى من فطور۔ دوبارہ (بلکہ بار بار)  
نظر اٹھا کر دیکھو۔ کیا کہیں ٹوٹ پھوٹ اور ”ناہم آہنگی“ نظر آئی۔  
(ملک، 34)

اس طرح اپنے قوانین میں پختگی کے حوالہ سے احساس دلایا کہ اللہ کی تخلیقات میں نہ فطر تا ٹوٹ پھوٹ ممکن  
ہے اور نہ کسی ”خارجی“ دست اندازی سے خلل ”روا“۔ مصنوعات خالق نہایت وقت اور بہاریکی اور نہایت حسن و خوبی سے  
وجود میں لائی گئی ہیں یعنی ایسے ناقابل شکست قوانین بروئے کار لائے گئے ہیں جن کے ”استحکام“ و پختگی کی ”گمانی“ خود  
فاطر ازل نے فراہم کی ہوئی ہے اس طرح وہ خود ”مقتدر علی الاطلاق“ ہونے کے باوصف ان قوانین کو، نہیں چھیڑتے  
ایسے میں اگر کوئی صاحب اپنے ”معجزات“ کی ”توانائی“ سے ٹوٹ پھوٹ۔ یا۔ ”تفاوت“ کو سامنے لانا چاہتے ہیں تو گویا نظام  
کائنات کو درہم برہم کرنے کے مدعی بھی بن جاتے ہیں جبکہ فرمایا۔ لمن الملك اليوم۔ کون ہے جس کا اس وسیع و عریض  
کائنات پر تسلط اور حکمرانی ہے یعنی استفہام ”انکاری“ کے لہجے میں فرمایا کوئی نہیں اور پھر صریح طور پر فرمایا اللہ الواحد  
القہار۔ اس کائنات پر صرف خدائے واحد جس نے ہر چیز کو زیر کر رکھا ہے کی حکمرانی ہے۔  
(غافر، 16)

بات صاف ہو گئی کہ معیجیٹ "ناممکنات" میں سے ہیں نہ یہاں کسی مردہ کو زندہ کیا گیا اور نہ کسی "چاند" کو دو "ٹکڑے" کر کے۔ جبل ہو قیس کے پار گرایا گیا۔ ☆

ن

## اللہ کی پنڈلیوں کی بات

446

### یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود

(ن، 42) جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور سجدے کا کہا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔

یہ ہے کہ یہاں یوم سے مراد۔ یوم قیامت ہے اور ساق سے اللہ کی پنڈلی۔ حالانکہ اللہ نہ جسم ہے اور نہ جسم کے اعضا اسکے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ **وجہ اعتراض**

یوم۔ "نکرہ" ہے اسے بغیر کسی دلیل کے "معرفہ" بنانا رستم ظریفی ہے خاص کر "یدعون الی السجود" کا "قرینہ" واضح کرتا ہے کہ یہاں یوم قیامت مطلوب نہیں ہے کہ اس دن سجود

### قول فیصل

طاعات کی بات ہی نہ ہوگی۔ اسی طرح "یکشف"۔ مجہول کا صیغہ ہے اسے معروف بنا کر بلا وجہ قاعدے و قانون سے انحراف کیا گیا ہے کیونکہ خدا نے اگر اپنا تعارف کرانا ہی تھا تو "چہرے" سے پردہ ہٹا کر ہی کرا لیتے۔ پنڈلی سے خدا کے چہرے کا پتہ کیسے چلے گا۔ پنڈلی تعارف کا ذریعہ نہ پہلے بنی ہے نہ محاورات قوم میں ایسا کوئی "شہ پارہ" ہے جو پنڈلی کو چہرے کا استعارہ ثابت کر دیتا ہو۔ یہ علاوہ اسکے کہ یہاں پنڈلی بھی واضح نہیں ہے کہ کونسی۔ دائیں یا بائیں؟ اب جہاں اتنے ایہامات موجود ہوں وہاں بات نتیجہ خیز ثابت ہو تو کیونکر ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ "یکشف عن ساق"۔ عرب کا ایک "محاورہ" ہے جو صرف خوف و "دہشت" کی حالت کو واضح کرتا ہے جو اسی دنیا میں پیش آنے والے واقعات میں سے کوئی واقعہ ہو سکتا ہے اس طرح یہ محاورہ کسی حقیقت حال کو واضح کرنے کا اشارہ بھی بن سکتا ہے۔

(تفصیل "برہان القرآن" میں ملاحظہ ہوں) ☆

## ذات بدل کر "وجاہت" حاصل کرنا

447

### عتل بعد ذالک زنیہ

(ن، 13) زشت خواہ اس کے علاوہ بد ذات۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں جن لوگوں کی بات کا اعتبار نہ کرنے کا حکم ہے ان میں بد ذات یعنی حرام نطفے کی پیداوار لوگ بھی ہیں۔ **وجہ اعتراض**

## قول فیصل

یہاں ”ذنیم“ کے معنی ”ولد الزنا“ کے، نہیں اس شخص کے ہیں جو سماج کی نظروں میں ”بچ“ ذات ہے اور اپنی ذات پر پردہ ڈالنے کے لئے کسی اونچی ذات کا فرو ظاہر کر کے دنیاوی مفاد حاصل کرنے کی راہ ہموار کرتا اور سید، مغل، پٹھان اور راجپوت کا جامہ پہن کر سامنے آتا ہے مثلاً اپنے گھر اور وطن میں ایک شخص ڈوم، میراثی اور کر خندار قسم کی سماجی پستی میں مبتلا ہے وہ گھر سے نکل کر دوسرے ماحول میں کسی دوسرے شہر میں سماجی شرفاء کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے تاکہ اُن کاں ذمال و بنین۔ دھن دولت اور زن و فرزند اور دیگر ہمہ گو نہ مفادات سمیٹ کر ٹھٹھ کی زندگی بسر کرے۔ قرآن کہتا ہے کہ شرافت و نجابت ذات کی تبدیلی میں، نہیں اخلاقی اور انسانی قدروں کو اجاگر کرنے میں ہے۔ ذات بدل کر اپنے نسب کو مشتبہ بنانا سب سے بڑھ کر بد اخلاقی ہے اور ایسے مصنوعی شرفاء کا مقام یہ ہے کہ لاتطع۔ ان کی نہ بات کا اعتبار ہے اور نہ گواہی قابل پذیرائی۔



الحاقہ

## ”صر صر“ کی صفت ”عاتیہ“ ؟

448

واما عاد فاهلکوا بریح صر صر عاتیہ

رہے عاد۔ تو ان کا نہایت تیز آندھی سے ستیا ناس کر دیا گیا۔ (الحاقہ، 6)

یہ ہے کہ۔ ریح۔ مؤنث ہے اسکی دوسری صفت عاتیہ۔ بھی مؤنث ہے لیکن اسکی پہلی صفت صر صر۔ مذکر ہے اسے صر صرة۔ ہونا چاہیے تھا۔

وجہ اعتراض

## قول فیصل

ادبیات عرب میں ”صر صر“ صرف ریح کی صفت بن کر آیا ہے اس میں کسی دوسرے لفظ کی صفت بننے کی صلاحیت نہیں ہے اس زاویہ سے اُسے قا (T) تانیث کے بغیر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے ”حیض“ کا لفظ ہے جو صرف عورت سے خاص ہے مردوں کی صفت نہیں بن سکتا لہذا اسے عورت کی صفت کے بطور ”حیضة“ نہیں بنایا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان ”امراة حائض۔ یا۔ طامٹ۔ توکیں گے اسکے برعکس، نہیں اسی طرح حامل۔ بھی عورت ہی کی صفت ہے کہ ایام حمل اور حمل صرف اسی سے مربوط ہیں ہم اردو میں تو ”حاملہ“ کا فقرہ بنا سکیں گے لیکن عربیت کے زاویہ سے امراة حاملہ کتنا فصاحت کے خلاف بھی ہے اور لسانی ضوابط کے منافی بھی۔



## غائب کو موجود تصور کر کے بات کرنا

449

وتری القوم فیہا صرعی

خدا نے ان پر ہوا کا شدید طوفان مسلط کیا جو آٹھ دن اور آٹھ راتیں ان پر چلا رہا۔ اب دیکھو ایسے  
نظر آرہے ہیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔

(الحاقہ، 7)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”توری“ کے مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں جو قوم عاد پر مسلط تباہی کے وقت  
موجود نہ تھے لہذا آپ سے ان کا انجام دیکھ لینے کا کہنا۔ غیر موزوں مطالبہ ہے۔

وجہ اعتراض

یہاں ”فیہا“ کا حرف ”مرعی“ کا ظرف ہے۔ ”فتے“ کا نہیں۔ نیز ”رویت“ سے آنکھ سے دیکھ  
لینا مراد، نہیں ہے عربی میں رعم (سائنس) اور عبرت (تاریخ کے حوالہ) سے جائزہ لینے کو بھی

قول فیصل

رویت کہا جاتا ہے اس طرح گویا نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ۔ رعم اور تاریخ کے ذریعہ ”عادیوں“ کا برا انجام دیکھ لو۔  
علاوہ عرب شاعری میں غائب کو موجود تصور کر کے ”راے زنی“ کا عام رواج بھی تھا۔



عرش کو اٹھائے پھرنے کے معنی کیا ہیں؟

450

و یحمل عرش ربك یومئذ ثمانیہ

اور اس دن تمہارے رب کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہونگے۔

(الحاقہ، 17)

یہ ہے کہ۔ اٹھانے کا فعل رجم دار سے خاص ہے اور رجم والی مٹے پر۔ اللہ کا بیٹھنا مکانیت کو

وجہ اعتراض

مقابلہ معنی ہے جو عقیدہ تقدیس کے منافی ہے۔

حمل۔ دو طرح کا ہوتا ہے۔ 1۔ جسم والی چیز کا اٹھانا II نظر یہ، ”رعم“ اور ہنر اور دیگر صلاحیتوں کا جو

قول فیصل

جسم والی نہ ہوں ان کا حامل ہوتا۔۔۔۔۔ اور عرش کے معنی ”حکمرانی“ کے ہیں اب معنی صاف

ہو گئے کہ۔ اللہ کی حکمرانی کو ”نافذ“ کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کے ”آٹھ پیکر“ جو ”عمل“ ہوں گے۔ اس طرح کچھ

ضروری نہیں کہ حمل کا اطلاق صرف ”مادی“ وجود ہی پر گیا جاتا ہو۔ گناہوں کا ٹھوس وجود نہیں ہوتا ان پر بھی حمل

کا اطلاق ہوا ہے (انعام، 31)۔ بہتان اور تہمت تراشی پر بھی ہوا ہے (نساء، 111)۔۔۔۔۔ (احزاب، 68) ظلم و زیادتی پر بھی

ہوا ہے (طہ، 111) کسی امر کے برداشت سے باہر ہونے کا حامل ہونا بھی مراد ہے (بقرہ، 286) کسی کے سر پرست و سارا

بنے پر بھی ہوا ہے (عریم، 27) وغیرہ۔



اللہ۔ کا محاسبہ غیر یقینی ہوگا؟

451

انی ظننت انی ملاق حسابیہ

(الحاقہ 20)

مجھے شک تھا کہ حساب و کتاب سے واسطہ پڑے گا۔

میں کہا جاتا ہے کہ احتساب اور مکافات عمل جیسی یقینی پالیسی کے سامنا کرنے کو ”ظننت“ جیسے غیر یقینی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو خیال اور واہمہ کا ترجمان ہے۔

وجہ اعتراض

ظن۔ کا لفظ حروف ”اضداد“ میں سے ہے جسکے معنی ظن اور گمان کے بھی ہیں اور ”اعتماد“ و ”ایقان“ کے بھی۔ اس طرح یہاں معنی ہوں گے میں نے ”یقین“ کر لیا کہ احتساب حقیقت ہے۔

قول فیصل

یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو کہ ”حساب“ و ”مکافات عمل“ کسی ٹھوس چیز کا نام نہیں ہے اسکے باوصف اس پر ”مکافات“ کا اطلاق ہوا ہے اب اگر تو اس ملاقات کا یہاں اللہ کی نسبت سے ذکر ہوا ہے تو اسے نقد لیں اور تزیہ کے وسیع تناظر میں ہاتھ ملانے، جھکی ڈالنے اور معافہ کرنے کے مفہوم میں نہیں لیا جائے گا صرف ”سامنا“ کرنے کے معنی ہوں گے۔

☆

رسول۔ قرآن کو منسوخ کرنے کے مجاز نہیں

452

ولو تقول علينا بعض الاقاويل. لاخذنا منه باليمين

اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت باتیں بنا لیتے تو ہم اسکا داہنا ہاتھ پکڑ کر قلعہ کر لیتے پھر اسکی گردن کی شہ رگ کاٹ ڈالتے پھر کوئی نہ ہوتا جو درمیان میں اگر ہماری گرفت کو روک سکتا۔

(الحاقہ 43، 47)

یہ ہے کہ۔ یہاں پیغمبر کے اختیارات پر شدید نوعیت کی ”قدغن“ عائد کر دی گئی ہے جتنے کہ قرآن کے کسی حکم کی بابت رد و بدل کی بات تک نہیں کر سکتے۔

وجہ اعتراض

اتنی شدید نوعیت کی ”تادیب“ کا اظہار اسلئے ہے کہ عام لوگ اسلامی ”رہبانیت“ کے حد سے زیادہ اسیر ہو کر کلام الہی میں شیخ و تبدیلی، اختلافات قرأت اور شانمائے نزول کی آڑ میں دخل اندازی

قول فیصل

کرنے کو عین اسلام سمجھتے اور بے محابا۔ احادیث نبوی کو مقابل میں لا کر وحی کے مقاصد کی نفی کرتے ہیں۔ انہیں احساس دلایا کہ دینِ خالص۔ اللہ کا اختیار ہے اور اس اختیار کو کسی بھی مناسبت سے چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب پیغمبر حد امکان ایسی جسارت نہیں کر سکتا تو دیگر کو کیا اختیار ہے کہ اپنے ذہنی تحفظات کو وحی قرآن پر مسلط کرنے کی ”کافرگری“ کرنا پھرے۔ اگر قرآن میں کوئی چیز ”قابل تبدیلی“ ہوتی تو۔ اللہ سبحانہ اسے قرآن میں درج ہی نہ فرماتے کیا اسکا علم ”ناقص“ تھا؟

یہاں داہنا ہاتھ پکڑنے کی بات کی بائیں کا ذکر نہیں فرمایا۔ وجہ یہ بنی کہ داہنا ہاتھ قوت، پاور اور طاقت کا استعارہ ہے اسے پکڑنے کے معنی ہیں ہم مخالف کا زور توڑ دیں گے۔ اسکی طاقت پاش پاش کر دیں گے اور ”پاور“ نام کی



کوئی چیز رہنے نہیں دیں گے ہاں روایت اگر قرآن کی پالیسی کے ہم آہنگ ہے تو اسے ٹھکرایا نہیں جائے گا دل و جان سے اسکی پذیرائی ہوگی۔

8-3-96 ملتان

☆

معارج

## کیا خدا سٹرھیوں کا محتاج ہے

453

### من الله ذي المعارج

(معارج، 3)

اللہ کی جانب سے جو سٹرھیوں والا ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”اللہ“ کے لئے سٹرھیوں کا ذکر ہے جو مادی وسیلہ کا مظہر ہیں جبکہ اللہ کی ذات نہ ان کی محتاج ہے اور نہ ہی اسکے شایان شان۔

وجہ اعتراض

معارج۔ ”بلندیوں“ اور ارتقاء کو کہا جاتا ہے جسکی اللہ سبحانہ کو ضرورت نہیں ہے لیکن یہاں احساس دلانا مقصود تھا۔ کہ ترقیاں اور بلندیاں اللہ کے قوانین پر عمل پیرا ہونے سے ملتی ہیں کہ اللہ

قول فیصل

ہی ذوالمعارج۔ ترقیوں اور بلندیوں والا ہے یہ ترقیاں اور بلندیاں اللہ کے قانون کو رٹنے سے نہیں ملتیں نہ تسبیح کے دانوں کو چکروینے سے حاصل ہوتی ہیں۔ بلاشبہ ”عبادات“ کا اپنا ”مقام“ ہے لیکن نظریہ ”ارتقاء“ کی رو سے بنیادی اہمیت ”قوانین قدرت“ پر عمل کرنے کو حاصل ہے۔

☆

## یہ فاصلے اور دوریاں ہمارے زاویہ نظر سے ہیں

454

### انهم يرونه بعيدا و فرأوا قريبا

(معارج، 7:6)

وہ اسے دور سمجھتے ہیں جب کہ ہم قریب سے دیکھتے ہیں۔

یہ ہے کہ یہاں ذکر غالباً قیامت کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کفار اسے بہت دور دیکھتے ہیں حالانکہ ابھی وہ ظہور میں نہیں آئی اس پر دیکھنے کا اطلاق کیا معنی دارد؟

وجہ اعتراض

ظہور میں آنے والی کسی چیز کو ”یقینی“ تصور کر کے وقت سے پہلے ”ظاہر شدہ“ تسلیم کرنا عرب کا خاص اسلوب تھا اس طرح وہ ”معدوم“ پر ”موجود“ کا اطلاق کرتے اور قریب و بعید کو ”حقیقی“

قول فیصل

قرب و بعد سے تعبیر نہ کرتے تھے۔ یعنی فاصلے کو درمیان سے ہٹا دیتے تھے۔ یہ تو ہوا ہمارے زاویہ نظر سے جبکہ اللہ سبحانہ کے ہاں تو فاصلہ ہوتا ہی نہیں وہ صرف ہم انسانوں کے اعتبار سے قرب و بعد کا اظہار فرماتے ہیں۔

☆

## کچھ دیر عذاب کا ٹل جانا

455

### وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى

(نوح، 4) تمہارے گناہوں پر پروہ ڈالے گا اور مقررہ وقت تک عذاب کو مؤخر کر دے گا۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”اجل“ کے بارے میں مؤخر کرنے کا عندیہ دیا گیا ہے جبکہ اس آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا۔ ان اجل اللہ اذا جاء لا يؤخر۔

(نوح، 4) بلاشبہ اللہ کا اجل جس وقت سامنے آئے گا مؤخر نہ ہوگا۔

نیز فرمایا۔ ولن يؤخر الله نفسا اذا جاء اجلها

(منا فعون، 11) اللہ جل شانہ جب کسی نفس کو اجل سے دوچار فرمادیں گے مؤخر نہ کریں گے۔

یہاں ”مؤخر“ کے معنی یا مؤخر کروینے کے نہیں ہیں۔ ڈھیل اور ”مہلت“ دینے کے ہیں اور ”اجل“ سے وہ اجل مراد ہے جو ”ازل“ سے مربوط ہے۔ اس طرح معنی ہوں گے۔

تمہارے وقت ختم ہونے تک ایمان لانے کی مہلت جاری رہے گی۔

☆

## انسان پودے کی طرح اُگتا ہے

456

### وَاللّٰهُ انْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا

(نوح، 17) اللہ نے زمین سے تمہیں پودوں کی طرح اُگایا ہے۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ یہاں انسان کی پیدائش کو نباتات کے اُگنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

انبتکم۔ کا لفظ انسان کی ”لہدائی“ آفرینش کا استعارہ ہے کہ وہ پودے ہی کی طرح زمین سے پیدا

قول فیصل

ہوا ہے۔

☆

## کفار کے چھوں کا کیا بنے گا؟

457

ان تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا الا فاجرا كفارا

اگر آپ نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو بدراہ کریں گے اور ان سے جو نسل چلے گی بد کرداروں اور کافروں کی ہوگی۔  
(نوح، 27)

وجہ اعتراض

میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں کفار کے بچوں کے عذاب کی بات کی گئی ہے جبکہ ابھی وہ نہ ایمان کے مکلف ہوئے نہ احکام خداوندی پر عمل کرنے کے مخاطب۔

قول فیصل

ہم اپنی روزمرہ کی باتوں میں کہتے ہیں کہ ----- انہیں وہ مزہ چکھائیں گے کہ ان کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ حالانکہ مزہ چکھانے کی باتیں ان کے بارے میں کی گئی ہیں جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔

اسی طرح ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے آنے والوں کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ حالانکہ یہ کہتے وقت آنے والوں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں بھی اسی ”محاوراتی“ انداز میں کفار کے بچوں کی بات کی گئی ہے اور ”محاکات“ کا یہ انداز کوئی ”غیر معروف“ نہیں تھا روزمرہ کی بول چال کا رائج انداز تھا۔ ☆

جن

سائنسی پاور کے بغیر فضا بے سہارا کو پار کرنا۔ ممکن نہیں

458

وانا لمسنا السماء فوجدناها ملئت حرسا شديدا وشهبا

اور ہم نے آسمان کو ”ٹٹولا“ تو اسے سخت پہروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا۔ (جن، 8)

وجہ اعتراض

یہ ہے کہ۔ ان کا کہنا ہے کہ آسمان کو ہم نے ”لمس“ کیا تو شہابوں سے بھرا ہوا پایا۔ حالانکہ وہ کبھی وہاں پہنچے ہی نہیں کہ انہیں ”مادی اسباب“ کی توانائی دیدہ نہیں رہی۔

قول فیصل

یہاں ”جنوں“ سے مراد وہ ”کماہن“ ہیں جو شعبدوں، ہاتھ کی صفائی اور نظر بندی کے خفیہ طریقوں سے لوگوں پر خدائی کر رہے تھے۔ وہ جب تک مسلمان نہیں ہوئے ان کا دعوے تھا کہ وہ

آسمانوں تک پہنچ کر غیب کی خبریں لاتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ جب مسلمان ہوئے تو اعتراف کرنے لگے کہ وہاں پہنچنا محال ہے یہ تو ہماری یوں ہی باتیں تھیں تاہم اگر اب بھی کوئی منکر مشاہدہ اس طرح کا دعوے کر بیٹھے تو اپنی سچائی ثابت نہیں کر سکتا۔ فمن يستمع الآن يجد له شهابا رصدا۔ اب اگر کوئی آسمان والوں کی باتیں سننے جائے گا تو پہلے ہی قدم پر اپنے سامنے بھسم کر دینے والے شہابوں کو تیار پائے گا۔ (جن، 9) بحکمہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمان ہونے سے پہلے بھی آسمان تک نہیں پہنچ پائے تھے لیکن لوگوں کے ”حواس“ پر چونکہ ان کا قبضہ تھا لہذا وہ جو بات بھی کہتے پاتے اعتبار کرنے والے موجود پاتے۔ تاہم عقیدے کی ”صحت“ کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام میں کوئی چیز بھی ”وہم“ اور خیال بندی کا

سارا نہیں بن سکتی تو انہوں نے سابقہ ماننے والوں سے خود ہی کہنا شروع کر دیا کہ۔ میاں اوپر کوئی نہیں جاسکتا شہایوں کی فرکشن سے پس کر رہ جائے گا۔ ہم تو تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے اوپر سے خبریں لانے کا ڈھونگ رہ جاتے تھے۔

اس مقام پر ”لمسنا“ کا لفظ قابل غور ہے جو صرف ”طلب“ کے معنے میں آیا ہے۔ کسی چیز کو چھونے اور ٹچ کرنے کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ اس طرح ”لمس“۔ التماس کا ہم مفہوم بن جاتا ہے۔ التماس یعنی گزارش اور طلب۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ۔ کائناتوں کی خواہش اور طلب بھی رہی ہوگی کہ وہ ان بلند یوں کو چھوئیں مگر راستوں میں ہمیشہ تاقبوں کی دیوار حائل پاکر اپنی خواہش اور طلب میں ناکام رہتے رہے اور آخر الامر مسلمانانہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنی ناسودہ خواہش کے بارے میں خود ہی وضاحت کر ڈالی۔ کہ فضائے بسیط کو سائنسی پاور کے بغیر پار کرنا۔ ممکن نہیں ہے۔



## جنوں کی عبادت گاہیں

459

وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احدا

(جن، 18)

بلاشبہ مسجدیں اللہ کی ہیں غیروں کو پکارنے کی جگہیں نہیں ہیں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں جنوں کے ضمن میں ”مساجد“ کا ذکر کیا معنے رکھتے ہیں؟

وجہ اعتراض

یہ اسلئے کہ جنہیں ”جن“ کہا گیا ہے وہ اصل میں انسان ہی تھے کہ ”عبادت گاہیں“ انسانوں ہی کی ہوتی ہیں۔

قول فیصل

8-3-96 جمعہ ملتان



مزمّل

## رتّل۔ کے معنے

460

ورتل القرآن ترتیلا

(مزل، 4)

اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

یہ ہے کہ اگر ”رتّل“ کے معنے ٹھہر کر پڑھنے کے ہیں تو اگلی آیت ”قول ثقیل“ سے کیا مراد ہے؟ میرا کہنے کا مقصد ہے کہ اگر قول ثقیل۔ بھی قرآن ہی ہے تو ”نزول“ سے پہلے ”ترتیل“ کیسی؟

وجہ اعتراض

نہ ”رتّل“ کے معنے ٹھہر کر پڑھنے کے ہیں اور نہ ہی ”قول ثقیل“ سے قرآن پاک مراد ہے۔ رتّل۔

قول فیصل

## مذثر

## 461

(4.5)

اور اپنے کپڑے صاف رکھو۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ کپڑوں کی صفائی بلاشبہ ایک اچھی خصلت ہے لیکن یہاں جس مقصد کے لئے ”تطہیر“ کا لفظ استعمال ہوا ہے اسکی وضاحت نہیں ہوئی۔

## وجه اعتراض

”عرلی“ میں۔۔۔۔۔مطہر الثباب۔ ”ایقائے عمد“ کو کہا جاتا ہے۔

## قول فیصل

## 462

عليها تسعة عشر

(30.74)

اس پر انیس نگرہاں ہوں گے۔

یہ ہے کہ۔ انیس کی تعداد کے مارے میں آگے چل کر فرمایا۔ ماذا اراد اللہ بهذا مثلاً۔

کافر کہتے ہیں کہ انیس کے عدد میں۔ مثال۔ کاکون سا پہلو پوشیدہ ہے؟

یہاں ”مثل“ کا لفظ بیان کردہ ”مثل“ نہیں۔ اس مفہوم میں ”استعارہ“ ہے کہ یہاں ”مثل“ کو ایسے

عجیب و غریب کلام سے نہ تھی کر دیا گیا ہے جو صرف ”استعجاب“ اور ”حیرت“ کو واضح کرتا ہو۔ اس

## قول فیصل



طرح معنی ہوں گے،

”اللہ نے حیران کن اور عجیب مثال بیان فرمائی ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔“



## ملائکہ جہنم کو بھر دیں گے؟

463

وما جعلنا اصحاب النار الا ملائكة

(مذثر، 31)

اور ہم نے فرشتوں ہی کو ”اصحابِ نار“ بنایا ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ۔ الفاظ کی موجودہ سیٹنگ (SETTING) سے مترشح ہوتا ہے کہ جہنم میں صرف فرشتے ہی جائیں گے جبکہ ملائکہ مقصود ہے کہ جہنم مجرموں کا ٹھکانا ہے۔

قول فیصل جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کوئی بھی اہل زبان اس کا قائل نہیں ہے۔ ”اصحاب النار“ کا مفہوم یہ ہے کہ۔ ہم نے دوزخ کے داروغے اور نگران فرشتے ہی بنائے ہیں۔ علامہ ہمدانی لکھتے ہیں۔ اصحاب

النار بمعنی انه و کلہم بتعذیب اهل النار۔

اللہ نے اہل نار کی سزا ان فرشتوں ہی کے سپرد کی ہے اب یہ فرشتے ہی جہنم کے با اختیار مالک اور داروغے ہوں گے۔ ☆ (تشابہ القرآن طبع مصر صفحہ 670)

قیامت

## چاند کے بے نور ہو جانے کا مقصد

464

وخسف القمر

(قیامت، 8)

چاند کا زور ٹوٹ گیا۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ چاند کے بے نور ہونے کے معنی کیا ہیں جبکہ اس کا نور سورج سے مستعار ہوتا ہے۔

قول فیصل یہاں بے نور ہونا۔ ”زور ٹوٹنے“ کا استعارہ ہے اور یہ اشارہ ہے ان عربوں کے ہزیمت اٹھانے کی طرف جو محمد سید البشرؐ کے خلاف صف آراء ہو کر طرح طرح کی اذیتوں کا باعث بنے تھے۔ اور یہ

چاند زمانہ جاہلیت میں عربوں کا ”قومی“ نشان تھا اور غیر عرب ہمسائے ”سورج“ کو مانتے تھے۔ لیکن حالات موجودہ چاند

والوں نے سید البشر ﷺ کو زچ و وق کیا گھر میں محصور اور کعبہ سے دور رکھا۔ عزیز و اقارب کو شدید اذیت سے دوچار کیا جسے کہ گھر سے نکال بھی دیا آپؐ نے بعض اقارب اور ساتھیوں کو لے کر حبشہ میں پناہ لی اسپر بھی چاند والے حبشہ پہنچ گئے اور نجاشی سے آپؐ اور آپؐ کے رفقاء کی سپردگی یا مکہ کو واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ مدینہ پہنچے تو ان کا تعاقب جاری رہا۔ بدر اور احد کے میدانوں میں اللہ والوں کے خون کی ارزانی رو بار بھی گئی غرض کہ اذیت کا ہر مرحلے پر پورا سا زور سامان کیا گیا ایسے میں اللہ سبحانہ نے اپنی عادت کے مطابق حق پرستوں کو نہ صرف ”نوید کا مرانی“ سنائی کفار کی ”ہزیمت“ میں پوری پوری نصرت بھی بہم پہنچائی۔ اور اس طرح بالآخر اللہ نے ”چاند والوں“ کا زور توڑ دیا اور ان کے چاند کی تابانی جاتی رہی کہ خسف کے ایک معنی لاغر و نحیف اور کمزور کے بھی ہیں خاسف العین۔ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہوں یعنی انکی تابانی اور چمک کا پتہ ہی نہ چلتا ہو۔ اس طرح خسف زور ٹوٹنے، توانائی سے محروم ہونے اور ہزیمت اٹھانے کا استعارہ ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن والوں کی فتح و نصرت نے ثابت کر دیا۔



## سورج اور چاند کامل جانا

465

### و جمع الشمس والقمر

(قیامت، 9)

اور سورج و چاند اکٹھے ہو جائیں گے / یا کر لئے گئے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہ امر بظاہر محال ہے۔ یہ ”ٹڑے“ کوئی پانی کے بلبلے نہیں کہ ایک دوسرے میں

تحلیل ہو جائیں۔

وجہ اعتراض

اللہ کے ہاں جس طرح ”عمل اتصال“ (جدا کرنے کا) ایک ”قانون“ ہے اسی طرح ”عمل

قول فیصل

اتصال“ اور جمع کرنے کا بھی قانون ہے اور کچھ ضروری نہیں کہ ہم نے اللہ کے ہر قانون کا احاطہ

کر لیا ہو یا اسکی کُنہ معلوم کر کے اپنے ”پیائے فہم“ کے مطابق۔ کوئی ”تصور“ دیا ہو۔ تاہم ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک کوئی

بات ہمارے مشاہدے میں نہ آئی ہو ہم تاویل کا سہارا لے کر اپنے کعبہ فکر کو درست کر سکتے ہیں اس طرح اسے اگر پیشگوئی

کے زاویہ سے دیکھا جائے تو نہ اچھبہ رہتا ہے نہ حیرانی سے واسطہ پڑ سکتا ہے کیونکہ چاند اگر عرب کا نشان اور ”مونو“ تھا تو

سورج غیر عربوں کا ”شعار“ اور قوی نشان تھا۔ جب نبی اکرم ﷺ تشریف لائے تو آپؐ کا پہلا واسطہ کفار عرب سے پڑا

اور آپؐ نے مسلسل ان کی اذیتوں کا سامنا کر کے بالآخر انہیں شکستِ کامل سے دوچار کر ڈالا اب یہ چاند پرستی سے دست

بردار ہو کر اہل توحید اور سنی کی صفوں میں شامل ہو چکے تھے پھر ایسا بھی ہوا کہ یہ لوگ دل و جان سے سید البشر ﷺ

کے معاون اور ”ساتھی“ بن گئے اور نبی اکرم ﷺ کے ان ہی ساتھیوں نے اسلام کے بڑے حریفوں یعنی سورج والوں سے

دفاعی جنگیں لڑیں اس طرح ”قادیہ“ کے میدان میں سورج والے شکست کھا کر۔ یہ مسلمانوں سے مل گئے اس طرح

سورج و چاند ایک ہو کر ایک نئی ”آئیڈیالوجی“ کے حامل بن گئے جو نہ چاند کے رہے اور نہ سورج کے اب وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد پا چکے تھے زمین اب اللہ کے نورِ توحید سے معمور اور منور ہو چلی تھی۔ سب محمدؐ کے متوالے بن گئے سب توحید اور قرآن کے جیالے کہلائے یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا جو محمد سید البشر ﷺ نے چاند و سورج کے اصنام پاش پاش کر کے برپا کیا۔ اب چاند (عرب والے) اور سورج (عجم والے) ایک ہی آئیڈیالوجی کے حامل ہو کر باہم دگر مل چکے تھے۔



## دیکھنا آنکھ کا عمل ہے چہرے کا نہیں

466

### وجوہ یومئذ ناضرة الی ربہا ناظرة

کچھ چہرے ہشاش بشاش ہوں گے جو اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ (قیامت، 22-23)

یہ ہے کہ۔ دیکھنا آنکھ کا عمل ہے جبکہ آیہ ہذا میں دیکھنے کو چہرے کا عمل بتلایا گیا ہے دوسرا یہ کہ یہاں اللہ سبحانہ کو دیکھنے کی بات کی گئی ہے۔

وجہ اعتراض

عرفی میں ”نظر“ اور ”رویت“ میں فرق ہے نظر کو اگر آنکھ سے مربوط کیا جائے گا تو اس کے معنی دیکھنے کی خواہش کرنے کے ہوں گے۔ جو واضح الفاظ میں کسی چیز کی ”معرفت“ اور اسکی

قول فیصل

”ماہیت“ سے آگاہی حاصل کرنے کے ہوں گے مثال ہے۔ نظرت الی الشیء فلم ارہ۔ میں نے اس چیز کو دیکھا اسکی ”ماہیت“ تک نہ پہنچ سکا یعنی اسکی ماہیت اور معرفت اور کنہ معلوم نہ ہو سکی۔ اسی طرح ایک مثال ہے ونظرت الیہ حتی رأتیہ۔ میں نے اسکی طرف دیکھا حتیٰ کہ سب کچھ پالیا۔ اسی طرح عربوں کے ہاں نظر۔ کو ”ہست سی“ اضافتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ غصے میں ڈوٹی ہوئی نگاہ۔ پیار کی نظر۔ اچھتی نگاہ وغیرہ۔ لیکن۔ رویت کے لئے اضافتوں کی کثرت نہیں ملتی۔ رویت اور نظر کے اس فرق کے بعد یہاں نظر کو رویت کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ (ہمدانی صفحہ 673)

بات صاف ہو گئی کہ اس دن چہرے ہشاش بشاش ہوں گے جو اپنے رب کی تخلیقات کی ”ماہیت“ اور غایت معلوم کرنے میں لگے ہوں گے یہی بات کہ دیکھنا چہرے کا عمل نہیں ہے تو یہاں ”وجوہ“ سے صرف جسم کا وہ حصہ مراد نہیں جو گردن اور ناک سے ملحق ہے اور جس میں دو آنکھیں چمک رہی ہیں بلکہ ”وجوہ“ یہاں پورے ”جسم انسانی“ کا استعارہ ہے عرفی میں وجوہ نمایاں اور بڑی شخصیات کو کہا جاتا ہے بلکہ ہم بھی اپنی زبان میں کہتے ہیں۔ فلاں تقریب میں بڑے بڑے چہرے موجود تھے۔



## نطفہ اور منی میں فرق

467

## الم يك نطفة من منى يمني

(قیامت، 37)

کیا وہ ”منی“ کا ایک نطفہ نہیں تھا۔

میں کہا جاتا ہے کہ نطفہ اور منی ایک ہی چیز ہے ان کی ایک دوسرے کی طرف اضافت نہ ہونی چاہیے۔

وجہ اعتراض

اضافت کے الفاظ جب مختلف ہوں تو ایک دوسرے کی طرف اضافت ہو سکتے ہیں۔ نیز۔ منی کی ”مقدار“ نہیں ہوتی جبکہ نطفہ ”نوند“ دو بوند سے زیادہ نہیں ہوتا۔

قول فیصل



## عورت کسی کی پسلی سے پیدا نہیں ہوئی

468

## فجعل منه الزوجين الذکرو الانثی

(قیامت، 37)

پھر قطرہ منی سے زروادہ کے جوڑ پیدا کئے۔

یہ ہے کہ یصال عورت و مرد کا ذکر اگرچہ نہیں ہے کہ ذکر سے ”نر“ اور انثی سے ”مادہ“ کا مفہوم

ہی لیا گیا ہے تاہم اسے اگر مرد و عورت سے مربوط کیا جائے تو دونوں کی تخلیق کے زاویے مختلف ہو جاتے ہیں یعنی دونوں اپنے اپنے رنگ میں مستمندانہ مخلوق ثابت ہوتے ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ عورت کو اپریشن کر کے مرد کی پسلی سے نکالا گیا ہے غلط ثابت ہو جاتا ہے حالانکہ قرآن ہی یہ گواہی بھی دیتا ہے کہ عورت و مرد ایک نفس سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ درست ہے کہ نساء میں فرمایا گیا ہے اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة فخلق

منہا زوجھا لیکن یصال ”نفس“ سے مراد ”جنس“ ہے یعنی اس اللہ سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی جنس سے پیدا کیا یعنی اسی جنس سے تمہارا جوڑ بنایا (نساء، 1) ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مرد تو قطرہ منی سے۔ تخلیق ہو اور عورت پلاسٹک سرجری کے ذریعہ مرد کے جسم سے الگ کر دی گئی ہو۔ بلکہ ایسا بھی نہیں ہوا کہ رپچھ کے لئے بندریا۔ اونٹنی کے لئے بیل کو جوڑنا کہ ہم جنسی کا قانون توڑا ہو۔

نمبر 2۔ نساء (1) میں ”منہا“ کا ضمیر ذنسا کی طرف راجع ہے جو عربی میں مؤنث ہے اور

انسانی جوڑ کی آفرینش کا بنیادی سبب بھی ”نفس واحدہ“ کو قرار دیا ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس دلیل اور ضابطہ انسانی کے ماتحت نفس سے مراد آدم لیا گیا ہے؟ کیا آدم مؤنث تھا؟ کیا حوا کو دوسری صفت نازک آدم سے پیدا کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ انسان اول اور اس کا ساتھی الگ الگ نطفوں مگر ایک ہی

قول فیصل

جنس سے پیدا ہوئے خود قرآن محکم نے دوسرے مقامات پر یہی تصور اُبھارا ہے کہ عورت مرد کی ہم جنس ہونے کے باوصف الگ نطفے کی تخلیق ہے کسی کے جسم کا حصہ ہے نہ عملِ جراحی کے ذریعہ الگ کر دی گئی۔ فرمایا۔ **انہ خلق الزوجین الذکر والانثیٰ من نطفۃ اذا تمنیٰ**۔

(نجم، 46) بلاشبہ رب قدیر نے نروادہ کی صورت میں قطرۂ منیٰ ہی سے جوڑے پیدا کئے۔

بلکہ زور دے کر فرمایا **فلینظر الانسان مم خلق؟ خلق من ماء دافق**

انسان اپنی تخلیق پر غور کرے کہ کس چیز سے پیدا ہوا؟ یہ بات اُس کے علم میں ہے کہ وہ اچھلتے

ہوئے پانی (قطرۂ منیٰ) سے پیدا ہوا ہے۔ (طارق، 5، 6)

یہاں ”الانسان“ میں الف و لام برائے ”جنس“ ہے یعنی تمام نوع انسان ”ماء مدفوق“ (قطرۂ منیٰ) کے ذریعہ تخلیق ہوئے۔ حوا ہو خواہ مسیح ان کی آفرینش قانونِ فطرت ہی کا شاہکار ہے اور قانونِ قدرت میں نہ تبدیلی آتی ہے نہ ٹوٹ پھوٹ۔ ویسے اگر کوئی صاحبِ فرماں کہ حوا آدم کی پہلی اور مسیح بن باپ اور انسان ابتداء میں یوزنہ تھا تو اسکے کہنے پر کیا پابندی ہے امام اعظم ابو حنیفہ (763 م) فرماتے ہیں،

قیل ان الاله ذو ولد = قیل ان الرسول قد کھنا لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ۔ صاحبِ لولاد ہیں اور محمد سید البشر کا بن اور غیب کی باتیں بتانے والے تھے پس جب اللہ اور رسول کوگوں کی زبان سے محفوظ نہ رہ سکے تو میں ابو حنیفہ کس باغ کی مولیٰ ہوں کہ مجھے معاف کر دیا جائے گا؟ 9-3-96



دھر

## دو نطفوں کا مکسر وجہ۔ تخلیق کائنات

469

### من نطفۃ امشاج

(دھر، 2) انسان دو نطفوں کے امتزاج اور اختلاط سے پیدا ہوا۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں ”امشاج“ جمع ہے جبکہ نطفہ مفرد۔

وجہ اعتراض

زمخوری (1144 م) کہتے ہیں کہ ”امشاج“ کی جمع ہے ہی نہیں۔ یہ مفرد ہے اور مفرد ہی کے طور پر

قول فیصل

نطفہ کا وصف بنا ہے اس میں یہ وضاحت مطلوب تھی کہ عورت کے بھی مخصوص پانی ہوتا ہے جو

مرد کے پانی سے رکن ہو کر ذریعہ تخلیق بنائے اگر مادہ کا یہ مخصوص پانی نہ ہو تو نر کے قطراتِ منیٰ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے بلکہ



ان پر ”امشاج“ کا اطلاق غیر آئینی بات ہے۔



## ابتلا۔ کسے کہتے ہیں؟

470

نبتلیہ فجعلناہ سمیعاً بصیراً

(دہر، 2)

ہم اسے ابتلا میں ڈالتے پھر سماعت و بصارت والا بناتے ہیں۔

یہ ہے کہ۔ انسان ابھی۔ سمیع و بصیر بنائی، نہیں اس پر ابتلا۔ کا دور آیا تو کیسے آیا؟

وجہ اعتراض

یہاں ”ابتلا“ کسی مصیبت میں پھنس جانے کے مفہوم میں، نہیں ہے ایک ”حالت“ سے دوسری

قول فیصل

”دوسری حالت“ میں منتقل ہونے کا استعارہ ہے مثلاً یہ حضرت انسان رُمّی کا پتلا تھا اس میں

”جرثومہ حیات“ رکھا گیا اس جرثومہ نے منی کی شکل اختیار کر لی اور پھر لو تھڑے میں تبدیل ہو گئی پھر لو تھڑا گوشت بنا پھر یہ گوشت ہڈیوں کا لباس بنایا گیا پھر اس پر آفریش کا آخری مرحلہ نمودار ہوا یعنی اب اسکی روح بھی ڈال دی گئی۔

(خلاصہ از مومنون، 14)

☆

## چاندی شیشہ کیسے بن گئی؟

471

قواریر قواریر من فضة

(دہر، 16)

اور شیشے بھی چاندی کے جو ٹھیک انداز سے بنائے گئے۔

میں کہا جاتا ہے کہ ”قواریر“ شیشے کی جنس ہوتی ہے اور چاندی الگ نرم اور قیمتی دھات کا نام ہے

وجہ اعتراض

۔ وجہ مناسبت کیا ہے؟

چاندی کو اس حد تک پالش کیا جائے کہ اسکی شیشے کی سی چمک پیدا ہو تو اسے مجازاً شیشہ ہی

قول فیصل

کہا جاسکتا ہے۔ وجہ مناسبت وہ چمک ہے جو اسکی پیدا کر دی گئی ہے حتیٰ کہ اس میں چہرہ بھی دیکھا

☆

جاسکتا ہے۔

## جنتی بچوں کی موتیوں سے تشبیہ

472

ویطوف علیہم ولدان مخلدون اذاریتہم حسبہم لولوا منشورا

(دہر، 19)

ان کے بچے ہمیشہ ان کے ساتھ ہوں گے انہیں جب دیکھو گے تو یوں محسوس ہوگا بھرے موتی ہیں۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ یہاں چٹوں کو ”لولو منشور“ (بکھرے موتی) کہا منظوماً۔ (پروئے ہوئے) نہیں کیا۔

**قول فیصل** بکھرتے موتیوں میں ہنوز سوراخ نہیں ہوتے لہذا انکی چمک دمک اور آب و تاب دوچند ہوتی ہے جبکہ پروئے ہوئے موتیوں میں وہ رونق نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے جو مقابلتا قابلِ تحسین ہو۔

## موسسات

جب بات کرنے کی اجازت ہی نہ ہو

473

هذا يوم لا ينطقون ولا يؤذن لهم فيعتذرون

آج وہ بات ہی نہ کر سکیں گے اور نہ ہی عذر و معذرت کی اجازت ہوگی۔ (مرسلات، 35، 36)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ یہاں عذر و معذرت کی اجازت نہ دینے سے بات کرنے کی نفی ہو جاتی ہے ایسے میں پہلے سے کہہ دیا کہ وہ بات نہ کر سکیں گے وجہ مناسبت کیا رکھتی ہے ؟

**قول فیصل** مجرم چونکہ ”نفسیاتی“ خوف میں بھی مبتلا ہوتا اور کچھ کہنے کی مہمت مفقود پاتا ہے لہذا پہلے پہل اس کی زبان کی لڑکھاہٹ اظہار سے قاصر رہتی ہے۔ تاہم اسے اگر کہہ دیا جائے کہ ڈرو مت اپنی بات کہہ دو تو وہ بولنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن اگر عذرو معذرت ہی کی نفی کر دی جائے تو وہ جس طرح اہم بات کرنے سے قاصر رہا اسی طرح بعد میں بھی قاصر ہی رہے گا۔ تاہم اسکے یہ معنی نہیں کہ مجرم کو انصاف بھی نہیں ملے گا؟ یہاں ”یوم“ کا لفظ ”نکمرے“ کے مقام پر لیا ہے جس سے کوئی خاص وقت مراد نہیں ہے فیصلے سے پہلے کسی بھی وقت ایسی حالت پیش آسکتی ہے یا پھر تحقیق و تفتیش کے دوران ایسے مواقع آسکتے ہیں کہ مجرم کو بولنے کی اجازت نہ ہوگی اور دوسرے ہی ”موقف“ پر اسے اجازت ہوگی کہ اپنی صفائی میں جو کہنا ہے کہہ دے۔ ☆

فیصلہ پہلے ”ڈگری“ بعد میں

474

هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنَاكُمْ وَالْأُولَى

یہ فیصلہ کا یوم ہے جہاں تمہیں اور تم سے پہلوں کو اکٹھا کیا جائے گا۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ فیصلہ اگر آخرت میں ہو گا تو یہ جو احادیث میں آیا ہے کہ مکرو نکیر کے سوال و جواب کے نتیجہ میں جو ”جہنمی“ ہو گا وہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہی میں دھکیل دیا جائے گا اور جو ”جنتی“ ہو گا وہ جنت ہی میں بھیج دیا جائے گا۔ تو اس حدیث کا کیا بنے گا؟

**قول فیصل** قبر میں جب زندگی ہی نہ ہوگی تو حساب و کتاب کیسے ہوگا؟ بلکہ منکر و نکیر کے ”فرضی“ سوال و جواب کے نتیجہ کو ”یوم الدین“۔ یا یوم الفصل کہا ہی نہیں جاسکتا ڈگری (فیصلہ) ملنے سے پہلے نہ عذاب ہوگا نہ ثواب وصلہ۔ اس سے پہلے آپ لاکھ چاہیں کہ ”کھجور کی لامبی لامبی“ ”چھڑیاں“ لے کر اہل قبور سے منکر و نکیر کو بھگادیں قبر والوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچ پائے گا کہ اب نہ ان کا جسم باقی ہے نہ جسم کے اجزاء۔ نہ روح کا مسکن قبر ہے۔



سورۃ عم

اللہ۔ ہر چیز کا حساب رکھتا ہے

475

وکل شیء احصینہ کتابا

(عم، 29)

ہم نے ہر چیز کو کتاب میں ضبط کر رکھا ہے۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ لکھے ہوئے کا سہارا لینے سے بے نیاز، پاک و منزہ ہیں۔

وجہ اعتراض

تحریر میں لائی ہوئی چیز زمانہ قدیم ہی سے ”نا قابل شک“ تصور کی جاتی رہی ہے۔ لہذا سے ”مستند“ گواہی اور رعایا کے حالات کو ریکارڈ کے طور پر محفوظ رکھنے کے لئے ہر دور کے ملوک و سلاطین اس ہی سے کام لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”لکھی ہوئی“ چیز کی اہمیت اور وقعت قدیم ہی سے ذہنوں میں رائج تھی لہذا خدائے الایزال نے اپنے ”علم محیط“ کو تحریر ہی سے ”تشبیہ“ دے کر نا قابل شک، ٹھہرایا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔



خدا کے پڑوس میں گھر بنانا

476

فمن شاء اتخذ الی ربہ مآباً

(عم، 39)

پس جو چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانہ بنائے۔

یہ ہے کہ۔ فمن شاء اتخذ الی ربہ مآباً۔ گرائمر کی رو سے شرط کی جزا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ

وجہ اعتراض وہ شرط کہاں ہے؟ کیونکہ تنہا ”شاء“ کا فعل شرط بننے کی صلاحیت سے قاصر ہے جب تک اس کا مفعول بیان نہ ہو اس کا ذکر بے سود ہوگا اور اگر اسی عبارت کو مشروط ہی تسلیم کر لیا جائے تو پھر سوال ہوگا کہ اسکی ”جزا“

کہاں ہے؟

## قول فیصل

اسکا مفہوم ذیل کی آیت کی طرح ہے، فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر (کہف، 29)۔ یہاں ”شاء“ کا فعل دوسرے آئے اور دونوں مرتبہ ہی مفعول کا ذکر نہیں ہے تاہم معنی ہوں گے، جو ایمان چاہتا ہے ایمان لے آئے جو کفر چاہتا ہے وہ کفر ہی اختیار کر لے۔ (کہف، 29)

یعنی وہ اپنے ”اختیار“ میں ”آزاد“ ہے۔

یہاں ”مآباً“ کا لفظ قابلِ غور ہے جو عام طور پر مکان، جگہ اور ٹھکانے کو کہا جاتا ہے لیکن اس کے معنی ”ساتھ دینا“۔ اطاعت گزاری کرنا اور اللہ کے قوانین کی طرف راجع ہونا بھی ہیں اور یہی معنی صحیح بھی ہیں۔ داؤد علیہ السلام کے لئے بڑے لوگوں اور رسالہ فوجوں کو حکم دیا گیا تھا کہ ”اوتی“ معاً اس کا ساتھ دو اور حکم احکام مانو۔ اسی طرح ایک مقام پر فرمایا۔ کل لہ اواب۔ ہر چیز اس کے قانون پر عمل پیرا ہے اس طرح مآباً۔ کے معنی ہوں گے حاجت روائی اور ”قانون سازی“ کے لئے اللہ کی جانب رجوع کرنا۔



## نازعات

### فرشتے مذکر ہیں یا مؤنث؟

477

والنازعات-----والناشطات-----والسابحات-----فالسابقات-----

(نازعات، 477)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ یہ تمام ملائکہ کے اوصاف ہیں اور مؤنث ہیں جبکہ فرشتے مؤنث نہیں ہوتے۔

## قول فیصل

فرائض کے لحاظ سے یہ سب فرشتوں کے گروہ اور لولیاں ہیں انہیں ”الطوائف والفرق“ بھی کہا جاتا ہے اس طرح ”مذکر“ صفات ان سے مربوط نہیں ہوتیں لہذا وہ نہ مؤنث ہوتے ہیں اور نہ مذکر۔ تاہم ”الفرق“ یا ”الطوائف“ ہونے کے ناطے سے مؤنث صیغوں میں انہیں لایا جاسکتا ہے۔

### دل کی آنکھیں نہیں ہوتیں

478

قلوب یومئذ واجفة ابصارها خاشعة

دلوں پر خوف و ہشت طاری ہوگی اور ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی۔

وجہ اعتراض یہ ہے کہ یہاں ابصارہا۔ میں ”ہا“ کا ضمیر ”قلوب“ کی طرف راجع ہے یعنی دل کی آنکھیں جبکہ

عربیت کے لحاظ سے قلوب۔ کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔

**قول فیصل** اسی سورہ کی دسویں آیت میں ”یقولون“ کا قرینہ واضح کرتا ہے کہ یہاں ”ابصار“ سے مراد دل کی آنکھیں نہیں۔ ”صاحبانِ نظر“ مراد ہیں۔ تاہم ہمارے اردو محاورے میں ”دل کی آنکھیں“ کھولنا بھی مستعمل ہے۔ اس بنا پر معنی ہوں گے۔ اس دن خوف و ہشت طاری ہوں گے اور صاحبانِ نظر کی آنکھیں جھکی ہوں گی۔

عبس

رسول اللہ کے اخلاق و ایمان پر مصفیٰ کی یلغار

479

### عبس و تولیٰ ان جانہ الا عمی

بہت بُرا کیا اس نے تیوری چڑھائی اور نابینا کے آنے پر منہ پھیر لیا۔ (عبس، 3۳-۱)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ۔ ”طبری“ کے مطابق ایک بار نبی اکرم ﷺ کفار مکہ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک نابینا کن ام مکتوم بھلی نبویؐ میں پہنچ گیا۔ آپؐ نے اس کے بے وقت آنے پر جنینِ اقدس پر دشمن ڈالے اور بات کرنے کی بجائے، منہ پھیر لیا وغیرہ شانِ نبوت کے منافی اس واقعہ کو حقیقت کے لباس میں پیش کرنے کے لئے امام رازی (1210 م) لکھتے ہیں،

اجمع المفسرون علی ان الذی عبس و تولیٰ هو الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام واجمعوا علی ان الا عمیٰ هو ابن مکتوم۔

گروہ مفسرین کا اجماع ہے کہ عبس و تولیٰ سے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور نابینا سے ابن مکتوم مراد ہیں۔ (تفسیر رازی طبع مصر جلد 31/55 نیچے کی دو سطریں)

**قول فیصل** جنہوں نے بغیر کسی دلیل و برہان کے ”عبس“ اور ”تولیٰ“ جیسے ”اخلاق سوز“ امور کا فاعل نبی اکرم ﷺ کو بنا کر شانِ نبوت کو ”خرافات“ کے سمندر میں ڈبو دینے کی جسارت کی ہے انہوں نے بہت بُرا کیا ہے وہ امتِ اسلام کے افراد ہو کر نامعلوم اپنے ایمان کے بارے میں گمراہی میں گئے اور کیوں نہ ایسا ہو کہ گستاخی رسولؐ کی پاداش میں ان کی بیٹھوں کو دروں سے گرمایا گیا یہاں عبس اور تولیٰ۔ کا ”فاعل“ نامعلوم ہے اور وہ یقیناً ان وڈیروں اور سرداروں میں سے کوئی ناہنجار ہو گا جو نبوت کے اہداف و مقاصد میں رکاوٹیں ڈالنے کے لئے عبس اور تولیٰ۔ کا مظاہرہ کر بیٹھا ہو گا۔ اسی طرح ”الا عمیٰ“ سے ابن مکتوم مراد لینے کے نہ قرائن ہیں نہ ”شواہد“۔ صرف ”بے دین“ مفسروں کی ملی بھگت سے ”دامِ نبوت“ کو داغدار بنانے کا عقیدہ کشید کر لیا گیا ہے جبکہ اجماعِ مفسرین یا اجماعِ امت میں نہ دین مٹنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی کوئی اجماعِ قرآن کی نوک و پلک درست کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ یہاں عقبہ بن ابی



ربیعہ اور ابو جہل بن ہشام جیسے خبیثا محل نبویؐ میں براجمان تھے وہ یقیناً اپنے سماجی رتبہ کے پیش نظر تیوری چڑھانے اور منہ پھیرنے کی بد اخلاقی کر بیٹھے ہوں گے لیکن اہل تفسیر جو صدیوں بعد تشریف لائے ان پر منکشف ہوا کہ عبس۔ قولی۔ کے اخلاق ہر ممکن عمل کے فاعل تو خود نبی اکرم ﷺ ہی تھے۔ العیاذ باللہ۔ راقم نے محدثوں اور مفسروں کی اس گستاخی رسولؐ کا شدید نوٹس لیا ہے علمی اور فنی جائزوں کے لئے ملاحظہ ہو ”برہان القرآن“۔



تکویر

## آتش پرستوں کا زوال

480

### إذا الشمس كورت

(تکویر، 1) جب سورج کی بساط پلیٹ لی جائے گی۔

یہ ہے کہ سورج اتنا چھوٹا جسم نہیں ہے کہ چٹائی کی طرح پلیٹ لیا جائے یا اس حد تک رڈیوز ہو کہ لپیٹا جاسکے۔

وجہ اعتراض

یہاں تکویر سے ”سورج پرستوں“ کی بساط لینے جانا مراد ہے جو ”سیاسی زوال“ کا استعارہ ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عجم میں مجوسی راج ختم ہوا اور اسلامی حاکمیت کا آغاز ہو گیا۔

قول فیصل



## کفار کے بچوں کو عذاب نہ ہوگا

481

### وإذا المودة سئلت باى ذنب قتلت

(تکویر، 8,9) جب زندہ گاڑی بچیوں کے بارے میں سوال ہوگا کیوں قتل کی گئیں؟

یہ ہے کہ یہاں بات مقتول کے ناطے سے چلائی گئی ہے جبکہ موزونیت قاتل کے حوالہ سے تھی۔

وجہ اعتراض

یہاں ”گرفت“ کو یقینی بنانے کے لئے عرب کے ایک اسلوب کا سہارا لیا گیا ہے کہ وہ قاتل کی زجر و توقیع اور تعزیر کے لئے ”مقتول“ کے ناطے سے بات کرتے تھے۔

قول فیصل

نمبر 2۔ میں کہا جاتا ہے کہ یہاں جاہلیت کی ایک رسم بد۔ کا تذکرہ ہوا ہے جس سے ہمارا کوئی واسطہ

وجہ اعتراض

نہیں ہے۔

یہاں قرآن حکیم نے زمانہ کفر و جاہلیت میں قتل کی جانے والی چیخوں کے حوالے سے یہ ذہن نشین کر لیا ہے کہ بچے کافروں کے ہوں یا مسلمانوں کے انہیں کسی بھی وجہ کو سامنے رکھ کر قتل کرنا جرم ہے۔ یہی بات کہ غیر مسلمہ مقتول بچوں کو عذاب نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ اگر ان کے قتل کو جرم کہا گیا ہے تو ”عذاب“ کس زاویہ سے ہوگا۔



## اپنے حالات سے کوئی کوئی آگاہ ہوگا

482

### علمت نفس ما احضرت

(تکویر، 14) جب ہر نفس جو پیش کرے گا اے جان لے گا۔

یہ ہے کہ یہاں ”علم“ کو ایک ہی نفس سے مربوط کیا ہے حالانکہ ہر نفس کو اپنے کئے کا علم ہوتا ہے۔

وجہ اعتراض

یہ عرب کے ان استعمالات میں سے ہے جو ”مدلول“ و معنی کے برعکس استعمال میں آتے ہیں بلکہ

وحی قرآن نے متعدد مقامات پر خود بھی اسے استعمال کیا ہے مثلاً۔۔۔ ربما یود الذین کفروا لو

کانوا مسلمین

یہاں ”رب“ کو ”کمیت“ برائے ”کثرت“ کے لئے استعمال فرمایا ہے اور معنی ہوں گے،

(حجر، 2) بہت سے کافروں کی خواہش ہوگی کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔

نیز فرمایا۔ وقد تعلمون انی رسول اللہ الیکم

(صف، 5) تم سب جانتے ہو کہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں۔

ان آیات میں ”ربما“ اور ”قد“ تقلیل کے ہونے کے باوصف ”تکثیر“ کے لئے آئے ہیں۔



## مشینی سوار یوں کی آمد آمد

483

### واذا العشار عطلت

جب اونٹنیوں پر سواری بے کار ہو جائے گی۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں۔ اونٹ سواری کے معطل ہو جانے کی پیشگوئی کی گئی ہے جبکہ کئی مقامات پر

وجہ اعتراض

واضح کیا گیا ہے کہ اگر بار برداری کے یہ جانور نہ ہوتے تو تم دور دراز کے مقامات تک بہ دشوار پہنچ پاتے۔

## قول فیصل

یہاں لونٹوں اور لونٹنیوں سے تمام وہ جانور مراد ہیں جو بار برداری اور سواری کے کام آتے ہیں جیسے کہ بر فانی کتے بھی شمار ہو سکتے ہیں۔ ان کے معطلی ہونے کے معنی۔ مختصر ہونے کے ہیں۔ کیونکہ یہاں آنے والے دور کے بارے میں بتلایا گیا ہے کہ علم سائنس کا دور ہوگا۔ مٹینی سواریاں، موٹر، ریل، بحری جہاز، پہلی کاپڑ، ہوائی جہاز اور جمجمہ تحلیل کر کے ریڈیائی سفر۔ عام ہوگا جس سے سابقہ مواصلات کے تمام ذرائع معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

اسی طرح اسی سائنسی دور میں یہ بھی ہوگا کہ ٹیلیفون، ٹیلیگرام۔ فیکس اور دیگر ذرائع ”مکالمہ“ اتنا عام ہوں گے کہ ساری دنیا ایک مٹھی میں آجائے گی۔ فرمایا۔ واذا النفوس زوجت جب سانسوں (یعنی ”مکالمی کے ذریعہ) دور۔ پرے کے انسانوں کو ملا دیا جائے گا۔ اور اسی دور میں یہ بھی ہوگا کہ اندھے قتل کا سراغ لگانے کو آسان اور ممکن بنادیا جائے گا فرمایا۔ واذا الموءدة سئلت۔ اور جب زندہ مقتولوں کی بابت زبان پر آجائے گی۔ 96-3-10 ملتان



انفطار

## پیار بگاڑ بھی دیتا ہے

484

## یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکریم

اے انسان تمہیں رب کریم کے سامنے گستاخی سے پیش آنے پر کس نے اُکسایا۔ (انفطار، 7)

یہ ہے کہ یہاں دیگر صفات کو چھوڑ کر صفتِ کرم کا بطور خاص ذکر کرنے میں کیا مصلحت پنہاں ہے؟

## وجہ اعتراض

یہاں سرکشی کے اس ”نفسیاتی“ سبب کی نشان دہی کی گئی ہے جو سلاوقات احسان ناشناسی کے پیکر

## قول فیصل

میں ظہور میں آتا ہے مثلاً۔ آپ بچے سے پیار کرتے ہیں اور وہ بھڑکتا ہے تو کہنے والے کہتے ہیں اسے باپ کے ”لاؤ“ اور پیار نے بگاڑا ہے۔ اس ضمن میں حضرت علیؑ سے ایک روایت ہے کہ آپ نے ایک بار اپنے ملازم کو متعدد بار پکارا مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ جب سامنا ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ۔ کیا وجہ بنی تم نے میرے بلاوے کا جواب نہیں دیا؟ اس نے جواب دیا مجھے اعتماد تھا کہ آپ ناراض نہ ہونگے اور مجھے کچھ نہ کہیں گے۔۔۔۔۔

عرب والے کہتے ہیں کہ ملازموں پر نوازشات اور ”نرمی“ انہیں ”گستاخ“ بنادیتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ماغرک بربک الکریم۔ کا فقرہ۔ اسی نوعیت کا استعارہ ہے ورنہ تو اللہ کا کرم۔ کسی نافرمانی اور گستاخی کا موجب کیسے بن سکتا



ہے؟

## صوت اور صورت کا امتیاز

485

### فی ایّ صورة ما شاء ركبك

(انفطار، 8)

جون سی صورت میں چاہا تمہیں ترکیب دے دیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں انسان کو انسانی صورت میں پیدا کرنے کی بات، نہیں کی گئی جس سے شبہ گزرتا ہے کہ انسان پہلے پہل رکسی اور شکل میں پیدا کیا گیا ہو گا خاص کر ”ایّ“ کا حرف تبدیلی

وجہ اعتراض

صورت کا غماز ہے۔

”آفریش“ کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے اور ایک ہی رہے گا۔ ”جون سی“ صورت میں ”ترکیب“

قول فیصل

دینے کا مقصد یہ ہے کہ اس نے جیسے پسند فرمایا اسی پیکر میں تمہیں لے آیا۔ چاہا تو دور کے رشتہ

داروں سے صوت و صورت کی ”مشابہت“ عطا کی اور چاہا تو رکسی ”منفرد“ پیکر میں نمود۔ حسی مثلاً ایک باپ کے دس بیٹے ہیں اور قدرت نے ہر ایک کو منفرد اور جداگانہ پیکر اور ”آواز“ عطا کر دی اور ایسا بھی ہوا کہ رکسی دو کو اتنا ہم شکل بلکہ ہم آواز بنا دیا کہ ملنے والوں میں سے بہت سے لوگ مخالطہ میں پڑ کر احمد کو محمد اور محمد کو احمد سمجھنے لگے۔ یہ قدرتِ خدا کی ”تو قلمونی“ اور صحتِ خدا کا ”شاہکار“ ہے اس سے ”اصول آفریش“ میں تبدیلی کا استدلال، نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں ”ایّ صورة“ کے یہ معنی کرنا کہ۔ چاہا تو انسان کی شکل دیدی اور چاہا تو ”نوزنہ“ بنا دیا بلکہ چاہا تو رکسی اور جانور کی شکل میں شکل فرمادیا۔ ”ذوقِ جمال“ اور فکری ”اُجلی پن“ سے محرومی کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی سوچ کا انسداد کرنے کے لئے آیہ (7) میں پہنکی فرمادیا۔ ”فسواک فعدلک“ اس نے ”حسن“ ”قدو قامت“، اعتدال۔ خدو خال کی خوبصورتی اور ”تناسبِ اعضاء“ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر تمہیں ”تفکیک“ دیا۔ اب تم حسن کا ”مرقع“ ہو۔ تمہاری اس ساخت کو قدرت کے اہل قوانین سے مربوط کیا گیا ہے ایسے قوانین جو نظامِ آفریش کے لئے غیر متبادل حیثیت رکھتے ہیں۔



## تمام امور کا مالک اللہ ہے

486

### والامر یومئذ للہ

(انفطار، 19)

اور اس دن تمام امور کا مالک اللہ ہوگا۔

یہ ہے کہ۔ اللہ۔ تو ہر وقت تمام امور کا مالک ہے صرف اس دن کی یہ تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟

وجہ اعتراض

## قول فیصل

یہاں اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیا ہے کہ اللہ نے انسان کو ”ارادے“ اور اختیار کا مالک بنایا ہے اس طرح وہ یہاں تو اپنے ارادے اور اختیار سے استفادہ کر سکتا ہے مگر وہ دن نتیجہ کا دن ہو گا جہاں

☆

صرف اللہ کا اختیار چلے گا۔

مطفئین

## رب سے او جھل۔ کیا معنی؟

487

## کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون

(مطفئین، 15) آگاہ ہو کہ اس دن وہ اپنے رب سے دور دور ہوں گے۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہاں بندے اور اللہ کے مابین ”حجاب“ حائل ہونے کی خبر دی ہے جبکہ وہ عالم

وجہ اعتراض

ماکان و مایکون ہے۔ وہاں حجاب اور پرزے حائل کرنے کے کیا معنی؟

حجاب رزسم دار چیز کے آگے ہوتا جبکہ اللہ۔ رزسم سے پاک و منزہ ہے اسے اگر بندے سے ”متعلق“

کیا جائے تب بھی یہ معنی غلط ہو جاتے ہیں کہ بندہ اللہ کے علم سے محجوب ہو سکتا ہے؟ اب لا محالہ

اسکا ”استعاری“ مفہوم سامنے لانا ہو گا یعنی انہیں ملنے کی اجازت نہ ہوگی۔ عربی میں حاکم سے ”ملنے“ نہ دینے والے کو

”حاجب“ کہا جاتا ہے اس طرح لمحجوبون کے معنی ہوں گے ان کو ملنے سے دور دور رکھا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں

اللہ کا دیدار یا ملاقات ان آنکھوں سے بالکل نہ کر سکیں گے۔ ☆

انشقاق

## آنے والے عظیم سائنسی انقلابات کا ظہور

488

اذا السماء انشقت واذنت لربها وحققت. واذا الارض مدت وقلت ما فيها

وتخلت واذنت لربها وحققت

اور جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کا فرمان چلا لائے گا اور اسے واجب بھی یہی ہے اور

جب زمین ہموار کر دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال باہر کر دے گی اور خالی ہو جائے

گی اور اپنے پروردگار کے قانون کی پابندی کرے گی۔ اور اسے لازم بھی یہی ہے۔ (انشقاق، 51-52)

یہ ہے کہ یہاں آسمان کے پھٹ جانے اور زمین کے ہموار ہونے کی بات کی گئی ہے جبکہ قیامت کے

دن نہ آسمان ہو گا نہ زمین تو انسان کہاں ہو گئے اور انہیں کیسے کہا جائے گا کہ۔ واذا قرئ علیہم

وجہ اعتراض



(الشقاق، 22:21) سجدہ کرو جبکہ ان پر قرآن تلاوت کئے جانے کے باوصف سجدہ نہ کر پائیں گے۔

## قول فیصل

ان آیات میں نزول قرآن کے وقت سے آنے والے عظیم ”مادی انقلابات“ نمودار ہونے کی خبر دی گئی ہے کہ مستقبل کا انسان ”علم“ و سائنس کے زور پر آسمانوں کو پھاڑ کر پار چلا جائے گا۔ کیونکہ اس طرح انسان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل بھی ہوگی اور کائنات کے راز ہائے سرستہ بھی ”طشت“ ازبام ہو جائیں گے ویسے بھی انسان تمام ”ترقیات“ کا منبع آسمانوں کو سمجھتا رہا ہے کہ یہ جو ”ثوابت“ اور سیاروں میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے وہ کیا چیز ہے جو ان کے زمین تک پہنچنے پہنچنے اور پر فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے چنانچہ آج اسے علم کی ”توانائی“ سے یہ راز بھی معلوم ہوا کہ ”اوزون“ نامی حفاظتی ”پٹی“ ہے جو زمین کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے وہی لوہے کی آفات میں ”حائل“، مانع و ”حاجب“ ہے۔ اسی طرح اسی علم ہی کے ذریعہ اس پر یہ، راز بھی کھلا کہ زمین ہی تمام خزانوں کا ”دفینہ“ ہے اسکی تہ میں۔ کانیں ہیں، پٹرول ہے گیسز (GASES) ہیں اسکی سطح پر ”نباتات“ آگتیں، بارشیں برستیں، حیوانات نمودار ہوتے اور انسان ”زخاں زمین“ کو ہمیشہ تروتازہ رکھنے کے لئے جو حرکت ہے اسی زمین کی بابت فرمایا الوقت ما فیہا ونخلت۔ وہ اپنے اندر کے خزانے نکال باہر پھینکے گی۔۔۔۔۔

ان تمام باتوں کے بعد فرمایا کہ۔۔۔۔۔ ان پر جب قرآنی آیات کھل جاتی ہیں تو اسکی حقیقتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ ان میں سے جو زیادہ انکار کے عادی ہیں وہ کھلی تکذیب بھی کر گزرتے ہیں (الشقاق، 22) لیکن ان کی تکذیب سے حقائق کے دھارے، نہیں بدلتے فرمایا۔ اذا زلزلت الارض زلزالها واخرجت الارض الثقالا جب زمین بھونچال سے اپنے خزانے اگل دے گی تو انسان حیران ہو کر دریافت کرے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ سارے راز اگل رہی ہے؟ (زلزلہ، 2:21)

یہاں ”بھونچال“ سے وہ ”ڈائنامیکی“ بھونچال مراد ہے جو ہزاروں فٹ کی گہرائی میں ”آلات“ پہنچا کر اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر اگل دے۔

☆

بروج

## برجوں والا آسمان

489

## و السماء ذات البروج

(بروج، 1) اور برجوں والا آسمان گواہ ہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ برج عرفی میں شہر پناہ (فصیل) یا ”دمدمہ“ یا اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں سے

## وجه اعتراض

مخالف غنیم کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن آسمان پر کون اللہ کا حریف ہے جو غنیم لے کر چڑھائی کر سکے؟

**قول فیصل** کبریا کی گواہی دیتے ہیں۔ ☆

یوم موعود کیا ہے اور شاہد و مشہود کون ہیں

490

**والیوم الموعود و شاهد و مشهود**

یوم موعود اور شاہد و مشہود گواہی دیتے ہیں کہ۔ (بروج، 2، 3)

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں یوم موعود سے اگر قیامت مراوے تو ابھی ہمارے سامنے نہیں ہے گواہی کسے ہوگی؟

## وجه اعتراض

یہاں ”یوم موعود“ سے قیامت مراد نہیں ہے وہ دن ہے جس میں اللہ نے مکہ فتح کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ خاص کر یہ آیات نازل بھی مکہ ہی میں ہوئی تھیں مگر اس وقت مکہ مسلمانوں کے کنٹرول کا وعدہ جنوز تکمیل طلب تھا اور جب تکمیل ہو گئی تو فرمایا۔ آج مکہ فتح ہو گیا ہے یہ اللہ کے وعدے کی گواہی ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

## قول فیصل

اس کے ساتھ ہی دوسرے گواہوں شاہد اور مشہود کی گواہی بھی ثبت فرمادی۔ ”شاہد“ سے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس اور ”مشہود“ سے قرآنِ محکم مراد ہے۔ یعنی فتح مکہ کا دن بھی گواہ۔ نبی اکرم بھی گواہ ہیں اور قرآن بھی گواہی دیتا ہے کہ۔ مکہ والوں کا حشر ”اخذود“ والوں کے حشر سے مختلف نہیں۔ کہ انہوں نے آگ کے الاؤروشن کئے پھر آگ کے ان دہکتے انگاروں پر جو خندقوں اور زمینی گڑھوں میں بھر دیئے گئے تھے ان لوگوں کو ڈال دیا جو خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے مگر یہ ”نجرانی“ ظالم خندقوں کے کناروں پر بیٹھ کر۔ مؤمنوں کے جلنے کا نظارہ کرتے رہے یہاں قرآن۔ فتح مکہ کے دن، رسول سید البشر کی فاتحانہ موجودگی اور قرآنِ محکم کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ تم دیکھو گے جو حشر اخذود والوں کا ہوا وہی مکہ والوں کا بھی ہوگا۔

★

والوں کا بھی ہوگا۔

طارق

انسان کی آخری تخلیق کس سے ہوئی؟

491

### فليَنظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ؟ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ

انسان اپنی تخلیق پر غور کرے کہ رکس سے پیدا ہوا؟ اسے معلوم ہو گا کہ قطرہ منی سے پیدا ہوا ہے۔ (طارق، 5: 85)

یہ ہے کہ آیہ زیر بحث میں انسان کی تخلیق قطرہ منی سے متلائی گئی ہے جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا۔

**وجه اعتراض**

والله ابتکم من الارض نباتا

اللہ نے تمہیں پودے کی طرح زمین سے اگایا ہے۔ (احزاب، 17)

**قول فیصل** انسان کی تخلیق کو کئی مراحل سے گزرنا پڑا اس کا پہلا مرحلہ۔ ”بدو دار“ مٹی سے مربوط رہا۔ جس میں ”جرثومہ حیات“ رکھ دیا گیا۔ پھر کروڑ ہا سال کے بعد تخلیق کا آخری مرحلہ شروع ہو گیا کہ اسی جرثومہ حیات کو۔ نطفہ کی شکل دے کر مٹی سے۔ گوشت کے لو تھڑے کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ یہاں اسی آخری مرحلے کی بات ہوئی ہے۔ اسمیں ”الانسان“ کا لفظ قابل غور ہے جو صرف اور صرف ”جنس“ کے لئے ہے جو ہر انسان کی تخلیق کا سبب صرف قطرہ منی ہی کو ٹھہراتا ہے اس میں مسیح ہوں یا ہمارے انسان اول۔ تخلیق میں برابر ہیں۔ بلکہ اسمیں یہ ارشاد بھی ہے کہ عورت بھی حیثیت انسان منی ہی سے پیدا ہوئی ہے جبکہ منی کا مرکز مرد کی بانیں پہلی، نہیں ہوتی۔

☆

جب دڑیرے دھر لئے جائیں گے ان کا ساہ تھی ہو گانہ مددگار

492

یوم تبلی السرائر فما له من قوة ولا ناصر

جب دلوں کے ”بھید“ جانچے جائیں گے ان کا نہ دور چلے گانہ مددگار ہو گا۔ (طارق، 10:9)

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ یہاں دل کے بھیدوں کے پکڑے جانے اور بے یار و مددگار بنانے کی بات کی گئی ہے جبکہ ”بھیدوں“ کا ٹھوس وجود نہیں ہوتا۔

**قول فیصل** ”بھیدوں“ سے مراد ”انسان“ ہیں بلکہ ”السرائر“ کو راغب نے اس معنی کے ”ضد“ یعنی ظاہر کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے ویسے اسکے معنی ”اساس“ اور جیاد کے بھی ہیں۔ تاج العروس نے ذرا کھل کر عیش فراواں اور ”خوشحالی“ کے معنی بھی لکھے ہیں جس سے سرائر کا مفہوم مزید نکھر کر سامنے آتا ہے کہ یہاں دڑیرے، سر، نواب، جاگیردار، تمندار، سردار، ذیلدار، نمبردار۔ بڑے زمیندار۔ ملک اور خان مراد ہیں جو انقلاب کے دن دھر لئے جائیں گے اور ان سے سب کچھ اگوانے کے علاوہ سنگین سزا سے دوچار بھی کر دیا جائے گا۔ اسی طرح وہ خداوندانِ شریعت جو موٹی توندیں لئے پھرتے اور خلقِ خدا پر نجات کا رعب جمائے رکھتے ہیں انقلاب کے دن بھرموں کی حیثیت سے پیش کئے جائیں گے چنانچہ مکہ میں بھی ایسا ہوا اور جنگِ قادسیہ میں بھی مخالفین کی طاقت پاش پاش ہو گئی بلکہ یہ سلسلہ اب الابد تک جاری رہے گا کہ قانونِ خداوندی میں ایسا ہی لکھا جا چکا ہے۔ مسلمان اگرچہ انقلاب کی حقیقت کو نہیں مانتے لیکن ”وقت“ بڑا امام ہے یہ ان کے کس بل نکالتا رہے گا۔

اس آیت کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے امام عبد الجبار ہمدانی نے واضح کیا ہے کہ جب یہ لوگ دھر لئے جائیں گے تو نہ ان کا زور چلے گا اور نہ ہی کسی وی آئی پی کی سفارش کام آئے گی۔ (تشلبہ القرآن صفحہ 888) یعنی اس سے نظریہ شفاعت

## کیا اللہ اکبر کہنے سے نظریہ توحید کی نفی ہو جاتی ہے

493

### سبح اسم ربك الاعلیٰ

(اعلیٰ) اپنے رب کی جو قدوسیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے تسبیح کرو۔

میں طویل پس منظر حاضر ہے راقم الحروف کو پشاور سے ایک متلاشی حقیقت نے لکھا ہے کہ

**وجہ اعتراض** روایات کہتی ہیں کہ صلوٰۃ اور اس کا ہر رکن اس جملے (اللہ اکبر) سے شروع کیا جائے لیکن اس پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ جملہ قرآن بھر میں نہیں ہے اس لئے کہ یہ وحدت باری کے خلاف ہے۔

پھر اسکی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ اللہ اکبر اسم تفہیل ہے جو ہم جنس کے مقابلے پر بڑائی کے لئے بولا جاتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم جنس موجود ہی نہیں اس لئے جملہ اللہ اکبر حقیقت کے خلاف ہے مزید فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ اب اس جملے کی ترکیب نحوی ملاحظہ فرمادیں اللہ مبتدل اور اکبر خبر ہے مبتدل اپنی خبر کے ساتھ مل کر جملہ اسمیہ خبر یہ ہوا۔ اب اکبر چونکہ اسم تفہیل ہے جو ہم جنس کے مقابلے پر بڑائی کا اظہار کرتا ہے اسلئے اس جملے کے معنی ہوئے اللہ اپنے ہم جنس آہوں سے بڑا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا ہم جنس کوئی نہیں وہ ہر لحاظ سے واحد دیکھتا ہے۔

(شکیل احمد یوسف خان کالونی پھندوروڈ۔ پشاور)

مستفسر کا مفہوم واضح ہے کہ جب دو آدمیوں میں ایک کا دوسرے سے مقابلہ ہو اور ہم بتانا چاہیں کہ ان میں سے ایک۔ دوسرے سے بڑھا ہوا (یا سب سے بڑھا ہوا) ہے تو اس کے لئے افعَل کے وزن پر افعَل التفہیل بنائی جاتی ہے اس طرح

I۔ دو کے درمیان مقابلہ ہو تو (COMPARATIVE DEGREE) کہیں گے اور

II۔ اگر سب کے ساتھ ہو تو (SUPERLATIVE DEGREE)

(حوالہ لغات القرآن طبع سوم طلوع اسلام جلد 27/1)

خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ افعَل کے وزن کا کوئی بھی کلمہ۔ صفت خدا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

مجھے اپنی کم مانگی، بے علمی اور ناقص معلومات کا اعتراف ہے اور میں اس قابل نہیں کہ ہر مسئلہ پر

### قول فیصل

لب ثنائی کر سکوں تا ہم افعَل التفہیل کے رُضمن میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے تسلیم کرتے ہوئے

بھی یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر امر لغت سے تیار ہوتا ہے اور لغت کا تمام تر ذخیرہ اور اسکے لہجے ”سماعی“ ہیں اور سماع غلط نہیں ہوتا لیکن اگر کہیں گرامر بظاہر سماع کے خلاف ہو تو وہ نظر ثانی کا محتاج بن جاتا ہے۔ لوگوں نے طہ (63) پر اعتراض کیا تھا کہ۔ ان هذان لساحران۔ گرامر کی رو سے غلط ہے ان هذين لساحران۔ ہونا چاہیے۔ اسی طرح نساء (72) کا

جمله الذین ہادوا والصابئون والنصارى۔۔۔۔۔ نیز گرامر کی رو سے غلط ہے والذین ہادوا والصابئین والنصارى۔ ہونا چاہیے بلکہ مائدہ (161) کا جملہ والمقیمین الصلوة والمؤتون الزکوة تیز غلط ہے۔ ہونا چاہیے والمقیمون الصلوة والمؤتون الزکوة۔ وغیرہ وغیرہ۔

قرآن پر گرامر کے یہ اعتراضات قرآن میں ”لسانی اسقام“ کو رو کر رکھنے اور اسکی ”لارہیت“ کو ”مشتبہ“ بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن ”لسانیات“ اور ”استعمالات“ عرب کے ماہرین و متخصصین نے سماع کے سارے ان تراکیب کو ”فصح“ اور صحیح ترین ٹھہرایا ہے بلکہ میں اللہ اکبر کی تحوی ترکیب سماع پر اثر انداز نہیں ہو سکتی علامہ رشید رضا لکھتے ہیں،

”کلام عرب کو سکھہند اور معیاری بنانے کے لئے زیر، زہد اور پیش کا صحیح استعمال ضروری ہے جس کا تعلق لسانی گرامر سے ہے اور گرامر کا قابل اعتبار یہ پہلو ہے کہ اس کی رو سے تمام الفاظ اور لہجوں کی لسانی حیثیت کا اثبات ”سماع“ پر مبنی ہے یعنی ”اہل زبان“ کے استعمالات اسکی ”بیاد“ ہیں اور سماع ہی کے ذریعہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تہ بر عتہ الفاظ جس شکل و صورت میں استعمال کئے جاتے ہیں فصیح ہیں اور صحیح ہیں۔“ (تفسیر ”النار“ طبع چہارم مصر ۱۳۶۷ھ جلد 477/6)

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی تمام لسانی ادبیات کی بیاد ”سماع“ پر ہے اور سماع جس چیز کو ”فصح“ قرار دے گا وہی حقیقت کی اساس بنے گی لہذا اسمیں نہ قباحت ہے نہ فنی خامکاری۔

(تفصیل ملاحظہ ہوں تفسیر رازی طبع قاہرہ جلد 17/3/15/22۔ امام عبد الجبار معتزلی کی تزیہ القرآن طبع مصر صفحہ 226۔ یدرہان القرآن تضاد نمبر 168)

اس طرح نہ صرف یہ کہ سماع نے ”اکبر“ کو اللہ کی ”صفت“ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے خود زبان ”نوحی“ نے بھی اسم تفصیل کو اللہ کی صفت بنانے کا پر زور ”جواز“ فراہم کر دیا ہے ذیل میں خط کشیدہ اسماء کو نظر میں رکھتے ہوئے مثالیں ملاحظہ ہوں :

☆ ولله المثل الاعلیٰ (نحل، 60) ☆ سبوح اسم ربك الاعلیٰ (اعلیٰ، 1) ☆ ولد المثل الاعلیٰ (روم، 72) ☆ اقرأ وربك الاکرم (علق، 3) ☆ واللہ خیر حافظا وهو ارحم الراحمین (یوسف، 64) ☆ فتبارک اللہ احسن الخالقین (مؤمن، 14) ☆ یغفر اللہ لکم وهو ارحم الراحمین (یوسف، 72) ☆ اعلم حیث یجعل رسالتہ (انعام، 124) ☆ الیس اللہ باحکم الحاکمین (تین، 8) ☆ قل هو اللہ احد (صد، 1) ☆ وانت ارحم الراحمین (اعراف، 150) ☆ واللہ احق ان تخشاه (احزاب، 37) ☆ واللہ احق ان تخشوه (تور، 14) ☆ نحن اقرب الیہ من جبل الوریث (ق، 16) ☆ ونحن اقرب الیہ (واقعہ، 85) ☆ وانت ارحم الراحمین (انبیاء، 83) ☆ الوسیلۃ الیہم اقرب (اسراء، 57)



## گر امر کے زاویہ سے

ناظرین محترم آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سماع کے لحاظ سے افعال التفہیل کے صیغے کو ذات قدسی کا ”وصف“ بنایا جاسکتا ہے گر امر بھی اسکی اجازت دیتا ہے اور استعمالات عرب بھی۔۔۔۔۔ اس کے بعد کون سی وہ چیز ہے جس کی طرف رجوع کر کے اپنے اطمینان کا مزید سامان کر سکتے ہیں؟ تاہم آئیے گر امر سے پوچھیں کہ وہ کیا فعل صادر فرماتا ہے؟ تو گر امر اسکی ”تعریف“ میں یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اسم تفہیل دو ہم جنسوں کے مقابلے کی جائے سب کے مقابل بھی استعمال ہوتا ہے اسمیں نہ قباحت ہے نہ سوء ادب؟ اسے (SUPERLATIVE DEGREE) کہا جاتا ہے اس زاویہ سے معنی ہوں گے۔ سب سے بڑا۔۔۔۔۔ بحر و بر سے بڑا۔۔۔۔۔ شجر و حجر سے بڑا۔۔۔۔۔ شمس و قمر سے بڑا۔۔۔۔۔ بحر کی ہر دو اصناف جن و انس سے بڑا۔۔۔۔۔ بلند یوں اور پستیوں سے بڑا۔۔۔۔۔ زمین کی پہنائیوں اور آسمان کے فرزانوں سے بڑا۔۔۔۔۔ فرشتوں اور تمام ملکوتی قوتوں سے بڑا مرضی کہ وسیع کرمیہ السماوات والارض کے مطابق اس کا ”اقتدار اعلیٰ“ سب پر ”حاوی“ اور اسکی کبریائی سب سے بڑھ کر ہے۔ اس طرح یہاں دو ”ہم جنسوں“ کے مقابلے والی بڑائی کی بات نہ رہی سب سے بڑائی کی بات آگئی۔ اب فرمائیے کہ اعتراض کی بات کیا رہ گئی؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ وحی قرآن نے دب۔ پر اکبر۔ کا اطلاق کر کے اس بات کو ممکن بنادیا ہے کہ ”محاکاتی“ لہجہ میں ہی یہی بات کرنے سے ”حقیقت“ کا اظہار ہو سکتا ہے۔ سیدنا ابراہیمؑ کی ”فطرت“ صاف و شفاف تھی آپ اشیاء کی حقیقت کو لوگوں کے ”پیانہ“ سوچ کے مطابق بیان فرماتے تھے ایک موقع پر استفہام انکاری کے لہجے میں آپؑ نے ڈھلتے سورج کو جب دیکھا تو سورج پرستوں کے احساس کو ٹھوکر رسید کرنے کے لئے فرمایا هَذَا رَبِّي هَذَا اكْبَرُ؟

یہی ڈھلتا سورج رب اکبر۔ تسلیم کر لوں؟ ایسا تو نہیں ہو سکتا ڈھلتے والی اور زوال پذیر کوئی بھی چیز رب اکبر نہیں ہو سکتی۔  
(مفہوم از انعام، 78)

یہاں قرآن کے اس فقرے کو ”عقائدی“ زاویہ سے نہ دیکھنا چاہیے کہ اسکی تو خود ابراہیمؑ نے بھی نفی کر دی ہے دیکھنا چاہیے کہ جملہ رب اکبر کی نفی کی ہے؟ بات صاف ہو جائے گی کہ نہیں کی کیونکہ وحی نے ظہور حکایت ابراہیمؑ کی زبانی ”اکبر“ کو ”دب“ کی صفت بنالیا ہے اور ابراہیمؑ کے عقیدے اور تصور میں رب اکبر صرف خدائے لایزال ہی کا اسم اقدس ہے۔ ابراہیمؑ کو اگر اکبر۔ میں ”ہم جنس“ کی بڑائی تو اسے رب۔ کا ردیف ہر گز نہ ملتا خواہ حکایت کے بطور ہی ہوتی۔

(وضاحت عنوان ”نظر باز گشت“ میں آرہی ہے)

ان قرآنی شواہد و نظائر کے علاوہ بھی قرآن پاک نے جہاں کہیں ”انسانی مشترکہ صفات میں حلا امتیاز“

”مشارکت“ کو رکاوٹ بننے نہیں دیا کیونکہ لسانیات کا یہ طے شدہ اصول ہے کہ ”نسبت“ کے تناظر میں ”مفہوم“ کا ”تغایر“ ملحوظ رکھ کر انسان اور رحمان میں ضروری حد تک امتیاز برقرار رکھا گیا ہے اس میں صفات کا ظاہری پیکر اگرچہ نہیں بدلا معنوی امتیاز از خود ہی پیدا ہوتا چلا گیا مثلاً۔ انسان سمیع ہے بصیر ہے۔ ہاتھ اور چہرے کے وصف کا حامل ہے ردوف

ہے رحیم ہے۔ غفار ہے کریم ہے وغیرہ۔ اور یہی صفات رحمان سے بھی وابستہ ہیں لیکن نسبتوں اور اضافتوں کے تناظر میں مفہوم خود بہ خود ہی مختلف ہو جاتے ہیں۔ علامہ بدر الدین زراکشی (1391م) لکھتے ہیں۔

وقد يخرج الاخبار عن الاعظم الاكبر للمبالغة وهو مجاز كقولہ تعالى وجاء ربك والملك صفا صفا فجعل مجي جلال آياته مجيئاً له سبحانه على المبالغة۔

کلام عرب میں یوں بھی ہوتا ہے کہ بات کسی برتر اور عظیم تر ہستی کے ناطے سے ہوتی ہے مگر اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ صفت اپنے ”لفظی دائرے“ سے نکل کر ”اولیٰ“ اور محاوراتی شکل اختیار کرنے لگتی ہے جیسے فجر (22) میں اللہ کے جمع فرشتوں کے ”آجانے“ کی لفظی صفت استعمال ہوئی ہے لیکن اس کا مفہوم پاؤں یا کسی دیگر مادی ذریعہ سے چل کر ”وجودی“ آجانے کا، نہیں بلکہ اللہ کی عظیم تر نسبت سے اس کا ”اولیٰ مفہوم“ جو وجود اور جسم کا خواہاں، نہیں ہوتا سامنے لا کر اللہ کی برتری اور کبریائی کے آثار و علامات کے نمودار ہونے سے تعبیر کیا جائے گا۔

(البرہان طبع مصر جلد 3/53/1:3)

بات صاف ہو گئی کہ ”مشتکہ صفات“ کسی طرح کی ”مشارکت“ اور ”ہم جنسیت“ سے عاری، نہیں ہو سکتیں لیکن اہل زبان جب انہیں مجاز، ”استعارے“ اور مبالغہ کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو مفہوم خود بخود ہی مختلف صورت میں نکھر کر سامنے آ جاتا ہے اب خدا کے دیکھنے اور سننے کا مفہوم ہمارے سننے اور دیکھنے کے مفہوم کی طرح نہ ہو گا دیکھنے، سننے کا جو ”نتیجہ“ ہو گا وہی مراد ہو گا۔ اسی طرح اللہ کے ہاتھ کا مفہوم طاقت اور پاور (POWER) اور چہرے سے مراد ذاتِ اقدس ہو گی۔

ان وضاحتوں سے بات قابل فہم

**اکبر دینی کلچر کا حصہ ہے حذف نہیں ہو سکتا** ہو چکی۔ وجہ اعتراض ختم شد۔ اب رہی

یہ بات کہ ”اللہ اکبر“ کا جملہ قرآن حکیم میں، نہیں ہے تو میں ادب سے کہوں گا کہ۔ کیا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ قرآن پاک میں ہے؟ جواب اگر نفی میں ہے تو آپ کلمہ کے پیکر میں توحید اور رسالت کے ”یکجائی“ اعتراف کا جواز کیا پیش کریں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اکبر ہمارے دینی کلچر کا حصہ ہے۔ ہم جب فتح کی گردن پر چھری پھیرتے ہیں تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتے ہیں۔۔۔۔۔ اذان ہے تو چہ بار ”اللہ اکبر“ کی تکرار سے کہتے ہیں۔۔۔۔۔ صفا سے مردہ تک دوڑ لگاتے ہیں تو ہماری روح کی بالیدگی ”اللہ اکبر“ کی تکرار ہی سے نمودار ہوتی ہے۔۔۔۔۔ حج کا احرام باندھ کر مٹے اور وہاں سے عرفات جاتے یا واپسی پر جمرات کو نکلنے والوں کا نشانہ مانتے ہیں تب بھی ”اللہ اکبر“ ہی کی ”رسیلی گونج“ کانوں میں ایمان کی حلاوت کا رس گھولتی ہے۔ اللہ اکبر کی صدا پھر جھومتے اور جبر قہر کر کے انسان کو عالم وجد میں پہنچا دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ایام تشریق میں دنیا کے ہر حصے میں ہر صلوٰۃ کے بعد تکبیرات کی صدائیں بلند کر کے ہم سب محمدی اور ثقافت دین کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اس طرح 1500 سال کے ارباب مسلمانوں کا عملی ترانہ ہمارے لئے سند فراہم کرتا ہے کہ ہم

بغیر کسی ترمیم کے اس جملے کو حجت تسلیم کریں اور اپنی اصلی حالت اور ”لفظی ترکیب“ کی رعایت سے دہراتے رہیں۔ ایسے میں ہم اللہ کے لئے اکبر کی ”عظیم“ صفت کو کہاں کہاں سے کھرچ ڈالیں گے اور کس کس کے لوحِ قلب سے محو کر لیں گے۔ غرض کہ اللہ اکبر ہماری پہچان ہے اور یہ فقرہ اللہ کی ”عظمت“ و کبریائی کا توانا محافظ اور امین ہے۔

**نظر باز گشت** ناظرین محترم! سابقہ میں میری معروضات سن چکے آخر میں ایک بار مکرر اس حقیقت کا اعادہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقابلے ہی میں ”زور دار“ طریقے سے ”افعل“ کے صیغے ہی کو اپنا وصف بنایا ہے ارشاد ہے۔ انتم اعلم ام اللہ۔ تم نہیں ”اعلم“ صرف میں اللہ ہوں۔ (بقرہ، 140) اس طرح ”افعل“ کے وزن پر ہی اپنے کو بزرگ امر بھی ”اعلم“ فرمایا ہے اور یہ ”اعلم“ صیغہ متکلم والا نہیں کہیں مغالطہ کا شکار نہ ہوتا۔ اسی طرح تقریباً پچاس مقامات پر اپنے کو افعل التحصیل کی صفت سے متصف فرمایا ہے چند ایک کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

☆ واللہ اعلم بما یکتُمون (عمران، 167) ☆ وانا اعلم بما اخفیتم (محمّد، 10) ☆ واللہ اعلم  
بایمانکم (نساء، 24) ☆ واللہ اعلم باعدائکم (نساء، 44) ☆ اور زور دے کر فرمایا الیس اللہ باعلم  
بالشاکرین (انعام، 53) ☆ نیز سوالیہ لہجہ میں۔ الیس اللہ باعلم بما فی صدور العالمین (عنکبوت، 10) ☆  
واللہ اعلم بالظالمین (انعام، 58) ☆ ایک ہی آیت میں دو دو مرتبہ ان ربک هو اعلم من یضل عن سبیلہ وهو  
اعلم بالمہتدین (انعام، 117) ☆ مزید دو دو مرتبہ (النحل، 125) ☆ مزید مکرر (نون والقلم، 7) ☆ ان کے علاوہ  
ذیل کی آیات میں یہی افعل کا صیغہ اپنے لئے خاص فرمایا ہے ☆ انعام (119) ☆ انعام (124) ☆ یونس (40) ☆ ہود  
(31) ☆ یوسف (77) ☆ نحل (101) ☆ اسراء (25) ☆ اسراء (47) ☆ اسراء (54) ☆ اسراء (55) ☆  
اسراء (84) ☆ کف (19) ☆ کف (21) ☆ کف (23) ☆ کف (28) ☆ مریم (70) ☆ طہ (104) ☆  
حج (58) ☆ شعراء (188) ☆ مؤمنون (97) ☆ قصص (37) ☆ قصص (56) ☆ قصص (85) ☆ عنکبوت (32) ☆  
☆ زمر (70) ☆ احقاف (8) ☆ ق (45) ☆ نجم (30) دو مرتبہ ☆ نجم (32) دو مرتبہ ☆ ممتحنہ (10) ☆ ممتحنہ (1) ☆  
☆ الشقاق (23) ☆

یہاں بقرہ (140)، انعام (53) اور عنکبوت (10) میں اللہ سبحانہ اپنی زبانی فرماتے ہیں کہ افعل التحصیل میری شان اور  
میر کی پسندیدہ صفت ہے۔

☆

الاعلم

قرآن سینہ پیغمبر سے محو نہیں ہو سکتا

494

سنقرئک فلا تنسی۔ الا ماشاء اللہ

(الا علی، 6، 7)

ہم تجھے قرآن کا درس دیں گے جسے بھول نہ پاؤ گے۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ آیہ زیر بحث میں فلا تنسی میں یہ ضمانت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سیدہ مبارک سے قرآن ”محو“ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ساتھ ہی حرف استثناء (الا ما شاء اللہ) کے ساتھ یہ خبر بھی دی ہے کہ جتنا اللہ چاہے گا اتنا ہی بھول اور نسیان کی نذر کر دے گا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے طویل سفر میں قرآن کو بھول جاتے رہے اور آپ کو پتہ نہ چل سکا کہ کون کون سی آیتیں بھول گئے اور حالت نسیان میں کون کون سی باتیں قرآن میں شامل کر ڈالیں۔

## قول فيصل

**قول فیصل** اس الجحش کو دور کرنے کے لئے زمانہ ماضی کے دانشورانِ قرآن نے کہا ہے کہ یہاں حرفِ الا۔  
برائے استثناء متصل نہیں۔ ”برائے منقطع“ ہے۔ یعنی اللہ کے نازل کردہ کلام کو تو آپ نہیں  
بھولیں گے لیکن دوسرے کلام جو وحی کے ذریعہ القاء نہیں ہوئے بھول جائیں گے۔۔۔۔۔ یہ مفہوم اگرچہ گوارا ہے لیکن نبی  
کے منصب اور ”مقام“ سے پھر بھی میل نہیں کھاتا کیونکہ ”نسیان“ جو کچھ بھی ہے ”دماغی عوارض“ سے تعلق رکھتا ہے  
جبکہ اللہ کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنے انبیاء کو ”دماغی عوارض“ سے ہمیشہ محفوظ رکھتا ہے اب اگرچہ محدثین اور اہل  
تفسیر ”انبیاء“ کی ”رعصمت“ کو نہیں مانتے اور ان سے بھری خامکاریوں کے سرزد ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے بلکہ یہاں تک  
کہتے تھے کہ لبید بن اعصم یہودی نے آپ پر ”جادو“ کیا تھا جس سے آپ نسیان (اور دماغی اختلال) میں یہاں تک مبتلا رہے کہ  
ایک سال تک اگر ”ازدواجِ مطہرات“ کے پاس جاتے تو بھول جاتے کہ گئے ہیں یا نہیں؟ اس طرح آپ ”جنبی“ حالت  
میں بھی رہتے اور صوم و صلاۃ کا عمل بھی چھلاتے رہتے۔ لیکن روایات و اہل تفسیر کی ایسی باتوں کو اہل اعتدال یعنی ”اہل  
اعتدال“ نہیں مانتے اور کہتے تھے کہ۔ نبی۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی رعصمت کی ”باز“ سے نکل جائے تو پورا دین اور ”سلسلہ  
وحی“ مشکوک ہو کر رہ جائے گا لہذا وہ استثناء منقطع کے ذریعے بھی نسیان کی معجائش ختم کے دیتے ہیں۔

اس وضاحت کے ساتھ ہی امام محمد عبدہ (1905م) کی نکتہ ورائہ توجیہ ملاحظہ ہو جس سے واضح ہوگا کہ ”نسیان“ پیغمبرؐ کے پاکیزہ خمیر میں شامل ہو ہی نہیں سکتا۔ فرماتے ہیں۔

واما قوله تعالى (78/8-7) سنقرنك فلا تنسى' الا ماشاء الله فهو يؤكد عدم النسيان لان الاستثنا بالمشية قد أستعمل في اسلوب القرآن دلالة على الثبوت والاستمرار كما في قوله تعالى (108/4) خالدين فيها مادامت السماوات والارض الا ماشاء ربك عطاء غير مجذوذ . اى غير مقطوع وقوله (7/188) قل لا املك لنفسي نفعا ولا ضرا الا ماشاء الله ----- والنكته في الاستثنا بيان هذه الامور الثابتة الدائمة انما كانت كذلك بمشيئة الله تعالى لا بطبيعتها في نفسها ولو شاء الله تعالى ان يغيرها لفعل . وهذا الا اعتقاد من مهمات الدين فلا غرو ان تزاح عنه الا وهام في كل مقام يمكن ان تعرض فيه فليس امتناع نسيان الوحي طبيعية لا زمة للنبي وانما هو تانيد ومنحة من الله تعالى وليس خلود اهل الجنة في الجنة واجب عقلي او طبيعي وانما هو بارادة الله تعالى ومشيئته

**مفہوم :-** اور اگر اس کے معنی بھول جانے کے لئے بھی جائیں تو بھی "الا ماشاء اللہ" اسکی نفی کر دیتا ہے کیونکہ "استثناء بالشیء" قرآن کے اسلوب میں ہر جگہ "اثبات" اور استمرار کے لئے آتا ہے یعنی جہاں حرف "الا" کے بعد "ماشاء اللہ" - یا - ماشاء ربك ہو جس سے خدا کی مشیت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ - جیسا پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا - مثلاً - پہلے فرمایا فلا تنسی - پھر "الا" کو خدا کی مشیت سے مربوط کر کے کہا "الا ماشاء اللہ" تو یہ "ماشاء اللہ" فلا تنسی - کے خلاف نہیں ہوگا بلکہ اسے پختہ بنائے گا جیسا کہ دوسرے مقامات (108/11--188/7) میں ہے - اور حرف "الا" کے ذریعہ استثناء میں نکتہ یہ ہے کہ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ امور جو ثابت اور دائم ہیں خدا کی مشیت ہی سے ثابت اور دائم ہیں - اپنے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے نہیں - اس طرح "فلا تنسی" کے معنی ہوں گے نبی اکرم ﷺ کا "عدم نسیان" خدا کی مشیت ہی سے قائم اور دائم ہے - (تفسیر "المنار" طبع اول قاہرہ جلد 1/3/419 تا 12)

بات صاف ہو گئی کہ الا - جہاں "مشیت خداوندی" سے مربوط ہو تو امام محمد عہدہ کے استقراء بموجب وہاں استثناء برائے انحراف یا سابقہ مضمون کی تردید کے لئے نہیں اثبات اور دوام کے لئے ہے یعنی - ہم تمہیں اس طرح قرآن پڑھائیں گے کہ بھول نہ پاؤ گے -

### نسیان عیب ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ نسیان عیب ہے اور نبی کی مناسبت سے ایسا عیب ہے جو تبلیغ رسالت میں "قادر" ہے پیغمبر ﷺ اس سے محفوظ ہے عصمت اسکی رسالت کے لئے "حفاظتی" حصار ہے - محمد عہدہ نے عصمت کے اس زاویہ کو ملحوظ رکھ کر نبوت کا خاصہ لازمہ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں - وان مثل هذا النسيان محال على الانبياء لانهم معصومون في التبليغ. والآيات الكريمة ناطقه بذلك

نسیان عیب ہے اسکا قلب انبیاء پر طاری ہونا ممکن نہیں ہے وہ تبلیغ رسالت میں کلی طور پر معصوم ہیں - آیات الہی اس پر گواہ ہیں - (المنار جلد 1/3/415 تا 5)

### تبرکاتِ سرسید

سید مرحوم نے زندگی بھر قرآن محکم اور حضرت "نبی حجتہ" ﷺ کی ذات اقدس کا ہمیشہ دفاع کیا آپ نے قرآنی حکمت بالغہ میں ڈوب کر یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ "عصمت" کو اگر نبوت سے الگ کر دیا جائے تو "کاذب" اور "صادق" کا امتیاز ختم ہو جائے گا بلکہ وہ صرف ایک ہی عقیدہ رکھتے ہیں وہی عقیدہ ان کے ایمان کا حاصل ہے فرماتے ہیں :

"ہم ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتے اور یقین جانتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے اتر ہے وہ بے کم و کاست موجودہ قرآن میں جو درحقیقت آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات ہی میں تحریر ہو چکا تھا موجود ہے کوئی حرف اس سے خارج نہیں" - (تفسیر القرآن طبع 1891 م لاہور جلد 1/175)





نصیحت اگر کار گر نہ ہو تو.....

495

فذكر ان نفع الذكر

(اعل، 9)

نصیحت اگر کار گر نہ ہو تو کرتے رہئے۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”ان“ برائے شرط ہے اسی طرح ”ذکر“ سے مراد قرآن ہے اور مفہوم یہ ہو گا کہ اگر قرآن سنانا کار گر ہو تو سناتے رہئے کار گر نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔

وجه اعتراض

یہاں ”ان“ شرطیہ نہیں ”اذ“ کا استعارہ ہے یعنی تم ”قرآن“ سناتے رہو جبکہ سنانے میں نفع ہی نفع ہے۔

قول فیصل

☆

ایسی ”مار“ کہ نہ جئے نہ مرے

496

لايموت فيها ولا يحي

(اعل، 12، 13)

وہ بڑی تباہی کا سامنا کرے گا تب نہ مرے گا نہ جئے گا۔

یہ ہے کہ کسی بھی ”شفس“ کا ایک ہی وصف ہوتا ہے۔ مردہ یا زندہ۔

وجه اعتراض

یہاں ”زندگی“ کے وصف کو ختم نہیں کیا گیا صرف یہ احساس دلایا ہے کہ اسے ”رسوائی“ کی ایسی

قول فیصل

زندگی سے دوچار کر دیا جائے گا کہ اس سے ”موت“ بہتر ہوگی اور موت سے بھی ایسی موت مراد

ہے جو ”جان“ تو جسم میں ہوگی مگر عزت و وقار خاک میں ملے ہوں گے۔۔۔۔۔ اور کسی کے بارے میں یہ لہجہ اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جبہ کسی کی کر تو توں کے مطابق لعنت و ملامت کا استحقاق واجب ٹھہرے۔

☆

الغاشية

وجه سے پورا جسم مراد ہے

497

وجوه يؤمئذ خاشعة . عاملة ناصبة . تصلي ناراً حامية .

اس دن بہت سے چہرے ذلیل و خوار ہوں گے۔ محنت سے تھکے ہارے۔ جلائے والی آگ کا

(غاشیہ، 2 تا 4)

ایندھن بنے ہوئے ہوں گے۔

**وجہ اعتراض** یہاں پورے جسم کو چھوڑ کر صرف ”چہرے“ کو آگ کا ایندھن بننے کی خبر دی گئی ہے۔

**قول فیصل** ادبیات عرب کا ایک یہ اسلوب بھی ہے کہ وہ ”وجہ“ بول کر پورا جسم مراد لیتے تھے۔ فرمایا۔ وَعَنْتَ الْوَجْوهَ لِلْحَيِّ الْقَيُومِ اور خدائے زندہ و قیوم کے سامنے تمام چہرے (یعنی جسم) جھکے ہوں گے۔

(طہ، 111)

اس مفہوم کے علاوہ عرب کے محاورات میں۔ وُیُورِل، سر داروں اور اعیان قوم کو بھی ”وجوہ“ کہتے تھے۔ اس طرح معنی ہوں گے :

یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے تھکے ماندے سوئے جہنم روانہ ہوں گے (جب انہیں احساس ہو گا کہ لوگوں پر ”خدائی“ کرنے کی سزا کیا ہوتی ہے؟) ☆  
(نیز ملاحظہ ہو نمبر-445)

## اونٹ اور آسمان کی تخلیق میں وجہ مناسبت؟

498

**افلا ينظرون الى الابل كيف خلقت ه والى السماء كيف رفعت**

یہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسے پیدا کیا گیا؟ اور آسمان کو نظر میں نہیں رکھتے کہ کیسے بلند کیا گیا۔ (غاشیہ، 17 تا 18)

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اونٹ اور سماء میں کون سی وجہ مناسبت یا موجب مشابہت ہے کہ دونوں کا ایک ساتھ ذکر کر کے دعوتِ غور و فکر دی گئی ہے؟

**قول فیصل** بلاشبہ اونٹوں کو ”ابل“ کہا جاتا ہے جس کا ”مفرد“ نہیں ہوتا لیکن اسکے معنی ”بادل“ کے بھی ہیں اور عرب شعراء نے اس زاویہ سے اس کا بہت ہی ذکر کیا ہے۔ لن درید (933م) نے اپنے قصیدے

میں بہت سے اشعار کے ضو میں اسے بادلوں کا استعارہ ٹھہرایا ہے اس طرح ”بادل“ بھی چونکہ ”اوپر“ ہوتے ہیں اور ”آسمان“ بھی اوپر ہی تصور کر لیا گیا ہے اس طرح معنی ہوں گے کیا بادلوں کی ساخت اور آسمان کی بلندیوں پر غور، نہیں کرتے کہ یہ بادل سمندر کے ”قطروں“ سے پانی لیتے اور ”کرشمہ قدرت“ یہ کہ یہ جب برستے ہیں تو بارش کے پانی میں نمکینی یا کھاری ذائقہ، نہیں ہوتا۔ ☆

10-3-95 یوم الاحد ملتان

الفجر

## انسان کی محیر العقول تعمیری تخلیقات

499

ارم ذات العماد التي لم يخلق مثلها في البلاد و ثمود الذين جابوا لصخر  
بالواد وفرعون ذى الاوتاد

بے مثل و بلند بام عمارتوں والے ارم۔ اور وادی پٹیر اور مدائن صالح میں چٹانوں کو تراش کر گھر  
بنانے والے ثمود۔ اور بلند و بالا اہرام بنانے والے فرعون کا تم نے حشر دیکھا؟ (نجر، 10:6)

میں کہا جاتا ہے کہ اللہ کے ان باغیوں کے عظیم الشان عمارتوں کے حوالے سے بات چلانے میں  
وجہ اعتراض کیا حکمت ہے؟

بتلانا یہ مقصود تھا کہ ان ”دیو پیکل“ تخلیقات کے حوالہ سے ان کے عظیم ”تخلیق کاروں“ کے

انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احساس دایا ہے کہ یہ جو خدا کی سر زمین پر ”خدا“ کن پیٹھے اور  
انسانوں کو جانوروں کی طرح ہانک کر زمین کو معمورہ فساد بنائے ہوئے تھے وہ کہاں گئے؟ یہ ان کی عظیم الشان عمارتیں جو  
ان کی عظمت کی گواہی کے ساتھ ساتھ ان کے فنا ہونے کی گواہی بھی دے رہی ہیں وہ خود کہاں ہیں؟ ”مکان“ کی عظمت  
تو ”مکین“ سے ہوتی ہے مکین نہیں تو وہ ”مرقع عبرت“ بن جاتی ہے۔ بلاشبہ اس کا یہ پہلو قابل غور ہے۔

☆

اللہ۔ کا بہ نفس نفیس چلے آنا

500

وجاء ربك و الملك صفا صفا

(نجر، 22)

اللہ اور فرشتے صف در صف چلے آئے۔

یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ کے آنے جانے کی بات کی گئی ہے جو اہل تجسیم کے عقیدے کے  
وجہ اعتراض عین مطابق ہے۔

لن عباس کہتے ہیں کہ اللہ کی ”حیثیت“ سے اس کے ”امر کا ظہور“ مقصود ہے یعنی اللہ کے قانون کا  
ظہور!!

قول فیصل

اس باب میں لغت اور ادب والوں نے ”جاء“ کے متعدد معانی کئے ہیں انہوں نے اپنے ”استقراء“ اور تفتیش  
میں ایک محاورہ پیش کیا ہے جو اسلامی عہد کی دریافت سے تعلق رکھتا ہے مثلاً کسی امر میں اختلاف واقع ہو تو اس وقت بعض  
کتبوں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور یہی کہتے ہیں کہ۔ اذا جاء الشافعی فقد كفانا۔ جب شافعی آئیں گے تو ہمارے لئے  
کافی ہیں۔ حالانکہ اس وقت نہ وہ آسکتے تھے نہ ہی ان کا آنا ممکن تھا لیکن ان کے آنے سے انکی رائے، ”فیصلہ“ اور تحریر کا سامنے  
آنا مراد ہے۔ اسی طرح ایک محاورہ یہ بھی ہے اذا جاء الخلیل فی العروض انقطع الکلام

جب عروض و قوانی کے باب میں خلیل بن احمد (791م) آئے تو بات ختم ہو گئی۔

یہاں غلیل کے آنے سے اسکے کسی اور بی شہ پارے کا سامنے آنا۔ مراد ہے۔ (الہمدانی صفحہ 669)

☆

الْبَيْتُ

عبدال مطلب اور ابو طالب کی قسم

501

لا أقسم بهذا البلد وانت حل بهذا البلد ووالد وما ولد لقد خلقنا الانسان

فی کبد

میں اس شرکی جس میں تم جاگزیں ہو اور عبدالمطلب اور ابو طالب رہتے ہیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ انسان درد جگر کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔

**وجہ اعتراض** میں کہا جاتا ہے کہ ان آیات میں اشارات کو مخصوص شخصیات سے مربوط کر کے ”کبد“ کے مفہوم کو بالکل ہی بے نور بنادیا گیا ہے خاص کر ابو طالب جیسے اندر کے اندھے جنسے خفیہ طور پر بھی اسلام کی حامی نہیں بھری اسکی قسم کھانے کی بات ماورائے عقل و فہم ہے۔

**قول فیصل** آپ شیعہ تفسیر پر نہ جائیں قرآن محکم اپنے ”معاملات“ کو ”شخصیات“ سے مربوط نہیں کرتا۔ یہاں جس نوح کے معانی ڈھالے گئے ہیں وہ ”خود اختراعی“ اور سراسر ستم ظریفی کی آئینہ دار ہیں۔

[illegible]

فإنما منتصبا والحيوانات الآخر تمشي منكسة لهذا امتتان عليه بهذه الخليقة

کبد کے معنی سیدھے قد اور کھڑی قامت کے ہیں کہ انسان کے سوا تمام حیوانات کی قامت میں جھکاؤ رکھا گیا ہے۔  
(تفسیر رازی طبع قاہرہ جلد 31/183/4 تا 5)

اس تحلیل کے تناظر میں مفہوم ہوگا کہ،

میں اس شہر کے باسیوں کو جس میں آپؐ بھی بس رہے ہیں اور دیگر باشندے بھی گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ بلاشبہ ہم نے انسانوں کو پورے اعتدال، تناسب (اعضاء) اور کھڑی قامت میں پیدا کیا ہے۔

(بلد، 4:1)

یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ۔ و انت حل بهذا البلد کے مفہوم میں کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ مکہ دار الحرام اور دار الامن ہے مگر رسول اکرم ﷺ کو یہ اختیار تمیزی حاصل ہے کہ آپؐ اس میں جب چاہیں اور جس وقت چاہیں قبل عام اور ”خول ریزی“ کروا سکتے ہیں چنانچہ فتح مکہ کے دن جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور لوگ فوج در فوج مسلمان یا ”پناہ طلب“ ہونے لگے تو آپؐ نے مَن دَخَلَهُ كَان آمناً۔ کے برعکس کعبہ میں پناہ لینے والے مقیس بن صبابہ اور عبد اللہ بن اخطل کو جو غلاف کعبہ سے چمٹے ہوئے تھے قتل کرادیا۔

(تفسیر رازی طبع مصر جلد 180/31 آخری دو سطریں)

بلکہ رازی۔ رسول اللہ کے اس ایجاد مندہ عمل کو اپنے ”جدلی“ انداز میں زور دے کر پیش کرتے ہیں کہ  
و حلال لك ان تقتل بمكة من مشيت وذلك ان الله تعالى افتح عليه مكة واحلها له . وما فتحت على احد قبله فاحل ما شاء وحرم ما شاء . وفعل ما شاء

آپؐ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہیں مکہ میں قتل کرادیں اور یہ اختیار اس لئے بھی آپؐ کو حاصل تھا کہ آپؐ کے فاتح تھے جبکہ فاتح کیلئے مفتوحہ علاقے کی ہر شے مباح ہوتی ہے خاص کر یہاں یہ بات نیز سامنے آگئی کہ آپؐ سے پہلے مکہ المکرمہ کسی نے بھی فتح نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فتح کی اس خوشی میں آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ جس حرام کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں۔

(180/31)

یارو۔ اتنی رستم ظریفی کہ رسول اکرم ﷺ جن کے بارے میں سرسید نے تصریح کر دی ہے کہ۔ مکہ فتح ہوتے ہی آپؐ نے یہ کہہ کر معافی کا عام اعلان فرمادیا تھا کہ لا تنزیب علیکم الیوم۔ آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اسی رسولؐ کو طوط کیا جائے کہ آپؐ امن اور جنگ کی قرآنی حدود کو روندتے ہوئے کعبہ میں پناہ لینے والوں کو قتل بھی کرادیں اور ہر حرام کو حلال بھی کر ڈالیں بلکہ جو جی میں آئے کر بھی ڈالیں۔ العیاذ باللہ۔

فرض کرو کہ آپؐ نے فتح کی خوشی میں مخالفوں کو پچ کعبہ کے قتل بھی کر دیا اور فعل ما شاء کے مطابق معصوم ”خواتین“ کو جو بیشتر آپؐ کی رشتہ دار بھی تھیں انکی ”عصمتوں“ کے ”آہنیے“ چکنا چور بھی کر دیئے تب بھی آپؐ کے پاس ان آیات کا جواب کیا تھا جن میں ہے کہ انا جعلنا حرمآ آمناً۔ ہم نے مکہ کو ازل ہی سے دار الحرام اور دار الامن بنالیا ہے (عنکبوت، 57) نیز فرمایا۔ اولم نمکن لهم حرمآ آمناً۔ کیا ہم نے مکہ کو ان کیلئے دار الامن نہیں بنالیا؟ (قصص، 57) کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مکہ جس کی حرمت اتنی پختہ اور ناقابل تحلیل تھی اسے رسول اللہ ﷺ نے کس ”نئے“ حکم کی رو سے منسوخ فرمادیا؟ خاص کر فتح مکہ سے پہلے ہی مدینہ منورہ میں اس پالیسی کو از سر نو ”ذہن نشین“ کر لیا کہ مَن دَخَلَهُ



کان آمنہ۔ مخالفین اسلام میں سے اگر کوئی کعبہ کو پناہ گاہ بنا لیتا ہے تو وہ ”پناہ یافتہ“ سمجھا جائے (عمران، 97) اب یہ رستم ظریفی ہے کہ جو رسول قدم قدم پر وحی کی رہنمائی ضروری سمجھتے ہوں وہ ”رہنمائی“ میسر ہونے کے باوصف اس پر عمل پیرا نہ ہوں۔ یارو کچھ تو خدا سے ڈرو۔ پھر جو رسول ایک ”نومسلم“ لوسفیان کے گھر کو پناہ گاہ کا ”وقتی“ درجہ دیتے ہیں وہ کعبہ کی مستقل ”پناہ گاہی“ حیثیت کو کیسے ختم کر سکتے ہیں؟ رسول کو تو فتح مکہ سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ لند خلن

المسجد الحرام آمین

تم آنے والے قریبی وقتوں میں مسلمانوں کو لے کر نہایت پر امن طریقے پر مسجد حرام میں داخل ہو جاؤ گے اور اپنے مناسب عمرہ بھی جلاؤ گے۔  
(فتح، 27)

اتنی تعلیمات امن و آشتی کی موجودگی میں رسول اللہ کو ایک نہ ختم فاتیح کی صورت میں پیش کرنا باعث شرم ہے لہذا ہمارے نزدیک جن روایات نے رسول اکرم ﷺ کے خلق عظیم کو نہایت گھناؤنے انداز سے پیش کیا ہے قرآن محکم کی ضوء میں سب کی سب مسترد اور ناقابل التفات ہیں۔ ☆

## ہر قسم کے غلاموں کو آزاد کرنے کا الہی اعلان

502

### وما ادراك ما العقبة فك رقبة

تمہیں پتہ ہے کہ عقبہ کیا ہے؟ تمام انسانوں کو غلامی کے بندھنوں سے آزاد کرانا۔ عقبہ۔ ہے۔ (بلد، 13-16)

یہ ہے کہ غلام اور کنیز رکھنا ایک قدیم رواج ہے اسلام میں اسکی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ بڑے سے بڑا کوئی عالم بھی یہاں ”پر“ مارنے کی جرأت، نہیں کرتا خاص کر ممدی زناں سیدہ ابوالاعلیٰ مودودی نے اسکے جواز اور وجوب پر اپنے رشحاتِ قلم وقف کر کے ایک گونہ یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ لونڈیاں رکھنے پر کوئی پابندی لگ ہی نہیں سکتی اگر شرعی داشتاؤں کا سلسلہ جبراً بند کیا گیا تو یہ اسلام سے انحراف کے برابر ہوگا۔ وہ یہ بھی اشارہ دیتے ہیں کہ اگر ان کی حکومت قائم ہوگئی تو وہ اسلام کی پالیسی کو برقرار رکھنے کے لئے علامتی طور پر کم از کم ایک لونڈی رکھنے کا حکم ضرور نافذ کریں گے۔ (مفہوم راقم کے الفاظ میں)

سید مودودی باو شاہ آدمی تھے وہ جب محسوس کرتے کہ زیر بحث کسی بھی مسئلہ میں روشن خیال مختلف رائے رکھتے ہیں تو فوراً ”سیخ پا“ ہو جاتے اور ان کا فکری ”میٹر“ الٹا گھومنا شروع کر دیتا۔

### قول فیصل

بد قسمتی سے سر سید علیہ الرحمۃ ہمیشہ دیگر مسائل کی طرح غلام بازی اور کنیز سازی کے دھندے کے خلاف بھی تھے وہ کہتے تھے کہ انسان نہ تو خرید و فروخت کی شے ہے نہ ہی بر غمال بنا کر ڈھور ڈھگروں کی طرح ہر تاؤ کرنے کے لائق۔ خاص کر اب علم و سائنس نے بالادستی اور انسانی خدائی کے تصور کو جب مسترد کر دیا ہے تو مسلمانوں کو اس باب میں بڑھ کر ”سبقت“ کرنی چاہیے کہ سب سے پہلے اسلام ہی نے غلامی کے تصور کو باطل ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ممدی زناں چونکہ سر سید سے

الربك تھے لہذا انہوں نے دور عباسیہ کے محلات و قصور کی ”رنگینوں“ کو سامنے رکھ کر کئیروں کو بطور خاص ”مصر“ آغوش“ بنانے کی فقہی توجیہات پر زور دیا بہر حال مہدی زمان اپنی سوچ کے مالک تھے وہ حقیقت شناسی کے لئے اپنا ”خصوصی“ معیار رکھتے تھے۔ لیکن کچھ ضروری نہیں کہ وحی الہی اپنی پالیسی کو ان کے تناظر میں بدل ڈالے فرمایا:

”فلك رقبة۔ تمام انسانوں کو غلامی کے بندھنوں سے آزاد کرنا حق ہے“

یہاں ”رقبة“ کا لفظ ”نکرے“ کے بطور آیا ہے جو اپنے مزاج کے مطابق ”عموم“ کے لئے ہے یعنی ہر نوع کی غلامی سے آزاد کرنا۔ سیاسی غلامی ہو۔ مذہبی غلامی ہو۔ ایسے غلام بھی جن میں خوئے غلامی اتنی رچ بس گئی ہو کہ وہ آزادی کے تصور سے بھی خوفزدہ ہوں۔ نیز سماجی غلام، معاشی غلام، محکومیت کے غلام اور معاشرتی غلام ان سب پر ”نکرہ“ کا اطلاق ہوگا۔ فرمایا ان کی گردنوں میں جو طوق و سلاسل ڈال دیئے گئے تھے ”حاملانِ قرآن“ اور پیرانِ محمد ﷺ کا فرض ہے کہ انہیں اتار پھینکیں اور آزاد انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا چانس دلا دیں یہ رقبہ۔ نکرہ اس لئے بھی ہے کہ غلام مسلم ہو خواہ غیر مسلم آزادی سب کا حق ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم اور دشوار کام ہے بلکہ انسانی بساط سے باہر بھی کی وجہ ہے کہ قرآن اسے ”العقبہ“ کے جامع لفظ میں بیان فرماتا ہے۔ العقبہ کے معنی بلند پہاڑیوں کی گھاٹیوں کو عبور کر کے چوٹیوں کو سر کرنا ہے جن پر چڑھتے چڑھتے ”جھکن“ پیر پڑتی اور سانس پھول جاتی ہے بلکہ بسا اوقات، مہم جو کی ہمت جواب تک دے جاتی ہے بلکہ میرا آٹھ مرتبہ پہاڑ پر چڑھنے کا مشاہدہ ہے کہ ان دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنا بڑا اہمیت طلب کام ہے میں عہدِ جوانی میں جبلِ نور (جہاں نبی اکرم ﷺ اپنے پیارے دوست ابو بکرؓ کے ہمراہ پہنچے تھے) اور جبلِ نور (جہاں غارِ حرا واقع ہے) کی چوٹی پر پہنچا تھا۔ اور ”العقبہ“ کا پورا منظر آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

یہاں ”فلك رقبة“ پر ”أو“ کے ذریعہ عطف کو استعمال کیا گیا ہے یعنی غلامی سے کامل نجات دلانا بھی مسلمانوں کا فرض ہے اور اسی طرح یہ بھی فرض ہے کہ۔ ”نانِ جویر“ کے محتاج۔ او اطعام ذی مسغبة۔۔۔۔۔ اور ایسے انسان کو جو عزیز و اقارب اور آبادی کے جگہٹے میں رہ کر بھی ”تبا“ ہے کی روزی کو سنبھال دینا بھی واجب ہے۔ اور یتیم و یتیمہ۔۔۔۔۔ اسی طرح جو تار محنت کش سارا دن رٹی کھودتا اور رٹی ڈھوتا ہے یعنی ہر لحاظ سے محنت کش ہے اور ”قوتِ لایموت“ کے دائرے سے نکل نہیں سکتا مقتدر ”جتوں“ پر واجب ہے کہ اسکی معیشت کو بھی سہارا فراہم کریں۔

(بلد، 14: 15)

او مسکینا ذا متربة

اسی طرح حکومت اور اداروں پر واجب ہے کہ سیاسی غلامی سے لے کر معیشتی غلامی تک کے انسداد کی تدابیر کریں۔ بلا امتیاز ملت و مذہب کریں۔ لیکن افسوس کہ ہمارے پیرانِ فقہ و روایات ان تمام ”پالیسی امور“ کو رضا کارانہ (یا نفلی) عمل قرار دے کر ان کی اہمیت کو بالکل ہی نظر انداز فرمادیتے ہیں آخر وحی قرآن ایسے الفاظ کہاں سے لائے جو ان کے کانوں سے گذر کر دلوں میں اتر جائیں؟ اور بول اٹھیں کہ ہمارے اندر فرض کو دیکھو نفل کو تلاش مت کرو۔

یہاں تک تو بات تھی قرآن کی پالیسی امر کی۔ ویسے نزولِ قرآن کے وقت منجملہ دیگر غلامیوں کے دو قسم کی

غلامیاں زیادہ رائج رتھیں۔ خرید و فروخت کی غلامی جسے اسلام ”اعلیٰ قدروں“ اور ”اعلیٰ اخلاق“ کے لئے سم قاتل قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خریدے ہوئے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیتا ہے اور خریدنے کی گنجائش رکھتا بھی ہے تو اس غرض کے لئے کہ انہیں خرید کر آزاد کر دیا جائے۔ غلام بنانے یا فروخت کرنے کے لئے نہ خریداجائے۔

اور غلامی کی دوسری قسم جنگی قیدیوں کی رتھی اسکی بہت ”آخری پالیسی“ جنگِ بدر میں عطا ہوئی کہ انہیں بالکل ہی رہا کر دیا جائے اگر معروفی حالات ساتھ نہ دیں تو تبادلہ میں رہا کریں یا کچھ جنگی تاوان لے کر۔ غلام بہر حال نہ بنائے جائیں۔ کہ اسلام پوری دنیا کے لئے رحمت ہے اور اسکا فیضان سب کے لئے یکساں ہے۔



شمس

## ارادے اور اختیار کا سلب ہونا؟

503

### ونفس و ماسواھا . فالھمھا فجورھا و تقواھا

انسان اور اسکے متناسب اعضاء بنائے اسے فکر و شعور سے نواز کر برے بھلے کی پہچان عطا کی۔ (شمس، 7، 8)

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو بھی پیدا کیا اور اسکے برے بھلے کو بھی جسکے معنی یہ ہیں کہ اب حضرت انسان اپنے کسی بھی معاملہ میں ارادے اور اختیار کا مالک نہیں رہا۔ اور یہ بات قسم کھا کر خدا نے کہی ہے۔

قول فیصل الھمھا۔ کے معنی کسی بھی لغت میں ”پیدا“ کرنا نہیں لکھے۔ زیادہ میں زیادہ اسکے معنی۔ دل میں ڈال دینے کے ہو سکتے ہیں جس سے یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر ”اچھائی“ کی صلاحیت اور ”استعداد“ ودیعت کر رکھی ہے بلکہ اسی ہی کی وضاحت ساتھ ہی فرمادی:

قد الفلح من ذکھا . وقد خاب من دسھا

جس نے اپنے نفس کی نشوونما کی وہ کامران ہو اور جس نے اسکی صلاحیتوں کو روندادہ ناکام و نامراد ہو گیا۔ (شمس، 9، 10)

یہاں ”ذکھی“ کے مقابل ”دسی“ کا لفظ آیا ہے اور دونوں ”صلاحیتوں“ کو ”ابھارنے“ اور صلاحیتوں کو ”دبانے“ سے تعبیر ہیں اور یہ دونوں صلاحیتیں انسان کے اپنے ہی ارادے اور اختیار کی مظہر ہیں۔ اب جہاں تک قسم کھا کر بات کرنے کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ قسم بھی ایک طرح کی گواہی ہی کا عکس ہے، تاہم اسکا صحیح مفہوم قرائن سے متعین ہو گا کہ کہاں قسم سے صرف سوگند مراد ہے اور کہاں صرف گواہی؟ میں نے برہان القرآن کے اکثر مقامات پر ”و“ کو قسم کے مفہوم میں استعمال کیا ہے کہ میرے ذہن پر مصر کے مشہور مفکر علامہ طعلاوی جوہری (1940م) اور ہندوستان کے قرآنی دانشور علامہ عبداللہ العمدادی (1945/1366ھ) کے رشحاتِ فکر مرہم تھے لیکن میرا بعد کا مطالعہ ارسیمیں تبدیلی چاہتا ہے اور میں اسے

قرآن سے مربوط کرنا چاہوں گا۔

☆

اللیل

جہنم میں جو زیادہ بد بخت ہو گئے وہی داخل ہو گئے

504

لا یصلها الا الا شقی

(اللیل، 15)

اس میں وہی داخل ہو گا جو زیادہ شقی اور بد بخت ہو گا۔

یہ ہے کہ۔ ”الاشقی“ فعل کے وزن پر اسم تفہیل کا صیغہ ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ اسمیں وجہ اعتراض وصف کو زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے مثلاً ”اعلم“ کا لفظ ہے جو انسان کی صفت ہے مگر اسے اسم تفہیل کے پیرائے میں لا کر ”فرلوانی“ کا مفہوم پیدا کر لیا گیا ہے یعنی زیادہ علم والا۔ اسی طرح ”الاشقی“ کے معنی ہوں گے زیادہ بد بخت کے یعنی جہنم میں عام سطح کا بد بخت داخل نہ ہو گا جو بڑا بد بخت ہو گا وہی داخل ہو گا۔

قول فیصل

لغت کے بڑے دانشور ابو عبیدہ (826 م) کہتے ہیں کہ عرب ”افعل“ کا صیغہ بول کر اس سے صرف فاعل کا مفہوم لیتے تھے اس طرح ”الاشقی“ کے معنی صرف ”الاشقی“ کے ہوں گے سورہ روم میں اسی وزن پر فرمایا۔ وھواھون علیہ (روم، 27) اور مفہوم لیا گیا ”ھین علیہ“ یعنی فرلوانی کو نرم کر دیا گیا۔ یعنی ”زیادہ تر“ کو صرف ”زیادہ“ میں بدل دیا گیا ہے۔

☆

اللیل

تلاش منزل تھی منزل مل گئی

505

ووجدك ضالا فهدی

(الضحیٰ، 7)

آپ کو ”ضال“ پا کر رہنمائی فرمادی۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں نبی اکرم ﷺ پر ”ضال“ کا اطلاق ہوا ہے جو کسی اچھے مفہوم کا حامل نہیں ہے۔ وجہ اعتراض

ضلال۔ کئی مناسبتوں سے ”ضال“ مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ راستے سے نا آشنا۔ کو بھی

ضال۔ کہا جاتا ہے جسکے تاظر میں ”ہدی“ کے معنی صرف رہنمائی کے ہو گئے ☆ 10-3-96

قول فیصل

نبی اکرم کی پرورش کس نے کی، اور آپ کھاتے کہاں سے تھے؟

506

یہ ایک اہم سوال ہے جسے ”سطحی“ معلومات کے حوالہ سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ لوگوں کو بڑا اعتراض یہ ہے کہ آپ ”یتیم“ تھے ذریعہ معاش کچھ بھی نہ تھا۔ گلہ بانی یا کوئی سی محنت و مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔ اور جب شعور کی آنکھ کھلی آپ نے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ۔۔۔۔۔ ”مذہبی“ اخلاقیات سب سے آسان اور سب سے زیادہ نفع بخش ذریعہ معاش ہے چنانچہ رفتہ رفتہ آپ نے مذہبی رہنماؤں کے سے انداز اپنانے شروع کئے اور ذریعہ معاش تلوار بنی کوہانے کا اعلان فرمادیا۔ روایات میں ہے کہ ان اللہ جعل دزقی تحت ریحی۔۔۔۔۔ اللہ نے میری روزی نوکب سناں میں رکھی ہے دوسرے الفاظ میں روزی کے لئے تلوار چلانا میرا مشن ہے۔۔۔۔۔ اس طرح آپ کی طرف منسوب اس وضاحت کو لوگ ”قرآنی“ اور لوٹ مار سے تعبیر کر کے آپ کی ذات اقدس پر زبان طنز و تعریض دل کرتے رہے۔

میں عرصہ دراز سے اس سوال کو حل کرنے کی فکر میں لگا رہا کہ اگر چہ میں آپ گلہ بانی کر کے پیٹ پالتے رہے تو بوطالب وغیرہ کس کی پرورش کرتے رہے؟ پھر ”گلہ بانی“ سے ملنا ہی کیا ہو گا کہ آپ نے اتنا ہمد مشقت پیشہ اختیار فرمایا؟ غرض کہ یہ اور اس طرح کے کئی سوالات میرے ذہن میں ”شعلہ جوالہ“ بن کر روایات سے بغاوت پر اُبھارتے رہے بلکہ میں عملاً اثبات کو چھوڑ کر نفی کی طرف ڈر گیا کہ اس سے کم از کم عصمتِ پنجبر کا تحفظ تو ہو سکتا تھا۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی میں جو کچھ سورہ ”النضحی“ کے تناظر میں سمجھا ہوں قارئین ”میزان القرآن“ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ارشاد ہے :

- I۔ الم یجدک یتیمًا فاویٰ کیا اللہ نے آپ کو تنہا کردلوں میں نہیں بسایا۔ (ضحیٰ، 6)
- II۔ ووجدک عائلًا فاغنیٰ کیا اللہ نے تمہیں بہت سوں کا معاشی کفیل پا کر بے نیاز نہیں بنایا۔ (ضحیٰ، 8)

یہ ہے کہ یہ دونوں جزواں آیتیں مخالفین اسلام کی تائید کرتی ہیں کہ آپ کا ذریعہ معاش کچھ بھی نہ تھا اور آپ کی نورانی شخصیت روایات کے آئینے میں غبار آلود نظر آتی ہے۔

وجہ اعتراض

حضور نبی اکرم ﷺ کے ابتدائی حالات زندگی ”پردہ خفا“ میں ہیں تاہم جو کچھ معلوم ہو سکے ہیں ان کی رو سے آپ کی پرورش کس نے کی اور آپ کھاتے کہاں سے تھے؟ کا جواب مل سکتا ہے

قول فیصل

کیونکہ آپ کے والد جناب عبد اللہ تاجر تھے تجارت آپ کا پیشہ تھا۔

خود جناب عبد المطلب مکہ کے بڑے تاجر اور سردار تھے ہمسایہ ممالک سے معاہدے کرتے اور داخلہ و خارجہ امور میں خود مختار فرماں روا تھے آپ کے آٹھ بچے اور چھ بیٹیاں تھیں، بڑا بیٹا حارث فوت ہو چکا تھا ان میں سے تین بچے عبد اللہ، زبیر اور بوطالب ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ سب اپنا کاروبار کرتے تھے حتیٰ کہ بوطالب جو کہ پاؤں میں لنگ رکھتے اور اپاج تھے اور کہیں سفر کرنے کے قابل نہ ہونے کے باوجود وہ بھی کعبہ کے دروازوں پر بیٹھ کر لوہان و دیگر خوشبوئیات بیچ کر گذر بسر کرتے تھے۔ جناب عبد اللہ اور زبیر بھی تاجر تھے شام اور یمن جاتے اور وہاں سے مال لا کر مکہ کے بازاروں میں فروخت کرتے ان دنوں بارنر سسٹم بھی تھا اور درہم و دینار کی صورت میں قیصر و کسرے کے سیکے بھی



”مبادلہ“ کا کام دیتے تھے جناب عبدالمطلب نے ہر بچے کو تجارت پیشہ بنادیا تھا۔ ابولہب و دیگر نے بھی تجارت ہی کو ذریعہ معاش بنالیا تھا۔ حضور ﷺ کے تقریباً ہم عمر دو چچا جناب حمزہ اور عباسؓ بھی اپنے والد عبدالمطلب ہی کے رستے پر گامزن تھے۔ آپؐ کے والد عبد اللہ مال لے کر شام جاتے اور واپسی پر اپنے نھیاں کے ہاں مدینہ منورہ میں سستانے کے لئے ایک دو روز کے لئے رک جاتے اور تازہ دم ہو کر مکہ روانہ ہو جاتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ آپؐ تجارت کا مال لے کر لوٹے تو مدینہ منورہ میں دھماکا پڑ گئے جناب عبدالمطلب کو پتہ چلا تو اسکے ماں جائے بھائی زبیر کو ”تہار داری“ اور علاج کے لئے بھیج دیا ابو طالب سفر کے قابل نہ تھے نہ جاسکے۔ جناب زبیر نے ”مرض الموت“ میں اپنے جگری بھائی کی خبر گیری کی لیکن وہ ”جان بر“ نہیں ہو سکے اور وفات پا گئے اور زبیر اسکے کفن و دفن کا انتظام کرنے کے دو چار دن بعد ان کا تجارتی مال لے کر مکہ روانہ ہو گئے۔ اس طرح پردیس میں بھائی کی موت ان کے لئے ہمیشہ روح فرسا رہی۔ لیکن قدرتِ خدا نے اسکے زخم مندمل کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ اور دو ہی ماہ بعد متوفی عبد اللہ کے گھر حضور نبی اکرم ﷺ کی صورت میں وہ آفتاب عالم تاب طلوع ہوا جسکی چکا چوند روشنی سے دنیا سے ”اندھیروں کے“ چھٹنے کی ”شروعات“ ہو گئی۔ زبیر کو اپنے چاند سے بچنے سے بے حد پیار تھا وہ اسے اپنے ہاتھوں پر جھلاتے اور بافتاق موڑ خین کہتے تھے :

”یہ محمدؐ میرے بھائی کی نشانی ہے عیش و آرام سے جیسے اسکی حکومت اور مال میں کمی نہ آئے اور سب بچوں سے بے نیاز ہو لو اور اتنا جیسے کہ بوڑھا ہو جائے۔“

(ملاحظہ ہو قدیم مورخ ابو جعفر محمد بن حبیب ہاشمی (860م) کی شہرہ آفاق کتاب ”المنطق“ طبع دائرة المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن صفحہ 435 ————— ابن حجر (1449م) کی میرت صحابہ ”الاصابہ فی تمیز الصحابة“ طبع مصر جلد 308/2 —————) (\*)

بلکہ عبد الرحمان سیہلی (1114م) نے حضرت زبیر کی ”امتیازی“ عادت کے مضمین میں لکھا ہے کہ

وهو الذي كان يرقص النبی وهو طفل

”یہ وہی چچا زبیر تھے جو نبی اکرم ﷺ کو ہر وقت ہاتھوں پر جھلایا کرتے تھے۔“ (الروض الانف طبع مصر صفحہ 78)

اسی زبیر کی بابت سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ ————— عبدالمطلب نے اپنے منصب کا وارث اور ولی ان ہی کو بنایا تھا

(لائف آف محمد صفحہ 10) (LIFE OF MUHAMMAD p10)۔ کیونکہ عبدالمطلب نے بوچاپے کی وجہ سے

”زبیر“ ہی کو تجارت و سیادت کا نائب بنا رکھا تھا اس طرح نبی اکرم ﷺ کے والد عبد اللہ بھی تاجر تھے اور ایک بڑے مکان

کے مالک تھے جو آج بھی صفا سے نکل کر جنوب کی طرف آئے تو چارپانچ سو قدم پر غزہ میں مولد النبیؐ (جائے ولادت) کے

نام سے مشہور ہے۔

(\*) زبیر کی گواہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پیدائشی طور پر ”مال فروشوں کے مالک“ تھے جسکی تواسکی فراوانی میں ”کمی“ نہ آنے کی بات کی گئی ہے۔ نیز یہ کہ مال فروشوں کے مالک ہونے کے باعث ہی ”پرورش“ کے لئے کسی ”اکل“ کی مدد کی ملک کے محتاج بھی نہیں تھے نہ ابو طالب کے نہ ہی کسی اور کے زبیر کے محتاج بھی نہیں تھے وہ صرف مگر اس طرح اس حوالہ میں اس سوال کا جواب موجود ہے کہ آپؐ کھاتے کہاں سے تھے؟



تھے بلکہ اکثر اوقات اس معاہدہ کا ذکر خیر بھی فرمایا کرتے تھے (تنبہ احادیث) اس معاہدے کے بعد جب زہیر فوت ہوئے تو آنحضرت ﷺ کی عمر 21-22 سال کی تھی۔۔۔۔۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دادا اور تایا نے جس لاڈ پیار سے آپ کی تربیت کی اور آپ کے والد کے ”اندختہ“ کو کاروبار میں لگا کر ”مالی استحکام“ بخشا سکے بعد یہ سوال پیدا نہ ہونا چاہیے تھا کہ آپ کھاتے کہاں سے تھے؟ مؤرخ بلاذری (894م) لکھتے ہیں کہ،

عبدالمطلب نے زہیر ہی کو وصیت کی تھی کہ میرے بعد تم ہی ان کو اپنے ساتھ رکھنا۔

(انساب الاشراف طبع مصر جلد 1/85)

کیونکہ نبی اکرم ﷺ ”تایا“ اور دادا کے گھر میں پلے، اسی گھر سے مانوس اور اسی تایا کے کاروبار میں، سیم و شریک تھے لہذا عبدالمطلب کی وصیت کچھ بچا نہیں تھی۔ اب اسی تناظر میں نبی اکرم ﷺ کی ولادت (571م) سے لے کر زہیر کی وفات (593م) تک کے مابین وہ ”عرصہ“ دکھانا چاہیے جبہ کسی لمحہ آپ پر ابو طالب نے دستِ شفقت رکھایا پرورش کی؟ یا بچے کے نام پر کوئی تحفہ بھیجا۔ یا کسی مناسبت سے بچی پکائی چیز پر مدعو کیا یا رسال کر دی؟ پس جب صورتحال یہی رہی تو ایک مخصوص طرز فکر کے مؤرخین کا یہ تاثر دینا کہ نبی اکرم ﷺ یتیمی کی ”کسمپرسی“ کی حالت میں تھے کہ ابو طالب نے آپ کی پرورش کا بوجھ سہارا اور تازیست سر پر دستِ شفقت رکھا؟ نہ صرف واقعات کی صریح تکذیب ہے تاریخ کو غلط بیج پر ڈال کر جرات و جسارت کا بجا اظہار بھی ہے۔ بلاذری (894م) نے پوری شدت سے اس تاثر کو زائل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ،

روى بعضهم ان الزبير كفّل النبي صلى الله عليه وسلم حتى مات ثم كفله ابو طالب بعده وذاك غلط

لان الزبير شهد حلف الفضول ولرسول الله صلى الله عليه وسلم يومئذ نيف وعشرون سنة  
کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے پہل نبی اکرم ﷺ کی کفالت آپ کے چچا زہیر بن عبدالمطلب نے کی تھی لیکن اسکے عرتے ہی ابو طالب نے یہ سعادت سمیٹ لی تھی لیکن یہ غلط ہے اور تاریخی جھوٹ ہے کیونکہ زہیر ”حلف الفضول“ کا بانی ہے اور ان ہی کی مساعی سے یہ معاہدہ عمل میں آیا تھا اور اسکے بعد ہی (کسی وقت وہ) فوت ہوئے تھے اس وقت نبی اکرم ﷺ کچھ لو پر بیس برس کے کزمل جوان تھے (جو محتاج پرورش، نہیں تھے)۔  
(انساب الاشراف طبع مصر جلد 1/85)

اس طرح واقعات گواہ ہیں کہ آپ کی ہمشور معنے میں ابو طالب نے پرورش کی ہی، نہیں۔ دادا نے کی۔ یا دادا کے ساتھ رہنے والے بچے زہیر نے کی اور وہ بھی اس حال میں کہ آپ کی پرورش میں والد۔ عبد اللہ کا ”ترکہ“ شامل تھا اب یہ بات صاف ہو گئی کہ پیغمبر کھاتا کہاں سے تھا؟

بلاشبہ ابو طالب چچا تھے قابلِ احترام تھے لیکن جس تایا کی نفی کرتے ہوئے پرورش کو ان کے کھاتے میں ڈالنے کی جسارت کی گئی ہے اسکی اصل ہے نہ بنیاد۔ بلکہ زہیر کے بعد جب ابو طالب خاندان کے بڑے بنائے گئے تو وہ بالکل ہی

مفلس اور ”قلاش“ تھے سیدنا علی خود ہی ”شہادت“ دیتے ہیں کہ ابی ساد فقیر او ماساد فقیر قبلہ  
 ”میرے والد ابو طالب مفلس اور غریب تھے کہ ان پر سیادت کا یہ جھگڑا اور ان سے پہلے کوئی  
 بھی مفلس نہیں گذرا جس نے افلاس کی حالت میں سیادت کی ہو۔“ (یعقوبی جلد 2/14)

یعقوبی کی طرح دوسرے شیعہ مؤرخ و شارح ابن ابی الحدید نے بھی ”نہج البلاغہ“ میں ابو طالب کے  
 بارے میں لکھا ہے۔ کان مقلا من المال۔ ”آپ مالی لحاظ سے دست خالی تھے۔“ (جلد 3/456)

اس تناظر میں نہ صرف یہ کہ ابو طالب نبی اکرم ﷺ جیسے عیش و ”رفاہیت“ میں پلنے والے شہزادے کی  
 تربیت اور ”پرورش“ کرنے کی سکت نہ رکھ سکتے تھے عام طور پر اپنے بچوں کی پرورش کرنے کی سکت سے بھی عاری تھے آپ  
 کے لڑکے جعفر طیار کی ولادت ہوئی تو پرورش ایک سنگین مسئلہ بن گئی لیکن ابو طالب کے سوتیلے چھوٹے بھائی عباس بن  
 عبد المطلب نے پرورش کا ذمہ لے کر ان کا بوجھ اٹھالیا اسی طرح اسکے دس سال بعد جب حضرت علیؑ پیدا ہوئے تو ابو طالب  
 کے لئے وہ بھی پریشانی کا موجب بن گئے تو حضور ﷺ اسے اپنے گھر لائے اور پرورش کی۔

ابو طالب غریبی اور افلاس کی سرداری کے باعث اتنے کمزور تھے کہ سرداری پر آپ کی گرفت اس حد تک  
 ڈھیلی پڑ چکی تھی کہ خاندانی ”ضبط“ و نظم درہم و درہم ہو چلا تھا اور قریب تھا کہ غریبی اور ناداری کی سرداری کی وجہ سے کعبہ  
 کی ”تولیت“ اور منصب۔ العمارۃ۔ و۔ السقایۃ بھی ”بد نظمی“ کی نذر ہو جاتا کہ اس خاندانی اعزاز کو چانے کے لئے آپ کے  
 چھوٹے بھائی عباسؑ نے سنبھالا دیا جس سے وہ اپنے موجودہ بھائیوں میں ”زیادہ مقبول“ ہوئے۔ اس طرح زہیر کی وفات  
 کے بعد آپؑ نے تمام کاروبار بلا شرکت غیرے سنبھال لیا۔ اور آپ کی تجارتی دیانتداری کا اتنا شرہ ہوا کہ وقت کے تاجر آپؑ  
 کے پاس لانتیں رکھتے اور کاروبار میں شراکت کی آرزو لئے ہوتے بلکہ حضرت خدیجہ الکبریٰ (620 م) نے جو تازہ بیوہ ہوئی  
 تھیں ”شریک تجارت“ بننے کی دعوت دی اور آپؑ نے اسے بھی مالامال کر دیا پھر جب شادی کی تحریک ہوئی تو آپؑ نے  
 خدیجہؓ کے حق المہر میں بیس ”اونٹ“ بھی دیئے اور دیگر تحائف مستزاد بلکہ ابو جعفر بن حبیب نے لکھا ہے کہ بارہ اقیہ (ایک  
 اقیہ ایک اونٹ کے برابر) سونا بھی شامل تھا۔“ (کتاب الحجر۔ طبع دائرہ المعارف العثمانیہ دکن صفحہ 79)۔۔۔۔۔

اور اتنا ”حق المہر“ اپنے وقت کے لحاظ سے بڑے رئیس اور ”مالدار لوگ“ ہی دیا کرتے تھے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ یہ  
 اونٹ ابو طالب نے دیے تھے۔ کتنا غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔۔۔؟ ان میں ایک ”دُنبی“ دینے کی سکت بھی نہیں رہی بیس  
 اونٹ کیسے دے سکتے تھے؟ تاریخ سازی میں اتنے مبالغہ اور جھوٹ کو شامل کر کے بالکل ہی مشکوک بنا دینا اچھا نہیں لگتا۔  
 اسی طرح یہ بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ آپؑ سیدہ خدیجہؓ کے مالی تجارت سے اتنے مالدار ہو گئے تھے کہ بوقت شادی اتنا  
 سونا اور چوپائے، حق المہر میں ارزاں فرمائے تھے۔ کیونکہ سیدہ خدیجہؓ کا ایثار و قربانی کا دور اگر شروع ہونا تھا تو وہ شادی کے  
 بعد ہی ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے جو کچھ تھا۔ اپنے اور تایا کے مالی تجارت میں نفع و برکت کا کرشمہ تھا۔

تاریخ و واقعات کی روشنی میں آپؑ ”مہد“ سے لے کر ”لحد“ تک خوشحال تھے اور خوشحال رہے۔ قیسی کے

باوصف مکان بھی اپنا تھا اور سر پرستی بھی گھر ہی کی تھی۔ ایسے میں الم بجدك یتیمہ فاوی کے معنی پناہ میں دینے اور پرورش کرنے کے صحیح نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ الفاظ متعدد معانی میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن ان میں سے وہی معنی مطلوب ہوں گے جو موقع و محل کی مناسبت سے ”موزوں“ بھی ہوں اور قرائن بھی جس کی تائید کریں۔ بنا بریں ”آوی“ کے معنی ہوں گے دل میں بسانے کے۔ عربی میں کہتے ہیں آویت له یعنی۔ رجعت الیہ بقلبی

میں نے اسکو اپنے دل میں بسایا۔ (راغب طبع دار الفکریرت صفحہ 28 سطر 23 تا 24 کالم نمبر 1)  
اس ضمن میں ایک محاورہ بھی نقل کیا ہے تقول آوی الی۔ کذا انضم الیہ۔ سینے لگانا اپنے میں شامل کر دینا (صفحہ 28 سطر 14) اس طرح معنی ہوں گے۔ اللہ نے تمہیں یتیم دیکھ کر عبدالمطلب اور زبیر کی دل کی ہستی میں بسایا۔ اور بلاشبہ اللہ کے یتیم نوازی کے ڈھنگ نرالے ہیں۔

**عائلا۔ کسے کہتے ہیں؟** سورہ ”الضحیٰ“ کی آیہ نمبر 8 میں ”عائلا“ کا لفظ آیا ہے جس کے مفہوم میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسکے معنی ”مفلس“ اور تلاش کے ہیں۔ لیکن میرے ”استقراء“ کے مطابق کسی بھی لغت میں اس مفہوم کی کوئی سند نہیں ملتی۔ اور جہاں تک مفسرین کا ”ادعا“ ہے کہ۔ بہتند ہے میرا فرمایا ہوا تو میں اسے نہیں مانتا دلیل و حجت کی قدر و قیمت ضرور ہے لیکن یہ مفسر نہ معصوم ہیں نہ مصب رسالت پر فائز۔ لہذا ان کی بات قابلِ شنوائی تو ہو سکتی ہے قابلِ ”پذیرائی“ نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ قرائن کو معنی آفرینی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ بلکہ متعدد مفہام میں سے ”قرینہ“ کو یہ ”توانائی“ حاصل ہے کہ کسی ایک معنی کا تعین کر پائے اور اس ”قار مولے“ کو ”عائلا“ کی تنقیح میں بے کھٹکے استعمال کیا جاسکتا ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں ”عائلا“ کے معنی کسی فرد یا افراد کی پرورش کرنے کا بوجھ اٹھانے والے کے ہیں کہ تاریخ بھی اس کی مؤید ہے اور لغت بھی ضوابطِ فطرت بھی اور استعمالاتِ عرب بھی کیونکہ عربی میں ”عول“ کثرت کو کہتے ہیں کثرت مال کی ہو یا اولاد کی۔ ”العیال“ وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو۔ (راغب طبع دار الفکریرت صفحہ 367)

عربی میں کہتے ہیں ”عائلا شہرا اذا کفاه معاشہ“۔

اس نے ایک ماہ کے لئے فلاں کے کھانے پینے کا ذمہ لے لیا۔ (مختار الصباح عبدالقادر رازی صفحہ 463)  
اور ادبیاتِ عرب کے ایک راہوار ابو عمر والدوری کہتے ہیں کہ حمیر (HIMYAR) کی زبان میں ”عول“ مال و اولاد کی کثرت پر بولا جاتا ہے بول شاعر۔

ان الموت بأخذ کل حی

بلا شک و ان امشی و ان عالا

بلاشبہ موت ہر انسان کو دوچ لیتی ہے خواہ اسکے پاس مویشیوں اور اولاد کی کثرت ہی کیوں نہ ہو۔

(نیل المرام صدیق حسن (1889م)، طبع مصر صفحہ 102)



امام شافعی (820 م) بھی اسکے معنی کثرت عیال ہی کرتے تھے۔ (تفسیر رازی طبع مصر جلد 9/178)

ان مستند حوالہ جات کی موجودگی میں بلاوجہ و بلاسبب ”عائلا“ کے معنی بالکل الٹ۔ تلاش اور ”مفلس“ کے موزوں نہیں ہو سکتے۔ خاص کر رسول اکرم ﷺ حیثیت تاجر۔ ابن تاجر اور ابن تاجر ”مفلس“ ہو ہی نہیں سکتے تھے آپؐ تجربہ کار تاجر تھے۔ سنے باز، نہیں تھے کہ کبھی تو نگر۔ تو کبھی دست نگر رہے ہوں بلکہ مصب تبلیغ پر فائز ہونے کے بعد تو آپؐ کے افلاس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جبکہ عام انسانوں کی بابت بھی فرمایا کہ ----- ان کے لئے بھی ”مالی سارا“ ہی بقا کا ضامن ہے اموالکم الٰہی جعل اللہ لکم قیاما۔

تمہارے اموال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے بوساسرا (قیاما) بنایا ہے۔ (نساء، 5)

بات صاف ہو گئی کہ رسول اکرم ﷺ پیدائشی طور پر خوشحال تھے اور خوشحال رہے مکہ میں خواہ مدینہ میں لوگوں کی کفالت اور معاونت فرماتے رہے مکہ میں حضرت خدیجہؓ ----- حضرت علیؓ ----- حضرت زیدؓ ----- حضرت زینبؓ اور اسامہ بن زید اور دیگر کی کفالت کا بوجھ آپؐ ہی نے اٹھایا ہوا تھا۔ اسی طرح مدینہ میں افراد خانہ کے علاوہ۔ ”ابو طالب“۔ اصحابِ صفہ و دیگر نادار و بے سارا خواتین بھی آپؐ ہی کے در پر پلنے والیاں رتھیں۔ اب ایسے میں صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی جو دو سخا اور کرم کی عادت کو جاری رکھنے کے لئے اللہ سبحانہ نے مزید مالی وسائل کی بہتات سے آپؐ کو نوازا ہو بلکہ ”عائلا“ کے بعد ”فاغنی“ کا فعل اس حقیقت میں مزید ”تکھار“ پیدا کرتا ہے کہ آپؐ نے کسی بھی مرحلے پر انسانی ساروں کو نہیں اپنایا۔ بلکہ ”اغنی“ کے ایک معنی ”بے نیاز“ بنادینے کے بھی ہیں آپؐ نہ زہر کے سارے کے محتاج تھے اور نہ ابو طالب کی ”مفروضہ پرورش“ کے۔ اللہ نے حضورؐ کو اپنے ہی ذرائع سے سب سے ”بے نیاز“ بنا رکھا تھا۔



انشراح

## تیز دھار آلہ سے سینہ پیغمبر شق کیا گیا

507

الم نشرح لك صدرك . ووضعنا عنك وزرك

(انشراح، 3:1) کیا ہم نے آپؐ کا سینہ کھول نہیں دیا۔ اور آپؐ کا بوجھ ہٹا نہیں کیا۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”لك“ اور ”عنك“ کے اشارات لائے بغیر بھی جملہ مکمل تھا انہیں لانے سے کیا فائدہ؟

وجہ اعتراض

فائدہ یہ ہے کہ یہاں ”انواع بلاغت“ کے ایک خاص ”نوع“ کو استعمال میں لایا گیا ہے اسکی خاصیت یہ ہے کہ پہلے ”اہام“ سے کام لے کر، مبہم بات کی جاتی ہے پھر وضاحت ہوتی ہے مثلاً

قول فیصل

پہلے، مبہم ”لجہ“ میں فرمایا، ”الم نشرح لك“ اتنے فقرے سے محسوس ہوا کہ اسکی تشریح ضرور ہوگی اتنے میں فرمایا ”صدرك“ اس پر وہ تشریح سامنے آگئی۔ یعنی کیا کھولا۔ فرمایا۔ سینہ۔ یہ دراصل ”مکشادہ ظرفی“ اور وسع القلبی کا استعارہ

ہے۔ اسی طرح ”ووضعنا عنک“ جب فرمایا تو سلسلہ کلام میں تشنگی اور ایہام کا احساس ہونے لگا کہ کیا ”ہلکا“ کر دیا؟ تب فرمایا ”وزرک“ ذمہ داری کا وہ بوجھ جس نے آپ کی کمر کو جھکا دیا تھا۔ اعوان و انصار پیدا کر کے اسے بانٹ دیا۔

نمبر 2۔ یہ ہے کہ انشراح صدر سے شق صدر مراد ہے یعنی غار حرا۔ میں ایک مرحلے پر فرشتے نے آپ کا ”سینہ چاک“ کر کے اندر سے ”دل“ نکال کر زمزم سے دھو ڈالا پھر سینے میں رکھ کر ”سی“

**وجہ اعتراض**

دیا۔

یہ ایک ”بے سروپا“ قصہ ہے جسے قصہ گو ”ابجدیوں“ نے تخلیق کیا اور ”اجتہاد پرست“ وقت کے بریلویوں نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ ورنہ تو شرح صدر کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ حقیقت واضح

**قول فیصل**

ہونے کا استعارہ ہے اس سے زیادہ کچھ، نہیں۔ لغت اور ادب موجود ہیں نظائر تنزیل ”مشاہدہ“ کئے جاسکتے ہیں ان میں کسی بھی زلویہ سے ”سینہ چاک“ کرنے کے معنی نہیں لکھے۔ سیدنا موسیٰ کو جب فرعون سے ڈائیلاگ کرنے کا حکم ملا تو ”ملکوتی“ ہوئے کہ۔۔۔ رب اشرح لی صدری۔۔۔ اے ربوبیت کے مالک میرا سینہ کھول دے تاکہ میں حقیقت کو اپنی جہت پر واضح کر سکوں (طہ، 25) اور ظاہر ہے کہ موسیٰ کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ میرا سینہ چیر کر اس میں سے بروٹی نکال کر ”جرات و بہادری“ رکھ کر پھر سلائی کر دے۔ بلکہ ”زمر“ میں کسی اولوالعزم انسان کی بابت نہیں ما و شما کی بابت فرمایا۔

افمن شرح الله صدره للاسلام فهو على نور من ربہ۔۔۔

جس کسی کا اللہ نے اسلام کے لئے سینہ کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر چل پڑا۔ (زمر، 22)

تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کا سینہ کسی تیز دھار آلے سے چاک کر کے پھر ہمارے دلوں کو نور ایمان سے بھر دیا گیا؟ پس اگر سارے قرآن میں ”شرح صدر“ کے معنی ”سینہ چاک“ کرنے کے، نہیں تو صرف اسی ایک مقام پر اسکے معنی اور مفہوم کیسے بدل گئے؟ کیا دوسرے انبیاء کو تو آسانی سے نور نبوت ارزاں ہو مگر نبی اکرم ﷺ کے دل و سینے کو اذیت ناک آپریشن کے ذریعہ ”آلودگیوں“ سے پاک و صاف کر کے منور کر دیا گیا۔ بارہ کچھ تو رحم کر دو۔



التین

انسان۔ یا۔ یوزنہ؟

508

لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم

بلاشبہ ہم نے انسان کو تناسبِ اعضاء اور خوبصورتی سے پیدا کیا ہے۔ (تین، 4)

میں کہا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق جن عناصر سے ہوئی ہے ان میں بدبودار کچھڑ بھی شامل ہے جو احسن تقویم کے منافی ہے۔

**وجہ اعتراض**

یہ کروڑہا سال پہلے کی بات ہے جب انسان کا ”خمیر“ مٹی سے اٹھایا جا رہا تھا پھر کروڑہا سال اسکے بعد

**قول فیصل**

اس خیر میں ”حیاتِ محض“ کا عنصر شامل کیا گیا۔ اس طرح اس حیاتِ محض یعنی جرثومہ حیات کو نطفہ کا پیکر دیا گیا پھر اسی نطفے سے حیوانات کو وجود عطا ہوا۔ اور ہمیں سے آگے کی تخلیق کے مراحل کا آغاز ہوتا ہے۔ جسکی بابت ڈارون (DAR-WIN) کہتا ہے کہ انسان پہلے پہل ”بوزنہ“ کے روپ میں نمودار ہوا پھر ارتقائی مراحل سے گذر کر موجودہ شکل میں ”مٹھل“ ہوا۔ وغیرہ۔ لیکن ڈارون کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے پہلے ہی مرحلے پر انسان کو ”ترقی یافتہ“ شکل دے کر ”ذوقِ جمال“ کے انتہائی تقاضوں کی تکمیل کر دی تھی اُسے حسن و خوبصورتی کا پہلے ہی سے ”مرقع“ بنادیا گیا تھا۔ وہ بوزنہ نہیں بنایا گیا۔ بوزنہ بد صورت ہے اس پر احسن تقویم کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر اگر انسان کسی بد صورت جانور کی ترقی یافتہ شکل ہے پھر آئندہ کے لئے بوزنہ کے ارتقاء موجب اب جو یہ جنگلوں اور پہاڑوں میں کروڑوں ”بوزنوں“ موجود ہیں انسان کیوں انہیں بن پائے تاکہ ان کی نسل ہی نہ ہو۔

مشاہدہ کی گواہی تو یہ ہے کہ انسان 16 کھرب سال سے اسی پیکر میں چلا آ رہا ہے جو واضح کرتا ہے کہ روز اول ہی سے اسی طرح تخلیق ہوا ہو گا بلکہ چاہیے تھا کہ بوزنہ ترقی کر کے انسان بن پایا تھا تو اس کا وجود ہی باقی نہ رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں نظریہ ارتقاء میں کوئی ”تعطل“ واقع نہیں ہوا۔ اللہ کے نزدیک ”تخلیقی مراحل“ کے معنے ہیں کہ جب سے یہ انسان نطفہ کے رنگ میں نمودار ہوا تو اس نطفے کو ایک خاص مدت تک محفوظ مقام (رحم مادہ) میں منتقل کر دیا گیا۔ اس مقام پر وہ لو تھڑے میں تبدیل ہوا اور وہیں پر اسکے اعضاء تکمیل کو پہنچے اور آخری مرحلے پر انہیں ”حیات“ کا ظہور ہوا اسی طرح یہ ”ہیولی“ ارتقائی منازل سے گذر کر انسانِ کامل بن گیا۔ اور اللہ کے یہی وہ تخلیقی مراحل ہیں جن کی سائنس بھی تائید کرتی ہے اور الفاظِ قرآن بھی۔



## انسان درجہ حیوانات میں

509

### ثم رد دناہ اسفل سافلین

(تین، 4)

پھر ہم نے اسے کرے ہوؤں کی طرف لوٹا دیا۔

یہ ہے کہ انسان کو خوبصورتی اور جمال کے اعلیٰ ذتبہ پر پہنچا کر پھر اسے حیوانات کی سطح پر لے آنا

بہت بڑا اقدام ہے۔

وجہ اعتراض

”راغب“ نے اس اعتراض کو ”احسن تقویم“ کے ساتھ ہی نمٹا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔ انسان

قول فیصل

نہ صرف جسمانی ساخت کے لحاظ سے خوب اور خوبصورت بنایا گیا ہے۔ ”احسن تقویم“ کے وسیع تر تناظر میں اسکی اخلاقی سطح کو بھی بلند اور قابلِ رشک بنایا گیا تھا۔ لیکن وہ بلند اقدار کی رعایت نہ کر سکا۔ بلندی سے پستی کی طرف چلا آیا اس طرح وہ اپنا مقام کھو بیٹھا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان بھی لے آئے، اچھے کام بھی کئے اور اخلاقی سطح سے کرنے بھی نہ پائے تو ان کا صلہ ”وافر“ اور غیر ”منقطع“ ہے۔

(التین، 6)

☆

علق

## 510

## قول فیصل

(علق، 1-4)

اس طرح یہاں ربوبیت، تخلیقِ عالم اور قلم کی اہمیت جتانے کا اعلان مقصود تھا اور آپؐ سے یہی اعلان کروا کر مستقبل کا پروگرام سنوایا گیا۔ دوسرے الفاظ میں ان آیات میں پڑھنے (اقراء) اور لکھنے (علم بالقلم) کی اہمیت کا احساس دلایا کہ جسے یہ دونوں ”توانائیاں“ حاصل ہونگی وہی ”موزو وحی“ اور حکمرانی کا ادراک کر سکے گا یعنی ضروری ہے کہ ہر انسان پڑھا لکھا بھی ہو اور غور و تدبر کی صلاحیتوں سے آراستہ و پیراستہ بھی گویا بتلادیا کہ ہر انقلاب کے لئے قلم و قلم کی توانائی حاصل کرنا لازمی ہے۔ دوسرے بول میں نبی اکرم ﷺ کے ”انقلابی“ پروگرام میں ”تعلیم“ پہلے ہی مرحلے میں ”لازمی“ قرار دے دی گئی تھی تاکہ معرفتِ اشیاء کے ساتھ تخلیقِ کائنات کے راز بھی فاش ہوتے چلے جائیں۔



بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا

كلا لئن لم ينته لنسفعا بالناصية

وہ اگر نہ رکے گا (یعنی اپنی سرکشی اور جرائم پر قائم رہے گا) تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیں گے۔  
(علق، 15)

میں کما جاتا ہے کہ پیشانی پر بال، نہیں ہوتے اب پکڑنا اور گھسیٹنا کیا معنی رکھتا ہے نیز اتنے غیر اہم کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دینا۔ اللہ سبحانہ کو ذیہ، نہیں دیتا۔

## وجه اعتراض

یہاں ”پکڑنا“ دلیل و رسوا کرنے کا استعارہ ہے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ خاص کر عربی میں ناصیۃ کو ناصیۃ القوم کی ترکیب سے استعمال کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاں بھی

## قول فیصل

”بغیر“ اضافت کے ہو وہاں۔ ”باضافت“ ہی مراد ہے اور معنی ہوں گے قوم کے سردار۔ وڈیرے وغیرہ۔ اس طرح معنی ہوں گے شریار اور سرکش لوگوں کے سرداروں کو پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اردو کا محاورہ ہے کہ فلاں صاحب اپنی قوم میں چوٹی کا آدمی ہے۔ یوں بھی جرم کے بعد انسان کی پیشانی پر جو انفعالات مرتسم ہوتے ہیں وہی اسکے پکڑے جانے کا موجب بنتے ہیں یعنی اسکی پیشانی گویا اس کے جرم پر گواہ بن جاتی ہے۔ ☆

إِلَيْهِ

رسول اللہ دیکھ کر بڑھتے تھے۔

رسول من الله يتلوا صحفا مطهرة فيها كتب قيمة

یہ اللہ کا ایسا رسول ہے جو ان پاک صحیفوں کو بھی دیکھ کر پڑھ لیتا ہے جن میں مستحکم آیتیں ہیں۔ (البینہ، 2-3)

یہ ہے کہ ان نکیات میں رسول اکرم ﷺ کے دیکھ کر پڑھنے کی خبر دی گئی ہے جبکہ ہم شیعوں کے نزدیک آپ مالک ہی ”ان بڑھ“ تھے۔

**وجه اعتراض**

سنی پچارے بھی کیا کریں کہ ان کے اکابر قرآن کی تصریحات کے برعکس ہمیشہ یہ باور کراتے رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ہمیشہ نابلد رہے ایسے میں ان سے توقع رکھنا کہ وہ سید البشر ﷺ کو

## قول فیصل

پڑھا لکھا تسلیم کر لیں گے خام خیالی ہے۔۔۔۔۔ بہر حال اس موضوع پر سابقہ میں بارہا وضاحت ہو چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب تک سنی تھے ان پڑھ تھے جب رسولؐ نے تو علم کتابی سے بھی آشنا ہوئے اور ہاتھ سے لکھنے پڑھنے پر قادر بھی۔ اور آپؐ کے لکھنے پڑھنے کو اکثر مقامات پر ”تلاوت“ سے موسوم کیا گیا ہے جسکے معنی ”دیکھ“ کر پڑھنے کے ہیں۔ راغب نے اسی بنا پر



کہا ہے کہ ہر "تلاوت" کو "قرأت" کہا جاسکتا ہے لیکن ہر قرأت۔ تلاوت نہیں کہی جاسکتی۔

(مفردات القرآن طبع بیروت صفحہ 72)

کیونکہ تلاوت ایک تو "دیکھ" کر پڑھنے کو کہا جاتا ہے دوسرا اسکا اطلاق صرف قرآن پر ہوا ہے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ۔  
اتلوا القرآن۔ یا۔ تلوت القرآن۔ لیکن اتلوا البخاری۔ یا تلوت البخاری، نہیں کہہ سکتے کہ بخاری غیر از قرآن ہے  
اسکی تلاوت ناجائز ہے۔ اسکے لئے قرأت کا اطلاق ہی جائز ہے اور قرأت عام ہے دیکھ کر پڑھنے کو بھی کہتے ہیں اور حفظ۔  
سے پڑھنے کو بھی۔

یہ یاد رہے کہ آیہ زیر بحث میں "صحفا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو حقیقت اپنے  
اصلی رنگ میں موجود تھی رسول اکرم ﷺ نے اسے مسترد نہیں فرمایا اسے قرآن ہی کی طرح پڑھ کر سنایا اور جو حقیقت  
نہیں تھی اسے نہ پڑھنے میں شامل گیانہ کسی بیان میں۔ ☆

زلزلة

مصدر کو مضاف بنانا

513

اذا زلزلت الارض زلزالها

(زلزال، 1)

جب زمین بھونچال سے ہلادی جائے گی۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ زلزال۔ مصدر ہے، اسے زمین کی طرف اضافت دینے میں گیا مصلحت

وجہ اعتراض ہے؟

یہ درست ہے کہ زلزالها۔ کہنے کی بجائے "زلزالا" سے کام چل سکتا تھا لیکن یہاں مشیت اور

قول فیصل

جسمت ایزدی جس زلزال کی خبر دینا چاہتی تھی وہ "زمینی" بھونچال سے تعبیر تھی۔ لہذا۔ ہا۔ کا

منیر "الارض" کی طرف راجع کر کے دیگر غیر زمینی بھونچالوں کی نفی کر دی۔ اب فضا میں دھماکے ہوں یا شہاب ثاقبوں کی  
رگڑ سے خوفناک آوازیں، زلزال سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ☆

اچھے عمل مذہبی نیشینیلی سے مربوط نہیں

514

فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره. ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره

جو ذرہ بھی اچھا عمل کرے گا صلہ پائے گا جو ذرہ بھی بدی کرے گا سوزنش کا مستحق ٹھیرے گا۔ (زلزال، 7، 8)

یہ ہے کہ آیات زیر بحث کو اگر "مَن" کے تناظر میں اپنے عموم پر رکھا جائے تو کافر اور مسلم، مجرم

وجہ اعتراض

اور نیکو کار کا فرق مٹ جائے گا۔ جو ہم سنیوں کے لئے ناقابل قبول ہے۔

## قول فیصل

سنیوں کا یہ اختیار تو ہے کہ وہ اللہ میاں کو اپنے ”زریں مشوروں“ سے نوازیں لیکن اسے اپنی بات منوانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہاں قاطر ازل نے ”مَنْ“ کے حرف میں جو ”عموم“ پنہاں رکھا ہے اس میں مذہبی یثینیلیٹی سے صرف نظر کرتے ہوئے ثواب و عقاب۔ یا صلہ و سرزنش کا معیار۔۔۔۔۔ حسن کارانہ عمل۔۔۔۔۔ یا بدی کے کردار کو ٹھیرایا ہے اور اسے سنیوں میں سے روشن فکر مسلمانوں نے بھی قبول کر لیا ہے۔ تقاصیل کے لئے ملاحظہ ہوں تفسیر روح المعانی اور امام عبدہ کی دروس القرآن۔ یا راقم آثم کی ”برہان القرآن“۔۔۔۔۔ جہاں پوری وضاحت ملے گی کہ اللہ سبحانہ کسی انسان کی نیکی پر بے رحم نہیں فرماتے اور کسی ”لاڈلے“ کی بدی سے درگزر نہیں کرتے۔ ابن تیمیہ (1328ھ) لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ عاقبة الظلم وخیمة وعاقبة العدل کریمة ولهذا یروی ان الله ینصر الدولة العادلة وان كانت کافرة ولا ینصر الدولة الظالمة وان كانت مؤمنة

ظلم کا انجام برا اور انصاف کا انجام قابل ستائش ہے حدیث میں ہے۔ اللہ سبحانہ ”انصاف پسند“ حکومت کی نصرت و تائید فرماتے ہیں خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اور رستم پیشہ حکومت کی نصرت و حمایت نہیں فرماتے خواہ مؤمن ہی کیوں نہ ہو۔

(الحسبة فی الاسلام طبع مکتبہ علیہ مدینہ منورہ صفحہ 13/5 تا 15)

القارعة

## مسلمان زیادہ تر برائی پسند ہے

515

### واما من خفت موازینہ فامہ ہاویہ

جکے وزن ہلکے ہوں گے، انکا ٹھکانہ ہاویہ ہے۔ تم کیا سمجھے کہ ہاویہ۔ گیا ہے؟ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔ (القارعة، 8 تا 11) میں کہا جاتا ہے کہ عبدالقادر رازی حنفی کہتے ہیں۔ واکثر المؤمنین سینا تھم راجحة علی وجہ اعتراض حسناتھم

(صفحہ 381) اکثر مسلمانوں کی بدیاں ان کی نیکیوں پر بھاری ہیں۔

اس طرح یہ آیات مسلمانوں کی طبعی خواہشات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ برائی پسند ہیں۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی سفلی اور حیوانی خواہشات ان کی طبعی مناسبت سے ڈھیروں ہیں۔

## قول فیصل

پہلے جہاں انفرادی جبر کا استعمال ہوتا تھا اب درندگی اور حیوانیت نے اجتماعی شکل اختیار کر رکھی ہے پاکیزہ اور بے بس بچیاں مسلم بھیزیوں کے ہاتھوں لہو لہاں ہیں بلکہ آئے دن کے اخبارات میں یہ شکایت بھی عام ہو چلی ہے کہ اپنی خوبصورت سانی۔۔۔۔۔ ممائی۔۔۔۔۔ بھاوج۔۔۔۔۔ بیوی کی بیٹی۔۔۔۔۔ بلکہ اپنی خوبصورت ساس تک سے آبرو

باختلگی کے تعلقات استوار کرنے میں عار، محسوس نہیں کی جاتی اور ہاں اخبارات میں یہ مواد بھی آنے لگا ہے کہ مسلم تاجاروں نے اپنی حقیقی آبرو۔ یعنی بیٹی پر ہوس رانی سے بھی پرہیز نہیں کی ایسے میں علامہ عبدالقادر رازی نے آیہ زیر بحث سے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ”خفت موازنہ“ کا اطلاق مسلمانوں پر ہی زیادہ ہوتا ہے۔



التکاثر

روٹی، کپڑے اور لباس کی ہر سش نہ ہوگی

516

ثم لتسئلن يومئذ عن النعيم

(تکاثر، 8)

اس دن تمام سہولیات اور نعمتوں کی پرسش ہوگی۔

یہ ہے کہ اگر نعمتوں کی پرسش ہوئی تو کون بچے گا جبکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ صرف تین

وجه اعتراض

چیزوں کی پرسش نہ ہوگی۔ بیت بکتہ سر چھپانے کے لئے گھر کی..... وما بقیہ بہ صلبہ من

الطعام جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنے کے لئے روٹی!..... وما بوزی بہ عور نہ من اللباس اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے کا حساب نہ ہوگا۔ یعنی ہر نعمت کا نہیں صرف روٹی، کپڑے اور مکان کی پرسش نہ ہوگی۔

یہ درست ہے کہ اللہ سبحانہ نے روٹی، کپڑے اور مکان کی بابت احسان کے لہجہ میں بات کی ہے۔

قول فیصل

(ہود، 81)

لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوا کہ ان کی بابت بات ہی نہ ہو۔ پرسش تو بسا اوقات متنبہ کرنے کے لئے بھی ہوتی

ہے جو صرف ”غفلت“ سے بچانے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔



الهمزة

انقلاب کے ڈر سے زرو جواہر کو ذخیرہ بنانا

517

ویل لكل همزة لمزة الذي جمع مالا وعدده

(ہمزہ، 1، 2)

ہر طرز کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے جو مال جمع کر تا اور بگن بگن کر رہتا ہے۔

میں کما جاتا ہے کہ ہمدانی (صفحہ 701) کے نزدیک یہاں ”لکل“ کے حرف نے بغیر کسی امتیاز

وجه اعتراض

کے ہر طراز اور چغل خور کو گھیرے میں لے رکھا ہے جبکہ یہ دونوں برے وصف نمازی مسلمانوں

میں زیادہ پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرم کوئی بھی ہوا سکے لئے تعزیر (اور وعید) حتمی چیز ہے اور اللہ اپنے وعید کے خلاف نہیں کرتا۔

## قول فیصل

خلف و عید سنیوں کا راسخ عقیدہ ہے وہ اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے یعنی ان کے نزدیک جنت و دیگر نعمتوں کا اللہ نے جو وعدہ کر رکھا ہے وہ تو پورا ہو کر رہے گا لیکن جن سینات اور فتنہ سامانیوں پر تعزیر کا تازیانہ رسید کرنے کا اشارہ دیا ہے اس کا پورا کرنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف اللہ سبحانہ کو تعزیر کے باب میں ”وعدہ شکن“ اور ”منحرف“ مانتے ہیں وہ لوگ مزید کچھ باتیں بھی بتاتے ہیں یعنی ”خلف و عید“ کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کی کوکھ سے ”امکان کذب“ باری کا عقیدہ بھی جنم لیتا ہے یعنی العیاذ باللہ۔ اللہ سبحانہ سے جھوٹ کا صادر ہونا بھی ممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔

## قول فیصل

نمبر 2۔ یہاں ”عدہ“ کا لفظ قابل غور ہے جو امام فراء نحوی کے نزدیک ”عدہ“ سے تعبیر ہے یعنی ”انقلاب“ کے مصائب و شدائد سے بچنے کے لئے پیسے و دیگر سامان زیست کو ”ذخیرہ“ بنانا شروع کر دیتا ہے اسی طرح وہ اپنے آرام اور سہولت کا خیال تو رکھتا ہے کہ صاحب زر و مال ہے مگر ”غذائیات“ کا شاک (عدہ)۔ کر کے دوسروں کی مشکلات میں اضافہ کا موجب بھی بن جاتا ہے۔ ایسے ناہنجار کے بارے میں اللہ سبحانہ نے ”تعزیر“ کا تازیانہ رسید کرنے کا حتمی وعدہ کیا ہے جبکہ سنی کہتے ہیں ایسے مجرم کو سزا نہیں ہوگی اور اللہ اپنی بات میں سچے نہ ہوں گے العیاذ باللہ۔

11-3-96.



فیل

## الم تر۔ سے خطاب کیوں ہوا؟

518

### الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل

کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کا جو حشر کیا اس پر غور نہیں فرمایا۔

(فیل، 1) یہ ہے کہ اس واقعہ سے اشارہ ملتا ہے کہ اصحاب فیل کا برا حشر معجزانہ طور پر ظہور میں آیا لیکن آنحضرت ﷺ تو اس وقت موجود ہی نہ تھے آپ سے۔ دیکھئے۔ کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟

## وجه اعتراض

یہاں ”الم تو“ کا لفظ ہے جو ”فلم و بصیرت“ سے دیکھنے کا غماز ہے جو صرف ”غور“ کرنے کا استعارہ ہے ہاں اگر ”الم تنظر“ کا لفظ ہوتا تو اس سے ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کا مفہوم متعین ہو سکتا تھا۔

## قول فیصل



## طیر۔ کہتے ہیں اور ”تر میہم“ کس چیز کا استعارہ ہے

519

وارسل علیہم طیرا ابابیل تر میہم بحجارة من سجيل

(فیل، 3-4) ان پر اللہ نے بڑی کثرت سے ”طیور“ بھیجے جو ان پر کنکڑ کی پتھریاں پھینکتے رہے۔

میں کہا جاتا ہے کہ۔ یہ تمام کام معجزانہ طور پر ظہور میں آیا اور۔ معجزہ پیغمبر کی موجودگی سے مربوط ہے جبکہ یہاں پیغمبر ندارد ہے لیکن اس اعتراض سے چنے کے لئے اوجھبہ پرستوں نے تاویل کا سہارا لیا ہے کہ ان دنوں نبی اکرم ﷺ چونکہ عالم شہود میں تشریف لانے والے تھے لہذا اللہ سبحانہ نے اس واقعہ کو آپ کی نبوت کے لئے ”ارہاص“ کے طور پر یعنی پیشگی ”معجزے“ کے بطور پیش کیا۔

## قولِ فیصل

ابابیل۔ ابو عبیدہ اور فراء کے نزدیک ان الفاظ میں سے ہیں جن کا ”مفرد“ نہیں ہوتا اسکے معنی کثرت کے ہیں اور غالباً کثرت کے مفہوم کو سامنے رکھ کر ہی ”جھنڈور جھنڈ“ کا مفہوم لیا گیا ہے اور یہ واقعہ چونکہ ولادتِ نبوی ﷺ کے ایک ہی سال بعد ظہور میں آیا لہذا اوجھبہ پرستوں نے اسے ”باطنی اصطلاح“ کا سہارا لیتے ہوئے پیشگی معجزہ بنا ڈالا۔ حالانکہ ایک تو پورے ایک سال کا وقفہ درمیان میں حاکم ہے دوسرا یہ کہ ان ہی اوجھبہ پرستوں کو یہ بھی تسلیم ہے کہ آپ ولادت کے چالیس سال بعد ہی مصیبِ نبوت پر فائز ہوئے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”پیشگی معجزہ“ کیلئے اکتالیس سال کا پیشگی وقفہ کسی واقعہ کے نمودار ہونے کا سبب بن سکتا ہے؟ یارو ہوش کے ناخن لو۔ کس ”ہنریاں سرائی“ سے کام لے رہے ہو؟

اب آئیے معلوم کر لیں کہ ”طیور“ یہاں کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مرئی میں ہر اڑنے والی شے کو طیر بھی کہا جاتا ہے اور ”خصوصی“ ناموں سے بھی وہ ”دیدنی“ ہو خواہ ”خوردبینی“ آلات سے نظر میں آنے والے جراثیم ہوں طیر ہی ہیں۔ یہ ”جراثیم“ متعدد بیماریاں پھیلانے کا موجب بھی بنتے ہیں، ”مچھر“ مکھی بھی اڑنے والی وہائیں ہیں۔ اسی طرح یہ جراثیم جو ہمیں نظر نہیں آتے۔ ”طیور“ ہی انکا استعارہ ہیں اور اصحابِ فیل کو ان ہی زہریلے جراثیم سے پالا پڑا تھا جن کے ”نادیدنی“ پاؤں پر نادیدنی حد تک گرد جمی ہوئی تھی وہ اڑ کر جس ”ہندے“ پر بھی بیٹھ جاتے۔ زہریلی گرد۔ اسکی جلد اور مسامات میں داخل کر ڈالتے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ۔ یہی جراثیم اڑ کر ”ہندے“ اور اس کے فوجیوں کے ”مسامات“ میں زہریلے اثرات پھیلاتے رہے جو ”وبا“ کا استعارہ ہیں اور قرآن کے اسی (من مسجیل) کے استعارے کا نام ”جدری“ (دچیچک) پڑ گیا کہ اس سے جسم پر پھنسیاں بکلی آتیں اور ان میں ”انگڑوں“ کی طرح جلن پیدا ہوتی ہے۔ اور جہاں جلن پیدا ہوتی ہے وہاں سیاہ دھبے یا گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ یہ مرض اگرچہ لاعلاج نہیں ہے لیکن جہاں علاج کی ”سہولیات“ نہ ہوں اور مرض بھی تاریخ میں پہلی بار نمودار ہوئی ہو تو اسکی تباہ کاریاں دو چند ہو جاتی ہیں۔ فرمایا جس طرح ٹڈی دل اچانک نمودار ہو کر کھیت کھلیانوں کو چاٹ جاتی یا بعض کیرے لگ جاتے ہیں جس سے پتوں میں سوراخ پڑ جاتے ہیں اسی طرح یہ ”چیچک“ بھی جسموں میں گڑھے کر ڈالتی اور دھبے ”سوراخوں“ میں تبدیل ہو کر، مریض کی ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ عکرمہ تاہی کہتے ہیں۔ ان من اصابہ الحجر جدرتہ و هو اول جدری ظہور۔

جسکے بھی مسامات میں ”جراثیمی“ مٹی داخل ہو جاتی اسے چیچک میں مبتلا کر ڈالتی۔ اور عرب میں یہ پہلا چیچک تھا



جواب یہ اور اسکی فوج میں پھیل کر متعارف ہوا۔ بات کیا ہوئی کہ یہاں طیور سے مراد ”زہریلے جراثیم“ ہیں جو ایک مریض سے دوسرے مریض تک پہنچ کر تباہی کا موجب بن جاتے ہیں اور قومِ میہم سے مراد مریض کا شدت سے نشانہ بننے کے ہیں یہ ابرہہ کے طویل سفر فوجیوں کے میل کچیل سے اٹے ہوئے جسم اور صفائی کے تمام لوازمات سے محروم ہونے کے باعث ان میں پھیل گئے اسمیں کسی کے پیشگی معجزے کا دخل ہے اور نہ ہی عین وقت پر کسی کرشمے کے ظہور کا۔



ایلاف

## کیا دونوں سورتیں ہم زلف ہیں؟

520

### لایلاف قریش ایلافہم

(قریش، 1)

قریش کو اکٹھا کرنے کا سبب یہ ہے کہ.....

یہ ہے کہ اصحابِ فیل کا۔ فیل ہو جانا گویا اہل مکہ پر اللہ کا بڑا احسان ہے لہذا انہیں احساس دلایا کہ اب وہ اسی احسان کو ملحوظ رکھ کر روزی کے لئے ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کی بجائے ربِ کعبہ کے قوانین کا احترام کریں انہیں (ابہرہ) کے خوف سے امن ملا اور فقر و فاقہ سے بے نیاز بنا کر محفوظ کر دیا۔ اس طرح یہ سورہ بھی دراصل سابقہ سورہ کا تتمہ ہے بلکہ الیٰ بن کعبؓ کے مصحف میں ان دونوں سورتوں کو ایک ہی سورہ شمار کیا گیا ہے۔

وجہ اعتراض

ہو سکتا ہے الیٰ بن کعب کے مصحف میں دونوں سورتیں ایک ہی ہوں لیکن اللہ کے مصحف میں یہ ”دو“ سورتیں ہی ہیں۔ کیونکہ دنیا میں ”مصحف“ ایک تھا اور ازل سے تابد ایک ہی رہے گا وہ مرتب و مکمل صورت میں نبی اکرم ﷺ کا کتابتِ بٹری کے ہاتھوں میں دے گئے۔ یہاں ”ایلاف“ کے معنی اس ”عہد و پیمان“ کے ہیں جو ہمسایہ حکومتوں سے مکہ کے سردار ہاشم نے کیا تھا اسکا فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح مکہ اور اسکے گرد و نواح کے عرب ایک ہی پروگرام پر اکٹھے ہو گئے۔ بائیں ہمہ ایک مرحلہ پر اس عہد و پیمان میں کچھ کمزوری اور جھول پیدا ہوئے تھے مگر حضرت نبی اکرم ﷺ کے تایا۔ جناب زبیر بن عبدالمطلب نے ”حلف الفضول“ کے عنوان سے تاریخی ”معاہدہ امن“ پر قبائل کو اکٹھا کیا اس وقت نبی اکرم ﷺ کی عمر 21-22 برس تھی اور آپ اس معاہدے میں شامل تھے اس معاہدہ کے مقاصد میں بھی یہی تھا کہ آئندہ کسی سے زیادتی ہونے نہ پائے اور اگر کوئی زیادتی کرے تو سب ملکر اسکی سرکوبی کریں۔ اب ہوا یہ کہ عرب، شام و یمن کا تجارتی سفر کرنے کی بجائے کعبہ و مکہ کی ”مرکزیت“ میں ”نجات“ گئے اور اس تاریخی اجتماع و ”ایلاف“ کے نتیجہ میں انہیں کہا گیا کہ۔ فلیعبدوا رب هذا البیت۔ انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر والے رب کے احکامات و ”قوانین“ کے تابع رہ کر عیش ورفاہیت حاصل کریں کیونکہ قانون پر چلنا بھی ”عبادت“ کے ”وسیع تر“ مفہوم میں شامل ہے یہ نہیں کہ قانون پر چلنے سے نمازیں حذف ہو جاتی ہیں بس اسکا خیال رہے۔



## لوگوں کو ضروریاتِ زندگی سے محروم رکھنا

ارأيت الذي يكذب بالدين فذلك الذي يدع اليتيم ولا يحض على طعام المسكين فويل للمصلين الذين هم - ن صلاتهم ساهون. الذين هم يراؤن ويمنعون الماعون

ان کی سنگدلی پر غور نہیں فرمایا جو بے کس یتیموں کو خستہ حالی میں پڑے رہنے دیتے اور ناداروں کو وسائلِ معیشت فراہم کرنے میں رکاوٹ بنے بھرتے ہیں (جبکہ یہ ہیں بھی نمازی) پس حیف ہے ایسے نمازیوں کی حالت پر جو دکھاوے کی لمبی لمبی نمازیں تو پڑھتے ہیں مگر مقاصدِ صلاۃ سے اتنے غافل کہ۔ لوگوں کو دانتہ ضروریاتِ زندگی سے محروم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ (ماعون)

میں کہا جاتا ہے کہ آیہ زیر بحث میں نمازیوں کو روند گیا ہے جبکہ نماز کے بارے میں فرمایا ان الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنكر۔ نماز تمام برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے۔ اب اگر نماز والوں ہی کے کردار کو نارگیت بنایا جائے تو نماز کی امتیازی خصوصیت کیا ہوئی؟

## قول فیصل

یہاں نمازیوں کو نہیں قانون شکن نمازیوں کو روند گیا ہے۔ دکھاوے کی صلاتیں قائم کرنے والوں کے منفی رویہ پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے قانون یہ ہے کہ I۔ بے کس و خستہ حال یتیموں کو جب تک اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو جاتے مالی و اخلاقی کمک پہنچائی جائے اس قانون کی حکومت بھی پابند ہے اور صاحبانِ زرو مال بھی۔ II۔ ناداروں کو وسائلِ معیشت مہیا کئے جائیں تاکہ معاشرے میں ان کا بھی مقام ہو اور۔۔۔۔۔ III۔ عام افرادِ مملکت کے لئے ضروریاتِ زندگی (ماعون) پر اجارہ دارانہ کنٹرول ختم کیا جائے۔ لیکن مسلم معاشرے میں ایسا نہیں ہو رہا وہ نیکی صرف اسی میں سمجھنے لگے تھے کہ رکوع و سجود والی نمازوں پر نمازیں پڑھے جاؤ اور نماز کے مقاصد یعنی قانونِ معیشت سے بغاوت کئے جاؤ۔ فرمایا نہ ایسی نمازیں قانونِ صلاۃ اور ”انقلابی معیشت“ کا بدل بن سکتی ہیں نہ ان کی پذیرائی ہوگی بلکہ ایسے ”مصلیوں“ کے منفی رویہ پر بڑا افسوس ہے۔ یہ درست ہے کہ ”صلوۃ“ کا ایک زرخِ عبادات بھی ہے لیکن اسے عام طور پر قانون اور آئین کے معاشی پہلو پر عملدرآمد کرنے کے لئے بھی خاص کیا گیا ہے شعیب کو قوم نے کہا تھا کہ کیا تیرا قانون یہی حکم دیتا ہے کہ..... ہم اپنے زرو مال کو تمہارے ہاتھوں میں دے ڈالیں۔ (رعد، 86)

اس طرح وہ لوگ بھی صلاۃ کو ”انقلابی معیشت“ کے مفہوم ہی میں استعمال کرتے تھے اور اسی کی ضو میں ذہن نشین کر لیا کہ ان الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنكر۔ صلاۃ قانون ہے اور قانون ہی میں یہ سکت ہے کہ برائیوں اور منکرات کا سد

باب کرے۔ (عنکبوت، 45) قانون اگر نہیں تو تمام عبادت کسی اجتماعی اور معاشرتی برائیوں کو روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی یہاں تو جتنا بڑا ”عبادتی“ ہوگا اتنا ہی معاشرتی برائیوں میں مبتلا ہوگا۔ آخر نماز و عبادت انہیں اخلاقی طور پر راہ راست پر کیوں نہ لاسکتیں۔ الغرض یہاں قانون شکنی اور دکھلا دے کی صلوة (نماز) پر عامل لوگوں کو روند آگیا ہے بری مصلیٰ کو نہیں لندا آپ پریشان نہ ہوں۔



## نماز پنج گانہ

522

### فصل لربك وانحر

اس آیت میں جسمانی اور مالی عبادات کے آداب بتائے گئے ہیں کہ صلاۃ کا قیام ہو تو صرف خدائے لایزال کے لئے اور مالی ایثار اور قربانیاں ہوں تو وہ بھی اسی ذاتِ بے ہمتا کے لئے۔ اور یہ بھی دراصل سیدنا ابراہیمؑ کے عقیدے کی بازگشت ہے کہ آپ نے بھی کہا تھا ان صلاحی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین۔ میری صلاۃ اور دیگر طریق ہائے عبادت، میرا جینا اور مرنا اللہ رب العالمین کے دین کی سربلندی کے لئے ہے (یعنی صلاۃ جو کہ خالص توحید کا پر تو ہے وہاں بھی ”لرب العالمین“ رتھی اور یہاں بھی ”لربك“ کے لئے ہی خاص ہے۔

یہ ہے کہ یہاں صلاۃ کا ترجمہ ”نماز“ اور اقیموا کا مفہوم پڑھنا۔ بتلایا جاتا ہے جبکہ پڑھنے کا حکم **وجہ اعتراض** کیس بھی نہیں ہے ہر جگہ ”اقیموا“ ہی ”اقیموا“ ہے اس طرح ”نماز“ آتش پرست مجوسیوں کی پرستش کا نام ہے یہاں صرف مجوسی طریق عبادت کی عکاسی کرتی ہے جبکہ مسلمانوں کو ایسی توحید شکن عبادت کا حکم نہیں دیا گیا۔

اسلامی عبادات کی غرض ”و غایت“ جب اللہ کی ”عبودیت“ اور اس کے دین کی سربلندی بتلائی گئی ہے اور جب ”للہ رب العالمین“ و ”لربك“ کے مہک دار الفاظ میں قرآن گواہی دیتا ہے کہ اسلامی عبادت صرف خدائے لایزال کے لئے ہوتی ہیں ان میں نہ ”مجوسیوں“ والی پرستش کا شائبہ ہے نہ دیگر ”اصنام پرستوں“ کی کسی روش کی پیروی کی جھلک! ایسے میں صلاۃ کو صرف ترجمہ کے بہانے مجوسی پرستش کا نام دینا بڑی زیادتی ہے۔ خاص کر میرے نزدیک تراجم کے لئے لسانیات کا یہ اصول بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ الفاظ ”و مفاہیم“ منتقل ہوتے ہی رہتے ہیں ایک لفظ جو کسی خاص علاقے اور زبان سے منتقل ہو کر دوسری زبان کا لفظ بن جاتا ہے اور دوسری قوم اس لفظ کو اپنے مزاج اور مفہوم میں ڈھال لیتی ہے بلکہ وہ لفظ نئے وطن، نئی زبان اور نئے ماحول میں اتنا بچ بس جاتا ہے کہ ”اجنبیت“ کا شائبہ تک نہیں رہتا تو یوں ہوتا ہے کہ اسکا سابقہ زبان سے ”رشتہ“ بالکل ہی کٹ جاتا ہے۔ وہاں اگر کسی ”مکروہ“ مقصد کے لئے استعمال ہوتا تھا اور یہاں آکر ”پاکیزہ“ غایت کا حامل بن جاتا ہے تو ہم اسے ٹھکرانے کا حق نہیں رکھتے کہ اس سے فلسفہ لسانیات سے لاعلمی کی ”بو“ بھی آتی ہے اور نئی زبان کی توہین بھی۔ وضاحت استدر اک میں آ رہی ہے۔

اس اصول کی روشنی میں صلاۃ کو ”نماز“ کا پیرہن پہنانے میں نہ قباحت ہے اور نہ ہی ”لسانیات“ کے کسی ”ضابطے“ کی خلاف ورزی۔ اس بنا پر مسلمانوں نے اگر نماز کے لفظ کو ”پرستش“ کے مفہوم سے عاری کر کے ”اطاعت“ اور احکام خداوندی کی بجا آوری کے لئے استعمال کیا ہے تو کون سا کفر تو لا ہے اور مجوسی پرستش کا کیسے اعتراف کیا ہے؟ اس وضاحت کے بعد میں صلاۃ کو نماز ہی کہوں گا کہ بات نمٹانے کیلئے اس سے زیادہ مختصر اور زیادہ ”آسان“ لفظ مجھے نہیں مل رہا۔ ویسے میرے نزدیک ”الصلاة“ کا لفظ پورے نظام قرآن پر حاوی اور جامع اصطلاح کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اصطلاحات کا ترجمہ نہ ہونا چاہیے کہ ترجمہ سے اصطلاح کی ”جامعیت“ متاثر ہو جاتی ہے تاہم صلاۃ ایک ”پہلو دار“ لفظ بھی ہے یہ جامد اور ”نفس“ یا ”یک معنی“ لفظ نہیں ہے۔ اسے کسی ایک مفہوم میں محدود کر کے دیگر تمام مفاہیم کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایک مقام پر اگر معیشت سنوارنے اور نظام معیشت قائم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو اس سے دیگر مفاہیم جو اپنی اپنی ”مناسبتوں“ سے وجود رکھتے ہیں کیونکر ”بے معنی“ یا معطل ہو سکتے ہیں؟ یہاں تو ہر مفہوم ”قرآن“ ہی سے کشید ہو گا کہ قرآن کو معنی آفرینی بڑا دخل ہوتا ہے جیسا قرینہ دیے معنی۔ ان لسانی ضوابط کی وضاحت کے بعد ذیلی عنوانات کے ذریعہ صلاۃ کی حقیقت معلوم کیجئے۔

سورۃ نساء میں ذہن نشین فرمایا ہے کہ جب موت سر پر کھڑی ہو، تیروں کی بارش ہو اور تیغ و سناں سے انسانی جسم چھلنی ہو رہے ہوں اور ایسے ہی نازک لمحوں میں وقت نماز آیا ہو تو۔ اے نبی علیک السلام ایسے میں مسلمانوں کو دو گروپوں میں تقسیم کر دو۔ اب ایک دھڑا تو دشمن کے خلاف صف بستہ کھڑا ہو اور دوسرا آپ کی قیادت میں ان کے عقب میں نماز قائم کرنے میں مصروف ہو جائے جب ایک رکعت ختم ہو تو یہ گروپ پہلے گروپ کی جگہ پہنچ جائے اور وہ نماز کی جگہ چلا جائے۔ (مفہوم از نساء، 102)

یہاں ”سجد و امن و رانکم“۔ ایک توانا قرینہ ہے کہ یہ میدان دعا میں رکوع و سجود والی صلاۃ تھی جبکہ نظام معیشت بھی اسلامی اصولوں پر قائم تھا لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس بہانے رکوع و سجود والی صلاۃ کی نہ تو نفی کی اور نہ ہی مؤخر کرنے کا بہانہ پیش کیا۔ بات صاف ہو گئی کہ ہر نظام کسی بھی عذر بہانے سے حذف ہو سکتا ہے مگر نماز کسی حال میں بھی معاف نہیں ہو سکتی تاہم یہ ”حرلی صلاۃ“ ”اسلامی حریات“ کا مستقل ”جز نہ بن سکی۔ اسکی بابت واضح کر دیا گیا تھا کہ جب میدان ”وفا“ میں نبی اکرم ﷺ یہ نفس نفیس شامل ہوں تو ادا کرنی چاہیے فرمایا اذ کنت فیہم فاقمت لہم الصلوۃ۔ جب آپ بذات خود شامل کارزار ہوں اور سپاہیوں کو نماز پڑھائیں تو یہ حرلی صلوۃ فرض ہے تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک امکانی حکم تھا کہ اگر میدان دعا میں وقت نماز آجائے تو تخفیف سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن چونکہ نبی اکرم ﷺ جن جنگوں میں شامل تھے ان میں سے کوئی بھی ہنگام صلوۃ پیش نہ آئی لہذا اس پر عمل نہ ہو سکا۔ اور معمول کی صلاۃ ہی زیرہ معمول رہی۔

ارشاد ہے اذا قمت الی الصلاۃ فاغسلوا وجوہکم وابدیکم الی المرافق۔

صلاۃ کیلئے وضو

جب قیامِ صلاۃ کے لئے اٹھو تو منہ ہاتھ اور پاؤں دھو لو یعنی وضو کر لو۔ (مائدہ، 7)

یہاں ”وضو“ قرینہ ہے کہ صلاۃ سے رکوع و سجدے والی ”نماز“ ہی مراد ہے اگر نظامِ معیشت کے لئے وضو کو لازم ٹھہرایا جاتا تو معیشت سے مربوط تمام شعبوں کے وزراء۔ ان کا پورا اسکریٹریٹ اور عمالِ حکومت کے لئے دفاتر میں با وضو داخل ہونا اور با وضو بیٹھنا ایک معیبت بن جاتی۔ خاص کر وزارتِ تجارت، وزارتِ صنعت اور وزارتِ زراعت کے وزراء اگر غیر مسلم ہوں تو ان کے لئے وضو ایک شامت بن جائیگی۔

ارشاد ہے اذا نودی للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا الى ذكر الله۔

## صلاۃ کیلئے اذان

جب صلاۃ جمعہ کے لئے اذان ہو تو اللہ کا کلام سننے کے لئے جلدی جلدی چل پڑو۔ (جمعہ، 8)

یہاں ”اذان“ مضبوط قرینہ ہے کہ صلاۃ سے مراد ”نماز“ ہی ہے کہ نظامِ معیشت کے لئے ”اذان“ نہیں ہوتی۔ یہاں خاص بات یہ ہے کہ فرمایا۔ وذروا البيع جب اذان ہو تو معیشت کے تمام ساز و سامان چھوڑ دو۔ واذا قضيت الصلاة فانتشروا في الارض

جب صلاۃ ہو چکی ہو تو اپنے اپنے ذرائعِ معاش میں لگ جاؤ۔ (جمعہ، 8)

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک تو قرآن نے ذکر اللہ کا مفہوم خود ہی بتا دیا کہ اس سے مراد۔ صلاۃ ہے دوسرا یہ کہ یہاں صلاۃ سے اگر نظامِ معیشت مراد ہوتا تو تجارت جو ذرائعِ معیشت کا اہم شعبہ ہے اسے ترک کر دینے کے کیا معنی ہو سکتے تھے؟۔ یارو کچھ تو سوچو قرآن والے ہو۔ قرآن کی حقیقت کو مسح کرنے کا جتن کیوں کر رہے ہو؟

سورۃ نور میں من بعد صلاۃ الفجر۔ اور بعد

اوقات کس صلاۃ کی غمازی کر رہے ہیں؟ صلاۃ العشاء کے الفاظ آئے ہیں مفہوم یہ

ہے کہ،

مؤمنو۔ تمہارے گھریلو خادم اور نابالغ بچے۔ تین اوقات میں تمہاری خلوتوں میں حائل نہ ہوں یعنی تمہاری خوابگاہوں میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہوں کہ ان اوقات میں گرم موسم کے باعث تم کچھ کپڑے اتار لیتے ہو۔ I۔ صبح کی نماز کے بعد، II۔ دوپہر کے وقت اور III۔ صلاۃ عشاء کے

(نور، 58)

بعد۔

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ مسلمانوں میں صلاۃ کے اوقات اس حد تک شہرت پائے ہوئے تھے کہ پڑھے لکھے اور ان پڑھ جب وقت معلوم کرنا چاہتے تو اوقاتِ صلاۃ کی مناسبت اور حوالہ سے معلوم کر لیتے تھے۔ نہ گھریلو کی احتیاج نہ ٹائم پیسوں کی ضرورت! سوال یہ ہے کہ کیا نظامِ معیشت کے لئے بھی ایسا معیار مقرر تھا؟ کیا یہاں صلاۃ کے اوقات کا ذکر خود رکوع و سجود والی صلاۃ کی غمازی نہیں کرتا؟ قرآن والو۔ قرآن کی حقیقتوں کو تسلیم کر لو اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لئے انحراف کی روش نہ اپناؤ۔



ارشاد ہے۔ اقم الصلاة طرفی النهار وزلفا من اللیل۔ صبح، شام اور رات کے ابتدائی حصوں میں

## صبح و شام، عشاء اور ظہرین کی نمازیں

صلاة قائم کرو۔ اس آیت میں صبح و شام اور عشاء کی نمازوں کی اقامت کا حکم دیا ہے۔

اسی طرح اسراء میں فرمایا۔ اقم الصلوة لدلوك الشمس الى غسق الليل ----- (اسراء، 8)

یہاں دلوك کے معنی۔ آفتاب کا ظہر کے وقت وسط آسمان سے نیچے کی طرف ڈھل جانا اور غسق رات کے پہلے حصے کی تاریکی کو کہتے ہیں۔ یہاں پھر دوپہر کی دو نمازوں اور شام کی دو نمازوں کا حکم دے کر اوقات قیام کی وضاحت کر دی ہے۔ حاصلِ بحث یہ کہ نور (58) اور اسراء (8) نے اوقات صلاة کی غیر ہم الفاظ میں نشاندہی کر دی ہے۔

سورہ مدثر۔ میں فرمایا۔ ماسلکم فی سقرہ قالوا لم نكن من المصلین ہ ولم نك نطعم

## تباہی کا گڑھا

المسکین۔

ان سے جب کہا گیا کہ کسی چیز تم کو تباہی کے دہانے پر لے گئی؟ انہوں نے کہا I۔ نہ تو ہم نے نماز کی عادت بنائی اور نہ ہی II۔ کسی نادار کو معاشی سنبھالا دیا۔ (مدثر، 42-44)

اسی مفہوم کو سورہ ماعون میں اس طرح دہرایا ہے کہ،

اے مخاطب۔ اس ناہنجار کو، نہیں دیکھتے جو معیشت اور صلاة کے بارے میں قانونِ خدا کو جھٹلاتا ہے یعنی عملی طور پر کسی بھی یتیم اور نادار کی روزی رسانی میں کوئی سی دلچسپی نہیں لیتا۔ نمازیں پڑھتا ہے تو دافسوس کہ مقاصدِ صلوٰۃ سے غافل ہے یعنی دکھاوے کی نمازیں تو پڑھ لیتا ہے مگر ضرورت مندوں کی احتیاج کو روکے ہوئے بھی ہے۔ (ماعون)

یہاں مدثر اور ماعون نے مل کر صلاة اور معاش میں جو حدِ فاصل ہے اسے واضح بھی کیا ہے اور دونوں نظاموں یعنی ”نظامِ صلوٰۃ“ اور ”نظامِ معیشت“ کی تکمیل کے لئے کچھ نہ کرنے کو سنگین نوعیت کا جرم بھی قرار دیا ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ صلاة ایک پہلو دار لفظ ہے جسکے مفہوم میں معیشت

## صلاة میں معیشت کا اندماج

سنوارنے کا اشارہ بھی ہے لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ کچھ

ضروری نہیں کہ ہر مقام پر یہ طے شدہ مفہوم ہو کہ صلاة لامحالہ معیشت ہی کی غماز ہے؟ جبکہ مصحفِ مقدس کی پہلی ہی سورہ میں ہے۔ یقیمون الصلاة۔ ومما رزقناہم ینفقون ہ۔

یہ قرآن ان ہی لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے جو اپنے طرزِ عمل میں احتیاط برت کر I۔ صلاة بھی قائم

کرتے ہیں اور II۔ جو کچھ انہیں ہم نے دے رکھا ہے اسے ضرورت مندوں پر کھلا بھی رکھتے ہیں۔

(بقرہ، 2)

اس طرح ”اقامت“ صلاة اور ”انفاق“ جو کہ معیشت کا اہم ستون ہے دونوں کا علیحدہ ذکر فرما کر ان میں جو

”حدِ فاصل“ ہے وہ بتا دی ہے لہذا دونوں کو ایک دوسرے میں ”مندج“ کرنا مناسب نہ ہو گا خاص کر ”انفاق“۔ صاحبانِ مال و دولت پر فرض ہے جبکہ صلاۃ کے لئے ایسی شرط نہیں ہے لہذا دونوں احکام اپنے اپنے مقام پر ہیں۔ ”حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے کسی ایک کی جاکواری دوسرے کی جاکواری کا لازمی نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

کہا جاتا ہے کہ اقیموا الصلاۃ و آتوا الزکوۃ۔ کے معنی ہیں نظامِ معیشت قائم کرو اور ناداروں کو مالی کمک پہنچاؤ۔

(نساء، 6)

یہاں دو حکموں کو ایک ہی حکم میں ضم کر کے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ۔ یہ ایک ہی حکم ہے جو صرف ناداروں کو نشوونما دینے کے لئے صادر ہوا ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ اقیموا الصلوۃ۔ اس اتھارٹی سے تعبیر ہے جو ناداروں کو نشوونما دے دے۔ لیکن یہ تعبیر جائزہ خود غلط ہے اقیموا۔ کو حدود و تقریرات کے نفاذ کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ لیکن دین و قرصہ جات کی متفرق سکیموں پر اسکا نام نہیں لیا جاتا۔ اگر صلوۃ ہمہ گیر نظامِ اسلامی کے نفاذ سے تعبیر ہے تو اسے صرف زکوۃ و خیرات بانٹنے والوں کی اتھارٹی سے کیوں موسوم کیا جاتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ معیشت بھی ایک نظام ہے اور ایک مرحلے پر اسکی اصلاح کو صلوۃ بھی کہا گیا ہے۔

(ہود، 86)

لیکن اسکے معنی یہ نہیں کہ جہاں بھی صلاۃ کا لفظ ”دستیاب“ ہو اس سے لامحالہ نظامِ معیشت ہی مراد ہو؟ خاص کر زکوۃ کا تعلق تو ”صاحبانِ زر و جواہر“ سے ہے جبکہ یہ کہیں نہیں لکھا کہ اقیموا الصلاۃ کے مخاطب بھی پیسے والے ہی ہیں۔ پھر سوچئے کہ یہ ذیقین امر کے صیغے سے چھ مقامات پر استعمال ہوا ہے جیسے کہ حج (78)، نور (56)، مجادلہ (13)، مزمل (20) سے واضح ہے اور یہی جملہ درجن سے زائد مرتبہ فاعلی مفہوم میں بلکہ حال اور متعلقہ کے صیغوں میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن اسنے مقامات پر اسے ایک ہی مفہوم میں محصور کر کے پھر اس پر زکوۃ کی ”تفریع“ کرنا اور نشوونما کاروپ دینا عرفی قواعد کی رو سے ناممکن ہے خاص کر دو لفظ (\*) جب دو مختلف مادوں سے تعلق رکھتے ہوں تو بغیر قرآن کے متحد المفہوم نہیں ہو سکتے۔ لیکن حادثہ یہ ہے کہ ہمارے مہرباں اس حقیقت کا اور اک نہیں کرتے انہیں ”نشوونما“ دینے کا لفظ کہیں سے مل تو گیا ہے مگر مقاماتِ استعمال کی رعایت کا انہیں پتہ ہے نہ شعور جبکہ ہمارے نزدیک زکوۃ بلاشبہ ایک کثیر المنافع منصوبہ ہے کہ اسکے بغیر نہ تو اسلامی معاشیات کا سلسلہ چل سکتا ہے نہ اسلامی مملکت کو استحکام مل سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے زکوۃ نادہندگان سے نرمی نہیں برتی اور وصول کر کے ہی رہے لیکن اسکے لئے نظامِ صلوۃ کی قربانی دینے یا نفی کر دینے کے لئے اسے زکوۃ ہی میں ”ضم“ کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قرآن میں اکثر مقامات پر اقامتِ صلوۃ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے جو رکوع و سجود۔ قیام اور قعود سے تعبیر ہے تاہم بہت سے مقامات پر صلوۃ کا لفظ نہیں بھی آیا۔ اسکے لئے ”روشن“ استعارات استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً۔ سجدا۔ اور السجود (فتح، 29) ساجد او قائما (زمر، 9) الراکعون الساجدون (توبہ، 112)۔ یا ایہا الذین آمنوا۔ ارکعوا

(\*) وہاں ”الزکوۃ“ ہے اور یہاں ”الصلاۃ“ وہاں ”آتوا“ ہے اور یہاں ”اقیموا“ اور دونوں لفظوں کے ماوے بھی مختلف ہیں اور صیغے بھی جدا جدا۔ ایسے میں یہ

واسجدوا واعبدوا ربکم (ج، 77) یہاں حج میں وضاحت کردی کہ ”اسلامی نماز“ پرستش نہیں حکم خداوندی کے مطابق عبودیت اور اطاعت کی جاکوڑی سے تعبیر ہے۔ (واعبدوا ربکم)

صلوة اسلامی نظام اطاعت کا محسوس پیکر ہے اسے ہماری

## نماز اسلامی نظام کا لازمی عنصر ہے

یا حالت جنگ میں بہر قیمت ادا کرنا پڑتا ہے۔ صحابہ رسولؓ

جنہوں نے عملی طور پر اسلامی نظام نافذ کیا تھا وہ موت کے منہ میں چلے گئے مگر رکوع و سجدے والی صلاۃ سے غافل نہیں ہوئے حضرت فاروق اعظمؓ (644م) نماز کی حالت میں خنجر ”لولو“ سے گھائل ہوئے حضرت علیؓ (661م) ابن ملجم مروی کی خون آشام تلوار کا ”لقمہ“ نماز ہی میں بنے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ (664م) طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے امامت نہ کرا سکے ان کے نائب صلوۃ نماز ہی کی حالت میں شہید ہوئے اسی گروہ کے ہاتھوں دمشق میں صبح کی نماز کے وقت حضرت معاویہؓ (680م) پر قاتلانہ حملہ ہوا اور آپ کا گھٹنہ گھائل ہو گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ صدر اول کے مسلمان صلاۃ کو اپنی ”پہچان“ کے طور پر ادا کرتے اور نازک سے نازک مراحل میں بھی اپنی شناخت سے دستبردار نہ ہوتے تھے۔ بلکہ قاتلین نماز ہی کی آڑ میں شغلِ قتل رہتے رہے۔

صلوة ”اسلامی ثقافت“ کا ”روشن“ استعارہ اور اطاعتِ خداوندی کا ”رمزی پیکر“

## صلوة ثقافتی زاویہ سے

ہے زندہ قوم میں اپنے ثقافتی ورثوں کی حفاظت کر کے اپنے سیاسی، اخلاقی اور دینی

وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ جو اس سے غافل ہیں وہ اپنے وجود اور قیات کی نفی کئے دیتے ہیں لیکن افسوس کہ یہاں کوئی جنم میں جائے کوئی سمندر میں ڈوبے ہمارے منہ پر روشن خیال قرآن کے منہ میں اپنی بات ڈال کر فخریٰ صلوۃ جیسی پہچان کی نفی میں لگے ہوئے ہیں رسول اللہ ﷺ اور نبیہ مسلمہؓ کے مابین امتیاز اور پہچان کا جو محسوس ذریعہ بنایا تھا یہ اپنے پیارے نبیؐ پر بھی اعتماد نہیں کرتے۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ صلاۃ عبادات و احکام کی ایک

## صلوة روح اور مسجد جسم ہے

”جامع“ اصطلاح بھی ہے اور نظام خداوندی کا ”ضابطہ“ بھی بایں ہمہ

یہ ایک پہلو دار لفظ بھی ہے جس کی معانی کا مختلف مناسبتوں سے قرائن ہی تعین کریں گے مثلاً ہود (86) میں صلاۃ کو قانونِ ربوبیت کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جسکے لئے دو قرائن استعمال ہوتے ہیں I. اصلاحتک تأمروک۔ یہاں تامرو (آرڈر دینا) کا قرینہ صلاۃ کو ضابطہ اور قانون کے مفہوم میں بدل دیتا ہے II۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ بڑے لوگوں کے اموال کو سب پر کھلا رکھنے کی بات ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ صلاۃ سے مراد رکوع، سجدے والی صلاۃ نہیں ہے اسی طرح نماز کے اوقات، وضو، اذان اور مساجد ایسے قرائن ہیں جو صلاۃ کو رکوع و سجدے والی نماز میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح صلاۃ روح اور مسجد جسم ہی سے تعبیر ہے یعنی کہ،

صلوة اور مسجد ”لازم و ملزوم“ ہیں جس طرح صلاۃ ”اسلامی ثقافت“ کا روشن استعارہ ہے اسی طرح مسلمانوں

کے دینی و سیاسی کلچر کا خمیر بھی مسجد سے اٹھا ہے۔ ملاؤں نے اگر مسجد کو تخریب کاری کے مرکز میں اور نمازوں کو فرقہ بازی اور نفرت کے مظہر میں پیش کر ہی دیا ہے تو اس کا وبال ہم سب بھگت رہے ہیں لیکن اس سے مسجد اور نماز کے اسلامی کلچر اور مسلم شناخت کی نفی کیونکر ہونے لگی؟ رسول اللہ ﷺ نے پہلی مسجد بستی قبا اور دوسری مسجد مدینہ منورہ میں تعمیر کی اور آج دنیا میں پھیلی ہوئی کروڑوں مساجد مسلم کلچر اور شناخت کی واضح شہادت پیش کر رہی ہیں کیا نعوذ باللہ۔ رسول ﷺ نے یہ سب کچھ کسی ”منفی“ غرض کے لئے کیا تھا؟ کیا مساجد کی تعمیر کے پیکر میں ایک نئے آرٹ کا یونمی اضافہ کیا تھا؟ اس سے شناخت اور ”پہچان“ کی غرض نہیں تھی؟ یاد رکھو تو سوچو!!

اسکا وضاحت کے ساتھ ہی مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویز کے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے شاید کہ دلی بیمار کو افاقہ ہو جائے :

”یہاں (4/102) سجدہ سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جن میں انسان سچ سچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے اور یہ شکل نماز نزول قرآن میں نبی اکرم اور جماعت مؤمنین میں رائج تھی قرآن کریم میں صلاۃ و حج ہی وہ تقاریب ہیں جن میں محسوس ارکان (FORM) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (صلاۃ و حج) اجتماعی عمل ہیں اور اجتماعی عمل کے لئے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ انکی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم آہنگی ہو۔“ (لغات القرآن جلد 2/847/1 تا 7)

نیز فرماتے ہیں :

”بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لئے ہاتھ، پاؤں، سر آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا (وہ اس طرح مجرد حقائق ABSTRACT TRUTHS کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (FORM) سے استعارہ بنا کر ہونے والے کے باوجود بعض مقامات میں اسے باقی رکھا ہے صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کے مظہر ہیں۔“ (لغات القرآن جلد 2/846/19 تا 25)

### استدراک. نماز پنجگانہ

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اب پھر گزارش ہے کہ ایک لفظ جب اپنے وطن اور قوم سے بٹھک کر سفر کر کے دوسرے دیس میں پہنچ جاتا ہے اور اس دیس والوں میں اسکی اتنی پذیرائی ہوتی ہے کہ اجنبیت کا احساس تک ختم ہو جاتا ہے تو اسے قبول کرنے میں جھجھک نہ ہونی چاہیے ہاں اگر کوئی نظریاتی لفظ ہے تو بھی اہل زبان اپنی لسانی نزاکتوں کا ہم سے زیادہ ادراک رکھتے اور پہلے ہی مرحلے پر اسے اپنے مزاج میں ڈھال کر لسانی ذوق کا مظاہرہ کئے دیتے ہیں۔

یہ نہ صرف لسانیات کا اصول ہے کہ زبانوں کے اختلاط سے مفردات کا تبادلہ ہو جاتا ہے مشاہدہ بھی اسکا گواہ

ہے کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے مثلاً برطانیہ سے ہند میں ہزاروں الفاظ اس شان سے وارد ہوئے کہ ہمیں کے ہو رہے حالانکہ یہاں نہ ہمسائیگی کی سہولت، تھی نہ فاصلہ۔ مختصر ہونے کا فائدہ مثلاً ریل۔۔۔۔۔ موٹر۔۔۔۔۔ ہائیڈرو۔۔۔۔۔ پنکچر۔۔۔۔۔ ایکسیڈینٹ۔۔۔۔۔ ٹیوب ٹائر۔۔۔۔۔ انجکشن۔۔۔۔۔ پولیس۔۔۔۔۔ رپورٹ۔۔۔۔۔ ٹائپ رائٹر۔۔۔۔۔ فوٹو سٹیٹ۔۔۔۔۔ کمپیوٹر وغیرہ وغیرہ اور یہ الفاظ ایسے ہیں جن کے نہ ترجمہ کی ضرورت رہی نہ متبادل۔ تجویز کرنے کی بلکہ قرآن جسکے بارے میں ارشاد ہے ہذا لسان عربی مبین۔ یہ فصیح عربی میں ہے (نحل، 103۔۔۔ شعراء۔ 195) اسکی بابت بھی تحقیق یہ ہے کہ بعض الفاظ جو عرب جاہلیت میں عربی میں راہ پیا چکے تھے اور عرب اسے بے تکلف تقریب کے سانچے میں ڈھال کر ”عربیا“ چکے تھے تو قرآن نے ایسے الفاظ کو بھی فصاحت کے خانے میں رکھ کر عربی مبین کہا ہے مثلاً۔۔۔۔۔ زنجبیل کا لفظ ہے اسے صاحب محیط نے فارسی کے شنکیبل کا یہ عرب قرار دیا ہے جبکہ علامہ پرویز کی تحقیق یہ ہے کہ (لغات القرآن طبع لاہور جلد 2/815)

اسی طرح قرآن پاک میں ”اہریق“ کا لفظ ہے جو وضو کرنے کے لوٹے۔ کو کہتے ہیں یہ بھی فارسی الاصل ہے۔  
جواصل میں ”اب ریز“ تھا معرب ہو کر اہریق بنا۔  
(لغات القرآن جلد 1/315)

نیز ”سندس“ کا لفظ ہے جو نزولِ قرآن سے پہلے ہی فصیح عربی کا روپ دھار چکا تھا یہ بھی اجنبی لفظ ہے مگر قرآن نے اسے اس شان سے ذکر کیا ہے جیسے ”اصلی عربی“ کا لفظ ہوا اسکے معنی موٹے ریشمی کپڑے کے ہیں۔

(لغات القرآن 907/2)

اسی طرح بہت سے دیگر الفاظ بھی ہیں جو مختلف زبانوں سے الگ ہو کر نزولِ قرآن سے پہلے ہی ”فصاحت“ کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے کیونکہ زندہ زبانوں کی علامت یہ ہے کہ اجنبی الفاظ کا خیر مقدم کر کے اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کر لیتی ہیں۔ اسی طرح فارسی، سندھی اور سرائیکی زبان کی ”نصف“ مفردات عربی ہی سے ”مناخوذ“ ہیں۔ ایسے میں یہ کہنا کہ۔ ترجمہ چونکہ اپنے اندر ”پس منظر“ کا عکس رکھتا ہے ”فلسفہٴ لسانیات“ سے ناواقف کی دلیل ہے۔ کیا وہ قومیں جو اجنبی ذخیرہ الفاظ کو ”پناہ“ دیتیں اور تحفظ فراہم کرتی ہیں ”عقل باختہ“ اور کج فہم ہوتی ہیں؟ کاش اس ”انارکیت“ کا مداوا ہو جاتا۔

عربی زبان نہ صرف ذخیرۃ الفاظ سے مالا مال ہے آرمی زبانوں میں سب سے قدیم اور مآخذ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ”ایرانی“ مفردات قدیم ہی سے عربیت کی ”دریوزہ گر“ رہی ہے۔ پیچیدہ ادبی، کیانی اور ساسانی عہد تک ایران عربوں کے سیاسی اور لسانی تسلط میں رہا ہے لہذا وہ عربی الفاظ کے ”مزاج“ اور رجحانات سے پوری آگہی رکھتا تھا انہوں نے صلوٰۃ کو نماز میں منتقل کیا بھی ہے تو عربی و اسلامی مزاج کو سامنے رکھ کر ہی منتقل کیا ہے وہ اگر کہیں کج روی اور کج نہادی کا ثبوت دیتے تو اس وقت کی وسط ایشیائی اور عربی فلسطین اسکی اجازت نہ دے سکتے تھے۔ ”حمیری“ بادشاہ ضحاک نے ایرانی فرماں روا بہرام گور کو شکست دی تو یہ بہرام ”عربیت“ کا قادر الکلام شاعر اور دانشور کی حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا۔ ان روابط



سے پتہ چلتا ہے کہ ایرانی اور عربی زبانیں قدیم ہی سے اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کو قبول کر چکی تھیں۔ فارسی میں الف و نون جمع کی علامت سمجھے جاتے تھے جیسے دختران، پسران، جوانان۔ سالتور دگان وغیرہ۔ اسی طرح عرب قدیم بھی الف و نون سے جمع بنانے کا کام لیتے تھے جیسے ضیف کی جمع ضیفان۔ واوی کی جمع ودیان اور غراب کی جمع غربان۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس وضاحت کے ساتھ عربی اور ایرانی بعض مفردات کے نمونے پیش کر رہا ہوں تاکہ قریب کے تناظر میں دونوں کا ”ہجائی“ فرق معلوم ہو جائے۔ مثلاً،

- (1)۔ رات کو عربی میں لیل۔ اور قدیم فارسی میں ”لیلیا“ کہتے تھے۔ (2)۔ سیب کو عربی میں ”تفاح“ اور قدیم ایرانی میں ”توپا“ بولتے تھے۔ (3)۔ بغل کو عربی میں ”کشح“ اور فارسی میں ”کش“ پکارتے تھے۔ (4)۔ گھریا۔ کمین گاہ کو ”کوخ“ اور قدیم فارسی میں ”کاخ“ کہتے تھے۔ (5)۔ مہربا کو عربی میں ”بنخ“ اور قدیم ایرانی میں ”پنخ“ بولتے تھے۔ (6)۔ طوفان عربی کا لفظ ہے اسے فارسی میں توفان پکارتے تھے۔ (7)۔ بات منہ میں رک جائے اسے عربی میں ”حصہ“ اور قدیم فارسی میں ”بسر“ کہتے تھے۔ (8)۔ پیغمبر کو عربی میں نبی اور قدیم ایرانی میں ”نبی“ بولتے تھے۔ (9)۔ عربی میں گناہ کو جناح اور قدیم فارسی میں جیم کو گاف میں بدل کر ”گناہ“ کہتے تھے بلکہ آج بھی جیم اور گاف کو ایک دوسرے کا متبادل کہا جاتا ہے۔ (10)۔ ٹیڑھے کو عربی میں کز۔ اور فارسی میں کج کہا جاتا ہے۔ (11)۔ خالص سونے کی ڈلی کو عربی میں تبر اور قدیم فارسی میں ”تبار“ کہتے ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ نماز رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ اسوہ ہے اس کی پیروی کرنا امت کے فرائض میں شامل ہے خاص کر یہ کوئی روایت نہیں۔ اسوہ مشاہدے کا خوشنما چہرہ ہے اور مشاہدے کی آنکھ جھوٹ نہیں بولتی وہ اپنے کمرے میں جس حقیقت کو کیچ کر لیتی ہے لاکھوں انسان اسکی تصدیق پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسوہ کو روایت بتلانے والے ذہنی غیبات اور بلاد کے سر بیض ہیں۔



کافرون

حرف ”ما“ کس مفہوم کا متقاضی ہے

523

ولا انتم عابدون ما عبد

(کافر، 4) اور نہ ہی تم اسکی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ”ما“ عبد کی بجائے ”من“ عبد ہو نا چاہیے کہ ”ما“ عقل و شعور سے عاری مخلوق یا حمادات کا ”صلہ“ ہے جبکہ اللہ سبحانہ نہ تو ”لا یعقل“ ہیں اور نہ ہی جابد۔

وجہ اعتراض

**قول فیصل** ہر زبان کا اپنا اسلوب ہوتا ہے یہاں ”ما“ کا استعمال دو طرح سے ہوا ہے یعنی ایک تو ”لا اعبد ما تعبدون“ کے تناظر میں ہوا ہے۔۔۔ دوسرا یہ کہ یہاں ”ما“ ”مصدر یہ“ ہے جو عاقل اور لایعقل کو یکساں شامل ہے اب مفہوم یہ ہو گا کہ میں تمہاری عبادت کی طرح اور تم میری عبادت کی طرح لدا لگی جا نہیں لاتے۔۔۔ بلکہ میں تمہاری طرح باطل کی اور تم میری طرح حق کی پذیرائی نہیں کرتے۔



## دیرو حرم کے آویزاں کتبے اتار پھینکو

524

### لکم دینکم ولی دین

تمہارے لئے تمہارا اور میرے لئے میرا دین ہی قابل پذیرائی ہے۔

**وجہ اعتراض** یہ ہے کہ اس طرح کافروں کے شیوہ باطل پرستی کا اعتراف کیا گیا ہے۔

**قول فیصل** یہاں ”لامت“، تنبیہ اور ”گوشائی“ کے لہجہ میں بات کی گئی ہے جس سے باطل کے اعتراف کی صریح نفی ہو جاتی ہے بلکہ زبان عرب کا یہ خاص اسلوب ہے جسے قرآن پاک نے اپنایا ہے اب تعجب ہے کہ جنہیں بات کرنے اور سمجھنے کا شعور تک نہیں وہ اٹھے ہیں قرآن کے خاص اسلوب میں کیڑے نکالنے۔ اب قطع نظر اسلوب کلام کے ویسے دیکھا جائے تو اس آیت میں قوموں کے ارتباط، باہمی میل جول، اہنائے جنس میں ربط و قرمت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا ہے کہ وہ نفرت کے گیت چھوڑ دیں محبت کے ترانے بلند کریں بلکہ باور کر لیا کہ دیرو حرم کے امتیاز کے باوصف انسانی بنیادوں پر فاصلوں کو مٹانا اور قریوں کو بڑھانا انسانیت کی اعلیٰ اقدار میں شامل ہے۔

**وجہ اعتراض** نمبر 2۔ یہاں ”ولی دین“ کے پیرائے میں رسول اکرم ﷺ نے ”دین“ کو اپنی طرف نسبت دی ہے۔ جیسے دین عیسٰی و دین موسیٰ کہنے سے مسیحیت اور موسویت کا تعین ہو جاتا ہے جبکہ فرمایا۔

الا لله الدين الخالص۔ آگاہ رہو کہ دین خالص (کی اضافت، صرف) اللہ (کی طرف ہوتی) ہے۔ (زمر، 3 وغیرہ وغیرہ) اس طرح غیر مبہم الفاظ میں فرمادیا کہ دین کی اضافت رسول اکرم ﷺ کی طرف ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ یہاں ”قانون ساز“ صرف ذات احدیت صفات ہے رسول قانون کی تشریح اور نفاذ کر سکتے ہیں۔

**قول فیصل** یہاں دین کے معنی صرف ”طریقہ کار“ کے ہیں جبکہ رسول کی طرف نسبت۔ نسبت ”مجازی“ ہے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے ”قانون ساز“ اللہ اور ”نافذ“ کرنے والے رسول اکرم ﷺ ہیں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ سلطان کا کام۔ امراء و اعیان سلطنت کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے ایسے ہی عمال حکومت کے کام

سلطان کے کھاتے میں لکھے جاتے ہیں اس سے ”حاکمیت مطلقہ“ متاثر نہیں ہوتی۔



النصر

تسبیح کیا ہے؟ اور استغفار کسے کہتے ہیں؟

525

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ

(نصر، 3 تا 4)

اپنے رب کی تسبیح اور اس سے استغفار کرو۔

یہ ہے کہ فتح و ”نصرت“ حاصل ہونے پر شکر اور ”حمد“ کا اظہار ہی موزوں ہوتا ہے یہاں استغفار اور توبہ کے مطالبہ کی مناسبت کیا ہے؟

وجہ اعتراض

تسبیح اور استغفار کے لئے جن خاص مفہیم کا جامہ تجویز کر لیا گیا ہے وہ ان کی ”قامت“ پر فٹ نہیں آتا، یہاں فتح مکہ کے ضمن میں ”فسبیح“ اور استغفار کی مناسبت واضح ہے کہ فسبیح سے مراد تسبیح کے ”دانے گھمانے“ کے، نہیں ہیں اس سے مراد فتح مکہ کے بعد کی ان ذمہ داریوں کی تکمیل کے لئے تگ و تاز کرنے اور ہمہ وقت مستعد رہنے کے ہیں جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت، تنظیم جماعت اور نفاذ آئین کے لئے کرنے باقی ہیں اور استغفار سے ان ”حفاظتی اقدامات“ کی تلاش و فراہمی کے ہیں جو فتوحات کے مقاصد کو تحفظ دینے کیلئے ضروری ہیں۔



لہب

ابو لہب کی وجہ تسمیہ

526

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ

(لہب)

ابو لہب کا حشر برا ہو۔

وجہ اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ یہاں اسکے نام کو صیغہ راز میں اور کنیت کو شہرت دوام بخشی ایسا کیوں ہوا؟

ابو لہب حضور نبی اکرم ﷺ کا حقیقی چچا نہایت ہی حسین و جمیل تھا اور اسی حسن و جمال کی وجہ سے اس کا چہرہ آگ کی طرح چمکتا تھا اور اسی ہی مناسبت سے اُسے ابو لہب یعنی آگ کی طرح روشن چہرے والا پکارا جاتا تھا۔ ہمیں اسکی اسی شہرت کو ملحوظ رکھ کر قرآن نے نام کی بجائے کنیت کا ذکر فرمایا۔ لیکن چونکہ یہ اپنے چچا سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بے حد مخالفت کرتا اور جنمیوں کے سے کام کرتا تھا اور لہب میں بھی ایک گوندہ نام کا پہلو

قول فیصل

نکال لیا گیا تھا۔ لہذا اسے اسکی کنیت ہی سے تشبیہ دی گئی۔ لیکن یہ کوئی طے شدہ وجہ شہرت نہیں ہو سکتی کیونکہ انسان جب تک ہر میں جاتا اسکے ایمان لانے کا امکان باقی ہوتا ہے اور پیشگی کسی کے لئے جہنم تجویز کرنا عربی زبان کی لطافت سے ناواقفی کی دلیل ہے پھر ”لب“ اگرچہ آگ کے شعلے کو کہا جاتا ہے تاہم اسکو صریح لفظوں میں جہنم یا دوزخ کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا۔ لہذا اسے گالی اور ذم کے طور پر بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اسکی مذمت میں اتنا کافی ہے کہ وہ دشمن رسول ہونے کی وجہ سے۔ اللہ کے دیدنی اور نادیدنی عذاب کا مستحق ہے۔



اخلاص

اللہ احد۔ کی جائے اللہ واحد کہنا چاہیے تھا

527

## قل هو اللہ احد

(اخلاص)

اعلان کر دیجئے کہ اللہ ایک ہے۔

یہ ہے کہ یہاں اللہ کی صفت۔ احد کے حرف سے بیان کی گئی ہے جبکہ احد کا استعمال ہمیشہ نفی کے بعد ہوتا ہے اسکے عکس۔ واحد کی صفت اثبات کے بعد میں آتی ہے مثلاً۔ فی الدار واحد۔ وما فی الدار احد یہاں پہلا جملہ اثباتی لہجہ میں ہے لہذا واحد۔ کا لفظ لایا گیا ہے اور دوسرا جملہ نفی کا حامل ہے لہذا۔ احد۔ کا حرف لایا گیا ہے یہ تو خارج کی مثال تھی۔ قرآن کے اندر بھی واحد۔ کو اثبات اور احد کو نفی کے بعد ہی ذکر کیا گیا ہے مثلاً۔ الہکم الہ واحد (بقرہ، 163)۔۔۔۔۔ اللہ الواحد القہار (ہریم، 48) وغیرہ۔۔۔۔۔ اور نفی کے بعد احد۔ کا استعمال ملاحظہ ہو ولا تتصل علی احد منهم (توبہ، 85)۔۔۔۔۔ لانفرق بین احد منهم (بقرہ، 285)۔۔۔۔۔ لستن کا احد (احزاب، 32)۔۔۔۔۔ فما منکم من احد (الحاقہ، 42 وغیرہ) (عوالہ عبد القادر رازی صفحہ 388)

یہاں رازی مرحوم کا ”استقراء“ صحیح معلوم نہیں ہوتا لغت اور ادب کے ”شناور“ ابو عبیدہ اور ابن عباس کہتے تھے کہ واحد۔ اور۔ احد۔ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن نے ”احد“ کو اثبات کے

مقام پر استعمال کر کے رازی کے استقراء کو غیر یقینی بنا دیا ہے فرمایا۔ فابعثوا احدکم یوقکم (کہف، 19)۔۔۔۔۔ فاشہا دۃ احدہم (نور، 6)۔۔۔۔۔ فخذ احدنا مکانہ (یوسف، 78 وغیرہ)۔

تاہم کسی کا دل رکھنے کے لئے ”احد“ کو نفی کے مقام پر لانے کو ضابطہ ہی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہاں ”صوتیات“ کی رعایت کی رو سے ہر فقرے (یا آیت کے) آخری فقرے کے ”آہنگ“ کو ملحوظ رکھا گیا ہے مثلاً۔۔۔ اللہ الصمد۔۔۔۔۔ لم یلد ولم یولد۔۔۔۔۔ ولم یکن لہ کفوا احد۔ چونکہ ان لکات میں ”فاعل“ کے آہنگ کا استعمال نہیں ہوا لہذا واحد۔ کی جائے احد۔ ہی کو ”صوتی ردیف“ بنایا گیا۔



## پیغمبر۔ جادو کے زرخ میں

528

### قل اعوذ برب الفلق۔ قل اعوذ برب الناس

کہ دو۔ کائنات بھری کے رب اور طلوع صبح کے مالک کی حفاظت چاہتا ہوں۔

میں کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں عبد اللہ بن مسعود کے مصحف میں نہیں تھیں بلکہ وہ جس

**وجہ اعتراض**

مصحف میں ان کو لکھا پاتے محو کر ڈالتے یا شق کر دیتے وہ کہتے تھے کہ یہ دراصل جادو سحر کے

اثرات کو زائل کرنے کے منتر ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ سورتیں عبد اللہ بن مسعود کے مصحف کی زینت نہ بنی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ

**قول فیصل**

موصوف انہیں جس مصحف میں بھی لکھا ہو پاتے شق کر ڈالتے مگر مسلمانوں کے حد علم تک

رسول اللہ ﷺ کے مصحف میں موجود تھیں اور آج تک کسی بھی مسلمان نے انہیں ”منتر“ تسلیم نہیں کیا۔ قرآن ہی کی

حیثیت سے تلاوت کیا اور سینوں میں محفوظ رکھا۔ نیز جہاں تک ابن مسعود کے نظر یہ کا تعلق ہے ہمارے علم میں ہے کہ وہ

مصبہ رسالت پر قائل نہیں تھے اگر کوئی مصحف ان پر نازل ہوا بھی تھا تو وہ راویوں کے سینوں میں محفوظ تھا مسلمانوں نے

اسے نہ دیکھا نہ تلاوت میں شامل کیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان سورتوں میں نہ کسی جادو ٹوٹنے کے ”ذفعیہ“ کا ازالہ کیا گیا ہے نہ آسیب زدوں کو

”شفایاب“ بنایا گیا ہے۔ ان میں شر و فساد سے بچنے کے آداب رکھوائے گئے ہیں۔ یہ نہ بہتر ہیں نہ کسی پر جادو ہونے پر ان

کا نزول ہوا ہے۔ امام بخاری کی روایت میں یہ شہادت کہ مدینہ کے مشہور یہودیوں نے آنحضرت ﷺ پر سحر کیا تھا جس

سے آپ ایک سال کا عرصہ یہاں تک متاثر رہے کہ جو کام نہ کرتے خیال فرماتے کہ کر بیٹھے ہیں جسے کہ ازواج میں سے کسی

سے قربت حاصل ہوتی تو بھول جاتے کہ قرمت کی ہے یا نہیں کی تو یہ سب امور جادو کی شدید گرفت کے غماز ہیں اور آپ

کے دماغی اختلال کی چغلی کھا کر ”نبوت“ کو لباس ”عصمت“ سے عاری کر دینے کے مترادف ہیں جو ایک راسخ العقیدہ

مسلمان کے لئے قابل تسلیم نہیں ہو سکتے خاص کر جادو کا واقعہ اگر مدینہ میں پیش آیا تھا تو یہ سورتیں اس سے پہلے مکہ میں

نازل ہو چکی تھیں۔ لہذا ہمارے نزدیک سحر بر پیغمبر کا واقعہ اپنی تمام تر ”جزئیات“ کے ساتھ کفر اور جھوٹ کا پلندہ ہیں پیغمبر

”معصوم“ ہوتا ہے۔ وہ جس مقام پر قائل ہوتا ہے وہاں کوئی ”شعبہ باز“ جادو گردوار نہیں کر سکتا۔ ”مادی اسباب“ تو اثر انداز

ہو سکتے ہیں لیکن ”روحی“ اور ”نفسی“ کرشمے اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اسکے لئے یہاں پہلے یہ وضاحت فرمائی کہ۔

طرف سے بھی حملہ آور ہو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (طہ، 69) پھر بطور خاص کفار کے اس عقیدے کو جھٹلایا کہ یہ پیغمبر تو سحر

زدہ ہے فرمایا۔۔۔ پیغمبر کو سحر زدہ کہنے والے یا آپ پر سحر تسلیم کرنے والے ظالم (کافر) ہیں۔ (اسراء، 42۔۔۔ غافر، 8)

اس طرح قرآن پاک اپنے پیغمبر علیہ السلام کو ”کلی طور“ پر معصوم اور لوگوں کی روحی اور نفسی ”دست



درازی“ سے محفوظ ٹھہراتا ہے اب یہ ستم ظریفی ہے کہ امام بخاری اور ان کے پیروکار ایسا مواد سامنے لے آئیں جو پیغمبر کو سحر زدہ، ”سیب کا مارا“ اور جادو کا صید زبوں تسلیم کرانے پر مبصر ہیں۔ نہ صرف مبصر ہیں فرماتے ہیں جو ان خرافات پر ایمان نہیں رکھتے وہ دین اسلام سے خارج ہیں۔ ☆ 12-3-98 ملتان بروز منگل مطابق 21-10-1418

jabir.abbas@yahoo.com

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)

باب دوم

408

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)

## وہ جو پیگر وفا تھی

اُس پاک طینت، پاکباز، پاکیزہ میرت، پاکیزہ کردار اور پاکیزہ اخلاق بی بی پاک دامن کے نام جو **ذخیر فاطمہ** کے نام سے شہرت رکھتی تھی۔ جو درویش صفت تھی۔ جس کا دل پاکیزہ، دماغ مطہر، اور جس کا شعور انتہائی سادہ اور انتہائی شفاف تھا اور جس کا احساس اجلا، صاف اور ستھرا تھا جو علم کی نیر تاباں اور پیکرِ حلم و وفا تھی جو شرافت کا پتلہ اور انسانی اقدار کی پاسبان تھی جو وقت کی رابعہ تھی جو 1958ء کے 6 مارچ مطابق چندرہ شعبان کی رات کو دہلی بن کر میرے آنگن میں بسی تھی، دل میں بسی تھی، سانسوں میں بسی تھی اور جو 42 سال کے بعد شعبان کی اُسی تاریخ کو داغِ مفارقت دے کر بھر کے لاقتا ہی سفر پر روانہ ہوئی تھیں میرے جگمگاتے آنگن کو اندھیروں میں تبدیل کر کے مجھے اور اپنے بچوں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے کے لئے چھوڑ گئی۔ ہم صدموں سے چور ہیں ہمارے سانسوں میں بسنے والی ہم سے روٹھ کر چلی گئی ہے بہت دور چلی گئی ہے۔ اب میرے آنسوؤں کا سیل رواں کبھی نہ تھمے گا میں ان کی جدائی اور اپنی کوتاہیوں پر روتا ہی رہوں گا مجھے ہسانے کی کوشش نہ کی جائے۔ میرے زخم جو مندل نہیں ہو گئے انہیں مزید ہرا نہ کیا جائے۔

گیارہ نومبر (2000ء) سے 25 دن پہلے ان کی زندگی کا چراغ جب ٹٹمانے لگا میرا دل ڈولتا چلا گیا اور مجھ پر سو گوار کی سائے لہجہ بہ لہجہ راز ہوتے چلے گئے۔ چار ماہ سے یوں تو غذا کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔ نہ بخنی نہ دودھ نہ جوس نہ صابودانہ اور نہ کوئی اور چیز جس سے ان کی حالت دن بدن غیر ہوتی چلی گئی۔ ان کی حالت کرب اور اذیت میں بدل چکی تھی۔ ہم بے بس تھے۔ کچھ نہ کر سکتے تھے حالات کے بے رحم پیٹروں نے ہمارے حواس اچک لئے تھے اور ہمیں بے بسوں اور بے کسوں کے ریلے میں شامل کر دیا تھا۔ اسکے منہ سے کراہنے کی آواز میں۔ اے اللہ! کی دل دوز اور رقت طاری کرنے کی آوازیں سن کر ہمارا کلیجہ منہ کو آتا۔ اور ہم میں سے ہر فرد کہتا کہ اگر تکالیف کا انتقال ممکن ہو جاتا تو اس کی تکلیف مجھے دیجاتی اور میری راحت اُسے۔ مگر ایسا قانون موجود نہیں تھا۔ غرض کہ اب کر بیک مر حلقے فیصلہ کن لمحوں میں داخل ہو گئے اور مذکورہ تاریخ کو بروز ہفتہ 12 بج کر 5 منٹ پر ان کی تارِ نفس ٹوٹ گئی اور یوں مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری زندگی کی رفتار بھی تھم گئی ہے۔ اب میری زندگی بے مقصد اور اپنی کوتاہیوں پر آنسو بہانے کے لئے باقی ہے مجھے 11 نومبر کی تاریخ نہیں بھولے گی کہ اُس دن اپنی محبوبہ کے جان۔ جان آفریں کی پردگی کے لمحے، میں ان کے سر ہانے بیٹھ کر جان کنی کا نظارہ کرتا رہا۔ اللہ ان پر رحمتوں کا نزول فرماویں۔ اس وقت ہم صدموں سے دل فگار ہیں وہ جو اس گھر کی مالک تھی جس کی حکمرانی تھی ہم کو بے سہارا کر گئی۔ لوگو! ہمیں تسلی مت دو۔ اے اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرما۔

☆ اے شہتِ قائم تم پر سلام ہو

☆ اے ام احمد تم پر سلام ہو

☆ اے اجیت اسلم تم پر سلام ہو

☆ اے جان طارق تم پر سلام ہو

☆ سلام طاہرہ قبول ہو

☆ گریہ عامرہ قبول ہو

☆ نالہ رضویا قبول ہو

☆ آنسوؤں کا خراج قبول ہو

☆ اور رحمتِ خدا قبول ہو

سنو سنو۔ اللہ تمہیں سارا ہے:

یا ایہا النفس المطمئنة . ارجعی الی ربک راضیة مرضیة . فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (الفجر)

# 410

[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)





تاریخ انسان کو پستی سے نکال کر حیات کی بلند ترین سطح پر لے جاتی ہے شرط یہ ہے کہ استفادے کے لئے بالغ نظری اور گہرے شعور سے کام لیا جائے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسئلہ مذہب نے پورے شغف اور اہٹاک کے باوصف تاریخ انہی میں گہرے شعور سے کام نہیں لیا ”خرق عادات“ اور ”کرامات“ کو بیاہنا گہرے سروپا۔ اور خرافاتی مواد کو ”جزو یقین“ بنادیا۔ یہ درست ہے کہ اسلام کے اندہ انی ادوار میں ”عجائب پسند“ مسلمان جو قرآن کے جغرافیہ سے نااہل تھے زیادہ تر قصہ گوؤں اور داستان سراؤں پر اعتماد کرتے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جوں جوں ”تاریخی شعور“ اجاگر ہوتا گیا داستان سراؤں کا سرخ رو شمار ہوا اور دامن عقیدت کو تھام رکھنے کیلئے ”خرقیات“ اور خرافات کی جن کرشمہ سازیوں کو اساس بنایا جاتا رہا وہ جس طرح سورج چڑھنے پر تارے غائب ہو جاتے ہیں عقلی ارتقاء کے ساتھ ہی وہ ”کرشمے“ بھی کافور ہوتے گئے۔ اب سچ کے متلاشی ہر بات میں دماغ سوزی اور فکر و تدبیر کے عادی ہونے لگے تھے۔ حقیقت و خرافات میں امتیاز کرنے کیلئے نئے نئے علمی اور سائنٹفک معیارات معلوم ہونے پر تاریک راہیں روشن ہونے لگی تھیں۔ بائیں ہمہ جو ”ماحولی“ نفسیات و ذہنوں پر مستولے تھی اسکا مکمل ازالہ ممکن نہ تھا۔ کاش ہمارے قدامت کی معجزات کے نام پر رطب و یابس جمع کرنے کی یہ صلاحیتیں اگر قرآن کے تاریخی مقامات کو برائے العین مشاہدہ کرنے پر صرف کی جاتیں تو نتیجہ یقیناً ثمر آور ہو تا اور آج ہم نہ تو ”اسرائیلیات“ کے دلدل میں پھنس جاتے اور نہ ہی قرآن حکیم کی حقیقتوں میں ”ریب و تشکیک“ راہ پاسکتے۔ آج ہمارے بڑوں کی غفلت اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تاریخی فروگزاشتیں حجت۔۔۔۔۔ خامیاں دلیل اور لغزشیں دلیل راہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور معاندین اسلام انہیں اچھا لگے ہمارے سامنے مشکلات کی سربلک دیواریں اونچی کر رہے ہیں بلکہ قرآن حکیم پڑھنے والوں کا جواز پیدا کر کے شرارتوں اور فتنوں کے نہ ہند ہونے والے دروازے کھول رہے ہیں اور یہ وہ ناقابل تلافی نقصان ہے جس کا خمیازہ پوری ملت مسلمانہ بھگت رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے سرسید اعظمؒ کے قلب حساس نے اس نقصان کا ادراک کیا اور مقام ”عبور“ موی، یاجوج ماجوج اور قرآن کے دیگر متعدد تاریخی و جغرافیائی واقعات پر خامہ فرسائی فرما کر اہل اعتراض کے آتشیں دہانوں کا رخ پھیر دیا اور ان ہی کی طرح زعم ملت امام الہند ابوالکلام آزاد (1958م) نے ذی القرنین وغیرہ کی بابت نئی تحقیقات کا اضافہ کر کے خرافات کا منہ موڑ ڈالا۔ تاہم قرآن مجسم کے بہت سے مقامات، اسماء و اعلام اب بھی حساس طبقے کے لئے سوہان روح (خاکم بدہن) بن کر، تشویش، عینم اضطراب اور مسلسل گرب، ٹیس اور غم بھری صورت میں باقی ہیں اور ضرورت

ہے کہ ریسرچ اور تحقیق کے نئے اصولوں کے مطابق ان کا جائزہ لے کر اصل حقائق کو سامنے لایا جائے۔ چنانچہ ایسے ہی ارفع واعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر سورہ نمل کی ایک دو آیات۔ اصحابِ اخذود کے ظالمانہ کارناموں اور فرعون ”ذی الاوتاد“ کے ابہام کے بارے میں اپنی گذارشات پیش کی تھیں۔ اور میرا احساس تھا کہ طالبانِ علم قرآن انہیں پسند فرمائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں ان کی حوصلہ افزائی پر سپاس گزار ہوں لیکن اس بھری دنیا میں ایک ناشائستہ اور جذباتی شخص کی نادان دوستی نے میرے احساس کو مجروح کر دیا کہ اس نے میری کدو کاوش کے برعکس سورہ نمل کے مرکزی مضمونِ ثابتہ غیر متعلقہ حث چھیڑ کر یہ تاثر دیا کہ۔۔۔۔۔ واقعہ سلیمان میں جس ”نملہ“۔۔۔۔۔ یا ”نمل“ کا مذکور ہے اس سے درحقیقت یہی چیزیں ہوں اور چھوٹے مراد ہیں۔ نہ صرف اتنا موصوف نے ”منطق الطیر، ہد ہد اور ”دابة الارض“ کی ضمنی حث چھیڑ کر دامنِ تحریر کو زیادہ پھیلائے کی کوشش بھی کر ڈالی۔ اب میرے لئے اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ۔ اپنی صفائی میں کچھ زیادہ تفصیل فراہم کر کے ”ضمننا“ ”منطق الطیر“ وغیرہ کی حقیقت بھی واضح کر دوں چنانچہ 59-1-12 کو یہ ناگزیر کام سرانجام دے کر ناقدِ مذکور کی ژولیدہ فکری کو برسرِ بام لے آیا اور میری اس ”لا شعوری تحریک“ کے نتیجہ میں ہوا یہ کہ مشہور عالمی محقق و ریسرچر علامہ ابوالجلال ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ و پروفیسر۔ جمالیہ عربک کالج مدراس نے ناقد محترم کے پیردرشد سید مودودی کے جواب میں ایک مدلل مقالہ تحریر فرما کر میرے فکر و نظر کے گوشے مزید دا کئے۔ اور اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سورہ نمل کی 18 دیں آیت کی بابت اتنی مدلل اور مبسوط تحلیل صرف میرے ہاں سے ہی ملے گی۔ وبالله التوفیق۔

طبع چٹان لاہور۔ 58-11-17، 59-1-12

**آیہ نمل کا متن**  
قالت نملة يا ايها النمل ادخلوا مساكنكم لا يحطمنكم سليمان وجنوده وهم لا يشعرون

(سلیمان کی مذکورہ فوجیں جس وقت داوی نمل میں داخل ہوئیں تو انکی رائیس نے کہا۔ اے قوم نمل اپنے اپنے گھروں میں جا چھو۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اسکی فوجیں بے خبری میں تمہیں چور چور کر ڈالیں۔)

(نمل، 18)

اس ترجمہ کی رو سے آیت کا مفہوم واضح ہے کہ جن دنوں سلیمان کا داوی نمل پر گذر ہوا ان دنوں وہاں ایک عورت راج کر رہی تھی اور اسی ہی نے اپنی قوم اور سپاہیوں کو مشورہ دیا تھا کہ ”گھر بند“ ہو کر شر کو ”کھلا“ چھوڑ دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جنگی قوانین کی رو سے محفوظ ہو گئے بلکہ ہزاروں برس کا یہی قانون اسلامی دور میں بھی نافذ، جاری اور رائج رہا۔ ارشاد ہے

من دخل دارابی سفیان فهو آمن . ومن القى السلاح فهو آمن ومن اغلق بابہ فهو آمن

مکہ فتح ہونے کے دن جسے ابو سفیان کے گھر میں قدم رکھا وہ قانونی پناہ میں آگیا۔ جسے ہتھیار ڈالے وہ بھی قانونی حفاظت میں آگیا اور اسی طرح جسے گلی کو چوں کو کھلا چھوڑ کر ”گھر بند“ ہو گیا وہ بھی پناہ یافتہ ہے۔

(بخاری و مسلم، حوالہ مشکوٰۃ)

ہمارے متقدمین اور ان کے پیروکار ”نملہ“ کے طے شدہ مفہوم کے مطابق وادی نمل۔ کوچیو نیوں والی وادی ہی تسلیم کرتے آئے ہیں جبکہ دنیا جانتی ہے کہ طے

شدہ مفہیم حقائق۔ تخلیق کرنے کی صلاحیت، نہیں رکھتے۔ پھر یہاں جو ”خرابی“ واقع ہوئی ہے وہ اس اصول کو نظر انداز کرنے ہی سے ہوئی ہے کہ ان لوگوں نے اسماء و اعلام کے بھی ترجمے کر ڈالے۔ جبکہ احتیاط ای میں تھی کہ ترجمہ کا اہتمام نہ کیا جاتا کیونکہ اسماء و اعلام جب علم (PROPER NAME) کے طور پر استعمال ہوں تو ان کا ترجمہ کرنا اسم اور علم کی نفسیات کی نفی کر دینے کے مترادف ہے مثال کے طور پر۔ ایک شخص کا نام ”اسد“ یا ”صخر“ ہے اب آپ قال اسد۔ بول کر بغیر کسی قرینے کے۔ ”شیر بولا“ مراد لیں۔ یا قال صخر کہہ کر چٹان کا بولنا لفظ کر لیں۔ تو یہ کسی بھی قاعدے اور قانون کے مطابق صحیح نہیں کہلائے گا۔ بلکہ قال۔ کا فعل قرینہ ہے کہ یہاں ”اسد“ سے مراد شیر اور صخر سے مراد پتھر نہیں ہے اسی طرح قالت نملہ۔ میں ”قالت“ کا فعل قرینہ ہے کہ یہاں نملہ سے مراد چیونٹی، نہیں ہے۔ اسکی دوسری مثال یوں سمجھئے کہ آپ۔ لا۔ ہو۔ کا تجزیہ کر کے مفہوم پتہ چلتے ہیں ”اور۔ لے آؤ“ اور ساتھ ہی عربی میں ترجمہ کرتے ہیں اعط ثانیاً۔ اور پھر وضاحت کرتے ہیں کہ اعط ثانیاً پاکستان کے ایک شہر کا نام ہے جسکی خاصیت یہ ہے کہ وہ ایک صوبے کا دار الحکومت ہے۔ تو یقین جانئے دنیا کے کسی بھی نقشے میں آپ کو ترجمہ شدہ لا ہو، نہیں ملے گا کیونکہ آپ کی فراہم کردہ معلومات، تجزیہ، ترجمہ اور تشریح نے اسکا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جب آپ نملہ۔ نمل اور وادی النمل۔ کا ترجمہ کریں گے تو کسی بھی حال میں مفہوم کی دشواریوں پر قابو نہیں پاسکیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے ان قبائل نے اپنا لقب ”نمل“ کیوں تجویز کیا؟ تو اس کا جواب قوموں کی تاریخ کے ان اٹھاء و خیزوں میں آسانی سے مل سکتا ہے جو اس طرح کے

[illegible]

تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ”سچ“ کے حمار تھے؟ العیاذ باللہ۔

ان شواہد کی رو سے ”نمل“ اس قوم کا لقب ہے جو جزیرۃ العرب کے جنوب میں رہائش رکھتی تھی اور اسی ہی مناسبت سے ان کے ”مسکن اور وطن کو ”وادی نمل“ سے موسوم کیا گیا تھا۔ نملۃ۔ اسم نکرہ ہے عربی میں تانیث کی علامت ”تا“ ہے اور اردو میں کوئی خاص قاعدہ نہیں ہے عام طور پر الف، نون اور ”یا“۔۔۔۔۔ اور صرف ”باء“ سے تانیث کا کام لیا جاتا ہے مثلاً مغل۔ عورت کے لئے مغلانی۔ راجپوت عورت کے لئے راجپوتی۔ اور ”نمل“ کے لئے مغلانی۔ یا۔ مہلی وغیرہ۔

نمل کے متعدد معانی ہیں یہاں ان سے مراد قوم نمل ہے کہ اسکے بغیر نطق اور قول کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی

### نمل کے انسان ہونے پر شواہد و قرائن

اور ہم محاورات اور لسانیات کے مسلمہ اصولوں کو نظر انداز کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ قادر ہے کہ چیونٹی میں ”قوت گویائی“ پیدا کر دے کیونکہ اللہ کی قدرت کو۔ خود ایجاب۔ ذہنی پیانوں سے مربوط کر کے اللہ کی ”سنت جاریہ“ اور فطرت اشیا کی نفی نہیں کر سکتے اس مضمون کو ”اخوان الصفاء“ میں بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جس کا اردو خلاصہ یوں ہے :

سنت اللہ اور عادات انسانی نے ہر مخلوق کے مافی الضمیر اور ”افتاد“ کے طریق اظہار کو مختلف جبلتوں سے مربوط کر رکھا ہے اور یہ ربط ایسا ہے کہ متعلقہ ذات سے جدا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی غیر پر اسکا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے یعنی کتا اگر بھونک کر ہی اپنا مافی الضمیر ادا کرتا ہے تو چنگھاڑ کر نہیں کر سکتا۔ گھوڑا ہننا کر ہی راز دل اگر بتا سکتا ہے تو بھونک کر نہیں بتا سکتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مخلوق جس طرز ادا سے خوشی، غمی یا خواہش کا اظہار کرے زبان حال سے وہی اسکا نطق ہے اور وہی اس کا قول۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کے طرز ادا کا دوسرے پر چونکہ اطلاق طبعاً محال ہے لہذا ہر مخلوق کے طرز ادا کا نام مختلف ہی تجویز ہوا مثلاً کلام، نطق اور قول انسان کے لئے۔۔۔۔۔ نہق گدھے۔۔۔۔۔ عواء اور نبیح کتے۔۔۔۔۔ اور صہیل گھوڑے کے لئے خاصہ لازمہ قرار پائے اور چیونٹی اپنے مختصر وجود کے لحاظ سے چونکہ آواز سے محروم تھی لہذا اسکی ”آہٹ“ کو اظہار خواہش کا ذریعہ ٹھہرا کر ”دیب“ کو اسکی صفت قرار دیا۔

(اخوان الصفا طبع مصر 1929 صحیح زر کلی جلد 2/125 و صفحات متفرق)

اس تجزیے سے واضح ہوا کہ جس طرح گدھا زروئے ”جبلت“ (NATURE) بھونکتا اور کتا ڈمپٹوں نہیں کرتا اسی طرح انسان بھی طبعی طور پر ”دیب“ کے وصف سے قاصر اور چیونٹی کلام کرنے سے عاجز ہے کیونکہ حیوانات سے کلام اور نطق کا صادر ہونا سنت اللہ کے خلاف ہے ولا تبدیل لخلق اللہ اور کہ جانوروں کی جبلت میں منطق اور کلام رکھا ہی نہیں ولن تجد لسنة اللہ تحویلا

(روم، 30)

(فاطر، 43)



یہاں یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ اخوان الصفا کے سرصفیہ گمنام اور مجبول تھے لہذا ان کا تجزیہ۔ قابل پذیرائی نہیں ہو سکتا کیونکہ انہوں نے جن حقائق کا اظہار کیا ہے قرآن حکیم خود بھی ان پر گواہ ہے وہ اگر کہتے ہیں کہ انسان فطرنا عاقل ہے اور حیوانات فطرنا لا یعقل ہیں یا انسان فطرنا بھونکنے سے قاصر اور کتا بھونکنے سے عاجز ہے تو اس میں خلاف واقعہ کون سی بات سرزد ہوئی ہے آپ کو ترکی طرح آنکھ موندھ کر دیکھنے سے انکار تو کر سکتے ہیں مٹی کی فطرت کو بدل کر بیج نہیں سکتے۔ بلبل کے چھانے اور قمریوں کے غٹ غوں کرنے کو گائے بیل کے بیل سے مراد کر کے قدرت خدا کا تماشا، نہیں کر سکتے۔ رہا اخوان الصفا کے گمنام ممبروں کا معاملہ تو وہ گمنام کب بٹھیرے؟ ذیل میں ان کے نام معلوم کر کے اپنی جمالت کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ العسل المصفا۔ کے مصنف عبدالحی الحویزی نے بڑی وقت اور ژرف نگہی سے لکھا ہے کہ اس مجموعے کے مصنف امام جعفر الصادق کے خلیفہ مجاز احمد بن عبد اللہ تھے اور انہوں نے جب محسوس کیا کہ۔ عالم انسان ہدایت کے سرچشموں سے دور چلا گیا ہے تو فلسفیانہ ہر ایہ بیان میں اپنے ”اہداف“ و مقاصد کی وضاحت کر دی۔ کہ ان دنوں فلسفہ ہی، تفہیم مسائل کا توانا ذریعہ بن گیا تھا۔

**دوسرا قرینہ۔ حطم** آئے زیر بحث میں قابل غور الفاظ میں سے۔ لا یحطمنکم۔ کا لفظ بھی ہے جسکے معنی توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں (زمر، 21۔۔۔ واقعہ، 65۔۔۔) اور حدید 20 بترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی)۔۔۔۔۔ اور جن لوگوں نے حطم۔ کا ترجمہ کچل دینا کیا ہے انہوں نے ادبیات عرب اور نصوص قرآنی کے خلاف کیا ہے اور غالباً اس خیال سے کہ ”نمل“ چونکہ چوٹی کو بھی کہا جاتا ہے اور وہ اتنی حقیر مخلوق ہے کہ صرف کچلی ہی جاسکتی ہے لہذا اس مناسبت سے حطم۔ کے معنی کچل دینا ہی تجویز کر ڈالے۔ لیکن اگر ان کی تلاش کردہ مناسبت کے مطابق ہی وحی الہی نے کچھ کہنا ہوتا تو۔ لا یحطمنکم۔ کی جائے۔ لا یطأنکم۔ کہنا موزوں ہو سکتا تھا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ”حطم“ کے معنی لامحالہ۔ روندنے اور کچل دینے کے نہیں کئے جاسکتے اور وہی معنی صحیح ہو نکلے جو قرآن پاک نے خود تجویز کئے یا اہل عرب نے واضح طور پر سمجھے۔ امام راغب (1108 م) مفردات الفاظ القرآن میں لکھتے ہیں۔ الحطم کسر الشئ۔ (حطم کے معنی توڑنے اور چور چور کرنے کے ہیں) (طبع مصر صفحہ 122) اور استدلال میں بھی یہی زیر بحث آئیہ پیش کر کے ہمارے موقف کی تائید کر جاتے ہیں۔ اسی طرح علامہ زنجیزی (1144 م) نے اساس البلاغہ میں عرب کے محاورے۔ قد تحطمت الارض یسا۔ کی تشریح میں لکھا ہے اے نکسرت زروع الارض۔ (خشک سالی سے درخت اور پودے ٹوٹ ٹوٹ کر بھرنے لگے)۔ (طبع دارالکتب المصریہ صفحہ 87)۔ بلکہ امام زنجیزی ہی نے حطم کے مجازی مفہوم میں لکھا ہے۔ اصابتم حطمة اے ازمة۔ کہ مصیبت ٹوٹ پڑنے کو بھی حطم ہی کہا جاتا ہے۔ (اساس البلاغہ صفحہ 87 ک نمبر 3) اور استدلال میں ذیل کا شعر پیش کیا ہے۔

انا اذا حطمة حئت لنا ورقا

نمارس العود حتی یبت الورق



جب کوئی آفت ہمارے باغ کے پتے گرا دیتی ہے تو ہم۔ دوبارہ اپنی محنت کو کام میں لا کر انہیں سرسبز بنانا لگتے ہیں۔  
(اساس البلاغۃ طبع مذکور صفحہ 87)

اس بناء پر آیہ زیر بحث کے معنی قابل فہم بن جاتے ہیں کہ وادی نمل کی ملکہ نے قوم سے کہا:  
اے قوم نمل اپنے گھروں میں چلی جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اسکی قوم لاشعوری طور پر تم پر مصیبت برپا کر دیں اور تمہارا زور توڑ دیں۔  
(نمل، 18)

یہاں ”حطم“ کا لفظ واضح قرینہ ہے کہ ملکہ سے مراد انسانی مخلوق اور یمن کا عربی قبیلہ ہے۔ اگر چہو نیٹیاں ہو تھیں تو ان پر حطم۔ کا اطلاق صحیح نہ ہو سکتا تھا کہ۔۔۔۔۔ وہ تو رتھیں ہی ریزہ ریزہ۔ انہیں سلیمان کی افواج قاہرہ کی تلواریں۔ مزید کیا ریزہ ریزہ کر سکتی تھیں؟

حطم۔ کے علاوہ اسی آیت کا صیغہ ”ادخلوا“ بھی گواہ ہے کہ یہاں انسانی مخلوق مراد ہے  
**تیسرا قرینہ۔ ادخلوا**  
کیونکہ غیر ذی عقل۔ کے لئے امر ”مذکر“ کا صیغہ استعمال نہیں ہوتا۔ یعنی قاعدہ یہ ہے کہ مخاطب جب ایسی مخلوق ہو یا۔ فاعل ایسا ذی روح ہو جو عقل و فکر کے تکلف سے بے نیاز ہو تو وہاں صیغہ امر ”جمع“ مذکر استعمال کرنے کی بجائے صیغہ امر۔ واحد مؤنث استعمال کیا جائے گا۔ شہد کی مکھی جو کہ انسانوں کے سے۔ عقل و فکر سے محروم ہے قرآن نے اسے بھی غیر عاقلوں کے صیغے ”مؤنث“ سے خطاب کیا ہے۔ ارشاد ہے واوحی الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون

اللہ نے شہد کو وحی فرمائی کہ۔ پہاڑوں میں۔ درختوں میں اور پودوں کے مراکز کی چھتوں میں اپنا گھر بنالے۔  
(نحل، 58)

یہاں ”النحل“ پر وحی کے اطلاق کے باوصف ”غیر عاقل“ کا صیغہ ”اتخذی“ استعمال کیا گیا ہے کہ وہ فطرتاً عقل کی نعمت سے محروم تھی جبکہ مرئی ادبیات و گرامر و استعمالات قرآن کی رو سے حشرات الارض اور غیر عاقلوں کے لئے انسانوں والا صیغہ استعمال نہ ہو سکتا تھا۔

اس قاعدے کی رو سے ”نمل“ اگر غیر انسانی مخلوق ہوتی تو ”ادخلوا“ کے عاقل کے صیغے کی بجائے تانیث کے غیر عاقل صیغے ”ادخلن“ سے خطاب کیا جاتا لیکن یہاں چونکہ انسانوں کا صیغہ استعمال ہوا ہے لہذا۔ یہ برہان قاطع اور واضح قرینہ ہے کہ یہاں جس ”نمل“ کو خطاب کیا گیا ہے وہ کیڑوں، مکوڑوں کی جنس میں سے نہیں انسانی مخلوق کا فرد ہے۔ اور اسی ہی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر علامہ ”خازن“ (1340م) جو کہ ”نمل“ کو حشرات ہی میں شمار کرتے تھے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ۔ ولم یقل ادخلن۔ لا نه جعل لهم عقولا کالآدمیین فحقو طبوا خطاب الادمیین۔

یعنی۔ ادخلوا مساکنکم۔ فرمایا۔ ادخلن مساکنکن استعمال نہیں کیا۔ جبکہ پہلا صیغہ غیر انسانوں کے لئے استعمال نہ ہو سکتا تھا؟ تو وجہ یہ بنی کہ اللہ سبحانہ نے چہو نیٹیوں کو عقل دے کر

(تفسیر خازن طبع مصر جلد 3/380)

انسانوں ہی کے صیغے سے خطاب کیا۔

یہاں خازن کو تسلیم ہے کہ ”ادخلوا“ کا غیر انسانوں پر اطلاق نہیں ہو سکتا کہ گرامر اور لسانیات کے متفقہ استقراء کی رو سے غلط ہے لیکن اسکے باوصف اپنے ذہنی پس منظر سے مغلوب ہو کر ضابطہ شکنی کا ملبہ ذاتِ خداوندی پر ڈال دیتے ہیں۔ جبکہ اللہ پر غلط بیانی اور جھوٹ بولنا متابع دین و ایمان کو عارت کر دیتا ہے۔

سبحان ربك رب العزة عما يصفون ه

یہاں ”نمل“ اگر غیر انسانی مخلوق ہوتی تو خطاب میں ”مساكنكم“ کہا جاتا۔

**چوتھا قرینہ مسکانکم**

یہ علاوہ اسکے کہ مرئی کی دستوں میں انسان، حشرات الارض اور حیوانات کی

آرام گاہ کو مختلف مناسبتوں سے مربوط کر کے جدا جدا ناموں سے موسوم کیا گیا ہے جس طرح ہم شہد اور بھڑوں کیلئے چھتا۔ شیر کے لئے کچھار۔ لومڑی، گیدڑ اور بھیڑیے کے لئے، بھٹ۔ سانپ کے لئے بانہ۔ بچھو کیلئے سوراخ۔ چوٹیوں کے لئے بل۔ گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کے لئے اصطبل، گھڑ سال اور طویلہ۔ گائے، بھینس کے لئے مویشی خانہ۔ اور تمام پرندوں کے لئے گھونسلہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح عربی میں بھی ہر جاندار کی رہائش کے لئے الگ الگ نام استعمال کئے گئے ہیں مثلاً شیر، چرخ، سانپ اور بھیڑیے کیلئے عربہ۔ اونٹ کیلئے مناخہ۔ بچھو اور چوٹیوں کے لئے جحر۔ گائے بھینس کے لئے مذبلہ۔ اور انسان کے لئے بیت۔ دار۔ اور مسکن وغیرہ۔ عربی لسانیات کی ان خصوصیات کے مطابق آیہ زیر بحث میں ”نمل“ سے اگر چوٹیوں کی جنس مراد ہوتی تو۔ ادخلوا مساكنكم کی بجائے ادخلن جحور کن کہا جاتا لیکن ایسا نہیں کہا گیا جو واضح قرینہ ہے کہ یہاں ”نمل“ سے انسانوں کے گروپ ہی مراد ہیں اور جطور پر انسانوں ہی کے لوازمات اور صیغے استعمال میں لائے گئے ہیں۔

چوٹی ایک ”بے آواز“ اور صامت کیڑا ہے کسی انسان نے اسکی آواز نہیں سنی اسکے برعکس

**پانچواں قرینہ آواز**

چڑیوں کی آواز ہم سنتے ہیں اور ایک حد تک ان کے چھمانے کی وجہ بھی بعض لوگوں کی

سمجھ میں آجاتی ہے بلکہ زلزلہ۔ یا اس طرح کی ناگہانی آفت سے پہلے یہ چڑیاں درختوں پر نظر نہیں آتیں۔ سورج ڈھلنے پر جب خوب چھمکتیں اور شور مچاتی ہیں تو ہر کوئی سمجھ جاتا ہے کہ اپنے رین بسیر اکیلے فکر مند ہیں۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر مخلوق کی کسی طرح کی آواز ضرور ہوتی ہے اور سنانے و سننے کے لئے مخصوص ”صوتی“ کیفیت نیز۔ لیکن چوٹیاں آواز سے قطعی محروم ہیں اب زیر بحث ”نملہ“ اگر چوٹی ہی تھی تو اس نے کس طرح کی چیخ ماری۔ جسے اسکی قوم نے بھی منسوس کیا اور سلیمان بھی اسکی بات سمجھ گئے؟ چوٹی بولی ایک شاعر تو کہہ سکتا ہے لیکن وحی الہی سو و خطا کے مراحل سے گزرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ قالت نملہ۔ کے صریح اشارے کو چھوڑ کر ”نملہ“ سے چوٹی مراد لینا دیوالاکی کٹھا تو ہو سکتی ہے۔ قص القرآن کا باب نہیں ہو سکتا۔

آیہ زیر بحث کا ماسبق اس طرح ہے۔ وحشر لسلیمان جوده من الانس

**چھٹا قرینہ آیہ کا ماسبق**

والجن والطير فهم يوزعون ه حتى اذا اتوا على وادى النمل ه

اور سلیمان کیلئے جنوں، انسانوں اور طیر کے لشکر اس ترتیب سے جمع کئے گئے تھے کہ ہر قسم کی الگ الگ تقسیم تھی۔  
(نمل، 17)

اس آیت میں مملکتِ سباء کو فتح کرنے کی جنگی تیاریوں اور سلیمان کیلئے زبردست لاؤ لشکر جمع کرنے کی خبر دی گئی ہے لیکن قبل اسکے کہ وہ سباء پہنچ کر اپنا عمل شروع کر دیں طائف سے گذر کر جب یمن کی وادی ”نمل“ پہنچے تو وہاں قبائل نمل کی چھوٹی سی مملکت کا پتہ چلا۔

یہاں سے ظاہر ہے کہ اگر وہ چیونٹیوں کی مملکت تھی تو اسے فتح کرنے کے لئے باری، نوری (\*) اور خاکی افواج کا اہتمام بے معنی ہو جاتا ہے کیا سلیمان کا لشکر دیکر ان واقعات چیونٹیوں پر ہی تلواریں کے جوہر دکھلا کر فتح مند ہو جانا چاہتا تھا؟ کیا اس وادی کے علاوہ سلیمان کو کہیں بھی چیونٹیوں کا احساس نہیں ہوا کہ وہ دوسرے مقامات پر تو انہیں روندتے اور ان کے بلوں کو ملیا میٹ کرتے رہے مگر یہاں پہنچ کر اپنی چیونٹی دشمن تلواریں کو نیام میں دینے پر مجبور ہو گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ سلیمان نے نہ تو چیونٹیوں پر لشکر کشی کی اور نہ ہی ”نمل“ کو آپ بے زبان، بے گوش اور خرقِ عاوت کیرا سمجھتے تھے؟ نیز اگر آپ نے اتنے اولوالعزم اور تمام وسائلِ حرب و ضرب کے مالک ہونے کے باوصف چیونٹیوں کو ہنس ہنس کرنے کا اہتمام کیا تھا تو کیا یہ آپ کی توہین نہیں ہے؟ کیا اگر چیونٹیاں ”گھربند“ ہو جاتیں تو سلیمان اپنی عظمت کو واؤ پر لگا کر انہیں ”رسل“ کے نہ رکھ دیتے؟

مفسرین نے بہ اختلاف روایات ”نملہ“ کے لئے کچھ نام بھی تجویز کیے ہیں مثلاً طاخیه۔۔۔۔۔ منذرہ۔۔۔۔۔ حزمی اور حوس! ان

میں سے حقیقی نام کیا تھا اس کا علم شاید ان مفسر حضرات کو بھی نہ ہو جنہوں نے اتنے سارے نام تجویز کر لینے کے بعد بھی اسے زمینی حشرہ ہی سمجھ رکھا ہے۔ یا پھر علمائے اثریات (ARCHEOLOGISTS) ہی بتا سکتے ہیں کہ اس قسم اور اس نام کی چیونٹیاں عرب کے کس علاقے میں رہتیں؟ یمن کی وادی نمل میں یا۔۔۔ شام کے طاء النمل میں؟ اور کتنا عرصہ ہو کہ یہ نسل دنیا سے ناپید ہو چلی؟ کیونکہ مجھ سے اگر سوال ہوگا تو میرا ایک ہی جواب ہوگا کہ ان روایات کا نہ سر ہے نہ پیر! آپ گھریلو اور مانوس جانوروں کے پیاری شناخت کے نام تجویز کر سکتے ہیں انکی عمدہ نسل اور شاخ کی بات بھی کر سکتے ہیں لیکن ناناؤس اور غیر مالوف حیوانات کے نام رکھنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر نام بھی چیونٹی جیسی حقیر اور بختہرہ جملہ والی مخلوق کا جسکے نہ تو سر پر آپ ہاتھ پھیر سکتے ہیں نہ ہونٹوں سے چبچ کر کے انہیں مانوس کر سکتے ہیں! اور غالباً یہی سوچیدگیاں اور گنجلک صورتِ حالات تھے جنہیں ملحوظ رکھ کر مراکش کے علامہ عبدالرحمان السہلی (1186ھ) نے لکھا کہ۔۔۔۔۔

ولا ادری کیف يتصور للنملة اسم علم و النمل لا يسمي بعضه بعضا ولا الادمى يمكنه تسمية واحد منهما باسم علم لانه لا يتميز للآدميين بعضهم من بعض ولا هم ايضا واقعون تحت ملك آدم كالخيل

والکلاب لان العلمیة فیما کان کذا لک موجودہ عند العرب

یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ ایک نملہ۔ کیلئے اسم علم (PROPER NAME) کیسے تصور میں لایا گیا؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خود چیونٹیاں بھی اپنے ہم جنس چیونٹیوں کے نام تجویز نہیں کر سکتیں۔ یہ حضرات انسان کیلئے کیسے ممکن ہوا کہ لاکھوں کروڑوں چیونٹیوں کی شناخت کر کے الگ الگ نام تک تجویز کر ڈالے؟ یہ تو بھری استطاعت سے قطعاً خارج ہے بھر تو ایسے جانوروں کے نام رکھ سکتا ہے جو اسکی دسترس یا ایک گونہ پرورش میں ہوں۔ مانوس ہوں اور سدھائے جانے کی صلاحیت رکھنے والے ہوں جیسے گھوڑے، بندر، کتے ہیں کہ عرب میں ایسے گھریلو جانوروں کے لئے اسم علم تجویز کرنے اور پکارنے کا رواج خفی ملتا ہے۔

(التعریف والا اعلام فیما أبهم من الاسماء والا اعلام۔۔۔۔۔ بحوالہ حیاة الحیوان

مصنفہ علامہ دمیری (1405 م) طبع قاہرہ جلد 2/433 مادہ ”نملہ“)

سہیلی نے عام اصول کے تحت وضاحت کرنے کے بعد ”حاصل وضاحت“ یوں پیش کیا ہے فہوان تکون

هذه النملة الناطقة قد سمیت بهذا الاسم

یہ شواہد واضح کرتے ہیں کہ سلیمانؑ نے جس ”نملہ“ کو جنگ کی وارننگ دی تھی اور اس نے اپنی قوم کو جس طرح نتائج سے آگاہ کیا تھا اسے انسان ہی تسلیم کیا جائے کہ انسانی مناسبت ہی سے اسکا نام بھی تجویز ہو سکتا تھا اور کام بھی مصالحتانہ سرزد ہو سکتے تھے۔ (حیاة الحیوان جلد 2/433)

اسطرابو یونانی (60 ق م) اپنے جغرافیہ ”مرمی گائیڈ“ میں ”نمل“ کی ذیل

آلہوان قرینہ. تاریخی نوشتے

میں لکھتا اور ان کے اوصاف بتاتا ہے کہ ”یہ لوگ سونے کو ریت سے

علحدہ کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔“

اسطرابو کی یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر 1857 میں تین جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

(حوالہ تھدیب الاخلاق جلد سوم علامہ اعظم یار جنگ چراغ علیؒ (1895 م) طبع جن الدین لاہور صفحہ 142)

اسطرابو کی یہ شہادت نزولِ قرآن سے کم از کم چھ سو سال پہلے واضح کرتی ہے کہ عرب اپنے قبیلہ ”نمل“ سے

آشنا اور ان کے پیشے سے خفی متعارف تھے لہذا یہ بات قرین عقل ہے کہ وحی الہی نے اسی ہی قوم کا واقعہ ذکر کر کے احساس دلایا ہے کہ وہ انسان تھے بلکہ ایک گونہ کیمشری میں اچھی مہارت بھی رکھتے تھے۔

محدث ومؤرخ ابن عساکر (1176 م) لکھتا ہے کہ روایت کی ہم سے اسحاق بن

نواں قرینہ. نمل. کی شاخ

بھرنے سعید سے اور اس نے قوادہ سے کہ اسے حسن نے بتلایا۔

”نملہ“ سلیمانؑ کا نام ”حرس“ تھا وہ قبیلہ بنی شیمان کی شاخ میں سے تھی اور لنگڑا کر چلتی تھی

قدو قامت زیادہ بلند، نہیں تھا بھیڑیے کے برابر تھا۔ (حوالہ تفسیر ابن کثیر طبع قاہرہ جلد 309/3)

یہ روایت جیسی بھی ہے اس سے محض، نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ محدثین نے اسکے لنگڑے پن، قامت اور قبیلے کی نشاندہی کر کے ایک گونہ اعتراف کیا ہے کہ وہ مشہور معنی میں ”چیونٹی“ نہیں، تھی بہت حوا تھی جس آدم میں سے، تھی قبیلہ بنی شیمان (SHEESAN) کی ایک فرد تھی۔

عام طور پر نمل کے معنی چیونٹی کے لئے جاتے ہیں لیکن منجد۔ اور ”قاموس“ میں۔ نملہ۔  
**نمل کے معنی** نمل یا۔ نمل کی ذیل میں لکھا ہے۔ نمل۔ مخبر۔

یعنی جاسوسی اور مخبری کرنے والا ابوالی۔ (المنجد طبع بیروت صفحہ 473 م)

یعنی منجملہ دیگر معانی کے ایک معنی یہ بھی ہیں۔ اور یہ بات یوں بھی قرین قیاس ہے کہ نمل۔ قبیلہ کی رکیسہ نے مخبروں کے ذریعہ معلوم کر لیا کہ سلیمان بن کو فح کرنے کیلئے پورے لاؤ لشکر سے یہاں سے گذرنے والے ہیں اور ہم کہ جو راہوں میں پڑے ہیں ہو سکتا ہے ہمیں بھی حریف۔ سمجھ کر بے خبری میں چڑھائی کر دیں لہذا شہر کو کھلا چھوڑ کر اسکی وارننگ کا جواب فراہم کر دیں کہ ہم پُر امن ہیں۔ نیز جاسوسی انسان کی صفت ہے۔

مفروضات کی کثافت سے حقائق کے چاند و سورج کی روشنی کو مدہم کرنے  
**وادئ نمل کا محل وقوع** والے سید مودودی صاحب قبیلہ نمل کی حقیقتوں کو ایسے مفروضوں سے

تعبیر کرتے ہیں جن کے لئے کوئی عملی ثبوت نہیں ہے۔ وہ تاریخ، جغرافیہ اور آثار قدیمہ کی پختہ شہادتوں کو ڈھکوسلہ قرار دیتے اور عجوبہ پسند اسلاف کی خیالی تفاسیر کو مستند باور کراتے ہیں۔ ان کے ایک پیروکار محترم وصی مظہر ندوی صاحب (سابق امیر جماعت حیدرآباد اور عہدہ ضیاء کے وزیر اوقاف) خفا ہیں کہ میں نے اس ضمن میں جو لکھا ہے وہ ”لادینیت“ کا مظہر ہے۔۔۔۔۔ اب پیرومرشد اور پیروکار کی بات یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے دل پر لگی ہوئی ”سیل“ کو توڑ کر خانہ دل کی ظلمتوں کو حقیقت کی روشنی سے زائل کیا جاسکتا ہے تاہم طالبان علم قرآن کیلئے جو کچھ میری معلومات کے احاطے میں ہے اسے پیش کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ دھوھڑا۔

الشریبینی اور مفسر خازن (1340 م) کی تفاسیر میں حضرت کعب احبار (متوفی 652 ہجری 104 سال) کا ایک طویل تبصرہ منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ،

حضرت سلیمان (950 ق م) یمن کو فتح کرنے کے ارادے سے چلے۔ اصطخر (پنیرا) سے ہوتے ہوئے مدینہ النبی (ﷺ) پہنچے۔۔۔۔۔ پھر مکہ سے گذرے۔۔۔۔۔ اسکے بعد وادی سدیر (جو طائف میں ہے) سے گذر کر وادی النمل میں پہنچے۔

(خازن طبع حلبی قاہرہ جلد 7/379 تا 8)

حضرت کعب احبار تک اسکی سند کیسی ہے؟ اسکی تفصیل میں جانے کی ضرورت، نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ



<http://fb.com/ranaiabirabbas>

بستیاں واقع ہیں اس قلعے کے چند دروازے ہیں جن میں اجازت لئے بغیر داخل نہیں ہوا جاسکتا۔ یہ دروازے بند کئے جاتے ہیں ان قلعوں، بستوں اور ایسے کھیتوں جن پر پانچ ہزار ”ذیب“ کا گیہوں حاصل ہوتا جسکی مقدار سات ہزار پچاسو قفیز بنتی ہے۔

اسکے بعد شہر پناہ کے ان دروازوں کے نام بتلائے ہیں جو وہاں کے قبائل کے داخل ہونے کیلئے مشہور تھے جن میں سے ایک دروازے کا نام ”البرار“ (BARAR) ہے جو قبائل شرس۔ نمل اور ”قدم“ کے داخل ہونے کیلئے خاص تھا۔

(صفۃ جزيرة العرب صفحہ 197)

مذکورہ وادی نمل جو اڑھائی ہزار سال سے تاریخی وجود اور تشخیص رکھتی ہے اسکی بابت علامہ ابو الجلال ندوی لکھتے ہیں :

### ایک تازہ شہادت

WALTER. B HARRIS. F.R.G.S نے اپنی شہرہ آفاق کتاب JOURNEY

THROUGH THE YEMAN. میں ایک نقشہ دیا ہے اسمیں صنعاء اور ”زار“ کے

درمیان طول عرض 44,30- اور عرض بلد 14,50 پر بلاد انیس میں وادی نمل کو دکھلایا ہے۔

(طلوع اسلام لاہور دسمبر 1959 صفحہ 45)

اور اسی مقام کے جنوب مشرق میں سات یوم کی مسافت پر شہر ”نارب“ کے آثار واقع ہیں جو ملکہ بلقیس کا پایہ تخت تھا اور لڑکی اس نئی تحقیق نے فکر و نظر کے مزید گوشے واضح کئے اور نمل کے افسانوی رنگ کو زائل کر کے حقیقی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

الہمدانی - اپنی دوسری کتاب ”الاکلیل“ میں نمل خاندان کا شجرہ نسب اس طرح پیش کرتے ہیں :

### نمل خاندان کا شجرہ نسب

نملہ بن قادم بن جحور بن اسلم بن علیان بن زید بن عریب بن جشم بن حاشد بن ہمدان

(الاکلیل طبع قاہرہ۔ جلد 10/102)

اس شجرہ نسب میں نملہ بن قادم کے خاندان کو بنی حاشد سے مربوط کیا گیا ہے کہ ان ہی کے علاقے میں نمل والوں کی بستیاں اور بازار واقع تھے۔

کاش۔ سیرے ناقد محترم وسیع النظری کا ثبوت دیکر حقیقت نگاری کو شیوہ بنا لیتے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”نملہ“ کو حکامت سلیمان میں مؤنث دکھلایا گیا ہے جبکہ

### نملہ . مؤنث یا مذکر؟

ہمدانی کے شجرہ نسب میں ”قادم“ کا پینا کہہ کر مذکر بتلایا گیا ہے۔ حقیقت حال

کیا ہے؟ یہ سوال اگرچہ ”نمل“ ذات کی نفی نہیں کر پاتا تاہم سوال کی حد تک قابل جواب ضرور ہے۔ امام رازی (1210م)

لکھتے ہیں کہ۔ لان النملة منل الحمامة والشاة فی وقوعها علی الذکروا لانثی فیتیمز بینہما بعلامة نحو

قولہم حمامہ ذکر و حمامہ انثی۔

نملہ - حمامہ (PIGEON) اور ”نشاۃ“ کی طرح مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی اسکی  
مذکر و تانیث کو فعل۔ کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے مثلاً حمامہ مذکر۔ اور۔ حمامہ مؤنث یعنی  
فعل۔ قال۔ ہے تو مذکر۔ اور اگر قالت ہے تو مؤنث۔

(تفسیر فخر رازی طبع قاہرہ جلد 19/187/24 20۰۰)

اقوام نمل کی نقل مکانی

سلف میں سے قتادہ بن دعامہ (736 م) کا خیال ہے کہ اقوام نمل کا مسکن شام ہے  
۔ ان کا یہ کہنا اس زاویہ سے درست ہے کہ۔ نقل مکانی کے دستور کے مطابق یہ  
اقوام کسی ایک محدود جغرافیائی حد میں محصور نہیں رہیں لیکن قرب و جوار کے جن ممالک کی طرف منتقل ہوتی رہیں وہاں  
پہنچ کر بھی اپنی امتیازی حیثیت، عادات و خصائل کو برقرار رکھ کر اپنے ہی سابقہ علاقوں اور قبیلوں کے ناموں پر شہر اور  
بستیاں آباد کرتی رہیں یہ تمدن اور معاشرت کا ایسا اصول ہے جسے بہت کم نظر انداز کیا گیا ہے۔ ملتان سے ہندو۔ انڈیا پہنچے تو  
وہاں اپنے قدیمی تبشخص برقرار رکھنے کے لئے دہلی، جمنپار۔ نیو ملتان آباد کیا۔ بمبے اور اجمیر میں سندھی کالونیاں تعمیر ہوئیں  
اسی طرح ہندوستان سے پناہ گیروں کا زور کار یلا آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سندھ و جنوبی پنجاب کا چپہ چپہ ہندی کالونیوں میں  
تبدیل ہو گیا۔ ہر جگہ لوکل نام و آثار مٹا کر ناموس اور اجنبی نام تجویز کئے گئے۔ اس طرح پرانی تہذیبیں مٹی چلی گئیں اور نئی  
مگر لاغر تہذیبوں نے قائم مقامی شروع کر دی لیکن بااثر تغیر و تبدیلی۔ کسی بھی قوم میں حیاتِ کنہ کی تھوڑی سی بھی رمت  
اگر پائی جاتی ہے تو ہزار سال گزرنے پر بھی اسے حیاتِ نو کا سراغ مل جاتا ہے۔ اسرائیل اسکی زندہ مثال ہے۔ کہنے کا مقصد  
یہ ہے کہ اقوام نمل نے ہجرت کے اسی اصول کے مطابق اگر کسی محدود پیمانے پر جزیرۃ العرب کے دوسرے حصوں کی  
طرف نقل مکانی کر لی ہو تب بھی اسے خلاف واقعہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن سلیمان نے جس داوی النمل کو اپنی خواہشوں  
میں شامل کر لیا اس داوی میں پہنچ کر فاتحانہ عزائم کا اظہار فرمادیا تھا۔ وہ جنوب جزیرۃ العرب میں واقع تھی۔ شام والی داوی  
نہیں تھی اس وضاحت کے ساتھ ہی شام اور مصر میں آباد ہونے والی اقوام نمل کا تعارف حاضر ہے۔ مشہور مؤرخ اور علم  
الانساب کا ماہر علامہ احمد بن علی بن احمد۔ عرف۔ القلقشنیدی (1418) اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”نہایۃ الارب فی معرفۃ  
قبائل العرب“ میں لکھتے ہیں۔ النمل بطن من الصبیحین من ثعلبۃ طی من القحطانیۃ کانت مساکنہم مع  
قومہم ثعلبۃ باطواف مصر ممایلی الشام

”نمل۔ بنو قحطان کے قبیلے ثعلبہ کی شاخ صبیحین سے تعلق رکھتے ہیں یہ لوگ قحطانیوں کے  
مرکز جنوب جزیرۃ العرب (یعنی، حضر موت، عمان اور عدن) سے چل کر شام کے اس حصے میں  
آباد ہوئے تھے جو مصر کی اطراف میں واقع ہے۔“

(نہایۃ الارب طبع بغداد 1913 م حوالہ عمر رضا کمالہ۔ قبائل العرب)

نمل۔ جمع ہے نمل کی۔ جس طرح مغول جمع ہے نمل کی۔ عربی میں ”فعل“ کا وزن جمع کے لئے خاص ہے۔ یہاں ”نمل“ کو بنی قحطان کی ثعلبہ قبیلہ فیملی میں شمار کیا گیا ہے اور قحطان کے بارے میں جدید اور قدیم تاریخی نوشتے متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ جنوبی یمن میں واقع تھا۔ یہ لوگ جب قحطان سے چلے تو اپنے قدیمی عرف اور قومی پہچان ”نمل“ کے ساتھ شام سے ملحق اطراف مصر میں رہنے لگے تھے جیسا کہ معلوم ہوا اور مزید تفصیل آ رہی ہے۔

یہ قحطانیہ سرسید اور تمام مؤرخوں اور نسابوں کی تحقیق کے مطابق۔ عرب کے تمام بڑے قبائل کے مورث اعلیٰ اور بانی تھے علامہ خیر الدین زرکلی فرماتے ہیں۔ اصل العرب القحطانیة وابو بطون حمیر وکھلان والتبابعة (ملوك اليمن) واللخمین (ملوك الجبلة) والغساسنة (ملوك الشام) فی الجاهلیة۔ یعدّ اهل الانساب اول رجال الجبل الثانی من احوال العرب الثلاثة۔

عرب کی اصل اور بنیاد قحطانیوں سے چلی اور عرب کے تمام بڑے قبائل جیسے حمیر، کھلان (اور یمن کے فرماں روا) تباعہ اور حیرہ (کے شاہان، عوٹم اور) شام (کے غسانی حکمران) جو اسلام سے مدتوں پہلے حکومت کرتے رہے سبھی نسل اور وطن کے لحاظ سے قحطانی تھے بلکہ عربی انساب کے ماہرین دور ثانی (العرب العاربة) کا پہلا فرد اسے ہی ٹھہراتے ہیں۔

(الاعلام۔ زرکلی طبع دوم۔ قاہرہ جلد 30/6)

ان قبائل میں عوٹم کی بابت مؤرخ۔ ابن تغری۔ بروی (1470م) لکھتے ہیں۔ لحم قبيلة من العرب قد موا من اليمن الى بيت المقدس ونزلوا بالمكان الذي ولد فيه عيسى عليه السلام بينه وبين القدس فرسخان والعامة تسمية بيت لحم بالحاء المهملة . وصوابه بيت اللخم بالخاء المعجمة۔

عوٹم ان عربوں کا قبیلہ ہے جو یمن سے چل کر بیت المقدس سے چھ میل کے فاصلے پر ولادت مسیحؑ کے شہر۔ لحم میں آباد ہوئے۔ یہ لحم کا حرف۔ حا (H) سے نہیں خا (KH) سے ہے یعنی بیت اللخم نہیں بیت اللحم ہے۔ (زرکلی الاعلام 106/6)

ان اقتباسات سے واضح کرنا یہ مقصود ہے کہ جنوبی عرب کے بہت سے قبائل اپنے مسکن سے نکل کر عراق کی طرح شام، فلسطین، اردن بلکہ مصر میں بھی آباد ہوئے اور وہاں پہنچ کر ان تازہ واردوں نے اپنے ہی قبیلہ کے نام پر کہیں ”بیت لحم“ کا لونی قائم کی تو کہیں ”طاء النمل“ کے عنوان سے بستیاں بسائیں اور قوموں کے اسی عمل کے مطابق ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دوسرے قبائل کی دیکھا دیکھی ”نمل“ قبائل کے افراد بھی جزیرۃ العرب کے جنوب سے نکل کر شمال مغرب میں جا آباد ہوئے۔ مشہور ریسرچ سکاٹر۔ استاذ مصطفیٰ وباغ ”تاریخ بلادنا“ میں ماضی بعید کے ان آباد کاروں کے ضمن میں لکھتے ہیں:

نمل (قوم) کو مختلف ادوار میں بڑا عروج ملا ہے یہ عسقلان شہر کی فیصل کے شرقی جانب کے

قریب گاؤں ”الجوزہ“ کے جنوب مغرب میں 500 میٹر کے فاصلے پر آج بھی کباد ہے اور اسی ”الجوزہ“ کے مقام پر ان کا قبرستان بھی۔ عرب اس مقام کے تقدس کے طور اکٹھے ہو کر سالانہ ایک ”میلہ“ بھی لگاتے ہیں۔ یہ وادی نما خطہ جنوب کی طرف بہت دور تک چلا گیا ہے۔

(حوالہ ”معجم القرآن“ طبع قاہرہ جلد 2/16/1963)

اور کچھ بعید نہیں کہ ”نقل مکانی“ کے اسی قبائلی رواج کے مطابق ”نمل“ والے نہ صرف جزیرۃ العرب کے ایک حصے سے نکل کر دوسرے حصوں تک پہنچتے رہے عین ممکن ہے کہ اس پاس کے افریقی ملکوں میں بھی اپنے قبائلی اسنادِ اعلام کو لے کر منتقل ہوتے رہے ہوں مثلاً پانچ ہزار سال قبل مسیح یمن کے ”رعاة“ ہی تھے جو یمن سے نکل کر مصر (و افریقہ) میں جا آباد ہوئے اور مقامی لوگوں نے انہیں بحسوس یعنی رعاة (خانہ بدوش) کے لقب سے پکار کر احساس دلایا کہ یہ باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں بہر حال بحسوس فراعنہ نے ہزاروں سال تک فرماں روائی کی بلند وبالا ہر امارت تعمیر کئے ان اہر امارت کی تعمیر میں کعبہ آرمٹ کو بنایا کر چوکور کھڑا کیا اس طرح انہوں نے مصر کو ایک نئی تعمیری شہنشاہت سے آشنا کر کے لبد الآباد تک کے لئے زندہ جاوید بنادیا۔ ان بحسوسوں نے 5004 ق م سے 3046 ق م تک فرماں روائی کی اور تاریخ میں انہیں نقوش چھوڑے۔

مشہور ریسرچ سکاٹر علامہ چراغ علی مرحوم (1895 م) ”نمل“ کی بابت شہرہ آفاق مؤرخ احمد المقریزی (1442 م) کے حوالہ سے ہارون

## دوسرے وطن کا ایک اور ثبوت

الرشید (808) کے ذکر میں لکھتے ہیں: (حذف تفصیل)

”وہ دورہ کرتے ہوئے جب شام کی وادی نمل میں پہنچے تو وہاں کی بڑھیا (رئیسہ) نے اسکی دعوت کی خلیفہ نے اس خیال سے کہ طاء النمل (قبیلہ نمل کا یہ) ایک چھوٹا سا گاؤں ہے دعوت قبول کرنے میں پہلے غافل کیا آخر قبول کر لی۔ اور رخصت کے وقت قبیلہ نمل کی رئیسہ نے اشرافیوں بھری کئی تھیلیاں نذر کیں جسپر خلیفہ بڑا ہی متعجب ہوا کہ اتنا سونا کہاں سے آیا؟ بڑھیا رئیسہ نے جواب دیا کہ ہم ریت سے سونا نکالنے کا کام کرتے ہیں اور اس وادی میں ایسی ریت کثرت سے پائی جاتی ہے لہذا ہمارے ہاں سونا بہت ہے۔“

(تہذیب الاخلاق جلد 3/142 حاشیہ نمبر احوالہ اقوام المسالک صفحہ 37۔ مصنفہ خیر الدین تونسہ 1890 م)

حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ جب سلیمان کا یمن کی وادی نمل پر گذر ہوا تو اس وقت قوم ”نمل“ پر ایک ملانی، حکمران تھی اور جب اٹھارہ سو سال بعد شام کی وادی نمل پر عباسی خلیفہ کا گذر ہوا تو تب بھی یمنی قبیلہ کے تارک وطن ”طاء النمل“ کی ناظم الامور ایک نملہ ہی تھی۔

مذکورہ بالا مستند حوالے۔ اقوام نمل کے وطن، قلعوں، دروازوں۔ کالونیوں اور بیسویں صدی۔۔۔ تک کی



خافتا ہوں۔ گورستانوں اور رہسکنوں کی واضح نشاندہیوں کے باوصف بھی نمل کو چوٹیوں ہی میں شمار کیا جائے گا؟ کیا یہ انسان کے ترقی یافتہ شعور سے مذاق نہیں ہے؟ کیا یمن کی واوی نمل کی ہشیار ملکہ نے جب سلیمانی مزاحمت سے پہلے ہی شریفانہ اقدار کا مظاہرہ کیا اور سلیمان اس کی فہم و فراست پر مسکرائے اور اس لاشعوری قتل و غارت اور تخریب سے رک جانے پر اللہ کا شکر چلائے کہ بے قصور جانیں تلف ہونے سے بچ گئیں۔ (مفہوم از نمل، 19) تو کیا یہ شکر جا آوری اسلئے تھی کہ چوٹیوں نے مقابلہ نہ کر کے جان بھی چائی اور سلیمانی افواج کی تلواریں بھی حرکت نہ کر سکیں؟ اے کاش اس طرح کی سوچ ہمارے ذہنوں پر سوار نہ ہوتی۔

دنیا میں کوئی وہ حقیقت ہے جس میں شکوک و شبہات نہیں ڈالے گئے اور کوئی ساوہ سچ ہے شبہات اور وسوسے جسپر بے یقینی و بد اعتمادی کا اظہار نہیں کیا گیا؟ لیکن اسکے باوصف ہوتا یہی رہا کہ حقیقتیں جب کبھی اپنی فطری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں دوسرے اندازوں کی کج روی اور کج نمادی ناکامی و نامرادی کا روپ دھارنے لگیں۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں مرض گیا تھا کہ جو نئی میرا مضمون ”واوی نمل کی ہشیار ملکہ“ صفحہ قرطاس پر مطبع ہوا مقدس جبینوں پر شکنیں پڑنا شروع ہو گئیں اور انہوں نے حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے دوسرے اندازی کا سہارا لینا مناسب سمجھا۔ (ملاحظہ ہو چٹان لاہور۔ 58-12-22)

یہ عمل اگرچہ انکی افتاد و مزاج کے عین مطابق تھا لیکن اس سے میرے جیسے جو یائے حقیقت کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ 12/1/59 کے چٹان میں میں نے دلی اضطراب کو سرکریں پر پھیلا دیا۔ اب معترض کے عقیدے کو ”وسوسے“ اور اپنی ”صفائی“ کو ”قول فیصل“ کے عنوان سے ظاہر کر کے۔ متلاشیان حقیقت سے انصاف کا خواہاں رہوں گا۔

ناقد محترم نے سورہ ”نمل“ کے موضوع و دیگر ہمسایہ سورتوں کے ساتھ ربط اور مناسبت پر زور دیتے ہوئے یہ تاثر دیا ہے کہ

نمبر 1۔ نمل۔ کا موضوع ایمان بالآخرت ہے اور نمبر 2۔ کہ فرعون اور حضرت موسیٰ کا واقعہ دیگر مقامات پر بھی بیان ہوا ہے مگر یہاں ذکر ہونے سے اس اصول کی تصدیق ہوتی ہے کہ نمل۔ اور ان واقعات میں کوئی ربط ہے لہذا اتمام تفصیل کو نظر انداز کر کے صرف ”اصول ربط“ یا سورتوں کی مناسبت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

(خلاصہ از چٹان 22، نمبر 58 صفحہ 99 کالم نمبر 1)

حضرت نقاد نے قرآن محکم کو ایک انسانی تصنیف سمجھ رکھا ہے جس میں موضوع اور ساہبہ و لاحقہ سے مناسبت کو دیکھا جاتا ہے جبکہ وحی قرآن میں مضامین کی ”صف بندی“ اور ضبط و ربط کچھ ضروری نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ مالی۔ ہر چیز کو قرینے سے سجاتا مختلف کیاریوں میں گلوں کے تختے بٹھاتا اور منفرد ترتیب سے چمن کی ہر چیز میں خوبصورتی کا اضافہ کرتا ہے کہ انسان فطرتاً حسن پرست ہے، بناوٹ و سجاوٹ کے اسکے اپنے انداز ہیں لیکن

## قول فیصل

قدرت کے ”مالی“ نے جس ترتیب و تسمیق سے اشیاء کو سینچا اور ان کے حسن کو نکھارا ہے وہ ہمارے پیمانے اور معیار سے کم ہی ربط و مناسبت رکھتی ہیں اور کوساروں پر جائیں اور رنگ قدرت کا تماشہ کریں وہاں ہر شے بے ربط و بے قرینہ ملے گی مگر سراپا حسن ہوگی ہر گل دوسرے سے بہ ظاہر بغل گیر مگر ”تضع“ کی بغل گیری سے بے نیاز۔ ہر چیز میں باہمی معافقہ ہوگا مگر بناوٹ کی دوستی سے پاک و صاف۔ پریموں کی گنگنائی اور پیچ و تاب کھاتی واویلوں پر نظر ڈالئے کہ یہ ہمارے جیومیٹری حساب سے بنی ہوئی لہروں کی طرح سیدھی اور پھنے میں کسی طرح کی طغیانی اور سرکشئی سے آلودہ نہ ہوگی اسی طرح یہ قرآن فاطر ازل کا نازل کردہ اور عرب کی ”بیس مصنوعی“ فطرت کے مطابق تمام انسانی تکلفات و معیارات سے بے نیاز ہے کیونکہ کسی انسانی تراوش فکر کا چرہ نہیں ہے۔ یہ حضرت انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں مضمون کی بناوٹ۔ یہ تسلسل اور باب بندی کو ملحوظ رکھ کر ہم عصر دانشوروں، عقلا اور اصحاب فکر کو متوجہ کرے۔ غرض کہ حقیقتوں کا سراغ لگانے سے نہ تو ایمان بالآخرت پر زد پڑتی ہے اور نہ ہی قرآن کا منفرد انداز بیان مجروح ہو جاتا ہے بغرض محال ”اصول ربط“ کو تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی نوع انسانی کو قرآن، فہمی میں نئی مشکلات اور مفہوم کی ہم آہنگی کے نئے تکلفات سے دوچار کرنا پڑے گا جبکہ قرآن محکم کے تیس سالہ متفرق مضامین کو ایک ہی موضوع کی لڑی میں پرونا یا کسی ایک مضمون سے مربوط کرنا اسکی فطری رعنائیوں کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔ اور کیا تعجب ہے کہ ہمارے ذہن کو جن خارجی اثرات نے متاثر کر رکھا ہے ان ہی کے مطابق آیات الہی میں ربط و مناسبت تلاش کرتے کرتے اپنے محور اور مقصد سے دور اور انکی طبعی و فطری رہنمائی سے دور تر ہوتے چلے جائیں امام السند آزاد مدظلہ (\*) نے اس بنیادی الجھاؤ کا بروقت اور اک گیا اور فرمایا

قرآن کے مختلف حصوں اور آیتوں کے مناسبات اور روابط کے سارے الجھاؤ صرف اسلئے ہیں کہ فطرت سے بعد ہو گیا ہے اور ”وضعیت“ ہمارے اندر بسی ہوئی ہے ہم چاہتے ہیں قرآن کو بھی ایک ایسی مرتب کتاب کی شکل میں دیکھیں جیسی کتابیں ہم مرتب کرتے ہیں۔

(ترجمان القرآن طبع دوم جلد 1/11/17:19)

یہ درست ہے کہ۔ کارلائل (1805م) نے جو اسلامی تعلیمات کا مداح ہے ربط آیات کے فقدان پر اعتراض کیا ہے لیکن انہوں نے فطرت عرب کا مطالعہ نہیں فرمایا جو مطلوبہ ربط اور مناسبتوں سے بہت کم آگاہ تھے حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی (1762م) فرماتے ہیں۔۔۔۔ حکمت دریں باب موافقت مبعوث الیہم است در لسان واسلوب بیان۔۔۔۔

تأزول قرآن در بیان عرب بیچ کتابے نہ بود۔۔۔۔ نہ کتاب الہی نہ مؤلف بشر۔ و ترتیبی کہ حالا مصنفین اختراع نموده اند عرب آنرا نمے دانستند۔ اگر این را باور نمے داری۔ قصائد شعرائے مخضرمین را تأمل کن۔ و رسائل آنحضرت و مکاتیب عمرؓ را برخوان۔ تا این معنی روشن شود۔ پس اگر خلاف طور ایشان گفته شود بحیرت در مانند۔ و چیزے نا

آشنا بگوش ایشان رسد۔ وفہم ایشان مشوش سازد۔ ونیز مقصود نہ مجرد افادہ است بلکہ افادہ مع التکرار والاستحضار۔ واین معنی در غیر مرتب اقوال و اتم ہست۔

تفسیر کے باب میں حکیمانہ طرزِ فہمائش یہ ہے کہ ”وحی“ جن کی زبان میں ”گویا“ ہوتی ہے۔ زبان اور اسلوبِ کلام میں ان ہی کے طور و طریقوں کو اپنایا جائے کہ نزولِ قرآن تک ان کے پاس نہ کوئی الہامی کتاب رہتی نہ انسانی لہذا ربط و مناسبت کے طریقے جو بعد والوں نے اختراع کئے وہ اس سے نا آشنا تھے۔ اگر میری اس بات کا یقین نہ آئے تو جاہلیت اور اسلام کے شاعروں کے قصائد۔ نبی اکرم ﷺ کے مکاتیب اور فاروقِ اعظمؓ کے خطوط کا مطالعہ کرو۔ جن سے یہ حقیقت کھل جائے گی کہ اگر ان کے ”بے ربط“ لسانی اسلوب کو ملحوظ رکھا جاتا تو جو نہی کوئی ”غیر مربوط“ چیز ان کی سماعت سے ٹکراتی تو درطہ حیرت میں ڈوب نہ جاتے۔ ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ ”بلاغ“ کا مقصد صرف افادہ ہی نہیں تکرار اور ذہنِ رشتین کرانا بھی ہے اور یہ مقصد زیادہ توانا اور زیادہ مکمل صورت میں صرف ”غیر مربوط“ کلام ہی سے حاصل ہو سکے گا۔

(فوز الکبیر بحوالہ ”تاریخ القرآن“ علامہ اسلم جیراچوریؒ طبع ۱۳۴۱ھ ص ۴۱-۴۲ صفحہ 41-42)

ولی اللہ کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جس ربط و ترتیب کے شیدائی ہیں عرب اسکو جانتے ہی نہیں تھے اور یہ مصلحت اسی امر کی تقاضی ہے کہ جن لوگوں کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے وہ جس طرح کلام کرتے ہوں اسی اسلوب پر قرآن بھی ہو ورنہ ان کی سمجھ میں نہ آتا۔ ادھر کلام کی رفعت اور بلند سی کا انحصار ایجاز و اختصار پر ہے جبکہ قرآن مجید اس قدر موجز اور مختصر ہے کہ کسی کلام کا اسکے برابر موجز و مختصر ہونا ممکن نہیں اور یہ کلام میں چونکہ زائد باتیں نہیں ہو تیں ضروری رموز اور کنائے ہوتے ہیں لہذا اسکا ربط و تناسب آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ناظرینِ کرام۔ ربطِ آیت کوئی طے شدہ مسئلہ نہیں ہے یہ مسئلہ سلف میں بھی اختلافی رہا ہے۔ ابنِ العربیؒ (1146) اور امامِ رازی (1210 م) نے خود تو ربط و تسلسل سے لطف اٹھانے کی کوشش کی ہے لیکن دیگر اہل علم کو شریکِ لطف نہیں گردانا۔ اس طرح سب سے پہلے اس موضوع پر ابو الفضل شرف الدین (1256 م) نے لکھ کر آیات کے باہمی ربط کے تکلفات کو داخلِ تفسیر کیا پھر یکے بعد دیگرے شیخ علی المہائمی (1421 م) برہان الدین بقاعی (1480 م) اور جلال الدین سیوطی (1505 م) نے اسی خج کو دہرایا۔

یہ درست ہے کہ ہم قرآن کیلئے ”تصریفِ آیات“ کا اصول قرآن نے خود ہی مقرر کیا ہے کہ اس طرح ہم موضوعِ آیات کو سامنے رکھ کر بات کو زیادہ قرینِ فہم بنایا جائے لیکن تصریفِ آیات اور ”ربطِ آیات“ کے مابین۔ بعد المعرفین ہے چنانچہ اسکے لئے بھی نظر زیادہ تر الفاظ کے مزاج اور ”غریب القرآن“ کی تحصیل پر ہوگی کہ یہی اصول ہمہ تکلفات سے مبرا اور سادگی و سلاست (DOCILITY) کے ہم آہنگ ہے۔

دوسرا وسوسہ۔ غیرتِ خداوندی فرمایا جاتا ہے کہ۔۔۔۔۔ حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں انعاماتِ الہی کو

صیغہ مجہول میں لو اگیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف صریح نسبت کرنے کی بجائے یوں کہا گیا ہے کہ ”ہم کو سکھائی گئی۔۔۔۔۔ ہم کو دیئے گئے“ وغیرہ اور حضرت سلیمان کا یہ انداز اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا اسلئے ان کو متنبہ کرنے کا انتظام فرمایا گیا اور اسکے لئے دو واقعات خصوصی طور پر ظاہر ہوئے۔ ایک چوٹی کی گفتگو اور ہد ہد کی اطلاع۔

(چٹان 22/12/58 صفحہ 9 کالم نمبر 3)

## قول فیصل

میرے نزدیک اپنے ہی ذہنی پیمانوں سے ”غیرت خدا“ کا تعین کرنا۔ قابل تسلیم نہیں ہے کہ لوگوں کی مخصوص ذہنی ”افتاد“ ہی کو حقائق معلوم کرنے کا اگر ذریعہ بنا دیا گیا تو دنیا میں جب تک کوئی ”ذہنی تقریب“ موجود نہ ہو کوئی حقیقت۔ حقیقت کے بطور تسلیم ہی نہ کی جاسکے گی پھر ایسی حقیقت فلاسفہ اور متکلمین کی ”فکری کاوشوں“ کی رہن منت ہو یا وحی الہام خداوندی کی ترجمان۔۔۔۔۔ بنائیں میرے نزدیک سرے سے یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ اللہ سبحانہ نے غیرت کھا کر سلیمان کے غرور کو توڑنے اور ان کے ناپسندیدہ انداز۔ کورد کرنے کیلئے پرندوں اور چوٹیوں جیسی حقیر مخلوق کو زبان عطا کی تاکہ وہ اپنے مقام کا احساس کر سکیں؟ حاملان فکر مودودی کو چاہئے کہ ایسی ذہنی افتاد سے الگ ہو کر حقائق کا جائزہ لیں اور منہ سے ایسی کوئی بات نہ کریں جس سے ”توہین“ پیغمبر کی ہوا آتی ہو۔ اس تلخ نوائی کے ساتھ ہی عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب دوصی مہر مندوی نے اپنے پیرومر شدید مودودی کی حمایت میں جن رشحات علم کو وقف کیا ہے انکی علمی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے وہ سمجھے ہیں کہ ہدھد۔۔۔۔۔ منطق الطیر۔۔۔۔۔ اور دابة الارض۔ کے حوالے سے ”غیرت خدا“ اور ”درماندگی“ سلیمان کا اپنے پیمانوں سے تعین کر کے معاملہ کو سہل بنا گئے ہیں لیکن معاملہ اتنا سہل نہیں ہے جس طرح انہوں نے سمجھ رکھا ہے۔ اس پر ہم نے اشارہ کیا کہ انعامات الہی کو ”مجہول“ کے صیغے سے ذکر کرنے کو انہوں نے سلیمان کے ”غرور“ سے تعبیر فرما کر اپنی علمی سطح کا مزید پتہ دے دیا کہ وہ کتنے کوتاہ نظر ہیں اور ان کو اتنا بھی پتہ نہیں چل۔ گا کہ حضرت سلیمان نے پہلے ہی انعامات الہی کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف کر دی تھی اعادے اور تکرار کی ضرورت نہیں تھی کہ۔ کام کا اعجاز نہ تو اسکا متحمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی غیر ضروری تکرار اسکی خوبیوں میں اضافہ کر سکتی ہے۔ کیہ زیر بحث کا ماسبق موجود ہے ملاحظہ کر کے۔ تشفی کی جاسکتی ہے ارشاد ہے۔ ولقد آتینا داود وسليمان علما وقالوا الحمد لله الذي فضلنا على كثير من عباده المؤمنين ه

اور ہم نے داؤد و سلیمان کو علم (دسائینس) عطا کیا (جسپر) انہوں نے زبان تشکر بن کر کہا کہ۔ اللہ کا اکھ لاکھ شکر ہے جنے ہمیں علم و دانش، حکمت، سائنس اور نبوت سے سرفراز (کر کے) بہت سے مؤمن بندوں پر فضیلت عطا کی۔

(نمل، 15)

اور اگر ”نسبت“ نہ بھی کی ہوتی تب بھی صیغہ مجہول سے انعامات کا تذکرہ نہ تو کبر و نخوت کا غماز ہے اور نہ ہی کبھی اسپر عتاب نازل ہوا۔ اور غرور شکنی کیلئے حقیر مخلوق کو سامنے لایا گیا؟ خود سید البشر ﷺ کے ارشادات مقدسہ میں بھی مجہول کا انداز اختیار کیا گیا ہے مثلاً

۔ اوتیت جوامح الکلم

(جامع کلمات ادا کرنے کا وصف دیا گیا ہوں)

۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

(اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی تکمیل اور اتمام کیلئے بھیجا گیا ہوں)

۔ نصرت بالرعب مسيرة شهر

(وہ رعب عطا کیا گیا ہوں کہ دشمن ایک ماہ کی مسافت پر میرا نام سکر

کانپ اٹھے)

۔ جعلت لی الارض کلها طهورا

(میرے لئے زمین کا چپہ چپہ قابلِ عبادت اور پاک بنایا گیا ہے)

یہ۔ اور اس قسم کی پسیوں احادیث موجود ہیں جن میں صیغہ ”جہول“ کے ذریعہ نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے پس اگر

ایسا انداز تشکر ناپسندیدہ اور آدابِ نیاز مندی۔ قابلِ عتاب ہو تا تو یہاں بھی اظہار کیا جاتا۔

تیسرا وسوسہ۔ حقیر پنے کا قاعدہ

ناقد محترم نے ”نملہ“ کے ملکہ نہ ہونے کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ نملہ۔

کی ”تنوین“ ( ) اس کے حقیر ہونے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جسکے

معنی ایک معمولی چوٹی کے کئے جاسکتے ہیں۔ (چٹان 22، سہر 58 صفحہ 10 کا لم نمبر 2)

مصنف اگر عربی زبان کی ”لطفاتوں“ سے بہرہ ور ہوتے اور کسی طرح علمی مذاق کا احساس کر سکتے تو

قول فیصل

انہیں معلوم ہو جاتا کہ ”نملہ“ اگر تنوین کے باعث حقیر تھی تو دیکھنا یہ تھا کہ ”النمل“ پر الف و

لام۔ تعریف کا لگا کر واضح کیا گیا ہے کہ اس نے جن کو خطاب کیا تھا وہ حقیر نہیں تھے۔ کیا حقیر بھی کبھی مردِ بالا کو خطاب

کر سکتی ہے؟ کیا تھا اس قرینے سے ”حقیر پنے“ کا ازالہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہ علاوہ اسکے کہ وحی الہی نے ”قالت نملہ“ کہہ کر

”نملہ“ کی تنکیز کو خود ہی زائل کر دیا ہے۔ تو کیا دنیا کا ایسا کوئی بھی قانون اور لسانیات کا ایسا کوئی بھی ضابطہ ہے جس میں شرف و

کرامت کو رعایا (اور کمتر) کے لئے اور ”دناست“ (MENNESS, LOWNESS) اور حقیر پنے کو فرماں (اور برتر)

کیلئے خاص کر دیا گیا ہو؟ جواب اگر نفی میں ہے تو کیا وحی الہی پر یہ ہمت نہیں ہے کہ اس نے لسانیات کے ایک اہم ضابطے

کو توڑ ڈالا؟ پھر یہ سوال اپنی جگہ پر باقی ہے کہ ”نملہ“ اگر ”ملکہ“ نہیں تھی تو پھر اسے نملہ ہی کہنے دیجئے ”چوٹی“ ترجمہ

کرنے کیلئے کون سے قرآنی شواہد موجود ہیں؟ الفاظ کے کلیساؤں میں گھنٹیاں جانے سے ”شواہد“ کی تخلیق تو نہیں ہوتی

۔۔۔ رہا یہ کہ تنوین لازمی حد تک ہی ”تحقیر“ (CONTEMPT) اور تصغیر (DIMINUTION) کیلئے آتی ہے تو یہ

بھی تدبیر کے ”فقدان“ کی علامت اور علمی شواہد سے انحراف کا بہانہ ہے کیونکہ یہ تنوین ( ) بسا اوقات ”تعظیم“ اور

”تفخیم“ (MAGNIFICENCE) کیلئے بھی آتی ہے تاہم اگر تنوین ( ) ہی معمولی پنے کا قاعدہ ہے تو امکا اطلاق نمی

پر بھی ہوا ہے (نقرہ، 46) رسول پر بھی ہوا ہے (حج، 52)۔ قرآن پر ہوا ہے (یونس، 61۔ رعد، 31۔ اسراء، 100) اور محمدؐ

پر بھی تنوین ہے ہاں کان محمد ابا احد (احزاب، 4، محمد، 2) اور محمدؐ بہ حیثیت رسول پر بھی تنوین و ما محمد

الارسل (عمران، 144) تو کیا رسول۔ نبی۔ قرآن۔ محمد اور۔ محمد رسول۔ بھی۔ معمولی اور حقیر تھے العیاذ باللہ۔ حقیقت یہ

ہے کہ جب کسی ذات کا تعین اور تشخیص کرنا مقصود نہ ہو یا نام کا اخفا مطلوب ہو تو وہاں پر ہی تنوین کا استعمال کیا جاتا ہے ہاں



اس صورت میں کہ حکیم خود وضاحت کرے یا قرینہ موجود ہو کہ ”حکیم کا منشاء“ ”تحقیر“ ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :

**چوتھا وسوسہ . انداز خطاب**

”ایک فرد یا افراد کا ذکر کرنے کیلئے ”یا“ نسبتی کا استعمال ضروری ہے یا پھر۔ معشر (گروہ) جیسے الفاظ کا استعمال قوم کے ساتھ کیا جائے مثلاً قریش کے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے یا تو۔ یوں کہا جائے گا۔ ایہا القریشیون۔ یا کہا جائے گا۔ یا معشر قریش

(چٹان 22، سبر 58 صفحہ 10 کا لم 2)

فاضل محترم۔ اس قاعدے کے حوالے سے کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حذل۔ اگر کسی قوم کا نام ہے تو یہ الفاظ یوں

ہونے چاہئیں قالت نملیة . یا ایہا النملیون

فاضل محترم کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ ”نملہ“ مونث بھی ہے اور مذکر بھی۔ حضرت امام اعظم

**قول فیصل**

ابو حنیفہ (760 م) سے جب دریافت کیا گیا کہ ”نملہ“ کیا ہے؟ فرمایا قرآن میں مونث ہے جب

(کشاف طبع قاہرہ جلد 3/280)

وضاحت چاہی تو فرمایا اس کا فعل ”قالت“ ہے۔

اور جو لفظ اپنی ساخت میں مونث بھی ہے اور مذکر بھی۔ تو اسے افعال کے ذریعہ ہی متعین ذات میں محدود

کیا جاسکے گا۔ یائے نسبتی کے ذریعہ نہیں۔ نیز جب کسی ”مفرد“ میں ”قوم“ کا مفہوم بھی دیا گیا ہو تو وہاں۔ معشر۔ آل۔

بنی۔ یا واو کی جمع سے بننے والے الفاظ سے مخاطب کرنا ضروری نہیں ہے۔ خاص کر۔ نظم میں تو ایسا بالکل ہی ناممکن ہے جیسے

”قریش“ کا لفظ ہے اسے ”معشر قریش“ سے بھی خطاب کر سکتے ہیں اور ”ایہا القریش“ کے لفظ سے بھی لیکن ”ایہا

القریشیون“ کہنا فصاحت اور ادبیاتِ جدیدہ کے خلاف ہے کی وجہ ہے کہ علامہ فرید وجدی (1954 م) جو کہ اہل زبان تھے

تفسیر کے بطور لکھتے ہیں۔ یا معشر النمل ادخلوا بیوتکم۔ (المصنف المصغر طبع ششم قاہرہ صفحہ 501 سطر 18)

یہاں۔ النمل۔ کو النملیون بنا کر لطافتِ زبان کا خون گیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تنقید نگار نے گراں گزرا کا ذائقہ

چکھائی نہیں یا پھر ندوہ اور اچھرہ کے فارغ التحصیل صاحبانِ تحریر کا مبلغِ علم ہی یہی کچھ ہوگا۔ اسی طرح قرآن حکیم میں

بہت سی اقوام کا ذکر ملتا ہے مثلاً ثمود (ہود، 68)۔ عاد (ہود، 59)۔ اور یاجوج ماجوج (کعب، 25) اور قرآن محکم کے علاوہ

دیگر کتابوں میں تنوخ و طسم (کامل مبرد) ہیکسوس (طبری 98/1) اور سلح، ضغیم اور اصبح۔ تو مومن کا ذکر ملتا ہے لیکن کسی نے

بھی یائے نسبتی۔ کے ذریعہ ان کی تائید پر زور نہیں دیا کہ اسکے بغیر ہی مطلوبہ وضاحت پائی جاتی رہتی اور پھر یہ کہاں سے

لازم آیا کہ جمع۔ لامحالہ۔ واوون کی شکل میں ہی خطاب کی صورت اختیار کر سکتا ہے؟ مثلاً ہکسوس، طسم، یاجوج،

تنوح۔ اور عاد۔ کے آخر میں واو و نون۔ لگا کر خطاب میں اس طرح ڈھال لیا جائے۔ ایہا الہکسوسون۔

یامعشر الیاجوجین۔ ایہا العادیون۔ یامعشر التئوخیین وغیرہ۔ کیونکہ ان اقوام کی جمع ہونا اور اسی غرض کیلئے استعمال

کرنا ادبیاتِ عرب اور فصاحتِ کلام کے تقاضوں کے بالکل منافی ہے۔ یہ اسماء شکل میں اگرچہ مفرد ہیں لیکن اطلاق کے لحاظ

سے جمع بھی ہیں جیسے ”انسان“ کا لفظ ہے کہ یہ ”ایک“ پر بھی بولا جاتا ہے اور ”زیادہ“ پر بھی۔ آپ ”ایہا الانسان“ تو کہہ سکتے ہیں ”ایہا الانسانون“ نہیں کہہ سکتے اور اسی پر قیاس کیجئے تمام ان اسماء و مفردات کو جو سگلا۔ تو ”مفرد“ ہیں مگر اطلاق۔ مفرد بھی ہیں اور جمع بھی۔ آپ ہکسوس، تنوخ، یاجوج اور عاد کو۔ ایہا الہکسوس۔ یمعشر تنوخ، یمعشر عاد۔ ایہا العاد ہی کہیں کہ روح و فصاحت بھی اسی کی متقاضی ہے اور اصول ”سماع“ بھی اسی کا خواہاں۔ عرب کا لفظ جو کہ ایک اور ایک سے زیادہ کیلئے استعمال ہوتا ہے اسے ”قواعد مصطلحہ“ کی رو سے ”ایہا العرب“ اور ”یمعشر العرب“ کہنا ہی زیادہ صحیح ہے۔ ایہا العربیون۔ اور ”یمعشر العربیین“ کہنے سے آپ کی ”عجمی“ نفسیات اور پس منظر کا پتہ چل جائے گا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نمل۔ کی واونون۔ کے ذریعے ”النملیون“ جمع بنانا عرب کے وسیع تر استعمالات کے بالکل منافی ہے لہذا یہ وسوسہ بھی ”قل اعوذ برب الناس“ کے سامنے تاب نہیں لاسکتا اور کچھ ”اور“ سوچئے۔

**پانچواں وسوسہ نمل کی تاریخی شخصیت** کہا گیا ہے کہ ”نملہ“ اگر تاریخی شخصیت ہوتی اور نمل۔ کا واقعاتی وجود ہوتا تو ان کے نام صیغہ راز میں نہ رہتے اور چونکہ ان کے نام آج تک صیغہ راز میں ہیں لہذا قریب قیاس بھی ہے کہ یہ انسانی مخلوق میں سے نہیں تھی۔

**قول فیصل** یہ ایک بانجھ مفروضہ ہے جو کسی حقیقت کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ہمارے ناقدین جن سہاروں پر چلنا چاہتے ہیں وہ کمزور اور غلطیوں سے بھرپور ہیں قرآن پاک کے اپنے اسالیب ہیں وہ ان کیلئے کسی خارجی شہادتوں اور تصدیقات کا محتاج نہیں ہے وہ جب اقوام کے سربراہوں کا ذکر کرتا ہے تو نام کی بہ نسبت صرف قومیت یا لقب سے یاد کرتا ہے اور نام نہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایسے عجمی نام جنہیں پہلے سے ”عربایا“ نہیں گیا قرآن میں ذکر کر دینے سے تلاوت میں دشواری کا موجب بن سکتے تھے مثلاً یوسف علیہ السلام کے ہمعصر مصری سربراہ کا نام ”اپوفس“ (1898 ق م) ہے اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے منہ بولے باپ کا نام رعمیس دوم (1292 ق م) اور موسیٰ علیہ السلام کے متحارب کا نام مضناح (1224 ق م) اور مصر کے بڑے اہرام کے بانی کا نام خضرع بن سہرع (2932 ق م) تھا اب اگر ان تمام ناموں کو عربی کر قرآن میں ذکر کر دیا جاتا تو لہجہ کی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی اور بہت سے نام کچھ کے کچھ بن جاتے۔ لہذا ان سب کو نام لئے بغیر صرف فرعون (PHARAOH) کے لقب سے یاد کیا کہ مقصد عبرت دلانا اور زندگی کو ایسی نینچ پر چلانا تھا جو فوز و فلاح کی ضامن ہو۔ یا پھر ایسے القاب تجویز کر دیئے گئے جو اصل کے مقابل زیادہ رسل اور زبان زد ہو سکتے تھے مثلاً فرعون خضرع کیلئے۔ ذی الاوتاد۔ (۱) اور یاجوج ماجوج کے فاتح سائرس (595 ق م) کیلئے ”ذی القرنین“ کا لقب تجویز کیا گیا۔ (ترجمان القرآن امام السند جلد 2/402-401)۔ اسی طرح ذوالکفل۔ اور ذوالنون کو قیاس کیجئے۔ مقصد یہ کہ ان تمام ناموں اور ہسمیات کے ”اخفاء“ سے یہ لازم نہیں آتا کہ انکی تاریخی حقیقت ہی نہیں تھی؟ یہاں تو پھر بھی ”نمل“ کہہ کر ”قومیت“ کا اشارہ کر دیا ہے لیکن قرآن پاک میں تو بسا اوقات اتنی وضاحت بھی ضروری نہیں

سمجھی گئی اور فرمایا گیا کہ ”اسکی طرح“ (بقرہ، 259)۔ حالانکہ یہ ”اس کی طرح“ ماضی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پیغمبر کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ ”اسکی طرح“ کے مشار الیہ (TO POINT AT) معلوم ہیں کیونکہ اشارہ بمالوقات وضاحت سے زیادہ بلیغ ہوتا اور ”مکرہ“ ”کبھی“ ”معرفہ“ سے دہری ”اقادیت“ کا حامل بن جاتا ہے۔

یہ تھے وہ شہمات لور دوسو سے جن کی اساس پر کہا جاتا تھا کہ ”نملہ“ لور ”نعل“ کے واقعات بے بنیاد لور فرضی ہیں۔

میرا موضوع اگرچہ واوی النمل سے منسوب دیومالا کی کتھا کی حقیقت معلوم کرنا تھا لیکن ناقد محترم منطق الطیر نے ”منطق الطیر - ہدھد - اور دابة الارض“ کا ذکر چھیڑ کر موضوع کو پھیلا دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو چٹان 22-12-58) لور میں سمجھتا ہوں کہ منطق الطیر وغیرہ کس طرح انکی مجبوری بن گئے؟ لیکن کاش وہ اگر اپنی حدود میں رہتے۔ تجاوز نہ فرماتے تو انکی علمی ساکھ مجرد ہونے سے بچ جاتی لیکن لب کہ وہ خود ہی اپنا بھرم نہ رکھ سکے تو میں کہاں تک ان کی کج ادائیگوں پر پردہ ڈالتا پھروں گا؟۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ موصوف نے دابة الارض، منطق الطیر اور ہدھد کا ذکر اسلئے چھیڑا ہے کہ وہ کلام اور منطق کا صدور بلکہ اطلاق غیر انسانی مخلوق پر ثابت کر دکھلائیں اور نتیجہ میں کہہ سکیں کہ جب یہ بے زبان مخلوق ”گویا“ ہو سکتی ہے تو نملہ۔ حیثیت چیونٹی کیوں نہیں ہو سکتی؟۔ یعنی ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق سلیمانؑ اس معنی میں جانوروں کی بولیاں جانتے تھے کہ آپ ہر جانور سے اسکی زبان میں بات کرنے پر قادر بنادے گئے وہ جب کوڑوں سے بات کرتے تو ”کاں کاں“ کرتے اور جب چڑیوں سے مخاطب ہوتے ”چوں چوں“ کرتے اور اسی طرح لور..... اور..... العیاذ باللہ۔ لیکن میرے نزدیک یہ مفہوم نہ صرف ایک نبی کی شان کے منافی ہے ان تصریحات کے بھی خلاف ہے جو اسی کیمپ کے اعتدال پسند علماء نے پیش کی ہیں مثلاً۔ مخدومی امام الحدیث ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسری (1948م) نے یہ توجیہ بیان فرمائی ہے کہ

سلیمانؑ کو ہر جانور کی خواہش کا الہام اور القاء ہو جاتا تھا یعنی اللہ سبحانہ الہام کے ذریعہ بتادیتے کہ فلاں جانور کا یہ منشاء ہے۔ (تفسیر ثنائی (اردو) طبع امرتسر جلد 6/30/23)

اس توجیہ سے اس عقیدے کی جڑ و بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے کہ سلیمانؑ جانوروں کی بولیاں بے ساختہ سمجھ اور بول لیتے تھے۔ اسی طرح امام بیضاوی (1260م) کی وضاحت یہ ہے کہ

آپ ہر جانور کی آواز سے قیاس، انکل (حدس) اور اندازے سے جان جاتے تھے کہ اسکی خواہش کیا ہے؟ مثلاً بلبل کے چھمانے لور قص کرنے کو فارغ البالی (خوشی) لور میر ہو کر کھانے پر قیاس کرتے لور فاختہ کے غٹ غوں سے اسکے۔ غمگین اور خالی پیٹ ہونے کا اندازہ فرماتے تھے۔

(تفسیر بیضاوی طبع مصلطی حلبی قاہرہ 1939م جلد 2/137/23 تا 26)

اعتدال پسندوں کے یہ ہر دو اقتباسات جیسے بھی ہیں رو کر دینے کی ضرورت نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ آپ حیوانات غیر ناطقہ (DUMB.MUTE) کی خواہشات کا اندازے اور قیاس ہی سے تعین کرتے تھے۔ یا ان ہی کی زبان میں باتیں بھی کرتے تھے؟ کیونکہ ہدھد۔ کے مکالمے کو اندازے اور قیاس سے کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی کہ وہ خود ہی اسپر دلیل فراہم کر رہا ہے کہ وہ ”انسان“ تھا اگر ”پرندہ“ ہوتا تو وہ شریعت اور انسانی آداب و احکام کا مکلف ہونے کے باعث اس دھمکی اور تهدید کا مستحق نہ ٹھہرتا جو سلیمان کی زبان سے نکل چکی تھی (جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا)۔ اور جہاں تک بیضاوی کی تصریح کا تعلق ہے تو اسے مسترد کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ۔ جانوروں کی خواہشات کو انکل سے معلوم کرنا حساس اور رحمدل انسانوں کی فطرت میں شامل ہے وہ جانوروں کی طبعی حرکات اور آواز کے سوز و گداز یا ”کرنٹگی“ اور گلوگیر ہونے سے ان کے دکھ درد یا خوشی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ کتے کے دم ہلانے سے خوشامد۔ رات کے پچھلے پہر کر اپنے سے کسی تکلیف اور الم میں مبتلا ہونے کا خیال کرتے ہیں۔ ایک بار حضور ﷺ نے اونٹ کا دکھ محسوس کرتے ہوئے فرمایا۔ فانہ شکا کثرة العمل وقلة العلف فاحسنوا اليه

یہ بے زبان جانور کام کی کثرت اور گھاس کی قلت کا شکی ہے اس سے اچھا سلوک کرو۔ (بخاری شرح السنہ) کسی نے پرندے کے بچے کو پکڑ لیا اسپر اسکی ماں نے اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا آپؐ نے فرمایا من فجع هذه بولدها ردوا ولدها اليها

چڑیا کے بچے کو پکڑنے کی حرکت کرس نے کی ہے؟ اسے چھوڑ دو تاکہ ماں کو قرار آجائے۔ (ابوداؤد) بلکہ آپؐ نے جانوروں کی بے رحمی کے اسناد کیلئے اصول مقرر فرمایا کہ اتقوا الله في هذه اليها نم اما وجهة فار كبوها صالحة و كلوها صالحة۔

ان بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ یہ جب طاقت ور ہوں تو سواری کرو جب چارہ دو تو بھر پور دو۔ (ابوداؤد)

یہ احادیث واضح کرتی ہیں کہ جانوروں کی خواہشات کا علم رکھنا کوئی خرق عادت معجزہ نہیں ہے جسے لے کر دیو مالائی کھاتیار کی جائے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ

منطق الطير۔ ایک علم ہے جس میں پرندوں کی بناوٹ، صورت، عادت اور وصف کا بیان ہوتا ہے اور یہ شعبہ ہے ”حیاء الحيوان“ کے علم کا۔ جس میں ہر قسم کے جانوروں کا ذکر ہوتا ہے۔ یہاں ”طیر“ سے بطور خاص بحث نہیں ہے اسکی بابت ابھی ابھی تفصیل آرہی ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ ”طیر“ کو جانور تسلیم کر لینے کے بعد بھی منطق الطیر ٹھیک ترجمہ ہے یونانی لفظ ”ارنی ٹولو جیا“ کا۔ ارنیس لورار نہیں تھوس کہتے ہیں اڑنے والے کو لور لوجیا کے معنی علم اور لغت کے ہیں۔ (\*)

اب جو لوگ اس حقیقی منطق الطیر سے ناواقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ پرندے آپس میں ”مرکب آواز“ میں بولتے ہیں لور ان کی ایسی باتوں کو سلیمان سمجھ لیتے تھے؟ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ علم الحيوان سلیمان کے وقت میں آج کی طرح مدون

و مرتب نہیں تھا اور نہ ہی اسکے جاننے والے ماہرین (Specialist) پائے جاتے تھے ان حالات میں اگر سلیمانؑ اور داؤدؑ کو اس علم سے بہرہ وافر ملا تھا تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی تھی؟ اور اسی نعمت کا یہ نفوس قدسیہ فخریہ اظہار کرتے اور شکر جلاتے رہے۔ اور یہ ایسی ”توجیہ“ نہیں جسے ہمارے ہی حوالہ سے معلوم کر لیا جائے۔ بلکہ اس حقیقت کو دوسرے اہل علم بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ

منطق الطیر در اصل وہ علم ہے جس کے ذریعہ پرندوں و حیوانات کی خواہشات کا اندازہ کیا جاتا ہے اور وہی علم سلیمانؑ کو حاصل تھا۔

(تفسیر ”الواضح“ مصنفہ علامہ محمود احمد حجازی طبع قاہرہ جلد 4/79/19)

یعنی کہ سلیمانؑ پہلے انسان تھے جو علم الحیوان (ZOOLOGY) سے آشنا ہوئے یا یہ کہ ماہر تھے۔ وہو المفسود و گو کہ علم الحیوان کے درجنوں شعبے ہیں اور ہر شعبہ کا ایک اصطلاحی نام ہے تاہم اسپر مجموعی طور پر ”زوالوجی“ کا اطلاق کیا نہیں ہو سکتا۔ رہا یہ کہ یہاں۔ علمنا منطق الطیر۔ کہا گیا ہے منطق الحیوانات۔ نہیں کہا گیا۔ تو اسکی وجہ یہ بنی کہ اس طرح ”الطیر“ کی خصوصیت باقی نہ رہتی اور تمام حیوانات اسمیں شامل سمجھے جاتے۔ پھر یہ بات تو اولے ثانیل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ عام طور پر ”قاعدہ تغلیب“ کے مطابق متعدد اشیاء کا ذکر کر دینے کی بجائے کسی ایک کا نام لے کر سب کو اسی ”زمرے“ کی چیز کہا جاتا ہے مثلاً چڑیا گھر، جسمیں ہزاروں قسم کے حیوانات و حوش و طیور موجود ہوتے ہیں مگر تغلیباً سبھی کو چڑیوں میں ضم کر کے ”چڑیا گھر“ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ”الطیر“ کا لفظ کہہ کر تمام حیوانات کے علم (Science) کو منطق الطیر سے موسوم کیا گیا ہے۔

منطق الطیر کی یہ تشریح بحث کو مختصر کرنے کیلئے کی گئی ہے ورنہ تو اسکا مفہوم اتنا محدود نہیں ہے کہ علم و سائنس کی روشنی میں کچھ کہا ہی نہ جاسکے!

جس طرح سلطنتوں کی فوج فضائی،

### سلیمانی افواج کی تقسیم طیر کی مزید وضاحت

بری اور بحری یونٹوں میں تقسیم ہوتی ہے اسی طرح حضرت سلیمانؑ کی افواج بھی جن، انس۔ اور طیر کی ٹکڑیوں میں تقسیم تھیں۔ پہلے چونکہ ”فضائی“ فوج کا رواج نہیں تھا لہذا باڈی گارڈ سے بری افواج میں سے لئے جاتے تھے بلکہ آج کمانڈو قسم کی فوج کا اضافہ ہوا ہے جو اسپر غماز ہے کہ ہر دور کی ضرورت فوجی تقسیم پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ فوج کی اس تقسیم کے علاوہ آج جس طرح پنجاب اور بلوچ رجمنٹ کے نام سے علاقوں سے وابستہ افواج تیار کی جاتی ہیں سلیمانؑ کے زمانے میں بھی اسی طرح کے فوجی اصولوں کی رعایت برتی گئی تھی کہ ”منطق الطیر“ کی صحیح تشریح اس وقت ہی سامنے آسکتی تھی (جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا) ان وجوہات کی بنا پر منطق الطیر سے مراد۔ لڑنے والے پرندے، نہیں ہو سکتے اگرچہ اسکے معنی یہ بھی ہیں کیونکہ پرندہ نہ تو ”حرلی جانور“ ہے اور نہ ہی جنگ میں کام آنے والا ذریعہ۔ لہذا یہ امر قابل فہم نہیں ہے کہ۔ جن و انس کے جنگجو قبائل کی



صف میں ”پردوں“ کو رکھ کر میدان جنگ میں جھونک دیا جائے؟ وضاحت کے لئے ذیل کی آیت ملاحظہ ہو:

وحشر لسليمان جنوده من الجن والانس والطير فهم يوزعون

(نمل، 17)

سليمان کیلئے جن وانس اور طیر کے عطا شدہ لشکر تیار کئے گئے۔

اس آیت میں سلیمانی افواج کو تین قسموں میں دکھلایا گیا ہے جن کی ترتیب وار تشریح میں محقق اعظم علامہ

چراغ علی لکھتے ہیں:

ایک لشکر میں تو فلسطینی قوم کے آدمی تھے ان میں سے کوئی شخص بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا

اور چونکہ بنی اسرائیل کا محاورہ تھا کہ۔۔۔۔۔ اپنی قوم کے آدمیوں میں اور غیر قوم کے آدمیوں

میں تمیز و تفریق کرتے تھے۔۔۔۔۔ جیسے 24:27 غیر ایم، 27:27 کوئم، اور 27:27 اور 27:27۔

یہی قسم فوج کی قرآن مجید میں ”جن“ کے نام سے آئی ہے۔

(تہذیب الاخلاق طبع دوم لاہور جلد 3/173/16 تا 22)

نیز فرماتے ہیں:

فوج جن (\*) کریٹی، اور قلیٹی قوم کے آدمی جو اجنبی قوم کے تھے ان کا ذکر کتاب دوم صموئیل

باب 15 کی 18، 19 کی آیتوں میں ہے اور اسی کتاب کے آٹھویں باب کی 18-آیت اور پوسویں باب

کی 7-اور 23-آیت میں بھی ان کا نام ہے یہ دونوں قبیلے فلسطانیوں کی نسل سے تھے۔

دیکھو گریوس کا عبرانی لغت جو کہ ابو الولید بن جناح القرطبی کی کتاب ”الاصول“ سے ماخوذ ہے

صفحہ 417 و 677- اور۔ ای والد۔ کی عبرانی گرامر صفحہ 297 اور ہارن کی 202/3۔

(حوالہ تہذیب الاخلاق 3/173، 174)

اسکے بعد عبرانیات۔ پر کامل عبور رکھنے والے علامہ مرحوم۔ داؤد کی فوج کی دوسری قسم کی بابت

ر قنطرازیں دوسری قسم فوج اسرائیل کے نام سے تھی اسمیں سب بنی اسرائیل اور اہل کتاب تھے

انکو لفظ ”انس“ سے تعبیر کیا ہے ان کی تفصیل کتاب ”اخبار الایام باب۔ 27 میں (1-15)

اور صموئیل باب 8 کی 16-باب 20 کی 63 آیت میں مذکور ہے۔

(تہذیب الاخلاق۔ حذف تفصیل جلد 3/174)

داؤد کی فوج کی تیسری قسم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

تیسری قسم فوج کی۔ طیبو۔ رتھی جو داؤد کے بہادروں کے نام سے موسوم، تھی۔ کتاب اول

سلاطین باب اول پوق 8 انکی تفصیل کتاب دوم صموئیل کے باب میں (8-39) اور کتاب اول

اخبار الایام کے گیارہویں باب میں (11-47)

یہ لوگ تعداد میں 600 تھے اور پھر ان میں دودو سو کی ٹکڑیاں تھیں اور پھر ان میں بیس بیس کی  
تفریقیں اور تقسیمیں (مستزاد) (تہذیب الاخلاق جلد 3/174/23 تا 27)

علامہ مرحوم اشار تائیہ بھی واضح فرماتے ہیں کہ :

جدید تقسیم کے لحاظ سے عربی فوجوں میں ”طیور“ کو آج بھی مخصوص دستہ شمار کیا جاتا ہے۔

(تہذیب الاخلاق جلد 3/173/1 نیچے سے تین)

داؤد کی اسی فوج کا زبان وحی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے والطیور محشورۃ (اسکے پاس گھڑ سواروں کا لشکر جمع

(ص، 19)

تھا۔

داؤد کی یہی افواج قاہرہ سلیمان کو دور ٹے میں ملیں اور قرآن پاک نے یہاں پھر اسی گواہی کو دہرایا کہ

سلیمان کیلئے جن وانس اور طیر ہی کے علاوہ غلجہ لشکر تیار (جمع) کئے گئے تھے۔ (نمل، 17)

طیر کی بابت ان تفصیل کے علاوہ ذیل میں معنوی مناسبت کے لحاظ سے مزید معانی درج ہیں جو مزید تائید کی

حیثیت رکھتی ہیں امام زنجری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔ فرس مطار و کاد یستطار من شدة عدوہ

گھوڑا جب تیز رفتاری میں بہت آگے نکل جائے تو کہتے ہیں اڑتا جاتا ہے۔

(اساس البلاغہ طبع فوٹو آفسٹ باہتمام محمد ندیم قاہرہ صفحہ 288 کا لم نمبر 2 س نمبر 5)

یہاں طیور۔ کا لفظ تیز رفتاری کا استعارہ بن کر واضح کر رہا ہے کہ گھڑ سوار دستے جو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر

دشمن پر جھپٹتے تھے قرآن کی اصطلاح میں اسے طیور۔ کے استعارے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس بنا پر علمنا منطق الطیر کے

معنی ہو گئے ہمیں گھڑ سوار لشکر (تیار) کرنے کے قواعد و ضوابط رکھائے گئے۔ (نمل، 16)

قرآن محکم کی آیات میں ژرف نگہی سے کام لیا جاتا تو مفہوم و معانی کا بحر ان پیدائش

**طیر کا وسیع تر مفہوم**

ہو سکتا۔ لیکن عبث و عناد سے دل بہلانے والے اتنی گہرائی میں نہ جاسکتے تھے۔ وہ

داؤد و سلیمان علیہما السلام کی افواج میں پرندوں کا شمول ضروری سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہاں نہ اسکی مناسبت تھی نہ کسی غیر

مناسب پیوند کاری کی ضرورت! قرآن میں صاف فرمایا کہ والطیور محشورہ کل لہ اوآب

اور گھڑ سوار دستے جمع رہتے اور ان کا ہر فرد اطاعت پذیری میں لگا رہتا (سرمواخرا ف نہ کرتا)۔ (ص، 19)

اور جس ”ص“ کی 17۔ ویں آیت میں داؤد علیہ السلام کو۔ ”اوآب“ کہا گیا ہے اسی طرح 19 ویں آیت میں

مذکور ہر فوجی کو نیز ”اوآب“ کہا گیا ہے۔ ادھر لغت اور ادب کے بڑے راہوار۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ الاوب ضرب من

الموجوع وذالك ان الاوب لا يقال. الا في الحيوان الذي له اراده

”اوب۔ اطاعت پذیری کی ایک صنف ہے اسکی خاصیت یہ ہے کہ یہ صرف انسان کی صفت بن سکتا ہے حیوانات کی نہیں

بن سکتا کہ وہ کسی ”ارادے“ کے مالک نہیں ہوئے۔“ (مفردات القرآن طبع مروت صفحہ 25 کا لم 2)

بن سکتا کہ وہ کسی ”ارادے“ کے مالک نہیں ہوئے۔“

بات کھل گئی کہ یہاں طیر کو جب تک حیوانات کی صف سے نکال کر انسانوں کے ”زمرے“ میں نہیں لایا جاتا عربیت اور استعمالاتِ قرآن کی رو سے ”اوب“ کی صفت استعمال نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح داؤد کے ذکر ہی میں فرمایا ولقد آتینا داود منا فضلا یجبال اوبی معہ والطیر ہ

ہم نے داؤد کو بہت سی باتوں میں برتری دی اور جبال و طیر سے کہا ان کا پورا پورا ساتھ دو۔ (سباء، 10)  
اوبی۔ کا صیغہ ”اوب“ سے ہے جو قرآن کے استعمال اور دانشورانِ وحی کے استقراء کی رو سے ”غیر انسان“ کی صفت (یا فعل) نہیں بن سکتا۔ جہاں تک ”جبال“ کے مفہوم کا تعلق ہے میری زیر تجویز تفسیر القرآن میں تفصیلات اور حوالہ جات کی تفصیل موجود ہے۔

طیر۔ کے ضمن میں عبرانیات کے علاوہ عربی اوب میں کافی مثالیں موجود ہیں اسپر جلد بن موسیٰ کے ذیل کے بیت سے خوبی روشنی پڑ سکتی ہے :

فما نفرت جنی ولا فل مبردی

ولا اصیحت طیری من الخوف وقعا

نہ میرا زور ختم ہوا نہ کاروبار میں گھٹا رہا

اور نہ ہی میری فوج نے ڈر کر ہتھیار ڈالے

یہاں طیر۔ فوج کے معنی میں آیا ہے وضاحت میں شیخ ابو ذکریا سخی ابن علی الخطیب تبریزی (912م) لکھتے ہیں۔

ویجوز ان یرید بالطیر سراہاہ وطوائف خیلہ الی تذهب فی الغارات والارتباء وتجسیس الاخبار وغیرہا

طیر سے مراد وہ شیخون مارنے والے گھڑ سوار ہیں جو سرعت اور پھرتی سے دشمن پر پل پڑتے اور

فوجی نوعیت کی خبریں لاتے یعنی دشمن کی سرحدیں پار کر کے ان کی افواج کی نقل و حرکت کی

اطلاع بہم پہنچاتے، جاسوسی کی مہارت کا مظاہرہ کر کے مملکت کو خطرات سے بچاتے ہیں۔

(دیوان ”حماسہ“ بصرہ تبریزی طبع یونان 1825م صفحہ 82)

طیر۔ کی ذیل میں قرآنی لغوی شواہد کی روشنی میں سلیمان کا گھڑ سواروں کے سر عسکر ”ہدھد“ کے غیر حاضر

ہونے پر جنگی کا اظہار فرمانا قرین عقل ہے۔ ارشاد ہے وتفقد الطیر فقال مالی لا اری الہدھد ام کان من الغائبین

یہاں آیہ میں ”تفقد“ کا صیغہ ہے جسکے معنی ہیں کھوئے ہوئے کو تلاش کرنے موجود نہ پا کر مضطرب ہونے اور بعض امور

کے جائزہ لینے کے ہیں۔ (\*) یعنی ماحول چونکہ جنگی تیاریوں کا تھا لہذا مہم کشی سے پہلے افواج کے جائزہ لینے کی ضرورت

تھی لیکن معلوم ہوا کہ ان کا سر عسکر بد غیر حاضر ہے تو یہ کہہ کر رہی اور جنگی کا اظہار فرمایا کہ۔ اگر یہ کوئی اہم خبر نہ لایا تو

اسکی غیر حاضری کا شدید نوٹس لیا جائے گا پھر سنگین سزا ہوگی یا تختہ دار۔ (نمل، 21)

اس طرح۔ تفقد۔ کی تشریح سے بھی جلیب کے معنی گھڑ سوار دستوں بلکہ تبریزی کی وضاحت کے مطابق

پڑھنے کی ہدایت کہا گیا ہے کہ :

پرندہ اپنے علم کو حضرت سلیمان کے علم سے زیادہ بتا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی حضرت سلیمان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ آپ خود کو صاحبِ جاہ و ”حشم“ سمجھتے ہیں لیکن میں نے ایک عورت کو جو فطر نامرد کے مقابلہ میں کمزور ہوتی ہے۔۔۔ حکمرانی کرتے ہوئے دیکھا۔ جسکو اس قسم کے اسباب و وسائل حاصل ہیں جس طرح تم کو حاصل ہیں اور عریدہ برال یہ کہ اسکے پاس ایک عرشِ عظیم بھی ہے۔“

(چٹان 22-12-58 صفحہ 10 کالم نمبر 1، 2)

یہ ہدھد۔ والد ہو یا چچا اس سے شک کا فائدہ اٹھا کر ہد ہد کی انسانیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تاریخ اور وہ بھی قبل از اسلام کے واقعات پر مشتمل ہو محمد ثنین کے ذاتی معیارات کو ملحوظ بنا کر جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ یہ علاوہ اس کے کہ حضرت سلیمان (978 ق م) کے ایک ہم عصر جمیری بادشاہ کا نام بھی ہد ہدن شرعیل تحریر کیا گیا ہے (اور ناموں کا توارد کوئی

اچھبے کی بات ہمیں ہے۔ (مرتلے نمیدی 1791 عوالہ تاج العروس)

**الغرض :-** تاریخ نے اتنے انسانی ”ہد ہدوں“ کو محفوظ کر رکھا ہے کہ ان کی موجودگی میں سلیمانؑ کے ہد ہد کو پرندہ کہنا حقیقت کا مذاق اڑانا ہے بلکہ انسانی ہد ہدوں کی بہتات کو دیکھتے ہوئے اہل تحقیق نے پورے حزم و اعتماد کے ساتھ تصریح کی ہے کہ :

سلیمانؑ کا ہد ہد۔ حقیقت میں بھی انسان ہی تھا اسے بعض خصوصیات کے پیش نظر صرف ”رمزی“ طور پر طیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (عوالہ۔ معجم القرآن۔ طبع قاہرہ جلد 2/228)

کیونکہ جس ہد ہد کو نہ پا کر سلیمانؑ نے جس طرح غیض و غضب اور خفگی کا اظہار فرمایا تھا وہ یہی لکڑی کو چونچ مار مار کر سوراخ کرنے والا چوب تراش (WOOD PECKER) پرندہ نہیں تھا وہ ذی شعور، ذی عقل، شریعت و قانون کا مخاطب انسان ہی تھا کہ انسانوں ہی کو غلطی یا کوتاہی پر تادیبی تازیانہ رسید کیا جاسکتا ہے۔ حیوانات جو کہ عقل و شعور کے تکلفات سے بے نیاز ہوتے ہیں، انہیں ڈرانے، دھمکانے کا انسانی انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سلیمانؑ کا روئے سخن کسی پرندے کی طرف نہیں تھا اپنے کسی با اعتماد سپاہی کی طرف تھا۔

ہد ہد۔ کے اتنے تعارف کے بعد متعلقہ آیت مع ترجمہ پیش خدمت ہے پڑھئے اور وجد فرمائیے۔ ارشاد ہے :

وتفقد الطير. فقال مالي لا اري الهدهد ام كان من الغائبين لا عذبه عذاباً شديداً اولاً ذبحنه اولياتيني  
بسلطان مبين

سلیمانؑ جب افواج کا جائزہ لینے کیلئے تشریف لائے (تو معلوم ہوا سر عسکر) ہد ہد غیر حاضر ہے تو یہ کہہ کر برہمی اور شدید خفگی کا اظہار فرمایا کہ۔ اگر یہ غیر حاضری کا کوئی مضبوط بہانہ پیش نہ کر سکا تو اسکی غیر حاضری کا شدید نوٹس لیا جائے گا پھر سنگین سزا ہوگی یا تختہ موت۔ (نمل، 21)

کچھ لوگوں نے جانوروں کی عاقلیت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہد ہد پرندہ ہی تھا۔ جی نہیں پرندوں کی عاقلیت اگر انسانوں ہی کی عاقلیت جیسی ہوتی تو ان میں نبوت بھی ہوتی اور احکام بھی چلتے اور قرآن میں بے وقوفوں کو جانوروں سے تشبیہ دے کر (کالا نعام) فہم و شعور سے محروم نہ کہا جاتا (اعراف، 179) لہذا اس طرح کے سطحی اعتراضات خانہ پری کی حد تک تو کام دے سکتے ہیں کسی حقیقت کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ غیر انسانی مخلوق میں جس رقبہ کے، عادات و اوصاف و دیعت کئے گئے ہیں وہ انکی ”جہلت“ کا جزو و لا ینفک ہیں اور جہلت ہی ان کیلئے عقل و شعور ہے۔ وحی ہے (النمل، 8) اور الہام ہے (الغفس، 8) ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ لامحالہ انسانی عقل ہی کی حامل ہوں اور کوئی مناسبت نہ ہونے کے باوصف ان میں انسانوں کے وصف پائے جاتے ہوں جبکہ وہ عقل و شعور سے بھی فارغ ہیں اور ”عرب آواز“ نکالنے سے بھی محروم؟

واقعات سلیمانؑ میں ”دابة الارض“ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر

دابة الارض



حیوانات کیلئے بھی نطق اور کلام ثابت ہے۔ وغیرہ۔

دابہ۔ وحی کی زبان میں درجنوں مقامات پر استعمال ہوا ہے اور ہر مقام پر اس کے معنی صرف ”جاندار“ کے آئے ہیں۔ سورہ سباء میں جہاں اسکا ذکر ہے اس کے الفاظ یوں ہیں۔ **مادلہم علی موتہ الادابتہ الارض**۔

جب سلیمانؑ پر موت مسلط ہو گئی تو اسکا پتہ کسی کو بھی نہ چل سکا تا آنکہ دابۃ الارض نے دلیل فراہم کر دی۔

(سباء، 14)

وہ کہتے ہیں کہ دابہ۔ کا بولنا اگر۔ تسلیم نہ کیا جائے تو ”دلہم“ کا فعل بے معنی ہو جاتا ہے۔ وغیرہ۔

جی، نہیں کیا اپنے استدلال میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جانور۔ سلیمانؑ کے علاوہ دیگر لوگوں سے بھی باتیں کرتے

تھے؟ اگر ایسا ہے تو پھر آنحضرتؐ کا وہ ”خصوص“ کہاں رہا جو جانوروں کی بولیاں بولنے اور سمجھنے کے ضمن میں بیان کیا جاتا

ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ۔ ذل۔ عری میں نشاندہی اور ”قرینے“ کو کہا جاتا ہے جبکہ قرینے کیلئے زبان، نہیں ہوتی اس طرح

آیت کے معنی ہونگے کہ سید موصوف علیہ السلام کی موت کا زمینی کسی بھی تنفس نے قرینہ فراہم کر دیا۔ عری میں ہر تنفس

کو دابہ کہا جاتا ہے۔ (ہود، 6) اس طرح کسی بھی تنفس نے قرینہ فراہم کر دیا۔ اس طرح کسی خاص نام اور حلیہ سے ”شخص“

وجود کو دابہ۔ کا نام نہیں دیا گیا۔ لیکن جو حضرات کچھ زیادہ ہی جانور صفت واقع ہوئے ہیں وہ مفسر ثعلبی (1035م) ابن جریج

(767م) اور ابو ہریرہ (679م) کے حوالہ سے اسکا حلیہ اس طرح کا بیان کر کے انسان ہی ثابت کرتے ہیں۔ اس عجیب الخلق

جانور کے چار پاؤں ہونگے اور جسم پر بال ہونگے۔ سر میل کا۔ آنکھیں خنزیر کی۔ کان ہاتھی کے۔ سینگ اونٹ کے (اونٹ

کے سیگ؟)۔ گردن شتر مرغ کی۔ سینہ شیر کا۔ رنگ چیتے کا۔ کمر بیلے کی۔ دم مینڈھے کی۔ سُم اونٹ کے (اونٹ کے

سم؟)۔ ٹانگ کے جوڑوں کا فاصلہ آدم کے ہاتھ سے بارہ ہاتھ کا لمبا فاصلہ ہوگا۔ قد کی اونچائی آدم کے ساٹھ ہاتھ کی ہوگی۔

سربادلوں کو مس کرے گا۔ اور دونوں سینگوں کے مابین کا فاصلہ تین میل لمبا ہوگا (یعنی کہ وہ تمام اپنی ذات میں پورا چڑیا گھر

ہوگا) (حوالہ تفاسیر متداولہ)

کہتے ہیں کہ یہ کعبۃ اللہ سے خروج کرے گا بلکہ صفا پہاڑی کے نزدیک داربنی مخزوم سے عین اس وقت خروج

کرے گا جب مسیحؑ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ طواف کعبہ کر رہے ہونگے۔ اس کے خروج کے وقت زمین پر سخت بھونچال

آئے گا۔ (کشاف طبع قاہرہ جلد 3/302/1 تا 19۔ نیز تفسیر رازی طبع عبد الرحمن قاہرہ جلد 217، 218)

اسی دابہ۔ کی بات یہ بھی لکھا ہے کہ۔

یہ پہلے یمن سے خروج کر کے پھر غائب ہو جائے گا اور عرصہ بعد جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے (غالباً بیت

المقدس) سے نکلے گا۔ اس کے پاس سلیمانؑ کی انگشتی اور موسیٰؑ کا عصا ہوگا وہ جس کی پیشانی پر عصا مارے گا۔ اگر سفید رنگ کا

نشان پڑ گیا تو وہ پھیلتے پھیلتے تمام پیشانی کو منور کر دے گا اور وہ مسلمان متصور ہوگا اور اگر پیشانی پر سیاہ دھبہ پڑ گیا تو وہ پھیل کر

ساری پیشانی کو سیاہ کر دے گا اور وہ شخص کافر شمار ہوگا۔ (تفاسیر متداولہ) یعنی اسے مسلمان اور کافر بنانے کی توانائی بھی

حاصل ہوگی۔

جس دابے کی خصوصیات اور حلیہ مفسرین نے بیان کیا ہے ان کی خرافات کے برعکس وہ انسان ہی ہوگا۔ مخدومی امام اہل الحدیث الشیخ ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری

**یہ دابہ انسان ہی ہوگا**

(1948م) نے دابۃ الارض کے معنی ----- ”نبی“ کے لکھے ہیں۔

(تفسیر القرآن بکلام الرحمان (عربی) مطبوعہ ۱۳۲۰ھ جری صفحہ 330)

اور وہ تفسیر میں لکھتے ہیں :

یہ دابہ دُم دار نہ ہوگا بلکہ داڑھی والا ہوگا یعنی انسان ہوگا (معالم)۔ اس روایت کے مطابق معنی یہ ہونگے کہ جب دنیا میں گمراہی زیادہ ہو جائے گی تو خدا کوئی سر و صالح پیدا کر دے گا جو لوگوں کو بے ایمانی پر ملامت کر کے ان کو ہدایت کرے گا۔ (تفسیر ثنائی اردو طبع امرتسر جلد 6/43)

یہاں تفسیر معالم التنزیل مصنفہ امام بغوی (1123م) کے حوالہ سے دابہ کو داڑھی والا کہا گیا ہے یعنی داڑھی کو انسان کا استعارہ بنایا گیا ہے جبکہ داڑھی جڑے اور تبت کے ”یاک“ کے بھی ہوتی ہے لیکن جانوروں کے بڑھے ہوئے بالوں کو ”عرف عام“ میں داڑھی نہیں کہا گیا لہذا داڑھی انسان ہی کا خاصہ لازمہ ہے۔ علامہ محمود احمد حجازی لکھتے ہیں۔

وفي ظني والله اعلم ان تلك الدابة عالم بكتاب الله وسنة رسوله واحكام شرعه يظهر في هذا الوقت الذي يقل فيه العلماء

میرے نزدیک دابہ ایک انسان ہی ہوگا جو علوم اسلامیہ کتاب و سنت اور احکام شرع کا عالم ہوگا اور اس وقت ہی اس کا ظہور ہوگا جب علم و دانش دم توڑنے لگیں گے۔

اس سے پہلے علامہ حجازی نے یہ تاثر دیا ہے کہ

یہ جو مفسروں اور قصہ گوؤں کی مضمون آفرینیوں کی بدولت تفاسیر میں دلبہ سے متعلق خرافات کے طومار ملتے ہیں بلکہ اس سلسلے کی بعض احادیث کے سہارے اسکی عجیب الخلقی کے بارے میں جو کچھ ملتا ہے خیال آفرینی اور خود اختراعی کا شاہکار ہے۔

(تفسیر ”الواضح“ طبع قاہرہ جلد 20/13-12)

ناقد محترم۔ نے دابہ کو مشہور معنی میں ”خیالی“ مخلوق بنا کر جس غیر علمی انداز سے اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے اسکی کوئی اصلیت نہیں ہے اسی طرح اسے مہدی اور مسیح کے انتظاری زمرے میں شامل کرنے والے بھی دلیل و برہان کی روشنی سے عاری ہیں وہ علم و دانش کے ہوتے ہوئے بھی ”انتظاری عقیدے“ کی فتنہ پرداز یوں سے مسحور ہیں انہیں ہم کہیں تو کیا کہیں؟ اور سمجھائیں تو کیا سمجھائیں؟ یہ لوگ حدیثوں کے سہارے ”نبوتوں“ کے روشن دان اور کھڑکیاں دانستہ

کھول کر ”ختم نبوت“ کا در غلط انداز سے مدد دکھانا چاہتے ہیں جبکہ اس دو غلطے پن سے محمدؐ کے شیعائی قرآن کی صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ ہی نہیں سکتے۔

**نظر باز گشت** ناظرین کرام میرے مضمون ”داوی نمل کی ہشیار ملکہ“ پر محترم دھی منظر ندوی سابق امیر جماعت اسلامی حیدر آباد سندھ کی تنقید آپ نے ملاحظہ فرمائی اور میرا نقاب بھی آپ کی نظر سے گذرا۔ اب انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دلائل کے تقابلی مطالعے سے آپ خود ہی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں آچکے ہیں یہاں نہ ذہنی اکراہ سے کام لیا گیا ہے نہ ہی کسی طرح کے دجل و فریب سے کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے نملہ و منطق الطیر۔ کی دونوں تشبیہیں آپ کے سامنے ہیں اور دونوں ہی مفسروں کی تراوش فکر سے مختلف ہیں اسی طرح ”طیر“ کے مفہیم بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ یہاں لغت، استعمالات عرب اور قرآن محکم کی مقتوع تصریفات سے بھرپور استفادہ کر کے اپنے مفہوم کو زیادہ مدلل بنا دیا گیا ہے اسکے لئے میری محنت و کاوش کا کوئی احساس کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر تو آپ پر حقیقت منکشف ہو گئی تو میرا مقصد پورا ہو گیا لیکن اگر اب بھی ذہن پر غلبان مستولی ہے تو گذارش کرونگا کہ دور کرنے کی کوشش فرمائیے۔

**وہم لایشعرون** ناظرین محترم نسیان کیسے باہو قلم۔ کہ میرے مضمون میں ”لایشعرون“ کی تشریح نہ ہو سکی اور یہ اعتراض نمودار ہوا کہ۔۔۔ نمل والے اگر انسان ہوتے تو سلیمانی افواج انہیں لاشعوری طور پر لقمہ ہلاکت نہ بنا سکتی تھیں۔

اب کہ میرے مضمون کو 36 سال ہو چکے ہیں ایک صاحب ذوق محترم محمد اسلم صاحب مٹ نے ایک خط کے ذریعہ متوجہ فرما کر مضمون میں ”تشکی“ کا احساس دلایا ہے میں ان کا شکر گزار ہوں اور۔۔۔ مستقبل میں اشاعت ثانی کی امید پر ذیل کی معروضات شامل کر رہا ہوں۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی صاحب کا مفہوم ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو :

”داوی نمل۔ کی ہشیار ملکہ کی تقریر میں ”لایشعرون“ کا جو ترجمہ کیا ہے اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ذہن اسکی صحت کو قبول کرنے میں جھجک محسوس کر رہا ہے آپ لکھتے ہیں کہ ملکہ نے سلیمانی افواج کے غیر شعوری ضرر رسانی سے چنے کیلئے قوم سے کہا تھا۔ اے قوم نمل اپنے اپنے گھروں میں محفوظ ہو جاؤ (کوئی بھی باہر نہ نکلے) ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اسکی فوجیں (دشمن سمجھ کر) تمہیں چور چور کر دیں اور انہیں علم تک نہ ہو۔ محترم بتایا جائے کہ اگر داوی نمل میں رہنے والے انسان تھے اور ان کے انسان ہونے میں کوئی شک بھی نہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ سلیمان اور اسکی فوجیں ایک مسلح تصادم میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو کچل دیں اور انہیں علم تک نہ ہو۔ قرآنی الفاظ اور اسکے پیش کردہ ترجمے سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چوٹیاں ہی ہو سکتی ہیں۔

والسلام

خیر اندیش محمد اسلم مٹ

ریٹائرڈ ٹیچر۔ بمقام مرالیوالہ ڈاکخانہ خاص

تحصیل و ضلع کوہجرانوالہ

8-2-96.

یہ خط اپنے مفہوم میں واضح ہے اور میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ۔ جہاں تک انسانوں کی بڑی تعداد کو حملہ آوروں کے ہاتھوں کچلے جانے کا امکان ہے تو یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے قرآن محکم نفسیات جنگ سے متعلق فرماتا ہے۔ ان المملوك اذا دخلوا قرية الفسد وها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وهم يفعلون ه

حملہ آور ملوک جب کسی آبادی پر حملہ آور ہو جاتے ہیں تو پوری بربادی لاتے اور شرفاء کو ذلت و رسوائی سے دوچار کر ڈالتے ہیں کہ وہ ایسا ہی کرتے رہتے ہیں۔ (نمل، 34)

اور چونکہ ان سے ان دنوں بچنے کی ایک ہی صورت رہی کہ حملہ آوروں کی مزاحمت نہ کی جائے چنانچہ داوی نمل کی ملکہ نے اپنی قوم اور اپنے وطن کو بچانے کا یہی نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ نمل (18) میں اس کا میاب تدبیر کا ذکر اور ملکہ کے خطاب کا ذکر ہے۔ تاہم نمل (34) میں جنگ میں ظہور پذیر ہونے والے نتائج کو سامنے لایا گیا ہے کہ وہ کوئی خوشگوار نہیں ہوتے اور حملہ آوروں کو علم ہوتا ہے کہ کبھی لوگ نہ جنگجو ہوتے ہیں نہ صلح جو۔ مگر حملہ کے بعد طالبان صلح کو بیچ جانے کے چانس دینے کا شعور تک نہیں رہتا اور بلاوجہ مارے جاتے ہیں کیونکہ ”رن“ جب گھمسان کا پڑ جائے تو با قصور اور بے قصور کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ شناسا اور نا شناسا برابر ہو جاتے ہیں۔ جنگجو اور صلح جو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وفادار اور بے وفا کی بات نہیں رہتی اور حامی اور مخالف کا احساس بھی پروان نہیں چڑھتا۔ اس وقت حربہ اعلیٰ (بے ہنگم لڑائی) زوروں پر ہوتی ہے۔ لاعلمیت، بے خبری اور لاشعوریت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ تلوار کی آنکھ نہیں ہوتی جو سامنے آتا ہے وار کر گزرتی ہے۔ اس وقت اخلاقی ضوابط دم توڑ بیٹھتے ہیں۔ ایسے میں خویش و بیگانہ۔ قریب اور بعید کا رشتہ بالکل ہی کٹ جاتا ہے تاہم یہ صرف قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ وہ ایسے نازک لمحوں میں بھی حملہ آوروں کو کھیت کھلیانوں، آدمیوں اور آدم زادوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے کی جائے۔ ”یلغار اور“ پر وکر اموں کو کوا کر ”مفاہمت“ کی پالیسی عطا فرماتا ہے۔ جنگ حدیبیہ۔ صلح حدیبیہ میں اسلئے بدل دی گئی کہ حملہ آور صحابہؓ میں سے بھی سابقہ اہل مکہ نہیں تھے جو یہاں کے محصور مسلمانوں کے جانتے ہوتے ان میں نووارد لشکر کی صحابہ کی ٹولیاں بھی تھیں جو نہ تو پہلے سے مکہ کی گلی کو چوں سے آگاہ تھے اور نہ ہی محصور مسلمانوں کو جانتے تھے ایسے میں اشارہ الہی ہوا کہ۔۔۔۔۔ معاہدہ امن خواہ گھائے ہی کا کیوں نہ ہو کر لیا جائے تاکہ محصور مسلمان مردوں اور عورتوں کو لاشعوری اور بے خبری کی تباہ کاریوں سے محفوظ کر لیا جائے۔ فرمایا۔ ولولار رجال مؤمنون و نساء مؤمنات لم تعلموہم ان تظنوہم فتصیکم معرفة بغير علم

اور اگر اس وقت مکہ میں ایسے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن سے تمہاری پہلے سے

کوئی آشنائی نہ تھی۔ اور ایسے میں تم چڑھائی کر دیتے تو (بے خبری میں ہوتا یہ کہ تم) انہیں بھی روندتے چلے جاتے اور (ایک گونہ مسلمانوں کو مار کر) تم خود ہی نقصان میں رہ جاتے۔ (فتح، 25)

اس آیت مبارکہ میں ایک تو ”تطنوہم“ کا لفظ قابل غور ہے جو کچلے اور روندے جانے سے تعبیر ہے جبکہ محصور مسلمان جسامت کے لحاظ سے اتنے بھی ”Reduced“ نہیں تھے کہ حملہ آوروں کو ان کے وجود کا پتہ ہی نہ چل سکے اور وہ بے خبری میں ان کو فنا کے گھاٹ اتار ڈالیں۔ نہیں یہاں ”تطنو“ دراصل محصورین کی کمزوری کا استعارہ ہے۔ یعنی کہ حملہ آور ہمیشہ طاقتور ہوتے ہیں اور محصورین دشمن خواہ دوست ہمیشہ کمزور ہوتے ہیں۔

دوسرے دو لفظ۔ لاتعلمونہم۔ اور ”بغیر علم“ اس حالت جنگ کی کیفیت کے غماز ہیں جبکہ نصب العین سامنے کی صفوں کو پچھاڑنا اور شکست سے دوچار کرنا ہوتا ہے اور اس وقت بھی لڑنے والے کو یہ ہوش نہیں ہوتا کہ مقابل میں آنے والا کون ہے؟ امید ہے میرا مفہوم واضح ہو چکا ہو گا۔

**ناظرین محترم :-** یہ عجیب اتفاق ہے کہ سیدنا سلیمانؑ کی لشکر کشی کے دوران جزیرۃ العرب کے جنوب میں جو دو سلطنتیں تھیں دونوں کی حکمران عورتیں ہی تھیں۔ دانش اور فرزانگی کی فراوانی نے دونوں کی سوچ میں یکسانیت، ٹھیراؤ، اعتدال اور معاملات کو ناخن تدبیر سے حل کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ ملکہ یمن بلقیس نے جنگ کے ہولناک نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے قوم کو حملہ آوروں سے اگر محفوظ کر لیا تو ملکہ۔ نمل۔ نے بھی ایسے ہی نتائج کو سامنے رکھ کر قوم سے کہا کہ۔ شہر کو کھلا چھوڑ دو۔ گھروں میں بند ہو جاؤ۔ حملہ آور جنگ آوری سے خود ہی ہٹ جائیں گے۔

ر۔ طارق۔ 12-2-95۔ از ملتان

## وادی نمل کی ہشیار ملکہ

انسان فطرنا جدت پسند اور اس کی فکر ہر لمحہ اور ہر آن ارتقا پذیر ہے۔ وہ جب تک کسی چیز کی حقیقت اور کنہ تک نہیں پہنچتا سائی حاصل کرنے کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ ایسے میں اسے مذہبی لب و لہجہ میں مبطلون کرنا اہل علم کو زب نہیں دیتا۔ دنیا جانتی ہے کہ سائنس کی ترقی اور اثری اکتشافات نے ہمارے عقائدی نظام کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور اس حقیقت کو مبرا بن کر دیا ہے کہ جس چیز میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے وہ جزو عقیدہ نہیں بن سکتی۔ پہلے کا انسان کسی خاص فکر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی سوچ پر کاربند رہنے کو معراج کمال سمجھتا تھا جب کہ ماضی قریب اور حال کا فرزند آدم مختلف زاویوں سے اپنی سوچ و فکر کے دائرے کو وسیع کر چکا ہے۔ پہلے کا انسان آدم کو مجسم و متعارف انسان سمجھتا رہا تھا مگر تازہ سوچ نے ماضی کے اس فیصلے کو غلط ٹھیر لیا ہے۔ اب وہ آدم کو نوع انسان کا ایک نمونہ بنی کردار ٹھیراتا اور استدلال میں مسلمان مفکرین ابو العلاء المعری (1058ء) امام باقر (732ء) امام جعفر (765ء) محمد عبدہ (1905ء)، رشید رضا (1935ء)، اور ابن عربی (1240ء) وغیرہ کے حوالے سے بات کر کے اپنے مدعا کو زیادہ مدلل انداز سے پیش کرتا ہے۔ اس طرح اقوام سابقہ میں ”نمل“ کا لفظ ہے جس کیلئے قرآن حکیم نے تمام تر انسانوں کے صیغے استعمال کر کے اس حقیقت کو زبردش کی طرح نمایاں کیا ہے کہ نمل چوٹی نہیں جزیرہ العرب کے بعض قبائل



وجہ شکایت یہ ہے کہ راقم الحروف نے عرصہ 39 سال پہلے ایک مضمون بعنوان ”واوی غفلت کی ہشیار ملکہ“ شائع کیا تھا جس پر ایک صاحبِ علم مگر سوچ و فکر سے عاری قلم کار نے کچھ اعتراضات جڑ دیئے جس پر راقم نے از سر نو محنت کر کے ان ہی دنوں تمام اعتراضات کے بالاستیعاب جوابات پیش کر دیئے۔ اس طرح میں فخریتا کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کی تفسیری تاریخ میں میرا مضمون ناگزیر اضافہ ثابت ہوا جس سے اچھنبہ پرستوں کے گھروندے سہار ہو کر رہ گئے مگر چشمِ حسد نے طویل عرصہ کے بعد پھر سے میری طرف گھورنا شروع کر دیا اور باوصفہ کہ میری نہ زبان غیر علمی تھی، نہ اندازِ بیان غیر شائستہ، اس پر بھی انہوں نے اندازِ تنقید ایسا اختیار کیا جیسے میں نے انہیں ہی خطاب کر کے ہدفِ ملامت بنایا ہو۔ وہ فرماتے ہیں،

”دوسری طرف ہمارے نزدیک قرآن مجید پر ایمان کا تقاضہ ہے کہ اس کے لفظ لفظ کے آگے سر تسلیم خم رہے اس کے الفاظ سے انحراف بیان کی من مانی تاویل در حقیقت قرآن مجید کا انکار ہے۔“ (اشراق بابت مئی 97ء صفحہ 65)

یہاں ناقد محترم نے قرآن فنی پر نہ صرف اپنا جارہ قائم کیا ہے بلکہ الفاظ کی ”چھن“ بتا رہی ہے کہ وہ مصنف کو ظاہر الفاظ کا منکر اور ای اساس پر منحرف بھی تسلیم کرتے ہیں حالانکہ میں نے ملکہ عمل کے واقعات و حالات سے نہ تو انکار کیا ہے نہ ہی توجیہات و تاویلات کے پٹ کھول کر الفاظ اور مزاج وحی سے انحراف کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ الفاظ اگر کوئی بجاو پرست کہتا تو کہا جاسکتا تھا کہ ان کا انداز گفتگو ہی ایسا ہے انہیں تو انسانوں کی زبان میں بات کرنا آتا ہی نہیں ہے لیکن ان سے ہم کہیں تو کیا کہیں۔ خاص کر یہاں ”افتاو“ یہ ہے کہ ان کی ”جدیدیت“ تو تعبیر و توجیہ کا علمی انداز کہلاتی ہے لیکن ہماری جدیدیت تاویل و تحریف کا بے خطا نمونہ۔ کیونکہ وہ الفاظ کے خوبصورت اصنام تراشنے کی مہارت اور تشریح کے ساحرانہ لہجے میں لوگوں کو مبسوت و حیرت زدہ بنا ڈالنے کی سکت رکھتے ہیں۔ نمونہ کیلئے زیدوزینب کے نام سے فرضی کرداروں کے واقعات ملاحظہ ہوں۔

یہ لوگ بعض اعلام فکر اسلامی کو اس انداز سے متعارف کراتے ہیں جیسے وہ ان کے سر پرست اور مرعفی ہوں۔ رئیس المضرین امام فراہی بلاشبہ عظیم انسان تھے۔ وہ سب اہل فکر کی مشترکہ میراث تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ لوگ اجارہ داری کی اساس پر ان کے بھی مجاورین بیٹھے ہیں۔ حالانکہ میں نے 1945 میں علامہ فراہی کی نظام القرآن کے بعض اجزاء کلکتہ

کے ایک کتب خانے میں مطالعہ کئے تھے۔ طبرہ، ابابیل، کی تشریح میں ان کے جواہر پارے دیکھے تھے جو منفرد بھی تھے اور مدلل بھی۔ ایسے عظیم مفکر کو اپنی سطح پر یا اپنی صف میں لے آنا کتنی رستم ظریفی ہے۔ اس تلخ نوائی کا پس منظر یہ ہے کہ میزاد ہی پرانا مضمون وقتی تقاضوں کے مطابق کسی طرح طلوع اسلام میں چھپ گیا اور ناقص ذی احترام اسے اپنا جواب سمجھ کر بنیاد پرستوں کی طرح کھلے بندوں دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی بجائے ”در حقیقت قرآن مجید سے انکار“ کے شکر چڑھے (Sugar Coated) الفاظ میں اپنا کام کر گئے یعنی رومالی میں لپیٹ کر وار کر گئے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ خود بھی الفاظ اور مزاج قرآن سے اتنے ہی بے خبر ہیں جتنا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے تاہم ان پر طنز کرنا علمی رواداری کے خلاف ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تحقیق و تفتیش کے باوجود آج بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ ”تحویل قبلہ“ کا واقعہ سچ اور حقیقت ہے مگر یہ نہیں بتلاتے کہ اسلام کی سب سے پہلی مسجد ”قبا“ میں تعمیر ہوئی پھر مسجد نبوی ”مدینہ طیبہ“ کی زینت بنی لیکن تاریخ اور مشاہدے کی گواہی یہ ہے کہ ان مساجد میں صرف جنوب (سمت کعبہ) کی طرف محراب یا محراب کا کوئی متبادل رکھا گیا۔ شمال یا بیت المقدس کی سمت نہ محراب مانا نہ ہی شمال کی جانب برش یا کسی اور چیز سے علامتی نشان لگا کر دوسرے قبلے کی نشاندہی کی گئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے بھول کر بھی سمت کعبہ کو نہ چھوڑا نہ بدلا۔ بلکہ قرآن بھی کہتا ہے وما انت بتابع قبلتہم آپ اس کے مجاز ہی نہیں کہ اللہ کے مقرر کردہ وحدت کے زمزمی نشان کو چھوڑ کر ان کے قبلہ کا رخ کریں (بقرہ 145) لیکن پھر کیا ہوا کہ ”قبلتین“ کے عنوان سے ایک مسجد وجود میں لائی جاتی ہے اور پہلے سے دکھلایا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ 15 ماہ تک بیت المقدس ہی کی طرف اعلانیہ یا چھپ کر رخ کر کے نماز پڑھاتے رہے۔ کیا اس کے لئے کوئی تازہ حکم مل چکا تھا؟ پھر کہاں ہے، وہ حکم؟ کیا اس کیلئے آپ نے کسی اجتہاد سے کام لیا تھا؟ اجتہاد بھی وہاں کارگر ہو سکتا ہے جہاں قرآن خاموش ہو جبکہ یہاں قرآن تعینہ کر رہا ہے کہ وما انت بتابع قبلتہم ایسے میں یہ واقعہ تاریخ اسلام کا حصہ بن گیا تو کیونکر؟ اور تحویل قبلہ کے باب میں سید البشرؐ کی شخصیت اور پالیسی کو متنازعہ بنایا گیا تو کس لئے؟

## وجہ گناہ

ناظرین محترم! اگر انصاف کا بول بالا کرنا مقصود ہو تا تو میرے مقالے کا علمی جائزہ لیا جاتا اور ان حوالہ جات کی کلائی مروڑ کر مجھے دکھلایا جاتا کہ وہ توانائی کے جوہر سے بالکل عاری ہیں۔ لیکن وہ خالی دھمکی پر ٹرنا کر صرف ”نسبت“ کی بات کر کے پہلو تھپی کر گئے حالانکہ پورے مقالہ کے مشمولات کو زیر بحث لانا چاہئے تھا تاکہ ان کے قارئین کے دواہرے اطمینان کا باعث بنے۔ اب یہ تسلیم کہ میں نے بہت سے خارجی سہاروں کی اساس پر زاویہ نسبت کو نہیں چھیڑا لیکن اسے ہی جرم تصور کر کے وجہ گناہ اگر پوچھی گئی ہے تو آئیے وہ بھی مرض کئے دیتا ہوں کہ اگر امر لغت سے تیار ہوتا ہے اور لغت کا تمام تر ذخیرہ سماع پر منحصر ہے۔ سماع جہاں قوم کے ایک فرد کیلئے نسبت کو ضروری سمجھتا ہے وہاں مفہوم پر بھی نظر رکھتا ہے یعنی مفہوم اگر نسبت کو اجاگر کئے دیتا ہے تو حرف نسبت کا اظہار چنداں ضروری نہیں ہے۔

حیوان کو انسان بنانے کا طریقہ صرف مرئی ہی نہیں ہر زبان میں قرائن کو معنی آفرینی میں بڑا دخل

ہوتا ہے مثلاً عرب میں ہندوستان کی طرح جانوروں کے نام پر قبائل بنانے کا رواج عام تھا اور اس کے لئے قال۔ یا۔ قالت کا قرینہ کافی ہو جاتا تھا مثلاً ثعلب (لومڑ) ثعبان (سانپ) شارقہ جس کے ق (Q) کو دارجہ عربی کے لبعے میں شارجہ (مچھلی) اور ابو ظبی (ہرن) جسے غلطی سے ابو ظبی کہا جاتا ہے۔ نمر (چیتا) اور تمساح (مگر مجھ) ان الفاظ کے ساتھ (بنو) کا استعمال بھی ہوتا تھا جو رفتہ رفتہ تحلیل ہوتا گیا۔ اب ان کے ساتھ قال۔ یا قالت لگا دیجئے حیوان سے انسان بن جائیں گے اور آپ ”فرد“ کو حرف نسبت کے اظہار کے بغیر ہی مفہوم اور قرینے کے زور پر ”بائنبت“ کہہ سکتے ہیں مثلاً قالت ثعلبہ (بو ثعلب کی ایک عورت نے کہا) کننا کافی ہوگا۔ ثعلبہ کننا ضروری نہیں۔ اسی طرح قالت ثعلبہ۔ قالت شارقہ۔ قالت ظبیہ۔ قالت نمرۃ اور قالت تمساحۃ۔ کننا کافی ہے اور کچھ ضروری نہیں کہ آپ نسبت کے ظاہری قاعدے کے مطابق بہ تکلف لفظوں ہی میں حرف نسبت کا اظہار کر کے فرد کو قبیلہ سے الگ کر دیں یعنی فرمادیں۔ قالت ثعلبہ۔ ثعبانیہ۔ شارقیہ۔ ظبیہ۔ (Zabiyyat) نمریۃ اور تمساحینۃ کیونکہ جب خالفت کے قرینے اور قبائلیت کے مفہوم نے مل کر نسبت کے زاویہ کو اجاگر کر رکھا ہے تو ایسے میں حرف نسبت کا اظہار بجائے خود فصاحت کے منافی بھی ہو گا اور سماع کے خلاف بھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حرف نسبت کا اظہار ضروری ہو تو کر ڈالئے لیکن جہاں ضرورت نہ ہو تو رحم فرمائیے۔

غالباً 1955ء کی بات ہے کہ مکہ المکرمہ کی ایک علمی درسگاہ کے اساتذہ سے وادی نمل کی کہانی چھڑ گئی میں نے ان پر واضح کیا کہ اس واقعہ کی تمام کڑیوں میں انسانی صیغے استعمال کئے گئے ہیں جبکہ بغیر کسی ادبی اور نثری ضرورت کے قاعدہ شکنی کا جواز نہیں بنتا۔ اس پر اساتذہ نے فرمایا قامیر کا اسلوب تو واضح کرتا ہے کہ انسانی صیغوں کے استعمال کے باوجود۔ نمل انسان نہیں چوئیاں تھیں۔ اس پر میں نے علامہ حسن بن احمد بن یعقوب البہدانی (945) کی کتاب ”صفة جزيرة العرب“ جسے سلطان عبدالعزیز 1952ء نے اپنے ذاتی خرچ پر چھاپا تھا اس کے صفحہ 197 پر وضاحت دکھائی کہ نمل۔ یمن کا ایک قبیلہ ہے جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے پھر ہدانی ہی نے ان بستیوں، گلی کوچوں اور ضعاء کی شہر پناہ اور دروازوں کے نام تک گنوا دیے جہاں قبائل نمل ترہائش پذیر تھے۔ مزید میں نے ہدانی ہی کی دوسری کتاب ”الاکلیل“ دکھائی جس میں قبیلہ نمل کا شجرہ نسب اس طرح بتلایا گیا ہے نملہ بن قادم بن یطن من جحود بن اسلم بن علیان بن زید بن عریب بن جشم بن حاشد جس سے واضح ہوتا ہے کہ نمل یا نملہ۔ چوئیاں، نہیں انسانی آبادی اور قبیلہ کا نام ہے۔

(الاکلیل طبع قاہرہ جلد 10/102)

بلکہ میں نے اپنی جستجو کو آگے بڑھا کر دمیری (1405) کا حوالہ بھی پیش کر دیا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ یہ نملہ بولنے والا انسان ہی تھا (حیوانہ الحیوان طبع مصر جلد 2/433) غرض کہ میری ان معروضات کو درخور اعتنا سمجھ کر سبھی نمل کے انسان ہونے کے قائل ہو گئے اور نسبت کے بارے میں فرمایا کہ اس کے کسی فرد کیلئے نسبت کا اظہار مفہوم پر مبنی ہے۔ مفہوم اگر نسبت میں شامل ہے تو نسبت کا اظہار غیر ضروری ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے عہد میں ”سید“

نے قوم، قبیلہ، اور نسبت کی حیثیت اختیار کر لی ہے لہذا ہم جب "قالت سیدۃ" (Seyydat) کہیں گے تو قومیت کی نسبت اس کے اندر موجود ہے اور معنی ہونگے سید قوم کی ایک عورت نے کہا اور اسے اگر بہ تکلف "سیدۃ" (Seyya-diiyyat) دیا جائے تو نہ صرف مفہوم گننا جائے گا بلکہ فصاحت کا خون بھی ہو جائے گا۔ لہذا ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفہوم کی مناسبت سے نسبت کا اظہار نہیں بھی کیا جاتا۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی ان قبائل کا بطور نمونہ ذکر کروں گا جن کے اصل قبیلوں پر ان کا پیشہ غالب آگیا یا وہ پیشوں میں ایسے تحلیل ہو گئے کہ اصل ذات، قوم اور گوت معدوم ہو کر رہ گئے یعنی اب اگر ہم نام کے ساتھ پیشہ لگادیں تو وہ پیشہ، نہیں ذات ہی شمار ہوگی مثلاً خباز (تورچی) علاف (گھاسی) لبان (دودھ دوہنے والا) سمان (گھی فروش) غسال (دھوئی) حداد (ادھار) خزار (موچی) خیاط (درزی) دھان (تلی) غزال (سوت کا تے والا) نساج (ٹپنے والا) یہ سب پیشے ہیں لیکن جو لوگ ان سے متعارف ہو گئے ان کی اصل قوم یاد ہو گئی۔

حرم مکی کے ایک خطیب کا نام عبد اللہ خیاط تھا لیکن خیاطی ان کا پیشہ نہیں ذات تھی۔ عبد العزیز غسال، مدینہ منورہ کا بڑا سرمایہ دار تھا اور اب بھی کئی عمارات اس کی ذات سے معنون ہیں مگر وہ دھوئی، نہیں۔ غسال اس کی گوت ہے۔ سرور الصبان، سعودیہ کا بڑا تاجر اور کئی اداروں کا مالک ہے مگر صابن سازی، نہیں کرتا۔ صابن اس کی قوی شناخت ہے۔ عبد العزیز کھنکی سعودی عرب کا بڑا پیکر ہے۔ پوری خلیج میں مصرف الکھنکی (کھنکی بینک) کے نام سے اس کے بینک ہیں مگر کھنکی اس کی ذات ہے وہ کیک بنانے والا پیکر، نہیں ہے۔ اب ان ذاتوں کی مونثات کا ذکر ہو گا تو اصل قبیلہ کی نسبت کا اظہار نہ ہو سکے گا۔ اب فصاحت اسی کی متقاضی ہے کہ نسبت کے اظہار کے بغیر ہی کہا جائے۔ قالت خبازہ۔۔۔ قالت خیاطۃ۔۔۔ قالت دھانۃ۔۔۔ قالت غزالۃ۔۔۔ قالت سمانۃ۔۔۔ یعنی ان کے نام کے ساتھ جو نئی پیشہ کا لاحقہ ہو گا وہ قبیلہ یا ذات کا غماز ہو گا اب خبازیۃ۔۔۔ خیاطیۃ۔۔۔ دھانیۃ۔۔۔ غزالیۃ کہنا ضروری نہیں۔ اسی طرح قرآن نے اگر نملہ کہا ہے اور سماع نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے تو اسکے لئے نملیۃ کا پیکر تجویز کرنا کچھ ضروری نہیں۔ کیونکہ اس وقت نملۃ، نملیۃ کا استعارہ متصور ہوگی۔

نمل قبائل صرف جزیرۃ العرب تک محدود نہیں پاکستان میں بھی اسی عنوان سے

### نمل۔۔۔ پاکستان میں

موجود ہیں۔ میانوالی کے شہر، تحصیلوں، قصبوں اور دیہاتوں میں لاکھوں نہیں تو ان

گنت لوگ بستے ہیں جو اپنے آپ کو "نمل" کہلاتے ہیں۔ سرکاری کاغذات میں انہیں نمل ہی لکھا جاتا ہے بعض علاقوں میں یہ لوگ ملخ بھی کہلاتے ہیں جو دلیل ہے کہ عرب کی طرح یہاں بھی جانوروں اور حشرات کے نام پر انسان متعارف ہوتے تھے۔ ملخ فارسی میں ٹھیک نمل کا ترجمہ ہے "یعنی" (چوٹا) مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ یہ چوٹے ہیں ابھی جانتے ہیں کہ انسان ہیں یہ جس طرح جزیرۃ العرب، شام اور مصر میں چوٹے نہ تھے انسان تھے اسی طرح پاکستان میں بھی چوٹے نہیں اولاد آدم ہی ہیں۔۔۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی توسیع سے پہلے شارع بوذر پر فندق الاخضر (گرین پلس ہوٹل) تھا اس کے قریب ایک بہت بڑی جیولری کی دکان تھی جس پر ایک بہت بڑا اور ڈاویزاں تھا جس پر لکھا تھا۔ "مجر ہرات



مکہ“ (مکہ جیولر) اور دوسری سطر میں تھا صاحبہا عبدالرحمان النملہ (پروپرائٹر عبدالرحمان نملہ) میں نے دیکھا کہ عبدالرحمان چپوٹا نہیں انسان ہے اس سے پوچھا انت انسان ام نملہ (آپ انسان ہیں چپوٹا کیسے بن گئے؟) اس نے فرمایا نملہ ہماری ذات ہے۔ اور پھر وہ ہنستا رہا۔ ناظرین محترم :- اگر علامہ فراہی اگر سید مودودی، اگر علامہ اصلاحی اگر الاستاذ الغامدی نملہ کو انسانی قبیلہ سے موسوم کرتے تو یقیناً واقع تھا کہ ناقد محترم انہیں الفاظ اور مزاج قرآن کے حوالہ سے ہرگز مطعون نہ فرماتے لیکن ان کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا آدمی ہوں مجھے مطعون بنانا ان کی مجبوری تھی۔ والسلام دنیا میں جب کوئی مصنف اپنی تحریر پیش کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے تنقید کا

### استدراکات نمل

نشانہ بنا قبول کر لیا ہے راقم نے واوی نمل پر کسی زمانے میں ایک مضمون لکھا تھا جسے معاصر چٹان نے پورے اہتمام اور دلچسپی سے شائع کیا تھا بعد میں اسی مضمون کو چار عشرے گزرنے پر طلوع اسلام نے بھی شائع کر ڈالا۔ لیکن اب کی بار خوردگیروں کی نظروں سے نہ بچ سکا اور انہوں نے تنقید برائے تنقید کے اصول کی پیروی کرتے ہوئے تنقید کے تیر چلادینے اور یہ ان کا حق تھا لیکن میرے نادیدہ ہم سفروں نے میری تحریک کے بغیر ہی خوردگیروں کو للکار کر پسپا کر دیا۔ اور میں بعد احترام و شکریہ ان کے جو اہر پاروں کو بطور ”استدراک“ میزان القرآن کے دوسرے باب کی زینت بنارہا ہوں اور اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ پہلے استدراک کا نام ہے :

۱۔ نمل منصرف ہوتے ہوئے بھی غیر منصرف ہے۔ (از محمد عصمت ابو سلیم)

۲۔ چپوٹائی اور سلیمان علیہ السلام (ایضاً)

آخر میں یہ کہ خوردگیروں جو اسلامی سنجیدہ فکر کو فروغ دینے کے قائل ہیں ان کی تباہی باللقاب کی گندی عادت پر توجہ دلاؤں گا کہ تباہی کی موجودگی میں سنجیدہ فکری کیسے پروان چڑھ سکتی ہے انہوں نے چھوٹے ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے ”میر و فکر پرویز“ کی گالی دی ہے جبکہ میں میر و فکر محمد سید البشر ہوں ﷺ۔

اگرچہ میں موقر ”طلوع اسلام“ کا باقاعدہ

### نمل منصرف ہوتے ہوئے بھی غیر منصرف ہے

آتا ہے کہ اسکے کسی شمارے میں میری دلچسپی کے کسی موضوع پر کوئی تحقیق شائع ہوئی ہے تو میں وہ شمارہ حاصل کر کے مطالعہ کرنے میں کسی سہل انگاری سے کام نہیں لیتا۔ چنانچہ گذشتہ سال جب علامہ رحمت اللہ طارق کا ایک تحقیقی مقالہ ”طلوع اسلام“ کے تین شماروں اگست، ستمبر اور اکتوبر 1996 میں بعنوان ”واوی نمل کی ہشیار ملکہ“ شائع ہوا تھا، تو میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ علامہ موصوف نے اس موضوع سے متعلق تمام گوشوں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ”نمل“ کو چپوٹائی کے معنی میں نہ لینے پر فکر انگیز قرائن کا انبار لگا دیا ہے۔

وسط اکتوبر 1997 میں مجھے معلوم ہوا کہ موقر مجلہ اشراق لاہور نے علامہ موصوف کے مذکورہ بالا مقالہ کے رد

میں جناب طالب محسن، استاذ کلیۃ حدیث کا مقالہ ”چپوٹائی“ کے عنوان سے شائع کیا ہے اور اس میں علامہ صاحب کے



استدلال کو ہدف تنقید بنایا ہے تو استاد محترم کے افکار سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے اشراق اکتوبر 1997 خرید کر پڑھا۔ اس مقالہ میں جناب طالب محسن کے ایک گزشتہ مضمون کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، چنانچہ وہ بھی تلاش کر کے مطالعہ کیا۔ ان کا اس موضوع پر پہلا مضمون مجلہ اشراق کے شمارہ مئی 1996 میں چھپا تھا۔

چونکہ قارئین ”طلوع اسلام“ علامہ صاحب کی تخلیق سے غوطی واقف ہو چکے ہیں، اس لئے ان کے دلائل کا یہاں اعادہ غیر ضروری ہو گا۔ جناب طالب محسن نے کچھ ایسی باتیں بھی کی ہیں، جنہیں علامہ صاحب نے درخور اعتنا نہیں سمجھا لہذا میں نے اپنے اس مقالہ میں ان باتوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور حتی الوسع اختصار سے کام لیا ہے۔

مازن کا لغوی معنی چوٹیوں کے انڈے (بيض النمل) ہے لیکن اس نام کا ایک قبیلہ بھی ہے۔ چنانچہ ”المنجد فی الاعلام“ میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے :-

”ماذن“ ذکر هذا الاسم في لائحة كبريات القبائل العربية اشهر من عرف منها ماذن تميم و كان منهم الحكم في سوق عكاظ. لم يوردوا عن الاسلام كسانو تميم ساهموا في فتوحات اسبا

(عرب کے بڑے بڑے قبائل کی فہرست میں اس نام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان معروف قبائل میں سے مشہور ترین قبیلہ ماذن تميم ہے۔ عکاظہ منڈی میں ثالث انہیں میں سے ہوتا تھا۔ باقی تميم کی طرح ماذن مرتد نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایشیا کی فتوحات میں بھی حصہ لیا تھا۔ دیوان الحماسہ میں ایک شاعر کہتا ہے :-

لو كنت من ماذن لم تستبح ابلى بنو اللقيطة من ذهل بن شيبانا  
اگر میں (قبیلہ) ماذن سے ہوتا تو ذهل بن شيبان کی رذیل عورت کے بٹے میرے اونٹ لوٹ کر نہ لیجاتے۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں ماذن کیسا تھ بنو، بنی آل یا معطر کا باد (Prefix) موجود نہیں، حالانکہ یہ ایک مشہور عرب قبیلہ ہے۔ یہی حال ”نمل“ کا ہے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے قبیلے ان کے جدا امجد کے نام (امیہ، عباس) پر ہیں امیہ کو امیہ اور عباس کو عباس ہی کہا جائے گا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جدا امجد کا نام قبیلہ کے کسی اور فرد کا نام نہ ہو، مثال کے طور پر، عباس میں متعدد لوگوں کا نام عباس تھا۔ اگر بنی اسد میں کسی شخص کا نام اسد ہو تو اسے اسد کے جائے اسدی نہیں کہا جائے گا۔

اسم علم (Proper name) کسی معین شخص کا نام ہوتا ہے۔ عربی میں بعض اسم علم غیر منصرف ہیں یعنی حالت رفعی میں ان کے آخری حرف پر ایک پیش اور حالت نصبی و حالت جری میں صرف ایک ایک زبر آتی ہے۔ جبکہ منصرف اسماء کے آخر پر دو پیشیں ( ) حالت نصبی میں دو زیریں اور حالت جری میں دو زیریں آتی ہیں۔

غیر منصرف کو منصرف بنانے کی مثالیں

ہوں تو غیر منصرف اسم ہونا ضروری ہے۔ فرعون عربی میں غیر منصرف ہے، جیسے قرآن مجید میں ہے  
واغرقتا آل فرعون (250 تا 251) (اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا) مثل مشہور ہے ہر فرعون نے را موسیٰ اسے  
عربی میں منتقل کرنے پر فرعون کو منصرف استعمال کیا جائے یعنی ہم کہیں گے لکل فرعون موسیٰ  
اگر ایسے کسی نام کی جماعت میں ایک فرد مراولیں، تو ہدایۃ النحو نے اس کی مثال کے طور پر یہ جملے پیش  
کئے ہیں :-

### جاء نى طلحة و طلحة آخر

(میرے پاس طلحہ آیا اور ایک اور طلحہ آیا) قام عمر و عمر آخر (عمر کھڑا ہوا اور عمر جیسا ایک اور عمر  
کھڑا ہوا) ضرب احمد و احمد (احمد نے مارا اور ایک دوسرے احمد نے مارا)۔  
نملۃ بھی طلحہ کے وزن پر اسم علم ہے نملہ کو طلحہ کی طرح نکرہ بنانے کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی قوم (نمل) کی  
ملکہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس قبیلہ کے جد یا جدہ کا نام بھی نملہ ہو۔ اور یہ ملکہ اسی نام کی حامل ہو۔ مثلاً میں آمت کریمہ  
(27/18) کی تشریح میری دانست میں کچھ اس طرح ہوگی۔

حتى اذا اتوا على واد النمل قالت نملۃ (تملكهم) يا ايها النمل ادخلوا مساكنكم (الخ)  
یہاں تک کہ جب وہ (حضرت سلیمان اور انکا لشکر) وادی نمل میں پہنچے تو ایک نملہ نے (جو وادی  
والے نملوں کی ملکہ تھی) کہا ”اے نملو اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔“ (الخ)

دارالعلوم بیروت کی شائع کردہ کتاب ”الشيطان يحكم“ مصطفیٰ محمود کے مقالات پر مشتمل ہے اس میں ان  
کے ایک تحقیقی مقالہ کا نام ”بیت النمل“ ہے جس میں چیونٹیوں کی طرز زندگی پر بڑے دلچسپ پیرائے میں روشنی ڈالی گئی  
ہے چیونٹیوں کے طریق اظہار کے متعلق لکھتے ہیں،

وللنمل لغة يتخاطب بها وبدون هذا التخاطب ما كان يمكن ان يوزع الوظائف و يقيم نظاما اجتماعيا  
تباين فيه الاختصاصيات وعلماء البيولوجيا يقولون لنا ان النمل يتخاطب عن طريق القبلات بلغة  
كيميائية خاصة يغزوها مع العباب ... وبدل الحروف المنطوقة ... هناك درجات و انواع مختلفة من  
المذاق

”چیونٹیوں کا ایک طریقہ اظہار ہے، جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے گفتگو کرتی ہیں۔ اس  
بات چیت کے بغیر چیونٹیوں کیلئے فرائض منصبی کی تقسیم اور مہارت کے مختلف میدانوں پر مشتمل  
ایک اجتماعی نظام قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ ماہرین حیاتیات ہمیں بتاتے ہیں کہ چیونٹیوں کی آپس میں  
گفتگو سوں (کے تبادلے) کے ذریعہ خاص کیمیائی الفاظ میں ہوتی ہے جو چیونٹیاں لعاب دہن  
کے ساتھ نکالتی ہیں اور بولے جانے والے حروف کے بدلہ میں ذائقہ کے مختلف درجے اور

انواع ہوتے ہیں۔“

## اسم جنس کیلئے مذکر واحد کا استعمال

اس اقتباس سے جہاں قارئین کو یہ معلومات حاصل ہو گئی کہ چیونٹیوں کی باہمی گفتگو کا ذریعہ

بوسہ بازی ہے، وہاں یہ بھی ان کے علم میں آئے گا کہ النمل بمعنی چیونٹیاں جب بطور اسم جنس استعمال ہوتا ہے تو اسم جنس کے قاعدہ کے مطابق ان کیلئے مذکر واحد کے صیغے اور ضمیر استعمال کئے جاتے ہیں جیسے اوپر نقل کی گئی عبارت میں بتخاطب، یوزع، یقیم اور یغرز سے ظاہر ہے۔

قارئین نے یہ بھی محسوس کیا ہو گا کہ ماذن کیلئے جو ایک مشہور قبیلہ ہے المنجد فی الاعلام نے جمع مذکر کے ضمیر اور صیغے استعمال کئے ہیں۔ جیسے ”منہم“ میں ”ہم“، ”لم یرتدوا“ اور ”سأهموا“ کیونکہ مراد قبیلہ کے افراد ہیں۔ لیکن بھی ایک قبیلہ ہے لہذا قرآن مجید نے اس قبیلہ کے افراد کے لئے جمع مذکر کے ضمیر اور صیغے استعمال کئے ہیں۔

جہاں تک ”النمل“ کا تعلق ہے تو تفسیر الخازن میں بتایا گیا ہے (النمل) یذکر ویونث وھی مونثہ فی لغة

الحجاز و کذا انثھا اللہ تعالیٰ

نمل مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے حجاز کی لغت میں مونث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اسے

مونث کے صیغے میں بیان فرمایا ہے۔

جانوروں کیلئے جمع مونث کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ قارئین آگے چل کر دیکھیں گے۔ اسی لئے جن تفاسیر نے ”نمل“ کو چیونٹیوں کے معنی میں لیا ہے انہوں نے آیت (28/18) کی تفسیر میں برملا اعتراف کیا ہے کہ ”اصولاً“ ”ادخلوا“ کے بجائے (جو جمع مذکر کا صیغہ ہے) ”ادخلن“ کہنا چاہئے تھا (جو جمع مونث کا صیغہ ہے) علی سبیل المثال خازن میں ہے۔

یا ایہا النمل ادخلوا مساکنکم ولم یقل ادخلن لانه جعل لہم عقولاً کالاد مین فخطوبوا خطاب الادمین و هذا لیس بمستبعد ان یخلق اللہ فیہا عقلاً و نطقاً فانہ قادر علی ذلک۔

اس آیت یا ایہا النمل (الخ) میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ادخلن نہیں فرمایا کیونکہ اللہ عز و جل

نے ان (چیونٹیوں) میں عقل اور صاف بولی کی تخلیق کرنا اللہ جل شانہ کے لئے کوئی بعید از قیاس

بات نہیں کیونکہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔

لیکن قرآن مجید میں تو علیحدہ سے کہیں ذکر نہیں کیا گیا کہ باری تعالیٰ نے چیونٹیوں کو انسان جیسی عقل اور بولی سے نوازا ہوا ہے۔ تفسیر خازن کی یہ توجیہ پکار پکار کر اعلان کر رہی ہے کہ نمل کیلئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمیر استعمال نہیں کئے جاسکتے جب تک یہ نہ مانا جائے کہ انہیں انسانوں جیسی عقل اور زبان عطا کی گئی ہے۔ یہ بات کہ چیونٹی نے کچھ کہا جسے سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام مسکرائے تو یہ بات چیونٹیوں کیلئے جمع مونث کے صیغے اور ضمیر استعمال کر کے بھی

کہلوائی جاسکتی تھی اگر ایسا کیا جاتا تو کسی کو مجال انکار نہ ہوتا کہ متکلم اور مخاطب دونوں بلا شک و شبہ چوئیاں ہیں اللہ تعالیٰ نے جمع مذکر کے صیغے اور ضمیر استعمال فرما کر اولی الالباب اور الذین یعقلون کو غور و تدبر کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔ کیونکہ نمل چوئٹیوں کو بھی کہا جاتا ہے۔

جناب طالب محسن نے اس ضمن میں عظیم نحوی زنجیری کی تفسیر میں سے ان کی ایک عبارت نقل کی ہے۔ جو

یہ ہے،

ولما جعلها قائلۃ والنمل مقولا لهم كما يكون في اولی العقل اجری خطابهم مجری خطابهم

اور جب ”نملہ“ کو قائل بنادیا اور ”نمل“ کو مخاطب، جیسا کہ ذوی العقول میں کہا جاتا ہے تو غیر

ذوی العقول کے خطاب کو ذوی العقول کا خطاب بنادیا۔ (کشاف جلد 3 صفحہ 142)

یہ ترجمہ کر کے جناب طالب محسن تحریر فرماتے ہیں :

اس اقتباس سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ یہاں جمع کے صیغے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ

”نمل“ کے لئے جمع مذکر کی ضمیر استعمال کی ہے۔

بالکل یہی عبارت تفسیر مدارك التنزيل و حقائق التاويل میں بھی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہاں

اس سے پہلے ہے۔ ولم يقل ادخلن لانه (یعنی اور اللہ تعالیٰ نے ”ادخلن“ نہیں کہا کیونکہ) یہ عبارت اس بات کی غماز

ہے کہ چوئٹیوں کیلئے جمع مونث کے صیغے استعمال کئے جانے چاہئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے جمع مذکر کے صیغے استعمال

فرمائے۔ اس کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو تفسیر خازن نے لکھی ہے اور جو قارئین اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں دوسری یہ کہ، ”نمل“

چوئیاں، نہیں بلکہ ایک قبیلہ یا قوم ہے، جو حضرت سلیمان کے عہد میں ایک وادی میں رہتی تھی اور ان کے نام پر ہی وہ

”وادی النمل“ کہلاتی تھی۔

جناب طالب محسن نے یہ نہیں بتایا کہ جمع، مذکر کے صیغے کس سیاق و سباق کی مناسبت سے استعمال ہوئے

ہیں۔ زنجیری نے نمل کیلئے جمع مذکر کے صیغے کا استعمال دیکھ کر مقولا لهم اور پہلے خطابہم میں ”ہم“ کی جمع مذکر کی

ضمیر استعمال کی ہے۔

چوئیاں حشرات میں شمار ہوتی ہیں۔ پرندوں کے زمرہ میں نہیں آتیں۔ جبکہ حضرت سلیمان کو صرف منطق

الطیر کا علم دیئے جانے کا ذکر ہے یقین سے، نہیں کہا جاسکتا کہ مراد طائر بطیر بجناحیہ ہے۔ اس سقم کو محسوس کرتے

ہوئے تفسیر خازن (اور دیگر تفاسیر) میں بتایا گیا ہے کہ وہ چوئٹی جس نے چوئٹیوں کو اپنے اپنے گھروں میں چلے جانے کا

حکم دیا تھا لنگڑی اور دوپروں والی تھی قیل کانت عرجاء و کانت ذات جناحین معلوم، نہیں راویان کرام کو یہ معلومات

کہاں سے حاصل ہوئیں۔ یہی نہیں انہوں نے اس مقام کی تفسیر میں ایک پوری ظلم ہو شر با تصنیف کر رکھی ہے، جس کی

تفصیل میں جانا باعث طوالت ہو گا۔

جناب طالب محسن نے لکھا ہے :

کسی بھی غیر انسان کی طرف قال فعل کا اسناد بالکل درست ہے۔ عربی ادب کی مشہور کتاب کلیۃ و دمنہ جانوروں کے ساتھ قال فعل کے اسناد کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کتاب کی کہانیوں کے کردار بالعموم جانور ہیں۔ لیکن قال فعل کے اسناد سے ان کے جانور ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ کوئی اس بنیاد پر انکار کرے تو ہم ہی نہیں ارباب فکر پر ویز بھی اس کا مذاق اڑا دیں گے۔ (اشراق۔ مئی 1996ء صفحہ 14)

کلیلہ و دمنہ میں جانوروں کی زبان سے حکمت و دانائی پر مبنی سبق آموز فرضی کہانیاں بیان کی گئی ہیں مگر جانوروں کے لئے جمع مذکر کے جائے جمع مونث کے صیغے اور ضمیر استعمال کئے گئے ہیں۔ جبکہ قرآن مجید میں النمل کے لئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمیر استعمال کئے گئے ہیں اور یہ بہت بڑا فرق ہے بہر حال کتاب کلیلہ و دمنہ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

زعموا انه كان في جبل من الجبال شجرة من شجر الدوح فيها وكر الف غراب وعلين وال من انفسهن و كان عند هذه الشجرة كهف فيه الف بومة و عليهن وال منهن فخرج ملك اليوم لبعض غدواته وروحاته و في نفسه العداوة لملك الغربان و في نفس الغربان و ملكها مثل ذلك اليوم. فاغار ملك اليوم في اصحابه على الغربان في اوكارها فقتل و سبي منها خلقا كثيرا و كانت الغارة ليلاً فلما اصبحت الغربان اجتمعت الى ملكها فقلن له: قد علمت ما لقينا الليلة من ملك اليوم و ما منا الا من اصبح قتيلاً او جريحاً او مكسور الجناح او منتوف الريش او مقطوف الذنب و اشد مما اصابنا ضراً جراتهن علينا و علمهن بمكاننا و هن عائدات الينا غير منقطعات عنا لعلمهن بمكاننا فانما نحن لك ايها الملك و لك الراى فانظر لنا و لنفسك (كلیلہ و دمنہ باب اليوم و الغربان صفحہ 255، 256 دار نشر الكتب الاسلامية۔ شارع شیش محل۔ لاہور)

کہتے ہیں ایک پہاڑ میں ایک بوڑھ کا درخت تھا۔ جس میں ایک ہزار کوؤں کے آشیانے تھے اور ان پر انہی میں سے ایک حاکم تھا۔ اس درخت کے پاس ایک غار تھا، جس میں ایک ہزار الور رہتے تھے اور ان پر انہی میں سے ایک حاکم تھا۔ الوؤں کا بادشاہ سیر کیلئے نکلا۔ اس کے دل میں کوؤں کے بادشاہ کیلئے دشمنی تھی۔ کوؤں اور ان کے بادشاہ کے دل میں بھی ایسی ہی عداوت الوؤں کیلئے تھی۔ الوؤں کے بادشاہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوؤں پر ان کے آشیانوں میں چھاپہ مارا اور بہت سے کوئے قتل کئے اور قیدی بنائے۔ یہ اچانک حملہ رات کے وقت کیا گیا تھا صبح ہوئی تو کوئے اپنے بادشاہ کے پاس اکٹھے ہوئے اور اس سے کہا کہ آپ کو یہ تو معلوم ہو چکا ہو گا کہ رات ہمیں الوؤں



کے بادشاہ کی طرف سے کیا گزند پہنچی؟ ہم میں سے کوئی قتل ہو، کوئی زخمی کسی کے پر توڑ ڈالے گئے یا نوچ لئے گئے کسی کی دم کھینچی گئی۔ ہمیں سب سے بڑا نقصان اس بات سے پہنچا کہ الوؤں کو ہمارے خلاف جسارت ہوئی اور انہیں ہماری قیام گاہ کا پتہ چل گیا اور ہماری قیام گاہ سے واقفیت کی بنا پر وہ آئندہ بھی اسی طرح آتے رہیں گے۔ بادشاہ سلامت! ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ ہمارا اور اپنی جان کا خیال کریں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے قارئین نے جان لیا ہو گا کہ کوؤں اور الوؤں کے لئے کہیں بھی جمع مذکر کی ضمیر یا صیغہ استعمال نہیں ہوا۔

باری تعالیٰ کی طرف سے نبل کیلئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمیر کا استعمال عربی زبان کے قواعد سے ہٹ کر تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے بندوں نے اس میدان میں داد۔ تحقیق دی۔ جن میں سے ایک مرحوم و مغفور علامہ عنایت اللہ اثری وزیر آبادی مدرسہ المدینہ عجمرات (پنجاب) ہیں۔ جناب طالب محسن بھی استاد کلیہ حدیث ہیں۔ اثری مرحوم اپنی کتاب البیان المختار کے صفحہ 254 پر رقم طراز ہیں۔

”اور حضرت سلیمانؑ اپنے لشکر سمیت تیار ہو کر اللہ پاک کے بتائے ہوئے علاقہ وادی النمل کی طرف روانہ ہوئے اور منزل منزل ٹھہرتے ہوئے وہاں پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا اور خط بھیج کر وہاں کی رانی کو احکام الہی سے آگاہ فرمایا جس پر اس رانی نے اپنے ارکان دولت کے مشورہ سے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو کر دروازے بند کر دیں تاکہ سلیمانؑ کو معلوم ہو جائے کہ ہم ان کے ساتھ جنگ کیلئے ہرگز تیار نہیں کہ اس میں طرفین کا نقصان ہے کشت و خون اور ملک کی تباہی ہے۔ ورنہ اگر مقابلہ ہوا تو اس کا لشکر بوجہ جار ہے۔ اسے اس رعلم و امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں کہ تمہاری طاقت کتنی ہے اور تم میں بڑا کون ہے اور چھوٹا کون ہے وہ ہم سب کو کچل دے گا۔ پھر یہی مضمون اس نے مسموع اپنے یہاں کے کھجور کے بیڑوں کے نچوڑ اور رس جو کہ گڑ کی طرح منجمد ہوتا ہے، اور ایک خاص قسم کے عمدہ بیروں کے اپنے کسی قاصد کے ذریعے زبانی یا تحریری سلیمانؑ کی طرف بھی روانہ کر دیا جسے پڑھ سن کر آپ مسکرائے اور بہت خوش ہوئے اور سوغات و تحفہ قبول فرمایا۔“

کتاب مذکور کے صفحہ 252 پر حاشیہ لکھا ہے: سلیمانؑ کا یہ سفر تین صورتوں سے خالی نہیں، جن میں سے اول الذکر دو غلط اور تیسری صورت ٹھیک ہے۔ اگر آپ مسموع لشکر تیار ہو کر بمحض چوٹیوں کی زیارت کے لئے گئے تھے تو یہ شان نبوت اور مملکت کے خلاف ہے اور اگر یہ کام رضی ہے اور اصل مقصد کسی قوم پر چڑھائی ہے تو پھر یہ قرآن شریف کی شان کے خلاف ہے کہ اس نے اصل مقصد کا ذکر تک نہیں کیا اور رضی باتوں کا مفصل طور پر بیان کر دیا اور اگر اسی قوم پر

چڑھائی اصل مطلوب ہے جس کا ذکر ہے تو پھر معلوم ہوا کہ یہ عرفی چوئیاں، نہیں بلکہ ایک حرلی قوم ہے جو کہ مطیع ہوئی، جیسے میرے ترجمے سے صاف ظاہر ہے۔ علاوہ اس کے چوئیوں کے بل تو وہاں پر بھی موجود تھے، جہاں سے آپ روانہ ہوئے اور راستہ میں بھی جاچکا موجود تھے اور سب جگہ ہوتے ہیں۔ مگر وادی النمل کتب تفاسیر و لغت کی رو سے ایک مقرر اور مشہور جگہ کا نام ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دائشمند قوم ہے، چوئیاں نہیں، جن کی کوئی آواز ہی نہیں۔ اگر ہے بھی تو کان لگا کر بھی نہ سموع نہیں۔ پھر ایک چوئی کی آواز کو سلیمان و نیز سب چوئیوں نے اپنی اپنی جگہ پر سن لیا کوئی قرین قیاس بات نہیں علاوہ ازیں ابو داؤد میں ہے کہ

ورای قرية نمل قد حرقناها قال من حرق هذه؟ فقلنا نحن قال انه لا ينبغي ان يعذب بالنار الا رب النار صحابہ کرامؓ نے نمل کے گاؤں میں آگ لگا دی تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ آپ لوگوں نے غلط کیا ہے۔ جنگی مقابلہ میں حرلی دشمنوں کے قتل کی اجازت ہے۔ آگ سے جلانا ٹھیک نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بستی میں نمل قوم کے لوگ آباد تھے۔ ورنہ عرفی چوئیوں کو خدا کے ناری یا غیر ناری عذاب سے کیا مطلب ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ 254 پر حاشیہ میں ہے۔

قاموس میں ہے کہ والا بوقه (ماء) من مياه نمله (نملہ کے پانیوں میں سے ایک پانی کا نام ابرقہ ہے اور قاموس میں ہے کہ مدینہ کے قریب بھی ایک پانی ہے، جس کا نام ”نمل“ ہے اور ان عرب میں ایک شخص کے نام پر ایک قوم آباد ہے۔ حالانکہ اس کے معنی جیسا کہ قاموس میں ہے والماذن كصاحب بيض النمل چوئیوں کے انڈے کے ہیں۔

جناب طالب محسن اشراق مئی 96 کے صفحہ 20 پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ارباب فکر پر دیر اگر تامل سے کام لیتے تو انہیں قرآن مجید ہی میں جمع مکسر غیر ذوی العقول کے ساتھ مذکر کے صیغے کی مثال مل جاتی اور وہ غیر ذوی العقول سے متعلق قاعدے کی مثال دینے کی زحمت سے بچ جاتے مثلاً سورہ اسراء میں ہے۔

تسبح له السموات السبع و الارض و من فيهن وان من شئ الا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم 1۔ اس آیت کا آغاز واحد مونث کے صیغے سے ہوا ہے اور آیت کے آخر میں جمع مذکر کی ضمیر ”ہم“ استعمال کی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کا ارشاد نقل ہوا ہے :

اذ قال لا بیه وقومہ ما هذه التماثيل التي انتم لها عاكفون

2۔ اس میں مونث اسم اشارہ اور مونث ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ لیکن آگے چل کر جہاں حضرت ابراہیمؑ کا ان کو توڑنے کا ذکر ہوا ہے :

تا الله لا كيدن اصنامكم بعد ان تولوا مدبرين فجعلهم جذذا الا كبير الهم

3۔ اس میں انہی تماثل و اصنام کے لئے جمع مذکر کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ واقعہ آ کے بڑھتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے

معارضے کے جواب میں ان کے مخاطب کہتے ہیں :

لقد علمت ما هو لاء ينطقون

4۔ اس ٹکڑے میں انہی کے لئے فعل کا جمع مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

جناب طالب محسن کے مندرجہ بالا استدلال پر گفتگو سے قبل انہوں نے اوپر جن نمبروں سے آیات کا ترجمہ

حاشیہ میں دیا ہے وہ نیچے ملاحظہ ہو :

1۔ 17/44 زمین و آسمان اور ان میں جو کچھ ہے وہ اس کی تسبیح کرتے ہیں کوئی شے نہیں جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے ہو۔

2۔ 21/52 جب اس نے اپنے باپ سے کہا یہ کیا مورتیاں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو۔

3۔ 21/57-58 خدا کی قسم جب تم یہاں سے رخصت ہو کر لوٹو گے تو میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا۔

4۔ 21/65 تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔

جناب طالب محسن نے پہلی آیت 17/44 میں ومن فیہن کا ترجمہ ”اور ان میں جو کچھ ہے“ کیا ہے جو قطعاً غلط

ہے۔ اگر تسامع نہیں تو شدید قسم کی مغالطہ آفرینی کی ناپسندیدہ کوشش ہے۔ اس ٹکڑے کا صحیح ترجمہ ”اور ان میں جو لوگ ہیں“ ہی تفسیر خازن کے مطابق یہ لوگ ملائکہ، انس اور جن ہیں اور آیت کے آخر میں اسی ”من“ کی وجہ سے نسیحہم کہا گیا ہے، جس میں تغلیبات آسمانوں اور زمین میں رہنے والوں کے علاوہ خود آسمان اور زمین بھی شامل ہیں۔

جہاں تک دوسری آیت یعنی 21/52 کا تعلق ہے تو اس میں بھی طالب صاحب نے وقومہ کا ترجمہ نہیں کیا۔

اسے ہمو پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اگلی آیت 21/52 میں حضرت ابراہیمؑ کے والد اور قوم کی طرف سے جواب دیا گیا ہے

قالوا وجدنا ابناء نالہا عبدین

ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔

اس کی تشریح کے طور پر تفسیر خازن میں ہے :

فاقتدینا بہم

چنانچہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل پڑے۔

گویا انہوں نے کہا کہ اپنے آباء اجداد کی تقلید میں ہم نے بھی ان مورتیوں کو معبود بنا لیا۔ لہذا لا کیدن

اصنامکم کا مطلب ہے لا کیدن اصنامکم الی اتخذتموها الہة

میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا (جنہیں تم نے معبود بنا رکھا ہے) اس وجہ سے فجعلہم

میں ”ہم“ کی ضمیر جمع مذکر لائی گئی جو الہة کی طرف لوٹتی ہے جو اصنام میں مشتمل تھے۔

اس کے بعد جناب طالب محسن کچھ آیات چھوڑ گئے کیونکہ ان سے ان کے دعویٰ کا ابطال ہوتا تھا وہ آیات مع ترجمہ ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

قالوا من فعل هذا بالهتانا انه لمن الظالمين O قالو سمعنا فتى يذكرهم يقال له ابراهيم O قالوا فاتوا به على اعين الناس لعلهم يشهدون O قالوا انت فعلت هذا بالهتانا يا ابراهيم O

کہنے لگے ہمارے معبودوں کے ساتھ کس نے یہ کام کیا ہے۔ یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔  
(لوگوں نے) کہا ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا۔ اسے ابراہیمؑ کہا جاتا ہے۔ کہنے لگے۔ اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تا کہ وہ گواہی دیں۔ (انہوں نے) کہا۔ ”اے ابراہیمؑ کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟“  
(21/59-62)

ان آیات سے واضح ہے کہ وہ اپنے بتوں کے بجائے اپنے معبودوں کی بات کر رہے تھے۔ اس لئے ماہو لاء ينطقون میں ہو لاء کا اسم اشارہ ينطقون کا جمع مذکر کا صیغہ ان لوگوں کے معبودوں کے لئے استعمال ہوا ہے اس کی مزید تائید آیات 93-37/91 سے ہوتی ہے، جہاں ارشاد ہے :

فراغ الى الهتهم فقال الا تاكلون مالكم لا تنطقون. فراغ عليهم ضربا باليمين.  
سو وہ ان کے معبودوں کی طرف متوجہ ہو اور کہا کیا تم کھاتے نہیں۔ تمہیں کیا ہوا تم بولتے نہیں۔  
پھر ان کو زور سے مارنے کی طرف متوجہ ہوا۔

جناب طالب محسن نے اشراق اکتوبر 1997ء کے شمارہ میں صفحہ 39 پر لکھا ہے :  
ہمارے نزدیک اصحاب پر دیز کی غلطی ہی یہ ہے کہ وہ اصل میں قرآن مجید کے الفاظ کی حاکمیت نہیں مانتے اور ہم انہیں اسی وجہ سے قرآن کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس جرم کا ارتکاب اگر کسی اور سے بھی ہو تو وہ بھی اس دعوت کا مستحق ہے۔ خواہ وہ ہمارا ممدوح بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ اشراق کے فائل ہماری اس روٹ پر گواہ ہیں۔ مولانا مودودی ہوں یا مولانا اصلاحی یا گزرے زمانوں کا کوئی بڑا امام، اگر ہم نے اس کی کسی بات کو خلاف قرآن پایا ہے یا ہم نے محسوس کیا ہے کہ وہ الفاظ قرآنی کو کھینچ تان کر اپنی کسی رائے کے حق میں پیش کر رہا ہے۔ تو ہم نے اس سے بھی یہی گزارش کی ہے کہ وہ قرآن مجید کی حاکمیت کو بے چون و چرا مان لے۔

یقیناً قرآن مجید کی حاکمیت تسلیم کے بغیر چارہ نہیں لیکن جناب طالب محسن ایک مدرسہ فکر کے نمائندہ ہیں اور اس کے فکر کو ہی صحیح قرار دیتے ہیں اگر ان کے معتب فکر کے کسی عقیدہ یا فکر کے خلاف کوئی تحقیق مظهر عام پر آتی ہے، تو خواہ وہ سنت اللہ کے عین مطابق ہو اور بتائیں قرآن کی عظمت کی مظهر، یہ معتب فکر اس کے خلاف محاذ قائم کر لیتا ہے۔ کیا فعل کیلئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمیر کے استعمال کی حاکمیت تسلیم کرنا اس لئے غلط ہے کہ ڈکشنری میں اس کا معنی

”چیونٹیاں“ لکھا ہوا ہے؟ فہمذاچیونٹیوں کے معنی میں لینا قرآن حکیم کے الفاظ کی حاکیت تسلیم کرنا ہے؟ کیا ”من فیہن“ کا ترجمہ اور ان میں جو کچھ ہے، کرنا بھی قرآن کے الفاظ کی حاکیت تسلیم کرنا اس لئے ہوگا کہ یہ ترجمہ جناب طالب محسن کا ہے؟ اور غیر ذوی العقول کے لئے جمع مذکر کے صیغے یا ضمیر کا قرآن میں استعمال ثابت کرنے کیلئے آیات کی آیت نظر انداز کر دینا بھی قرآن کے الفاظ کی حاکیت تسلیم کرنے کے مترادف ہے؟

قرآن مجید میں قانونِ الہی لا تبدیل لخلقِ اللہ مذکور ہے۔ کیا اس کی حاکیت تسلیم کرنا بھی ضروری نہیں؟ جناب طالب کے مقالہ سے مذکورہ بالا اقتباس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اکلوتے ماہر قرآنیات

ہیں۔ اور فہم میں غلطی سے مبرا ہیں۔ فہل هناك من لا یخطی من البشر؟



## چیونٹی اور سلیمان

قرآن حکیم میں ”نمل“ کا لفظ اس کے عام لغوی معنی (چیونٹیاں) میں استعمال ہوا ہے یا اس سے اس نام کا ایک قبیلہ یا قوم مراد ہے؟ یہ مسئلہ عرصہ سے ماہنامہ ”اشراق“ اور مجلہ ”طلوع اسلام“ کے مابین موضوع بحث ہے۔ اگست، ستمبر اور اکتوبر 1996ء میں جب علامہ رحمت اللہ طارق کا ایک مقالہ موخر الذکر مجلہ میں رتین اقساط میں شائع ہوا تو اس موضوع سے دلچسپی کے باعث میں نے یہ شمارے حاصل کر کے مطالعہ کئے۔ مقالہ مدلل تھا۔ تاہم ”اشراق“ کا اس سے اطمینان نہیں ہوا اور اس نے اپنے اعتراضات از سر نو دہرائے۔ مجھے معلوم ہوا تو اس ماہنامہ کے مئی 1996ء اور اکتوبر 1997ء کے شمارے خرید کر پڑھے۔ یہ دونوں مقالے جناب طالب محسن استاد کلیہ حدیث کے قلم سے تھے۔ میں نے بعض اعتراضات رقع کرنے کی اپنی کوشش کے طور پر ”چیونٹی“ کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا، جو مجلہ ”طلوع اسلام“ کے جنوری 1998ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اب جناب طالب محسن نے ”اشراق“ اگست 1998ء میں ”سلسلہ چیونٹی“ کے عنوان سے میرے مذکورہ بالا مقالہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

”اس مضمون میں پہلی مرتبہ متوسلین پرویز کی طرف سے میرے استدلال کے اصل نکات کا

جائزہ لینے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ میں نے کسی کتاب یا رسالہ میں سورہ النمل کی آیت 18 کا پرویز مرحوم کی طرف سے کیا گیا کوئی ترجمہ، اس کی کوئی تشریح یا توضیح یا اس بارے میں ان کی کوئی تحقیق آج تک نہیں پڑھی۔ مجلہ ”طلوع اسلام“ کا مطالعہ کرنے کا بھی بھی کبھی اتفاق ہوتا تھا۔ اس میں میرے مذکورہ بالا مقالہ کی اشاعت کے بعد رسالہ کے ناظم اور مدیر مسئول جناب محمد لطیف چوہدری کی مہربانی سے یہ پرچہ اب مجھے باقاعدگی سے ارسال کیا جا رہا ہے، جس کیلئے میں چوہدری صاحب اور ادارہ ”طلوع اسلام“ کا ممنون ہوں۔ اس پس منظر میں کلیہ حدیث میں استاد کے منصب عالی پر فائز جناب طالب محسن کا



مجھے یکے از متوسلین پر ویز کے لقب سے ملقب کرنا کسی طرح مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جہاں تک علامہ رحمت اللہ طارق صاحب کا تعلق ہے تو وہ ایک آزاد خیال محقق ہیں۔ علامہ عنایت اللہ اثری مرحوم کی تحقیق بھی مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دونوں عالم پر ویز مرحوم کے ہمعصر رہے۔ ان سے قبل عظیم مفکر قرآن خواجہ احمد الدین امرتسری بھی اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ نمل ایک انسانی گروہ ہے جس سے واضح ہے کہ اس موضوع پر پر ویز مرحوم منفرد نہیں تھے۔

آئیے اب دیکھیں کہ جناب طالب محسن نے میرے مقالہ پر کیا موقف اختیار کیا ہے۔ جناب طالب کا اصرار تھا کہ اگر ”نمل“ کسی قبیلہ کا نام ہوتا تو اس کے ساتھ ”و“ وغیرہ کا لفظ ہونا چاہئے تھا۔ میں نے نظم و نثر سے اقتباسات پیش کر کے ثابت کیا کہ اس قسم کا ساہلہ ضروری نہیں۔

**اسم نسبت کا استعمال؟** محترم طالب محسن نے اب یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ قبیلہ کا نام کسی ساہلہ کے بغیر لکھا اور بولا جاتا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ اگر کسی شخص کا نام بھی وہی ہو جو اس کے قبیلہ کا ہے تو اس صورت میں اسم نسبت استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس ضمن میں میں نے یہ مثال پیش کی تھی کہ قبیلہ اسد کے کسی فرد کا نام بھی اسد ہو تو اسے اسد ہی کہا جائے گا، اسدی نہیں۔ لیکن پھر سوال داغ دیا ہے کہ قبیلہ کا نام اگر نمل ہے تو پھر ”نملہ“ کیا ہے اور اگر نملہ ہے تو پھر نمل کس بلا کا نام ہے۔ جناب محترم! اگر نمل نامی کسی قبیلہ کے کسی فرد (مذکورہ مومن) کا نام نملہ ہو تو آپ کیا کہیں گے؟ کیا اس صورت میں بھی اپنے مشہور زمانہ قاعدہ کا اندھا دھند اطلاق کرتے ہوئے اسے جبراً نمل کر کیلئے نمل اور مومن کیلئے مملیہ کہنے پر اصرار کریں گے؟

النملہ میں ہے۔ الزنج والزنج جمع زنج۔ قوم من السودان واحد هم زنجی وقد يقال له زنج۔ ایک رجبی قوم واحد کوزنجی اور کبھی زنج بھی کہا جاتا ہے۔ اس مثال سے صرف یہ حقیقت ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہر لفظ کا واحد جمع کا قاعدہ یکساں نہیں لہذا سب پر ایک ہی قاعدہ کا اطلاق کرنا درست نہیں ہوگا۔

**اعتراف لیکن** 2۔ جناب طالب محسن کا اصرار تھا کہ نملہ اگر اسم علم ہے تو عربی قواعد کی رو سے غیر منصرف ہے۔ جبکہ قرآن حکیم میں نملہ منصرف استعمال ہوا ہے۔ اس پر میں نے غیر منصرف اسماء علم کے قواعد سے ثابت کیا تھا کہ ایسے اسماء منصرف بھی استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب موصوف نے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ نملہ تنوین کے باوجود علم ہو سکتا ہے اور یہ قاعدہ درست ہے لیکن ساتھ ہی کہا ہے کہ اس قاعدے کا اطلاق اس آئیہ کریمہ پر کسی طرح بھی درست نہیں اور یہ کہ اس آئیہ کریمہ میں نملہ اگر اسم علم ہے تو اس کو نکرہ استعمال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں توجیہ کی ہے کہ جب کوئی علم نکرہ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے درحقیقت وہ شخص نہیں اس کی صفات مراد ہوتی ہیں، جبکہ اس آیت میں نملہ سے مراد اس لفظ سے موسوم اصل فرد کی ذات ہی ہونی چاہئے اور مزید لکھا ہے کہ اس قاعدے کے تحت جو اسماء علم استعمال کئے جاتے ہیں ان کی متعلقہ صفات مخاطب پر پوری طرح واضح ہوتی ہیں جبکہ نملہ

نامی کسی ملکہ کی صفات تو کیا اس کا نام بھی عرب قبائل کی تاریخ میں معروف نہیں۔ ایسی ملکہ کو دریافت کرنا بھی تک غیر معمولی تحقیقات کا متقاضی ہے چنانچہ کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے اسے علم قرار دینا ممکن نہیں۔

یہاں جناب طالب محسن نے غلط بحث بھی کیا ہے اور مغالطہ سے بھی کام لیا ہے۔ اس خاکسار نے غیر منصرف اسماء علم کو نکرہ بنانے کی دو مثالیں دی تھیں۔

1- یہ کہ اگر، معین، شخص کی صفات کا حامل کوئی اور بھی ہو یا ہوں۔

2- یہ کہ ایسے کسی نام کی جماعت کا ایک فرد مراد ہو۔

میں نے دوسری مثال کے تحت ”نملہ“ کا ذکر کیا تھا۔ جناب محسن کا سارا استدلال صرف پہلی مثال کے گرد گھوم رہا ہے، فلہذا غیر متعلق ہے۔ جہاں تک نملہ کے ملکہ ہونے کا تعلق ہے تو اس اشارہ زیر بحث آیت میں اس کا اپنی قوم سے یہ کہنے سے ملتا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ اسی بنا پر میں نے زیر بحث آیت کی تشریح اس طرح کی تھی،

قالت نملۃ (تملکھم) یا ایہا النمل ادخلوا مساکنکم .....

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نملہ نامی ملکہ کی صفات تو کیا اس کا نام عرب قبائل کی تاریخ میں معروف نہیں الخ۔

تو عرض ہے کہ تاریخ میں کسی کا عدم ذکر اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتا۔

علامہ رحمت اللہ طارق اور علامہ عنایت اللہ اثری مرحوم نے ”نمل“ قوم کے متعلق بہت سے تاریخی حوالے دیے ہیں (طلوع اسلام اگست، ستمبر 1996ء اور جنوری 1998ء)۔ ان پر جناب طالب محسن نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

جناب طالب محسن نے (اثری - مئی 1996ء صفحہ 24-25)، تفہیم القرآن میں سورہ ”نمل“ کے اس مقام کی تشریح کے طور پر جیوش (Jewish) انسائیکلو پیڈیا کے حوالہ سے مودودی صاحب کے نوٹ کا یہ اقتباس پیش کیا ہے۔

”بنی اسرائیل کی روایات میں بھی یہ قصہ پایا جاتا ہے۔ مگر اس کا آخری حصہ قرآن کے خلاف اور حضرت سلیمانؑ کی شان کے بھی خلاف ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جب ایک وادی سے گزر رہے تھے، جس میں چیونٹیاں بہت تھیں، تو انہوں نے سنا کہ ایک چیونٹی پکار کر دوسری چیونٹیوں سے کہہ رہی ہے کہ اپنے گھروں میں گھس جاؤ ورنہ سلیمانؑ کے لشکر تمہیں کچل ڈالینگے۔ اس پر حضرت سلیمانؑ نے اس چیونٹی کے سامنے بڑے تکبر کا اظہار کیا اور جواب میں چیونٹی نے ان سے کہا تمہاری حقیقت کیا ہے۔ ایک حقیر بوند سے تو تم پیدا ہوئے ہو۔“

(ج 11 ص 43)

اس اقتباس کی تشریح کرتے ہوئے جناب طالب محسن نے لکھا ہے :

”قرآن مجید اور اسرائیلی روایت میں چیونٹی سے متعلق حصہ میں مکمل اتفاق ہے۔ جس طرح اللہ

تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے بارے میں صحیح بات بیان کر کے اس بات کی تردید کر دی کہ حضرت سلیمانؑ نے چوٹی کے سامنے تکبر کا اظہار کیا تھا، اسی طرح اس غلطی کی بھی اصلاح ہونی چاہئے تھی۔ کہ ”نمل“ سے چوٹیاں نہیں انسانی گروہ سراد ہے۔“

هذه سذاجة مابعد ها سذاجة. قرآن مجید نے اس بات کی تردید کی ہے کہ وادی میں چوٹیاں تھیں۔ جبھی تو زبرِ بحث آیت میں نمل کیلئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمائر استعمال فرمائے۔ اس لطیف انداز کی تردید کی وجہ سے قرآن کریم کو یہ نہیں کہنا پڑا کہ ”نمل“ سے چوٹیاں، نہیں انسانی گروہ سراد ہے۔ کیا طالب محسن صاحب ازراہ کرم بتائیں گے کہ حضرت سلیمانؑ کی طرف سے چوٹی کے سامنے تکبر کے اظہار کی تردید اس آیت میں کہاں ہے؟

ضمناً قرآن مجید کے خوبصورت اندازِ تردید کی ایک اور مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے :

تورات میں ہے : ”اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ اس نے کہا، لارٹھی۔ پھر اس نے کہا، اسے زمین پر ڈال دے۔ اس نے اسے زمین پر ڈالا اور وہ سانپ بن گئی اور موسیٰؑ اس کے سامنے سے بھاگا۔ تب خداوند نے موسیٰؑ سے کہا، ہاتھ بڑھا کر اس کی دم پکڑ لے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ اسکے ہاتھ میں لارٹھی بن گیا۔ (خروج باب 4 آیت 5-2)

عربی تورات میں ”وہ سانپ بن گئی“ کیلئے ”صارت حية“ ہاتھ بڑھا کر اس کی دم پکڑنے کیلئے مدیدک وامسك بذنبھا اور ”وہ سانپ اس کے ہاتھ میں لارٹھی بن گیا“ کیلئے فصارت عصافی يدہ کے جملے دیئے گئے ہیں۔

قرآن مجید میں اس کی توضیح یوں کی گئی۔ والقی عصاك فللما راها تهتز كانها جان ولي مدبرا ولم يعقب تم اپنا عصا (زمین پر) ڈال دو، سو جب انہوں نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور سر کر بھی نہ دیکھا۔ (ترجمہ مولانا شرف علی تھانویؒ 10:27)

یعنی لارٹھی نہ سانپ بنی اور نہ ہی اس کی کوئی دم تھی۔ قرآن مجید نے یہ کہنے کے بجائے کہ یہ غلط ہے کہ لارٹھی سانپ بن گئی تھی اور اسکے کوئی دم بھی لگ گئی تھی، محض لارٹھی کو اس طرح ہلتے دیکھ کر جیسے وہ سانپ ہو، موسیٰؑ پیٹھ پھیر کر بھاگے، کہہ کر تردید کر دی۔

3۔ میں نے مصطفیٰ محمود کی کتاب سے جو اقتباس درج کیا تھا، اس کے متعلق بتایا تھا چوٹیوں کے معنی میں ”نمل“ کیلئے اسم جنس ہونے کی بنا پر واحد مذکر کے صیغے اور ضمائر استعمال کئے گئے ہیں۔ جناب طالب محسن نے صرف مذکر لکھا جو صحیح نہیں اور غلط، فنی کا باعث ہو سکتا ہے۔

جناب طالب محسن نے یہ بتانے کے بعد کہ میں نے کلیلہ و دمنہ (مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، شیش محل روڈ، لاہور) سے ایک اقتباس بھی درج کیا ہے، جس میں جانوروں کیلئے مونث کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں، درآں جائیکہ اسی ایڈیشن میں وہ مقامات بھی ہیں، جہاں جانوروں کیلئے مذکر کے صیغے بھی آئے ہیں، مثلاً

زعموا ان جماعة من القردة كانوا سكنا في جبل فالتمسوا في ليلة باردة ذات رياح و مطار ناراً فلم يجدوا.

کہتے ہیں کہ بندروں کا ایک گروہ پہاڑ پر رہتا تھا۔ ایک ٹھنڈی رات جس میں ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور بہت بارش ہو رہی تھی، انہوں نے آگ تلاش کی مگر انہیں، نہیں ملی۔

(ص۔ 190)

یہ مثال درج کر کے جناب طالب محسن نے لکھا ہے :

”ہمیں حیرت ہے کہ ابو سلیم صاحب نے کتاب کھولی، لیکن ان کی نظر صرف اسی صفحہ پر پڑی جس میں مونث کے صیغے استعمال کئے گئے تھے اور وہ مقامات انہیں نظر نہ آ سکے، جن میں جانوروں ہی کیلئے مذکر کے صیغے درج تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارباب فکر پرویز کی طرف سے اس معاملہ میں اصرار بالکل بے جا ہے۔“

یہ صحیح ہے کہ میں نے جناب طالب محسن کے چوٹی کے موضوع پر مضمون کا جواب دینے کیلئے کلیلہ و دمنہ خریدی اور مجھے باب البوم و الغریبان میں الوڈوں اور کوڈوں کے متعلق واحد اور جمع مونث کے شمار اور صیغے مل گئے اور میں نے اسی پر اکتفا کیا، جس کا اغلب باعث مندرجہ ذیل وجوہات تھیں :

1۔ قرآن مجید میں جانوروں کیلئے مونث کے صیغوں اور شمار کا استعمال کیا گیا ہے، جیسے مثلاً سورہ النحل میں ہے :

والانعام خلقها لكم فيها دف و منافع ومنها تاكلمون. ولكم فيها جمال حين تريحون و حين تسرحون. و تحمل الثقالكم الى بلد لم تكنوا بباليه الا بشق الا نفس ان ربكم لرؤف رحيم. والخييل و البغال و الحمير لتر كبوها و زينة و يخلق ما لا تعلمون.

اور اسی نے چوپایوں کو بنایا۔ ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان میں سے کھاتے بھی ہو اور ان کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جبکہ (ان کو) شام کے وقت لاتے ہو اور جبکہ (ان کو) صبح کے وقت چھوڑتے ہو اور وہ تمہارے بوجھ بھی (لا دکر) ایسے شر کو لے جاتے ہیں، جہاں تم بدون جان کو محنت میں ڈالے ہوئے (خود بھی) نہیں پہنچ سکتے تھے۔ واقعی تمہارا رب بڑی شفقت والا اور رحمت والا ہے۔ اور گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور نیز زینت کیلئے بھی۔ (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ 8-16:5)

2۔ نمل کے متعلق تفسیر خازن اور تفسیر مدارک التریل میں پڑھ رکھا تھا کہ چوہنیوں کیلئے ادخلن کا صیغہ آنا چاہئے تھا۔ اور ادخلوا کے متعلق جو توجیہ کی گئی تھی وہ بلا جواز تھی۔

3۔ اسم جنس کا قاعدہ بھی معلوم تھا۔ قرآن مجید میں ہے۔ ان البقر تشابه علينا۔

(2:70)

بلاشبہ ایسے ساڈ (دنیا میں کثیر ہونے کے سبب) ہم پر مشتبہ ہیں۔

یہاں ہر کے اسم جنس ہونے کی وجہ سے تشابہ کا واحد مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

جہاں تک جناب طالب محسن کے کلیلہ و دمنہ سے دیئے گئے مندرجہ بالا اقتباس کا تعلق ہے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں ہمدروں کیلئے نہیں بلکہ ہمدروں کے ایک گروہ کے افراد کیلئے جمع مذکر کے صیغہ استعمال ہوئے ہیں جیسے قرآن مجید میں ہے۔ ان طائفان من المؤمنین اقتلوا۔

(مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ 49:9)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں۔

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کے دو گروہوں کا ذکر کر کے ان کے افراد کیلئے جمع مذکر کا صیغہ لایا گیا ہے۔ کتاب کلیلہ و دمنہ میں واقعی بعض مقامات پر جانوروں کیلئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمائر بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ کتاب قوت گویائی کی صلاحیت سے محروم جانوروں (بہائم غیر ناطقہ) سے خیالی طور پر منسوب کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں کو زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز بنانے کیلئے بعض مقامات پر کچھ جانوروں کو آدمیوں کے روپ میں پیش کرنے کیلئے ان کیلئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمائر استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ بات مفسرین کہ علم سے باہر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے علی الرغم انہوں نے چوہنیوں کیلئے جمع مذکر کے صیغوں اور ضمائر کے استعمال کیلئے جواز کے طور پر یہ خیالی وجہ گھڑی کہ اللہ تعالیٰ نے چوہنیوں کو آدمیوں جیسی عقل سے سرفراز کیا تھا۔

12 اگست 1998ء کو اسلام آباد سے لاہور آنے کیلئے، پیر دوہائی کے جنرل بس سٹینڈ سے، میں بس پر سوار ہوا اور دوران سفر مطالعہ کیلئے ”روزنامہ اساس“ خرید لیا۔ اہم خبریں اور مضامین پڑھے۔ ایک کا عنوان تھا ”کھنگول کا چوہا“۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مضمون نگار نے بھوک سے بے حال اپنے بیٹے کی تسلی کے لئے ٹیپ ریکارڈر چلا کر وہاں کی ریکارڈنگ ڈاؤن لوڈ کرنے کی کوشش کی تو بیٹے نے کہا اسے ردی چاہیے۔ ردی نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔ مجبوراً مضمون نویس روٹی کی تلاش میں نکلا۔ حکومت کے سب دروازے بند پائے ایک کو کھٹکھٹایا تو اس میں ”جلاد نما شخص نکلا۔ یہ ایس ایس پی تھا۔ دوسرے پہ دستک دی تو ایک دیو بھل آدمی باہر آیا۔ یہ انکم ٹیکس انسپکٹر تھا۔ تیسرا دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک ہمدرد نما شخص برآمد ہوا۔ جو محکمہ تعلیم کا ڈپٹی سیکرٹری تھا۔ اس میں سے کسی نے اس کا مسئلہ حل نہ کیا۔ بلکہ الٹا ڈر لیا اور دھمکیاں۔ چنانچہ دل شکستہ ہو کر صاحب مضمون ایک فٹ پاتھ پر جا بیٹھا۔ قریب ہی ایک فقیر لینا خرانے لے رہا تھا۔ پہلو میں کھنگول رکھا تھا۔ مضمون کے لکھنے والے نے کھنگول میں ہاتھ ڈالا تو کسی چیز نے اس کی انگلی میں کاٹ لیا۔ جھانک کر دیکھا تو کھنگول میں ایک چوہا بیٹھا تھا۔ دریافت کرنے پر چوہے نے بتایا کہ فقیر اور درخت کے نیچے بیٹھے چار آدمی حکومت کے خاص نمائندے ہیں۔ اور دوسرے ملکوں سے امداد، خیرات، زکوٰۃ اور چندے لانے پر مامور ہیں۔ فقیر کو انگریزی نہیں آتی اس کی جگہ وہ انگریزی بولتا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ طنز بڑا زبردست ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ چوہا بول سکتا ہے یا اس نے بول کر یہ سب باتیں بتائی تھیں۔ پرلے درجے کی بے عقلی ہوگی۔ طاقت گویائی سے محروم سب جانوروں، چرندوں، درندوں،



پر ندوں اور حشرات الارض سے نسبت منکسر خیالی اور فرضی ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض کیلئے جمع مذکر کے صیغے اور ضمائر استعمال کر لئے جائیں جو ذوی العقول کے لئے مخصوص ہیں، تو اس سے یہ سمجھنے لگنا کہ وہ ناطق ہیں یا وقتی طور پر ناطق بن گئے، سادگی کی انتہا ہے یا پھر لول درجے کا دجل ہے۔ اور لوگوں کو بے وقوف بنائے رکھنے کی نہایت گھناؤنی سازش۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ خالق ارض و سماء نے آیت زیر بحث میں کلام کی اس قسم کی صفت سے کام لیا ہوگا۔ اور انزال البہائم والحشرات منزلة الرجال کا اسلوب اختیار فرمایا ہوگا۔ سبحانہ و تعالیٰ عما یصفون۔

4۔ جناب طالب محسن نے اپنے بعض تسامحات کی طرف توجہ دلانے پر شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”تکلم“ کی ضمیر انسانوں، جنات یا فرشتوں کیلئے نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی گئی۔

5۔ طالب صاحب نے لکھا ہے، ”ہم نے اپنے مضمون میں قرآن مجید سے غیر ذوی العقول کیلئے مذکر کے صیغوں کی مثال دی تھی۔ ابو سلیم صاحب نے ہماری اس مثال کو یہ کہہ کر غلط قرار دینے کی کوشش کی ہے کہ مذکر ضمائر کی وجہ ان کا ”اللہ“ ہونا ہے۔ یہ بات درست ہے۔ لیکن آخر انہی کیلئے اس سلسلہ آیات میں مونث ضمائر بھی موجود ہیں کیا اس وقت وہ ”اللہ“ نہیں تھے؟ اصل میں غیر ذوی العقول کی اصطلاح ایک نحوی اصطلاح ہے۔ اس سے کسی معنی کے اثبات کے لئے استشہاد کرنا کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ یہ استشہاد طالب محسن صاحب نے ہی کیا تھا اور جب اس کی غلطی واضح کی گئی تو اب یہ فیصلہ صادر کر دیا۔ جہاں تک سورہ الانبیاء کی آیت 52 تا 65 کا تعلق ہے تو پہلی آیت میں تماشیل کیلئے مونث کا صیغہ استعمال ہوا جن پر حضرت ابراہیمؑ کے عہد کے لوگ جہے پیٹھے تھے۔ اگلی آیت میں بھی تماشیل کیلئے مونث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اس میں لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بتایا کہ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کو ان کی پوجا کرتے پایا نتیجہ انہوں نے بھی انہیں معبود مان لیا۔ چنانچہ آیت 58 میں ان اصنام کیلئے جنہیں حضرت ابراہیمؑ کے عہد کے لوگوں نے معبود مان رکھا تھا جمع مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا وھلم جہا۔

6۔ طالب محسن صاحب نے یہ بھی تحریر کیا کہ قرآن مجید میں آیہ کریمہ لا تبدیل لخلق اللہ مادی قوانین کے غیر متبدل ہونے کے معنی میں نہیں ہے۔ پھر لکھا ہے کہ برائے بحث اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ جو قوانین انسانوں نے دریافت کئے ہیں وہ اپنی حتمی اور آخری شکل میں دریافت ہو چکے ہیں۔ اور اب ان کے خلاف کسی بات کو مان لینا خلاف عقل و علم ہے۔

اس صورت میں جبکہ ابھی تک کسی تحقیق سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ چوہنیاں انسانوں کی طرح بول سکتی ہیں یا اپنی ہی کوئی بولی بولتی ہیں۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ ان کی آپس کی گفتگو بوسوں کے ذریعے ہوتی ہے، تو حضرت سلیمانؑ نے ان کی گفتگو کس طرح سن لی؟ اور اسرائیلی روایت کے مطابق، حضرت سلیمانؑ نے سنا کہ ایک چوہنٹی پکار کر دوسری چوہنٹیوں سے کہہ رہی ہے... کیا چوہنٹیوں کی ایک محدود تعداد کو حضرت سلیمانؑ کی آمد پر پکارنے کی صلاحیت وقتی طور پر عطا کر دی گئی تھی۔ اگر جواب اثبات میں ہو، تو اس کا ثبوت فراہم کیا جائے۔ عام مشاہدہ ہے کہ اگر کسی جگہ بہت سی چوہنیاں ہوں تو

ہمیں ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ جبکہ دوسرے بہت سے حشرات کی کسی نہ کسی طرح کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انسانوں اور دوسرے جانوروں کی طرح چیونٹیوں کا اپنا ایک دائرہ عمل ہے۔ اپنی ایک دنیا ہے، اپنے کرنے کے کام ہیں، اپنی ایک طرز زندگی۔ جس کا انسانی دنیا سے قطعاً کوئی قابل ذکر تعلق نہیں۔ صرف دو چیونٹیاں ہمارے سامنے ہوں تو ہم ان میں تمیز کر کے یہ نہیں بتا سکتے کہ کوئی چیونٹی مس اللہ رکھی ہے اور کوئی مسز بھاگو۔ بھر طیکہ ان کے نام بھی ہوتے ہوں۔ ہمارا اور چیونٹیوں کا آپس میں کوئی لین دین نہیں۔ کوئی میل ملاپ نہیں۔ نہ چیونٹیوں کی مملکت سے ہمارے کبھی مذاکرات ہوئے نہ باہمی روابط۔ نہ ہمارے اور چیونٹیوں کے مابین تعلقات قائم ہیں، نہ خوشگوار ہوتے ہیں نہ کشیدہ اور نہ منعطف نہ۔ حال۔ ہمارا کوئی وفد بھی آج تک چیونٹیوں کی کسی مملکت میں گیا ہے نہ ان کا کوئی وفد ہمارے ہاں آیا ہے۔ کہتے ہیں جس جگہ کوئی رہتا ہے وہی اس کی کائنات ہوتی ہے۔ انسان تو رب مسکون میں گھومتا اور کھوج لگاتا رہتا ہے۔ چیونٹیوں کو کس طرح معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ اور ان کا لشکر حملہ کرنے آ رہا ہے؟ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت سلیمانؑ جیسے جلیل القدر نبی کو تیس دلا چار چیونٹیوں سے کیا خطرہ پیش آ رہا تھا کہ اس مہم کی ضرورت پڑ گئی۔ کیونکہ مذکورہ بالا اسرائیلی روایت کے مطابق، جس کے متعلق جناب طالب محسن تصریح کر چکے ہیں کہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے، ایک چیونٹی نے پکار کر دوسری چیونٹیوں کو اپنے گھروں میں گھس جانے کا حکم دیا تھا تاکہ حضرت سلیمانؑ اور ان کا لشکر انہیں کچل نہ ڈالیں۔

بالفرض اگر یوسوں کے ذریعے گفتگو والی تحقیق حتمی اور آخری نہیں ہے تو آئندہ ہونے والی علمی تحقیقات (Scientific Research) کے متعلق یہ ضمانت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ انکشاف کریں گی کہ ہاں چیونٹی بولتی ہے اور اس کی آواز مسموع ہے۔ مگر اس کو سننے کے اہل ہر ف حضرت سلیمانؑ تھے یا اکیسویں صدی یا اس سے اگلی صدی کے لوگ ہو گئے کیا سائنس دان ایک ایسا احساس الہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو نہ صرف چیونٹیوں کی آواز سنائے گا بلکہ ان کی زبان بھی سکھائے گا۔

قرآن مجید نے پیش گوئی تو فرمادی کہ حضرت موسیٰ کے عہد کے فرعون کی لاش چالی جائے گی تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کیلئے موجب عبرت ہو (10:92) مگر چیونٹیوں کے ناطق ہونے کے متعلق آئندہ کسی زمانہ میں انکشاف کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جناب طالب محسن کس موہوم انکشاف کے منتظر ہیں؟

چیونٹیاں آج بھی وہی کچھ کر رہی ہیں جو شروع میں کرتی تھیں۔ انہوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔ جبکہ انسان نے اپنی خدا داد صلاحیت سے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ متنوع ایجادات اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ بلا کسی معقول وجہ کے لشکر لے کر اس کمزور دنیا تو اس مخلوق کو کچلنے کیلئے وادی نمل کا رخ کرتے۔ ایسی کوئی بات اسرائیلی روایات میں درج ہو تو چنداں تعجب خیز نہیں۔ مگر ان کو تسلیم کرانے پر اصرار کرنا اور پھر قرآن مجید سے اس کی صحت کی دلیل تلاش کرنا عجیب تر ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ رحمت اللہ طارق کے اس انکشاف پر کچھ گفتگو ہو جائے کہ مدینہ میں

ایک جوہری کام عبدالرحمن النملہ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ طالب محسن صاحب نے اس استدلال کو یہ کہہ کر مسترد نہیں کیا کہ، ہوگا کوئی عبدالرحمن چیونٹا۔ بلکہ اعتراف کیا ہے کہ ”عبدالرحمن النملہ“ کی مثال سے صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عرب میں ایک خاندان کا نام نملہ بھی ہے۔“

طالب صاحب کا یہ اعتراض رفع کیا جا چکا ہے کہ نملہ پر ثنویں ہے۔ لہذا وہ اسم علم نہیں ہو سکتا۔ تکرار کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود، اگر یہ مان لیا جائے کہ آیت کریمہ میں نملہ اسم علم نہیں تو پھر یہ النمل کے واحد ہے۔ جو مذکر و مونث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا عبدالرحمن النملہ میں اس کا معنی جناب طالب کے الفاظ میں عبدالرحمن النمل ہوگا۔ یعنی النمل قبیلہ کا ایک فرد۔ کیونکہ النمل کیلئے قرآن مجید میں جمع مذکر کے صیغوں اور ضمائر کا استعمال اس طرف رجحانی کرتا ہے۔ کہ النمل ایک قبیلہ ہے۔ اس صورت میں آیت زیر بحث کی تشریح کچھ یوں کی جاسکتی ہے۔

قالت نملۃ ای امراۃ من قبیلۃ النمل وہی رئیسہم

ایک نملہ نے (یعنی قبیلہ نمل کی ایک خاتون نے جو ان کی سربراہ تھی) کہا۔

سربراہ کے لفظ کے اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ قبیلہ کا سربراہ ہی خواہ عورت ہو یا مرد اپنے قبیلہ کے افراد کو یہ حکم دے سکتا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں چلے جائیں اور اسے ہی یہ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں کہ آنے والا سلیمان اور ان کا لشکر ہے۔

خواجہ احمد الدین امرتسری نے اپنی تفسیر بیان للناس میں سورۃ النمل کے اس مقام کا ترجمہ حسب ذیل

کیا ہے۔

”یہاں تک کہ جب وہ (یعنی سلیمان اور اس کی فوجیں) نمل (قوم) کی وادی پر آئے تو (اس قوم میں سے) ایک نملہ نے (جو ان کی حاکمہ تھی) کہا اے مملو تم اپنے مکانوں میں داخل ہو جاؤ (اور راستہ خالی کر دو تاکہ تمہارے لئے راستہ میں افواج سلیمان سے کوئی مقابلہ کی صورت نہ پیدا ہو جائے) مبادا سلیمان اور اس کی فوجیں تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں (دوست و دشمن کا) شعور نہ ہو۔“

خواجہ مرحوم اس سورۃ کے شروع میں رقم طراز ہیں۔

”اس سورت کا نام نمل ہے۔ نمل چیونٹی کو بھی کہتے ہیں اور یہ ایک قوم کا بھی نام ہے۔ یمن کے قریب جس وادی میں وہ قوم بستی رہتی، اسے واد النمل کہتے تھے۔ پہاڑوں سے گھرے ہوئے پست میدان وادی کہلاتے ہیں۔ اکثر قومیں اپنی حفاظت کیلئے وادیوں میں بستی رہتیں۔ قوم ثمود وادی میں پتھروں کو کاٹ کر گھر بناتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنی لولاد کو وادی غیر ذی زرع میں ہی بسایا تھا۔ وادیوں کی نسبت انسانوں کی طرف بلاشبہ ہوتی رہی۔ جیسا کہ اودیتھم کے لفظ

سے واضح ہے۔“

خواجہ صاحب نے مزید کہا ہے کہ۔

”عرب لوگ قوموں اور شخصوں کے نام جانوروں کے ناموں پر رکھتے تھے۔ مازن کے معنی ہیں چوٹی کے انڈے، اور عرب میں ایک مشہور قوم کا نام بھی تھا۔ یہی حال نمل کا بھی ہے۔ منتھی الارب میں نمل کے متعلق لکھا ہے ”واذا اعلام است“ یعنی نمل کا لفظ علم یعنی خاص نام کے



طور پر بھی آتا ہے۔“

## ریاستہائے یمن پر سلیمانؑ کی لشکر کشی



سلیمان اور ملکہ بلقیس (سبائ)

تاریخی واقعات میں پہلے تو ہم آہنگی نہیں ہوتی اور جہاں ہوتی ہے تو بہت سی جزئیات رہ بھی جاتی ہیں جس سے تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہے اور رسالوں، واقعات، محدث بھی ہو جاتے ہیں تاہم یہ بھی مسئلہ اصول ہے کہ اگر کسی سے متعلق کوئی بات کہیں رہ بھی جاتی ہے تو عدم ذکر سے دوسرے مقام پر ایسی بات کی نفی نہیں ہو جاتی۔ خاص کر انبیائے سابقہ کے واقعات میں بھڑت ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے کیونکہ یہ واقعات ہر نبی کے عہد میں مرتب نہیں ہوئے، بعد میں آنے والے لوگوں نے ”سماعیات“ کے سہارے ترتیب دیئے اور ساتھ ہی ترتیب دینے والوں نے اپنے ذوق کی تسکین کی آبیاری بھی کر ڈالی۔ عہد قدیم میں ایسے واقعات کو بائبل کے ”دفتین“ میں محفوظ کر لیا گیا تھا اور عہد اسلامی میں حضور نبی اکرم ﷺ کے اقوال



واقعات پر مشتمل واقعات کو احادیث اور روایات کی صورت میں سامنے لایا گیا۔۔۔ اس طرح بائبل کے واقعات ہوں یا عہد نبوی کے حالات دونوں کی حیثیت مذہبی تاریخ کی سی ہے اور ادھر یہ بھی مسلمہ ثابت ہے کہ تاریخ میں سچ اور جھوٹ کا امکان ہر دور میں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ البتہ حسن ظن کو عنصر فعال کی حیثیت دیدی گئی ہے کہ بالکل نفی کے مقابل اثبات کو ترجیح ہونی چاہیے۔۔۔ عرض مدعا یہ ہے کہ میں نے چالیس سال پہلے ”وادی نمل کی ہشیار ملکہ“ کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا تھا جسے اہل علم نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا لیکن اس بھری دنیا میں ایسے بھی قاصر الفہم اچھبہ پرست تھے جنہوں نے تنقید کے قشون قاہرہ سے سینہ و عقل و فراست کو چھلنی کر دیا۔ چنانچہ بامر مجبوری ان کی تنقیدات کا علمی اور واقعاتی جائزہ لے کر جواب الجواب داخل کر دیا گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ پورے 39 سال تک فضا پر سکوت طاری رہا لیکن پھر ایسا ہوا کہ میرا وہی پرانا مضمون کسی ضرورت کے ماتحت طلوع اسلام میں شائع ہو گیا اور ایک صاحب علم جو کہ نہ تو فہم رسا سے محروم تھے اور نہ ہی اچھبہ پرست، میدانِ دعا میں اترے اور تباہ توڑ کئی وار کر ڈالے۔ میں نے اپنی ماسط کی حد تک کچھ دضاحتیں شامل کر دیں، مگر ان کا اصرار تھا کہ کسی بھی اہم علم پر تنوین نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں قالت نملہ پر تنوین ہے۔۔۔ یہ لکھ کر پہلے تو راقم سے کوئی مثال طلب کر لی گئی۔ لیکن پھر پیشگی فیصلہ سنا دیا کہ اگر کوئی مثال مل بھی جائے تب بھی نملہ کے معنی چیونٹی ہی کے ہونگے۔ اس پر مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہ رہی کہ اب مغز ماری کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے خاموشی کو بہتر دطیرہ بنایا۔ تاہم ایک نادریدہ اہل علم صاحب قلم، ابو عصمت محمد سلیم صاحب سے رہا نہیں گیا اور انہوں نے ایک علمی دھاندلی کا پردہ چاک کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کر لی جزاء اللہ خیر الجزاء۔۔۔ پھر اس کے کچھ عرصہ بعد ایک محلے کے ایڈیٹر نے میری خامکاری کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی طرف سے فیصلہ کن انداز میں لکھ دیا کہ :

”تاریخی اعتبار سے حضرت سلیمانؑ کا تعلق یمن کی وادی نمل اور سبا سے جوڑ کر دکھایا جائے اور کہ... تاریخی حوالہ سے حضرت کی یمن میں فوج کشی ثابت نہیں کر سکتے جو کہ یقیناً نہیں کر سکتے تو ان کی پورے وثوق سے لکھی ہوئی مدلل اور مبسوط تحلیل کا مصرف و مقام خاک بھی نہیں ہے۔“

یہ تحدی واضح کرتی ہے کہ تنقید نگار اپنے فیصلہ کو حرف آخر قرار دے چکے ہیں۔ لیکن میری کسی بھی تحریر میں نہ تحدی ہے نہ تعلی۔ پھر کیا ہوا کہ تنقید نگار انتہائی اقدام پر مجبور ہو گئے اور میری تحریر کا مصرف خاک کی جائے کڑ ٹھہرا لیا۔ حالانکہ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اس کا اخذ ذیل کے مفسرین حضرات کی تحقیق و سرچ تھی۔ چنانچہ امام خازن (1340م) اپنی شرف آفاق تفسیر میں لکھتے ہیں :

”حضرت کعب احبار جو کہ نبی اکرم ﷺ کے ہم عصر تھے آپ ﷺ سے 23 سال پہلے پیدا ہوئے 20 سال آپ کے وصال کے بعد (652م) میں فوت ہوئے تھے۔ اشارہ دیتے ہیں کہ... حضرت سلیمان یمن کو فتح کرنے کے ارادے سے پہلے اصطخر (پٹنہ) سے ہوتے ہوئے مدینہ النبیؐ



پہنچے۔ پھر مکتبہ المکتزمہ سے گزرے۔ اس کے بعد وادی سدیر (جو طائف سے آگے یمن سے متصل ہے) سے گزر کر وادی نخل میں پہنچے۔“

حضرت کعب کی اس گواہی پر تفسیر "سراج المنیر" کے مصنف امام خطیب شربینی (1590م) امام بقاعی (1480م) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ۔ ان کے نزدیک یہ وادی 885 ہجری یعنی 15 ویں صدی مسیحی کے اختتام تک اسی نام سے مشہور تھی اور میراجہ ان گواہی دیتا ہے کہ یہی وادی آج بھی اسی نام سے موجود اور مشہور ہے۔

اسی طرح بقاعی، شربینی اور خازن کے استقراء بموجب وادی نخل۔ سدیر اور مارب کے مابین آج بھی موجود ہے بلکہ راقم نے قدیم و جدید جغرافیہ نویسوں کے تعاون سے اس وادی کا طول بلد اور عرض بلد بھی لکھ دیا تھا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے اور ساتھ ہی جنوب جزیرۃ العرب کے بوئے مورخ الہمدانی (945م) کے حوالوں سے اقوام نخل کی بستیوں، قصبوں اور دیگر مقامات سکونت کے نام تک لکھ دیئے تھے لیکن تنقید نگار نے محض اس بنا پر کہ بائبل میں سلیمان کے سفر یمن کا ذکر نہیں ہے، لہذا میرے ماخذ کو مسترد فرما دیا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ مستزاد کہ میں ثبوت فراہم کر دوں جو کہ ناممکن ہے وغیرہ اس ضمن میں، میں نے ابتداء میں عرض کر دیا ہے کہ تاریخی واقعات میں ہم آہنگی کا ہونا اتفاقی امر تو ہو سکتا ہے، یعنی اور حتمی نہیں۔ تاہم اگر چالیس سال پہلے اس نوعیت کا کوئی سوال اٹھتا تو شاید نفی یا اثبات میں کچھ عرض کر دیتا مگر اب کہ نہ جوانی ہے نہ اعصاب اور جسم میں سکت اور بصارت ہے تو وہ بھی ضعف کی زد میں۔ ایسے میں کسی محترم کی تسلی کا سامان نہیں کر سکتا۔ خاص کر میں سلیمان کا ہم عصر ہوں نہ میری آنکھ کے کمرے نے آپ کی حرکات و سکنات کو کیچ کیا ہے اور نہ ہی موصوف کا جنگی وقائع نگار ہوں۔۔۔ میں نے مفسروں کی وضاحتوں کو سامنے رکھ کر سلیمان کو یمن کی سرحد تک پہنچا دیا ہے میرے نزدیک بائبل کی تاریخ بعد از وقت کی تحریر ہے۔ اسی طرح مسلم روایات بھی بعد از پیغمبر کے واقعات کا مجموعہ۔ اس طرح دونوں میں سچ بھی ہو سکتا ہے اور داستان سرائی و غلط بیانی بھی۔ لہذا تنقید نگار کو تلملاہٹ دکھانے اور پیچ و تاب کھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، واقعات کی ایک کڑی اگر بائبل میں رہ گئی ہے تو مسلم روایات نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ یوں بھی قرآن محکم نے بہت سے تاریخی مقامات کے صرف نام ذکر کئے ہیں۔ محل وقوع کی نشاندہی نہیں کی کہ عرب جو کہ قرآن کے اولین مخاطب تھے ان مقامات کو جانتے تھے۔ تاہم بعد کے ادوار میں ان مقامات کی نشاندہی ناگزیر تھی کہ اب مرور زمانہ کے باعث یہ مقامات ذہنوں سے محو ہو رہے تھے۔ مثلاً تہذیب بابل کے شاہکار۔ معلق باغات نیوٹی کے کس شہر میں تھے۔ اہرام حیرہ کے بانی کون تھے۔ ارم ذات العمداء نے کس مقام پر چٹانیں کھود کر گھر بنائے تھے۔ شداد کی ستونوں والی جنت کہاں تھی؟ موسیٰ نے بحر احمر کو کس مقام پر پایاب پایا تھا؟ وادی طور، سینا کے کس مقام پر ہے؟ بدر و حنین خیبر اور تبوک کا محل وقوع کہاں ہے۔ وادی نخل، کہاں تھی، اصحاب کف کا بلجا وادی کا غار کہاں تھا؟ اصحاب الرس کہاں رہتے تھے، اصحاب الاخذود والوں نے کہاں ظلم، و بربریت کے الاوروشن کئے۔ "موتفکات" جہاں پر آتش فشانی ہوئی عراق کے کس مقام پر بجتے تھے، "اصحاب الایکھ" پیڑ اور سدوم کے مابین کہاں

واقعہ تھا؟ معرکہ یرموک اور کارزار تبوک کب اور کیسے تاریخ کا حصہ بنے۔ مقابلہ جمل اور حرب صفین درجہ اور فرات کے کون سے مقامات پر واقع ہوئے۔ دیبل، منصورہ، بھسور اور بھکر سندھ کی وادی میں کہاں کہاں واقع تھے۔ ذوالکفل کون تھا، ذوالقرنین کہاں کے فرماں روا تھے۔۔۔؟ غرض کہ یہ سب مقامات اور اشخاص قابلِ تبصیح و تشریح تھے چنانچہ قدیم خواہ جدید جغرافیہ نویسوں نے ٹوہ لگا کر ان مقامات کی ناقابلِ تحلیل وضاحت کی ”خود ہمارے دور میں علامہ عبد اللہ العماوی، سید سلیمان ندوی اور انجمن ترقی اردو کراچی نے ”تاریخ عرب قدیم“، ”ارض القرآن“ اور ”جغرافیہ قرآن“ لکھ کر کوئی ابہام رہنے نہیں دیا۔ ڈاکٹر جواد علی نے عرب قدیم کی تاریخ دس جلدوں میں مرتب کر کے اپنی تحقیق و ریسرچ کو معراج کمال تک پہنچایا۔ اسی طرح درجنوں عرب مورخین نے تفتیش و استقراء کے جوہر دکھلا کر لازوال شاہکار چھوڑے۔ اب اتنے سارے مقامات و اسماء کا تعین و تشخیص اگر قابلِ اعتراض نہیں ہو سکے تو وادی منہل کے محل وقوع پر کیا اعتراض ہے۔۔۔ چونیماں تو ہر جگہ ہوتی ہیں بلکہ افریقہ کے جنگلات میں خوفناک چونیماں پائی جاتی ہیں جو کسی بھی جاندار چیز پر حملہ آور ہو کر منٹوں، سیکنڈوں میں زندگی سے محروم کر ڈالتی ہیں۔ بالائیں ہمہ قرآن نے نہ تو ان کا ذکر کیا نہ ان کے بلوں اور سوراخوں کی نشاندہی کر کے وادی منہل یا چونیٹیوں کے جنگلات کا نام دیا۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وادی منفرد تھی جس میں صلح جو انسان بستے اور زبرک دو انا لوگوں کا محسوس تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرا مآخذ نہ صرف کعب احبار کی گواہی اور مفسرین کرام کی تصریحات ہیں قرآن حکم کی ذیل کی آیات میں بھی ارشاد ہے۔

میرے استدلال کا مأخذ

وحشر لسليمن جنوده

سلیمان کیلئے مختلف ٹولیوں میں مختلف اقوام کا لشکر تیار کیا گیا تھا جسے لے کر آپؐ وادیِ نخل میں پہنچے۔  
(نخل، 18)

اسی طرح آپ نے وادی نمل ہی سے ملکہ یمن، بلقیس کو ایک تہدید آمیز خط لکھا کہ فلنا ینہم بجنود لا قبل

لهم

ہم انہیں مزہ چکھانے کیلئے ایک ایسی فوج سے لشکر کشی کریں گے جو اس سے پہلے چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔

اور ان ہر دو لکات کا ایک ایک لفظ بول رہا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے باقاعدہ لشکر کشی کی تھی وہاں کی سرحدوں کو شکر و نڈاں۔۔ کی تقریب منانے کیلئے پانچ سال نہیں کیا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سیدنا سلیمانؑ غنیم کی صورت ہی میں دوسرے ملکوں میں جا پہنچے تھے اور پھر فرزند زمین نے بھی یہ سمجھ کر ہی کہ سلیمانؑ کی فوج کشی برائے فتح ہے گھروں میں بند ہونے کی پالیسی پر عمل کیا کہ ان دنوں جان کی امان پانے کا یہی معروف طریقہ چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ وادی نممل کی ریسہ کی حکمت عملی پر سلیمانؑ متبسم ہوئے اور فتح کی راہ میں جو خون خرابہ ہونا تھا اس سے رک گئے بلکہ بلا جنگ و جدل کامیابی پر اللہ

کے لئے سجدہ شکر جلائے۔ (نمل، 19)

اب اس سے اگلے مرحلے کی لشکر کشی کا نمبر آتا ہے کیونکہ وادی نمل۔ یمن کے ہمسائے میں تھی، اور سلیمانی جاسوسوں نے پہلے ہی سے معلوم کر لیا تھا کہ وہاں بھی ایک عورت ہی حکمرانی کرتی ہے چنانچہ لگے ہاتھوں آپ نے اسے بھی فتح کرنے کا عزم کر لیا اور چڑھائی سے پہلے تدبیر آمیز خط لکھا کہ *الا تعلوا علی و اتونی مسلمین* میرے سامنے دفاعی لشکر لانے کی کوشش نہ کریں اور سیدھے طریقے سے اطاعت و زبردستی کا اعلان کر دیں۔ (نمل، 31)

چنانچہ ملکہ معاملہ کی نزاکت کو بھانپ گئی اور مجلس مشاورت بلوا کر معاملہ کی بشگینی کا احساس دلایا کہ اب یہ معاملہ تم سب کے سامنے ہے میں قطعی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ جو بات تمہاری ہوگی وہی فیصلہ کن ہوگی۔ اس پر سب نے کہا کہ ”ہم طاقت ور اور جنگ جو ہیں مقابلہ کریں گے۔“ تب ملکہ پھر گویا ہوئی کہ سوچ لو غنیمت تمہارے در پر دستک دے رہا ہے اور ان الملوک اذا دخلوا قرية افسدوها.....

اور تم جانتے ہو غنیمت جب چڑھ دوڑتا ہے تو ملک بڑی تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے عزت فاختہ کا اور ذلت مفتوحین کا مقدر بن جاتی ہے اور یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ (34)

چنانچہ طے ہوا کہ زبردستی قبول کرنے سے پہلے تحفہ تحائف بھیج کر دیکھا جائے کہ کیا صورت حال نمودار ہوتی ہے۔ (35) اب ہوا یہ کہ تحائف جب دربار سلیمانی میں نذر ہوئے تو جناب سلیمانؑ پر منفی اثر ہوا۔ آپ نے فرمایا تو گویا ان لوگوں نے تحائف دے کر مجھے لالچ دیا ہے حالانکہ میرے پاس جو ساز و سامان ہے وہ ان کے تحائف سے زیادہ قیمتی ہے اور یہ کہہ کر آپ نے قاصدوں کے سردار سے کہا،

ارجع الیہم فلناتینہم بجنود لا قبل لہم ولنخرجنہم منها اذلة و ہم صغرون۔  
تم چلے جاؤ اب ملکہ کو خبر کر دو کہ (I) ہم ایسا لشکر جرار لے کر وہاں چڑھائی کریں گے جو چشم فلک نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا اور تمہیں ذلت اور غلامی سے دوچار کر دے گا (II) اپنا پایہ تخت یعنی حکمرانی کا حق مجھے تفویض کر دو۔ (38)

ان آیات میں سلیمانؑ کی لشکر کشی سورج کی طرح روشن ہے مگر بائبل کے یہ پرستار ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ جو کچھ بھی ہو خلیج عربی کی دونوں ملکات نے نہایت فرزانگی و دانشمندی اور ہشیاری سے اپنی ریاستوں پر سے تباہی کے بادل ٹالے اور رہتی دنیا تک ایک روشن مثال قائم کر گئیں۔ اور ان کے واقعات کا یہی وہ روشن پہلو تھا جسے قرآن پاک نے نظر میں رکھا اور ذکر فرمادیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ملکہ سبا کو سلیمانی پایگاہ دکھلایا جاتا ہے اور اب یہ تمام تر سلسلہ خیر سگالی اور اچھے ہمسایوں کے روپ میں تبدیل ہو جاتا ہے اب سیدنا سلیمان ملکہ کے خیر سگالی کے دورے کیلئے میزبانی کے فرائض خود ہی سر انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اپنے جڑاؤ تحت و تاج آمینہ پوش محلات و قصور اور عجیب و غریب آثار میں دکھلاتے اور پھر خیر و خوبی سے انہیں رخصت فرماتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ واقعات چونکہ نئے

سرے سے ذکر ہوتے ہیں لہذا مزید تفصیل کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ خاص کر اب پہلے سے زیادہ مجاز اور استعارے سے کام لیا گیا ہے، جو تنقید نگار کیلئے مزید تشویش کا باعث بن سکیں گے۔

یہ یاد رہے کہ جس طرح آج بعض، خلیجی ریاستوں کو عرب امارات کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی ابو ظہبی، شارجہ، ام القوین، دبئی وغیرہ سات ریاستوں کو عرب امارات کا نام دیا گیا ہے اسی طرح کسی زمانے میں، سیریا، لبنان، فلسطین کو بھی شام ہی کہا جاتا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسی طرح کسی زمانے میں باب المندب عدن سے لے کر بحرین اور طائف سے لے کر حدود مسقط تک کو یمن ہی کہا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جہم کے راجاؤں سے ہوتے تھے۔ (مثلاً سلطنت نجد، امارات مکہ اور مقاطعہ حضر موت) انہیں فتح کرنا اور ڈرنا دھمکانا کسی بڑے طاقتور بادشاہ کے شایان شان نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا سلیمانؑ نے ہر موقع پر افواج کے استعمال نہ ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ آپ کے ہاتھ کسی کے ناحق خون میں نہیں رنگے۔ غرض کہ ریا پرست بائبل میں بھی اور یمن میں بھی یہی شکر کشی کی تھی

خلاصہ بحث یہ کہ سلیمان کے ریاستہائے یمن تک پہنچنے کیلئے میرا استدلال، کعب احبار اور دیگر مفسرین کی مشاہداتی گواہی سے ہے اور ناقد محترم کا ماخذ بائبل پر ہے جب کہ تاریخی واقعات اپنے وقت پر مدون نہیں ہوئے ان میں بعض جزئیات کا رد جانا یقینی امر ہے۔ تاہم قرآن کی اپنی گواہی یہ ہے کہ سلیمان نے ریاستہائے یمن جو کبھی متحد تھیں اور کبھی منقسم کا سفر ضرور کیا ہے میں نے 35 سال پہلے ایک مضمون ”خلیج عقبہ کا تاریخی کردار“ کے عنوان سے لکھا تھا اس میں تجارتی اور لشکر کشی کے راستوں کی واضح نشاندہی کر دی تھی جس میں مدینہ اقصیٰ تک موسیٰ اور آگے کی طرف سلیمان کا سفر دکھایا تھا۔



## فرعون ذی الاوتاد۔ کا زندہ معجزہ

راقم الحروف کے شعور کی آنکھ ابھی نیم باز تھی کہ چین سے علمی ماحول کی وجہ سے ”ترجمۃ القرآن“ اور تفسیر ”جلالین“ درسا پڑھ ڈالی تھیں عمر کے اس حصے میں ذہن تقریباً ہمہ آلود گیوں اور آلائشوں سے پاک و صاف اور فطری طور پر اتنا بے لوث ہوتا ہے کہ اس میں ہر چیز قبول کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اساتذہ نے مزاج کو ”وہمیات“ کے جس سانچے میں ڈھال دیا وہ ڈھل گیا یعنی انہوں نے اگر کسی تاریخی آیت کے واضح مفہوم میں ”الف لیلائی“ رنگ بھر دیا تو میں نے اسے قرآن کا زندہ معجزہ اور صداقت کی آخری دلیل سمجھ لیا اور یہ نہ سوچا کہ اس طرح کتاب لاریب میں ریب و تشکیک کا گزر ممکن ہو چلے گا اور قرآن کے تاریخی حصے پر اعتقاد کا بحر ان پیدا ہو جائے گا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا جبکہ سلفاً عن خلف یہی آواز سنائی دے رہی تھی کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ ہمیں دیا ہے اس پر نکتہ چینی یا انگشت نمائی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً سورۃ الفجر (13 تا 7) کے مفہوم میں بتلایا جا رہا ہے کہ ذی الاوتاد کے معنی ہیں میخوں والا یا میخیں لگانے والا

فرعون یعنی





## فرعون ذی الاوتاد

فرعون ذی الاوتاد — (ہاتھی دانت کا مجسمہ)

فرعون ذی الاوتاد . (ہاتھی دانت کا مجسمہ)

اسکے پاس خیمے نصب کرنے کی بہت ساری میخیں تھیں وہ جہاں جاتا ہزاروں آہنی میخیں زمین میں گاڑ کر خیموں کی طنائیں کس کر دیکھتے ہی دیکھتے متحرک شہر ہسا لیتا۔ یا یہ کہ وہ فرعون جس سے ناراض ہو جاتا اسکے ہاتھ اور پاؤں میں میخیں جڑ دیتا لہذا میخوں والا فرعون کہلایا۔ حالانکہ فرعون کیا ہر ”وہ خدا“۔ جہاں کوچ کرتا ہے اپنے پاس خیموں، رسیوں اور طنائیں کسے کیلئے آہنی یا چوٹی میخوں کا دافر شاہک رکھتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر حکمران جب کسی پر الزام دھرتا ہے تو اپنے ملزم کو اذیت کے انواع سے دوچار کرتے وقت ایسا بھی کر ڈالتا ہے کہ اسکے ہاتھ پاؤں باندھ لیتا۔ یا کیلیں ٹھونک دیتا ہے۔ صلیب کی تخلیقی غایت بھی یہی تھی کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میخیں کسی بھی غرض کیلئے فراہم ہوں وہ صرف مہری فراغت پر ہی موقوف نہیں سائنسی دور سے پہلے کا ہر حکمران ”اذیت رسانی“ یا کسی بھی غرض کیلئے میخوں کو استعمال میں لاتا رہا ہے یہاں اگر میخوں کا اشارہ ہے تو یقیناً کوئی ”سید معمولی“ نوعیت کی میخیں ہی ہو گی۔ اور یہ میں بتاؤں گا کہ وہ میخیں کیسی تھیں؟



خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر مفسر نے اپنے ذوق اور ذہنی رسائی کے مطابق کوئی نہ کوئی تشریح کر ڈالی۔ ان کے دائرہ نظر میں وسعت۔۔۔۔۔ فکر میں رسائی۔۔۔۔۔ اور خیالات میں گہرائی نہیں تھی۔ وہ تحقیق و سرچ کرتے تو کس بل بوتے پر۔ اور غور و فکر کی زحمت اٹھاتے تو کس مبلغِ علم پر۔ نتیجہ یہ کہ صدیاں بیت گئیں سورۃ الفجر کی آیات ”الف لیلوی“ دائرے میں گھومتی رہیں۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ آیات الہی کے ساتھ یہ ناروا سلوک بڑا ہی اندوہناک اور نہایت ہی ناشائستہ ہے؟

یہ درست ہے کہ فرعون ذی الاوتاد۔ اپنے عظیم تخلیقی فن پارے۔ اہرام جیزہ کے ناطے سے زندہ نام پایا گیا ہے لیکن یہاں صرف اہرام جیسی نادر و روزگار۔ تخلیق ہی کی بات نہیں ہوئی۔ دوسری اقوام کی انمول تخلیقات کا ذکر بھی ہے۔ فرمایا۔

### قومیں عظیم فن پاروں کے ناطے سے

ارم ذات العمدات التي لم يخلق مثلها في البلاد

و ثمود الذين جابوا الصخر بالواد

وفرعون ذی الاوتاد

ان آیات میں تین اقوام کا ذکر ہے اور تینوں ہی جفاکش، ہنرمند، کاریگر اور خلاق ذہن رکھنے والی رتھیں۔ پہلی قوم۔ عاد کی رتھی پھر یہ دو شاخوں میں بٹ گئی۔ (۱) عادِ اولیٰ جسے ”ارم“ کہا جاتا ہے اور۔۔۔۔۔ (۲) عادِ ثمود۔ جو حضرت ہود کی امت کہلائی۔ بعد میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام بھی ثمود ہی پڑ گیا۔ آخر میں فرعونوں کا ان کی تخلیقات کے حوالے سے ذکر فرمایا۔ اور پھر ان کی تراش و فکر جو سراسر جبر و استبداد کا حاصل رتھی کا انجام بیان فرما کر ذہن انسانی کو ٹھوکر لگائی کہ جو عمل بھی انسانیت کی اجتماعی بہبود سے عاری ہو گا وہ کتنا ہی عظیم الشان ہو سکتا ہے۔

یہ تھان آیات کا موضوع اور۔۔۔ مختصر بیان۔ نین ہمارے اکابر نے تشریح و تعبیر کا ایسا انداز اپنایا جو ان آیات کے نزولی مقصد سے ہم آہنگ نہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً ارم ذات العمدات۔ کی تشریح میں جلال الدین سیوطی (1505م) فرماتے ہیں۔

ذات العمدات ای الطول۔ کان طول الطویل منهم اربعمئة ذراع۔

عماد کے معنی ہیں بلند و بالا قامت والے چنانچہ عاد۔ والوں کا قد چار سو گز لمبا ہوتا تھا۔

(تفسیر جلالین طبع دار المعرفہ بیروت صفحہ 806 سطر 10، 11)

اور اسی تشریح کی اساس پر بعد میں ترجمہ ہوا کہ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا؟ (جو)۔ ارم (کہلاتے تھے)

در از قد کہ تمام ملک میں ایسے پیدا نہیں ہوئے تھے۔

(ترجمہ۔ فتح الحمید۔ تاج کمپنی نمبر 25 صفحہ 809 سطر 2، 4)

عماد۔ کی اسی تشریح کی اساس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عاد اولے ہوں خواہ عاد ثانی۔ انکی قد کی اتنی لمبائی جو اہرام مصر سے تین گنا زیادہ ہو اور دنیا کی ”حفریات“ (کھنڈرات) میں ان کا نشان و پتہ ہی نہ وارد ہے کیا اتنی دراز قد مخلوق کی

نسل ناپید ہو چکی ہے۔ یا سنا سنا کہ ان بھی سرگرم تلاش ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں۔ وضاحت کیلئے ملاحظہ ہو عنوان ”استدراک“۔

دوسری آیت میں ثمود کا نام لے کر ان کا کام بتلایا الذین جابوا الصخر بالواد۔  
جنہوں نے شمالی حجاز کی وادی مدائن صالح اور پیٹرا میں اندر ہی اندر سے چٹانوں کو تراش کر گھر بنائے۔  
(الفجر)

اور قوم ثمود کی ہنرمندی، جفاکشی و کارگیری کے ہزاروں سال گزرنے کے باوجود زندہ نمونے اور شہادتیں چونکہ موجود ہیں انکی بابت تفسیری موشگافیاں نہ ہو سکتی تھیں۔ بلکہ ان محیر العقول عمارات کی تین تصویریں شامل ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معمول کے قد والوں کے مسکن تھے۔ چار سو گز دراز قد انسانوں کے مکان، ہمیں تھے۔ ایسے میں لم یخلق مثلھا۔ کا تعلق اگر عماد (یعنی قد) سے ہے تو دوسرے معنی میں یہ عین حقیقت ہے کہ یہ زمیں نہ معلوم کب سے بنی اور کب جا کر جانداروں کا مسکن ٹھہری اس پر اب تک کسی ایسے انسان کا سراغ نہیں ملا جو سیکڑوں گز لمبا ہو؟

تیسری آیت میں ”الاولاد“ کا لفظ ہے جسکی تشریح میں سیوطی فرماتے ہیں۔ کان یند اربعة اولاد یشد الیہا یدی ورجلے من یعذبہ

### ذی الاولاد

فرعون ذی الاولاد جسے اذیت دینا چاہتا تھے دونوں ہاتھ اور پاؤں میں چار بیخیں گاڑ دیتا۔

(جلائیں طبع بیروت صفحہ 806)

حالانکہ۔ اولاد۔ بھی یہاں بھاری بھر کم عمارتیں کا استعارہ ہے اس طرح الفجر کی زیر بحث آیات ان اقوام سے بحث کرتی ہیں جو ہنرمندی میں کمال رکھنے کے علاوہ اپنی عظیم الشان تعمیرات کے ناطے ہی سے ”پہچان“ رکھتی تھیں۔ نہ ان کے قد لائے تھے اور نہ ہی الزام دھر کر۔ ہاتھوں اور پاؤں میں کیلیں ٹھونکتے تھے۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی ترجمہ ملاحظہ ہو۔

کیا تم نے غور نہیں فرمایا کہ تمہارے رب نے عاد جیسی طاقتور قوم سے کیا سلوک کیا؟ ان کی شاخ ارم جو عظیم عمارتوں والی تھی۔ ایسی عمارتیں جو دنیا میں اپنی مثال آپ۔ تھیں (کہاں گئے وہ؟) اور قوم ثمود کے تعمیری کارناموں کو دیکھ لیجئے جنہوں نے چٹانوں کو اندر ہی اندر سے کھرچ کر اپنا مسکن بنایا اور اہرام جیسی بھاری عمارتوں کے بانی فرعون کو دیکھو۔ جنہوں نے ملکہ جبر و استبداد کے زور پر لوگوں کو محکوم بنانا سرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کر لی۔  
(الفجر، 137)

مذکورہ اقوام کی بابت ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان

### عاد، ثمود اور فراعنہ اولے کا ابتدائی وطن

کا اصلی مادر وطن کہاں تھا اور وہ کن مقاصد و اہداف کو ملحوظ رکھ کر اپنے گھروں سے دور جا کر بسے اور پھر ایسے رچ بس گئے کہ وطن ثانی کا پیدا انکی ضرورت کر رہے؟ اسکی بابت

اثری اکتشافات اور قدیم حجری الواح (OLD LEGENDS) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ۔ ارم۔ یعنی عاد ولولے لایا عاد ثانی بلکہ فراعنہ میں سے ہکسوس قبیلہ کا اصلی وطن ”بین“ تھا۔ یہ لوگ بڑے جفاکش اور ہنرمند تھے اور اپنی محنت کے ہیرے سے پتھر کا دل چیرنے کی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ اپنی گونا گوں صلاحیتوں کے ناطے سے متدن (CIVILIZED) بھی تھے۔ یہ لوگ ہزاروں سال پہلے جنوب جزیرۃ العرب سے نکل کر شمالی عرب پھر مصر اور آفریقہ میں پھیل گئے اور جہاں گئے اپنا کلچر اور تہذیب ساتھ لے گئے۔ قوم عاد نے عدن کے قریب ایک جنت بھی بنائی تھی جو صدیوں تک عربوں کی لوک کہانیوں کا عنوان بنی رہی ارم یعنی عاد ولولے نے مارب شہر کو محفوظ کرنے اور سیلابی پانی کو یکجا سمیٹنے کیلئے ایک ڈیم بھی تعمیر کیا تھا جو دیوار چین کی طرح اپنے وقت کا ایک مضبوط بند تھا۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ بارشوں کے تسلسل کی وجہ سے پہاڑی ندی نالوں میں اس زور کا سیلاب آیا کہ ”سدعآرب“ تاب نہ لا کر بہ گیا۔ (سباء، 16)

اور یہ حادثہ اپنی تباہ کاریوں کی ایسی یادگار چھوڑ گیا کہ ملک سباء کی اقوام کی اجتماعیت پارہ پارہ ہو گئی اور خوشحالی بد حالی کا روپ دھار گئی۔ اب ان کی زیست کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا وہ حیات نو کی تلاش میں خاک بہ سر، حیران و پریشان ہجرت کی پگڈنڈیوں پر چل پڑے ان میں سے بہت سوں نے اپنے اجداد کے پسندیدہ ملک مصر کا رخ کیا کہ دریائے نیل نے کسی بھی پیاسے کی پیاس بجھانے میں نخل سے کام نہیں لیا تھا اور کئی ایک نے آفریقہ کی چراگاہوں کو حیات بخشی کا سبب ٹھہرا کر سوڈان اور مملکت کو وطن بنالیا چنانچہ برطانوی روڈیشیا میں آج بھی ان یمنی اور سبائی اقوام کے آثار موجود ہیں اور اپنے ماضی بعید کے مکینوں پر شہادت فراہم کر رہے ہیں۔ اور تاریخ نے ان ہی اقوام کے اسلاف کو جو ”سدعآرب“ کے بہ جانے سے ہزاروں سال پہلے مصر پر قابض ہو کر حکمرانی کا ڈنکا جاکے تھے۔ ہکسوس۔ کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان ہی فراعنہ کے چوتھے پاپا نچویر دور کے ایک حکمران۔ ذی الوناد۔ کو تاریخ نے زندہ جاوید کی حیثیت سے یاد کیا ہے مورخ ”موویو“ نے مصر کے اثری اکتشافات سے ثابت کیا ہے کہ اہرام جیزہ کے بانی فرعون نے اپنا لقب خود ہی ”ذی الوناد“ اختیار کیا تھا۔

اوناد۔ اپنی ساخت میں عربی کا لفظ ہے اور اس کا مفرد ”وند“ ہے جسکے معنی ہیں بلند و بالا عمارت۔ یا

**اوناد کے معنی** مستحکم و ثابت کھڑا ہونا۔ شاعر کہتا ہے :

لاقت علی الماء جزیلا و اتدا

وکان لا یخلفها الموعدا

محبوب نے وعدہ وفا عاشق کو پانی کے کنارے (گریاں حالت میں) کھڑا پایا کہ وہ وعدہ خلافی نہ کر سکتا تھا۔ (اساس البلاغۃ طبع ندیم قاہرہ صفحہ 491)

یہاں۔ وند۔ قدم جما کر کھڑے ہونے کو کہا گیا ہے اور اساس البلاغۃ والے زحمری (1144م) ہی نے عربی کا

ایک محاورہ نقل کیا ہے۔ وانتصب کانه و اتد۔

(اساس صفحہ 491)

وہ ایسے کھڑا ہے جیسے پہاڑ۔

یہاں ”واتد“ پہاڑ کے استعارے میں آیا ہے ویسے پہاڑ کو بھی وقد۔ کہا گیا ہے قرآن محکم میں ہے، والجبال

(نباء، 7)

اوتاد۔

یہاں ”اوتاد“ پہاڑ کے ثابت، مستحکم اور اونچا ہونے کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس مفہوم میں ایک بدو کا قول ہے

وقد الله الارض بالجبال واوتدها۔

اللہ نے زمین کی جنبش کو کنٹرول کرنے کیلئے پہاڑ بنائے۔ (اساس البلاغہ صفحہ 491)

بات صاف ہو گئی کہ ”وقد“۔ مستحکم اور بلند وبالا عمارت جو دیکھنے میں پہاڑ سے ہم سری کرتی ہو۔ کو نیز کہا جاتا

ہے۔

امام الشریف الرضی (1016م) لکھتے ہیں :

وقد يكون معنى ذى الاوتاد اى ذى الابنية المشيدة والقواعد المهددة التى تشبه بالجبال فى ارتفاع  
الرؤس ورسوخ الاصول لان الجبال تسمى اوتاد الارض

اوتاد ان بلند وبالا عمارات کو کہا جاتا ہے جن کی بنیاد میں زمین کی گہرائیوں اور چوٹیاں آسمان کی  
بلندیوں تک پہنچی ہوئی ہیں اور جنہیں جطور پر پہاڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

(تلخیص البیان فی مجازات القرآن طبع قاہرہ (1955م) صفحہ 278 سطر 755)

یاد رہے۔ یہ کتنی خوبصورت تشبیہ ہے جو قرآن حکیم نے اہرام (حیرہ) کیلئے تجویز فرمائی ہے؟

مانا کہ اسکے ایک معنی ”میخ“ کے بھی ہیں تو کیا اس کی تعبیر میں یہ کہنا بیجا ہو گا کہ یہ وہ ”میخ“ معمولی ”میخ“ ہے جو

انسانی ہاتھوں نے، شکم زمین پر اٹا کر رکھ دی ہے جس کی وسیع و عریض چوڑائی نیچے کی طرف اور چوکور نوک اوپر کو چلی گئی

ہے۔ کیا اتنی پرہیز اور فلک بوس عمارت جو تمام تر تعمیراتی زاویوں سے فنِ تعمیر کا ایک عجوبہ ہے۔ انسان کی اعجازی

صلاحیتوں اور کارکردگی پر زندہ شہادت، نہیں ہے؟ کیا اسکے خلاق اور بانی کا غلط انداز ہی میں اسی ایک زندہ معجزہ، نہیں ہے؟

کیا عربوں نے اسے ”وقد“ کے جامع لفظ میں اگر دوام بخشا ہے تو یہ ان کے شعور کی گہرائی اور گیرائی کا ثبوت، نہیں؟ یہ

عمارت جس کی بلندی 755 قدم یا 146 میٹر تک پہنچتی ہے اسے ہزاروں برس پہلے چھوٹے سے انسان نے وجود دیا اور

لاکھوں ٹن وزنی پتھر اس وقت تراشے، صیقل کئے اور اوپر پہنچائے جبکہ نہ بھاری بھر کم میکانیکی آلات تھے اور نہ ہی نشالات

(کرہیں) کا وجود۔ تہذیب تھی تو عہد طفولیت کے آئین میں ہمک رہی تھی۔ ایسے میں قرآن پاک نے اگر تحریر یعنی انداز ہی

میں اسی انسان کے ہاتھوں لازوال شاہکار کا ذکر کیا اور ”عظیم بانی کو“ ”ذی الاوتاد“ کے لقب سے یاد فرمایا ہے تو نہ باعثِ

تعجب ہے اور نہ موجبِ حقیر۔ یہ چھوٹے سے پہاڑ جس طرح سکندر یونانی (۔۔۔) نے دیکھے تھے اسی طرح عمرو بن العاصؓ

(629م) نے بھی دیکھ لئے تھے بلکہ ہزاروں سال کے بعد آج راقم الحروف بھی دیکھ سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اگر یہ اہرام نہ

ہوتے تو بابل کے معلق باغات (جن کی تصویر اور تعارف آئندہ ملاحظہ ہو گئے ان) کی تصدیق ایک افسانہ بن جاتی۔

## ذی الاوتاد کی پیدائش

حفریات (کھنڈرات کی کھدائی سے دریافت شدہ تصویری کتبات) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 2130 ق م میں "میدوم" کے شاہی محل میں ذی الاوتاد

کے والد "سفر و" ٹہل رہا تھا کہ اتنے میں ملکہ "حتب حورس" تشریف لے آئیں اور دونوں کا ذیل کا مکالمہ شروع ہوا۔  
سفر و: یہ میرے مبارک دن ہیں کہ آپ کی رفاقت نصیب ہے اور آپ کی بدولت میرے پاؤں عرشِ مصر پر متمکن ہیں کیوں نہ ہو جبکہ آپ فرعون حونی (HUNY) کی صاحبزادی اور فرعون "زوسر" کی پوتی ہیں۔  
حتب حورس: یہ سب آپ کا ذاتی جوہر ہے میں تو دوسرے درجہ کا ایک سارا تھی۔

سفر و: یہ حقیقت ہے کہ میں نے آپ کی قربت سے بوا سہارا لیا۔ آپ کی خوشنودی کیلئے سرکش سرداروں کا زور توڑ کر سر زمین وطن کو زبردست طاقت میں تبدیل کیا ہے اور۔۔۔ ایسے مضبوط ہرم بنائے ہیں جو آپ کے دوا "زوسر" کے ہرم سے بھی اونچے ہیں ایک "سقارہ" میں۔ دوسرا "دھشور" میں اور یہ۔ تیسرا "میدوم" میں۔ نیز "نوبہ" (NOUBAY) (حال سوڈان) پر چڑھائی کر کے متر ہزار غلام اور سو بجریاں پکڑ لایا ہوں۔  
ملکہ حتب حورس: فرعون سفر و کے جواب پر بے حد مسرور ہوئیں۔ اسکی نگاہیں جذبہ تشکر سے جھک گئیں اب سفر و نے اسکی مزید دلجوئی کیلئے متحرک بکرہ شب خوانی (SLEEPING ROOM) تحفہ کے طور پر پیش کر دیا۔  
ملکہ اسپر مزید وارفتہ ہوئیں اور فرط مسرت میں یہ کہہ کر مژدہ جانفز کا جوانی تحفہ نذر کر دیا کہ۔۔۔

اے فرعون! عظیم آپ کا تحفہ یقیناً گر بہا اور انمول ہے لیکن میری طرف سے جو تحفہ ہو گا وہ بھی لامٹانی ہو گا اور بدرجہا بہتر ہو گا۔۔۔ اسپر فرعون نے پورے اشتیاق سے استفسار کیا۔۔۔ تو معلوم ہوا کہ ملکہ "امید" سے ہیں اور چند ماہ تک وارثِ تخت و تاج کی ماں بننے والی ہیں۔۔۔ فرعون کی سماعت سے جب یہ نوید ہوئی تو فرط جذبات سے اپنے تخت سے نیچے اتر آیا اور گلوگیر ہو کر ملکہ سے کہنے لگا کہ ملکہ عالیہ میں اسی ہی مژدہ جانفز کا مختصر تھا۔ اور میں آپ کے جوانی تحفہ کا بدلہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ اب چند ہی ماہ بعد ایک لازوال فن پارے کے موجد اور والدین کی تمناؤں کے مرکز قرآن کے ایک طاغی فرعون "ذی الاوتاد" کا تولد ہوتا ہے۔ پورے ملک میں خوشی کے شادیاں منج جاتے ہیں پوری توجہ سے تربیت کا اہتمام کیا جانے لگتا ہے۔ قد مناسب۔ جسم گھٹا ہوا طاقتور۔ مونڈھے چوڑے۔ اور چہرہ بھرا ہوا۔ یہ تھا فرعون ذی الاوتاد کا حلیہ۔ اب ذی الاوتاد جب 12 سال کا ہوا تو فرعون سفر و راہیے ملکِ عدم ہو چلا۔ اس نے اپنی مادرِ مریان حتب حورس کی نگرانی میں امورِ سلطنت چلانا شروع کر دیئے اور دار الحکومت "میدوم" سے منتقل کر کے "جیزہ" میں لے آیا۔

## اہرام کی تعمیر کا ارادہ

نئے دار الحکومت میں کچھ عرصہ گزرا کہ ذی الاوتاد پھر سے اداس، غمگین اور

زیادہ وقت افسردہ رہنے لگا۔ ملکہ اور دربار نے اس نئے اندوہ و ملال کی وجہ دریافت کی تو ہونہار شہزادے نے بتلایا کہ۔ میں ایک ایسے یادگار منصوبے کی تکمیل اور آمیزی کا سوچ رہا ہوں جو اگر وجود میں آگیا تو میرا نام تابہ۔ زندہ رہے گا۔ یعنی میری خواہش ہے کہ ایک ایسا مقبرہ تعمیر کروں جو نہ تو مجھ سے پہلے کسی فرعون



نے ہوا یا ہو اور نہ ہی بعد میں مجھ سے کوئی ہم سَری کر سکے۔ میں نے سامنے وسیع و عریض میدان کے سرے پر ایک ماہر تعمیرات (ARCHITECT) کو مامور کر دیا ہے جو عنقریب نقشہ، آغاز کار اور تکمیل کے اخراجات اور وقت کی رپورٹ تیار کرے گا۔ اب ہوا یہ کہ انجینئر نے تمام مراحل کے تخمیناتی اخراجات اور کام کا نقشہ پھیلاتے ہوئے کہا کہ۔

”سورج کے اوتار۔ فرعون! عظیم نے جس قبر کا خیال پیش کیا ہے وہ بلاشبہ روئے زمین پر اپنی مثال آپ ہوگی اسکی تکمیل میں تیرہ ایکڑ ہموار زمین کام آئے گی۔ ملحقہ مندروں اور عمارت کا رقبہ علاوہ ہوگا۔ اسکی بلندی ایک سو چھیالیس میٹر۔ اور حجم پچیس لاکھ مکعب متر ہوگا۔ بڑے پتھروں کی سلوں کی تعداد دو لاکھ تین ہزار ہوگی۔ اور ہر پتھر کا وزن دو ٹن پانچ رطل ہوگا یعنی تمام وزن ساٹھ لاکھ ٹن ہوگا اور اصل قبر کا تعویذ گرائی پتھر سے بنایا جائے گا۔ عرصہ تعمیر بیس سال ہوگا۔ اور ایک لاکھ مزدور کام کریں گے۔ جو ہر تین ماہ بعد تبدیل ہو نکلے ان کی جگہ نئے مزدور لیں گے۔“ جب ذی اللاتاد نے اتنی ہیبت ناک اور ہوش ربا تفصیل سنی تو سر اسٹمہ و مضطرب ہو کر رہ گیا تاہم، سنہل کر حکم دے دیا کہ جو کچھ بھی ہو کام کرنا ہے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں تعمیرات کے ماہرین جٹ گئے۔ مزدوروں کی آغاز میں کالونیاں بنیں اور انہیں سہولت کار کے پیش نظر کئی یونٹوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ بعض پہاڑ کاٹنے پر متعین ہوئے۔ دوسروں کو پتھر کاٹنے اور ہینٹل کرنے کے کام پر لگا دیا گیا اور ایک پارٹی لکڑی یا لوہے کے ”پھسلوں“ کے ذریعہ تراشیدہ پتھروں کو اوپر لیجانے لگی اسطرح بیس برس میں تقریباً 8 ملین انسانوں نے ہلکے ایک چھوٹے سے پہاڑ یا قوی پیکل عمارت کو پہاڑ کے پیکر میں کھڑا کر دیا۔ اس طرح یہ اہرام جب تعمیر کے آخری مراحل میں پہنچا تو ذی اللاتاد کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کے مراحل میں داخل ہو چکے تھے اور وہ اب بے صبری کا شکار ہو چلا تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اکثر کہا کرتا کہ۔ میں اپنی زندگی میں اسے دیکھ بھی سکوں گا؟ کہ ایک دن اسے تکمیل کی نوید سنائی گئی۔ وہ اپنی آل و احفاد (FAMILY) کو ساتھ لے کر اپنے ہاتھ کے معجزے کو دیکھنے چل پڑا۔ پالکی میں اپنے دو شہزادوں خضر، اور منقرع کو اپنے ساتھ رکھا اور جب بلند و بالا ہرام کے دامن میں پہنچا تو اسکی چیخ نکل گئی اور بے ساختہ پکارا اٹھا کہ،

”لبیک اے مدفن! عظیم! اے وہ یادگار جو عنقریب تیرا پیٹ میری لبدی پناہ گاہ بننے والا ہے۔ اے وہ عمارت جس کے باعث میری روح اور میرا نام ہمیشہ ہمیشہ تک زندہ رہے گا۔“ اسکے بعد وہ شہوش ہو کر گر پڑا اور زندگی کی یہ آخری سانس تھی۔ اب اسکی لاش کو ”مومیا“ کر اسے اپنی ہی تعمیر کردہ قبر میں دفن کر کے پھر قبر کو ہر طرف سے بند کر دیا گیا۔ لیکن صدیوں بعد چوروں نے خزانہ لوٹنے کے لالچ میں نقب لگا کر لاش ہی کو غائب کر دیا۔ تاہم بارے غنیمت ہے کہ قاہرہ میوزیم میں اسکا ہاتھی دانت کا ایک بے نظیر ”مجسمہ“ (STATUE) جسکی لمبائی 15 سینٹی میٹر اور چوڑائی 7 سینٹی میٹر ہے محفوظ ہے۔ اور اسی کا فوٹو اگلے صفحے پر موجود ہے۔

معبود، خسو کے لوح سے پایا جاتا ہے کہ۔ فراغت۔ زندگی میں اپنا نام ظاہر نہیں کرتے تھے صرف خواص کو اصل نام تک رسائی حاصل ہوتی تھی۔ ان کی حکومت ان کے القاب سے چلتی تھی بلکہ

اصل نام

تاریخ القرآن سے پتہ چلتا ہے کہ۔ فرعون کے علاوہ بھی بہت سے نام صرف لقب ہی سے متعارف تھے۔ مثلاً ذی القرنین  
 ذی الیسع۔۔۔۔ ذی النون۔۔۔۔ ذی الکفل۔۔۔۔ ذی یزن۔۔۔۔ ذی نواس اور ”ذی الاوتاد“۔۔۔۔ عربوں  
 اور دیگر اقوام کی اسی عادت کے مطابق اہرام حیرہ کے بانی فرعون خوفین سحر و کوا کے لقب ذی الاوتاد ہی سے ذکر کیا گیا  
 ہے۔ (تمام شد)



(تصویر) فرعون ذی الاوتاد۔ اہرام کے اندرونی حصے کا معائنہ کر رہے ہیں۔

ناظرین محترم! یہاں تک سیر مقالہ ”فرعون ذی الاوتاد

کا زندہ معجزہ“ ختم ہو گیا یہ مقالہ ماہنامہ نقاد کراچی بابت

**میری خامکاری عنوان حقیقت بن گئی**

مئی 1957ء (صفحہ 49 تا صفحہ 52) میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کا ماخذ مصری اسطورے اور اثری کتاب تھے۔ اس کے لئے تحقیق و

ریسرچ کی بھی ضرورت نہیں تھی تاہم غنیمت ہے کہ ملک کے نامور محقق جناب خواجہ عباد اللہ اختر کی نظر سے گذر اور آپ نے مجھے قابل التفات سمجھا اور بروقت لغزشوں اور خام کاریوں کا نوٹس لیکر اگست 1957 کے نقاد ہی میں میری سرزنش فرمادی اور میں نے بھی اسے خندہ پیشانی سے سنا اور برداشت کیا کیونکہ اب حالات متقاضی ہو چلے تھے کہ میں عام اساطیری انداز سے ہٹ کر اپنے دفاع میں تحقیقی مواد سامنے لے آؤں اور مجھے احساس تک نہیں تھا کہ میری خام کاری آگے چل کر حقیقت کا عنوان بن جائے گی۔ بلاشبہ علامہ محترم کی گرفت مضبوط تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ لا جواب ہو۔ انہوں نے فراعنہ مصریہ۔ یہ کہ ماضی بعید میں جن فرمانرواؤں نے مصر پر حکومت کی ان کا اجمالی یا سرحدہ وار تذکرہ کیا تھا۔ جسکا میرے مضمون سے نفی یا اثبات میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ میں نے اگر اہر امات مصر کے بانوں میں ”خوفو“ (KHOFU) (خفوع) اور منفوع کو شمار کیا ہے تو آپ نے ان کی نفی نہیں فرمائی۔ (ملاحظہ ہو نقاد اگست 57 صفحہ 15/63) بلکہ ان کو اعتراض ہے تو یہ ہے کہ۔ میں نے خوفو۔ کو بحسوس فیلی میں شمار کیا ہے جبکہ ان کی استقراء کے مطابق۔ وحی قرآن نے شاہان بحسوس کو فراعنہ سے موسوم نہیں کیا۔ ”ملوک“ کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ (صفحہ 63 نیچے سے چار سطریں)۔ اب میرا اس پر اصرار نہیں ہے کہ بحسوس فراعنہ تھے یا نہیں میرا حاصل مطالعہ یہ تھا کہ اہر امات کے بانی جو کچھ تھے مصر کے باہر کے لوگ تھے جنہوں نے مصر کو اپنا ایسا وطن بنایا کہ بعد میں بھول کر بھی یمن کا نام نہیں لیا۔ (ملاحظہ ہو رواں مضمون کا عنوان ”ذی الاوتاد فرعون تھا یا بحسوس؟“) اور نہ صرف یہ کہ بحسوس کو میں نے ہی ”فرعون“ لکھا ہے خود علامہ محترم بھی لاشعوری طور پر فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ ملوک بحسوس کا خاتمہ (1600 ق م) میں ہوا اور اٹھارویں خاندان فراعنہ کا بانی احمس اول ہے۔ (صفحہ 63 سطر 20) اس طرح آپ نے جن کو ملوک لکھا تھا اسی ہی سطر میں ان کو ”فراعنہ“ میں بھی شمار کر ڈالا۔

ان معروضات کے باوصف میں نہ ”مصریات“ کا ماہر

### ذی الاوتاد۔ فرعون موسیٰ تھے یا خوفو؟

ہوں نہ زمانہ اور وقت کے تعین میں کوئی سائنٹفک

معلومات رکھتا ہوں لہذا کسی قسم کی تاریخی پیچیدگیوں کو حل کرنے کی علمی مزاحمت نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ بڑے اہرام کے بانی کو وحی قرآن نے ”فرعون ذی الاوتاد“ کہا ہے یعنی کہ اہرام کے بانی ایک ”فرعون“ ہی تھے اور آپ کو چاہئے تھا کہ آپ کسی علمی دلیل اور توانائی سے۔ ذی الاوتاد۔ کی فرعونیت کی نفی کر دکھاتے۔ یہ درست ہے کہ آپ نے بڑے ہرام کے بانی کو ”خوفو“ ہی تسلیم کر لیا ہے جس سے زمانہ اور وقت کا تعین آسان اور متفقہ ہو چلا ہے۔ لیکن اس اتفاق کے ساتھ۔ ذی الاوتاد۔ کو عہدِ موبے کے کسی فرعون کو فرض کر لینا محل نظر ہے اور باعثِ تعجب ہے کہ جناب نے میرے ہی حوالہ سے لکھا ہے کہ میں نے بھی ذی الاوتاد کو عہدِ موسیٰ ہی کا فرعون لکھا ہے اور پھر اس مفروضہ پر تبصرہ ہے کہ۔۔۔۔۔ ذی الاوتاد۔ موسوی دور کے کسی فرعون کا لقب ہے تو ظاہر ہے کہ غلط ہے کیونکہ اہرام تو ہزاروں سال پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔ (صفحہ 64 سطر 9)

لیکن میں نے کب اور کہاں لکھا ہے کہ اہرام کے بانی عہدِ موسیٰ کے فرعون تھے؟ یہ تو جناب کے ذہن کی نارسائی کی بدترین مثال ہے اپنی غیر ذمہ داری کو میری گروں کا بوجھ بنانے کا نہ جواز ہے اور نہ مناسبت۔ یہ درست ہے کہ میر اور جناب کا امیر اتفاق ہے کہ بڑے اہرام کے بانی ”خوفو“ ہیں۔ اور اسی نکتہ پر بات ختم ہو جانی چاہئے تھی۔

**وتد۔ گرداب معانی میں** ادبیاتِ عرب کی رو سے راقم نے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ اصل مضمون میں واضح کر چکا ہوں اسکے برعکس علامہ محترم کی تراوشِ فکریہ ہے کہ۔ وتد ایک مقدس نشانِ فراعنہ مصر کا تھا۔ تصویری حروف میں اسکی شکل یہ ہے۔  
سر کے حلقہ میں فراعنہ کا ہاتھ مصور کتبوں اور تصویری حروف میں دکھلایا گیا ہے۔

(نفاذِ کراچی پبلشنگس 57 صفحہ 64 کالم نمبر 1 سطر 19 تا 26)  
اوارہ ”ثقافتِ اسلامیہ“ کے فیلو علامہ محترم نے وتد کو۔ مذہبی نشان ٹھہرا کر شاید غور نہیں فرمایا کہ۔ آیاتِ زیر بحث میں۔ عظیم تخلیقات و تعمیرات کے ناطے سے عاد اول و ثانی۔ ثمودیوں اور فراعنہ کے غرور، جبر اور استبداد کو درمیان میں لا کر متنبہ فرمایا ہے کہ اتنے عظیم کارناموں کی تخلیق میں چونکہ بے بس و مجبور انسانوں کا خون پسینہ کام آتا رہا ہے اور وہ پیہم ”میگار“ کیپسوں میں مشقت کرتے کرتے در ماندہ ہوتے رہے ہیں لہذا اللہ سبحانہ نے اپنے قانونِ احتساب کو حرکت دی اور سب کے سب فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ (الفجر، 11-14) تاہم اگر یہ ”وتد“ مصریوں کا ایک مذہبی نشان تھا تو دو زاویوں کے تناظر میں بالکل ہی لغو اور مہمل بن جاتا ہے۔

۱۔ عم (7) کے زلویہ سے مذہبی نشان نہ ہو سکتا تھا کہ یہاں احسانِ جتنا نے کی ”ترکیب“ کام میں لائی گئی ہے جبکہ وہ مذہبی (مشرکانہ) نشان۔ انعاماتِ الہی میں شمار نہونے کی وجہ سے موجب تشکر نہ ہو سکتا تھا نیز  
۱۱۔ مذہبی نشان عجائباتِ دنیا میں راہ نہ پا سکتا تھا جہاں شداد کی جنت کی ساخت کا بیان ہوا رم ذاتِ العماد۔ کے مآربِ ذیم کی تعمیر اور تباہی کی بات ہو (\*) پتھر اور مدائنِ صالح کے کھدے ہوئے حجری مکانات کا ذکر ہو و ثمود الذین جابوا الصخر۔ وہاں اوتاد کے پیکر میں کسی مذہبی نشان کا عظیم تخلیقات کی صف میں در آنا کیا مناسبت رکھتا ہے؟ ہے کوئی جو اس الجھن کا حل بتا دے؟ اس وضاحت کے ساتھ ہی اب میرے استدلال ملاحظہ ہوں۔

**تبرکات محمد عبدہ** ناظرین محترم اگرچہ گو سالہ حدیث کا سامری نہیں ہوں تاہم اوتاد کی تشریح میں صحیح نہ کسی کوئی غیر معیاری حدیث ہی ہوتی تب بھی غور کیا جاسکتا تھا لیکن یہاں تو مطلع اور مقطع دونوں ہی صاف ہیں لہذا غور و فکر کے لئے نہ رکاوٹ ہے اور نہ ہی کسی طرح کی فکر شکن پابندی۔ لہذا میرے نزدیک ”اوتاد“ کی وہی تشریح موزوں اور صحیح ہے جو امام العصر محمد عبدہ (1905م) نے کی ہے فرماتے ہیں۔

وللمفسرين في الاوتاد اختلاف كثير . و اظهر اقوالهم ملائمة للحقيقة . ان الاوتاد . المباني العظيمة الثابتة . وما اجمل التعبير مما تركه المصريون من الابنية الباقية بالاوتاد فانها هي الاهرام ومنظرها في عين

(\*) مفسوس کہ مآرب کی ٹوٹی پھوٹی ذیم کی تصاویر کی حفاظت نہ کر سکا۔ سب کی سب نسیان اور غفلت کا شکار ہو گئیں۔

الرئ منظر الوتد الضخم المغروز في الارض بل ان شكله في هياكلها العظيمة في اقسامها شكل الاوتاد المقلوبة يبتدى القسم عريضا وينتهى بادق ما يبتدى و هذه هي الاوتاد التي يصح نسبته الى فرعون على انها معهوده للمخاطبين.

اوتاد۔ کی تشریح میں اہل تفسیر کا بڑا اختلاف ہے لیکن حقیقت سے میل کھانے والا ان کا یہ بیان ہے کہ ”اوتاد“ کے معنی عظیم الشان، ثابت اور مستحکم عمارات کے ہیں بلکہ مصریوں کے اُبلے ذوق نے دیوبند کل اہرام کے لئے ”وتد“ کا خوبصورت استعارہ تلاش کر کے۔ تعبیر کو نہایت خوبصورت جہت دیدی ہے۔ یہ اہرام موٹے ”کیل“ کی طرح ”شکم زمین“ میں گڑے ہوئے ہیں جو اپنی عظیم جسامت اور ساخت کی مختلف شکلوں میں ”الٹی“ میخ کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اس میخی عمارت کی اہراء کئی ایکڑ رقبہ پر پھیلی ہوئی ”چوڑائی“ سے ہوتی ہے پھر یہ چوڑائی سمتی سمتی ”اتنا“ میں میخ کی ”لوک“ کی طرح ”پتلی“ ہو جاتی ہے۔ اب ان ہی اہرامات کو اگر اوتاد۔ سے تعبیر کیا جائے تو سامع کا ذہن اسے قبول کرنے میں جھنجھک محسوس نہیں کرے گا کہ مشاہدے کی تائید بھی اسے حاصل ہو جاتی ہے۔

(تفسیر پارہ عم تصنیف محمد عبدہ طبع سوم مطالع الشعب قاہرہ صفحہ 57)

### لا شعوری لغزش

امام العصر نے غلط العوام سے دھوکہ کھا کر ”لا شعوری“ طور پر ”ذی الاوتاد“ کو فرعون موٹے خیال کیا ہے جبکہ یہ بات ان کی اپنی وضاحت۔ ان تاریخی نصوص اور کتاباتی شواہد کے منافی ہے جو اہرام کی تعمیر کو موٹے سے ہزاروں سال پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ بھی ان سینہ گزٹ روایات کا کرشمہ ہے جو حجتوں سے ہمارے ذہنوں میں راسخ کرتی آئی ہیں کہ جہاں بھی فرعون کا لقب آئے وہ لامحالہ فرعون موٹے ہی ہیں چنانچہ اس نفسیاتی یا لا شعوری لغزش کا نتیجہ ہے کہ حضرت امام العصر جیسے راہنما نے علم بھی غلط العوام کا شکار ہو گئے اور یہ کوئی اچھبے کی بات نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سورۃ غافر میں پڑھا ہو کہ۔ یا ہامان ابن لی صر حا لعلی ابلغ الاسباب اسباب السموات فاطلع الی الہ موسیٰ۔

اے ہامان (مذہبی قیادت کا لقب) میرے لئے اتنا اونچا محل بناؤ جس سے مجھے اوپر جانے کی تمام سہولیات میسر ہوں اور میں آسانی سے موٹے کے خدا کے پاس پہنچ کر پنچہ آزمائی کر سکوں۔

(غافر، 37)

یہ پڑھ کر خیال کیا ہو کہ فرعون موٹے مفتاح (Menephatah) نے بھی خدا سے جنگ لڑنے کیلئے اونچے دُمدے تیار کروائے تھے اور شاہجہاں کی طرح تعمیرات کے شہنشاہ بھی مشہور ہوئے تھے وہی فرعون ہی ہو۔ اور لا شعور چونکہ خود بھی ایسی توانائی ہے جو بسا اوقات ”شعور“ پر غالب آکر حقائق کو پس پردہ لیجاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ



یہاں بھی کام کر گئی ہو۔ جو کچھ ہوا ہرام کے بانی فرعون موئے نہیں تھے کہ وہ عہد وسطے کے فرعون تھے جبکہ اہرامات ماضی بعید کے فن پارے ہیں۔ آپ معمولی سی غیر ارادی، ٹیکنیکل خامی کو آڑ بنا کر امام العصر کے مقصد کو غلط جت دینے کی جسارت نہ فرمادیں۔

## دوسرے شاہد عادل

امام العصر نے تشریح اور لفظی تحلیل کر کے اہرامات مصر کے بانی ہی کو ذی الاوتاد تسلیم کیا ہے یہی بات مصری دانشور عبدالمتعال جبری نے ”النفحة الاولى“ (طبع مصر صفحہ 127) میں اور منسر۔ محمود احمد حجازی نے اپنی تفسیر ”الواضح“ (طبع سوم پارہ 30) میں واضح کی ہے۔ لیکن یہاں آپ کی معلومات کیلئے میں ایک ایسے حوالہ کا اضافہ کرنا چاہوں گا جو حرف قاطع کی حیثیت سے اہرامات ہی کو ”اوتاد“ ثابت کرتے ہیں میرا اشارہ امام۔ معین الدین محمد بن عبدالرحمان بن محمد بن عبداللہ۔ الایجی (905م) کی طرف ہے جن کی غیر مطبوعہ تفسیر کتب خانہ ظاہر یہ دمشق میں زیر نمبر۔ تفسیر 8 12 10 محفوظ ہے مجھے دسمبر 1957 میں اسی تفسیر کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اسکے حاشیہ پر لکھا ہے،

و غیر بعید ان یکون المراد بالاوتاد تلك الاهرامات الضخمة التي يغلب على الظن انهم بنوها يضاهون بها خلق الله في الجبال التي جعلها الله اوتاد الارض كما قال (والجبال اوتاد) و تلك الاهرامات دالة على ما كان عليه اولئك القراعين المجرمون من العتو والطغيان والتجبر على الله وعلى خلقه باذلا لهم وتسخيرهم في بتانها مع عدم الفائدة منها بتاتا فانها لم تنل للسكن وانما بنيت مقابر لاولئك المجرمين ولذلك وصفهم بالفساد.

یہ بات قرین عقل ہے کہ اوتاد۔ سے یہ دیو ہیکل اہرامات ہی مراد ہوں جو معلوم ہوتا ہے کہ اہرامات بنانے والوں کی غرض و غایت یہ ہو کہ یہ جو زمین کی مضبوطی کو کنٹرول کرنے کیلئے اللہ نے پہاڑ بنائے ہیں یہ اپنے اونچے اہرامات کے ذریعہ اللہ سے ہمسری کر سکیں جو کچھ بھی ہو یہ اہرامات بجائے خود اس بات پر دلیل ہیں کہ ان کے بانی سرکش، بغاوت اور استبداد میں کتنے بڑھے ہوئے تھے کہ اللہ کی بے بس اور مجبور مخلوق کو بیگار کیسوں میں قید کر کے ذلیل و رسوا بنا کر یہ اہرام بناتے رہے جبکہ ان کی تعمیر میں نہ مقصدیت شامل تھی نہ انسانیت کی فلاح و بہبود مربوط۔ یہ بالکل ہی فضول اور بے مقصد تھے۔ یہ نہ تو رہائش کیلئے تعمیر ہوئے نہ ہی کسی ارفع نصب العین کی تکمیل کیلئے۔ یہ ان جرائم پیشہ نافرمانوں کی قبریں ہیں جنہیں اللہ نے اہل فساد کے وصف سے ذکر کیا ہے۔

(جامع البیان علامہ ابن کثیر (905م) ج 1 صفحہ 426 سطر 22 تا 28)

قارئین محترم۔ یہ بھاری بھر کم حوالہ جات ان شکوک و شبہات کا ازالہ کر دینے کیلئے کافی ہیں جو اوتاد۔ کے مفہوم اور اہرامات کے بانوں کے بارے میں پیدا کئے جاسکتے ہیں میں نے تاریخی حوالوں اور ناقد محترم کے اپنے ہی اعتراف کے

موجب فرعون ”خوف“ کو بڑے اہرام کا بانی لکھا ہے اب اگر میدانِ تحقیق و تدقیق میں در آنے کی کسی میں ہمت ہے تو وہ یہ ثابت کر دیں کہ اہرام حمیزہ کے بانی کا نام خوف اور لقب ذی الاد تاد نہیں تھا اور جب تک کوئی اہل نظر اپنا جوہر تحقیق سامنے نہیں لاتے میری مصروضات اہرام ہی کی طرح بلند و بالا۔ مستحکم رہیں گی۔ وباللہ التوفیق۔

### بے مقصد تعمیرات

علامہ ابجی (905 م) نے جعفر مایا ہے کہ شہرِ خوشال ہمانے سے کوئی مقصدیت وابستہ نہیں ہوتی۔ یہ بلند و بالا عمارات بنا کر ان پر اترنا۔ کبر و نخوت کا مظاہرہ کرنا سب لا حاصل ہے۔ اللہ سبحانہ ان ہی عجائب کی عظمت کا حوالہ دے کر بانیوں کو احساس دلاتے ہیں کہ یہ کیا ہیں اللہ کے عجائبات ان سے لاکھوں کروڑوں گنا عظیم اور لا فانی ہیں تم کس کس بات میں عجائبات کی تخلیق کے ناطے سے اپنے کو لا فانی بناتے پھر دگے جب کہ تمہاری یہ عمارتیں نمونہ عبرت بن کر رہ جائیں گی اور تم معدوم اور فنا کے گھاٹ اتر چکے ہو گے۔ امپر ہمارے مشائخ پرست کہہ سکتے ہیں کہ۔ یہ اونچے ٹھاٹھ باٹ والی خانقاہیں ایک طرح کی سرائیں ہوتی تھیں جہاں۔ بادیہ پھاؤں اور زائرین کی رہائش و آسائش کا اہتمام ہوتا تھا۔ غریبوں، مسکینوں، بے کسوں، بے نواؤں، لاپاہجوں اور بے ساروں کی دیکھ بھال۔ خوراک، صحت اور آخری مرحلے پر کفن و دفن کا نیز ہمد و بست ہوتا تھا۔ لہذا مشائخ کے مزارات کو بے مقصد نہیں کہا جاسکتا۔ جی، نہیں مزارات کی بلند و بالا ساخت سے جو مقاصد وابستہ کئے گئے ہیں مندر اور معبدوں کے مقاصد بھی یہی کچھ بیان کئے جاتے ہیں یہاں جذبات کو نہیں تو لا جاتا۔ میزان تنقید میں حقائق کو رکھا جاتا ہے اور حقائق کی گواہی یہ ہے کہ بزرگوں کے نام پر جو کچھ تعمیر ہو تا رہا ان سے گدی نشینی اور موروٹی جاگیر داری کا رجحان پروان چڑھا۔ یہاں محنت اور دماغ سوزی کی بجائے۔ اجارہ داروں، مفت خوروں، شکم سیروں اور ”ہڈ“ حراموں کی کھیپ تیار ہوتی رہی جس سے کسی بھی مستحق شخص کو مادی یا روحانی مفاد نہیں پہنچ پایا۔ پھر اخلاقی زاویہ سے دیگر خرابیاں مستزاد۔ اس طرح جو اہل قبور جیتے جی اگر کہیں خدا پرستی کو شیوہ بناتے بھی رہے تو موت کے بعد وہی حضرات یزداں کی ٹمیری اور دلوں پر مُردوں کا راج قائم کرنے کا موجب بھی بنے رہے۔

اب رہا مشاہیر کیلئے یادگاری عمارتوں کا مسئلہ، تو ظاہر ہے کہ ان سے بھی انسانوں کا مفاد وابستہ نہیں ہوتا۔ مُردوں پر بلند و بالا عمارات کیلئے زرو جو اہر اڑانا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ شاہجہاں (1616 م) کا تاج محل بلا وجہ ایک لاثانی فن پارہ ہے مگر ہے تو اسکی اور اسکی زوجہ کی قبر۔ درجنوں ایکڑ قبعے میں زندہ انسانوں کی بود و باش یا بہبود کا اہتمام ہو تا وہ مردوں کی رسی آرام گاہ سے بہتر تھا۔ اسی طرح خوف و فتن سطر و نے آٹھ ملین انسانوں کو بیگار پر لگا کر اپنی قبر کو دنیا کے سات عجائبات کی صف میں شامل کر ڈالا۔ مگر ہے تو ایک قبر جسکی تعمیر میں لاکھوں انسان کام آئے۔ بانی پاکستان کی مزار کیلئے وسیع و عریض میدان جسکی ہزاروں گھرن بن سکتے تھے اسے صرف ایک انسان کی قبر کیلئے خاص کر دیا گیا۔ بیگار اگرچہ نہیں لی گئی مگر تعمیر کے لئے جو رقبہ خامس ہو اور پانی کی طرح جو پیسہ بہایا گیا اسکو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

غرض کہ علامہ ابجی (905 م) نے اہرامِ مہر کی ساخت کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے ہر فرد کے ذہن کو ٹھوکر

رسید کی ہے کہ وہ ان نمائشی اور غیر مقصدی کاموں میں نہ دلچسپی لیں اور نہ اس پر پیسہ اڑائیں۔

علامہ محترم رقم طراز ہیں کہ۔۔۔۔۔ قرآن میں شاہانِ حقیق سوس کو فراعنہ سے موسوم نہیں کیا گیا۔ ان کو ملوک کہا گیا ہے۔

**ذی الاتواد. فرعون یا ہکسوس؟**

(نقارائت 57 صفحہ 63 کالم 2)

یہاں ہکسوس فیملی کے فرماں رواؤں کو قرآن کے حوالہ سے ”ملوک“ ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اگر ”قرآن“ کا حوالہ ہوتا تو مزاحمت کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن علامہ محترم نے بھی چونکہ میرے جواب میں۔ ”اگر یہ تفسیر نہ ہوتی“ کہہ کر اپنی تنقید کا پلانتیر پھینکا ہے لہذا میری بھی مجبوری ہے کہ اپنی صفائی میں واضح کر دوں کہ۔ پورے قرآن پاک میں حقیق سوس کا لفظ کہیں بھی نہیں ہے لہذا ان کے لئے ”ملوک“ کا لقب تجویز کرنا ہی تکلف محض ہے۔ خاص کر یہ ملوک کا لفظ قرآن پاک میں اس مقصد کیلئے استعمال ہی نہیں ہوا سورہ نمل میں یلقیس نے سلیمان کی یلغار کے امکان پر ”ملوک“ کا لفظ صرف حکمران کے مفہوم میں استعمال کیا تھا۔ یاقوں سمجھئے کہ یہاں ملوک کی تلمیح سے سلیمان ہی مراد ہیں۔ ارشاد ہے۔

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوها . وهم یفعلون ۔

یہ ملوک (اور فرماں روا) جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کر دیتے ہیں اور اب بھی ایسا ہی کریں گے۔

(نمل، 34)

اس آیت میں داؤد فیملی کے فرماں رواؤں کو ”ملوک“ کہا گیا ہے۔ ادھر عریٰ اور عبرانی لڑچکر میں بھی سیدنا سلیمان کو نبی سے زیادہ ”ملک“ اور ”الحکیم“ کے وصف سے ذکر کیا گیا ہے یعنی کہ اس طرح بھی اسکا اطلاق ہکسوس فیملی پر نہیں ہوا۔ دوسرے موقع پر اسی لفظ کا انبیائے بنی اسرائیل پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ سیدنا موسیٰ نے قوم سے کہا کہ۔

اذکر وانعمۃ اللہ . اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا

اے قوم۔ تم اللہ کی نعمتوں کو مت بھولو کہ اس نے تم میں سے انبیاء مبعوث فرمائے اور تم ہی میں سے ملوک پیدا کئے (بلکہ) دیگر ایسے امتیازات سے نیز نوازا کہ دنیا والے ان سے محروم تھے۔

(مائدہ، 22)

اسی طرح یہاں بھی ملوک۔ کسی خاص حکمران فیملی کو نہیں کہا گیا۔ اور بحث کی خاطر اگر مان لیا جائے کہ اسراہیلوں ہی کو ملوک کہا گیا ہے۔ تب بھی کہنے والے سیدنا موسیٰ علیہ السلام تھے۔ قرآن ان کے ”کہے“ کا صرف ناقل ہے لہذا آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اسباط اسرائیل کو قرآن میں بھی ملوک کہا گیا ہے؟ اب یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن پاک نے بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ خود یا نقل کے بطور جن افراد اور قوموں پر ”ملوک“ کا اطلاق کیا ہے۔ ان میں ”حقیق سوس“ کا نام نہیں لیا تو پھر وہ کونسا قرآن ہے جن میں علامہ کے خود اختراعی حقیق سوس پر ملوک کا اطلاق تو ہوا ہے فرعون کا نہیں ہوا؟ یہاں میں نے حد ادب کا پاس نہیں کیا اور ”حقیق سوس“ کو علامہ محترم کی خود اختراعی کہہ ڈالا تو ناظرین محترم

یہ حقیقت ہے کہ۔ حیق سوس۔ نہیں بلکہ عربی تراجم اور کتبائی تاریخ میں جن لوگوں کو اہرامات کا بانی کہا گیا ہے انہیں ”ہکسوس“ کہا جاتا تھا جسکے معنی و مفہوم ”غیر ملکی“ حکمران کے ہیں یعنی مصری اپنی ”پہچان“ کی حد ”امتیاز“ باقی رکھنے کیلئے غیر مصری حکمرانوں کو ملوک الرعاة۔ یعنی بدیشی حکمران کہتے تھے اس سے ان کا مقصد اجنبی حکمرانوں کو نہ تو ”ہجو“ کے طور پر ”الرعاة“ کہنا تھا اور نہ ہی یہ حکمران اس امتیاز کو اپنے خلاف ”گالی“ سمجھ کر براماتے تھے اس طرح ہکسوس ان کے ہاں اگرچہ اجنبی تھے لیکن عملاً انہوں نے مصر کو ایسا وطن بنایا جو ابد الابد تک مصری ہی بنے رہے بلکہ ہزاروں سال کا مشاہدہ بتاتا رہا ہے کہ انہوں نے یمن کو کبھی ذہنی یادداشتوں کا جز بنایا ہی نہیں اب ان کے ذہن کی گہرائیوں میں مصر ہی رچ بس گیا تھا۔ اور اس طرح اگر قدیمی باشندوں نے انہیں ملوک الرعاة۔ کہہ کر۔ ان پر ملوک کا اطلاق روار کھا بھی تھا تب بھی قرآن کے حوالہ سے بات نہیں ہو سکتی تھی قرآن نے کہیں بھی انہیں ملوک نہیں کہا یہ علامہ کے ذہنی انتقال کا شاخسانہ ہے وہ دراصل قرآن کے حوالہ سے میراپتہ کاٹنے کی بلاوجہ زحمت فرما رہے تھے اور میں نہیں کہتا کہ۔ سیری ذہنی سطح اتنی بلند ہو چکی ہے کہ ”ہمدانی“ کے دوش پر پرواز کرنا میرا حق بن گیا ہے ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ناقد محترم نے غور نہیں فرمایا کہ۔ تاریخ کے ناطے سے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ فلاں کام کس حکمران کے وقت میں ہوا تھا اس طرح کام کی تاریخ۔ وقت اور زمانہ معلوم ہونے پر اس وقت کے حکمران کا تعین کرنا ہوتا ہے اب وہ فرعون ہے تو۔ ہکسوس ہے تو۔ ملکی حکمران ہے تو۔ غیر ملکی ہے تو۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔

فرعون کون؟ لقب یا نام  
فرعون علامہ محترم کے نزدیک قدیم مصری زبان میں ”باب عالی“ کو کہتے تھے۔ اور ان کے نزدیک یہ عربی کا لفظ ہے جو فرع سے مشتق ہے۔

(نقاد کراچی، اگست 57ء، صفحہ 4 کالم 1)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ فرع سے مشتق ہے اور نہ ہی اسکے معنی ”باب عالی“ کے ہیں۔ یہ قدیم مصری لفظ ہے اور عام طور پر سورج کو ”رع“ کہتے تھے اور مصر کا ہر فرماں روا اپنے کو سورج دیوتا کا اولاد یا نمائندہ مانتا تھا یہ غالباً ہیرا کلیٹی زبان کا لفظ ہے۔ کیونکہ قدیم مصری زبان کا رسم الخط تصویری ہوتا تھا اسمیں پرندوں، گھریلو جانوروں اور جنگلی درندوں کی تصویروں کو ”رمزی“ نشان کے طور پر لکھا جاتا اور انہیں رموز کے مطابق پڑھا اور سمجھا جاتا تھا۔

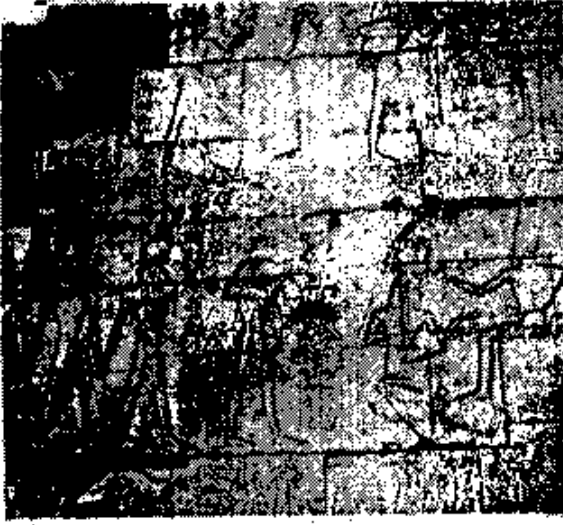
(تصویر کے لئے اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو دسمیس کے مندر ”الاقصر“ کی پیشانی)

یہ فرعون کا لفظ عرصہ بعد سورج دیوتا کے اولاد یا نمائندہ کے مفہوم میں استعمال ہونا متروک ہو چکا تھا اب یہ صرف مصر کے حکمران کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا تاہم ہر حکمران کے نام کا جز بننا چلا گیا۔ (ملاحظہ ہو ڈاکٹر صدیقی پاشا 1950ء) کی ڈکشنری بابت قدیم مصری اصطلاحات۔ یا اساطیر مصر یہ ”طبع وزارت ثقافت مصر“

عرض ہے کہ یہ فاروہ (Farah) کا لفظ تین ہزار سال کے طویل عرصے سے لسانی تغیرات کے مراحل طے کرتے کرتے نزول قرآن کے زمانے تک فرعون بن گیا۔ یہ کسی خاص فرد کا نام نہیں ہے جس طرح کسی زمانے میں تاتاری



## الفن الفرعوني



طبوكة . من نقوش معبد رمسيس



الاقصر . كتابات هيرغليفية على مسلة



الكرنك . معبد رمسيس

رمسيس دوم کے تعمیر کردہ مندر جو کھدائی میں دریافت ہوئے۔ مندر الاقصر کی دیواروں پر  
ہیروغلیفی تصویری رسم الخط میں کندہ کتبے

حکمرانوں کو خاقان۔ چین کے فرماں رواؤں کو فغفور۔ ترکوں کو سلطان یا پاشا۔ ایرانی ”وہ خداؤں“ کو شاہ یا کراے۔ مصری  
آقاؤں کو خدیو۔ یوننس اور لیبیا کے بادشاہوں کو ”بیگ“۔ روسی حکمرانوں کو زار۔ بلوچی سرداروں کو خان اور قسطنطنیہ و روم  
کے فرماں رواؤں کو قیصر۔ کہا جاتا تھا اسی طرح زمانہ قدیم میں ہر مصری آقا کو ”فرعون“ کہا جاتا تھا۔ قرآن پاک نے اسی  
”عمومی“ مفہوم میں اسے استعمال فرمایا اور ان حکمرانوں کو بھی فرعون کہا جو کسی دوسرے لقب سے پکارے جاسکتے تھے اس بنا  
پر ہمسوس اگر ”ملوک“ تھے تب بھی قرآن نے وہاں کے پرہیزگاروں کے مطابق انہیں فرعون ہی کہا بلکہ یہ جو سورہ مومن  
(37) میں ہے کہ۔ فرعون نے ”ہامان“ سے اونچا محل بنانے کو کہا تو اس سے فرعون ”خوفو“ بھی مراد ہو سکتے ہیں اور



ہامان کی تلمیح سے صرف ”مذہبی قیادت“ مراد ہے جو ہر فرعون کو فتویٰ کی کمک بہم پہنچا کر خدائی کے مقام پر بٹھائے رکھتی تھی۔ اسی طرح قارون۔ فراعنہ کے ان معاونوں کو کہا جاتا تھا جو ملکی خزانوں پر قابض اور انہیں صرف حکمرانوں کی خواہشات پر خرچ کرنے کا انتظام کرتے تھے اس طرح فرعون حکمرانوں کا ”مرمری“ لقب۔ ہامان مذہبی کمک پہنچانے والوں کی ”علامتی پہچان“ اور قارون وہ لوگ جو عوام کا خون چوس کر خود بھی عیش اڑاتے اور فراعنہ کے خزانے بھی بھرتے رہتے تھے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سورہ مومن میں جس فرعون کے ساتھ ہامان کا ذکر ہے اس سے کچھ ضروری نہیں کہ رعمیس اور اس کے مذہبی پشت پناہ ہامان ہی مراد ہوں کیونکہ فرعون رعمیس (ii) کی بابت لکھا ہے کہ مکان میلا الی البناء فشید الہیا کل والقصور فی النوبہ وطیوہ والاقصر والکرنک . عشر واعلیٰ مومیانہ فی دیر البحرۃ رعمیس دوم نے شام اور سوڈان کو فتح کرنے کے بعد تعمیرات کی طرف توجہ دی کہ وہ تعمیرات کا بے حد شوق رکھتا تھا اس نے سوڈان میں بڑے بڑے محلات و قصور اور مندر تعمیر کرائے۔ بالائی مصر کے قدیمی شہر طیوہ۔ اقصر اور کر تک میں اونچے محل بنوائے (1881م) میں ”ممفس“ شہر کے مندر کی کھدائی کے دوران اسکی ممی شدہ لاش دریافت ہوئی۔

(المنجد . فی الادب والعلوم صفحہ 219)

جو اسی وقت لندن کے دارالآثار میں پہنچادی گئی۔

تاہم اسکی تعمیرات میں اتنے اونچے ”دمے“ کا سراغ نہیں ملا جو اہرام کی اونچائی کی ہمسری کر سکے۔ جس سے درپچہ فکر مزید داہو جاتا ہے کہ جس فرعون نے ہامان سے اونچے ”دمے“ کی فرمائش کی تھی وہ رعمیس، اسکے مذہبی پیشوا ہامان نہیں تھے صرف اور صرف قدیم حکمران خوفوی تھے لیکن چونکہ اسکے اور اسکے بیٹے مصتاح کے پورے دور حکومت میں سیدنا موسیٰ کی ولادت، پرورش اور پھر عالم شباب میں انقلابی اقدامات کا تذکرہ ملتا ہے اسپر لوگوں نے خیال کیا کہ چونکہ سب انبیاء سے زیادہ حالات اور تفصیل سیدنا موسیٰ کے ملتے ہیں لہذا مصر کے ہر فرعون کو فرعون موسیٰ ہی ٹھہرایا۔ حالانکہ مصر میں ہر دور میں تین بڑوں کی حکومت رہی ہے اور تینوں میں ”کمپر دماز“ تھا۔ لیکن کچھ ضروری نہیں کہ یہ تین بڑے عہد موسیٰ ہی کے نامور بڑے یعنی رعمیس، ہامان اور قارون ہی ہوں۔ قرآنی دانشوروں کو اسپر غور



کرنا ہوگا۔

وتمود الذین جابوا الصخر بالواد

وتمود الذین جابوا الصخر بالواد



تصویر۔ پیٹرا تمذیب ثمودی تمذیب ہی کا چربہ ہے ملاحظہ ہو ”مدائن صالح“ شمالی حجاز۔

قوم ”ثمود“ جس نے چٹانیں کھود کر رہائش کا منفرد انداز اختیار کیا

رہ ط

وتمود الذین جابوا الصخر بالواد سے پہلے۔ ارم ذات العماد النبی لم یخلق مثلها فی البلاد۔ کا ذکر ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ارم“ بھی اپنے دور میں بڑی تمذیب اور ثقافت کی حامل قوم تھی جس نے صحراؤں خواہ جبال میں اپنی تعمیراتی تمذیب کے تابعدار نقوش چھوڑے جن کے اعتراف میں خود وحی قرآن گویا ہے کہ لم یخلق

وَمَثُودِ السِّدِّينِ جَابُوا الصَّخْرَ بِالسَّوَادِ





مثلھا فی البلاد۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ”ارم“ کون تھے؟ اسکی بابت سرسید (1898م) اور عبد اللہ العمدادی (1946) کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر جزیرۃ العرب کے باسی تھے بعد میں یہ ارم۔ عاد اول۔ اور عاد ثانی قبائل میں تقسیم ہوئے ان میں سے ایک فریق شمالی حجاز اور شام کے پہاڑی علاقوں میں سکونت پذیر ہوا انہیں ”ثمود“ کہا گیا اور دوسرا جنوب جزیرۃ العرب اور خلیج کے ریگستانوں میں وطن پذیر ہوا وہ ”عاد“ سے متعارف ہوئے اور ان کا وطن ”احقاف“ یعنی ریت کے ٹیلوں اور صحراؤں میں رہنے والے بنا۔ ارم کی دو شاخوں میں سے ثمودی زیادہ جفاکش تھے الذین جابوا الصخر بالواد جنہوں نے پیٹر اور مدائن صالح کے پہاڑوں کو کھود کر اپنے گھر بنائے جو ہزاروں برس بیت جانے کے باوصف یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی بنائے گئے ہیں بعض عمارات کے ستون یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے الگ نصب کئے گئے ہوں جبکہ وہ بھی کھدے ہوئے ہوتے ہیں یعنی پوری عمارت ایک پیس پر مستند ہوتی ہے اور جیومیٹری کے اصولوں کے مطابق اس خوبی سے بنائی گئی ہے کہ ایک دیکھ کر محو حیرت رہ جاتی ہے راقم نے ان کو ہستانی بسعیوں کو دیکھا ہے جن کے دیکھنے سے ہزاروں برس پہلے کے لوگوں کا تمدن آنکھوں میں گھوم جاتا ہے (تصاویر ملاحظہ ہوں)۔ دوسری شاخ والے عادی کملائے جنہوں نے صحراؤں میں ”نخیامی“ زندگی کو درجہ کمال تک پہنچایا جنہیں ایک سرحلے پر طوفانی جھکڑوں نے فنا کے گھاٹ اتار دیا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ”کھجور“ کے تنے گرے پڑے ہیں۔ اللہ سبحانہ نے دونوں دھڑوں کو قانون شکنی اور بغاوت کے نتیجہ میں ہلاکت اور تباہی سے دوچار ہونے کی خبر دی ہے فرمایا۔ واما ثمود فاھلکوا بالطاغیۃ یعنی ثمود تو خوفناک فنا کی جلیوں کی نذر ہو گئے واما عاد فاھلکوا بریح صرصہ عاتیۃ۔ اور عاد کو طاقتور جھکڑوں نے فنا کی دہلیز تک پہنچایا۔

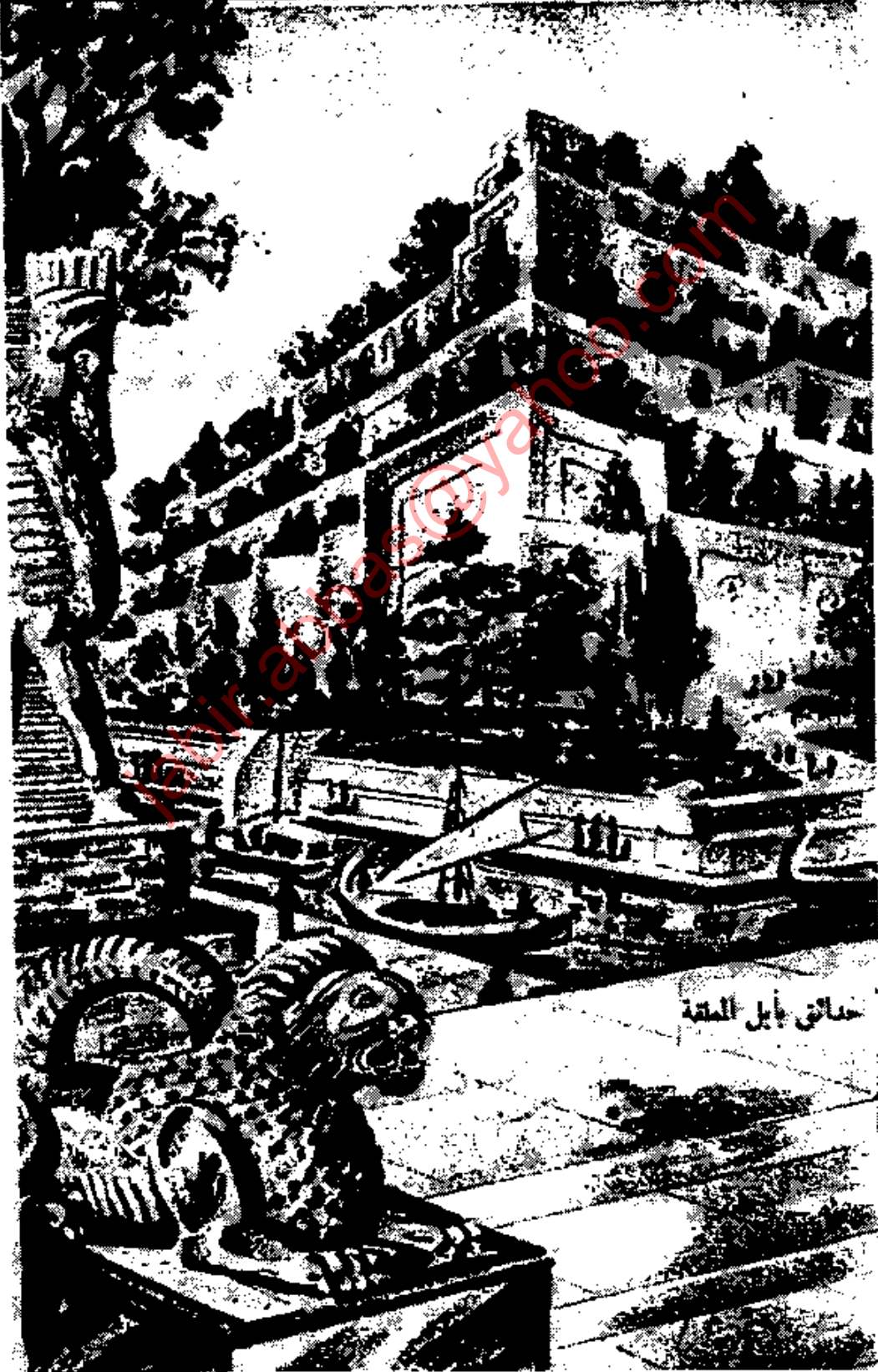
یہاں عاد کو۔ اعجاز فخل سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر لوگوں نے قیاسات کے گھوڑے دوڑا کر ان کی درازی قد کے افسانے تراشے ہیں جبکہ سائنسدانوں نے پختہ شواہد سے دریافت کر لیا ہے کہ انسان موجودہ سٹیپ (STEP) یعنی قد و قامت کے لحاظ سے 16 کھرب سال سے اسی طرح 4/1/2 سے انتہائی 6/1/2 فٹ تک کی قامت کا حامل چلا آ رہا ہے لہذا قامت کی بات تو ختم ہو گئی۔ البتہ ”اعجاز“ کا لفظ قابل غور ہے جسے بہرہ تکلف ”کھجور کی لمبائی کیلئے ایسپلائٹ“ کیا جاتا ہے جبکہ ”عجز“ کھجور کے تنے کے اس حصے کو کہتے ہیں جو زمین میں بکڑا ہوتا ہے نہ کہ پوری لمبائی کو۔ اس کے معنی تو یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کھجور کا درخت جتنا لمبا ہوتا ہے اسی تناسب سے اسکی لمبائی زیر زمین بھی ہونی چاہئے۔ لیکن زیر زمین لمبائی چونکہ کافی ہے اور جتنی کچھ ہے وہ بھی کمزور ریشوں کی جڑوں کی سر ہون منت ہے جو کہ زوردار جھکڑوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ جلدی اکھڑ کر زمین کی پشت پر دراز ہو جاتی ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو قومیں مضبوط سہارا نہیں رکھتیں حوادث کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

العماد۔ قوم ارم کے لئے صفت اضافی کی حیثیت رکھتا ہے یہ پہلو دار لفظ ہے اسکے معنی بنیاد اور مضبوط سہارے کے بھی ہیں اور خیمے کے وسط میں جو لائٹھی دے کر اطراف میں طنائیں کھینچ جاتی ہیں اس لائٹھی کو بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف ارم

کی اجمالی صفت ہے لیکن اسے اگر ٹمود سے مربوط کیا جائے اور مفہوم مضبوط عمارت کا لیا جائے تو بلاشبہ ان کی کھدی ہوئی عمارتیں عدیم الظہیر اور لازوال شاہکار ہیں اور عادی سے مربوط کیا جائے تو ان کی خیامی زندگی آج بھی پسندیدہ زندگی ہے۔



## بابل کے معلق باغات (ہمارق)



خداوند بابل المعلقة



قارئین محترم۔ مقالہ فرعون ذی الاوتار کے ضمن میں بابل و نینوا کی تہذیب کا ذکر بھی ہوا تھا لیکن ان کے کسی تعمیراتی شاہکار کا نام نہیں لیا گیا لہذا تفصیل سے کچھ لکھنا دشوار تھا لیکن چونکہ بابل کے معلق باغات کا تاریخ میں بڑا شہرہ تھا اور قرآن نے بھی خواہ مخواہ نفی لجبہ ہی میں اسی اسکے شعبہ ہا زوں اور جادو گروں کا نام لے کر ذکر کیا تھا لہذا میں چاہوں گا کہ لگے ہاتھوں اسکے معلق باغات کا تذکرہ بھی ہو جائے چنانچہ اب مقالے کے اختتام پر اس اضافہ کو ناگزیر سمجھ کر شامل کر رہا ہوں یہ درست ہے کہ آج بابل کے معلق باغات کا رسمی نشان تک باقی نہیں رہا صرف نام ہی نام ہے تاہم اسکے وجود کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے ماہرین نے ان باغات کو دنیا کی سات عجائبات میں شمار کر کے ان کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔

یہ ماہرین آثار کہتے ہیں کہ 745 قبل مسیح میں نینوی کے حکمرانوں نے بابل کو فتح کر کے قبضہ کر لیا لیکن محکومی کے باوصف اہل بابل کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہی اور انہوں نے 139 سال مزاحمت جاری رکھی تاآنکہ وہ دور بھی آگیا کہ کچھ ہمسایوں کے جنگی تعاون سے بابل والوں نے اہل نینوا کو شکست سے دوچار کر کے شہر نینوا کو اپنے قبضہ میں لے لیا تب سے بابل والے نئی امنگوں، نئے تقاضوں اور نئی منصوبہ بندیوں سے تعمیر و ترقی میں جُت گئے۔ ان کے بادشاہ ”نخت نصر“ (561 ق م) نے ساراشام اور فلسطین زیر کر کے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے آیا۔ اور ہیکار کیپوں میں قید کر ڈالا۔

بابل جدید کے بارے میں یونانی مؤرخ ہیرودوٹس (425 ق م) یہ تاثر دیتا ہے کہ۔ یہ شہر ایک ایسے ترفیع مقام پر چوکور۔ نقشہ کے مطابق تعمیر کیا گیا تھا جس کا ہر ”کونہ“ 15 میل لمبا تھا اور اسے ایک فصیل نے گھیر رکھا تھا اس فصیل کی اونچائی 250 قدم اور چوڑائی 87 قدم، تھی اس شہر کے بچوں پچ دریاے فرات بہتا تھا۔ اسکے معلق باغات تھے جو کائنات رنگ و بو میں پہلی بار متعارف ہوئے اور بابلیوں کی ترقی یافتہ سوچ اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کی چغلی کھاتے تھے۔ ان باغات کی تعمیر میں بڑی وقت اور بارش کی کو ملحوظ رکھا گیا تھا منزل دار اونچے نیچے طبقے تھے۔ ان عمارات کی بنیاد پتھریلی زمین پر رکھ دی گئی تھی۔ باغات کی سیر اہلی کیلئے بالائی چھت پر بڑے بڑے حوض بنادیے گئے تھے جنہیں دریاے فرات سے بھر دیا جاتا اور ضرورت کے مطابق ہر منزل کے باغیچے کی آب رسانی کی جاتی۔ ان میں نہ صرف چھوٹی جڑوں والے پودے اور درخت ہوتے تھے گہری جڑوں والے درخت بھی لگادیے گئے۔ ان منزلوں کی چھتیں اس قسم کے مسالہ سے پلستر کر کے پھر سیسہ پگھلا کر یا سیسہ کی چادریں بچھا کر متعلقہ عمارات کو پانی رسنے اور سرایت کرنے سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ یہ عمارتیں پتھر کے دیو ہیکل ستونوں پر استوار ہوتیں ان پر چھوٹے چھوٹے گنبد بنادیے گئے تھے کہ یہ گنبد عمارت کی عمر میں سائنٹفک اضافہ کرتے تھے اور یہ چھوٹے چھوٹے گنبد جبروں اور قلعہ نماز اویوں پر مشتمل ہوتے ان کو ایسے رنگ و روغن سے مزین و آراستہ کیا گیا تھا کہ ایک دنیا دیکھ کر دنگ رہ جاتی تھی۔ اور تزئین اتنی مہارت اور فن مصوری کے اصولوں کے مطابق کی گئی تھی کہ دنیا اس سے زیادہ سامان تزئین نہ کر سکتی تھی۔ سورج کی تیز کرنیں باغات اور مکینوں کو متاثر نہ کر سکتی تھیں۔ یہ تمام کام

ہزاروں یہودی قیدیوں سے لیا گیا جو سخت نصرت المقدس سے پکڑ لایا تھا۔



## اخذود۔ والوں کا انسانیت سوز کارنامہ (ر۔ طارق)

----- نقاد کراچی فروری 1958ء

دنیا میں شقاوت و قساوت۔ ہر دور میں صبر و استقامت سے نبرد آزما رہی ہیں۔ فرقہ پرستی جس نے دنیا میں ہمیشہ خون ریز فتنے برپا کئے اور انسانی آبادیوں کو، جس نہس کیا۔ قدیم ہی سے اعلیٰ اقدار کو ملیا میٹ کرنے کا ذریعہ بنی رہی ہے۔ حضرت موسیٰ جب توریت لکھنے کے بعد واپس آئے تو سامری قبیلے کے لوگ جو کہ گائے (ایزیس خدا) کی پرستش کے عادی بن چکے تھے۔ موسیٰ کی غیر موجودگی میں پھر سے ایزیس کی پوجا میں لگ گئے۔ اس پر آپ نے اپنے بھائی ہارون سے جواب طلبی کی ہارون نے کمانی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی میں اس بات سے ڈر گیا کہ کہیں آپ یہ نہ فرمادیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میرا پاس تک نہ گیا۔ (طہ، 50)

حضرت ہارون معاون پیغمبر تھے، کسی ذمہ داری پوری کرنے میں کوتاہی نہ کر سکتے تھے وہ کسی سے ڈرنے والے نہ ہو کر بھی خوف کھا گئے کہ کہیں اسرائیلی موحدا اور غیر موحدا فرقوں میں مٹ نہ جائیں لہذا قوم کے شرک پر خاموش رہے کہ آپ جانتے تھے کہ فرقہ پرستی ایسا زہر ہے جو انسان کے دل و دماغ میں سرایت کر کے مسموم اور نفع نہ پہنچاتا ہے۔ تعصب ایک جنون ہے جو بریت اور وحشی پن کی راہ دکھلاتا ہے وہ ظلم کرتا ہے تو ثواب سمجھ کر۔ اور ستم ڈھاتا ہے تو حورو غلمان کے حصول کی خاطر۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اخلاقیات کی تاریخ میں دو تین ایسے اذیت ناک واقعات کا سراغ ملتا ہے جنہیں اگر قرآن محفوظ نہ کرتا تو شاید کہ ذہنوں سے محو ہو جاتے یا خود اختراعی کمانیوں میں تبدیل ہو جاتے۔

I۔ سیدنا مسیح کی اذیت ناک داستانِ صلیب۔

II۔ مسیحی راہبوں کا رقیم کے غاروں میں روپوش ہو جانا اور

III۔ نجران کے آتشیں گڑھوں میں عیسائی مؤمنوں کو انسانیت سوز انجام سے دوچار کر دینا۔

ان میں سے آخری واقعہ چونکہ اس قدر دردناک اور اس قدر منفرد ہے کہ اسی کے ذکر کر دینے ہی سے انسان لرزہ بر اندام ہو جاتا اور مذہبی اخلاقیات پر یعت نہ بھجنا شروع کر دیتا ہے لیکن پہلے حکمران ”تبع“ (TUBBAA) فیملی کا تعارف اور دیگر پس منظر کی بات ہوگی۔ پھر واقعہ اخذود کی تفصیل۔

نئی تحقیقات سے واضح ہو تا ہے کہ یمن کی ”سبا“

یہودیت ”یمن“ میں کب داخل ہوئی؟

(SABA) سٹیٹ کسی زمانے میں مشرق و مغرب کیلئے

ایک عظیم شاہراہ اور مختلف تہذیبوں کا مرکز تھی۔ بحر احمر، خلیج فارس اور محیط ہندی کے تمام تاجروں اور جنگلی کے تمام قافلے یہاں آکر رکتے تھے۔ سب سے زیادہ اس تجارتی اہمیت سے یہودی غافل نہ ہو سکتے تھے چنانچہ ایک ہزار ق م سلیمان نے بحر احمر کی طرف توجہ دی اور خلیج عقبہ کی ایک بندرگاہ ”عصیون جابو“ کو اپنے بحری بیڑے کا مرکز بنایا کہ مملکت سب سے پہنچنے کیلئے بحر احمر کی طرف سے یہی راستہ تھا اور اسی راستے کے ذریعہ ہی سلیمان نے ملکہ بلقیس کو مملکت یروشلیم آنے کی دعوت دی تھی چنانچہ ملکہ اور سلیمان کی یہ دوسری ملاقات تھی جو فلسطین کی بندرگاہ ایلاتھ (عصیون جابو) میں ہوئی۔ سلیمان اور ملکہ کا یہی اجتماع یہودی کیلئے بڑا مبارک ثابت ہوا کہ انہوں نے اسی دن سے سب سے پہلے اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا لیکن عرصہ بعد جبکہ یہ سٹیٹ رومن اسمپائر کے تسلط میں آئی۔ انہیں یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ کاروبار تجارت جیسے کہ کھیتی باڑی میں بھی انکی نفری دن بدن بڑھتی گئی جس سے لوکل معیشت بری طرح متاثر ہوتی چلی گئی اسکے نتیجہ میں 70 ق م میں انہیں جلا وطنی پر مجبور کیا گیا جس پر ان ہی یہودیوں نے ایتھوپیا، عراق، بھارت اور چین کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ عراق میں رومنوں کے مقابل پر شین حکومت قائم تھی اور ان دونوں ہمسایوں کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی یہودیوں نے موقع غنیمت جان کر پر شین (Persian) حکام کے زیر سایہ آرمینیا میں یہودی سٹیٹ کے قیام کا اعلان کر دیا سیاسی زبان میں یوں کہو کہ یہ رومنوں کے حریف اور پارسیوں کے حلیف بن گئے اس طرح یہ سٹیٹ منتشر یہودیوں کو جمع کر کے رومنوں کا قلع و قمع کرنے کا ذریعہ بن گئی چنانچہ طویل مراحل طے کرنے کے بعد چھٹی صدی مسیح میں ”یمن“ جہاں سے کسی زمانے میں انہیں جلا وطن ہونا پڑا تھا وہاں یہودی سٹیٹ کی تاسیس عمل میں لائی گئی لیکن عملاً پہلی صدی عیسوی کے بعد ہی جزیرۃ العرب اور حجاز کے شہروں، یثرب۔ عک۔ تہما۔ خیبر اور تبوک وغیرہ میں خود عربوں کے حساب پر اپنی بالادستی کی دکان جمائی تھی نیز مسیح المکرمہ اور نجران انکے بڑے مراکز تھے۔ یہودیوں کی اس ”مساہلت“ کو روم اور یونان کے مسیحی مفسر استحسان نہیں دیکھتے تھے چنانچہ عراق سے خشکی اور باب المندب (عدن) کے راستے اور شام سے رومنوں اور یونانیوں کے خیراتی جہازوں پر سوار ہو کر بحر احمر کے ذریعہ ”یمن“ میں داخل ہوتے رہے نتیجہ یہ کہ عیسائی مہاجرین اور یہودی حکمرانوں کی آبادی برابر ہونے لگی۔

آبادی کی اس بڑھوتری سے پہلے تو یہودی خاموش رہے کیونکہ رومنوں کی طرف سے خود مسیحوں پر بھی قدغن تھی لیکن اسی اثنا میں ہوا یہ کہ رومنوں کے یہودی بادشاہ

## حکومتوں کا ادل بدل

فلسطین (306-337 ق م) نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور اسکے بعد اسکے جانشین ”تھیوڈیسس“ (379 ق م) تا (395 ق م) نے مسیحیت کو سرکاری مذہب قرار دیا جبکہ ان کی دیکھا دیکھی سوزان۔ آرمینیا۔ اور مصر کی تین ریاستوں ”مکرر (Mukarar)“، ”مرس“ (Murs) اور ”الوا“ (Alwa) نے بھی مسیحیت کا اعلان کر دیا لوگوں نے ساتھ دیا کہ وہ رومنوں کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ اور اب لوگوں کے پے درپے مسیحیت قبول کرنے سے یہودیوں کا رشک و حسد بھی بڑھا اور یہ اندیشہ بھی دامنگیر ہو چلا کہ کہیں مقامی مسیحوں کو بیرونی امداد کے سارے بغاوت پر اکسایا نہ جائے۔ چنانچہ یہودیوں کا یہ اندیشہ درست نکلا

کہ ”اکسوم“ (Aksum) (ایتھوپیا) کے بادشاہ ”الاعمد“ نے مسیحوں کی نصرت و حمایت کیلئے 345 م میں سباء پر چڑھائی کر دی۔ سباء کی آبادی نے جو کہ بدیشی یہودیوں کے ہتھکڑی نہ نظام حکومت سے شاکی تھی اکسوم کے بادشاہ کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ کلیسا کی تاریخ بتلاتی ہے کہ ”الاعمد“ کے قبضہ یمن کے دوران قسطنطین نے 337 تا 351 پادری ”تھیوفیلس“ کو تبلیغ کیلئے بھیج دیا اس نے ”ظفار“ (Zifar)، ”عدن“ اور ”مقطا“ (خلیج فارس) میں گرے تعمیر کئے اور یمن کے عیسائیوں کا لاٹ پادری قرار پایا۔ پھر جب 356 م میں وہ واپس چلا گیا تو نیا پادری۔ بحر ان۔ ہرمز۔ اور ”سقتری“ کا ناظم بھی مقرر ہو گیا اور پادری بھی لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حبشیوں کی یہ حکومت دیرپا ثابت نہیں ہوئی کیونکہ 378 م سباء پر ”تبع“ (TUBBA) خاندان کا ایک مقامی مردار ”کوب یہامن“ حیثیت حاکم نظر آتا ہے جس نے اپنے لئے سباء ذریعہ ان۔ حضر موت اور سمنا۔ کا بادشاہ لقب اختیار کیا پہلے یہ حکومت دو حصوں میں تقسیم تھی ایک حصہ سباء سے موسوم تھا دوسرا حضر موت سے بعد میں ”حارث رائس“ جب حکمران ہوا تو اس نے دونوں حصوں پر قبضہ کر کے ایک سلطنت میں ”ضم“ کر دیا اب چونکہ سب نے اسکی متابعت کی اس مناسبت سے حکمران تبع کلائے قرآن پاک نے قریش کو اسی حکمران قوم کے حوالہ سے اغتباہ کیا ہے کہ ان سے تو ”قوم تبع“ والے اچھے تھے اہم خیبر ام قوم تبع (دخان، 37) اسی تبع خاندان کے بارے میں حمزہ اصفہانی (970 م) نے لکھا ہے کہ اسکے 25 بادشاہ گزرے ہیں۔ (تاریخ سنی الملوک طبع لہجہ 1848 صفحہ 124) غرض کہ ”گرب یہامن“ نے دیکھا کہ مسیحی جو کہ ساتھ حکمرانوں کی وجہ سے طبعاً زور آور طبقہ بن چکا تھا انہیں برا ملا کچلنا برا کٹھن مرحلہ تھا جبکہ اسکے بغیر مسیحیوں کا استحکام ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ لہذا اسکے ذہن میں آیا کہ کسی طرح یہودیوں کو اعتماد میں لے کر ہموار بنایا جائے چنانچہ اس نے یہودی مذہب اختیار کر لیا۔ دراصل یہودی ہوں خواہ مسیحی دونوں کو شاں تھے کہ سباء کی مقامی آبادی یا حاکم اعلیٰ (گورنر جنرل) ان کا ہم خیال ہو تاکہ اس کے ”جلو“ میں آزادی سے، اپنے خیالات اور عقائد کی نشر و اشاعت بھی کر سکیں اور سٹیٹ کا مذہب بھی ان کی پسند کا ہو بلکہ مساوات دونوں مذاہب اس دور میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں چنانچہ اسی ”تبع“ خاندان کا پانچواں بادشاہ ”عبد کلام“ مسیحی نظر آتا ہے جبکہ اسکا بیٹا ”شر جیل یتف“ یہودی۔ جبکہ مجموعی آبادی کا مذہب ”ہت پرستی“ تھا جو الہ السماء۔ الا لہ رب السماء والارض۔ اور۔ الرحمن کی مورتیوں کو پوجتی تھی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی اسی رقیبانہ مسابقت میں یہودی کامیاب ہو گئے۔

### ذونواس پردہ سکریں پر

یوسف نامی یہودی جس کا عرف ذونواس اور کنیت ابو سمان تھی 522 م میں تبع کے حاکم کو شکست دے کر بالفعل یہودی سٹیٹ کا بانی قرار پایا۔ یہ شخص قساوت قلبی اور جبر و تشدد کا منحوس بیکر تھا۔ بالخصوص مذہبی جنون نے جذبہ انتقام میں شدت پیدا کر دی تھی۔ لہذا اب کی دفعہ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ تورات کی خوشنودی کیلئے جتنے ظلم اور جتنی چیرہ دستی کا مظاہرہ اس سے ہو سکے گا کر ڈالے گا چنانچہ اس نے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی عیسائیوں کو کچلنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی یہودیوں اور مقامی ہت پرستوں کے جبری تعاون سے عرب میں



یہودیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ ادھر سیاسی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ییز نطینیوں کے جانی دشمن مجوسیوں (ایرانی حکومت) سے دفاعی معاہدہ کھریا۔ اس طرح یہودیوں کی حلیفانہ ضرورت بھی پوری ہو گئی اور ذونواس بھی تنہا نہیں رہا۔ لیکن قبل اسکے کہ یہ سیاست بار آور ہو حبشہ (ایتھوپیا) کے بادشاہ ”اصبح“ نجاشی کو اس کا علم ہو گیا اور اس نے ذونواس کے عزائم کو خاک میں ملا دیا یعنی دفاعی معاہدہ کے نتیجہ کا انتظار کئے بغیر ہی 523 م میں ”یمن“ پر حملہ کر دیا جسکی تاب نہ لا کر ذونواس پہاڑوں میں چھپ گیا ادھر اصبح نجاشی ساحل یمن کی تمام ریاستوں اور ”ظفار“ (راجدھانی) مسکیوں کے تسلط میں دے کر واپس چلا گیا۔

دھوکہ، فریب اور مکاری یہودی سیاست کے اہم عناصر ہیں۔ اصبح نجاشی **یہودی ”وار“ خطا نہیں جاتا** اُسے، نہیں سمجھ سکا۔ وہ یا تو ”کودن“ تھا یا یہودی نفسیات سے بے خبر یا پھر یہ کہ وہ حزقی سائینس کا اور اک نہیں کر سکا اور ذونواس کے بھاگ کر چھپ جانے کو آخری قحمدی سمجھ بیٹھا اور غفلت و نادانی سے بے گناہ مؤمنین پر فنا کی جلیاں کڑکانے کا موجب بن گیا۔ اس نے سمجھا کہ تمام ریاستیں مسکیوں کے تسلط میں آنے سے ناقابلِ تسخیر ہو جائیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اصبح کے حبشہ سے جاتے ہی ذونواس پہاڑوں سے اتر آیا اور راجدھانی ظفار پر حملہ کر کے گرجا گھروں کو توڑ پھوڑ دیا پھر ریاستہائے یمن پر قبضہ کر کے نجران کی طرف متوجہ ہوا کہ عیسائیت کا مضبوط مرکز یہی نجران ہی تھا چنانچہ ”شر جیل یکتف“ نے وزیران یہودی چیف آف شاف کی قیادت میں نجران کے محاصرے کا حکم دیدیا اور محاصرے سے پہلے یہ چال چلی کہ عراق، سیریا اور دیگر عرب ممالک کی سرحدوں کو ”ہند“ کر دیا تاکہ اسکے زیرِ تجویز قتل عام کے منصوبے کا پتہ نہ چل سکے ادھر شوئے قسمت کہ سمندری موسیٰ ہوائیں ناسازگار تھیں اور ”حبشہ“ سے کسی فوری جوابی کارروائی کا امکان معدوم تھا۔ اب ذونواس اور وزیران نے بے اندیشہ ہو کر ہمہ تن مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کیلئے بڑی سرعت سے تیاریاں شروع کر دیں اور نومبر 524 م میں بے بس مظلوم عیسائی رعایا کو گھیرے میں لے کر یہودیت یا موت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ مؤمنین نے موت کو ترجیح دی کہ ان کے عقیدے کے مطابق یہودیت بھی موت کا دوسرا پیکر تھا نتیجہ یہ کہ ان مسیحی اصحاب ”عزیمت“ نے اپنے ضمیر اور عقیدے پر قائم رہنا پسند کیا اور ”رخصت“ کو نفاق اور بزدلی کے مترادف ٹھہرا کر لہدی صداقت کی سر بلندی کا تہیہ کر لیا اور ذونواس کو شہادت کے جرعہ شیریں نوش کرنے کا اشارہ دے دیا مؤمنین کے اس مایوس کن جواب پر ذونواس اور وزیران نے مختلف مقامات پر خندقیں کھودنے کا حکم دیدیا پھر حکم دیا کہ ان خندقوں میں آگ بھڑکادی جائے پھر اپنے جلاوٹوں کے ذریعہ مؤمنین کو ان دہشت خندقوں میں دھکیلنے کا عمل شروع کر دیا اور جلاوٹوں کا یہ بدکردار ٹولہ خندقوں کے کناروں پر بیٹھ کر جلنے کا تماشہ کرنے لگا۔ پہلے جہاں لکڑی کا ایندھن تھا اب انسانوں کا ایندھن بھی شامل ہو گیا اور اس ہولناک منظر پر انہیں ذرہ بھر رحم نہ آیا قرآن حکیم میں ہے،

تہا ہو گئے اخذ و دالے ان خندقوں کو آگ سے بھرنے والے اور پھر کناروں پر بیٹھ کر مؤمنوں کے



جلنے کا تماشہ کرنے والے۔ (ہائے افسوس) بے بس انسانوں سے یہ وحشیانہ سلوک اس لئے روا رکھا گیا کہ وہ صاحبِ ستائش خدائے غالب پر ایمان لائے تھے۔ (بروج، 8۲4)

یہ مقتل کہاں قائم تھے؟ ان جریر (923م) نے لکھا ہے کہ یہ خندقیں نجران ہی میں تیار کر لی گئی تھیں مگر جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے اور ”فلپی“ اسے ہی ترجیح

دیتے ہیں کہ۔ اخدود کا محل وقوع ”القابل“ اور ”رجلہ“ کے مابین ہے جو کہ نجران کے آثار قدیمہ کا علاقہ ہے۔ فلپی نے ان شہداء میں سے ایک کی قبر بھی دیکھی ہے۔

اس ہولناک حادثہ فاجعہ کی بابت دود ستاويزات

دریافت ہوئی ہیں جو دستاويز 507 اور دستاويز 508

**کتنے مؤمنین فنا کے گھاٹ اُتارے گئے؟**

کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں لکھا ہے کہ دونوں اس نے چودہ ہزار مؤمنین کا نذرانہ جان وصول کیا اور گیارہ ہزار غلام بنائے اور دو لاکھ مویٹی غصب کئے لیکن کلیسا اور عربی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ شہداء کی تعداد بیس ہزار تھی۔

**ناظرین محترم:-** قرآن محکم کی رواداری ملاحظہ ہو کہ اس نے کمال دلسوزی اور گہرے افسوس کے ساتھ اس

حادثہ فاجعہ کا ذکر کر کے واقعہ نجران کو زندہ جاوید بنادیا ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اسی ”تبع“ خاندان کے حکمرانوں نے جب ”عوم“ ڈیم بنایا جسکے دائیں بائیں باغات تھے سبزے تھے قرآن نے۔ تبسین کے ساتھ یاد کیا (دخان، 37) کیونکہ قرآن تعصب اور جانبداری کی حوصلہ افزائی، نہیں کرتا۔ لیکن اسکے برعکس مسیحیوں نے قرآن کے احسان کا بدلہ یہ دیدیا کہ اخدود والے یہودیوں کی طرح انہوں نے بھی 1492م اور 1592م کے مابین پین کے چراغ سحری مسلمانوں کو چن چن کر زندہ لقمہ آگ بنادیا۔ نتیج کیا تحریک ارتداد کے حوالے سے زندگی کی حرارتوں سے محروم کیا اور آج حالت یہ ہے کہ اتنی عظیم قوم کا پین سے نام و نشان تک بتانے والا بھی نہیں ملتا بلکہ آج کے اٹمی، سائینسی اور علمی دور میں صیہونیوں کی پشت پناہی کر کے (15 مئی 1948م) کورات کے 12 بچے برطانوی انتداب ختم ہوا وہی منٹ بعد صیہونی ریاست کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ کیا اس سے بڑھ کر بے شری، ڈھٹائی، نمک حرای اور احسان فراموشی کی مثال ہو سکتی ہے؟ قرآن سچ کتا ہے ولن ترضیٰ عنک الیہود والنصارى حتى تتبع ملتہم۔

عبداللہ الہمدی (1946م) کی تحقیق یہ ہے کہ اس حادثہ فاجعہ کے رد عمل میں جو کرام مچا

**ظلم کی شکست**

اس سے نجران کے دیہات و قصبات نے فوراً مسیحیت قبول کر کے یہودیت کو بری شکست

سے ہمکنار کیا۔ لیکن کلیسا کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پھر ان کے ”محصور مسیحیوں میں سے“ دوس ”ذو ثعلبان“ نامی ایک مؤمن بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور بیزنطینی حدود میں داخل ہو کر بادشاہ سے تمام قصہ بیان کر دیا جس پر تمام مملکت میں صف ماتم بچھ گئی۔ بادشاہ نے حبشہ کے عیسائی فرماں روا صبح نجاشی کو لکھا کہ اپنے دینی بھائیوں کا جب تک انتقام نہیں لیا جاتا ہم مسیحی حکمرانوں کو چین سے بیٹھنا حرام ہے اسی کے ساتھ صبح کے پاس بیزنطینی بحری بیڑا بھی پہنچ گیا۔ ننگے

سر۔ لمبے بال۔ طویل جبت۔ کمر میں پٹکے لپٹے ہوئے اور ہاتھ میں صلیب کا مقدس نشان لئے اللہ والوں کا یہ قافلہ جہاد پر چل پڑا (صلیب کا نشان قسطنطین نے 312م میں مذہبی نشان قرار دیا تھا) اس وقت فصل بہار کی ابتداء تھی یہ موسم ختم ہوا تو یمن کے ساحل پر مجاہدین کا بیڑا لنگر انداز ہوا۔ اب موقعہ پا کر 18 مئی 525م کو اصبح نجاشی نے خدائے لایزال کی کبریائی کے نعروں سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا اور مجاہدوں نے تابو توڑ حملہ کر دیا باطل سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا دونوں اس کی دفاعی لائن ٹوٹ پھوٹ گئی۔ حمایتی تتر بتر ہو گئے حالات کے گھیرے میں آکر دونوں اس نے خودکشی کا سوچ لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر سمندر کی موجوں میں اتر گیا پھر آج تک نہ نشان ملانہ پتہ چلا۔

### طلوع سحر

526م کو مؤمنین نجران کو فتح بین نصیب ہوئی اس واقعہ کی شہرت تمام عرب اور باب المندب کے پار ملکوں میں آفتاب نصف النہار کی طرح پھیلی ہوئی تھی اسکے ٹھیک 45 سال بعد 571م میں دنیا میں مسیح علیہ السلام کی پیشگوئی کے مصداق فاران کی چوٹیوں سے آفتاب عالم کا طلوع ہوا جسے دنیا محمد رسول اللہ ﷺ کے نام سے جانتی ہے کفار اور یود نے آپ کے مشن اور مقاصد میں روڑے اٹکائے اذیتوں سے دوچار کیا بلکہ 610 سے باقاعدہ منظم طریقے پر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کا گھیرا تنگ کیا سید البشر ﷺ اپنے مختصر ساتھیوں کو لے کر حبشہ کو چل پڑے۔ حبشیوں کو احساس ہوا کہ ماضی میں مسیحی مؤمنین بھی ایسی وحشتناک سزاؤں سے دوچار ہو چکے تھے خاص کر قرآن نے بڑے دلسوز لہجے میں اسکا ذکر بھی کیا اور عفت مریم کو نمایاں بھی چنانچہ اسی اعتراف کے شکرے میں انہوں نے سید البشر ﷺ کی خدمت اور میزبانی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی بلکہ مسلمان آج تک ان کے احسان کو نہیں بھولے۔



### موسیٰ اور فرعون (ر۔ ملحق)



موسیٰ



حضرت موسیٰ

اذہبا الی فرعون انه طغیٰ۔ فقلوا لہ قولا لینا لعلہ یتذکرا ویخشیٰ

تم دونوں (موسے و ہارون) فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے۔ پھر جب اس کے پاس پہنچو تو ( سختی کے ساتھ پیش نہ آنا) نری سے بات کرنا۔ (تمہیں کیا معلوم؟) ہو سکتا ہے کہ نصیحت پکڑ لے یا۔ عواقب سے ڈر جائے۔

(ط، 43، 44 ترجمان القرآن 450/2)

گرامی قدر طالبانِ قرآن : --- میرا یہ قسط وار مقالہ ہفت روزہ نصرت لاہور ہفت 10 ستمبر 59 - 27 ستمبر 59 - 4 اکتوبر 59 - اور 11 اکتوبر 59 کو چھپا تھا انہیں سیدنا موسے اور فرعون کو اس طرح آنے سامنے دکھایا گیا تھا کہ سیدنا موسے کے محسوسات ii۔ اور فرعون مضمون کے ساتھ تمام واقعات مربوط اور مسلسل نظر آنے لگے تھے۔ میرے اس مقالہ کا مأخذ مصریات پر مستند اور مفصل کتاب "دیانة مصر القديمة" تھا جو مجھے خود کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا اسکے مصنف غالباً ڈاکٹر بروغش تھے اسکے آخر میں قدیم مہری اصطلاحات اور ناموں کا عربی و انگریزی میں انڈکس بھی دیا گیا تھا جس سے تلفظ کا غلطی پتہ چل سکتا تھا۔ یہ تقریباً سات سو صفحے کی کتاب تھی اب کہ مجھے ناموں اور بعض اصطلاحات کا مقابلہ کرنے ممکنہ اغلاط کی تصحیح کرنا تھی وہ کتاب نہ مل سکی میں نے بہ اس پیرا نہ سالی اپنی لائبریری چھان ماری مگر مطلوبہ کتاب نہ مل سکی۔ مگر وہاں زمانہ نے میرا حافظہ چھین رکھا ہے مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مجھ سے کون لے گیا ہے۔ اب جس حالت میں بھی نام اور اصطلاحات میرے طبع شدہ مقالے میں درج ہیں انہیں بعینہ رہنے دے رہا ہوں۔ لہذا کہیں لغزش قلم محسوس ہو تو درگزر سے کام لیں اور خود ہی اصلاح کرتے چلے جائیں۔ ضمناً یہ بھی عرض کروں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا دو فرعونوں سے دعوت تبلیغ کا سلسلہ چلا تھا۔ فرعون ii کے آپ متنبے تھے۔ وہ کچھ عرصہ زندہ رہ کر مر چلا تھا اب آپ کے اہداف و مقاصد کا اصل نشانہ فرعون منکو تھا جسے ط، (43) میں سرکش اور باغی کہا گیا ہے۔ امام الہند ابو الکلام علیہ الرحمۃ (58) فرماتے ہیں،

”یاد رہے کہ جس فرعون کی طرف اب حضرت موسے جارہے ہیں یہ وہ نہیں ہے جس کے محل میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ وہ مرچکا تھا اور دوسرا فرعون تخت نشین ہو چکا تھا۔“

(ترجمان القرآن 450/2)

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ،

”پس آیت (43) میں ”اذہبا“ کا خطاب پہلے واقعے سے تعلق نہیں رکھتا بعد کا واقعہ ہے۔“

(ترجمان القرآن 450/2)

قارئین محترم : پہلے میرا خیال تھا کہ الفاظ کے انتخاب میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے۔ استدلال و اظہار کیلئے الفاظ کی درپوزہ گری چنداں ضروری نہیں ہے لیکن عمر کے جب پانچ عشرے گزر گئے تو احساس ہوا کہ الفاظ کے انتخاب ہی سے تو مفہیم میں نکھار، حسن اور زور پیدا ہوتا ہے غیر منتخب الفاظ ان مقاصد کی تکمیل میں کوئی رول ادا نہیں کر سکتے۔ لیکن اب

وقت گزر چکا تھا اور میرا مزاج ”انتحالی“ سے زیادہ ”بلاغی“ یا ”استدلانی“ طرزِ کلام میں ڈھل چکا تھا۔ تاہم کوشش رہی کہ الفاظ کے حسن و قبح کا خاص خیال رکھوں۔ (رحمت اللہ طارق۔ 13 مارچ 1995)

ہمارے قصبے کا آغاز مصر کے شمال مشرق میں واقع وادی ”طمیلات“ سے ہوتا ہے جہاں فرعون اپوفس (1898 ق م) کے عہد میں اسرائیلی قافلے آنا شروع ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ انکی جمیعت یہاں تک بڑھ گئی کہ بعد کے فراعنہ کیلئے دائمی اضطراب، مستقبل در دسر اور ہیثم کبیدگی کا موجب بنی رہی چنانچہ ایک بار جب فرعون نرہس (1400 ق م) نے لویوں (لیویا والوں) کو شکست فاش دے کر شام و فلسطین کو ان کے تسلط سے آزاد کر لیا تو اس عظیم کامیابی پر اہل مصر بڑے خوش ہوئے اور پیرو جوان نے مل کر خوشی کے شادیانے بجائے کیونکہ اب ان کا دیوتا (فرعون) تمام خطرات سے نمت چکا تھا اسکے 74 سالہ دور حکومت میں یہ بائیسویں اور آخری لڑائی رتھی جس میں اسے کامیابی ہوئی۔ لیکن اس فتح و کامرانی کے باوصف اندر ہی اندر سے ایسے خطرات بھی پرورش پارہے تھے جن کے تصور سے فرعون اعظم کے روتائے کھڑے ہو جاتے تھے ان خطرات میں جس کو مرکزی حیثیت حاصل تھی وہ اسرائیل کی بڑھتی ہوئی آبادی کا خطرہ تھا کیونکہ غیر ملکی جب موہوم خوشحالی کے پیش نظر اپنی ہجرت کیلئے کسی ملک کو نظر میں رکھتے ہیں تو ٹڈی دل بن کر اس ملک پر چھا جاتے ہیں بلکہ مملکت کے تمام زندہ وسائل پر قابض ہو کر لوکل کیلئے مسائل پیدا کرنے کا موجب بھی بن جاتے ہیں خوراک کے مسائل، تعلیم و صحت کے مسائل۔ امن عامہ اور رہائش کے مسائل، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کے مسائل۔ غرض کہ لوکل آبادی کا چین حرام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی غفلت کی تلافی کرنے کی صلاحیت مفقود پا کر بے بس ہو جاتی ہے۔ سندھ کے بڑے شہروں کا حشر ہر ایک کے سامنے ہے۔


غرض کہ اندیشوں کے ان ہی ظلاطم میں مستغرق فرعون۔ مصر کے پایہ تخت ”رمیس“ کے محلات میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا اور یہ سوچ معمول کے خلاف نہیں تھی لیکن آج فرعون کے چہرے پر انفعالی کیفیات اور ناویدہ خوف کے آثار۔ تسم ہو چلے تھے۔ وہ ان ہی خیالات میں گم سم تھا کہ اس کی چیتی ملکہ ”است نفرو“ (آسید) حاضر ہو جاتی ہے۔ است نفرو یا۔ آسید کو فرعون کے دل پر پورا قابو تھا وہ فوراً ہی فرعون کی ملال انگیز حالت کو بھانپ گئیں۔ چنانچہ دلہاری اور غمخواری کی رسم کی جا آوری کے بعد ملکہ نے باصرار و جہ پریشانی دریافت کی فرعون نے جو کہ سردست اپنا حال دل کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا رسمی تردد کے بعد اپنا دکھڑا اس طرح سنا شروع کر دیا کہ،

”یہ اسرائیلی چار سو سال ہوئے یوسف بن یعقوب کے زمانے میں مہاجروں کے بھیس میں مصر میں داخل ہوئے تھے تب ان کی تعداد ستر کے لگ بھگ رتھی اور بعد میں جب بڑھنے لگی تو فرعون احمس (1850 ق م) نے ان کا استیصال کر دیا لیکن آج پھر ان کی آبادی اور نسل بڑھ رہی ہے اگر حالت چنداں یہی رہی تو تعجب نہیں کہ یہ لوگ زور میں آکر وادی ”طمیلات“ پر قبضہ کر بیٹھیں یا یہ کہ وادی طمیلات سے جہاں فرعون یوسف ”اپوفس“ (1898 ق م) نے انہیں بسایا تھا۔ منظم ہو کر پہلے



طمیلات اور پھر مصر کے حصوں پر یلغار کر دیں کہ۔ ہجرت کے نیچر میں یہ بھی شامل ہے کہ پہلے کسی ملک میں پہنچ کر پناہ گیر بن جاؤ پھر حالات سازگار ہونے پر قبضہ جما کر الگ ہو جاؤ۔

آسیہ نے جب یہ ماجرا سنا تو ڈھارس بندھاتے ہوئے مجلس میں دوم سے کہا کہ یہ سب ادہام و ظنون ہیں جن سے افسردہ اور پریشان ہونا ہے محل ہے۔۔۔۔۔ اب فرعون اگرچہ کچھ دیر کیلئے مطمئن ہو گیا مگر جو اندیشہ گھن کی طرح اسے کھا رہا تھا وہ بظفل تسلیوں اور مصنوعی اطمینان سے رک نہ سکتا تھا کیونکہ پناہ گیروں کی بڑھتی ہوئی آبادی مسلسل وجہ اضطراب بنتی جا رہی تھی اب ضبط اور حوصلہ کے پیمانے لبریز ہوئے جا رہے تھے چنانچہ اضطراب دروں کو اپنے خواص پر پیش کرنا وقت کی ضرورت بن گیا اور اس نے درباریوں کے متفقہ مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ مشورہ یہ تھا کہ اسرائیلیوں کی نرینہ اولاد کو ولادت کے وقت ہی موت کی آغوش میں سلا دیا جائے چنانچہ۔ قتل ناحق کی یہ رسم دو عورتوں ”شفرو“ اور ”فوعہ“ کے سپرد کر دی گئی جو فنِ دایہ گری میں ماہر تھیں۔

**ولادت موسیٰ**  **مجلس شہر میں ایک عبرانی نوجوان ”عمران بن قاہٹ“ نامی رہتا تھا جس نے خالہ زاد حسین لڑکی سے شادی کر رکھی تھی یو کا پد۔ کے بطن سے پہلے ”ہارون“ و مریم۔ اور کئی سال بعد سیدنا موسیٰ تولد ہوئے۔ موسیٰ کی ولادت کے وقت آپ کے والد عمران فوت ہو چکے تھے۔ اب اسکے سر پر ستوں میں۔ ماں۔ بہن اور بھائی ہارون کے ماسوا کوئی موجود نہیں تھا۔ ماں نے مردم کشی کے نئے قانون کے ڈر سے بڑھتی کو بلوا کر 98 سنٹی میٹر لمبا اور 64 سنٹی میٹر چوڑا صندوقچہ بنا کر موسیٰ کو اس کے اندر بند کر کے دریا کے سپرد کر دیا اور بیٹی مریم سے کہا کہ نظر چا کر اس مولود کے پیچھے چلی جاؤ۔ (قصص، 11)**

**آسیہ ملکہ فرعون**  **رعمیس دوم کی کچھ مشہور بیگمات تھیں۔ است نفیر (آسیہ)۔ حتن کاہن کی بیٹی۔ ماعت نفرو۔ اسکی دو بیٹیاں۔ مریت آمون۔ عنتا۔ اور دیگر ایک اور ملکہ۔ اور نفرتاری۔ ان میں سے است نفیر۔ اسکی جیتی اور حسین ملکہ تھی جسکے بطن سے رعمیس پنجم۔ منفو۔ پارا خرومعت۔ اور ایک بیٹی اشرو نامی تولد ہوئے۔ رعمیس پنجم نہایت خدا ترس اور نیک دل شہزادہ تھا لیکن زندگی مختصر تھی اور بہت جلد پیک اجل آن پہنچا اور یہ وجود ہمیشہ کیلئے ملکہ آسیہ کو داغ مفارقت دے گیا اسی طرح پارا خرومعت۔ بھی فوت ہو گیا۔ اب مصنوع (1224 ق م) زندہ تھا مگر اسکی بوالہوسیوں اور ملکوں مزاجی سے ملکہ مطمئن نہیں تھی۔ ادھر فرعون اعظم بے حد سن رسیدہ ہو چکے تھے اور آسیہ کے بطن سے مزید اولاد کی توقع بھی نہیں تھی بس تفکرات کے اسی گرداب میں ملکہ مصر کے دن کٹ رہے تھے۔ ایک روز ملکہ تفریح کی غرض سے دریا کے کنارے پہنچ گئی جو شاہی محل سے متصل ہی تھا کیا دیکھتی ہے کہ تھوڑے ہی فاصلے پر تیرتا ہوا ایک صندوق دریائی گھاس میں جا کر رک گیا۔ دل لچایا کہ اس صندوق کو حاصل کر لیا جائے چنانچہ اشارہ پاتے ہی محافظوں نے صندوق کو جا کر تھام لیا۔ صندوق میں کیا تھا؟ معصوم نبوت مسکرا رہی تھی سعادت اور مجد کے آثار پیشانی پر چمک رہے تھے ملکہ است نفیر۔ دو بیٹیوں کی مفارقت کا شدید صدمہ**



اٹھا چکی تھیں اس نے فرعون سے ”متنبی“ بنانے کی اجازت طلب کی۔ فرعون اپنے قانون کے مطابق موسیٰ کی تارِ نفس کاٹ دینا چاہتا تھا لیکن ملکہ است نفر۔ اور فرعون کے ایک بچا زاد بھائی نے مداخلت کرتے ہوئے فرعون کے برے عزائم کو ناکام بنادیا۔



موسیٰ اور آسیہ (ملکہ فرعون)

## رسم تنہا اور موسیٰ کی تربیت

فرعون نے بعض عمائدین مملکت اور ملکہ است نفر کی فمائش پر محسوس کیا کہ یہ معصوم چہ دین و سلطنت کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے چنانچہ اس نے ملکہ کی دلجوئی اور دلہناری کیلئے متبنیٰ بنانے کی اجازت دیدی اور نام تجویز ہوا ”موسیٰ“۔ ”مو“ معنی پانی اور ”سا“ معنی لکڑی یعنی وہ چہ جو لکڑی کے صندوق میں پانی پر تیرتا ہوا ملا۔ یہ ہیر و گلی زبان کا لفظ بتایا جاتا ہے جو اس وقت مصر میں رائج تھی۔ فرعون نے از خود ہی ”ہیلوپولس“ (موجودہ مطریہ کے مقام) کے محلات کی صحت در عورتوں کو موسیٰ کی تربیت پر مامور کیا مگر آزاد منہش موسیٰ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا یعنی کسی بھی عورت کا دودھ قبول نہیں کیا۔ فرعون بوا پریشان ہوا کہ اب تربیت کا مسئلہ آہل ہونے کی بجائے پیچیدہ ترین گیا تھا لیکن مذہبی قائد ہامان کی حاضر دماغی کام کر گئی اور اس نے اشارہ دیا کہ یہ لڑکی مریم (ہمشیرہ موسیٰ) اس بچے کے ماں باپ کو جانتی ہوگی اسی سے دریافت کیا جائے۔ چنانچہ مریم نے خطرے سے بے نیاز ہو کر اس کنبہ کی نشاندہی کر دی جو آپ کی تربیت کے لئے موزوں ہو سکتی تھی (قصص، 11) اسی طرح موسیٰ کی پرورش اپنی ماں کی گود میں خود شاہی محلات میں ہونے لگی۔ ادھر رسم تنہا کی خاصیت یہ تھی کہ متبنیٰ اپنے ساتھ خاندان سے کٹ کر نئے خاندان کا فرد بن جاتا تھا اور مصر کی طرح عرب میں بھی یہی رواج تھا مگر قرآن کے ذریعے اس میں یہ ترمیم ہو گئی کہ متبنیٰ اپنے ساتھ خاندان ہی کا فرد قرار پایا۔ الا یہ کہ خاندان کا سراغ نہ ملتا ہو (احزاب، 5)۔ غرض کہ سیدنا موسیٰ کو فرائض سے باخبر ہو کر موز مملکت اور راز ہائے درون پر وہ معلوم کرنے کا زریں موقع مل گیا بالخصوص رعس عیسٰی کے پیشمار بیٹوں میں سے کئی ایک ایسے بھی تھے جو سن رسیدہ باپ کو تخت سے ہٹانے کی سوچ رہے تھے۔ اس طرح فرعون کا محل گویا سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ بھی گویا ایک راز تھا جو موسیٰ پر منکشف ہوا اور آگے چل کر آپ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو محلات و قصور کی یہی کمزوریاں آپ کے فائدے اور کامیابیوں کا سبب بن گئیں۔

## نشاط، نبوت اور ایمان کا امتزاج

سیدنا موسیٰ کی تربیت پھر تعلیم کے مراحل بسر عت تام طے ہوتے چلے گئے اور وہ دن آہی گیا جب حضرت موصوف عنفوان شباب میں قدم رکھ چکے تھے اور یہ وہ دن تھے جب آپ کے ژئیں سے بڑے ہی خوشگوار تعلقات تھے بلکہ مشہور یہودی مؤرخ جوزیفوس (110 م) لکھتے ہیں کہ،

ایک زمانہ میں موسیٰ فرعون کا اس قدر بالاعتماد سارا تھا کہ آپ مصری نوجوانوں کی کمان کرتے ہوئے اتھوپیا کی مہم سر کرنے کیلئے وہاں کے پایہ تخت ”صرو“ میں داخل ہو گئے وہاں کی شزادی نے آپ کی مردانگی، وجاہت اور جنگی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے شر کے دروازے کھول دیے اور شادی کا پیغام بھیج دیا بلکہ اسی مہم کے دوران آپ پر یہ راز بھی منکشف ہوا کہ I مقبوضات کا ایک طبقہ فرعون کی سخت گیری اور مظالم سے نالاں ہے نیز یہ کہ II آپ بھی اجنبی ہیں فرعون نہیں ہیں۔ چنانچہ اس انکشاف کے بعد آپ ہمہ تن اپنی اسرائیلی قوم کی زبوں حالی اور ذلت و غلامی دور کرنے میں لگ گئے

اور دیگر غیر ملکی یعنی ان ہی اسرائیلیوں سے رواہلہ بوجھانے میں مصروف ہو گئے۔ کہ موسے اب عنفوانِ شباب میں قدم رکھ چکے تھے زندگی کے یہی دن بے باکی، لامابالی اور لاپرواہی کے دن ہوتے ہیں آپ کے دل سے فرعون کا وقار بالکل جاتا رہا۔ اب آپ نہایت بے تافی سے اللہ کے ماسواہر طاقت سے نگر لینے کو تیار نظر آنے لگے۔ آپ کا آزاد اور پاک ذہن اب یہ برداشت کرنے پر بالکل آمادہ نہیں تھا کہ۔ فرد واحد جس طرح چاہے انسانوں کو ریوڑ کی طرح ظلم کی چھڑی سے ہانکتا پھرے چنانچہ اسی احساس نے موسے کے مزاج کو سہ آتشہ ہمار کھا تھا اب وہ ظالم اور اسکے حمایتیوں سے کسی قسم کی مداخلت، مداخلت، مروت اور رواداری برتنا ظلم کا ساتھی بننے کے مترادف سمجھتے تھے ذیل کا واقعہ اسی احساس کی غمازی کر رہا ہے،

ایک دفعہ فرعون کے افراد میں سے ”فانوه“۔ قبیلے نے سامری قبیلے کے ایک عبرانی غلام کو بیٹنا اور گالی دینا شروع کیا۔ گالی کا جواب تو زبانِ پیغمبر پر جاری نہ ہو سکتا تھا لہذا جوانی اور غیرت کا تقاضا دوسرے ذریعے سے پورا کر دیا۔

(قصص، 15)

یہ ایک ایسا حادثہ تھا جو مصری سیاسیات پر مستقل اثر چھوڑ گیا کیونکہ اس کے بعد فرعون نے اندر ہی اندر محلات سے باغی عنصر کی تطہیر شروع کر دی اور عملاً موسے پر واضح کر دیا کہ ”فرعونیت“ ایک پاکدار طاقت کا نام ہے۔

فرعون نے کھلم کھلا تصادم پر مصلحتِ وقت اور حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے مصر کے انتہائی **مجمع البحرين** شمال مشرقی صوبہ ”مجمع البحرين“ میں موسے کو تعلیم کیلئے بھیج دیا اس کا خیال تھا کہ موسے یہاں رہ کر کسی بھی وقت محلات و قصور کی اینٹ سے اینٹ جاسکتا ہے لہذا وہ کمپیوٹر (CAPITAL) سے دور رہ کر وہاں کے کانہوں و دیگر حمایتیوں کی ”برین واشنگ“ سے نارمل ہو جائے گا۔ مجمع البحرين، بحیرہ روم اور بحرِ قزقم کے اتصال کے مقام پر واقع تھا۔ وہاں کی شاہی در سگاہ ”بیت الحیات“ میں ساحر و کاہن جتنے بھی محیر العقول کام کرتے تھے یا شہزادوں کو سکھاتے تھے شہزادہ موسے اپنی فطانت کے زور پر نہایت چابکدستی اور ہوشیاری سے ان کی تہ تک پہنچ کر ساحروں اور کانہوں کے ماہر اندر۔ نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح ریمیس نے موسے کو شاہی محلات اور قصور سے دور بھیج کر خود حفاظتی کی جو حکمتِ عملی اختیار کی تھی تقدیر کے پیکانوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔

شہزادہ موسے مجمع البحرين کی در سگاہ ”بیت الحیات“ میں

**آسیہ پر حکومت توڑ سازش کا الزام**

رہ کر پہلے سے زیادہ انقلابی بن چکا تھا اور اب مصر کے دار الحکومت میں روزانہ اس مضمون کی تازہ خبریں آنے لگیں کہ وہاں کچھ ہوا چاہتا ہے۔ اوھر فرعون بھی غافل نہیں تھا شہزادے کی انقلابی حرکتوں پر وہ خاموش نہ رہ سکتا تھا مگر کچھ کر گزرنے سے پہلے آسیہ نے فرعون سے کہا کہ،

”موسے سے آپ کو ڈرنا نہیں چاہیے یہ سب دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہے وہ ملک و دولت کا بھوکا نہیں ہے سمجھدار شہزادہ ہے۔“

فرعون اور اس کا بھوکا نہیں تھا اسکی سو کے قریب بیویاں تھیں صرف آسیہ کے ہاں منہ کے ماسوا کوئی نرینہ اولاد

باقی نہیں رہی تھی اور معصوبے و قوف اور متلون مزاج تھا لہذا آسیہ کی خاطر ہی موسیٰ کو متنبہ بنایا گیا تھا۔ (قصص، 9)

ادھر ہوا یہ کہ موسیٰ کی بابت حالیہ پند و نصیحت سے عکس میں کو شبہ ہوا کہ وہ موسیٰ کی پشت پناہی کر کے۔ یا تو خود ملکہ مصر بنا چاہتی ہے یا اپنے چیمپے متنبہ کو سربراہی کے کسی منصب پر لانا چاہتی ہے اور اسکے شبہ کو اسلئے بھی تقویت حاصل رہی کہ بعض شنراوے محل کے اندر ہی ایک دونا کام سازشیں کر چکے تھے۔ چنانچہ اس کا یہ وہم یقین کی حد تک پہنچ گیا اور اس نے اپنے با اعتماد ساتھی ہامان کو مشورے کیلئے بلایا بھیجا ہامان جو ملکی خزانوں کے ساتھ امور مملکت میں بھی دخل رہتا تھا اس نے مشورہ دیا کہ موسیٰ سے پہلے آسیہ کا پتہ کاٹ دینا چاہئے۔ لیکن وہ تو دنیاوی جاہ و تمکنت کی خواہاں نہیں تھی اسے ”قلب نظام“ سے گیاد لچسی ہو سکتی تھی وہ تو خدا کی پسندیدہ تھی اور خدا ہی کے لئے موسیٰ کا ساتھ دے رہی تھی اس نے موسیٰ کی صفائی میں اگر کچھ کہا بھی تو صحیح تھا وہ عین حقیقت تھا یعنی موسیٰ تاج و تخت کے خواہاں نہیں تھے بہر حال ہامان کے مشورے کے مطابق آسیہ کا پتہ کاٹ دیا گیا۔ اس نے جان سپاری کے وقت اپنے رب سے کہا کہ

”اے مولائے کریم۔ اپنی جنت میں میرا مقام بنا اور فرعون کی ہر تکلیف سے با ایمان نجات دے

(تحریم، 10)

اور ظالموں سے اپنی پناہ میں لے لے۔

آسیہ کے ظالمانہ قتل کی خبر سن کر موسیٰ کا دل بے حد اچاٹ ہونے لگا ادھر اتفاق دیکھئے **موسیٰ کی روپوشی** کہ مجمع البحرین میں ایک عبرانی کی دہائی پر ایک اور قطبی کو جنم رسید کرنا چاہا جس پر لوگوں میں برہمی پیدا ہو گئی اور شاہی خاندان سے دلی پر خاش رکھتے ہوئے بھی نمائشی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے موسیٰ کے خلاف ہو گئے چنانچہ خوشامدیوں کے گروہ نے سازش تیار کی کہ موسیٰ سے خود ہی نمٹا جائے۔ لیکن موسیٰ کے ہمدردس ”یوشع“ کی بروقت اطلاع نے موسیٰ کو چوکنا کر دیا اور ان کے ناپاک عزائم خاک میں مل گئے یعنی قبل اسکے کہ ان کے ناپاک ہاتھ آپ کے گریبان تک پہنچ پائیں نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ (قصص، 21)

موسیٰ کے خلاف اتنی گہری سازش کے بعد آپ کیلئے مجمع البحرین میں مزید ٹھہرنا مشکل **دارالامن کی تلاش** ہو چلا تھا اور آپ نے ایسے دارالامن کی تلاش شروع کر دی جو کہ مبصر ہی کے قانون کے مطابق دارالامن ہو۔ چنانچہ مبصر کے شمال مشرق میں بحر قلزم کے کنارے سے شام اور حجاز کے سرحدی شہر ”مدائن“ یا ”مدین“ پر آپ کی نظر انتخاب پڑی یہاں پہنچ کر آپ نے شعیب سے رابطہ کیا اور دس برس تک ان کے پاس رہ کر فرعون رمیس ii کی موت کا انتظار کرنے لگے خالص کرملکی دستور میں یہ بھی تھا کہ

اگر قاتل حدود مملکت سے نکل کر ان چھ شہروں میں جو حرم قرار دیئے گئے ہیں کسی میں پناہ لے لے تو اس سے امام کاہن (یعنی خود فرعون) کی موت تک باز پرس نہ ہوگی۔

(لب لباب۔ استثناء باب 19)

چنانچہ حضرت موسیٰ نے اس قانون سے فائدہ اٹھایا خاص کر شعیب سے دس سال تک ملازمت کی اجرت پر



معاملہ طے ہو اور آپ نے اپنی اجرت کو شعیبؑ کی ایک صاحبزادی کے مر میں تبدیل کر دیا۔  
(قصص، 27)  
اور جس وقت آپ کے ہمدرس یوشع نے مصر سے فرعون کی موت کی اطلاع بھجوائی تو آپ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر مصر کو چل پڑے۔

**منفتو کی تاجپوشی**  
رسمیں II کا محل سازشوں کا گڑھ بنا ہوا تھا اس کی موت کے بعد پسماندگان میں تاج و تخت کیلئے سز پھٹول شروع ہو گئی تاہم سازشی چونکہ سازش کے کسی متفقہ پروگرام پر اکٹھے نہیں ہو سکے لہذا اب سوائے معنو کے کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو فوری طور پر تخت مصر پر بیٹھ سکتا لہذا اسے ہی قبول کر لیا گیا یہ رسمیں II کا تیر ہواں اور ملکہ "است نفر" (جو لسانی تغیر سے آسیہ بن گئی ان) کا دوسرا بیٹا تھا جو 47 سال کی عمر میں مصری تاج کا وارث بناس نے آتے ہی اپنے لقب کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا کہ،  
"ما قابل تسخیر قوتوں کا مالک معنو"

یہ مائل بہ نسائیت تھا۔ اسکی آنکھیں بڑی اور خمار آلود تھیں۔ اوپر کا ہونٹ پتلا۔ ناک خمیدہ۔ ٹھوڑی گول۔ اور خدو خال ملائم تھے۔ خصائل کے لحاظ سے متکون مزاج۔ سحر اور جادو کا دلدادہ۔ اور عورت اور عیش پرستی کا شیدا تھا۔ اس نے جو نئی زمام حکومت سنبھالی تو رشتہ داروں میں سے ایک شخص تخت کا دعویدار اٹھ کھڑا ہوا جس سے شہ پاکر غیر ملکی عبرانیوں نے بھی مصر سے نکل جانے کی ٹھان لی اتنے میں موٹے بھی مدائن کی جلاوطنی ختم کر کے مصر میں تشریف فرما چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے از سر نو عبرانیوں اور اسرائیلی غلاموں سے روابط بڑھانے شروع کئے منظم ہونے اور انقلابی روح سے آشنا کرنے کیلئے زیر زمین مراکز بنائے۔ پہلے شاہی محلات کی ساتھ کمزوریوں کا علم ہونے کی بنا پر چاہا کہ شاہی خاندان کے باغی افراد کو بھی اپنی تحریک میں شامل کر دیں لیکن کامیابی میں تاخیر دیکھ کر اس ارادے کو ترک فرما دیا اور صرف کمزور طبقوں پر انحصار کر لیا۔ معنو کی حکومت کے ساتویں سال آپ کی شہرت اور انقلابی سرگرمیاں مقبولیت کی انتہا کو پہنچ گئیں اور آپ نے پوری جرأت سے فرعون کے ہاں پہنچ کر۔ خطاب کیا کہ ارسل معی بنی اسرائیل

اسرائیلیوں کو آزاد کر کے میرے ساتھ فلسطین بھیج دے۔  
(اعراف، 105)

فرعون اس مطالبہ پر شش و پنج میں پڑ گیا اور باوجود اسے کہ اسرائیلیوں کو حقیر اور غلام سمجھتا تھا پھر بھی دفعاتاً ان کے چلے جانے سے مصری معیشت بلکہ اونچے طبقے کی ہر امکانی آسائش اور عیش کو شیوں پر منفی اثر پڑ سکتا تھا چنانچہ موٹے کے مطالبہ کا مثبت جواب نہ دے سگایوں کہنے کو کہہ دیا اگر اپنے پاس کچھ لائے ہو تو دگھاؤ۔

**تباهی کے اسباب اور دلائل (۴)**  
فرعون معنو اوبار و نخوت کا پیکر تھا یہ اگر غیر ملکوں کے مطالبہ آزادی کو تسلیم کر لیتا تو آنے والے مصائب کا مقابلہ کر سکتا تھا کیونکہ اب حالات جس نہج پر جا رہے تھے ان پر کنٹرول کرنا دشوار تھا خاص کر طبعی اسباب ایسے ظہور میں آ رہے تھے جو فرعون کے کنٹرول میں نہ آ سکتے۔ (اعراف، 132) میں کچھ تفصیل اس طرح ہے،



- 1- عصائے موسے جواب تک لکڑی کا عصا تھا اب قوت انقلاب میں تبدیل ہو چکا تھا۔
- 2- غیر ملکیوں کی تنظیم ایک عظیم رہنما کی قیادت میں کامیاب ہو چلی تھی جو اشارہ ملنے پر راتوں رات نکلنے کیلئے تیار تھی۔
- 3- قحط سالی اور گراں فردشی نے مصریوں کو مفلوک الحال بنا دیا تھا اور ہر بقول رافضی (صفحہ 263) جو کی بالیاں نکل چکی تھیں اور گندم پھوٹنے والا ہی تھا کہ جنوری کے مہینے میں زور کی بارش ہوئی جو سب کچھ بہا لے گئی جو ابھی تک بچ رہا تھا تو
- 4- فروری کے وسط میں مڈی دل (جواد) نے زور کا حملہ کیا اور ہر چیز چاٹ ڈالی۔ ہنوز ان حوادث کے اثرات باقی تھے کہ
- 5- مارچ میں غیر متوقع طور پر گرم طوفان اور تیرہ ہوتا آندھیوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی پھر ایک عذاب یہ آیا کہ
- 6- اپریل کے مہینے میں معنوکا بڑا بیٹا مر گیا۔ مزید یہ کہ
- 7- نیل کی سطح پر ایسے وبائی کیڑے اور سرخ رنگ کے جراثیم حیر نے لگے جس سے پانی کی سطح سرخی مائل ہو گئی یوں معلوم ہوتا تھا کہ خون کا دریا بہہ رہا ہے (الدم) پھر اس زہر پلے پانی سے پیشمار
- 8- مویشی اور انسان ہلاک ہوتے چلے گئے اور طرح طرح کی بیماریاں پھوٹ پڑیں (الوجز)
- 9- نیل اور البحر میں زور کا سیلاب آیا جس سے بچھروں، رتوں اور دیگر وبائی حشرات الارض نے شہروں اور دیہات کے مکینوں کے گھروں میں گھس کر ان کی زندگی نمونہ عذاب بنا ڈالی۔ (سرسید مرحوم) غرض کہ اس طرح کے طبعی حوادث اور اسباب سے گھبرا کر فرعون نے ایک بار چاہا بھی کہ آبادی کے بوجھ کو کم کیا جائے؟ مگر سینکڑوں برس کا خاندانی وقار اور خاص کر مصریوں کی غلاموں پر عیش کوشی کا واحد سدا ختم ہو جانے کے ڈر سے رک گیا اور اب ”مصری قومیت“ کی آڑ میں کہنے لگا کہ

”اے قوم کیا مصر کے دریا اور مصر ہم مصریوں کے نہیں؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے؟ کیا یہی موسے

ہے جو اپنے لئے بھی کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ کیا میں ٹھیک نہیں ہوں۔“ (زخرف، 51)

فرعون نے سوچا کہ اس کی اس دہائی سے فضا اسکے حق میں سازگار ہو جائے گی مگر۔

به آب زمزم و کوثر۔ سفید نہ توان کرد

گلبم بخت کسی را کہ باختند سیاہ

قومیت کی دہائی دے کربات کرنا کچھ معیوب بھی نہیں ہے لیکن اسے اس انداز سے ابھارنا کہ

**نعرہ قومیت**

دوسرے کی قومیت کی تھنیک ہو۔ وحی الہی کی رو سے قابل مذمت ہے۔ فرعون معنوکا نے مصر

مصریوں کا نعرہ لگا کر کوئی نئی بات نہیں کی اس سے پہلے دو ہزار نو سو بیس برس قبل مسیح فرعون ”دودفرع“ نے بھی قومیت

کا نعرہ بلند کیا تھا اس نے سات برس تک حکومت کی پھر اس جرم میں مارا گیا کہ اسکی والدہ لوبیائی (لیبیائی) نسل اور قومیت

کی تھی مصر یہ نہیں تھی یعنی قومیت کا پسند اجواس نے دوسروں کے لئے تیار کیا تھا اپنے ہی گلے کا ہار بن گیا۔

(الاعراف 7 مارچ 1956 مصر صفحہ 8)

یہ یاد رہے کہ اللہ سبحانہ نے تحفظ نسل اور تحفظ ذات کیلئے قوموں و قبیلوں کی خود ہی تخلیق فرما کر احساس دلایا ہے کہ قومیت بے مقصد نہیں ہے یہ تعارف اور تحفظ ذات کا حقیقی ذریعہ ہے تاہم اسکے ذریعہ اپنی ذات اور قومیت کی برتری کا اگر اظہار مقصود ہے تو یہ معیوب ہے لیکن کسی بھی اچھے امر میں اگر برائی در آتی ہے تو اس سے اچھے امر کی نفی نہیں ہو سکتی نہ برائی کا ازالہ کرنا چاہئے۔

## نو آیات

ٹھیک نہیں بیٹھتے۔

I انبیاء کو اعلیٰ قسم کے معجزات عطا ہونے چاہئیں، کھیاں، پچھر، ٹرو، پکھوے، مڈیاں، جو نکلیں اور سرخ قسم کے دہائی حشرات معجزانہ طور پر عطا ہونے کوئی باعث فخر و مباہات نہیں۔

II معجزے کا اصول یہ ہے کہ وہ دنیا میں پہلی دفعہ ہی ظہور پذیر ہوا ہو لیکن قحط و بیماری، خوں ریزی اور فساد کا وجود حضرت موسیٰ سے پہلے بھی تھا۔ بلکہ سیدنا یوسفؑ کے زمانہ میں سات سالہ قحط مشہور ہے۔

III معجزے کا ظہور چند لمحوں کیلئے ہونا چاہئے کیونکہ وہ اختیاری امر نہیں ہے۔

IV ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم، احمد، اسحاق، ابویعلیٰ اور طبرانی نے حضرت صفوان بن عسال سے روایت کی ہے کہ نو آیات سے نبی اکرم ﷺ نے نوا احکام مراد لئے ہیں۔ اب اگر یہی تفسیر آپ سے منقول ہے تب بھی ”معجزات“ کے مفہوم کی نفی ہو جاتی ہے تاہم یہ سوال پھر بھی سطح ذہن پر ابھر رہا ہے گا کہ۔ ان نوا احکام کی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ سیدنا موسیٰ سے دو ہزار سال بعد ان احکام کی نشاندہی۔۔۔ تکلف ہے لہذا ہم نے آیات کا ترجمہ اسباب و علامات کر کے بات کو صحیح جہت دیدی ہے۔ کیونکہ آیات ہی کے ضمن میں قرآن فرماتا ہے،

ہم نے فرعون اور اسکے ساتھیوں کو قحط سالی اور فصل کی تباہی میں مبتلا کیا (اعراف، 130) پھر زور کی طغیانی آئی اور مڈیوں، جو نکوں اور ٹروں کا حملہ ہوا اور۔۔۔ سطح نیل خون آلود ہو گئی۔ اسکے باوجود فرعون تکبر سے باز نہ آیا اور اپنے ظالمانہ کردار پر قائم رہا (اعراف، 132) نہ صرف اتنا ہم نے ہیضہ اور دیگر دہائی امراض (الوجز) بھی عام کر دیئے جس سے ڈھیر سارے لوگ کھپت گئے اور باقی ماندہ نے توبہ کر لی۔ (اعراف، 133)

## ایک مرد مؤمن

حضرت موسیٰؑ تو حالات کے مطابق پروگرام بناتے اور اپنے مشن کو آگے بڑھانے کی تدبیریں کرتے تھے مگر فرعون نے بیک۔ جب عیش قلم فیصلہ کر ڈالا کہ۔ اپنے متنبہ بھائی کو موت کے گھاٹ اتاراجائے۔ کیونکہ یہ شخص زور میں آکر خون ریزی اور فساد کر کے ”دین فرعون“ کو ملیا میٹ گردے گا۔ (غافر، 26) چنانچہ

اس نے حاشیہ برداروں اور خواص کی محفل میں موئے کے قتل کو آخری شکل دینے کا پروگرام رکھا لیکن وہاں فرعون کے بچا جسے قرآن نے ”مرد مؤمن“ (رجل مؤمن عاقر، 28) کے نام سے یاد کیا ہے اس نے نہایت جرأت اور پامردی سے حاضرین کو مخاطب کیا کہ

”کیا ایسا شخص سزاوار قتل ہے جو صرف یہ کہتا ہے کہ اللہ ایک ہے؟ حالانکہ وہ اپنے دعویٰ کے ساتھ اپنے رب سے دلائل کی توانائی بھی رکھتا ہے پس اگر وہ غلط کہتا ہے تو اپنے کئے کی سزا سے مل کر رہے گی اور اگر اس کا دعویٰ جتنی بر حقیقت ہے تو پھر لامحالہ جس عذاب کی تمہیں خبر دے رہا ہے جھٹلانے کی صورت میں تم پر نازل ہو کر رہے گا۔“ (عاقر، 28)

اس مرد مؤمن کی یہ بیباکی اور تنبیہ جلتی پر تیل کا کام کر گئی اور فرعون کو یقین ہو گیا کہ موئے کی آواز سے قصر شامی کے افراد بھی متاثر ہو چکے ہیں چنانچہ اس نے بے سوچے آسیہ کی طرح اسپر بھی ”قلب نظام“ کی فرد جرم عائد کی اور تختہ دار تک پہنچا دیا تاکہ دارورسن کو چومنے کی ہوس پوری کر سکے۔ جب موئے دریافت ہوئے تو فرعون اعظم آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے مگر اس وقت آسیہ اور یہی مرد مؤمن آئے آگئے اور موئے کی جان بچ گئی اسی طرح آج مفتونے جب موئے کے قتل کا فیصلہ گیا تب بھی یہی مرد مؤمن دفاع کرتا ہوا جام شہادت نوش کر گیا۔

موسیٰ سے پنجم آزمائشی اور ذلت آمیز شکست

پنجم آزمائشی کی ٹھان لی۔ لیکن اس نے سوچا کہ موئے کو یوں قتل کر دینے سے بہتر ہے کہ سر عام کاہنوں کے ذریعہ شکست دے کر مہذب طور پر آپ کے قتل کا جواز پیدا کرے۔ چنانچہ اسکے لئے ”یوم الزینہ“ (عید کاروز) طے پایا۔ (طہ، 69) یوں تو حضرت موئے سے جادو گروں کے کرتب پوشیدہ نہیں تھے کیونکہ وہ صوبہ مجمع البحرین کی شامی در سگاہ ”بیت الحیات“ میں سب کچھ معلوم کر چکے تھے مگر ساحروں نے یہاں ایسا داؤ چلایا جس سے بے نظر اول خود موئے بھی خوف کھا گئے (طہ، 67) اور یہ خوف اسلئے نہیں تھا کہ انبیاء کسی جادوگر سے خائف ہو جاتے ہیں ڈر یہ تھا کہ فرعون نے ہونٹک کے لئے ہزاروں افراد کو مجمع میں شامل کر رکھا تھا وہ اشیاء میں فوری تغیر دیکھ کر ہونٹک شروع کر دینگے اور جواہی کاروائی سے پہلے ہی میدان مارنے کی ہڑ بونگ شروع ہو جائے گی۔

دسیوں کی حقیقت

بلاشبہ ساحروں کا یہ محیر العقول کارنامہ تھا کہ لائٹیوں اور رسیوں کو چلتے پھرتے سانپ بنا کر دکھا دیتے لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ صرف۔ فریب نظر ہی تھا۔ (طہ، 26) بلکہ مصر کے قدیم الواح جو کاہنوں کے خصوصی معبدوں اور فراعنہ کے مقبروں پر کندہ اور نصب کئے جاتے تھے ان میں بھی ان کرتبوں کو فریب نظر ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مشہور مفسر و امام ابو بکر خفی جصاص (983م) احکام القرآن طبع مصر میں لکھتے ہیں،

”ساحروں کے ڈنڈے اندر سے کھوکھلے ہوتے تھے جن میں پارہ بھر دیا جاتا تھا اسی طرح رسیاں چڑے کی ہوتی رہتیں جن کے ہر ”مٹ“ میں پارہ بھر دیا جاتا تھا اور نمائش سے پہلے اصل مقام کے نیچے ایک نہ خانہ بنادیا جاتا تھا جس میں آگ جلائی جاتی رہتی اور باریک سوراخوں کے ذریعے اس آگ کی حرارت ان رسیوں اور ڈنڈوں تک پہنچادی جاتی رہتی۔ اور جو نمی یہ حرارت رسیوں اور ڈنڈوں تک پہنچتی وہ حرکت کرنے لگ جاتے تھے کیونکہ پارے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ حرارت پر اڑ جاتا یا حرکت کرنے لگ جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا اور ادھر اللہ سبحانہ نے بذریعہ وحی موسیٰ پر حقیقت آشکارا کر دی۔“

(حوالہ مفتی عبدہ مرحوم 1905م)

مشہور امام اور مفسر جبار اللہ زنجیری (1144م) نے لائیں اور رسیوں کی مذکورہ بالا کیفیت اور مصنوعی حرکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے،

رسیوں کے ہر مٹ کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا گیا تھا تاکہ دور سے بغیر حرکت ہی کے سانپ نظر آئیں۔ (تفسیر کشاف طبع مصر جلد 1/111)

غرض کہ سحر سراپا فریب نظر ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نے سرے سے اسکے وجود ہی سے انکار کیا ہے۔ (نیل المرام طبع مصر صفحہ 4 سطر 18)

کیونکہ جو چیز اندر سے کھوکھلی ہو اسکی حقیقت فریب نظر ہی تک محدود ہو سکتی ہے۔

**جوابی کاروائی** ڈنڈوں اور رسیوں کی حقیقت موسیٰ پر پوشیدہ نہیں رہتی چنانچہ آپ نے بتائید ایزوی اپنا عمل شروع کر دیا۔ جس ڈنڈے اور جس رسی پر عصا مارے گئے اسکے خول سے پارہ نکلتا گیا اور اسکی حرکت بند ہوتی گئی۔ فالقی موسیٰ عصا فاذا هی تلفف مایاً فکون

پس موسیٰ نے اپنی عصا کو حرکت دی وہ جس پر پڑی ان کے ایک (فریب، شعبہ) کو ناکارہ بناتی گئی۔ (شعراء، 15)

**مفسروں کی درماندگی** ہمارے بعض مفسروں نے ذہن میں ایک مضمون باندھ کر ”تلفف“ کے معنے نکل جانا کئے ہیں یعنی موسیٰ ڈنڈا فرعونی اڑدہوں کو نکل جاتا رہا۔ لیکن ایک تو یہ ترجمہ ”عربیت“ کے خلاف ہے، دوسرا یہ کہ شعراء کی اسی آیت کی آخر میں ”یا فکون“ کا لفظ ہے جس کے معنے حیلہ، فریب اور مکاری کے ہیں حقیقت اور واقعیت پر اس کا اطلاق کہیں بھی نہیں ہوا۔ مفسروں نے غالباً جھوٹ، فریب اور حیلہ کو حقیقی وجود سے تعبیر کر کے پھر اسی مناسبت سے فرض کر لیا کہ اگر حقیقت ہے یعنی اسکامادی وجود ہے تو ”لفف“ کے معنے نکل جانا ہی موزوں ہو سکتے ہیں لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ ”افک“ حقیقت اور مادی وجود سے کہیں بھی تعبیر نہیں ہوا ملاحظہ ہوں آیات (اتخاف، 22۔ ذاریات، 9۔ روم، 55۔ مائدہ، 78۔ توبہ، 31) اور اگر افک حقیقت ہے اور اسکامادی وجود ہے

تو معاذ اللہ پھر سیدۃ النساء حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جس تہمت کو ”افک“ (جھوٹ اور بہتان) کہا گیا ہے ثم معاذ اللہ اسے بھی حقیقت ہی تصور کر لینا چاہئے۔

اسکے معنی فریب اور شعبدے کی حقیقت کو باطل و ناکارہ بنانا ہے شیخ الطائفہ امام المشائخ محی الدین لکن عری (1240 م) وضاحت فرماتے ہیں کہ،

**لقف کے معنی**

”اگر لقف کے معنی نکل جانا کئے ہیں تو اس پر یہ شبہ وارد ہو گا کہ فرعون کے جادوگروں سے موسے کا جادو زوردار نکلا۔ حالانکہ ایسا نہیں لارنھی کسی چیز کو نکل، نہیں گئی بلکہ جادوگروں کے گرتب فیل کر دیئے اور ان کی رسیوں کی حرکت بند ہو گئی۔“ (حوالہ محمد عبدہ (1905 م))

علامہ زنجیزی نے ایک مقام پر ”افک“ اور ”لقف“ کے ضمن میں لکھا ہے کہ

جادوگروں نے الحیل و الشعوذہ کے ذریعہ کرتب دکھائے تھے۔ (کشاف 111/1)

اور اسی الشعوذہ کی وضاحت میں امام العصر محمد عبدہ لکھتے ہیں

”نہایت ہشیاری اور چابکدستی سے ہاتھوں کو ایسی حرکت دینا جس سے فوراً کئی اشیاء ظاہر ہوں اور کئی چھپ جائیں اور اس طرح تماشائی کو مختلف صورتحالیں دکھائی جائیں۔“

(تفسیر ”المنار“ طبع مصر جلد 9/26)

یعنی جس طرح پتلیوں کے کھیل میں دھاگوں کو نہایت پھرتی اور مہارت سے حرکت دے کر تماشائیوں پر اصل حقیقت کو او جھل رکھا جاتا ہے اسی طرح حرکت اور فریب کو ”افک“ یا ”شعوذہ“ کہا جاتا ہے۔ اس تشریح کے بعد موسے کے عصا کا عمل خود خود ہی قابلِ فہم بن جاتا ہے اور اب جس وقت معنوں نے سیدنا موسے سے جوابی عمل کا مطالبہ کیا تو آپ نے پورے اعتماد سے اور منطقی انداز میں فرمایا کہ

”اگر اشیاء کی فطرت سحر کے ذریعہ بدل سکتی ہے تو صرف یہ مخصوص اشیاء اور ڈنڈے اور وہ بھی

ایک خاص مقام پر حرکت کیوں کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے مقرر مقام سے ہٹ کر کیوں حرکت

نہیں دی جارہی۔ آخر یہ میرا عصا بھی تو ہے یہ ساحرا سے کیوں نہیں سانپ بنا لیتے۔“

یہ کہتے ہوئے آپ نے اس ارادے سے عصا دے مارا کہ وہ بھی طبیعت بدل کر فرعونی سانپوں سے جا ملے گا لیکن اسکی فطرت نہیں بدلی وہ عصا ہی کی حالت میں جس جس مصنوعی اژدہا کو جالگاہ سے پارہ نکل پڑا اور حرکت بند ہو گئی۔ اور یہ بات سب کے مشاہدے میں آگئی کہ غیر متحرک عصا نے متحرک اژدہاؤں کی حرکت بند کر دی۔ اب ساحروں کا فرض تھا کہ اپنی مخصوص لائٹھوں کے علاوہ دیگر لائٹھوں کی فطرت بھی بدل کر دکھلاتے۔ لیکن یہاں تو کوئی بات بھی نہ ہوئی اور کاهنوں پر منکشف ہوا کہ موسے جادوگر نہیں ہے وہ مشاہدہ اور منطق کی جنگ لڑ رہا ہے لہذا سر بسجود ہوئے اور رب موسے پر ایمان لے آئے۔ (طہ، 71- شعراء، 39)



## ید بیضا

پیغمبر کی ہر بات دلیل اور اس کا ہر قول حجتِ قاطعہ ہے وہ جس قوتِ ارادی اور زورِ بیان سے لیس ہوتا ہے اس سے عامۃ الناس محروم ہوتے ہیں اس کی پیغمبرانہ فراست وہ کچھ دیکھ لیتی ہے جس کا آج کی خور و دین سے کھوج لگانا ستمِ نظر لپی ہے اسکی دور بین اسکے جیب و دامن میں ہوتی ہے اسکا ”برہانِ قاطع“ اسکی قوتِ گویائی ہے۔ ید بیضا جسے قرآن نے حجتِ قاطع سے تعبیر کیا ہے حضرت موسیٰ کو ہر لمحہ حاصل رہی ہے انہوں نے کبھی بھی براہین اور روشن دلائل سے ہٹ کر بات نہیں کی۔ کپ کا سینہ روشن تھا (الی جناحک)۔ دل کی ضیاء (فی جلیک) سے رجوع فرما کر واضع یدیک۔ مخارلفین پر حجتِ قاطعہ (فخرج بیضا) قائم کرتے تھے ایسی حجتِ قاطعہ جس میں عقل اور مشاہدے کی رو سے کوئی نقص نہ ہوتا تھا دلائل میں کوئی سقم، استدلال میں کوئی ضعف اور انتخاب میں کوئی کمزوری نہ ہوتی تھی (من غیر سوء) یعنی دلیل و منطق، لسانی شناری اور فصاحت آپ کی کامیابی کی ایک اور دلیل تھی۔ (آیۃ احزمت)

ید بیضا کے متعلق درجنوں اقوال موجود ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ موزوں اور مطابق واقعہ وہ قول ہے جسے قاموس کے شارح امام محبت الدین مرتضیٰ زبیدی (1791م) نے تاج العروس میں ذکر کیا ہے۔ امام موصوف کے خیال میں ید بیضا کا ترجمہ ”روشن یاد و خصال ہاتھ“ کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ حجتِ قاطعہ معنی کرنا ہی صحیح ہے۔

## وطن کو واپسی

اسرائیلی سینکڑوں سال پہلے مصر میں داخل ہوئے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے مصر کی پوری معیشت پر چھا گئے لیکن پھر ان پر اوبار و کبت کا ایسا بھی دور آیا کہ ان کی بڑھتی ہوئی آبادی سے گھبرا کر فرعون نے ان پر نہ صرف پابندیاں عائد کیں شہری آزادیاں ختم کر کے غلام بننے پر مجبور بھی کر دیا اور کوئی نہ تھا جو اتنے طویل عرصے تک ان کی رعایت اور قیادت سنبھالتا۔ سیدنا یوسفؑ بلاشبہ ان کے زیرِ عیم آگبر تھے مگر ان دنوں تک اسرائیلیوں کی اتنی کثرت نہیں رہی لہذا شہریت کے حقوق سے مشروط حد تک مستفید ہو سکتے تھے۔ یہ تو ان نجومیوں اور کاہنوں کے کہنے پر بعض فرعون ان کی نسل کشی کا فیصلہ کر بیٹھے ورنہ تو اسرائیلی مشروط شہریت تک قبول کر چکے تھے بہر حال موسیٰ نے فرعون مصنوع پر اپنا پروگرام واضح کر دیا اور فرعون چاہتے تھے کہ عبرانیوں کے یوں چلے جانے سے جہاں مصری معیشت متاثر ہوگی وہاں رجعتِ قہقری کی صورت میں انہیں جان کی امان بھی مل جائے گی جبکہ یہ دونوں صورتیں اسے منظور نہیں رہیں چنانچہ اس نے کاہنوں اور ساحروں کی شکست پر انہیں اجتماعی موت سے دوچار کر کے اب اسرائیلیوں کی نسل کشی کا پروگرام بنایا مگر اب موسیٰ کی انڈر گراؤنڈ تحریک کامیاب ہو چکی تھی آپ نے ایک رات ان کو نکل جانے کا اشارہ دیا اور پوچھنے سے پہلے یہ لوگ دریا کے پایاب ہونے کی جگہوں پر پہنچ گئے۔ بارہ تین تھے اور اسرائیل کے بارہ قبائل ان کے ذریعہ دریابار ہو گئے۔ دن ہونے پر پتہ چلا تو فرعون بہت طیش میں آیا اور تعاقب کا فوری حکم دیدیا مگر اب حیرت کمان سے نکل چکا تھا فرعون کا تعاقب ناکام ہو ابلکہ اخذتہ العزۃ بالانتم اسے کبر و نخوت اور حکومتی پندار نے ہر مقام پر شکست سے دوچار کر دیا۔ (القرآن) اور وہی پندار اسے چڑھتے دریا کی لہروں میں گم کر دینے کا باعث بن گیا۔ اب اگرچہ ڈوبتے وقت اس نے اسلام کا اعلان کر دیا مگر اب کا اسلام ضابطہ الہی کے مطابق نہیں تھا۔ اب طبعی اسباب کے بغیر دریا کی پھری

ہوئی موجوں سے جھٹکنا محال تھا۔

قرآن پاک نے خبر دی ہے کہ فرعون نے ڈوبتے وقت کہا تھا کہ۔ آمَنْتُ اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْ  
**فرعون کا ایمان**  
 آمَنْتُ بِہٖ یٰۤاِسْرَآئِیْل۔

”میں اس خدا پر ایمان لاتا ہوں جو بنی اسرائیل کا خدا ہے۔“ (یونس، 90)

اس طرح یہ آیت واضح کرتی ہے کہ فرعون ڈوبتے وقت کلمہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اب وقت گزر چکا تھا کہ توبہ ضابطہ توبہ کے مطابق نہیں ہوئی تھی فرمایا،

ان لوگوں کی کوئی ”توبہ“ نہیں جو زندگی بھر برائیاں کرتے رہے یعنی قانون الہی پر ایمان نہ لائے  
 اور جب ”موت“ نے آدھوچ لیا تو کہنے لگے ”تَبْتَ الْاَن“ اب میں تائب ہو گیا ہوں۔ اور نہ ہی ان  
 لوگوں کی توبہ قبول ہے جو مرتے دم تک کافر رہے۔ (نساء، 18۔ ترجمہ امام المسند ابو الکلام آزاد)

اس آیت کریمہ نے ایمان لانے کا وہ معیار یا یوں کہئے کہ وہ ضابطہ بتا دیا جس کے مطابق ایمان لانا موجبِ فلاح بن جاتا ہے لیکن فرعون چونکہ اس معیار پر پورا نہیں اتر لہذا توحید کا اعلان بھی اسے فائدہ نہ پہنچا اس کا قانون الہی کے اسی مضمون کو سورہ یونس (91) میں خود فرعون کے غرق ہونے کے ساتھ بھی ذکر کر دیا ہے لیکن اس وضاحت کے برعکس ہمارے اہل تفسیر کا اصرار ہے کہ فرعون کو کلمہ پڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ

”فرعون کے ڈوبتے وقت ہوا یہ کہ جبرئیل نے اس کے منہ میں کچھ ٹھونس دی تاکہ وہ لا الہ کہنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔“ (حوالہ ترمذی ”نسائی“ ابن حبان، حاکم، اسحاق، بیہار، ابو داؤد اور طیانی)

یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث نہیں ہے بلکہ ضعیف سندوں کے ساتھ ابن عباس کا قول ہے جو کہ چند وجوہات کے پیش نظر قابلِ کمال ہے۔

I۔ فرعون اگر مسلمان ہو جاتا تو انہیں ابن عباس کا کیا نقصان تھا؟

II۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ٹھونسنے کے باوصف مفتو لا الہ۔ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا لیکن۔ اعلانِ توحید چونکہ ضابطہ ایمان۔ پر پورا نہیں اتر لہذا اسے فائدہ نہیں پہنچ سکا۔

III۔ ایمان کا تعلق دل سے ہے اگر زبان کی تصدیق لازم ہوتی تو گونگوں اور بہروں کے اسلام کا اعتبار نہ ہوتا اس بنا پر جبرئیل کا فرعون کے منہ سے کلمہ پڑھنے سے روکنا دل کے مسلمان ہونے سے مانع نہیں ہو سکتا پس انہوں نے یہ تکلف کیوں گوارا کیا؟

IV۔ اس واقعہ کو تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تعلق امورِ غیب سے ہے اور ابن عباس اور ہمارے مفسرین عالم غیب نہیں تھے انہیں کس طرح معلوم ہوا کہ۔ جبرئیل نے کچھ ٹھونس کر فرعون کا منہ بند کر دیا تھا؟

فرعون اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا اور پیش میں آکر دریا میں گھوڑا اتار دیا۔ جبکہ دریا

**فرعون ڈوب رہا ہے**

کاپانی چڑھ رہا تھا۔ درمیان میں پہنچا تو موج دریا نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ قرآن اسکی لاش کو عبرت بنانے کیلئے محفوظ ہونے کا اس طرح اشارہ دیتا ہے فالیوم ننحیک بیدنک لتکون لمن خلقت آية  
 آج تیری لاش کو کسی بلند جگہ پر لے آئیں گے تاکہ آنے والوں اور دیکھنے والوں کیلئے ”گیہ“ عبرت ہو  
 نجات عرثی میں نیلے یا لوچی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ (کشاف جلد 2/289-المنار جلد 11/276)  
 اس بنا پر آیہ کا مطلب یہ ہو گا کہ

تو اب موت سے تو نہیں بچ سکتا لیکن تیرا جسم پانی کی موجوں سے چھلایا جائے گا تاکہ وہ حسب معمول مٹی کر کے رکھا جائے اور آنے والی نسلوں کیلئے عبرت و تذکیر کا موجب ہو۔

(ترجمان القرآن امام المند جلد 2/169)

دریا کی بھری ہوئی موجوں نے فرعون کی لاش کو ساحل پر پھینک کر جہاں اسکی خدائی کا پردہ فاش کر دیا وہاں اسکی لاش کی حفاظت کا اشارہ کر کے دیدہ تماشا کیلئے سامان بصیرت بھی مہیا کر دیا اور پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ جسکی 1882 میں ”ممفس“ شہر کے مندر ”دبر البحر“ کی کھدائی نے تصدیق کر دی۔ اس وقت اسکی مہیا کی لاش لندن کے دارالآثار میں محفوظ ہے۔ صدق اللہ العظیم۔

تورات سفر خروج فصل پنجم کی ابتدا اور ششم کی ابتدا آیت 8 اور 9 میں خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ”موئے اور اسکے ساتھیوں کو فراعنہ کا جانشین اور مصری تاج و تخت کا وارث بنائیں گے۔“

اسی طرح اعراف میں اسرہیلیوں کے بارے میں فرمایا۔

اور ہم نے اس قوم کو تخت و تاج کا وارث بنایا جو زمین کے مشرق و مغرب میں قلت اور ضعف کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ (اعراف، 136)

اور کہ

ہم احسان کرنا چاہتے ہیں ان پر جو غلامی و ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور بنائیں گے ان کو حکمران۔ اور کرینگے زمین کے دارثوں میں سے۔ اور دکھائیں گے (آنے والے) فرعون اور ان کے ہاں کو ہر وہ خطرہ جسے خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

خدا کا یہ وعدہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فراعنہ کے دیس کے مشرقی و مغربی کناروں پر موئے نے ”اسرائیل“ بنالیا تھا؟ اس ابہام کو امام المند نے یوں حل کیا ہے،

”پورب (مشرق) یعنی فلسطین و شام کا ملک جو مصر کے پورب میں واقع ہے اور اسکے مغربی حصوں کا ملک یعنی جزیرہ نما سینا فلسطین کے پچھتم میں ہے یہ تمام علاقہ اس وقت مصری شاہنشاہی کا خراج گزار تھا۔“ (ترجمان القرآن طبع دوم جلد 31/2 حاشیہ نمبر 1)

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ”ننجیک“ میں جس ”نجات“ کا وعدہ ہے وہ اسکے غرق فرعون غرق نہیں ہوا؟

ہے کہ نجات کے معنی کسی ٹیلے یا بلند جگہ کے ہیں یہاں اردو والی نجات مقصود نہیں ہے کیونکہ اگر اے غرق بھی تسلیم نہ کیا جائے اور ساتھ ہی عیسویوں کا بھی نہ مانا جائے تو کیا ایک نبی کے شایان شان ہے کہ کسی مسلمان فرماں روا کی ریاست کے حصے بخرے کر کے اپنی حکومت قائم کرے۔

11 نیز قرآن کی گواہی کو کیا کہا جائے گا جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے فاغرقہ ومن معہ (103) وقلنا من بعدہ بنی اسرائیل اسکنوا الارض۔

(اسراء، 104)

پس فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو زچ کرے اور ان پر ملک میں رہنا دشوار کر دے لیکن ہم نے اُسے اور ان سب کو جو اس کے ساتھ تھے (سمندر) میں۔ غرق۔ کر دیا اور ہم نے اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ اب اس سر زمین پر (فارغ البال) ہو کر۔ بسو۔ تمہارے لئے کوئی کھٹکا نہیں رہا۔

(ترجمان القرآن جلد 2/367)

یعنی فرعون اور اسکے تمام تر ساتھی جو شامل کاروان تھے غرق کر دیئے گئے تھے اور یہی خبر یونس (90) میں بھی دی گئی ہے۔ ایسے میں ”نجات“ سے اردو والی نجات عرادلے کر فرعون کو صحیح سالم موج دریا سے باہر لے آنا اور اسکے ایمان کا باقاعدہ اعلان کرنا عجیب بہتم نظر لگتی ہے۔

یوں تو قرآن کسی خارجی شہادت کا محتاج نہیں ہے لیکن ذہن انسانی چونکہ خارجی ساروں اور تصدیقات سے جلد مطمئن ہونے کا عادی ہے خواہ ان کے الفاظ کتنے ہی ہنس اور مفق ہوں۔ لہذا مناسب ہو گا کہ ہیروڈوٹس (HERO) (425 ق م) کا ایک کتبہ۔ نقل کر کے اس کی تشریح کر دی جائے جو فرعون کے غرق ہونے پر زندہ شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے،

”یہ ایک حقیقت ہے کہ فرعون ابن سیسوسٹرس (میتھونیائی میں)۔ دس برس تک ٹائیٹار ہا اور اسکی آنکھیں شدت درد سے نکل آئیں جس سے دریا میں جوش آیا اور اس کی موجیں عام سطح سے بلند ہو گئیں۔“ (حوالہ ”ڈکشنری آف کتاب مقدس“ عربہ پوسٹ جلد 410 حوالہ امام عبدہ)

اسکی تشریح میں امام العصر محمد عبدہ (1905 م) فرماتے ہیں،

”لکن سیسوسٹریس فرعون موتے تھے جسکے عہد میں دریا میں طغیانی آئی اور یہی فرعون موتے کے تعاقب میں دریائی لہروں کی نذر ہوا۔ ٹائیٹار ہونے سے عرادلے ملک و دولت کا زوال ہے۔“

اس طرح کے واقعات کی روشنی میں فرعون کا دس برس تک ٹائیٹار ہنا صاف بتا رہا ہے کہ وہ اتنا عرصہ موتے کی انتہائی سرگرمیوں اور دیگر طبعی حوادث اور مکر و ہات زمانہ کا شکار ہی رہا۔ یہ 47 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور روزول

ہی سے موسے کی انتظامی ضروریوں کا شکار رہا، اسکی تخت نشینی کے ساتویں سال موسے کی انتظامی شہرت قبول عامہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور اگلے تین برس فرعون سے ہاتھ پائی میں بسر ہوئے بالآخر دسویں برس جبکہ فرعون کی عمر 67 برس تھی اسے غرق آبی کا حادثہ پیش آیا۔

### تیہ میں پراؤ

سیدنا موسے جب مصر سے نکل کر پورب اور پچھتم کے بمصری مقبوضات پر قابض ہوئے تو ارادہ کر لیا کہ اسرائیلیوں کو ان کے اصل وطن بیت المقدس میں لگا دیا جائے لیکن یہاں پہلے سے کنعانی قابض تھے جن کے ذراور بیت سے، عبرانی بعد خائف تھے چنانچہ یروشلیم چلو سے صاف انکار کر دیا اور یہاں یہ بتایا کہ۔ انا لن ندخلها ان فیہا قوماً جبارین۔

”ہم یروشلیم میں کسی حال میں بھی داخل نہیں ہو گئے وہاں کے باشندے دیو ہیل اور قوی انسان ہیں۔“

(ماخذہ، 24)

حضرت موسے نے محسوس کیا کہ یہ غلام قوم لڑنے کی نہیں۔ ریاستی ماحول میں رہ کر خوف و دہشت ان کے رگ و پے میں رچ گئے ہیں یہ ذلت و ضعف کی زندگی پر قناعت کرنے والے لوگ ہیں لہذا باہر ایزدی پالیسی یہ وضع ہوئی کہ۔ انہیں چالیس برس تک سینا کی سنگلاخ، ریگستانی اور نامہوار زمین (میر) میں رکھ کر ان کی تربیت اور ٹریننگ پر صرف کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس اثنا میں ہوا یہ کہ ان کی پرانی نسل ختم ہو گئی اور نئی پود جوان۔ جوان جذبے اور جوان احساسات، جوان امنگیں، اور جوان غیرت۔ اور پھر پیغمبر کی صحبت و تربیت کا اثر۔ جہاں پرانے لوگوں میں فرعون کی استعمار کی وجہ سے غیرت، دینداری، مقابلہ کی تاب و توانائی، جہاد یک جہتی و دینی حمیت کی اعلیٰ قدریں دم توڑ چکی تھیں وہاں نئی نسل نے ان ہی اقدار کو زندہ و بلند کرنے کا۔ مصمم ارادہ کر لیا۔

### مصر پر موسیٰ کی حکومت

کہا جاتا ہے کہ موسے نے چالیس برس تک صحرائے سینا اور نواحیات پر حکومت کرنے کے بعد سوچا کہ مصر پر حملہ کریں۔ ادھر مصر پر ایک دوسرا پر اسرار فرعون حکومت کر رہا تھا۔ مشہور قدیم مؤرخ جوزیفوس یسودی (100 م) لکھتا ہے،

”مائیوں (مفتوحہ کا خاص ڈائری نوٹس) کا بہن لکھتا ہے کہ۔ موسے نے جب سینا کی طرف سے (نئے) فرعون کو شکست دی تو وہ بھاگ کر ایتھوپیا میں پناہ گزین ہوا اور اس کے بعد تیرہ برس تک مصر پر (حضرت) موسے ہی حکومت کرتے رہے پھر ایسا ہوا کہ یہ (پر اسرار) مگر مفرور فرعون اپنے بیٹے کی معیت میں ایک لشکر جرار لے کر مصر کی طرف لوٹا اور عبرانیوں کو شام کی طرف دھکیل دیا۔ کہ اس اثنا میں حضرت موسے غالباً فوت ہو چکے تھے۔“

### فرعون کا دعوة ربوبیت

قرآن مجید نے خبر دی تھی کہ فرعون (مفتوحہ) نے رب اعلیٰ۔ ہونے کا دعویٰ کیا تھا اسکی تفصیل اور تصدیق مصری کتبہ کی اس عبارت سے ہو سکتی ہے جو قاہرہ



میوزیم میں زیر نمبر 34025 میں محفوظ ہے، انہیں ہے کہ

”جب سے آلمہ پیدا ہوئے خداوند (رع) نے مصر کو اپنا چیمپینا قرار دیدیا اور معنو (فرعون موسیٰ) بھی خداوند ”رع“ کا چیمپینا ہے جو کہ فضا کے دیوتا ”شو“ کی گود میں بیٹھا ہوا ہے اور خداوند (رع) نے مصر پر جب توجہ ڈالی تو معنو والی مصر پیدا ہوا جسے کہا گیا کہ وہ مصر کا دفاع کرے۔ پس قیروانیوں، آرمینیوں، کنعانیوں، عسقلانیوں، جزایوں اور یعام نے اسکی اطاعت قبول کر لی۔ کٹ گئے اسرائیلی نہ رہی ان کی اولاد۔ اور ہو گیا فلسطین یہ وہ تاکہ مصر اس کا کفیل (نیا شوہر) ہو اور ہو گیا معنو سورج دیوتا ”رُزق دینے والا“۔

جب سیدنا موسیٰ محلات کے ایک شہزادے کی حیثیت سے مجمع البحرین

موسوی دور کے نامور فضلاء

کی تربیت گاہ ”بیت الحیات“ میں بچے گئے تو وہاں آپ کے جن فضلاء

سے تبادلہ خیال ہوتا رہا ان کے نام اس طرح تھے،

1. سفن رع . 2. پان لو . 3. مجمع البحرین صوبے کے گورنر اور شاہی درگاہ بیت الحیات کے پرنسپل جسے خواجہ خضر کہا جاتا ہے۔ 4. درباری شاعر ینطور . 5. حور . 6. رمیس شہر کی لاہریری کا منظم اعلیٰ۔ آمن رع . 7. حور رع . 8. انا . 9. ناگابو . 10. بیگن تباہ . 11. مرام ابط . 12. سرنپاح . 13. آمن ام ابی اور . 14. آمن فاسو وغیرہ وغیرہ۔



## ذوالکفل۔ گوتم بدھ (دارق)

واسماعیل وادریس و ذالکفل کل من الصابرين . (انبیاء، 85)

واذ کر اسماعیل والیسع و ذالکفل کل من الاخیار . (ص، 48)

طالبانِ قرآن! میرا یہ مقالہ ہفت روزہ چٹان ہاٹ 13 جون 1960 (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔ اسکی تحریر کا محرک یہ ہے کہ رواں صدی کے پانچویں عشرے میں الشیخ الفاضل علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم کا ایک تحقیقی مقالہ۔ باصرہ نواز ہوا ان دنوں مجھے تحقیقی لٹریچر کے مطالعہ کا بذا شوق تھا۔ لیکن تقسیم ملک نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا، ہم علمی نوادرات کی تلاش و جستجو ہر لمحہ جاری رہی لہذا ہر ایسی تحریر جو کسی بھی زلوئے سے قرآن محکم کی تشریح و تعبیر پر مشتمل ہوتی جمع کرنا فرضِ منہی سمجھتا تھا ان دنوں کتابیں منگوانے کا براہِ راست کوئی امکان نہیں تھا۔ خط و کلمت کے ذریعہ لکھنو، حیدرآباد اور دہلی کے کتب خانوں سے قیمتیں معلوم کر کے پھر پاکستان میں ان کے بتائے ہوئے عزیز و اقارب کے ہاں پیسے جمع کر دیئے جاتے اور اس طرح مطلوبہ کتابیں یہاں مل جاتیں۔ ان ہی کتابوں میں علامہ مناظر احسن کی ایک تحقیقی

تحریر ”ذوالکفل“ کی بابت بھی فراہم ہو گئی اور پہلی نظر میں اس نے بحد متاثر بھی کر ڈالا۔ کیونکہ ان دنوں یا جوج ماجوج اور اصحابِ فیل کی بابت سرسید (1898ء) اور ذی القرنین اور اصحابِ کف کے سلسلے میں امام الہند ابو الکلام آزاد (1958ء) کی تحقیقات حرفِ آخر کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں اور مجھے شوق پیدا ہوا کہ ”ذوالکفل“ کے بارے میں بھی کوئی ایسی تحقیق ہی نظر نواز ہو جو مجھے دولتِ اطمینان سے مالا مال کر دے لیکن بعد افسوس کہ علامہ مرحوم کی تحقیق میرے لئے سامانِ تسلی نہ کر سکی اور میں نے غالباً کسی طرح ہفت روزہ چٹان میں اس سلسلہ کو چھیڑا اور یوں اہلِ علم کی آراء جمع ہونا شروع ہو گئیں ان میں حبیبِ لبیب محمد اسلم انصاری جو ریسرچ سکارلر بھی ہیں۔ دانشور اور ادیب بھی استاد بھی ہیں شاعر اور خطیب بھی ان دنوں عنفوانِ شباب میں تھے مگر قلم اور سوچ میں تجربہ کار بزرگوں کا رنگ موجود تھا انہوں نے بھی اپنی نگارشات ارازاں فرمادیں اور اس طرح جس خیال اور نظر یے کا میں حامل تھا ان کی صورت میں مجھے دستگیر اور معاون مل گیا اور میں نے بھی حوصلہ پا کر اپنا حاصلِ مطالعہ نذرِ قارئین کر دیا۔ اب میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی اس کا بخوشی احساس کیا جاسکتا ہے لیکن اس اعتراف کے باوصف کہ میں گیلانی مرحوم کے مقابل کو یہ قد ہوں تاہم اتنا بھی نہیں کہ ان کے گھٹنوں تک بھی نہ پہنچ سکوں۔ رہی یہ بات کہ اس مجموعے میں ایسے مقالات کو شامل کیا گیا ہے جو مثبت پہلور کھتے تھے۔ جبکہ یہ مقالہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ تو صاحبانِ انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں ہے آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کا ”ذوالکفل“ کیا ہند کا ”کپل دیو“ یا حضرت گوتم بُدھ ہو سکتے ہیں؟ جبکہ۔ وحی قرآن جزیرۃ العرب، مصر، ایران، ایشیائے کوچک اور بحرِ کیسپین وغیرہ کے تاریخی واقعات کا تو ذکر کرتا ہے لیکن ہندوستان اسکی گرفت سے بہت دور نظر آتا ہے وہ یہاں کے ”کپل“ کو ”تعریب“ کا جامہ نہیں پہناتا۔ نہ قرائن کے لحاظ سے نہ شواہد کے زاویہ سے۔ پھر قرآن کے ذوالکفل۔ اور ہند کے کپل۔ دستو کی تعلیمات میں جو فرق ہے وہ اس خیال کی نفی کر دینے کیلئے کافی ہے کہ وہ مطلوبہ شخص نہیں ہو سکتے علاوہ اس کے دونوں کے زمانے میں سینکڑوں برس کا تفاوت پھیلا ہوا ہے جو تباہ و تفریق کا مدلل ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ایسے میں مقالات کے اس مجموعے میں ”اثباتی“ حیثیت سے اسے شامل نہ کیا جاسکتا تھا لیکن چونکہ اپنے فہم ناقص کی حد تک اسکے منفی اثر کو زائل کرنا ضروری تھا لہذا اپنا مقالہ پیش کر رہا ہوں۔

(رحمت اللہ طارق۔ 95-3-15 ملتان)

یوں تو قرآنی تعلیمات کی رو سے یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان جیسے براعظم میں کسی پیغمبر یا فرستادہ خدا کے وجود کا انکار کر کے قرآن کی تکذیب کا مرتکب ہوا جائے۔ لیکن یہ جو قرآن حکیم میں بعض انبیاء کا ضمناً اور اشارۃً مذکور ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ہندوستانی پیغمبر ہو سکتا ہے؟ کیا ایسی مطابقت اور تعین اتفاقی امر ہے یا علمی تحقیق؟ یا پھر یونہی خوش فہمی؟ ہماری رائے میں (جسے حرفِ آخر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا) دوسروں سے قطع نظر ذوالکفل کا گوتم بُدھ تسلیم کرنا تیسری شق سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ علم و بصیرت اور تحقیق کی رو سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت گوتم بُدھ کے ہاں تمام اخلاقی قدروں کا سراغ تو ملتا ہے لیکن وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق کوئی واضح یا مبہم تصور تک نہیں ملتا۔ اور اس کے بغیر کسی شخص کو نبی تسلیم کرنا خوش فہمی ہے یا ضعفِ اعتقاد کی علامت!! نبوت کیلئے تصورِ خدا، جسم کے لئے ممزولہ

روح کے ہے۔ نبی جب مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکتا ہے تو خدا کی توانائی سے وقل الروح من امر ربی۔ لیکن جب خدا ہی نہ ہو تو پھر وہ توانائی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے جو مردہ دلوں کو حیات نو بخشے؟ اسلم انصاری نے جس انداز سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا صارم الازہری مدظلہ نے بیک اور ضبط تولید پر جس طرح کامیاب مقالے تحریر فرمائے۔ ذوالکفل کے معاملہ میں آپ نے کسی تحقیق سے کام نہیں لیا۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے فاضل مکتوب نگار نے استدلالی طور پر نہیں بلکہ روایتی طور پر گفتگو کی ہے۔ اس روایت پر شک کرنا کہ شیخ العرب والعم قبلہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز اور دیگر اکابر دیوبند کے نزدیک ذوالکفل اور گوتم بدھ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں خوا مخواہ سوء ظن کا اظہار ہے۔ مولانا مرحوم کی عظمت و بندگی۔ مسلم، لیکن محض یہ کہہ دینا کہ آپ بھی ذوالکفل کو گوتم بدھ سمجھتے تھے۔ اس مسئلہ پر کوئی عالمانہ روشنی نہیں ڈال سکتا۔ تاہم اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان اکابر کے بھول ذوالکفل کو گوتم بدھ ہی تھے تو بھی ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس خیال کے ماخذ کا کھوج لگائیں یا پھر اس عقیدہ کو رائج کرنے کی ”نفسیات“ کا جائزہ لیا جائے۔ تاکہ یہ عقدہ خود بخود حل ہو سکے۔ ماخذ کا سراغ تو ہم جیسے نابلدہ محض کیا لگائیں گے۔ اس خیال کے حامی حضرات خود بھی تائیں و مـ ظن و تخمین کی بھول بھلیوں سے نکل نہیں سکے۔ اب رہا نفسیاتی تجربہ تو آپ ہماری نیت پر شبہ نہ کریں۔ جو بات کہی جائے گی بے لاگ اور خوفِ خدا کو ملحوظ رکھ کر۔

### عقیدہ پہلے یا دلیل؟

”نفسیات“ کے ماہرین میں آج تک یہ نکتہ موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ دلیل خواہش سے پیدا ہوتی ہے یا خواہش خود دلیل ہے؟ غالب اکثریت کا خیال یہ ہے کہ خواہش

ہی اصل ہے اور دلیل فرع۔ عام مشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ہر انسان کے اندر پہلے ایک خواہش اور ایک رجحان سر اُبھارتا ہے اور اس کے بعد اس کی عقل اور اس کے شعور و ادراک کی محض و عیاں صلاحیتیں اس کے لئے دلائل فراہم کرتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ کوئی خیال یا رجحان دلیل سے قبل ہی کیونکر جنم لیتا ہے؟ بہر حال خیال یا خواہش کا پیدا ہونا نہ تو جرم ہے اور نہ ہی باعثِ تعجب! ہدف ان دلائل کی واقعی کمزوری کو بتایا جاسکتا ہے نہ فعل استدلال کو۔ کیونکہ خواہش بہر حال ماحولی تقاضوں کی تابع ماننی پڑے گی۔ راقم الحروف کے خیال میں ذوالکفل کو گوتم بدھ سے تعبیر کرنے کا خیال ایک سیاسی ماحول اور کچھ اتفاقی تقاضوں کی پیداوار ہے اور ایسے اتفاقی تقاضے کم و بیش ہر طالبِ علم کو پیش آتی جاتے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا بھوت راقم پر اس حد تک سوار تھا کہ بے تکلف ہر ہندو ریفاہ مر کے نام کے ساتھ علیہ السلام منہ سے نکل جاتا تھا۔ کرشن علیہ السلام، رام علیہ السلام، بدھ علیہ السلام وغیرہ۔ سب اسی ماحول کے اثر سے علیہ السلام بنے تھے۔ اور میں سمجھتا تھا کہ ایسا کرنے میں اسلام اور قرآن سے میری تائید ہی ہو رہی ہے۔

### سیاسی مصلحتیں

در اصل جدوجہد آزادی کی تاریخ میں اس بات کا واضح نشان ملتا ہے کہ ہندو ہی اور مذہبی لحاظ سے دو مختلف قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کیلئے ایسی اقوام کے درمیان قدیم تمدنی

اور ثقافتی تعلقات کا سراغ لگانا گزیرا امر تھا۔ بالخصوص جب ایک دوسرے کو ثبوت کے طور پر یہ بتایا جاتا کہ تمہارے فلاں

بزرگ کا نام ہماری مقدس کتاب میں بھی مذکور ہے تو طرفین کے سیاسی نظریہ کو ایک گونہ زندگی حاصل ہو جاتی رہتی اور ان کے روابط جاندار صورت اختیار کر جاتے تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی نے اپنے خیالات کو ”حروف لواکل السور“ میں واضح صورت دے کر قرآن کی مبہم شخصیتوں کا اس طرح تعین کر دیا کہ وہ سب ”انڈین“ ہی تھے۔ کہنے کو تو یہ کتاب موسیٰ جار اللہ۔ روی مرحوم نے بھوپال میں تالیف کی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب مولانا سندھی کے دروس و افکار کا عکس کامل ہے جو روی پروفیسر کے توسط سے صلی قرطاس پرنٹنگس ہوا۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ یہ جو سورہ واقعہ (78) میں ہے کہ ”یہی قرآن کریم“ ”کتاب مکتون“ میں بھی اسی طرح ہے۔ اللہ لقرآن کریم فی کتاب مکتون تو کتاب مکتون سے ”لوح محفوظ“ مراد نہیں۔ بلکہ اس سے مراد ہے ”وید اپنشد“ مطلب یہ ہوا کہ یہی قرآن کریم ”وید اپنشد“ میں بھی اسی طرح ہے (یہ الگ بات ہے کہ اس طرح قرآن کا ماخذ وید کو ماننا پڑے گا) اسی طرح مولانا اور لیس کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ ”اد“ کے معنی ہیں بڑا یا پہلا۔ ریس یار لیش کے معنی ہیں رسول یعنی پہلا رسول جو کہ ہندوستان میں مبعوث ہوا کہ مولانا کے نزدیک امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ بھی ہندوستانی تھے کیونکہ آپ کے اجداد کاٹلی تھے اور کابل ان دنوں ہندوستان کی عملداری میں شامل تھا وغیرہ وغیرہ۔ الغرض ہندو مسلم اتحاد کے ضمن میں مسلمانوں نے جس وسیع المشرقی اور رواداری کا ثبوت دے کر جن بعض خواہشات کا ثبوت خود قرآن سے مہیا کرنے کی جرأت کی ان میں اتنی جان نہیں ہے کہ ایک متلاشی حقیقت کیلئے سلمان تسکین فراہم کر سکیں۔

مولانا مناظر احسن صاحب مرحوم اپنے عقیدہ و خیال کو لے کر مولائے کریم کے جوار رحمت میں پناہ لے چکے۔ وہ ہم میں موجود نہیں ورنہ ان سے پہلے یہ سوال کیا جاتا کہ ”کپل“ کو عربی کے کس اصول سے معرب بنا کر کفل بنایا گیا ہے؟ جبکہ اس کا ترجمہ اہل فن سے منقول ہی نہیں۔ پھر بادب گزارش کرتے کہ

1۔ حضرت بدھ کا 570 سال قبل مسیح ظہور ہوا اور یہ بھی مسلم ہے کہ آپ کے فلسفہ ”نزدان“ سے ایشیا والے متعارف ہو چکے تھے۔ نیز یہ بھی بدیہی امر ہے کہ بدھ کی تعریف ”بوذا“ کا عربی لٹریچر میں سراغ ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی انجیل میں آپ کا ذکر خیر نہیں ہے اسی طرح نزول قرآن سے بارہ سو سال پہلے آپ کا صوبہ بہار میں غلطہ بلند ہوتا ہے اور آپ کی تعلیمات سے ایران و خلیج فارس کافی عرصہ تک متاثر نظر آتے ہیں لیکن قرآن میں بھی ”بوذا“ کا لفظ نہیں ملتا۔ حالانکہ بیسیوں الفاظ ایسے ملتے ہیں جنہیں مرتب ہونے کے بعد فصیح عربی میں شمار کر کے انہیں بھی ”عربی مبین“ کی امتیازی برتری سے نوازا جاتا ہے۔ پھر اعلام و اشخاص میں تو اتنی لمبی چوڑی تعریف کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر گاگ۔ میگاگ کو یاجوج ماجوج نہادینے میں قرآن کو کیا وقت پیش آئی کہ بدھ کو بوذا بنانے میں آسکتی رہتی؟

2۔ کپل سے مراد وہ شخص ہے جس نے بدھ سے قبل جوگی مت کو جنم دیا یوں کہیے کہ خود حضرت بدھ نے بھی کپل کی تعلیمات سے متاثر ہو کر آپ کی تعلیمات میں تہذیب و ترمیم کر کے ایک نئے نام سے ”جوگی مت“ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسی کپل کے نام پر بعد میں ایک شرکباد ہوا جس میں

**یہ کپل کون تھے؟**



حضرت بدھ تولد ہوئے۔ لیکن عربی میں کفل کے معنی نہ تو شر کے ہیں اور نہ ہی کسی فلسفی کے نام کے۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم ذو کے معنی ”والا“ اور کفل کا ترجمہ کپل کر کے بغیر کسی دلیل و قرینہ کے یہ مفہوم اخذ کریں کہ ”کپل والا“؟ جبکہ اس کے تقریبی مفہوم کا سراغ نہیں ملتا؟

3۔ اگر اسی قرینہ کو علمی و ادبی تائیدات و توثیقات کے برعکس تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ خود گوتم بدھ ہی ذوالکفل ثابت ہو سکیں۔ بلکہ اس صورت میں خود ”کپل“ کو ”کفل“ ثابت کیا جاسکتا تھا۔ (بہ تکلف ہی ہسی)

4۔ بدھ کا ظہور (570 ق م) ہوا۔ لیکن ذوالکفل علیہ السلام

### ذوالکفل اور گوتم میں تاریخی فاصلے

جس نے ”ایزابیل“ زوجہ ”آحاب“ کی پھیلائی ہوئی گمرانی اور مت پرستی کے خلاف اعلان جنگ کیا جس نے بعل دیوتا اور ”عشروت دیوی“ کے پجاریوں اور اتباع کو قتل کر کے کوہ کرمل میں اپنا مرکز بنایا اور بعد میں ملکہ ازلیلا کے شدید حملہ اور تعاقب کی وجہ سے صحرائے سینا کا رخ کیا۔ پھر ایک بار آپ نے ”تھوت“ کے اغوا کرنے پر ”آحاب“ کے خلاف لوگوں اکسا کر کوہ کرمل وغیرہ علاقوں پر قبضہ کر کے مت پرستوں کا صفایا کر دیا۔ آپ کی ولادت اور وفات کا زمانہ 875 تا 853 ق م یعنی بدھ سے تین یا ڈھائی سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ اس تاریخی فرق کو کیونکر نظر انداز کر کے اخلاقی تعلیمات کے ایک بڑے ریفارمر۔ مگر منشک و غیر موحد شخص کو ایک ایسے پیغمبر سے تعبیر کیا جائے جس نے مثبت بیادوں پر نیکی کی تعلیم دی۔ فرار کی بجائے ڈٹ کر برائی اور ظلم کا مقابلہ کیا۔ بعل اور عشروت کے پجاریوں کو توحید کی تعلیم دی۔ اور اہالیان کرمل کیلئے تین سال کے مسلسل قحط کے بعد توحید قبول کرنے پر ہارش کی دعا کی۔۔۔۔۔؟

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اور اب مکرر وضاحت کی جاتی ہے کہ قرآن نے اکثر اشخاص کو نام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن بسا اوقات ”لقب“ پر ہی اکتفا کی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص کا نام بھی بتلادیا اور لقب بھی جیسے یونس کو ایک جگہ ذوالنون کے لقب سے یاد فرمادیا اور باقی مقامات پر خود نام سے یہ یاد رہے کہ ان ناموں اور مقامات سے اہل عرب و اہل قرآن پوری طرح واقف تھے۔



### بحث و نظر

ذوالکفل \_\_\_\_\_ گوتم بدھ؟

اسلم انصاری \_\_\_\_\_

چٹان میں مولانا محمد وارث کمال نے ذوالکفل اور گوتم بدھ کے سلسلے میں اظہار خیال کی دعوت دی ہے۔ راقم



الحروف مختصر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے لیکن یہ آخری اور قطعی فیصلہ نہیں۔ قارئین چنان اپنے اپنے زلویہ نگاہ سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ (اسلم انصاری)

۱۔ مذہب اور فلسفہ کے مابین ہمیشہ یہی چیز مابہ الامتیاز رہی ہے کہ حانی الذکر نے حیات و کائنات کی ہستی کو عقل اور استدلال یعنی Reason کے ذریعے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ مذہب میں بھی اگرچہ عقل کا عنصر مفقود نہیں رہا لیکن مذہب نے جب بھی حیات و کائنات کے بارے میں کچھ لکھا ہے سب سے پہلے ایک کامل و اکمل ہستی کو مفروضے کے طور پر تسلیم کر کے لکھا ہے۔ یعنی کسی ایسی ہستی کو بغیر کسی رد و قدح کے حیثیت ایک مسئلہ کے قبول کیا ہے جسے جہاں پر اس سارے نظام ہستی کا خالق و مالک کہا جاسکتا ہے، جس بات کو فلسفہ آج تک طے نہیں کر سکا اسے مذہب محض وجودانی رہنمائی کے سارے تسلیم کر کے زندگی کے ہقیہ مسائل کو حل کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ مذہب میں خدایا کسی خالق کائنات کا وجود محض ایک مفروضہ یعنی فرض کی ہوئی بات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ اس طرح ہے جس طرح ریاضی اور علم ہندسہ میں اعداد و یا خط مستقیم، دائرہ اور نقطہ کی بعض اضافی صورتوں کو پہلے سے تسلیم کر لیا جاتا ہے اور پھر بعد کے دلائل سے وہ مفروضہ ثابت شدہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب مذہب میں خالق کائنات کل کی حیثیت سے ایک ہستی کو تسلیم کر لینے کے بعد انسان اس کی روشنی میں زندگی کے دیگر مسائل کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو خدا کے وجود کا مفروضہ خود خود ایک حقیقت ثابت بنا چلا جاتا ہے۔ اور بعد میں کسی منطقی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

۲۔ یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ فلسفہ اور مذہب ہوا سانس، فکر انسانی کے یہ تینوں نمائندے کسی حقیقت کی تلاش میں ہیں۔ ایک ایسی مطلق، غیر اضافی، غیر مبہم اور واضح حقیقت جو باقی کے تمام حقائق کی الجھنوں کو دور کر سکے۔ جو زندگی کو کلیتہً اور یک جہتی عطا کر سکے۔ جو زندگی کے متنوع مظاہر کی بظاہر باہم متضاد اور متعارض صورتوں کو تطبیق دے سکے۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے تمام انسانی مذاہب نے حیات و کائنات کے مسائل کی توضیح و توجیہ اور تشریح و تعبیر خدا کی ہستی کے اعتراف کے ساتھ شروع کی ہے۔ گویا مذہب نے کائنات کو ہمیشہ ایک جامع مرقع کی صورت میں دیکھا ہے جس کے اندر تضاد یا تناقض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جو اپنے اندر ایک اعلیٰ مقصد پنہاں رکھتی ہے۔ وجود کی نیرنگیاں سرسبز باطل اور نظر کا فریب نہیں بلکہ ان کے پس منظر میں ایک مطلق حقیقت کا فرما ہے اور زندگی کا ہمہ جنس جب تک اس مطلق حقیقت، اس کی کلیت کے ساتھ نہ ہو جائے زندگی کی وہ قوتیں جن کے اندر تخلیقی نشوونما کی حیرت انگیز صلاحیتیں ہیں پارہ پارہ ہو کر فساد کا باعث بنتی ہیں یہ شر ہے اور اسکی دوسری صورت خیر۔ ظاہر ہے کہ شر اور خیر اصل کے لحاظ سے محض اعتباری طور پر مختلف ہیں۔ لیکن نتائج اور عواقب کے لحاظ سے حقیقتاً متضاد۔ (ہویت اس خیال کی بجوی ہوئی صورت ہے)

۳۔ فلسفہ جب استدلال کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہوا تو اسے نفس شامروہ اور وجود فی الخارج فریب اور دھوکہ نظر آنے لگا۔ لہذا زندگی ایک بے مقصد کھیل بن کر رہ گئی۔ لیکن اس کے برعکس مذہب فطری نے جن میں بدھ مت شامل نہیں، کیونکہ

بدھ مت فیس باطن اور اشیاء فی الخارج دونوں کی نفی کرتا ہے، نفس انسانی اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات دونوں کو حقیقت کے طور پر تسلیم کیا ہے کیونکہ نفس انسانی کائنات کے مجموعی شعور کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اسی لئے دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اسلام نے نفس انسانی کو ”عالم نفس“ اور کائنات کو ”عالم آفاق“ کہہ کر نہایت واضح الفاظ میں دونوں کی حقیقت اور اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

۴۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ”عارف“ گوتم بدھ نے نفس باطنی (عالم نفس) اور خارجی (عالم آفاق) کو کسی حیثیت سے بھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر مجھے اجازت دیں تو عرض کروں کہ گوتم بدھ دنیا کا سب سے بڑا متشکک تھا۔ وہ زندگی کا عرفان حاصل کرنے کا عزم لے کر اپنے محلات سے نکلا اور بڑھ کے درخت کے نیچے عرفان کے آخری لمحوں تک زندگی اس کے لئے چیتان رتھی اور آخر تک چیتان رہی۔ اس کا عرفان غالباً معلوم شد کہ بیچ معلوم نشد والا عرفان تھا۔ زندگی جس طرح پہلے اول و آخر اس کہنہ کتاب القداست کی صورت میں رتھی بعد میں اسی طرح رہی۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ آفریش کائنات، مقاصد حیات و کائنات اور کائنات میں انسانی زندگی کے اصل مقام کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اگر اس نے اعمال صالحہ پر زور نہ دیا ہوتا تو اس کا فلسفہ کلی طور پر معدومیت کا فلسفہ ہوتا۔ اب بھی تشکیک، لا اور میت اور معدومیت اس کے بنیادی نظریات ہیں۔ ہم کون ہیں؟ ہماری منزل کیا ہے؟ اعمال صالحہ کا معیار کیا ہے؟ اور اسی طرح کے دوسرے اہم سوالات کا جواب گوتم بدھ کے پاس نہیں جب ہمیں زندگی کی حقیقت کچھ نہیں معلوم تو ہم اعمال صالحہ کیوں اختیار کریں۔ محض اس لئے کہ وجود کے چھینٹنے سے آزاد ہو جائیں۔ ہمیں مکتی اور نروان حاصل ہو جائے یا ایک لحاظ سے ہم بالکل ”معدوم“ Extinct ہو جائیں؟ اگرچہ گوتم بدھ زندگی کی پوری طرح نفی نہیں کر سکا لیکن یہ عرصہ زندگی کی نفی کرنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے زندگی کا مہمائے مقصود وجود کے چکر سے نکل کر معدوم ہو جانا ہے۔ اس کا فلسفہ نفی Negation کا فلسفہ ہے۔ جبکہ زندگی کا حقیقی عرفان خود زندگی کی نفی نہیں کر سکتا۔

اصل میں گوتم بدھ کا وجود ویدانت کے پیچیدہ نظام افکار کے خلاف ایک ردِ عمل تھا۔ ہندومت کے نزدیک یہ سنسار ایک بہت بڑا چکر ہے جو لکھو کھمبس سے چل رہا ہے اور نہ جانے کب تک چلتا رہے ہندومت میں زندگی کا تصور خطِ مستقیم کی صورت میں نہیں بلکہ دائرے کی صورت میں ہے جس کے اندر ارتقاء کی کوئی گنجائش نہیں گوتم بدھ نے ایک لحاظ سے انسانی زندگی کو اس ”سنسار چکر“ اس لبدی امتداد اور ازلی استمرار سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش نے ایک عظیم Frustration کی صورت اختیار کر لی۔ یعنی معلوم نہیں حقیقت کیا ہے۔ بس اتنا ہے کہ اچھے کام کئے جاؤ۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اچھے کام کا معیار کیا ہو؟ داخلی یا خارجی؟ اگر اچھے بُرے کا معیار کوئی خارجی شعور ہے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانی شعور سے عظیم تر ہوگا۔ انسانی شعور سے عظیم تر شعور رکھنے والی ہستی آخر کون ہے؟ اور اگر یہ معیار داخلی ہے یعنی بالفاظ دیگر، ضمیر انسانی۔ تو آخر وہ کونسے مقاصد عالیہ ہیں جن کو سامنے رکھ کر اعمال و افعال پر اچھے بُرے کا حکم لگایا جاسکے۔ کیونکہ اعمال و افعال کا اچھا بُرا ہونا اضافی بھی ہو سکتا ہے؟ اس مقام پر پہنچ کر اکثر مجھے کانٹ اور گوتم

بدھ میں گہری مشابہت دکھائی دی ہے۔ کانٹ بھی نیکی کیلئے کوئی جواز نہیں چاہتا چونکہ نیکی نیکی ہے اس لئے نیکی کرنی چاہئے  
(Imperative Catagorikal) کانٹ کی نیکی کا سرچشمہ Good Will ہے جس پر اکثر لوگوں نے پھبتی کہی  
ہے کہ

**His good will is a will that Wills nothing.**

لیکن کانٹ کے ہاں زندگی پھر بھی ایک گہرے مفہوم کی حامل ہے۔ اور اس کے نظریہ حیات اور نظریہ خیر میں،  
بدقت ہی ایسی پیوند ضرور لگ جاتا ہے۔

۵۔ اگر ان واقعات کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے جو گوتم بدھ کی جستجوئے عرفان کا محرک ثابت ہوئے تو معلوم ہوگا کہ جو نئی  
گوتم بدھ نے زندگی کے حقائق کو شعور کی آنکھ سے دیکھا۔ اسے زندگی اپنے منفی روپ میں دکھائی دی۔ یعنی بیماری، موت،  
بوہا، تکلیف، آزار، جوں جوں گوتم بدھ نے غور کیا، زندگی شرکی، مستقل علامت بن کر اس کے سامنے آئی گئی۔ اس کا لازمی  
نتیجہ یہ نکلا کہ چونکہ زندگی بذات خود شر کا Symbol ہے اس لئے ایسی زندگی سے آزاد ہو جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن زندگی  
سے آزادی بغیر عمل صالحہ کے، نہیں مل سکتی اس لئے عمل صالحہ زندگی کا بنیادی اصول ہونا چاہئے۔ آپ نے دیکھا کہ کس  
طرح در پردہ گوتم نے شر کو بنیادی اور اولین حیثیت دی اور خیر کو ثانوی۔ اگرچہ خیر یہاں بھی شر کے خلاف پیر کے طور پر  
استعمال ہو رہا ہے لیکن زاویہ نظر کے فرق نے بنیادی نظریات کو کتنی مختلف صورت دے دی ہے۔ خیر یہاں بھی ہے۔ لیکن  
اس کے سامنے کوئی تعمیری مقصد نہیں۔ یہاں صرف وہ ہستی کو ختم کرنے کیلئے ہتھیار کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ جبکہ  
اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کے نزدیک خیر ہستی کی نشوونما اور ارتقاء کا تکمیل کا اصل الاصول ہے۔

۶۔ بدھ کی تعلیم کی بنیادی بات ایک یہ بھی ہے کہ ”اگر انسان کے اندر خود اعتمادی کا جوہر ہو تو بلند ترین مقام تک رسائی  
حاصل کر سکتا ہے۔“ یہ خیال جائے خود ایک عظیم خیال ہے لیکن گوتم کے نظام فکر میں صحیح بیٹھتا ہے یا نہیں؟ حیرت اس  
بات پر ہے کہ انسان کو اس قدر ممتاز درجہ دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ اپنی حقیقت شخصی سے باخبر ہو جائے تو خارج کی کوئی قوت اس  
کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ خدا بھی اسے اس کے ارادوں میں ناکام نہیں کر سکتا۔ لیکن نہ تو اس ”بلند ترین“ مقام کی  
نشاندہی کی گئی ہے اور نہ عرفان ذات کی اصل منزل سے آگاہ کیا گیا ہے اور خیال تو عجیب ہے کہ اگر انسان اپنی حقیقت شخصی  
سے باخبر ہو تو خدا بھی اسے اس کے ارادوں میں ناکام نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس مذہب فطرت یہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنی  
حقیقت شخصی سے باخبر ہو جاؤ تو تم خود ارادہ خداوندی کے حامل ہو جاؤ گے۔ وہی انفسکم افلا تبصرون۔ تم اپنی ذات  
کی گہرائیوں کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟ تاکہ عالم انفس اور عالم آفاق کے باہمی تعلق کے مطالعے سے تم پر خلافت  
اللہ فی الارض کا مفہوم واضح ہو سکے۔ فطری نظریہ حیات میں خدا اور انسانی ارادوں کے باہم متصادم ہونے کا سوال ہی پیدا  
نہیں ہو سکتا۔ یہاں عرفان نفس اپنی ذات میں ارادہ خداوندی کا شعور ہے۔

۷۔ قرآن کریم میں یہ التزام کم و بیش ہر جگہ برتا گیا ہے۔ کہ تاریخ و سیر کے حوالوں میں صرف انہی اشخاص یا مقامات کا ذکر

کیا جائے جن سے قرآن کے اولین مخاطب یعنی جزیرۃ العرب اور اس کے مملکت (وہ علاقہ جس کی جغرافیائی حدود خلیج فارس، بحر احمر، بحر روم اور کیپسین تک پھیلی ہوئی ہیں) کے لوگ مانوس اور آشنا تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اسی خیال کو اساس بنا کر سائرس کو ذوالقرنین ثابت کیا ہے۔ اب یہاں بنیادی سوال یہی ہے کہ کیا ظہور اسلام کے وقت اس خطہ کے لوگ گوتم بدھ کے نام سے آشنا ہو چکے تھے؟

۸۔ تعبیر و تفسیر میں ہمیشہ قرآن کی اکثریت پر انحصار کیا جاتا ہے۔ صرف ایک قرینے (کپل اور کفل) پر کس طرح انحصار کر کے ہم گوتم بدھ کو ذوالکفل یعنی قرینی پیغمبر ثابت کر سکتے ہیں۔ جبکہ دیگر قرآن (مثلاً گوتم بدھ کی بنیادی تعلیمات) اس کی تصدیق نہیں کرتے کہ گوتم بدھ کی تعلیمات کا سرچشمہ وحی الہی اور عرفان ربانی تھے۔ پھر قرآن نے صرف انہی مصلحتین کا ذکر کیا ہے جن کی تعلیمات توحید اور الوہیت کے کسی واحد انی تصور پر قائم تھیں۔

تشکیک، لا اور بیت اور معدومیت کے اس متضاد، متناقض اور منافی مذہب کو اگر آپ آسانی مذہب ٹھہرانا چاہیں تو اس سے آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ کیونکہ یہ ایک بلند رواداری کا اظہار ہے۔ لیکن ذرا سوچ لیجئے، قرآنی تعلیمات ہی آسانی اور غیر آسانی تعلیمات کا اصل معیار ہیں۔ ارباب نظر خود سوچ سکتے ہیں کہ گوتم بدھ کی تعلیمات اور قرآن کی تعلیمات کے درمیان کیا تعلق ہے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔ ☆

### سید البشرؐ سے شادی کے وقت خدیجہؓ کی عمر کیا تھی؟ (د۔ طارق)

چھٹی صدی مسلمانوں کی فتوحات اور تنظیم ریاست کا دور تھا۔ ہر طرف نئی تہذیب اور نئے ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب چمک رہے تھے۔ تحقیق و جستجو سے ناطہ تھا۔ نظریے اور دین کی تلاش وحی کے جھروکوں سے رتھی، مدینہ، منصورہ اور دمشق علوم اسلامی کے گوارے تھے۔ عباسیہ دارالحکومت میں کتاب و قلم کی حکمرانی تھی، زندہ علوم کے ترچے ہو رہے تھے، متنوع تصانیف کے انبار لگ رہے تھے، معزلہ آسمان، عقل و فراست پر چھائے ہوئے تھے کہ پیسہ گھوم گیا۔ دانش و تحقیق والے نیچے آگئے محدثین اور شعور سے بے بہرہ لوگ طوقِ جمالت لئے ہر سودوڑنے لگے، تقلید و جمالت کی یلغار نے روشنی کے مینار گرا دیے۔ وحی قرآن کو شانمائے نزول کے حصار میں "مجبوس" کر کے بے بس و درماندہ کر دیا گیا۔ مذہب کے نام پر بے سند اور بصری شعور سے عاری مواد کی پذیرائی ہونے لگی۔ عقل کا نام لینا گردن زنی بن گیا۔ تعلیم و تربیت سے "معقولیت" کا جوہر چھین کر "لامعقولیت" کا زہر بھر دیا گیا، تقلید اور حدیث نے لوگوں کے شعور کو بیڑیاں پہنا دیں۔ اسی طرح کم از کم بارہ سو سال تک یہی کیفیت رہی اور ہم "مسلسل" گمراہی کی دلدل میں گمراہ اترتے چلے گئے۔ اب صدیوں پر محیط متبادل دین نے قرآن کے چشمہ صافی کو گدلا کر دیا تھا۔ کہ پردہ غیب سے ایک مرد خود آگاہ و خود بین نمودار ہوا اور اس نے اپنی قوتِ نفسی سے باور کرایا کہ دنیا میں اگر باعزت طور پر جینا ہے تو فک کو صحیح کا دامن تھام لینا ہو گا جو کہ صرف اور صرف تعلیم و تربیت سے مربوط ہے۔ چنانچہ سید احمد خان نے گم کردہ راہ قوم کو اپنے پیچھے لگالیا۔ ان میں علوم



دشمنوں کی خیرات بانٹی اور ایک ایسے چور ہے پرلے آئے جہاں سے ہر سو پھیلی ہوئی روشنی ہی روشنی تھی۔ تاریخ نے شخصیات کے ساتھ جو بے انصافی، روار کھی اور انہیں کرشماتی رنگ و روپ میں پیش کیا سید نے بتلایا کہ ان میں سے کوئی بھی مواد اگر شعور و فراست کو اپیل نہیں کرتا تو اسے بے دریغ جھٹک دو۔ چنانچہ اہل فکر نے سید کا یہ مشورہ مان لیا اور تحقیق و جستجو میں عصری فراست کو شامل کر لیا۔ اب ہوا یہ کہ ہزاروں وہ درخت جو عقیدے اور تقلید کے بیج سے پروان چڑھے تھے عقلیت کے ایک ہی جھونکے سے اکھڑتے چلے گئے۔ راقم الحروف کو بھی سید کا یہ مشورہ پسند آیا اور میں نے اپنی سوچ و فکر کے زاویے درست کرنا شروع کر دیئے۔ میرے سامنے سورۃ النبیؐ کی آیت و وجدك عائلا فاغنی۔ ہے جسے رسول اکرم ﷺ کے مفروضہ افلاس، تنگدستی اور معاشی بد حالی سے مربوط کر کے بتلایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ سے نکاح کا سامان کر کے آپؐ کی خوشحالی کا ذریعہ بنایا چنانچہ وہ عائلا کے معنی مفلس اور قلاش کرتے اور اسکی ذیل میں غریبی کے فضائل کی احادیث کا ذکر کر کے اپنا مفہوم پختہ بنا لیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک آنجنابؐ کی غریبی اور مفلسی کا تعلق ہے تو راقم الحروف الم یجدك یتیمًا فاوی کی تشریح میں اسکی نفی کر چکا ہے۔ اس مقالے میں اس سوال کا جواب ہو گا کہ اس شادی کے محرکات کیا تھے؟ نبی اکرم ﷺ کی عائلی زندگی پر اس نے کیا اثرات چھوڑے؟ کیا حضرت خدیجہ اتنی مالدار تھیں۔ یا اتنی عمر رسیدگی کے باوصف عائلی زندگی کا بوجھ سہار سکتی تھیں۔ یہ سب بنیادی سوال ہیں لیکن یہاں صرف شادی کی عمر سے بحث ہو گی اور اسی میں ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ واللہ التوفیق۔

ہماری تاریخ نے شخصیات بطور خاص نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جو بے انصافی روار کھی اور اسے نہ صرف اچھنیوں اور کرشموں کا مرقع بنا کر پیش کیا ہے بہت سی باتوں میں اہانت کا پہلو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ یا تو آپؐ کی شادی نہایت کمسن عیسیٰ عاشرہ سے کر دی جاتی ہے جو بالکل الزور شادی کے تقاضوں سے بے خبر اور نا آشنا ہے یا کسی ایسی عمر رسیدہ خاتون سے جو بن یاسن میں قدم رکھ چکی اور مزید سات بچوں کی ماں بننے کی صلاحیت سے عاری بھی ہے۔ مانا کہ شادی ہر انسان کی جیسی رغبت بھی ہے اور ضرورت بھی لیکن اس کیلئے عمر کے تناسب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حضور ﷺ نے اگر مادی توانائی کے حصول کو ملحوظ رکھ کر یہ شادی کی تھی تو بھی تاریخ اس مفروضہ سے بھڑائی نہیں کرتی کیونکہ آپؐ خود بھی تجارت کرتے اور اپنی کمائی سے کمزوروں کی مالی معاونت فرماتے تھے۔ (ملاحظہ ہو ایک سہ ماہی مضمون بعنوان رسول اللہ کھاتے کہاں سے تھے؟)

اس طرح واقعات کے تناظر میں یہ بھی ایک مفروضہ بن جاتا ہے کہ شادی کے وقت خدیجہ کی عمر چالیس برس تھی؟ یہ تسلیم کہ خاص فکر کے مؤرخین اسی ہی کو ترجیح دیں گے کہ انہوں نے ہی اس خیال اور عقیدے کو جنم دے کر پختہ کیا ہے کہ بن یاسن کے آخری دنوں میں صرف ایک ہی بچی کو جنم دینے کا احساس ابھارا جائے اور کہا جائے کہ صرف سیدہ فاطمہؓ ہی آپ کے بطن سے پیدا ہوئیں کہ ماہواری کا سلسلہ رک گیا۔ باقی تین بچیاں رقیہ، ام کلثوم، اور سیدہ زینبؓ سہ ماہی شوہروں کی بچیاں تھیں۔ لیکن یہاں بات ان خاص فکر کے حامل مؤرخین کی نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو خدیجہ کی عمر سید



المرسلین ﷺ سے نکاح کے وقت چالیس برس شمار کر کے اپنے کو رُسنی کہتے ہیں وہ کس حد تک راہِ راست پر ہیں؟ آئیے ذرا اس کا تجزیہ کریں۔ خیر الدین زرکلی کہتے ہیں۔ کان بین کل ولدین منہ۔ سیدہ خدیجہ کے ہر دفعہ بچوں کے مابین ایک سال کا وقفہ ہوتا تھا۔ (الاعلام طبع دوم مصر جلد 2/346) اس طرح سیدہ خدیجہ کی عمر بوقتِ شادی چالیس برس۔ تسلیم کر لی جائے تو سات بچوں کے مابین تقریباً 14 سال کا مجموعی وقفہ ہو گا یعنی آپ کی عمر جب 57-58 سال ہوئی تب تک بچے جنم رہے ہیں جب کہ بن یاس شروع ہونے کے بعد اتنی اولاد پیدا ہونا ممکنات میں سے نہیں ہے لہذا اقرین قیاس یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اگر جوان تھے تو سیدہ خدیجہ بھی 27 یا 28 سال کی تھیں۔ علامہ شباب الدین نویری (1333 م) اپنی شہرہ آفاق تحریر ”نہایۃ الادب“ میں لکھتے ہیں،

و خدیجة بومئذ بنت ثمان و عشرين سنة و قلیل بنت اربعین سنة

خدیجہ کی جب نبی اکرم ﷺ سے شادی ہوئی تو انکی عمر 28 برس رہتی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

چالیس برس کی تھی۔ (نہایۃ الادب طبع قاہرہ باب 15، 98)

یہ چالیس برس کنے والے کون تھے؟ اسکی نشاندہی نہیں کی گئی۔ تاہم یہاں دورائیں سامنے آئی ہیں اسی طرح قدیم مورخ ابو جعفر محمد بن حبیب (860 م) نے بھی دورائیں نقل کی ہیں۔ (المصحح طبع دائرۃ المعارف العشائریہ دکن 79) علامہ زر قانی 1710 نے یوں تو دورائیں نقل کی ہیں تاہم قسطلانی 1517 م (المواہب دالے) اور مغطائی (1361 م) کے حوالہ سے پورے وثوق سے بیان کیا ہے کہ یہ حضرات 28 برس ہی کو، صحیح تسلیم کرتے تھے۔

(الزر قانی طبع مصر 1/200)

اور یہ اختلافی آراء آج نمودار نہیں ہوئیں قدیم ہی سے پائی جاتی رہیں اور ہمارے مفاد میں جاتی ہیں کیونکہ اس طرح ہمارا ترجیح کا حق باقی رہ جاتا ہے اور ترجیح ہمیشہ قرائن کی اساس پر دی جاتی ہے۔ یا پھر عقلیت کی توانا توجیہات کو ملحوظ رکھ کر۔ جہاں تک قرائن کا تعلق ہے تو سب سے بڑا قرینہ یہ ہے کہ شادی کے بعد خدیجہ کے سات بچوں کی ولادت متلائی جارہی ہے جو آپ کے شباب کی چٹلی کھاتی ہے اگر بن یاس کو پہنچی ہو تو زیادہ سے زیادہ ایک بچہ کی ولادت ممکن ہو سکتی تھی جیسا کہ امامیہ کا عقیدہ ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ ڈاکٹری تجزیوں کے مطابق گرم علاقوں کی عورتوں کا استقرار حمل 35 تا 42 تک تسلیم کیا گیا ہے۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ میرت النبیؐ اور میرت صحابہؓ کے قدیم مورخ ابن سعد (845 م) نے پورے وثوق سے لکھا ہے کہ،

كانت خدیجة يوم تزوجها رسول الله ﷺ ابنة ثمان و عشرين سنة

خدیجہ سے جب نبی اکرم ﷺ کا بیاہ ہوا تو اس وقت اٹھائیس برس کی جوان تھیں۔

(طبقات ابن سعد 8/10-باب النساء)

ان تاریخی حوالہ جات کے تناظر میں ہمارے لئے یہ جاننا مشکل ہے کہ ہم سیدہ خدیجہ کی شادی کے لئے چالیس

سال کی عمر۔ تسلیم کر لیں اور پھر خلاف وضع فطری استقرار۔ حمل کی مدت میں سے پندرہ سال کا مزید اضافہ بھی سوچیں۔ آخر میں یہ بات نیز تصفیہ طلب رہ جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو مفلن اور قلاش کیوں کہا گیا؟ تو اس کا بظاہر جذبہ محرکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح سیدہ خدیجہؓ کی مفروضہ تو مگر می کو لالچ کا سبب بنایا جائے اور پھر یہ دکھلایا جائے کہ اسی خدیجہؓ ہی نے آنحضرت ﷺ کے افلاس کے زخموں پر ”پھایا“ رکھا۔ لیکن بات اگر اس طرح ہوتی تو اللہ سبحانہ پر اے مال سے غنی بنانے پر اپنے احسان اور اقتان کا اظہار نہ فرماتے، وہ قادرِ مطلق تھے اپنے خزانوں سے بھی مالِ مال فرما سکتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کی تاجرانہ کد و کاوش پر مالدار ہونے کو اپنی منت اور احسان کا نام دے سکتے تھے۔ جی ہاں وہ قادر تھے کہ سیدہ خدیجہؓ کی عمر رسیدگی کو بھرپور شباب میں بدل سکتے تھے۔ لیکن اللہ کی ”قادریت“ کو خلاف فطرت امور میں تلاش کرنا جائے خود کار جمالت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ،

- 1۔ نبی اکرم ﷺ خود بھی تاجر تھے عالم شباب سے لے کر زمانہ پیری تک بہت سوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے اسی طرح
- 2۔ سیدہ خدیجہؓ بھی سن یاس کو پہنچی ہوئی نہیں تھیں، چہرے پر جوانی کا خون گردش کر رہا تھا۔ جاذبیت اور شباب نے ان کی رعایاؤں کو دو بالا کر رکھا تھا بلکہ کسی حد تک مالی خوشحالی نے چہرے کی وجاہت اور رنگ و رونق میں بھی نکھار پیدا کر رکھا تھا۔ شادی کے طالب دوسرے بھی تھے لیکن آپ نے رشتہ پیغمبر ﷺ کو ترجیح دی اور وہ ہو ہی گیا۔ ایسے میں شادی کی تحریک خواہ کسی بھی طرف سے ہوئی فطرتِ شباب کے عین مطابق تھی۔



### سید البشرؐ سے شادی کی وقت عائشہؓ کی عمر کیا تھی؟ (ر۔ طارق)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب 1957ء میں حافظہ بھی قومی تھا اور جسم بھی ٹھوس تھا۔ مکہ المکرمہ میں بیٹھ کر میں منسوخ القرآن لکھ رہا تھا۔ ان دنوں رہ رہ کر میری سطح ذہن پر یہ سوال ابھرتا تھا کہ سیدہ عائشہؓ کی عمر وقتِ شادی اگر 5 سال تھی اور وقتِ ”خصتی“ 9 سال۔ تو یہ قرآن السعدین طبائع بصری کے خلاف اور اصولِ مقارنت کے منافی ہے اس عمر کا بچہ نہ ”یکس“ سے آگاہ ہوتا ہے اور نہ ہی ”یکسی“ خواہشات کا ”تجمل“ جبکہ۔ ما طاب لکم (نساء، 3) میں۔ من النساء واضح اشارہ ہے کہ مرد کے لئے وہی رفیقہ ”طاب“ (پسندیدہ) ہو سکتی ہے جو اسکی جستی رغبات کی تسکین فراہم کر سکتی ہو۔ کیونکہ انسان فطر تاجب مرہقت اور بلوغت کی حدود میں قدم رکھتا ہے اس میں کشش اور جنسی رغبت کی لہریں ابھرتی اور وہ ”مقارنت“ کی نفسیات کا اور اک کر سکتا ہے۔ یہ جذب و کشش کی تحریک اس وقت ہی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے جب طالب و مطلوب اپنے عمل کے ثمر سے آگاہ ہوں یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنے بلیغ اشاراتی انداز میں ”نابالغی“ کے نکاح کو ثمر آور نہیں ٹھہرایا۔ طالب کو پتہ ہے کہ ایجاب کیا ہے اور قبول کسے کہتے ہیں مگر مطلوب اپنی کم سنی کی وجہ سے نہ ایجاب سے آگاہ ہوتا ہے نہ قبول سے (نساء، 5) لیکن یہاں افتاد یہ تھی کہ ان اصولِ بصریت کے برعکس روایات کا ایک وسیع میدان

تھا جو چھ اور نو کی بے ہنگم روایات پر محیط تھا۔ یہاں انکار کی مجال تو کیا لب ہلانے کی گنجائش بھی، نہیں انہوں نے 6 اور 9 کی روایات کو اتنا تنقید پر وف ہمار کھا تھا کہ ان پر مخالفت کا ”وار“ اثر انداز ہی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک وحی قرآن کے ماسوا کوئی بھی چیز تنقید پر وف نہیں ہو سکتی۔ میرے ہونٹ کسی نے ”سی“ نہیں رکھے میں ہر ملا ہر ایسے مواد کی تکذیب کر سکتا ہوں جو قرآن کی عمومی پالیسی۔ وحی کی نفسیات اور عقلی کی حاکمیت کے خلاف ہو۔ قرآن ہر انسان کو تعلقین کرتا ہے کہ جہاں اطمینان کا بحر ان ہو وہاں تصدیق میں جلد بازی نہ ہونی چاہئے۔ (نقرہ، 260، نساء، 102۔ عمران، 126) کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں ان کے کسی بھی مآخذ سے مطمئن نہیں اور اپنے اطمینان کی خاطر علم کے جنگل اور میابان عبور کرنا شروع کر دیئے اور بالآخر خدائے لایزال نے میری مدد فرمائی اور میں زوال فکر کے رعب سے بچ گیا۔ میرے نزدیک نساء، (5) میں درج عبرت پنہاں ہے کہ جب تک معاملہ کی سدھ بدھ نہ ہو، فریق نہ بنانا چاہئے۔

یہ بات کہ سیدہ عائشہ کی عمر وقت شادی 5۔ اور وقت 9 سال تھی مآخذ کی تمام کتابوں میں درج ہے اور یہ ایک دو کتابیں نہیں جنہیں شمار کر کے بات کو مختصر کیا جائے تاہم بات کی درستی سے چتے ہوئے ایک آدھ بیادی راوی کی بات اشاروں میں بات ہو سکتی ہے مثلاً روایات کی تمام اسانید میں بیادی راوی ہشام بن عروہ یا۔ ابن شہاب زہری کو نمایاں دکھلایا گیا ہے۔ اب جہاں تک ہشام کا تعلق ہے وہ بلاشبہ گھر کا آدمی ہے وہ اگر استبازوں کا وطیرہ اختیار کر لیتا تو بہت بہتر تھا لیکن اعتماد یہ ہے کہ وہ کچھ معیاری آدمی نہیں ہے خاص کر یہ جب اپنے والد عروہ کے توسط سے روایت کریں تو جھوٹ کا پلندہ ہو جاتی ہے کیونکہ رجال کے بڑے نقاد آجری، عقیلی، ابو الاسود، امام مالک، یعقوب بن ابی شیبہ اور ابن خراش وغیرہ ہشام کی تمام ان روایات کو مسترد کرتے تھے جو ہشام نے اپنے باپ عروہ کے حوالہ سے بنائیں اور تعجب ہے کہ ہشام کی ایسی ہی روایات کو بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ اپنے مجموعوں میں داخل کر کے ہم سے طالب ہیں کہ ہم ان کے فرمائے ہوئے کو مستند مانیں۔ سیدہ عائشہ کی زبانی جو روایات درج کر لی گئی ہیں ان کی تحقیق اگر تسلیم ہی کی متقاضی تھیں اور وہ اس سلسلہ اسناد کی خرابیاں معلوم بھی کر چکے تھے تو جامعین احادیث کی طرح نقد رجال والوں کی پذیرائی بھی ہونی چاہئے تھی۔

یہاں جو کچھ ہشام سے مروی ہے اسکی حیثیت روایت کی ہے یعنی چھ

**ان روایات کا مآخذ مشکوک ہے**

ایسی جو اپورٹڈ نوعیت کی ہیں یعنی انہیں عراق سے لایا گیا ہے گھر والے یعنی مکہ و مدینہ والے انہیں جانتے تک نہیں تھے اور تعجب کی بات ہے کہ واقعہ تو منسوب مکہ و مدینہ سے ہو اور ڈھالا جائے روایات سازی کی بڑی ٹیکالوں بھرے اور کوفے میں اور پھر ایک حجازی ہی کے توسط سے مکہ و مدینہ میں ہشتر کجائیں؟ یا للجب جبکہ امام مالک اور امام شافعی کا فرمان ہے۔ اذا لم يوجد للحديث من الحجاز اصل ذهب نخاعه

جس حدیث کی اصل اور جیاد حجاز میں نہ ہو اسکا مغز جاتا رہا۔ (تدریب الراوی طبع عصر صفحہ 23)

یعنی وہ ناقابل اعتبار اور حقیقت سے عاری ہیں لہذا ایسی تمام روایات جو عائشہ کی عقلی اور شادی سے خود ان کی اپنی زبانی بحث کرتی ہیں عراق میں جنم پذیر ہوئیں اور ہشام ہی انہیں حجاز میں لانے کا ذریعہ بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ رجال کے قد کورنا قدین ابن ہشام کی عراقی ایسی روایات کو نہیں مانتے جن کی اہل مدینہ یا حرمین شریفین والوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہو لہذا ان پر اسلئے اعتماد کرنا کہ صحاح ستہ کی بعض شرائط کے مطابق وضع ہوئی ہیں دین کی جڑوں پر کلھاڑا چلانے کے مترادف ہے۔

ایک بات جو قابل اعتنا ہے وہ یہ ہے کہ چھ اور نو کی بات جس ہشام کے ذریعے مشترک ہے وہی ہشام۔ عبد الرحمن ابی الزنا (735م) کا سہارا لیتے

## دائے اور روایت کا اختلاف

ہوئے کہتے ہیں کہ کانت اسماء اکبر من عائشہ بعشر

حضرت عائشہ حضرت اسماء کی ولادت سے دس سال بعد پیدا ہوئی تھیں۔

(سیر اعلام النبلاء شمس الدین ذہبی طبع دار المعارف مصر 1957 جلد 6/209/2 956)

اس حساب سے عمر عائشہ بوقت شادی انیس سال بنتی ہے اور اصول حدیث اور فقہ کی کتابوں میں طے شدہ بات ہے کہ جو راوی اپنی روایات یا روایت کے خلاف رائے کا اظہار کرے اسکی وہ روایت مشکوک ہو جاتی ہیں کہ خود روایت کنندہ بھی ہم آہنگ نہیں ہے اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ رائے کا ”منع“ عقل و فکر، سوچ اور تدبر ہوتا ہے جبکہ روایات کا مآخذ تقلید، سنی سنائی اور بے ثبوت باتیں ہوتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں رائے اور روایت کے اختلاف کے پیش نظر ترجیح رائے ہی کو دی جائے گی جس سے چھ اور نو کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔

علامہ ابن کثیر دمشقی (1373م) اپنی شرہ افاق

اسماء اور عائشہ کی ولادت کے تناظر میں کتاب ”البدایہ والنہایہ“ میں نیز اسی حقیقت کا

اعادہ کرتے ہیں کہ عائشہ اپنی بہن اسماء سے دس برس چھوٹی تھیں۔۔۔۔۔ (البدایہ والنہایہ طبع مصر 346/8)

اسی طرح سیرت صحابہ کے بڑے مصنف حافظ ابن حجر (1449م) توثیق فرماتے ہیں کہ ان اسماء اکبر من

عائشہ

اسماء ہجرت سے 27 سال پہلے اور عائشہ ان سے دس برس بعد پیدا ہوئی تھیں۔ (الاصابہ طبع مصر 225/4)

اور ”بعثت“ سے ”ہجرت“ کا زمانہ 13 سال کا ہے یعنی اسماء 613 میں اور عائشہ 603 میں تولد ہوئیں۔ اس طرح

اسماء ”بعثت“ کے وقت 16-17 سال اور ہجرت کے وقت 29-30 سال کی بنتی ہیں اس میں سے دس سال وضع کرو تو

حضرت عائشہ کی بوقت ہجرت عمر 19-20 سال بنتی ہے۔

یہاں ایک اور زاویہ سے بھی عمر عائشہ بوقت شادی کا تعین

عائشہ کی عمر ولادت کے تناظر میں ہو سکتا ہے کہ بافاق ابن سیر دہلی تاریخ 67 برس تھی

ادھر قدیم اصحاب سیر و انساب عرب میں خلیفہ بن خیاط عصفری (854م) کا ایک خاص مقام ہے وہ اور امام احمد بن حنبل (856م) کہتے تھے کہ صدیقہ کا سن وفات پچاس ہجری تھا بلکہ ہشام بن عروہ (763م) اسماء کے پوتے ہونے کے ناطے سے عائشہ کے بھی پوتے ہوتے اور گھر کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک توفیت عائشہ سنہ خمسین - عائشہ کا وصال سن پچاس ہجری میں ہوا تھا۔

(حوالہ سیر اعلام النبلاء ہی (1348م) جلد 2/135/11/2)

اس طرح ابن عروہ کی یہ دوسری رائے بھی ان کی روایات کی نفی کرتی چھ اور نوکی بات کو بے وزن بناتی اور واضح کرتی ہے کہ صدیقہ کی شادی 19 سال کی عمر میں ہوئی تھی یعنی دو تین سال بعثت سے پہلے اور دو سال ہجرت کے بعد۔

حضرت اسماء بائناق محمد ثین والہا سیر سوسال کی عمر میں 73 ہجری 1  
**اسماء کی وفات کے تناظر میں** 692م میں اپنے فرزند عبداللہ بن زبیر کے قتل ہونے کے چند روز بعد فوت ہو گئی تھیں۔ حافظ ابن عبد البر (1071م) نے اسماء کی عمر 99 یا 100 سال لکھی ہے۔۔۔۔۔

(الاستیعاب فی معرفة الاصحاب طبع مصر جلد 2/705)

یعنی چند ماہ کے فرق کے ساتھ وہ بھی سوسال ہی کی تصدیق کرتے ہیں اس لحاظ سے ان کی ولادت ہجرت نبوی ﷺ سے ستائیس برس پہلے (598م) اور عائشہ کی دس سال بعد (608م) میں ہوئی اس سے بھی عمر عائشہ پر روشنی پڑتی ہے۔

امام ابن حزم اندلسی (1064م) جن کی تحقیقات کا لوہا دنیا مانتی ہے انہوں نے ام رومان (والدہ صدیقہ) کی وفات سے "عمر" عائشہ پر کچھ اشارے دیئے ہیں جو کہ شادی کی عمر کو 19 برس واضح کرتے ہیں۔ ام رومان کی وفات چھ ہجری مطابق 628م ہوئی اور عائشہ کی شادی 4 سال پہلے یعنی 625/624م ہوئی۔ (جمہرة انساب العرب طبع دار المعارف مصر صفحہ 375، صفحہ 376)

**ابوبکر اور ام رومان کے اسلام کے تناظر میں** امام ابن جریری طبری (923م) جو کچھ بھی تھے ولادت عائشہ کے بارے میں پتے کی بات کر گئے ہیں،

تزوج ابوبکر فی الجاہلیہ فیہ ..... فولدت عبداللہ واسما وتزوج ایضا فی الجاہلیہ ام رومان بنت عامر فولدت عبدالرحمان و عائشة وکل هؤلاء اربعة من اولاد ولدوا من زوجتہ اللتین سمیناھا فی الجاہلیہ

صدیق اکبرؓ نے زمانہ جاہلیت میں دو شادیاں کی تھیں جن سے چار بچے پیدا ہوئے فیہ - Face)

1a) سے عبداللہ اور اسماء اور ام رومان سے عبدالرحمان و عائشہ اور یہ چاروں بچے زمانہ قبل از اسلام ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ (تاریخ الامم والملوک طبع مصر حالات صدیق اکبر مطبوعہ المحمدیہ جلد



16/9/60/4 نیز۔ مطبوعۃ الاستقامہ مصر جلد 2/11/616 (16)

طبری جو کہ رطب دیاس روایات پیش کرنے کا عادی ہے یہاں خرافات سے دامن چاتے ہوئے اپنی تحقیق کا جواہر پارہ پیش کیا ہے یعنی کہ تاریخ کے ماتھے پر سچ کا جھومر سجایا ہے یا یوں کہئے کہ اسکا مآخذ روایت نہیں اپنی۔ تحقیق اور استقراء کو بنایا ہے جس سے ہمارے لئے تاریخ کی اس بلند پایہ گواہی کی روشنی میں زمانہ اسلام اور جاہلیت کے مابین حد قاصد کا سراغ لگانے میں حقیقی مدد مل سکتی ہے اور ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ تمام محدثین اور اہل انساب اس بات پر متفق ہیں کہ زمانہ اسلام کا آغاز سن ہجری قبل از ہجرت مطابق 610 م میں ہوا تھا۔ لیکن اب یہ بھی ضروری نہیں کہ ولادت زمانہ جاہلیت کے عین اختتام پر ہی تسلیم کر لی جائے جبکہ زمانہ اسلام کے آغاز کے وقت صدیقہ۔ سمجھدار لڑکیوں کی طرح ماں باپ کے مسلمان ہونے کی خبر دے کر ضمناً اپنی عمر کا پتہ بھی دے رہی ہیں کہ وہ ان دنوں چار پانچ سال سے کسی طرح بھی چھوٹی نہیں تھیں اس طرح ”عین اختتام“ کی بات بھی حذف کر دینے کے قابل ہو جاتی ہے ابن سعد اپنی طبقات میں لکھتے ہیں کہ

عن عائشہ قالت ما عقلت ابوی الا وهما یدینان الدین وما مر علینا یوم قط الا ورسول اللہ یتینا فیہ بکرۃ وعشیا

”میں عقل و ہوش والی تھی تو والدین کو اسلام کا پیروکار پایا اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ رسول اکرم و اعظم ﷺ ان دنوں بلا ناغہ ہمارے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔“

(ابن سعد طبع بیروت جلد 2/173 نیز بخاری باب الهجرة)

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ بعثت نبوی ﷺ یعنی زمانہ اسلام کے وقت ملی صاحبہ کو اسلام اور کفر کا اور اک تھا اور اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ اسلام کیا ہے اور کفر کسے کہتے ہیں؟

ملی عائشہ کا یہ بیان طبری کی تصریحات کے عین مطابق ہے لہذا اس بنا پر آپ کی ولادت چار سال قبل از اسلام مطابق 606/607 م قرار پاتی ہے اور شاوی ہجرت نبوی ﷺ کے دو سال بعد مطابق 625 م میں ہو جاتی ہے جبکہ آپ کی عمر 19-20 کے لگ بھگ ٹھہرتی ہے۔ تو کیا اس بدیہی تناظر میں آپ کی عمر کو بوقت شادی 6 یا 9 سال کی عمر میں بدلا جاسکتا ہے؟

یہ بات ذہن میں رہے کہ اسماء اور عائشہ اسماء اور عائشہ کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی دونوں بیویوں کا نکاح تقریباً ایک ساتھ

ہی ہوا تھا حضرت اسماء کا حضرت زبیر سے اور حضرت عائشہ کا حضرت جبیر سے۔ بات یوں ہوئی کہ سیدہ عائشہ کی پہلے مکہ کے قریشی سردار مطعم کے بیٹے جبیر (679 م) سے نسبت ہوئی تھی کہ ان ہی دنوں اسلام کا اعلان ہوا۔ ادھر ملی کی شادی میں دیر ہو رہی تھی تاہم کئی بار پیغام بھیجنے کا نتیجہ نہ نکلنے پر سیدنا ابو جبر نے مطعم کے گھر جا کر بات کی۔ مطعم خود تو کچھ نہ بولے، مگر ان کی بیوی نے کہا کہ، ۔۔۔۔۔۔ اگر یہ لڑکی ہمارے گھر آجائے گی تو ہمارا لڑکا جبیر بھی بے دین یعنی مسلمان ہو جائے



فرصت کے لمحات اور مشاغل ختم کر دیئے تھے اب کہ 18-19 سال کے بعد ملی ملی صاحبہ کی جوانی کا عالم تھا ضروری تھا کہ آپ کی تصویر کے ذریعہ ان کی جوانی کی ہیئت و شباهت ملاحظہ کرائی جائے، اب اگر بغیر گردن کے تصویر دکھلائی جاتی تو خوب و ناخوب کا پتہ کیسے چل سکتا جبکہ فیصلہ کا مدار گردن یعنی چہرے والی تصویر پر ہی تھا۔ کاش جبرئیل اگر الحمد للہ ہوتے تو اتباع سنت کا پاس کرتے ہوئے ایسا ہی کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ ملی ملی صاحبہ کی کم سنی کا شوشہ تنہا ہشام ہی نے نہیں چھوڑا۔ رئیس المحدثین امام محمد بن شہاب زہری (742 م)

### زہری کے ذریعہ کم سنی کا اثبات

بھی اس نیک کام میں ان کے ہمواور تخلیق کار ہیں۔ لیکن زہری کون سے کوئی بامعاریہ تھے؟ وہ بھی کرپٹ روایت دان تھے ارسال کے خوگر تھے یعنی تاہی ہو کر صحابی کے روپ میں روایت کرتے تھے جبکہ رسول اللہ کو دیکھنا نہ بھالا جس پر محمد رشید کو کہنا پڑا کہ مواصل الزہری کا لویاح زہری کی مرسل روایتیں بے سرو پا ہیں دوسری اس کو لویاح کی عادت تھی یعنی رسول معصوم کی بات میں اپنی بات کا پوند لگا کر بات کرتے تھے جس پر ہمعصر محمد رشید کو اختیار کرنا پڑا کہ وہ اس خسیس حرکت سے باز آجائے کہ لوگ اس کی بات کو رسول اللہ کی بات سمجھ کر دھوکہ میں پڑ جائیں گے پھر یہ مدلس بھی تھا جسکی روایت آسانی سے قبول نہیں ہو سکتی۔ تفصیل ملاحظہ ہوں محقق العصر علامہ بشیر ہسوانی کی ”حصانۃ اللسان“ طبع مصر اور امام عبدالرحمان الاحوذی کی ”تحقیق الکلام“ اور ”ابکار المنن“۔ ایسے میں زہری یا ہشام دونوں ہی قابلِ مذمت اور اپنے کردار کے لحاظ سے ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ☆

### قرآن پر تصوف اور روایات کی ہمہ جہتی یلغار (ر. طارق)

قرآن محکم میں دو قسم کے احکام دیئے گئے ہیں مستقل اور عارضی۔ مستقل احکام کو اصولوں اور مبادیات سے مربوط کیا گیا ہے جن میں ترمیم و تبدیلی۔ یا۔ تحکیم و تحذیف نہیں ہو سکتی اور عارضی احکام معروضی یا استثنائی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ حالات۔ عمل کے متقاضی نہونے تک پس پشت رہیں گے۔ جو نئی حالات متقاضی ہوئے سامنے آئیں گے۔ ایسے احکام۔ یا نئے پیش آمدہ حالات کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کیلئے ”اجتہاد“ جسکے سوتے غور و فکر اور عقل و تدبر سے پھوٹتے ہیں، نہایت ضروری ہے۔۔۔۔۔ اور اجتہاد کے لیے ناگزیر ہے کہ سیکولر بنیادوں پر ہو۔ گروہی اساس پر نہ ہو۔ یعنی سب کی مشترکہ میراث ہو۔ سب کے فائدے کی یکساں پکار ہو اور حسب ضرورت تبدیلی کا ”متمثل“ ہو۔ یعنی اجتہاد کو آنے والوں کیلئے مستقل شرعی حیثیت حاصل نہو۔ دس، پندرہ سال کے بعد اگر حالات ”گروٹ“ بدل لیں تو آئندہ کے فیصلے ان ہی حالات کی ضو میں طے ہو گئے۔ اور ساتھ اجتہاد کی بساط پلیٹ لی جائے گی ہاں بطور نظیر و شواہد اسے مد نظر رکھا جاسکتا ہے بلکہ حالات اگر پھر سے پہلی وضع پر لوٹ آئیں تو ”مترکہ“ اجتہاد سے مدد لی جاسکتی ہے نیز نیا خواہ پرانا اجتہاد ”ویڈیو“ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اسکی حیثیت دین والی نہیں ہوتی کہ دین کی ”تکمیل“ ہو چکی کہ دین ان ”اساسیات“ کا نام ہے جو مستقل

قدروں کی حیثیت سے انسانوں کو مل چکیں انکی مزید تکمیل کی کوشش کرنے سے ایسے فتنوں کا باب کھل جائے گا جسے کوئی بھی بند نہ کر سکے گا جو لوگ انسانوں کو پھر سے مصیبت رسالت پر فائز کرنا چاہتے ہیں یا۔ نبوت کے متبادل اصطلاحات مثلاً مبشر، محدث، مجدد، رویا، کشف وغیرہ اختراع کر کے جہاں ذہنوں میں انتشار اور نفرت کا بیج بونا چاہتے ہیں وہاں ”عقل“ کے ارتقائی ”عمل“ کو جہالت کے ہتھکنڈوں سے روکنے بلکہ مصیبت رسالت اور دین کے حساس تقاضوں کو مجروح یا بالکل ہی منہدم کرنے کے مجرم بھی بن جاتے ہیں۔

**قرآن کے خلاف مترادفات کی صف بندی** ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے باطنی اصطلاحات کی بھول بھلیاں تعمیر کر کے مسلم اذہان میں بھونچال پیدا کر دیا اور ”مترادفات“ کے بے پایاں چکر چلا کر ہر گوشہ فکر کو مشتبہ اور مشکوک بھی بنا ڈالا ہے۔ ترادف کے معنی سوار کے پیچھے جو دوسرا شخص سوار ہو وہ ردیف (To ride behind) ہے الفاظ کے ترادف کو (Synonymous) کہتے ہیں اور پھر حیثیت بھی دونوں کی ایک سی بتلاتے ہیں اس طرح لوگوں نے شریعت کے ساتھ طریقت کو۔ اسلام کے ساتھ تصوف اور توحید خالص کے ساتھ۔ وجودی اور شہودی کو ردیف بنا کر انبیاء و رسل کے رُشن و مقصد کو بالکل ہی غارت کر دیا ہے بلکہ ولایت کو رسالت و نبوت کا ردیف بنا کر ذہنوں میں بٹھا دیا گیا ہے کہ اگر ”متبادلات“ کا سلسلہ نہ ہو تو تہادین میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ لوگوں کے دکھوں کا مداوا کرے ان کے احکام و مسائل کو ایک نہج پر ڈال کر ذہنی بھونچال سے محفوظ کر سکے۔

**کتاب و سنت** ترادف کے اسی ہی زلویہ سے انہوں نے کتاب کے ساتھ سنت کو بھی ردیف بنا کر قرآن محکم کی لاریٹ اور یہ قطعی حیثیت کو کھل طور پر مجروح کر دیا ہے کیونکہ کتاب کے بارے میں وضاحت ہے کہ اتبعوا ما النزل الیکم من ربکم۔ دین مکمل ہو چکا ہے اب پیروی صرف خدا کی جانب سے نازل شدہ کتاب کی کرنی ہے جبکہ روایت نہ تو منزل من اللہ ہے اور نہ ہی متبادل اور ردیف کا جھومرا سکے بھدے ماتھے پر سجایا جاسکتا ہے۔ بات صاف ہو گئی کہ سنت کتاب کی ردیف نہیں بن سکتی کہ جو منزل من اللہ نہ ہو وہ ہم حیثیت بھی نہیں ہو سکتی۔

**ضلالت کا ازالہ سنت سے؟** کہا جاتا ہے کہ سنت کو کتاب اللہ کا ردیف خود سید البشر ﷺ نے ہی رٹھیرایا ہے فرمایا۔ آپؐ نے تو کت لیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ و سنتی۔ میں تم میں دو باتیں چھوڑے جا رہا ہوں تم جب تک انہیں تھامے رہو گے گمراہی تمہارے گرد نہیں بیٹھے گی۔ وہ کہتے کہ ”لن تضلوا“ کے فقرے میں وضاحت ہے کہ سنت بھی گمراہی کا ازالہ کر سکتی ہے اور ارسیمیں صلاحیت ہے کہ کتاب اللہ کی ردیف بن پائے وغیرہ۔ جی نہیں۔ یہاں ضلالت اگر ہدایت کے مقابل مطلوب ہے تو قرآن کتاب ہے کہ انک لا تہدی من احببت ولكن الله یهدی من یشاء

تم چاہنے کے باوجود اگر کسی کو ضلالت کے مقابل گمراہی سے نکال لو۔ تو نہیں نکال سکتے۔ یہ کام



(قصص، 56)

اللہ کا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ سنت کی نسبت رسول اور کتاب کی نسبت اللہ کی طرف ہے اور جب فرمایا کہ تو کسی بھی انسان کی گمراہی کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ تو مفہوم یہ ہو گا کہ سنت میں گمراہی کے ازالہ کی صلاحیت نہیں ہے خاص کر غیر منزل من اللہ کوئی بھی چیز منزل من اللہ کا کردار ادا نہیں کر سکتی لہذا ردیف یا متبادل بھی نہیں بن سکتی۔ بلکہ وحی قرآن اپنے ہی الفاظ میں گویا ہے کہ ولا تتبعوا من دونه اولیاء۔ قرآن کے علاوہ کسی کی بھی پیروی نہ کرو۔ اور ہاں ہدایت اگر ضلالت کے مقابل نہیں ہے تو خالی رہنمائی پر کوئی پابندی نہیں ہے کہ پہلو دار الفاظ قرآن کے سہارے ”متعین“ مفہوم دیتے ہیں۔

رسول معصوم کی زبانی یہ بھی کہلایا گیا ہے کہ اوبیت القرآن ومثلہ معہ

**حدیث: مثل قرآن؟**

مجھے قرآن بھی دیا گیا اور اسی طرح مثل قرآن بھی۔

اس طرح یہاں بھی رسول اکرم ﷺ قرآن کی ”مثلیت“ کو اجاگر کرتے ہوئے ”ردیف“ بننے کی خبر دیتے ہیں وغیرہ۔ پہلے تو یہ روایت حدیث کی کسی بھی کتاب میں نہیں ہے اسے خطیب (1072م) نے تاریخ بغداد میں ذکر کیا ہے دوسرا یہ روایت قرآن کی واضح تحدی اور چیلنج کے مقابل استعمال ہو کر اپنا وزن کھو بیٹھی ہے یعنی جھوٹی ہے ارشاد الہی ہے قل لن اجتماعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القرآن لایأتون بمثلہ

کائنات بھری کے چھوٹے اور بڑے انسان ملکر ایک دوسرے کی پشت پناہی کریں کہ اس قرآن کی مثل بنالائیں تو نہیں بنا سکتے۔

(اسراء، 88)

بات صاف ہو گئی کہ ”مثل“ قرآن ناممکن ہے نہ ہی ردیف قرآن بن سکتی ہے۔ اس طرح قرآن پاک نے اپنی ”مثلیت“ کی نفی کر کے تمام مترادفات اور متبادلات کی حیثیت متعین کر دی ہے کہ وہ ”لاحیثیت“ ہیں۔ اتنی وضاحت کے باوصف محدثین اور اہل روایات کی یہ بڑی جسارت ہے کہ وہ اسی دھن میں لگے ہوئے ہیں کہ متبادلات گھڑ کر لاتے رہیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ خطیب بغدادی کی روایت کے خود ساختہ اور جعلی ہونے پر امام الرجال علامہ تمنا عمادی (1971م) نے غالباً 1951ء سے پہلے طلوع اسلام کراچی میں بعنوان ”مطلہ معہ“ ایک معرکہ الآراء مضمون لکھ کر روایت سازوں کو حالت نزع میں پہنچا دیا تھا۔

ترادف کا اصول یہ ہے کہ سوار کے پیچھے جو دوسرا سوار ہو اسے ہی ردیف

**قرآن کے متبادل شخصیات؟**

کہا جاتا ہے۔ اب اصولاً ہونا یہ چاہئے کہ ردیف سوار کی حیثیت ثانوی ہو

مگر دیکھا گیا ہے کہ اسکی حیثیت اولین بنا دی جاتی ہے۔ یا کم از کم ہم حیثیت گردانا جاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی قرآن والوں نے بھی ردیفوں کا سہارا لے کر اپنی پوزیشن کو توانا بنانے کی سرگرمی دکھائی ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی محبوب شخصیت کو پہلا سوار اور قرآن محکم کو ردیف سوار کی حیثیت سے پیش کر ڈالا ہے اور انہیں اسکی



خبر تک نہیں ہوئی کہ ان کی سوء تدبیر نے انہیں کتنا یرغمانہ منزل بنا دیا ہے یعنی اب قرآن والے بھی ”اقبال اور قرآن“ کے ترانوں کی دھن میں کھڑے مراتب سے بے نیاز ہو کر قرآن کو اقبال کا ردیف بنا کر نازاں و فرجاں ہیں۔ حالانکہ قرآن سرِ پاپا نور ہے ہدایت ہے بے مثل خدا کی بے مثل کتاب ہے ضلالت کے عمیق گڑھوں سے اٹھا کر ہدایت کی رفعتوں اور بلندیوں سے آشنا کرنے والی کتاب ہے۔ جبکہ پہلی حیثیت والاد جودی ہے۔ لحدِ مجدد پر حاضری دینے والا ہے۔ مرشدِ روی کا گن گانے والا ہے۔ طبعی راہب ہے۔ تضادِ فکری کا شکار ہے۔ اکسین ہادی بننے کی صلاحیت ہے نہ بن سکنے کا امکان۔ یہ تو شکر ہے کہ عہدِ حاضر میں، تفہیمِ قرآن کے بڑے معلم علامہ پرویز اور سید عبدالودود صاحب نے اقبال کے تصوف کا علمی، سائنسی اور واقعاتی جائزہ لے کر اقبال کے فکر و فلسفہ والوں کی کٹیا ڈلا دی ورنہ تو نہ معلوم آگے کیا کیا ہو جاتا۔ غرض کہ اقبال کا فلسفہ تصوف نہ قرآن ہے نہ قرآن سے کشید۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی آئیے صوفیہ خالص کر مجددِ الف ثانی گئے توحیدِ ممکن افکار کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

مشہور دانشور اور تاریخ و فلسفہ کے مستند سکالر قاضی جاوید صاحب اپنی کتاب ”بر صغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء“ (صفحہ 143) میں مجددِ الف ثانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں،

”میں اللہ تعالیٰ کا مرید بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کا مراد بھی میری ارادت کا سلسلہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے متصل ہے اور میرا ہاتھ اللہ کے ہاتھ کے قائم مقام ہے۔“ (مکتوبات جلد 3/1500)

اردو، مرید اور مراد یہاں باطنی مفہیم میں استعمال ہوئے ہیں۔ مراد کے معنی ہیں مطلوبِ خدا۔ ارادے سے مراد۔ رجب و ولایت ہے یعنی کہ ولایت بہ نسبت نبوت کے افضل ہے کہ یہاں واسطہ جبرئیل استعمال نہیں ہوتا۔ امیرِ جب شیخ بلع الدین نے لوگوں کے حوالہ سے ولایت کی توانائی اور افضلیت پر اعتراض کیا تو مجدد (1623) نے جواب میں فرمایا،

”جزئیات میں سے ایک جزی میں غیر نبی کو اگر نبی پر فضیلت لازم آجائے تو کچھ حرج نہیں لہذا جب غیر نبی کو نبی پر فضیلت جزی جائز ہے تو غیر نبی پر بطریقِ اولیٰ ثابت ہو سکتی ہے۔“

(قاضی جاوید صفحہ 142 حوالہ مکتوبات صفحہ 432-433)

جو لوگ اپنی ولایت کو جزی یا کلی، طور پر نبوت سے افضل ٹھہراتے ہیں صدیق اکبر کے رتبے و مقام سے برتری حاصل کرنا ان کے لئے مشکل نہیں چنانچہ حضرت مجدد اپنے ایک ”تجربے“ میں لکھتے ہیں،

”صدیق اکبر کے مقام کے بالکل مقابل ایک اور مقام ظاہر ہوا جو نہایت ہی نورانی تھا۔ ایسا نورانی مقام کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا اور حضرت صدیق اکبر کے مقام سے کچھ بلند تھا جس طرح

چوتھے کو زمین سے قدرے بلند بناتے ہیں اور معلوم ہوا کہ وہ مقام۔ مقامِ مجموعیت ہے اور یہ مقام رنگین اور متغش تھا۔ میں نے اس کے مد تو سے اپنے آپ کو بھی رنگین اور متغش پایا۔

(مکتوب دفتر اول۔ مکتوب یازدہم جلد 53/1)

یہاں مجدد۔ رُعبہ صدیق سے گذر کر مقامِ نبوت پر جا پہنچے ہیں یہ خیر ہوئی کہ شہنشاہ نور الدین جہانگیر صدیق سے برتر ہونے کے دعوے کو برداشت نہ کر سکے اور مجدد کو گوالیار کے قلعہ میں بند کر دیا ورنہ۔ کیا مزید شکوے کھلتے؟

قاضی جاوید صاحب لکھتے ہیں،

**کائنات کا نظام چلانے کی ممبر شپ** ”یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنی نقطہ نظر کے

حامل ہونے کے باوجود شیخ اس رجحان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے ان ہی اثرات نے ان کے تصور ”قیوم“ کو جنم دیا تھا۔ ان کے تصورِ قیوم سے مراد ایسا فرد ہے جو واضح طور پر خدائی صفات کا حامل ہو۔“ (صفحہ 143 حاشیہ 47)

شیخ احمد سرہندی کے نزدیک جب فرد روحانی ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا اعلیٰ ترین مقام تک رسائی پالیتا ہے تو اسے تمام اشیاء کا ”قیوم“ بنا دیتے ہیں۔ (حوالہ مکتوبات امام ربانی جلد 3/1187، 188)

یہاں مجدد کی بات تفصیل طلب ہے اسکی وضاحت کیلئے ان کی جائے خواجہ کمال الدین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں،

”قیوم اس شخص کو کہتے ہیں جسکے ماتحت تمام اسما و صفات، شئونات، اعتبارات اور اصول ہوں۔ اور تمام گزشتہ و آئندہ مخلوقات کے عالم موجودات، انسان، وحوش، پرند، نبات، ہر ذی روح، پتھر، درخت، بحر و ہر شے، عرش و کرسی، لوح، قلم، سیارہ، ثوابت، سورج و چاند، آسمان، بروج سب اس کے سائے میں ہوں، افلاک و برج کی حرکت، سکون، سمندروں کی لہروں کی حرکت، درختوں کے چوں کا ہلنا، بارش کے قطروں کا گرنا، پھلوں کا پکنا، پرندوں کا چونچ پھیلانا، دن رات کا پیدا ہونا، اور گردش کنندہ آسمان کی موافق و ناموافق رفتار سب اس کے حکم سے ہوتا ہے، بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اسکی اطلاع کے بغیر گرتا ہو۔ زمین پر حرکت سکون اسکی مرضی کے بغیر نہیں۔ جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے اسکے حکم کے بغیر نہیں ہوتا، کوئی گھڑی کوئی دن کوئی ہفتہ کوئی مہینہ، کوئی ایسا سال نہیں جو اسکے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی و بدی کا تصرف کر سکے، غلّہ کی پیدائش، نباتات کا آگنا غرض جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اسکی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔ روئے زمین پر جس قدر زاہد، امدار، اور مقرب، تسبیح، ذکر فکر، تقدیس اور تزیین میں عبادت گاہوں، جموں، نہروں، کنیوں، پہاڑ اور دریا کے

کنارے، زبان، قلب روح، سخنی، اخفی اور نفسی سے شافل اور متکلف ہیں اور حق تعالیٰ کی راہ میں مشغول ہیں سب اسی کی مرضی سے مشغول ہیں گو انہیں اس بات کا علم نہ ہو اور جب تک ان کی عبادت، قیوم۔ کے ہاں قبول نہ ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔

(روضۃ القیومیۃ خواجہ کمال الدین جلد 94/1 حوالہ شیخ اکرام ”رود کوثر“ صفحہ 298)

قیوم کو واضح الفاظ میں کائنات کے نظام کو چلانے کیلئے ایک ممبر اور مشیر کی حیثیت حاصل ہے یعنی وہ۔ اللہ کے ہر کام میں ساجھی اور سہیم ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید (1832م) کا نام سنتے ہی آپ کے چشم تصور میں تقویۃ  
برے صاحب کا برا بھول الایمان والے شاہجی کی شخصیت گھوم جائے گی۔ آئیے ان کی بھی سنئے فرماتے ہیں،

اتفق اهل الكشف والوجدان وارباب الشهود والعرفان مؤیدین بالبراهین العقلية والاشارات النقلية على ان للقيوم للمكشورات الكونية واحد شخصى

”كشف، وجدان، شہود اور عرفان والے امپر متفق ہیں کہ نظام کائنات کی نگرانی پر ایک قیوم متعین ہے۔“ (عبقات۔ اشارہ نمبر 1 عبکہ نمبر 20 حوالہ اشراق صفحہ 31۔ جنوری 1999م)

مجدد ماثی ہوں۔ یا۔ ہمارے اسماعیل شہید اہل وجدان و عرفان ہوں یاد گیر صوفیائے طریقت وہ اس عقیدے پر مصر ہیں کہ اللہ نے اپنے اختیارات میں ساجھی مقرر رکھے ہیں یعنی گروہ قیومین۔ اللہ کے نظام تکوینی کے تجربہ کار ممبر اور مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ اللہ سبحانہ (ہوئی من المشرکین۔ توبہ 3) ساجھے داروں کے اشتراک سے پاک اور مبرا ہیں بلکہ قرآن ایسے مدعیان اشتراک پر واضح کرتا ہے کہ لا یشرک فی حکمہ احدا وہ اپنے نظام حکمرانی میں کسی کو بھی سہیم و شریک نہیں گردانتا۔

(کف، 26)

یہاں واضح کرنا یہ مقصود ہے کہ مجدد صاحب کو تو جانے دیجئے کہ جب امام اہل توحید خود بھی تصوف کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں تو کسی دوسرے سے کیا شکوہ؟ کاش وہ ”تقویۃ الایمان“ لکھنے کا تکلف نہ فرماتے۔ وہ جب امور خدا وندی میں قیوم کے متصرف ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں تو شرک کس بلا کا نام ہے جسکے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ کاش اسماعیل شہید عبقات نہ لکھتے۔ یا تقویۃ الایمان کو اپنے ہاتھوں نذر آتش کر دیتے۔

کارہائے یزداں کی تکمیل میں ہاتھوں ہوتی ہے امام ولی اللہ دہلوی (1762م) بلاشبہ علوم دینی و اجتماعی پر کامل و مترس

رکھتے تھے اور میں ان پر کسی حرف گیری سے کام نہیں لینا چاہتا لیکن آپ چونکہ اہل ہند کے ایک ”مسلمہ“ مقتدا تھے لہذا شریعت کے باب میں ان کو درمیان میں لانا ضروری ہے اور یہ کام چونکہ دینیات کے ایک فرزاند شہور جناب غامدی صاحب مجھ سے پہلے سرانجام دے چکے تھے لہذا میں حوصلہ پا کر ان کے اقتباسات میں ان ہی کا خوشہ چین ہوں مجھے ان

کے حوالہ جات پر کامل بھروسہ ہے۔ وہ لام ولی اللہ کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ رالیتنی فی المنام قائم الزمان اعنی  
بذلك ان الله اذا اراد شيئا من نظام الخير جعلني كالجارحة لا تمام مراده

میں نے خواب دیکھا کہ مجھے قائم الزمان کے منصب پر فائز کیا گیا ہے اس سے میری مراد یہ ہے  
کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے نظام خیر میں سے کسی چیز کا ارادہ کریں گے تو اپنے مقصد کو پورا کرنے کیلئے  
اللہ کار مجھے بنائیں گے۔ (فیوض الحرمین۔ مشاہدہ 44 حوالہ اشراق جنوری 99ء صفحہ 45)

اسپر غامدی صاحب فرماتے ہیں،

”تو گویا ولی اللہ بھی ارض و سما کے امور کی تکمیل کیلئے قیوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔“ (اشراق)

یہاں راقم الحروف عرض پر داز ہے کہ ولی اللہ نے اپنے کو اللہ کے نظام خیر کا اللہ کار کہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے  
کہ اللہ نہ شر کا خالق ہے نہ ہی اس کے کارخانہ قدرت میں شر ڈھلتا ہے وہ خیر ہے اس سے خیر ہی کا صدور ہوتا ہے۔ لیکن  
تعجب ہے کہ وہ جسے کن فیکون کی توانائی حاصل ہے وہ دنیا کا نظام چلانے کیلئے ولی اللہ کی قومیت کا سہارا لیں؟ یا روکچھ تو  
رجم کرو۔

خالق اور مخلوق میں وحدت کا توحید دشمن رشتہ جوڑنے والے

تم نام کے نبی اور کام کے صفر ہو

بائیں حد فاصل بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ معاشر الانبیاء او تنیم اللقب واو تینا مالہم تو توه۔

اے جماعت انبیاء۔ تمہیں صرف ”نبی“ کا لقب دیا گیا اور ہمیں وہ کچھ دیا گیا جس سے تم محروم

تھے۔ (فتوحات مکیہ جلد 90/2 حوالہ اشراق صفحہ 45 جنوری 99ء)

یعنی اے گروہ انبیاء تم صرف نام کے نبی ہو اور کام کے صفر ہو۔ تمہیں صف انبیاء میں لایا تو گیا ہے مگر برائے نام۔

علامہ غامدی صاحب لکھتے ہیں،

خداؤں کی یلغار ”صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ زمین پر اللہ کے خاص بندوں کی ایک جماعت ہمیشہ

موجود رہتی ہے جو اس عالم کا سب کام جاری رکھتے ہیں۔ زمین و آسمان کی ہر چیز ان کی مرضی کے

تابع اور روز و شب کا یہ سلسلہ ان کے احکام کا پابند ہے۔“ (اشراق، صفحہ 43 حاشیہ 32)

اور یہ ”خدا“ غامدی صاحب کے مطابق مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں مثلاً۔ قیوم، قطب، ابدال،

اولیاء مکتوم اور رجال الغیب وغیرہ۔ عبدالکریم قطب الدین (1428م) ان خداؤں کی کارکردگی اور توانائی کی بابت لکھتے ہیں

۔ کل واحد من الافراد والاقطاب له التصرف فی جميع المملكة الوجودية ويعلم کل واحد منهم ما

اختلج فی اللیل والنهار

ان افراد و اقطاب میں سے ہر ایک کو اس پوری مملکت وجود میں پورا تصرف حاصل ہوتا ہے۔

پرندوں کی بولیاں تو کیمیا اور دن میں جو کھٹکا بھی ہوتا ہے وہ اس سے واقف ہوتے ہیں۔

(الانسان الكامل حوالہ اشراق صفحہ 42)

مذکورہ بالا حوالہ جات نہایت احتیاط سے نقل کئے گئے ہیں لکھنے والے بھی کوئی معمولی علم و دانش والے نہیں تھے۔ پختہ کار قلمکار اور نوشتہ خواند کا خصوصی مذاق رکھنے والے تھے۔

## ان سب کا مآخذ

میں نے ان ہی کے رشحاتِ قلم کو سامنے رکھ کر کتاب ہدیٰ کی فریاد آپ تک پہنچادی ہے اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ انھیں اور کتاب ہدیٰ کی نصرت و حمایت میں آگے بڑھیں اور پوری توانائی سے ان روایات، مآخذوں اور شیطیات و خرافات کو پیچھے دھکیل دیں جن کی یلغار سے توحیدِ خدا بھی پس منظر میں چلی گئی اور کتاب ہدیٰ بھی درماندہ بنادی گئی۔ نہ صرف ان روایات کے توسط سے مخلوق کے ذریعہ خالق کے اختیارات پر کمند ڈالنے کی بھرپور کوشش کی گئی روایات و سنت کی فرضی توانائیوں سے قرآن کی حساس پوزیشن کو نازک بھی بنادیا گیا۔

**ناظرین محترم :-** ذیل میں وہ روایات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جن میں صوفیا کی خرافات کی ”جھلکیاں“ بھی ہیں اور اللہ سبحانہ کیلئے ”مثلیت“ کا عقیدہ بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ شذرات 56 سال پہلے جمع کئے گئے تھے مگر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اب ”یاب“ ہیں اور تصوف کی یلغار کی مناسبت سے انہیں بھی سامنے لا رہا ہوں۔

قرآن نے کہا تھا۔ لا تضر بوا للہ الامثال۔ خدا کو شیوے تصویر میں نہ اتارو۔ (نحل، 74) تصویر تو اسکی اترسکتی ہے جو مشاہدہ، نظر اور خیال میں آسکتا ہو لیکن یہاں پوری تحدیٰ سے فرمایا۔ لیس کمثلہ شیء۔ اسکی مثل تو ہے ہی نہیں۔ (۔۔۔) بلکہ حتمی الفاظ میں ”مثلیت“ کی نفی کرتے ہوئے فرمایا لا تدركہ الابصار وهو يدرك الابصار اسے نظر پانی نہیں سکتی۔ (انعام، 103) انسان جتنا کچھ یزداں پر کمند ڈالنے کی کوشش کرے اور آنکھ کے کیمرے میں یزداں کو کیچ کرے کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔ (لیجئے اب شذرات ملاحظہ ہوں)

## خدا کی پنڈلیاں

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے، سمعت النبی ﷺ يقول یکشف ربنا عن ساقه فیسجد له کل مؤمن ومومنة ویبقی من کان یسجد له فی الدنیا ریاء وسمعتہ

فیذهب فیعود ظہرہ طبقاً واحداً

یعنی رسول اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ سبحانہ اپنی پنڈلی سے کپڑا ہٹالیں گے تب ہر مؤمن مرد اور مؤمنہ عورت سجدے میں گر پڑیں گے صرف وہ سجدہ نہ کر سکیں گے جو دنیا میں نام و نمود اور ریاکاری کی عبادت جلااتے رہے وہ اگر سجدہ کرنا چاہیں گے تب بھی ان کی پیٹھ میں ایک سریارکھ دیا جائے گا وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔

(بخاری کتاب التفسیر۔ پ 20۔ تفسیر ن والقلم۔ کوئی پنڈلی اس کی وضاحت نہیں ہوئی)

## خدا کی شکل

ابو ہریرہ کی روایت ہے قال رسول اللہ ﷺ خلق اللہ آدم علی صورته طوله ستون



فرمایا نبی اکرم ﷺ نے اللہ نے آدم کو اپنا ہم شکل بنایا ہے جس کی قامت ساٹھ گز ہے۔

(بخاری پ 16 و پ 3 مشکوٰۃ کتاب الآداب باب العلم فصل اول، ربع سوم)

خدا کو کسی نے نہیں دیکھا مگر ہریرہ نے اسکی شکل بھی دیکھ لی اور قد و کاٹھ کی پیمائش بھی کر دکھائی۔ کہو کیا

**تبصرہ**

خیال ہے؟

عن صفوان سمعت النبی ﷺ يقول يدنى المؤمن من ربه وقال

**اللہ میاں مونڈھا مارتے ہیں**

هشام يدنو المؤمن حتى يضع عليه كتفه فيقره ذنوبه

صفوان اور ہشام کہتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا مؤمن کو اللہ کے قریب لایا جائے گا اللہ اُسے مونڈھا

ماریں گے وہ اپنے گناہ بتا دے گا۔

(بخاری کتاب التفسیر پ 19 و پ 9 کتاب المظالم تفسیر الالعة اللہ علی الکاذبین)

تعب ہے کہ اللہ کے مونڈھ مارنے سے مرد مؤمن پچار ہا سے کچھ بھی نہ ہوا۔ اسے تو پس جانا چاہئے تھا۔

**تبصرہ**

عن ابن عباس عن النبی ﷺ

**خدا کی انگلیاں گداز اور ٹھنڈک پہنچانے والی ہیں**

اتی فی اللیل ربی فی احسن

صورة فوضع يده بين كتفي حتى وجدت بردانا مله

فرمایا نبی اکرم ﷺ نے ایک رات اللہ سبحانہ نہایت حسین شکل میں نمودار ہوئے، میرے

شانوں پر اپنا ہاتھ رکھائے اللہ کی گداز انگلیوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔

(بخاری، پ 20)

عن ابن مسعود عن النبی ﷺ قال قيل له ما المقام المحمود قال ذالك يوم ينزل الله

**خدا کا وزن**

على كرسیه فيأط كما يأط الرجل الجديد

ابن مسعود کہتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے مقام محمود کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔

مقام محمود وہ جگہ ہے جہاں اللہ سبحانہ نزولِ اجلال فرما کر کرسی نشین ہو گئے تب کرسی اللہ کے

بوجھ سے اسی طرح چرچرائے گی جس طرح اونٹ پر نیپالان ڈالکر بیٹھا جائے تو وہ وزن سے آوازیں

نکالنے لگے۔ (داری حوالہ مشکوٰۃ باب الخوض والشفاعة)

اس روایت کے بارے میں ابن تیمیہ کہتے ہیں۔

”عرشِ عظیم اللہ سبحانہ کے بیٹھنے سے چرچراتا ہے اور مرش کے چاروں طرف اللہ میاں کا جسم چار چار انگلیوں

(منہاج السنۃ طبع مصر جلد 1/260)

جتنا باہر رہتا ہے۔“

تعب ہے کہ اللہ میاں جس ٹھیکے وار کو عرش سازی کا عظیم کام سپرد کر دیتے ہیں وہ اتنا ”انارڈی“ ہے کہ اللہ

**تبصرہ**

کے بھاری بھر کم جسم کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر پایا اور اللہ میاں کو بڑی تنگی سے بیٹھنا پڑا۔؟ روایت سازو اللہ کی شان میں ایسی گستاخیاں مت کرو اسکی گرفت بڑی ناگوار اور شدید ہے۔ (طارق)

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں،

**اللہ میاں روئے اور خوب روئے** ”اللہ میاں کی آنکھیں دُکھنی آئیں تو فرشتوں نے ہمار پر سی کی۔ اللہ

میاں نے کہا کیا کروں! نوح کے طوفان نے اتنی تباہی پھیلا دی کہ درود کر میری آنکھیں آشوب زدہ ہو گئیں۔“

(منہاج السنۃ طبع مصر جلد 1/260)

**اللہ میاں تنور لگا کر بھشتیوں کی روٹیاں پکائیں گے** اللہ میاں زمین گوروٹی کی طرح قیامت کے دن اپنے ہاتھوں سے

آٹ پکٹ کریں گے اور وہ روٹی ہوگی واسطے بھشتیوں کے۔ (بخاری حوالہ مشکوٰۃ باب الحشر۔ فصل اول۔ ربع چہارم)

**تبصرہ** یہاں راوی نے وضاحت نہیں کی کہ روٹی کس چیز کی ہوگی؟ صرف یہ لکھا ہے کہ ”گیلی مٹی کے پیڑے بنا کر اسے ہی بھشتیوں کیلئے پکائیں گے۔ یعنی گول اینٹیں بھشتیوں کی غذا ہوگی اور ”نانہائی“ کا کام اللہ میاں خود ہی سرانجام دیں گے۔ (العیاذ باللہ)

**اللہ میاں ہنستے ہنستے بے خود ہو جاتے ہیں** عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال. یضحک اللہ الی رجلین فیقتل

احدهما الآخر فیدخلان الجنة فیقاتل هذا فی سبیل اللہ فیقتل ثم یتوب اللہ علی القاتل

ابو ہریرہؓ خبر دیتے ہیں کہ، ”اللہ سبحانہ دوایسے آدمیوں کے حال پر ہنستے ہیں جن میں سے ایک

قاتل ہے اور ایک مقتول۔ مگر دونوں جنت میں جاتے ہیں۔ مقتول اسلئے کہ۔ ظلم سے مارا گیا اور

قاتل اسلئے کہ اسے جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کا موقع ملا اور شہادت نصیب ہوئی۔“

(بخاری پ 11 کتاب الجہاد والسر۔ باب الکافر یقتل المؤمن)

**تبصرہ** کیا قاتل توبہ کرنے اور شہید ہونے پر قصاص سے بھی بچ جائے گا یعنی وہ شہید نہ ہو تا تب اسکی ہمت کیا فیصلہ ہو سکتا تھا؟ یعنی اگر کوئی مسلمان قتل کرنے کے بعد اپنے جرم سے توبہ کر لے تو اس پر سے قصاص حذف

ہو جائے گا؟ یہی بات اگر جناب ابو ہریرہؓ دریافت کر کے متا دیے تو اشکال ختم ہو سکتا تھا۔ اللہ کے ہنسنے اور کھل کھلا ٹھننے کی

بات ہی نہ ہوتی۔ ویسے بھی اللہ سبحانہ انسانی ”انفعالات“ سے پاک و منزہ ہیں مگر افتاد یہ ہے کہ روایات پرست بعض افعال جو

خدا اور انسان کی طرف یکساں منسوب ہو سکتے ہیں ان میں تاویل سے گریز کرتے اور انہیں حقیقت جانتے ہیں جس سے

معاملہ ”گنیمت“ ہو جاتا ہے۔

**اللہ میاں کی زلفیں** فرمایا نبی اکرم ﷺ نے رأیت ربی فی صورة شاب وله وفرة۔

میں نے اللہ کو گھبر و جوان کی شکل میں دیکھا جسکے شانوں تک زلفیں دراز تھیں۔

(بخاری ب 3 صفحہ 107 و صفحہ 108۔ یا کنز العمال علاؤ الدین سمنانی (طبع مصر جلد 58/1 حدیث 153)

عن انس عن النبی ﷺ قال یلقى فی النار وتقول هل

اللہ میاں کا پاؤں گھرام جہنم میں من مزید حتی یضع الرب قدمه فتقول قط

حضرت انس راوی ہیں کہ جب دوزخ بھر جائے گی اور پھر بھی آوازیں دے گی۔ ہے کوئی مزید داخل ہونے والا تب رب تعالیٰ اپنا قدم آگے بڑھا کر دوزخ میں ڈال دیں گے۔ اس پر وہ کہے گی کہ بس بس میں بھر گئی۔

تصرہ اللہ میاں نے کونسا پاؤں جہنم کا ایندھن بنایا؟ پھر جہنم مجھ گئی یا صرف بھر گئی؟

اذا قاتل احدکم فلیحتجب الوجه فان صورة الانسان علی صورة

انسان خدا کا مظہر ہے وجہ الرحمان

آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب کوئی کسی کو تھپڑ رسید کرے تو چہرے کو چاکر رسید کرے کیونکہ رحمان نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا ہے۔

(طبرانی طبع دہلی۔ یا کنز العمال جلد 57/1 حدیث 1143, 1144, 1145)

اللہ تعالیٰ سونے کی جوتی پہنتے اور چہرے پر برقعه ڈالتے ہیں رأیت ربی فی صورة شباب

موہر فی الخضر علیہ نعلان من ذهب و علی وجہه فراش من ذهب

میں نے اللہ کو گھبر و جوان کی شکل میں دیکھا جسکے سبز رنگ کے تھکھریا لے بال تھے پاؤں میں سونے کی جوتی اور چہرے پر سونے کا نقاب ڈالا ہوا تھا۔

(صحیح مسلم جلد 1 باب اثبات رویۃ المؤمنین فی الآخرة۔ کنز العمال جلد 58/1 حدیث نمبر 1154۔ ابن اثیر کامل جلد 98/8)

تصرہ غالباً یہی وجہ ہے کہ سونا دن بدن منگتا ہو رہا ہے کیونکہ اہل روایات کا خدا اور اسکا ربوں کھریوں پر مشتمل سٹاف بھی سونا ہی استعمال کرتے ہوں گے۔

اللہ سبحانہ داؤد ظاہری کی نظر میں عبدالکریم شریستانی (1153 م) اپنی عقائدی انسائیکلو پیڈیا میں لکھتے ہیں۔

عن دانود الظاہری۔ انه قال عفونی عن الفرج واللحیة وسلونی عما وراء ذالك فقال ان معبودی له جسم ولحم ودم له جوارح واعضاء وکبد ورجل وعینان واذان

مقتدائے اہل روایت امام داؤد ظاہری (884ھ) کہتے ہیں۔ مجھ سے خدا کی داڑھی اور فرج کے بارے میں نہ پوچھیں کہ ان کا حدیث میں ذکر نہیں ہے ویسے میرے خدا کے اعضا اور جوارج ہیں جسم ہے گوشت ہے خون ہے رگیں اور اعصاب ہیں جگر ہے پیچھڑے ہیں، پاؤں ہیں، زبان ہے دو آنکھیں ہیں دو کان ہیں۔

عورت کا رحم اللہ میاں سے لپٹ گیا  
 بھوہریرہ سے روایت ہے کہ اللہ میاں جب ”مادہ منویہ“ کی مخلوقات کی تخلیق سے فارغ ہوا تو عورت کا رحم اللہ میاں سے لپٹ گیا اور فریادی ہوا کہ بار الباتیری جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔

(بخاری کتاب التفسیر۔ تفسیر آئینہ۔ الذین کفروا)

عورت کا لپٹ جانا تو قابلِ فہم ہے کہ اللہ کی حسین صورت دیکھ کر بے خود ہو گئی ہو۔ رحم کا لپٹ جانا عجیب بات تبصرہ ہے جو بھوہریرہ نے کہی۔

۱۹۴۳ء



ناظرین محترم:- میزان القرآن حصہ مقالات میں تین مقالے جن کی علمی اور تحقیقاتی حیثیت اور لکھنے والوں کے علمی مقام کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میں بصدِ تحسین ان ہی کے نام سے شائع کئے ہیں دو مقالے جناب ابو عصمت محمد سلیم اور ایک ڈاکٹر محمد اسلم انصاری کا ہے انہیں اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

طارق



# علومِ شرآنی میں ایک عظیم انقلاب ایک محبت • ایک دلیل • ایک برہان ”فسوخ القرآن“

— عہدِ آفرین • انقبلا انگیز • تاریخ ساز تصنیف —

علومِ شرآنی کی مستند دلیلیں پر پھیل چوکی تاریخ میں اپنی نوعیت کی اولین کتاب جس میں پہلی بار قرآن مجید میں نسخ و منسوخ کی بات ہے، شمارِ علوم کی روشنی میں سیرِ معاش کی گئی ہے اور دلوں و دھنوں کی روشنی میں ہزاروں عقل اور نفس و دلائل کے ساتھ قطعی طور پر ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں نہ الفاظ کا تغیر و تبدل واقع ہوا ہے نہ معانی و مفہیم میں کسی طرح کا نسخ یا معرکہ آرا کتاب میں ان تمام غیروہمائیوں کی آواز کو جمع کیا گیا ہے جو قرآن کی سہما کی گواہی قرار سے برحق ثابت کرتے اور نسخ فی القرآن کے نظریہ کو مروج اسلام و نیفتیادگی کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ احاطہ القرآن کے موضوع پر اس سے جامع مدلل اور سنجیدہ علمی کتاب اردو زبان میں آج تک سیر نہ کی گئی تھی جس کے مصنف رحمۃ اللہ طارق نے کوٹلہ کوٹہ دشت کے لائبریریہ میں علوم القرآن علمِ نوریت اسلام و رجال تاریخ و فقہ اسلامی اہل سنت و اہل اہل بیت ائمہ و ائمہ کی تعلیم و ترویج کے ساتھ ساتھ تحقیقاتی

— شاہکار ترتیب ہے جس پر علم و اسلامی اور دین حاضر کی علمی دنیا سب سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہے

۹۷۹ سے نامہ صفحات ○ ۶۶۹ منسوخ آیات کی تفصیل ○ ۳۱۵ مستقل عنوانات

جن کے ذیل میں سیکڑوں علمی بحث • ہزاروں علمی اور استدلالی حقائق کے مطالعہ کا پورا

روشنی کا بہت بڑا نفع ہے • عمدہ سفید کاغذ • بڑا سا

جلد دست کر کے ساتویں قیمت 45 روپے

کتاب منگوانے کے لئے نفع رتن پبلنگ بزنس مین آڈر یا ڈیمانڈ ڈرائٹ بھیجا ضروری ہے

## ادارہ • طبعیاتی لائبریری • ملتان

1339/3 Gulshan Abad O/s Pak Gate, Multan.

”زمینداری جاگیر واری اور اسلام“ اور ”تفسیر منسوخ القرآن“ کے مصنف کے علم سے  
اسلامی اجتماعیت و اسلامی سرشت و اسلامیت کے پس منظر میں عہدِ حاضر کے  
اقتصادی مسائل کا سائنٹیفک تجزیہ و نقد و برہان کے نام آئیں جو ہم آہنگی، حلال الدین  
اقبال اور عہدِ حاضر و عہدِ کبر کا اقتصادی نظریات کی روشنی میں مصنف نے اسلامی جمہوریت  
اور سماجیت کا انقلابی مطالعہ پیش کیا ہے۔ پاکستان میں اقتصادیات کے تمام مسائل میں یہ  
کتاب ایک اگلی نئی نئی کتاب ہے۔ ادارہ • ادبیات اسلامیہ ملتان





مذاہبنا      ينطق عليكم بالحق

ہماری یہ کتاب تمہیں سچ سچ بتا دے گی۔ (جاشیہ ۲۸)

## تفسير

برہان القرآن

یعنی

اس حقیقت کے اظہار میں کہ قرآن کریم کی آیات میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں ہے۔ بعض مزمعہ دلائل و تصورات کی انقلاب آفریں تحقیق۔

رحمت اللطارق

اداره • رئیس ادارہ الامیر • عثمان

1339/3 - GULSHAN ABAD, O/s PAK GATE, MULTAN.

فتیہ

600/2

## صورت‌نما

1024

<http://fb.com/ranajabirabbas>

فان اعتزلوكم فلم يقاتلوكم والقوا اليكم السلم فما جعل الله لكم عليهم سبيلا  
 پس اگر وہ تم سے (اور تمہارے دین سے) کنارہ کش ہو گئے پُر امن رہو اور صلح و سلامتی کا پیغام بھی بھیج بیٹھے تو پھر خدا نے تمہارے لئے گناہوں  
 نہیں رکھی کہ تم انہیں چھڑو۔ - سورہ ۹۰

# قتل مرتد شرعی حیثیت

قرآن کی عطا کردہ حریتِ فکر و روشنی میں احادیث و آثار کا بے لاگ جائزہ  
 اسلام میں قتلِ مرتد کے موضوع پر انقلاب آفرین تحقیق

جمیع  
 فقہاء اور محدثین کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا گیا ہے کہ پُر امن اور سلامتی کا بھی قابلِ تعزیر نہیں رہا  
 (تحقیق و ریسرچ کا بے نظیر مرجع)

## رحمۃ اللطیف

ادارہ ♦️ لکھنؤ اسلامیہ ♦️ ملتان